رجسٹرڈ نمبر ال (۵۲۰)

جنوری سنہ ۱۹۷۲ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کتبہ سید اقبال احمد)

جلد ۱۱۱ - ماہ ذی الحجہ ۱۳۹۲ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۷۳ء - عدد ۱

مضامین

شذرات	شاہ معین الدین احمد ندوی	۲-۴

مقالات

ہندوستان میں علم حدیث اموی دور تک	جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری، اڈیٹر البلاغ بمبئی	۵-۱۹
مولانا محمد علیؒ کی یاد میں	سید صباح الدین عبدالرحمن	۳۰-۴۰
کیا اسلامی قانون رومی قانون کا مرہون منت ہے	ترجمہ جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب پیرس	۴۱-۵۶
خریطۂ جواہر	شاہ معین الدین احمد ندوی	۵۷-۶۲
مکتوب حمید	جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب پیرس	۶۳-۷۴

وفیات

مرزا احسان احمد بیگ وکیل	م	۷۵-۷۶
مولانا عبد المجید حریری بنارس	"	۷۶
مطبوعات جدیدہ	"ض"	۷۷-۸۰

اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں

مصر و شام و حجاز وغیرہ اسلامی ملکوں کے مقابلہ میں ہمارے ملک ہندوستان میں بھی اسلامی علوم و فنون پر کچھ کم کام نہیں ہوا ہے، تقریباً تمام علوم پر ہندوستانی علماء اور مصنفین کی بہترین کتابیں موجود ہیں جن سے تمام دنیا متمتع ہو رہی ہے، لیکن ان کی کوئی جامع فہرست اردو میں کیا، کسی زبان میں بھی مرتب نہیں ہوئی تھی، اس خلا کو پر کرنے کے لئے مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب نزہتہ الخواطر نے الثقافتہ الاسلامیہ فی الہند کے نام سے عربی میں ایک فہرست مرتب کی تھی جو اب دمشق سے شائع بھی ہوگئی ہے، یہ اسی عربی کتاب کا ترجمہ ہے، اس میں ہندوستانی علماء و مصنفین کی تمام علوم تصانیف کے ذکر کے ضمن میں اجمال کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کے علمی و تعلیمی، دینی و فکری تاریخ بھی آگئی ہے، اس طرح سے یہ کتاب ہندوستان کے اسلامی دور کے محققین کے لئے ایک مستند ترین ماخذ بن گئی ہے،

ضخامت :- ۴۰۰ صفحے قیمت :- دس روپے،

مترجمہ مولانا ابوالعرفان ندوی

کے لئے یکساں کوڈ بل میں بڑا فرق ہے اس لئے اس سے بھی مسلمانوں کے پرسنل لا میں تبدیلی کا جواز نہیں نکلتا،

جو لوگ اسلامی ملکوں کو مثال میں پیش کرتے ہیں، وہ اُن کے اور ہندوستان کے حالات کو نظرانداز کر دیتے ہیں اسلامی ملکوں میں مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت اور اُن کی حکومت ہے، دوسرے فرقے برائے نام ہیں، اس لئے اگر کوئی ملک کوئی ایسی تبدیلی بھی کرتا ہے جس کا اس کو شرعاً حق نہیں ہے تو اس سے یہاں کے مسلمانوں کی ملی حیثیت میں فرق نہیں آتا وہ قائم رہتی ہے کسی دوسرے فرقے میں اُن کے ضم ہونے کا خطرہ نہیں ہوتا لیکن جن ملکوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں اور حکومت میں بھی اُن کی موثر حیثیت نہیں ہے، اور ایسی جماعتیں بھی موجود ہیں، جو اُن کی ملی خصوصیات کو مٹانا چاہتی ہیں، وہاں اُن کا وجود صرف اُن کے مذہب، کلچر اور زبان سے قائم ہے، ان میں سے جس چیز کو بھی نقصان پہنچے گا، ان کا ملی وجود خطرے میں پڑ جائے گا، اسی لئے ہندوستان کے جمہوری اور سیکولر دستور نے اقلیتوں کے مذہب کلچر اور زبان کے تحفظ کی ضمانت دی ہے، خود اسلامی ملکوں نے بھی کسی دوسرے فرقے کے پرسنل لا میں کوئی مداخلت نہیں کی ہے

مسلمانوں کا پرسنل لا انکے مذہب پر مبنی ہے اور اتنا مکمل ہے کہ دوسری قومیں اسکی تقلید کر رہی ہیں طلاق و خلع کا حق وراثت میں عورتوں کا حصہ وغیرہ اسی تقلید کا نتیجہ ہے اسلئے مسلم پرسنل لا میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں اور وہ ہندوستان کی دستوری ضمانت کے بھی خلاف ہے، جو لوگ مسلمانوں کی خیرخواہی ان کے عام طبقہ کی حمایت اور ان کی اصلاح و ترقی کے لئے پرسنل لا میں تبدیلی ضروری سمجھتے ہیں، ان سے سوال ہے کہ کیا مسلمانوں کی ساری خیر خواہی اور ان کی اصلاح و ترقی پرسنل لا میں تبدیلی ہی پر موقوف ہے جو چیزیں مسلمانوں کی حقیقی خیر خواہی اور اُن کی ترقی کی ہیں، اُن کی [illegible] نہ ان مصلحین کی توجہ ہے نہ حکومت کی مسلمانوں کے خلاف خونریز فسادات اور [illegible] جانی و مالی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

بمبئی کے مسلم پرسنل لا کنونشن میں مسلمانوں کا بڑا نمایندہ اجتماع ہوا، پورے ہندوستان کی مسلم تنظیموں اور ہر مکتبۂ خیال کے کئی سو نمایندے شریک ہوئے اور سب نے متفقہ طور سے مسلمانوں کے پرسنل لا میں حکومت کی مداخلت اور تبدیلی کی پرزور مخالفت کی، اس سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ مسلمانوں کی کوئی جماعت کبھی تبدیلی گوارا نہیں کرتی، باقی ایسے افراد تو ہمیشہ رہے ہیں جو پرسنل لا کیا کلام اللہ کے بہت سے مذہبی احکام میں تبدیلی کے متمنی ہیں مگر انکی جو حیثیت ہے وہ سب پر ظاہر ہے۔

پرسنل لا میں تبدیلی کے جواز کی جتنی دلیلیں دیجاتی ہیں اُن میں سے ایک بھی صحیح نہیں ہے سب سے بڑی دلیل یہ دیجاتی ہے کہ بعض اسلامی ملکوں نے تبدیلی کی ہے اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ جس ملک نے بھی احکام قرآنی کے خلاف کوئی تبدیلی ہے، اس نے غلطی کی کسی قانون شکن کے عمل کو قانون شکنی کے جواز میں پیش نہیں کیا جا سکتا اسلئے کسی ایسے اسلامی ملک کا عمل ہندوستان کے مسلمانوں کیلئے دلیل نہیں ہو سکتا، دوسرے اس دلیل میں بھی مغالطہ ہے، ٹرکی کے علاوہ کسی ملک نے نص قرآنی کے خلاف کوئی تبدیلی نہیں کی ہے البتہ بعض ملکوں نے شریعت کے اصولوں کی روشنی میں پرسنل لا کے غلط استعمال کو روکا ہے اور اس سے پیدا شدہ خرابیوں کو دور کیا ہے، اس قسم کی اصلاح ہندوستان میں بھی کیجا سکتی ہے مگر اس کا حق صرف اسلامی شریعت کے ماہرین کو ہے، عام مسلمانوں کو بھی نہیں، اور کسی تیسرے کا تو کوئی سوال ہی نہیں، اس سلسلہ میں یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ جن اسلامی ملکوں نے کوئی تبدیلی کی ہے تو اپنے پرسنل لا میں کی ہے کسی دوسرے فرقہ پر اس کو مسلط نہیں کیا ہے، اس میں اور سب

مقالات

ہندوستان میں علم حدیث اموی دور تک

از

جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

ہندوستان میں علم حدیث کے موضوع پر متعدد علماء محققین نے خامہ فرسائی کی ہے، اور تقریباً سب کی تحقیق میں یہاں علم حدیث کا رواج چھٹی صدی کے بعد ہوا ہے، اور پہلے کی صدیاں اس سے خالی نظر آتی ہیں، اس تحقیق سے اسلامی ہند کی دینی وعلمی تاریخ میں بڑا خلا محسوس ہوتا ہے اور یہ باور ہونے لگا کہ پہلے اس ملک میں رواۃ حدیث و محدثین اور ان کی تصانیف کا وجود نہ تھا، راقم نے اپنی کتاب " رجال السند والہند الی القرن السابع" میں اس خلاء کو پر کیا اور پہلی صدی سے لیکر ساتویں صدی تک ہندی رواۃ و محدثین اور اُن کی تصانیف اور کئی سو علمائے حدیث و رجال حدیث کا ذکر کیا ہے، اس کے بعد اس کا اعتراف تو کیا گیا کہ اس زمانہ میں یہاں محدثین اور رواۃ حدیث تھے مگر انھوں نے غیر ممالک میں درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کی سرگرمی دکھائی، خود ہندوستان میں وہ نہیں رہے، نہ انھوں نے یہاں روایت اور تصنیف کا کام کیا لیکن یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے، واقعہ یہ ہے کہ تیسری اور چوتھی صدی میں جس کو علم حدیث کا زریں عہد کہا جا سکتا ہے، تمام بلاد اسلامیہ کی طرح

شذرات

تباہی وبربادی کا سلسلہ بدستور جاری ہے، ملازمت کے دروازے اُن پر تنگ ہیں، اردو زبان
اور مسلم یونیورسٹی کا حشر سب کی نگاہوں کے سامنے ہے، اگر حقیقتاً مسلمانوں کی خیرخواہی مقصود ہے
تو پہلے ان چیزوں کی اصلاح کی ضرورت ہے، مگر اس کے بارہ میں سارے مصلحین کی زبانیں
خاموش ہیں، اس کے بغیر مسلمانوں کی اصلاح وترقی کا درد

تو کار زمین را نکو ساختی
کہ با آسمان نیز پرداختی

کا مصداق ہے،

مگر یہ امر باعث اطمینان ہے کہ اس بارہ میں حکومت کو بھی مسلمانوں کے جذبات
کا احساس ہوگیا ہے، اور اس کے ایک ترجمان محمد شفیع قریشی نائب وزیر ریلوے نے اعلان
کیا ہے کہ مسلمانوں کا پرسنل لا ان کا ذاتی معاملہ ہے، حکومت اس میں تبدیلی کا کوئی ارادہ
نہیں رکھتی، خدا کرے یہ بیان مسلم یونیورسٹی کے متعلق بیانات کی طرح نہ ہو،
کہ شروع ہی سے جو عمل وہ مسلم یونیورسٹی کے معاملہ میں اختیار کرتی تو مسلمانوں کو بدگمانی کا موقع
نہ ملتا۔ اب بھی وہ اس کی تلافی کرسکتی ہے،

پرسنل لا کے غلط استعمال سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، وہ اصل میں اسلامی نظام قضا
نہ ہونے کا نتیجہ ہے، ورنہ آسانی سے ان کا تدارک ہو سکتا تھا، مگر یہ چیز ہندوستان
میں ممکن نہیں ہے، اس لئے یہ علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ خرابیوں اور دشواریوں کو دور
کرنے کی کوشش کریں، کنونشن نے جو بورڈ بنایا ہے، یقین ہے کہ اس کے پیش نظر یہ مسائل بھی ہونگے

کتاب المصباح کبیر، کتاب الہادی
کتاب النیر

بڑی بڑی کتابیں ہیں، ان میں کتاب المصباح بڑی کتاب ہے، نیز کتاب الہادی اور کتاب النیر ان کی تصنیف ہے،

ابو اسحاق شیرازی نے طبقات الفقہاء میں لکھا ہے،

صاحب کتاب المنیر، خرج الی بغداد وتعلم ثم عاد الی المنصورۃ

وہ کتاب النیر کے مصنف ہیں، دیبل سے بغداد گئے اور وہاں سے علم حاصل کرکے منصورہ واپس آئے،

یاقوت نے معجم البلدان میں ان کے متعلق بیان کیا ہے،

لہ تصانیف فی مذہبہ وکان قاضی المنصورۃ

ابو العباس احمد بن صالح دیبلی کی ان کے مسلک پر تصانیف ہیں، وہ منصورہ کے قاضی تھے،

اس سے ظاہر ہوگا کہ خلف بن محمد دیبلی، علی بن موسیٰ دیبلی، قاضی ابو محمد منصوری اور ابو العباس احمد بن صالح منصوری چوتھی صدی میں دیبل اور منصورہ کے ان علماء و محدثین میں سے تھے، جنھوں نے یہاں حدیث کی تدریس و روایت کی اور اس فن میں کتابیں بھی لکھیں،

اس خیال کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کے قدیم علماء و محدثین اور ان کی تصانیف کے نام و نشان ہمارے سامنے نہ آسکے، اور بعد کے علمائے عجم کے علمی و فکری سیل نے قدماء کے ناموں اور انکے تصنیفی کارناموں کو اس طرح بہا دیا کہ تاریخ کے صفحات بالکل سپاٹ ہوگئے، اور ان کتابوں میں سے کسی کا پتہ نہیں چلتا، اور ساتویں صدی کی ایک کتاب مشارق الانوار کے علاوہ یہاں کے علماء کی کوئی کتاب علم حدیث میں سامنے نہ آسکی، اور جس طرح علمائے عجم اور فقہائے ماوراء النہر

یہاں بھی علم حدیث کا چرچا تھا، دیبل، منصورہ، ملتان اور لاہور کے دینی و علمی مرکزوں میں علم حدیث کی سرگرمیاں جاری تھیں، اور بغداد، بصرہ اور کوفہ کی طرح یہ شہر علم حدیث اور محدثین کے مرکز تھے، جہاں روایت اور تصنیف کا سلسلہ جاری تھا،

خطیب بغدادی نے تاریخ بغداد میں خلف بن محمد دیبلی موازینی کے تذکرہ میں علی ابن موسیٰ دیبلی سے شہر دیبل میں روایت کی تصریح کی ہے،

.....خلف بن محمد الدیبلی	خلف بن محمد دیبلی موازینی نے کہا کہ علی
الموازینی، حدثنا علی بن موسیٰ	ابن موسیٰ دیبلی نے ہم سے دیبل میں حدیث
الدیبلی بالدیبل[1]	بیان کی،

اسی دور میں منصورہ میں متعدد علمائے حدیث درس و تصنیف میں مشغول تھے،

مقدسی بشاری نے ابو محمد منصوری کے بارے میں لکھا ہے،

ورأیت القاضی ابا محمد المنصوری	میں نے قاضی منصورہ ابو محمد منصوری
داؤدیا فی مذھبہ ولہ تدریس	کو دیکھا ہے، وہ داؤد ظاہری کے مسلک
وتصانیف وقد صنف کتبا	پر تھے، اور وہاں ان کا حلقۂ درس
عدیدۃ حسنۃ	اور تصانیف تھیں، انھوں نے کئی
	اچھی اچھی کتابیں بھی لکھی ہیں،

ابو العباس احمد بن صالح منصوری کے متعلق ابن ندیم نے تصریح کی ہے،

من افاضل الداؤدیین ولہ	وہ داؤدی مسلک کے فاضل ترین علماء
کتب جلیلۃ حسنۃ کبار منھا	میں سے تھے، اور ان کی کئی اہم، عمدہ اور

---

[1] تاریخ بغداد ج ۸ ص ۳۳۳

وبالبلد الذی هو به ماواه
وحفظه عن رسول الله صلی الله
علیه وسلم وحکموا بحکم الله
عزوجل وامضوا الامور
علی ما سن رسول الله صلی الله
علیه وسلم وافتوا فیما سئلوا عنه
مما حضرهم من جواب رسول الله
صلی الله علیه وسلم عن نظائرها
من المسائل، وجردوا انفسهم
مع تقدمة حسن النیة والقربة
الی الله تقدس اسمه لتعلیم
الناس الفرائض والاحکام
والسنن والحلال والحرام
حتی قبضهم الله عزوجل
رضوان الله ومغفرته ورحمته
علیهم اجمعین، فخلف بعدهم
التابعون الذین اختارهم الله
عزوجل لاقامة دینه وخصهم
بحفظ فرائضه وحدوده

صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوئی احادیث کو عام
کیا، اللہ تعالیٰ کے احکام اور رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے سنن جاری کیے اور رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر معاملات کو چلایا اور
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مسائل کے
جواب میں جو کچھ سنا تھا اسی کے مطابق ان
جیسے مسائل میں فتویٰ دیا، حسن نیت اور
رضائے الٰہی کے لیے عام مسلمانوں کو فرائض
و احکام اور سنن، حلال و حرام میں اپنے
آپ کو مصروف رکھا، اور اپنے اس کام
میں یہ حضرات برابر لگے رہے، یہاں تک کہ
اللہ تعالیٰ نے ان کو اٹھا لیا، پس ان کے
بعد حضرات تابعین آئے جن کو اللہ تعالیٰ
نے اپنے دین کی اقامت اور فرائض،
حدود، امر الٰہی اور رسول کے سنن
و آثار کی حفاظت کے لیے چن لیا تھا،
انھوں نے حضرات صحابہ سے احکام
اور سنن و آثار حاصل کر کے عام کیا، اس
بارے میں وہ اتقان، تفقہ اور علم کا حق

کی تصانیف نے ائمۂ احناف کی امہاتِ کتب کو بھلا دیا، اسی طرح ان کی علمی اور تصنیفی یلغار نے ہندوستان کے قدیم فقہاء و محدثین کی تصانیف کو بھلا دیا،

ذیل میں ہم ہندوستان میں علم حدیث کی ابتدائی تاریخ ایک دوسرے انداز میں پیش کرتے ہیں، جس سے معلوم ہوگا کہ دوسرے ممالک اسلامیہ کی طرح ہندوستان میں بھی علم حدیث اپنے تمام لوازم کے ساتھ رائج تھا، اور یہ نظریہ غلط ہے کہ یہاں اس فن کو کئی صدیاں گذرنے کے بعد پھلنے پھولنے کا موقع ملا،

خلافت راشدہ میں صحابہ و تابعین کی آمد خلافت راشدہ میں ہندوستان کے مقبوضہ علاقوں میں دینی علوم کا چرچا ہوگیا تھا اور اس عہد کے رواج کے مطابق حدیث کا مذاکرہ بھی جاری تھا، اخبار و احادیث کا باقاعدہ سلسلہ پہلی صدی ہجری کے بعد شروع ہوا، جبکہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کے حکم سے احادیث کو مدون کرکے ان کے صحیفے مرتب کیے گئے، اور ان کی روایت کا سلسلہ جاری ہوا، اس سے پہلے حضرات صحابہ و تابعین حسب موقع احادیث و آثار بیان کیا کرتے تھے،

اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا تو مختلف بلاد و امصار میں صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم دینی و فقہی تعلیم کے لیے روانہ کیے گئے، اور انھوں نے وہاں احادیث رسول اور شرائع اسلام کی تعلیم عام کی، جیسا کہ امام ابن ابی حاتم رازی نے تقدمۃ الجرح والتعدیل میں تصریح فرمائی ہے:

ثم تفرقت الصحابة رضی اللہ عنهم	رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرات صحابہ
فی النواحی والامصار والثغور	رضی اللہ عنہم مختلف شہروں، علاقوں اور
فی فتوح البلدان والمغازی	سرحدوں میں فتوحات، مغازی، امارت
والامارة، والقضاء، فبعث	اور قضا کے سلسلے میں پھیل گئے، اور ان میں سے
کل واحد منهم فی ناحیته	ہر ایک نے اپنے علاقہ اور شہر میں رسول اللہ

في زمن عمر رضي الله عنه وعثمان رضي الله عنه فتحوا غالب هذه النواحي ودخلوا مبا ينها بعد هذه الأقاليم الكبار مثل الشام ومصر والعراق واليمن واوائل بلاد الترك ودخلوا الى ماوراء النهر واوائل بلاد المغرب واوائل بلاد الهند[1]

حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں صحابۂ کرام نے ان اطراف کے اکثر حصے فتح کیے، اور شام، مصر، عراق یمن اور اوائل ترکستان کے وسیع و عریض اقالیم میں پہنچے، نیز یہ حضرات ماوراء النہر اوائل مغرب (افریقہ) اور اوائل ہند میں داخل ہوگئے تھے۔

ہماری تحقیق میں سندھ و مکران اور ان کے حدود میں جو صحابۂ کرام تشریف لائے ان میں سے صرف سترہ[17] کے نام و حالات ملے ہیں، جن میں پندرہ خلافت راشدہ اور دو[2] اموی دور کی ابتدا میں آئے، اس دور میں صرف نو دس تابعین کے نام مل سکے ہیں، جبکہ اس زمانے میں یہاں آنے والے صحابہ و تابعین کی تعداد اس سے کہیں زیادہ رہی ہوگی، ان میں بیشتر صغار صحابہ اور کبار تابعین کے طبقہ کے حضرات تھے، انھوں نے یہاں اس زمانہ کے طریقہ کے مطابق کتاب و سنت اور احادیث و فقہ کی تعلیم جاری کی، اس وقت تک باقاعدہ "اخبرنا و حدثنا" کا رواج نہیں تھا، بلکہ صحابہ و تابعین کی مجلسیں اور مسجدیں دینی علوم و معارف کے مدرسے ہوا کرتی تھیں، اور جب بعد میں اموی دور میں باقاعدہ احادیث کی تدوین و تعلیم کی باری آئی تو ان ہی حضرات سے احادیث کی روایت کا سلسلہ چلا۔

علمائے صحابہؓ خلافت راشدہ میں ہندوستان آنے والے صحابۂ کرام میں سے جن حضرات کے نام اور حالات معلوم ہوسکے ہیں، اُن میں مندرجۂ ذیل صحابہ احادیث و آثار اور علوم اسلامیہ

---

[1] البدایہ والنہایہ، ج ۹ ص ۸۸

وامرہ ونھیہ واحکامہ وسنن رسولہ	اداکرکے اسلام اور خدائی امرونواہی
صلے اللہ علیہ وسلم وآثارہ وحفظوا عن صحابۃ	میں اس مقام پر تھے جس پر اللہ تعالیٰ
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مانشرہ وبثوہ	نے ان کو رکھا ہے، اور ان کی شان میں
من الاحکام والسنن والآثار وسائر ما	فرمایا ہے والذین اتبعوھم الخ
وصفنا الصحابۃ بہ رضی اللہ عنھم	یعنی جن لوگوں نے حسن وخوبی کے ساتھ
فاتقنوہ وعلموہ وفقھوا فیہ	صحابہ کی اتباع کی ان سے اللہ راضی ہوا
فکانوا من الاسلام والدین	اور وہ اللہ سے راضی ہوئے،
ومراعاۃ امر اللہ عزوجل ونھیہ	
بحیث وصفھم اللہ عزوجل	
ونصبھم اذ یقول اللہ عزوجل	
والذین اتبعوھم باحسان	
رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ[1]	

اور جس طرح خلافت راشدہ میں حضرات صحابہ وتابعین نے دوسرے مفتوحہ ممالک میں کتاب وسنت کے اوامر ونواہی جاری کیے اور احادیث وفقہ کی تعلیم دی، اسی طرح ہندوستان میں بھی فرائض، سنن، احکام، حدود، حرام، احادیث، آثار، فقہ وغیرہ کی اشاعت فرمائی، ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں [illegible]سم کی فتوحات کے ذکر میں لکھا ہے کہ اس سے پہلے خلافت راشدہ میں اور اُس بلاد ہند میں صحابۂ کرام فاتح بنکر تشریف لاچکے ہیں، وہ لکھتے ہیں،

قبل ذلک قد کان الصحابۃ	سندھ میں محمد بن قاسم کی فتوحات سے پہلے ہی

---

[1] تقدمۃ الجرح والتعدیل ص ۸ و ۹

کی روایت کی ہے، ان کا شمار بھی علمائے بصرہ میں تھا، ان سے ان کے دو صاحبزادوں عبدالرحمٰن بن صحار اور جعفر بن صحار کے علاوہ منصور بن ابو منصور نے روایت کی ہے،

(۶) حضرت عبداللہ بن عمیر اشجعیؓ سے ابن وقدان نے روایت کی ہے،

(۷) حضرت عبید اللہ بن معمر قرشی تیمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ سے روایت کی ہے، اور ان سے عروہ بن زبیر اور محمد بن سیرین نے روایت کی ہے،

(۸) حضرت مجاشع بن مسعود سلمیؓ سے ابو ساسان حصین بن منذر، یحییٰ بن اسحاق، ابو عثمان نہدی، کلیب بن شہاب اور عبدالملک بن عمیر نے روایت کی ہے، ان کی احادیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں موجود ہیں،

(۹) حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور معاذ بن جبلؓ سے روایت کی ہے، اور ان سے عبداللہ بن عباسؓ، قتادب بن عمیر، ہصان بن کاہل، سعید بن مسیب، محمد بن سیرین، عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ، حسن بصری، ابولبید، عمار بن ابوعمار مولیٰ بنی ہاشم وغیرہ نے روایت کی ہے، ان سے مروی احادیث صحاح میں موجود ہیں،

علمائے تابعین خلافت راشدہ کے مقدس دور میں ہندوستان آنے والے جن تابعین کرام کے نام اور حالات معلوم ہو سکے ہیں، اُن میں متعدد بزرگ احادیث و آثار اور علوم دینیہ کے اساطین و ائمہ تھے،

(۱) حضرت حکیم بن جبلہ عبدیؒ خلیفہ بن خیاط کی تصریح کے مطابق عہد عثمانی میں عہدۂ قضاء پر مامور تھے، اور یہاں کے مسلمانوں کے جملہ امور و معاملات میں احادیث و آثار کی روشنی میں فیصلہ کرتے تھے،

کے عالم و حامل تھے،

(۱) حضرت عثمان بن ابو العاصی ثقفیؓ خیار صحابہ میں سے تھے، ابن عبد البر نے لکھا ہے کہ ان سے اہل مدینہ اور اہل بصرہ نے روایت کی ہے، جن میں امام حسن بصری زیادہ نمایاں ہیں، امام احمد نے حسن بصری کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے عثمانؓ بن ابو العاصی سے افضل کسی کو نہیں پایا ہم ان کے مکان پر جاکر ان سے حدیث کی روایت کیا کرتے تھے، ایک مرتبہ عبد اللہؓ بن بریدہؓ نے خدا کی قسم کھاکر ان کی توثیق کی ہے[1]

(۲) ان کے بھائی حضرت حکم بن ابو العاصی ثقفیؓ کے بارے میں امام بخاری نے لکھا ہے کہ ان کا شمار بصرہ کے علماء و محدثین اور رواۃ حدیث میں ہے، اور ابن عبد البر نے لکھا ہے کہ ان کا شمار بصرہ کے علماء میں ہے، بعض لوگ ان کی احادیث کو مرسل بتاتے ہیں، ابن حبان نے کتاب الثقات میں ان کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ان کا شمار اہل بصرہ میں ہوتا ہے، ان سے معاویہ ابن قرہؒ نے روایت کی ہے۔[2]

(۳) حضرت ربیع بن زیاد حارثیؓ سے مطرف بن شخیر اور حفصہ بنت سیرین وغیرہ نے روایت کی ہے، محدثین کے نزدیک ان سے کوئی مسند حدیث مروی نہیں ہے،

(۴) حضرت حکم بن عمرو ثعلبیؓ سے ابو حاجب سوادہ بن عاصم، ابو الشعثاء، وجہ بن قیس، جابر بن زید، اور عبد اللہ بن صاحب نے روایت کی ہے، صحیح بخاری میں ان سے ایک حدیث مروی ہے،

(۵) حضرت صحار بن عباس عبدیؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دو یا تین احادیث

---

[1] جمہرۃ انساب العرب ص ۲۶۶ و استیعاب بذیل اصابہ ج ۳ ص ۹۲، کتاب العلل و معرفۃ الرجال ص ۲۳۴-۲۵۵

[2] التاریخ الکبیر ج ۱ ق ۲ ص ۳۲۹، استیعاب ج ۱ ص ۳۰۶، کتاب الثقات ص ۳۹

کے قائد اور صوبوں کے حاکم صحابۂ کرام ہوا کرتے تھے، جنھوں نے براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلیم و تربیت اور دینی علوم حاصل کیے تھے، وہ اپنے حلقۂ امارت میں بیک وقت امیر و قاضی اور فقیہ و معلم سب کچھ ہوتے تھے، ایسا بھی تھا کہ انتظامی امراء و حکام اور دینی و فقہی تعلیم اور قضاء و افتاء کے لیے قاضی، امام اور معلم الگ الگ ہوتے تھے، ہندوستان میں یہ دونوں صورتیں تھیں، یہاں کے امراء و عمال میں بعض اوقات ایک ہی ذات تمام دینی امور کی ذمہ دار ہوتی تھی، اور مختلف عہدوں کے لیے الگ ذمہ دار بھی ہوتے تھے،

۴۳ھ میں ربیع بن زیاد حارثی نے سجستان اور سندھ کے علاقہ میں فرج کو فتح کیا اور ڈھائی سال تک زرنگ میں قیام کیا، اس پوری مدت میں امام حسن بصری انکے ساتھ میر منشی اور مفتی کی حیثیت سے رہے، افتاء کی خدمت حضرت جابرؓ بن زید بھی انجام دیتے تھے، ابن سعد نے طبقات میں لکھا ہے:

کان الحسن یغزو، وکان مفتی الناس ھھنا جابر بن یزید قال: ثم جاء الحسن فکان یفتی[1]	جس زمانہ میں حسن بصری جہاد میں چلے جاتے تھے، سجستان میں جابرؓ بن زید لوگوں کے مفتی تھے، اور جب حسن بصری آجاتے تھے تو وہ فتوی دینے لگتے تھے،

اس سے ان مقامات پر احادیث و آثار اور فقہ کی تعلیم و اشاعت کا سلسلہ جاری ہوا، عہد عثمانی میں سندھ میں محکمۂ قضا کا مستقل قیام ہو گیا تھا، خلیفہ بن خیاط نے اس عہد کے مختلف بلاد و امصار کے قضاۃ اسلام کی تفصیلی فہرست درج کی ہے، اسی ضمن میں لکھا ہے کہ

[1] طبقات ابن سعد ج۷، ص ۱۸۰

(۲) حضرت امام حسن بصری کی حیثیت شیخ الکل فی الکل کی تھی کم از کم ڈھائی سال تک خلافت راشدہ میں انھوں نے سجستان سے متصل سندھ و مکران کے حدود میں جہاد و غزوات کے ساتھ افتاء و انشاء کی خدمت انجام دی، اور صحابہ و تابعین کی ایک بہت بڑی جماعت سے روایت کی ہے، ابن حبان نے کتاب الثقات میں لکھا ہے کہ امام حسن بصری نے ایک سو بیس صحابۂ کرام کو دیکھا ہے،

(۳) حضرت جابر بن یزید حسن بصری سے بھی پہلے ربیع بن زیاد حارثی کی فوج میں مفتی کے عہدے پر تھے، اور سجستان کے غزوات کے سلسلے میں سندھ کے علاقوں میں بھی جہاد و افتاء کی خدمت انجام دیتے تھے، جیسا کہ ابن سعد نے طبقات میں تصریح کی ہے،

(۴) حضرت سعد بن ہشام انصاریؓ حضرت انسؓ کے چچا زاد بھائی ہیں، انھوں نے اپنے والد ہشام بن عامر، چچا انس بن مالک اور ام المومنین عائشہؓ، عبداللہ بن عباسؓ، ابوہریرہؓ، اور سمرہ بن جندب سے روایت کی ہے، اور ان سے حمید بن ہلال، زرارہ بن ابی اوفیٰ، حمید بن عبدالرحمٰن حمیری اور امام حسن بصری نے روایت کی ہے، ثقہ رواۃِ حدیث میں سے ہیں، دین و دیانت اور علم و فضل میں ممتاز مقام رکھتے تھے،

ان حضرات نے صحابۂ کرام کے بعد اس ملک میں اپنے اپنے علوم و معارف کی اشاعت کی، اور سفر و حضر، غزوات و فتوحات اور قضا و امارت میں کتاب و سنت کی شمع اس علاقہ میں روشن کی، اور فرائض، سنن، احکام، اوامر، نواہی کی تعلیم کے لیے اس دور کی ضرورت اور طریقہ کے مطابق دینی و علمی خدمات انجام دیں،

قضاء و افتاء اور احادیث و تفقہ کی تعلیم | عہد رسالت اور خلافت راشدہ میں عام طور سے فوجِ

ینھیٰ عن النھبیٰ[1]　　آپ اس طرح مال لوٹنے سے منع فرماتے تھے،

اس فرمان رسول کا سننا تھا کہ جس سپاہی نے جو کچھ لیا تھا سب واپس کر دیا، پھر آپ نے از روئے شرع مالِ غنیمت کو تقسیم کیا،

اموی دور میں علم حدیث و محدثین خلافت راشدہ کے بعد اموی دور کی ابتدا میں بھی خلافت راشدہ کی طرح امرائے فوج اور امرائے بلاد صحابۂ کرام بنائے جاتے تھے، اور غزوات و فتوحات میں ارباب علم و فضل اور اہل ورع و تقویٰ کی اچھی خاصی تعداد رکھی جاتی تھی، جس میں کبار تابعین کا عنصر غالب ہوتا تھا، ابن کثیر نے اموی خلفاء کی مجاہدانہ سرگرمیوں اور دینی خدمات کو بیان کرتے ہوئے تصریح کی ہے،

وکان فی عساکرھم وجیوشھم　　اموی دور کے غزوات میں اسلامی فوج میں
فی الغزو الصالحون والاولیاء　　کبار تابعین میں سے صلحاء، اولیاء اور علماء
والعلماء من کبار التابعین فی کل جیش　　ہوا کرتے تھے، ہر لشکر کے ساتھ ان بزرگوں
منھم شرذمۃ عظیمۃ ینصر　　کی بڑی تعداد ہوا کرتی تھی، جن سے اللہ تعالےٰ
اللہ بھم دینہ[2]　　اپنے دین کی مدد فرماتا تھا۔

اس مقدس گروہ کے افراد غزوات و فتوحات کے ساتھ اسلامی علوم و معارف کی تعلیم و تلقین کی خدمت بھی انجام دیتے تھے، اور بہت سے علماء مفتوحہ بلاد میں سکونت اختیار کر کے کتاب و سنت اور فقہ کی تعلیم میں مصروف ہو جاتے تھے، ان کے پاس مرویات و احادیث کے مدونات بہت کم ہوتے تھے، اس لیے زبانی تعلیم و روایت کی خدمت انجام دیتے تھے، بعض حضرات جن کے پاس مرویات کتابی شکل میں تھیں، تو ان کی حیثیت ذاتی یادداشت کی تھی۔

---

[1] سنن ابوداؤد [2] البدایہ والنہایہ ج ۹ ص ۸۷

اس دور میں سندھ کے قاضی حضرت حکیم بن جبلہ عبدی تھے[1]، یہ وہی بزرگ ہیں جن کو حضرت عثمانؓ نے ثغر ہند کے حالات معلوم کرنے کے لیے بھیجا تھا، عہد عثمانی کے تینوں امراء عبید اللہ ابن معمر تیمی، عمیر بن عثمان بن سعد اور ابن کندیر قشیری کے دور میں غالباً حکیم بن جبلہ عبدی سندھ و مکران کے قاضی تھے۔

یہاں کے مسلمان بعض دینی مسائل میں صحابۂ کرام اور علمائے عرب سے رجوع کرتے تھے، چنانچہ فاتح مکران عبید اللہ بن معمر تیمی نے فارس کی امارت کے زمانہ میں حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے استفتاء کیا،

انا استقررنا فلانخاف عدونا	ہم کو یہاں سکون و قرار حاصل ہے،
وقد اتیٰ علینا سبع سنین	اور اب ہمیں اپنے دشمن کا ڈر نہیں ہے۔
وولد لنا فکم صلاتنا؟	اس حالت پر سات سال کی مدت گذر چکی ہے اور ہمارے ہاں بچے پیدا ہوگئے ہیں، ایسی حالت میں ہم نماز میں قصر کریں یا پوری نماز ادا کریں؟

اس کے جواب میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے تحریر فرمایا،

ان صلواتکم رکعتان[2]	اب بھی تم لوگ دو ہی رکعت پڑھا کرو۔

فتح کابل کے موقع پر جب اسلامی لشکر مال غنیمت کی تقسیم سے پہلے ہی اس میں مصروف ہوگیا اور ایک طرح کی لوٹ مچ گئی تو حضرت عبد الرحمٰن بن سمرہ نے کھڑے ہوکر فرمایا

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے،

---

[1] تاریخ خلیفہ بن خیاط ج ۱ ص ۱۹۷ [2] اصابہ ج ۲ ص ۳۴۲ و ۳۴۳۔

سلم بن ذیال ثقہ محدث تھے، ان سے ان کے تلمیذ معتمر نے ایک مرتبہ جہاد کے بحری سفر میں سماع حدیث کیا، ابن شاہین کا بیان ہے

وکان غزا معہ فی البحر فسمع	معتمر نے سلم بن ذیال کے ساتھ بحری جہاد کیا
منہ (کتاب الثقات لابن شاہین قلمی ص ۵۳)	اور اسی اثنا میں ان سے احادیث کا سماع کیا

عمارہ بن عمیر تمیمی نے ایک غزوہ میں ایک محدث سے کہا کہ میں آپ کو پہچانتا ہوں، آپ ہمارے ساتھ امام ابراہیم تیمی کے حلقۂ درس میں بیٹھا کرتے تھے؟ انھوں نے کہا ہاں درست ہے۔ اور عمارہ بن عمیر کو تیس دینار دیے[1]

۵۰ھ میں سندھ کے غزوۂ قیقان میں حضرت سنان رضی اللہ عنہ بن سلمہ بن محبق ہذلی رضی اللہ عنہ امیر لشکر تھے، ایک موقع پر میدان جنگ میں دشمن پر حملہ کرنے کی ایک خاص تدبیر سے کام لیا، جس سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح دی، ان سے پوچھا گیا کہ آپ نے اسلامی فوج کو اس طرح حملہ کرنے کی ہدایت کس لیے دی تھی؟ انھوں نے جواب دیا،

کذلک یصنع رسول اللہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جہاد میں
صلی اللہ علیہ وسلم	اسی طرح کیا کرتے تھے،

بعد میں اس حدیث کو حضرت سنان رضی اللہ عنہ بن سلمہ سے ان کے تلمیذ حضرت ابوالیمان معلی بن راشد نبال ہذلی بصری نے روایت کی[2]

ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں احادیث کی روایت چلتے پھرتے بھی ہوتی تھی، اور باقاعدہ حلقۂ درس کے ساتھ بھی، ہندوستان میں بھی اس طرح حدیث رسول کی تعلیم و اشاعت جاری تھی،

(باقی)

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۶ ص ۲۸۸ [2] تاریخ خلیفہ بن خیاط ج ۱ ص ۲۵۰

کیونکہ پہلی صدی تک احادیث و آثار کی باقاعدہ تدوین نہیں ہوئی تھی، اور نہ اخبرنا، حدثنا کا طریقہ رائج ہوا تھا، ۴۰ھ سے ۹۹ھ تک یہی حال رہا، اس کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے دور خلافت میں احادیث و سنن کی تلاش و تدوین کے احکام جاری کیے، اور ان کے کئی مدونات و صحائف تیار ہوگئے، اور دوسری صدی کے سرے پر باقاعدہ تدوین حدیث کا رواج ہوا، اور ۱۲۰ھ و ۱۵۰ھ کے درمیان تقریباً پورے عالم اسلام میں فقہی ترتیب پر احادیث و آثار جمع کیے گئے، اس طرح اموی دور خلافت کا علم حدیث کا یہ پودا عباسی دور کی ابتدا میں پوری طرح بارآور ہوگیا، اور محدثین کرام نے اپنے اپنے مدونات و صحائف اور کتب احادیث کی باقاعدہ روایت شروع کردی۔

اموی دور میں باقاعدہ حلقۂ درس کے علاوہ محدثین اپنے اپنے دائرۂ عمل میں اپنی مرویات بیان کیا کرتے تھے اور چلتے پھرتے حدیث کی تعلیم دیا کرتے تھے، یہ طریقہ دیگر ممالکِ اسلامیہ کی طرح سندھ و مکران میں بھی رائج تھا، اس کی دو چار مثالیں ملاحظہ ہوں۔

عبید اللہ بن ایاد بن لقیط ثقہ محدث اور اپنی قوم کے عریف و ترجمان تھے، ایک مرتبہ کوفہ میں خندق کھودنے کا انتظام ان کے سپرد کیا گیا، وہ مزدوروں کی نگرانی و سربراہی کے ساتھ اپنے مجموعۂ احادیث سے ان کو حدیث کی تعلیم بھی دیتے تھے، ابن شاہین نے انکے تذکرہ میں لکھا ہے

وكان يجيئ فيحضرون قدامه	جب وہ آجاتے تو مزدور کھدائی کا کام شروع
وكانت له صحيفة فيها احاديثه	کرتے، انکے پاس ایک صحیفہ تھا جس میں انکی
فاذا جاء انسان مضى اليه	حدیثیں درج تھیں، جب کوئی شخص ان کے
بتلك الصحيفة فكتب منها	پاس آتا تو وہ اسے صحیفہ دیدیتے اور وہ اس
ما اراد وقرء عليه	میں سے جتنی حدیثیں چاہتا نقل کرکے ان سے

(کتاب الثقات لابن شاہین قلمی ص ۰۰)

ہم لوگ عرب کی آزادی کے مخالف نہیں ہیں، ہم اس علاقہ کی خود مختاری کے خواہاں ہیں، لیکن یہ آزادی خلافت کے ساتھ ہم آہنگ ہو، یہ کوئی ناقابل عمل چیز نہیں، کیونکہ عربوں اور ترکوں دونوں کا مذہب ایک ہے، اور اور دونوں مسلمان ہیں،

اس کے بعد سید حسین نے ہندوستان میں اس سلسلہ میں جو جذباتی ہیجان پیدا ہوا تھا، اُس کا ذکر یہ کہہ کر کیا کہ یہ وفد آل انڈیا خلافت کانفرنس کی طرف سے بھیجا گیا ہے، جو صرف مسلمانوں کی تنظیم ہی نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ بہت سے اہم ہندو رہنما بھی ہیں یہ ہندو رہنما اس کے ساتھ اس لیے ہو گئے ہیں کہ ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد اب انتہائی عروج پر ہے، ہندوؤں نے اسی اتحاد کے جذبہ میں محسوس کیا ہے کہ خلافت کا مسئلہ مسلمانوں سے بڑا گہرا تعلق رکھتا ہے، اسی لیے وہ مسلمانوں کے ساتھ ہیں، دس بیس برس پہلے تک برطانوی حکومت کے دور میں ہندو مسلمان ایک دوسرے سے علٰحدہ رہتے، جب انڈین نیشنل کانگریس قائم ہوئی تھی تو مسلمانوں نے اس تحریک کی مخالفت کی، لیکن رفتہ رفتہ مسلمان اس میں شریک ہونے لگے، اور اب یہ غیر معمولی صورت دیکھنے میں آتی ہے کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہیں، ہم لوگ ہندوستان کے ایک نئے دور میں داخل ہو رہے ہیں، ہندوؤں اور مسلمانوں میں میل ملاپ ہے، برطانوی امپائر میں دنیا کی سب سے بڑی مسلم طاقت آباد ہے، جزیرۃ العرب جیسے مذہبی مسئلہ کا تعلق ہندوستان کے نہ صرف مسلمانوں سے ہے بلکہ اس ملک کے اور دوسرے لوگوں

مولانا محمد علیؒ کی یاد میں

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۳)

مولانا محمد علی کی خواہش اور لائڈ جارج کی اجازت سے جب سید حسین نے تقریر شروع کی تو انھوں نے لائڈ جارج سے مخاطب ہوکر کہا کہ مولانا محمد علی عرب کے متعلق کچھ کہہ رہے تھے، تو آپ نے ان کو روک کر پوچھا "کیا آپ عرب کی آزادی کے خلاف ہیں؟" مولانا محمد علی نے جواب دیا۔ "ہاں" اس کی تھوڑی سی وضاحت کرنے کی ضرورت ہے، ہم لوگ عرب کی آزادی سے اختلاف نہیں رکھتے، لیکن امیر فیصل نے اپنی آزادی کا اعلان جس طرح کیا ہے، اس کی نوعیت سے ضرور اختلاف ہے، اسلام کی پوری تاریخ میں عرب اب تک براہ راست خلیفہ کے ماتحت رہا ہے، تاریخ اسلام میں یہ پہلی مثال ہے کہ ایک شخص نے جو خلیفہ نہیں ہے، اس ملک پر اپنا حق جتانے کی کوشش کی ہے، اس طرح مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے مذہبی پابندیوں اور اصلی حقیقتوں میں تصادم ہوتا نظر آتا ہے،

کی لڑائیوں میں ضائع ہوتی رہی، کیونکہ برطانوی فوج نے جنرل الن بائی کی نگرانی میں ایک ایسی فتح حاصل کرلی ہے کہ جس کے بعد اس سلسلہ کی لڑائی ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔ اسکے بعد وزیر اعظم کی تقریر کا متن پڑھیں :

وزیر اعظم۔ حضرات! آپ لوگوں نے اپنے معاملے کو پوری وضاحت اور اعتدال کے ساتھ پیش کیا، میں ایک حکومت کا سربراہ ہوں، اور مجھکو ایسے امپائر سے تعلق ہے، جس کے متعلق آپ نے خود ہی کہا ہے کہ دنیا کا سب سے بڑا مسلم امپائر ہے، مجھ پر یہ لازم ہے کہ اس امپائر کے کسی حصہ کی بھی رعایا جو کچھ کہے اس کی سماعت کروں جب ہم لوگ پیرس میں تھے۔ تو ہندوستان کے جو مسلمان نمایندے وہاں آئے، ان کی باتوں کو ہم لوگوں نے غور سے سنا، شروع میں ان کی نمایندگی دولایتی ہندوستانیوں نے کی، جو مسلمان تو نہ تھے لیکن اپنے مسلمان ہموطنوں کے ساتھ انصاف کیے جانے کے خواہاں تھے۔ مہاراجہ بیکانیر اور لارڈ سنہانے اس مسئلہ کو برطانوی امپائر کے وفد کے سامنے پیش کیا۔ یہ وفد برطانیہ عظمیٰ ہی کا وفد نہ تھا، بلکہ پورے امپائر کا تھا، یہ دونوں وفد میں شریک تھے، اس کے بعد مسلمانوں کا بھی ایک وفد مرتب ہوا جس میں کچھ تو برطانیہ کے رہنے والے تھے، اور کچھ ہندوستان سے آکر اس میں شریک ہوئے، اور میری خواہش پر اتحادیوں کی سپریم کونسل نے اس وفد کی باتیں سنیں، اس کونسل میں میرے علاوہ کلی مانسو، صدر ولسن، سینر اولینڈو تھے، ہم سب نے اس وفد کی باتوں کو بہت ہی غور سے سنا، انہوں نے ترکی کے معاملات اور مسلمانوں کے جذبات کو بہت ہی موثر طریقہ سے پیش کیا، میں ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ باور کرانا چاہتا ہوں کہ ان کا یہ معاملہ بہت اچھی طرح اور پوری قوت سے پیش کیا جا چکا ہے، اور اس کی سماعت برطانوی امپائر کے وفد کی

کو بھی اس سے تعلق ہو گیا ہے۔ اگر یہ مسئلہ مسلمانوں کی مذہبی امنگوں کے مطابق طے ہو گیا تو برطانوی امپائر کے ساتھ اسلام اور ہندوستان یعنی ہندوستان کے مسلمان اور ہندو دونوں ہو نگے جس کے بعد برطانوی دولت مشترکہ کو اسلامی ممالک کی بھی ہمدردی حاصل رہے گی، دنیا میں بڑے بڑے تغیرات ہو رہے ہیں، اگر ہندوستان، اسلام اور برطانیہ کا حقیقی اتحاد عمل میں آجائے تو برطانوی امپائر کا مستقبل شاندار ہو جائے گا۔

اس وضاحت کے بعد وزیر اعظم (لائڈ جارج) بولنے کے لیے کھڑے ہوئے، اس تقریر میں وزیر اعظم نے اپنی اُن تمام عیارانہ ہوشمندی اور مغرورانہ تدبر کا جوہر دکھایا جس کے لیے انگریز سیاست داں ایک سامراجی قوت کی حیثیت سے اس وقت مشہور تھے، ان کے پاس قوت تھی جس سے مدبرانہ دماغ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ اس قوت اور تدبر کے ذریعہ یورپ، ایشیا اور افریقہ کے لوگوں سے سیاست کی آنکھ مچولی کھیلتے رہے، جس کا ایک نمونہ ذیل کی تقریر ہے، اس کو پہلے غور سے پڑھ لیں۔ پھر اس کی سیاسی دھاندلیوں کا تجزیہ بعد میں کیا جائے گا۔ لیکن ناظرین کی توجہ لائڈ جارج کی ایک تقریر کے اس حصہ کی طرف دلانا ضروری ہے، جس میں انھوں نے اتحادیوں کے ایک فوجی سپہ سالار جنرل الن بائی کو خراج تحسین پیش کرتے وقت کہا تھا کہ ان کا نام ہمیشہ کے لیے اس حیثیت سے یاد کیا جائے گا کہ وہ ایک ذہین اور قابل قدر فوجی سردار بن کر صلیبی لڑائیوں کے سلسلہ کی آخری لڑائی لڑے، جس میں ان کو بہت ہی شاندار فتح حاصل ہوئی، یہ ان کی خوش قسمتی ہے کہ انھوں نے اپنی جنگی صلاحیت سے ایک ایسی لڑائی کا خاتمہ شاندار طریقہ سے کرایا جس میں یورپ کی سپہگری صدیوں سے ملوث ہوتی تھی، اب ہم اس خیال کو فراموش کر دیں کہ نسلاً بعد نسلٍ یورپ کی جنگی قوت بیکار قسم

اتحادی تھے، ہمارے ساتھ اس کا کوئی جھگڑا نہ تھا، لیکن طلعت پاشا اور انور پاشا نے ہماری راہیں مسدود کر دیں، جس سے اتحادیوں کو بلاشک وشبہہ بڑا خطرہ پیدا ہوگیا، میرا خیال ہے کہ فرانس نے بھی ترکی سے کبھی جنگ نہیں کی، وہ ترکی کا ہمیشہ دوست رہا ہے، فرانس بھی کریمیا کی لڑائی میں ہمارے ساتھ تھا، جو ترکی کی حمایت میں لڑی گئی، اس طرح ہندوستان کے مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات نہیں آنی چاہیے کہ ہم نے ترکی سے اس لیے جنگ کی کہ ہم اسلام کے خلاف ایک صلیبی جنگ لڑنا چاہتے تھے۔

ہمارے ذہن میں یہ بات بھی نہیں رہی کہ ہم دنیا کے کسی حصہ میں بھی اسلام کے خلاف لڑائی لڑنی چاہتے ہیں، جنگ کے درمیان ہم نے بار بار کوشش کی کہ اس کا خاتمہ دوستانہ طور پر ہو جائے، ہماری لڑائی ترکی سے نہ تھی، ہم تو موت و زیست کی لڑائی جرمنی اور اس کی فوجی قوت سے لڑ رہے تھے، ہم کو گہرا افسوس ہے کہ ینگ ٹرکش پارٹی نے اپنے ملک کو ورغلا کر ہم سے برسرپیکار کر دیا، مجھکو یقین ہے کہ ترکی ہم سے جنگ نہیں کرنا چاہتا تھا، میرا مطلب ہے کہ ترکی کی اکثریت جنگ کی خواہاں نہ تھی، لیکن ہم کو دکھ ہے کہ اس کے حکمرانوں نے اپنے ملک کو اس کے لیے آمادہ کیا کہ وہ اپنے پرانے اتحادی اور دوست یعنی برطانیۂ عظمیٰ سے لڑ جائے، یہ صورت حال ہے، وہ لڑنے کے لیے مصر ہوئے، انھوں نے ہمارے لیے وہ دروازہ بند کر دیا جس سے ہو کر ہم رومانیہ اور روس کی مدد کو پہنچ سکتے تھے، اس طرح جنگ کی مدت دو سال اور بڑھ گئی اب ترکی کو شکست ہو گئی ہے، جرمنی بھی ہار چکا ہے، اسٹریا کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہیں، یہ ایک امپائر تھا، اب اس کے حصے بخرے ہو چکے ہیں، اس کے علاقے علحدہ علحدہ ہو گئے ہیں، یہ کوئی مسلمان ملک نہیں ہے، عیسائی ملک ہے، اس لیے صلیبی جنگ کا

خواہش کے مطابق اتحادیوں کی سپریم کونسل نے پوری احتیاط کے ساتھ کی ہے، ہم لوگ جس فیصلہ پر پہنچے، اس کے لیے ہم نے پہلے ساری باتیں سنیں، تمام دلائل کو بڑی احتیاط کے ساتھ پرکھا، سارے واقعات سامنے رکھے، اور دنیا کے ہر خطے کے مسلمانوں کی اپیلوں کا لحاظ رکھا ہے۔

دوسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ برطانوی امپائر کے مسلمان اپنے دل سے یہ بات نکال دیں کہ ہم لوگ ترکی کے معاملے میں وہ تمام باتیں اختیار نہیں کرتے ہیں جو عیسائی ممالک کے ساتھ اپناتے ہیں، ہم لوگ تو تین عیسائی اور ایک مسلمان ملک سے برسرپیکار رہے، ہم لوگ ان میں سے کسی سے بھی لڑنا نہیں چاہتے تھے، ترکی کے حکمران تو خود ہم سے لڑنے پر آمادہ ہو گئے، ہم لوگوں کے ذہن میں یہ بات بالکل نہ تھی کہ ترکی سے بھی لڑائی لڑنی ہوگی، جہاں تک میرا مطالعہ ہے، برطانیہ نے کبھی ترکی سے جنگ نہیں کی، ہم تو ترکی کی حمایت میں دوسروں سے جنگ کرتے رہے، ہم نے تو روس کے وحشیانہ حملے کے خلاف ترکی کو بچانے کے لیے سب سے زیادہ ہولناک لڑائیوں میں سے ایک لڑائی لڑی ہے، میری مراد کریمیا کی جنگ سے ہے، ۱۸۵۴ء میں ہم ترکی کی حمایت ہی میں روس سے جنگ کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے تھے، میری یاد جہاں تک کام کرتی ہے، ہم نے ترکی سے کبھی جنگ نہیں کی، ایک دو ناگزیر واقعات ترکی کے ساتھ ضرور ہو گئے، لیکن اس سے باضابطہ کوئی لڑائی نہیں ہوئی، ہم تو ترکی کی خاطر ہی برابر جنگ کرتے رہے، لیکن جب ہم بڑی ہولناک لڑائی میں مشغول تھے، تو ترکی نے ہمارے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اس ہولناک لڑائی میں ہمارے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ ہم کو بحر اسود سے ہو کر راستہ ملے، لیکن اس راستہ کو حاصل کرنے کے لیے دو برس لڑائی کی مدت اور بڑھ گئی، ترکی نے ہمارے لیے یکایک دروازہ بند کر دیا، ہم اس کے پرانے

کیا کوئی ایسا مختلف سبب ہے جس کی بدولت ہم ترکی پر وہ اصول نافذ نہ کریں جو ہم جرمنی اور آسٹریا کے عیسائیوں پر کرچکے ہیں، میں ہندوستان کے مسلمانوں پر یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ ہم لوگ ترکی کے ساتھ جو سخت رویہ اختیار کرنا چاہتے ہیں وہ اس لیے نہیں کہ یہ مسلمان ملک ہے، ہم یہاں اُن ہی اصولوں کو عمل میں لارہے ہیں جو ہم آسٹریا میں لاچکے ہیں، جہاں عیسائیوں کی بہت بڑی آبادی ہے۔

یہ اصول کیا ہیں؟ یہ حقِ خود اختیاریت کے اصول ہیں جو ایسے امپائر میں عمل میں لائے جاتے ہیں جن سے حکومت کرنے کا حق سلب کرلیا جاتا ہے، عربوں نے آزادی کا دعویٰ کیا ہے، انھوں نے فیصل کو شام کا بادشاہ مان لیا ہے۔ وہ خواہاں ہیں کہ ان کا تعلق ٹرکش امپائر سے ختم کر دیا جائے، کیا آپ کی یہ تجویز ہے کہ عربوں کو ترکوں کی سلطنت میں محض اس لیے رہنا چاہیے کہ وہ مسلمان ہیں؟ کیا ان کو اسی قسم کی آزادی نہیں دینی چاہیے۔ جو عیسائیوں کو دی جاچکی ہے؟ کروشیا کے لوگ آزادی کے طلبگار ہوئے، ہم نے یہ آزادی ان کو دی، یہاں تو عیسائی رہتے ہیں، شام نے آزادی طلب کی، اور یہ ان کو دی گئی، یہی اصول عیسائیوں کے ملکوں میں لائے جارہے ہیں، عربوں کی خواہش نہیں ہے کہ وہ ترکی کے سلطان کے ماتحت رہیں، لیکن ان کی خواہش کے خلاف کچھ کیا گیا تو اس قسم کا رویہ ہم عیسائیوں کے ملکوں میں اختیار کرنے کو سونچ بھی نہیں سکتے۔

اب میں ایک دوسری بات کہنا چاہتا ہوں، اور وہ تھریس سے متعلق ہے، جہاں سے معلومات حاصل کرنا بہت مشکل ہے، لیکن میرے سامنے ترکوں اور یونانیوں

خیال لانا بیکار سی بات ہے، ہم اسٹریا کے خلاف صلیبی جنگ نہیں لڑ سکتے تھے، اس کو اپنی شکست کی سزا ملی ہے، اس کے پرخچے اڑ گئے ہیں، اور جرمنی کس حال میں ہے؟ ہم لوگ اس سے السس لورین لے چکے ہیں، اس سے پولینڈ بھی لے لیا گیا ہے، اس کو ہم لوگوں نے بہت ہی سخت شرائط منظور کرنے پر مجبور کیا ہے، وہ بھی عیسائی ملک ہے مسلمان ملک نہیں ہے، ہم نے ان ملکوں کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا؟ محض اس لیے کہ ہم حقِ خود ارادیت کے اصول کو ان ملکوں میں نافذ کرانا چاہتے تھے، جہاں کے لوگوں پر مظالم ہو رہے تھے، اور یہ ملک جنگ کی اشتعال انگیزی کرکے دنیا کی آزادی کو برباد کرنا چاہتے تھے، اسٹریا میں زیکوسلویک برابر کہہ رہے تھے کہ ہم اسٹریا کے ماتحت نہیں رہنا چاہتے ہیں، ہم نے ان سے کہا "بہت خوب، اسٹریا کو امپائر بننے کا حق نہیں رہا، اب ہم لوگ تم کو اس سے آزاد کرا کے دم لیں گے،" سربیا کے رہنے والوں نے بھی یہی کہا، ہم نے ان سے بھی کہا کہ بہت اچھا، سربیا میں اپنی حکومت بنا لو، ٹرانسلوینیا نے بھی یہی خواہش ظاہر کی، اور ہم نے اس خواہش کا احترام کیا، اس طرح ہندوستان کے مسلمان یہ خیال نہ کریں کہ ہم نے عیسائیوں کے ساتھ جو اصول استعمال کیے، وہ مسلمانوں کے ساتھ نہیں کیے، ہم نے ترکی کے ساتھ ظالمانہ سلوک نہیں کیا، جو اصول جرمنی اور اسٹریا کے عیسائیوں کے ساتھ برتا گیا، وہی ترکی میں عمل میں آیا،

مسٹر محمد علی انصاف چاہتے ہیں، ہم ان کو یقین دلاتے ہیں کہ ترکی کے ساتھ انصاف کیا جائیگا، اسٹریا کے ساتھ انصاف کیا گیا، جرمنی نے انصاف پایا، گویہ خوفناک قسم کا انصاف رہا، اب ترکی کو کیوں چھوڑا جائے، ترکی کو یہ خیال رہا کہ اسکو ہم سے جھگڑا ہے، ترکی کو ہم سے کیا جھگڑا تھا؟ اس نے کیوں آگے بڑھ کر اس وقت ہماری پیٹھ میں چھرا گھونپنے کی کوشش کی جب ہم موت و زیست کی لڑائی لڑ رہے تھے؟ اس طرح اس نے دنیا کی آزادی کا خاتمہ کر دینا چاہا،

لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ ترک اب اپنے دنیاوی اختیارات صرف ترکوں کی زمین ہی میں استعمال کریں گے، ان کو ایسے علاقے پر حکومت کرنے نہ دینا چاہئے جہاں ترک نہیں ہیں، کیوں؟ اس لیے کہ یہی اصول یورپ کے عیسائی ملکوں میں بھی کارفرما ہے، اور یہی اصول ترکوں کے ساتھ برتنا چاہئے،

جہاں تک آرمینیوں کے قتل کا تعلق ہے، اس میں شک کرنے کی گنجایش نہیں، مسٹر محمد علی کہتے ہیں کہ اس سلسلہ میں کوئی غیر جانب دار تحقیقات نہیں ہوئی، یہ صحیح ہے، جنگ کے زمانے میں بدترین قسم کا قتل عام ہوتا رہا، کسی نے اس کی تحقیقات نہیں کرائی، لیکن میں اس وقت پیرس میں آنے والے ترکوں کے نمایندوں کا جواب نقل کرتا ہوں، ان کا جواب تھا کہ اس زمانہ میں مجلس اتحاد و ترقی برسراقتدار تھی، اسی کے ذریعہ سے آرمینیوں کا قتل عام ہوا، لیکن اسی نے تیس لاکھ مسلمانوں کا بھی قتل کرانے کا جرم کیا ہے؛ لیکن یہ کوئی جواب نہیں، یہ سزا دینے کا سوال نہیں ہے، بلکہ اچھی حکومت کرنے کا سوال ہے، آٹھ لاکھ یونانی ہوں یا تیس لاکھ مسلمان ہوں، ایک حکومت اپنی رعایا کی حفاظت نہیں کرسکتی ہے، خواہ یہ عیسائی ہوں یا مسلمان، ان کا قتل عام ہو جائے تو پھر اس کو حکومت کرنے کا حق نہیں ہے، ہم تمدن کے مفاد کی خاطر اس قسم کے واقعات پر نگرانی کرنے اور ان کو قابو میں رکھنے پر مجبور رہیں، یہ اب بالکل صاف ہو چکا ہے کہ ترکی حکومت اپنی رعایا کو محفوظ رکھنے کے لائق نہیں رہی، اب ذرا حقائق پر غور کریں، ایشیائے کوچک میں ترکوں کی حکومت بہت زیادہ قدیم نہیں ہے، ہم گفتگو کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترک ایشیائے کوچک کے ہمیشہ مالک بنے رہے، لیکن یہ حقیقت نہیں ہے، ہماری معلومات تو یہی ہے کہ [illegible] بہت ہی بری حکومت رہی، یہ علاقہ پہلے بہت ہی مالدار تھا، اس کی دولت سے دوسرے علاقوں کو فائدہ پہنچتا رہا،

دونوں کے تیار کردہ آبادی کے شمار کے اعداد ہیں، دونوں میں بہت کم اختلاف ہے، دونوں کے اعداد شمار کے لحاظ سے تھریس میں مسلمانوں کی اقلیت ہے، اگر یہ صحیح ہے تو حق خود اختیاریت کے اصول سے تھریس کا پورا علاقہ ترکی حکومت سے علیحدہ کر دیا جائیگا، سمرنا میں بھی یہی صورت حال ہے، ہم نے ایک غیر جانبدار کمیٹی کے ذریعہ سے سمرنا کے صوبہ کی بڑی محتاط تحقیقات کرائی ہے، ہم لوگ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہاں آبادی کی بڑی اکثریت غیر ترک ہے، وہاں مسلمان ہیں لیکن وہ یونانی ہیں، جہانتک میں سمجھتا ہوں کہ یہاں کی آبادی کی اکثریت ترکوں کی حکومت کے بجائے یونانیوں کی حکومت کی خواہاں ہے،

خلافت کی دنیاوی قوت کا ایک دوسرا مسئلہ یہاں پیش کیا گیا ہے، مسٹر محمد علی اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ ایک روحانی پیشوا کی دنیاوی قوت کا مسئلہ صرف اسلام ہی کے ساتھ لاحق نہیں ہے، عیسائی دنیا میں بھی یہ ایک متنازعہ فیہ مسئلہ بنا ہوا ہے، رومن کیتھولک گرجا کے سربراہ کے دنیاوی اختیارات کے سلسلہ میں ایک نسل سے زیادہ مدت سے خوفناک تنازعے جاری ہیں، کچھ رومن کیتھولک تو دنیاوی اختیارات کے حق میں ہیں، لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو اس کے حق میں نہیں ہیں، میں اس سلسلہ میں اپنی رائے تو کوئی ظاہر کرنا نہیں چاہتا ہوں، لیکن جب پوپ کو اس کی دنیاوی طاقت سے محروم کر دیا گیا، تو اس کی روحانی قوت ویسے ہی عظیم رہی، بلکہ عظیم تر ہوگئی، میں ایسے مخلص، راسخ اور سچے مسلمانوں کو جانتا ہوں جو خلیفہ کی دنیاوی قوت سے متعلق وہ رائے نہیں رکھتے جو مسٹر محمد علی رکھتے ہیں، میری یہ معلومات اسی طرح کی ہے، جس طرح کہ رومن کیتھولک سے متعلق ہے، ان میں کچھ تو پوپ کے دنیاوی اختیارات کے قائل ہیں اور کچھ اس سے مختلف رائے رکھتے ہیں، یہ ایک ایسا متنازعہ فیہ مسئلہ ہے جس میں دخل دینا پسند نہیں کرتا ہوں۔

سلطنت پر فخر کر سکتا ہے؟

آخر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمان ان ہی باتوں پر غور کریں، جنگ کے زمانے میں وہ برطانوی تخت اور امپائر کے وفادار بنے رہے، کچھ استثنائی مثالیں ضرور ہیں، لیکن ایسی مثالیں عیسائیوں کی بھی ہیں جو مسلمان وفادار رہے اور جو نہ رہے، ان میں کوئی ایسا امتیاز برتنا نہیں چاہتا ہوں جس سے ان کو نقصان پہنچ جائے، بہت سے عیسائی بھی غیر وفادار ہوئے، اس لیے میں کوئی ایسی بات کہنا پسند نہ کروں گا جس سے محمڈن ازم پر تنقید کا اظہار ہو، ہندوستان کے مسلمان تخت اور امپائر دونوں کے وفادار رہے، ہم لوگ ان کے ممنون ہیں، انھوں نے جنگ میں ہماری مدد کی، ہم کو خوشی سے اس کا اعتراف ہے، ہم کو اس کا بھی احساس ہے کہ ان کو حق ہے کہ وہ اپنی تمام باتیں ہم سے کہیں جن کا تعلق اسلام سے ہے، ہم نے بھی ان کی باتیں سنیں اور ان کی خواہشوں کا لحاظ رکھا، اور جو فیصلہ اب تک ہو چکا ہے، اس میں ان کی خواہش کا لحاظ رکھا گیا ہے، یہ فیصلہ ہندوستان کی رائے اور خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات کو سامنے رکھکر کیا گیا ہے، لیکن ہم ایک مسلمان ملک کے لیے کوئی ایسا فیصلہ نہیں کر سکتے تھے جو اصولی حیثیت سے ان عیسائی ملکوں سے مختلف ہو جن سے ہم لوگ برسر پیکار رہے، یہی آپ لوگوں سے کہنا تھا، میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اپنے مسئلہ کو میرے سامنے بہت واضح طریقہ پر پیش کیا۔"

مولانا محمد علی لائڈ جارج کی اس تقریر کو بھلا کیسے گوارا کر سکتے تھے، ان کی آتش فشاں طبیعت تقریر کے درمیان ہی میں کیوں نہ پھٹ پڑی، یہی تعجب کی بات ہے، وہ ضبط کیے بیٹھے رہے، لیکن جب یہ تقریر ختم ہوئی تو وہ اپنی تلملاہٹ کو دبا نہ سکے، بڑی جرأت سے بول اٹھے

مولانا محمد علی۔ کیا میں ایک دو باتیں عرض کر سکتا ہوں مجھکو ترکوں کی طرف سے اعلان جنگ

لیکن اب یہ متمول علاقہ نہیں رہا، ویران اور غیر آباد ہو چکا ہے، ان باتوں کو بھی آپ سامنے رکھیں، یہاں کا کسان اپنے فارم کے لیے بہت برا ہو چکا ہے، حالانکہ یہ حصہ بحر روم کے علاقہ کے لیے زراعت کا بڑا گودام سمجھا جاتا تھا، لیکن یہ اب ایسا نہیں رہا، اس علاقہ کو اب برباد اور ویران ہوتے نہیں دیکھنا چاہیں گے متمدن دنیا کا تقاضا ہے کہ اس پر قابو پایا جائے، ترکوں کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ یہ ان کا ملک ہے، اگر وہ اس کو برباد کرنا چاہتے ہیں تو یہ ان کا اپنا معاملہ ہے، اب کسی ملک کو بھی یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ اس کا تعلق کسی نسل سے نہیں ہے، مسلمان اور عیسائی ہونے کا سوال نہیں ہے، اگر وہاں عیسائی ہوتے اور اس عظیم علاقہ کو برباد کرتے دکھائی دیتے تو پھر دنیا کے لیے وہی سارے اقدام کرنے ضروری ہو جاتے جو اب وہاں کیے گئے ہیں، اس وقت یورپ میں چیزوں کی کمی محسوس ہو رہی ہے، ہم لوگ ایک دوسرے کے لیے ضروری ہو گئے ہیں، صرف یورپ ہی کے ممالک کا نہیں ایک دوسرے پر انحصار ہے، بلکہ یورپ کا انحصار ایشیا پر اور ایشیا کا انحصار یورپ پر ہو گیا ہے ہم سب کو اسکا خیال رہتا ہے کہ بڑے علاقے بری حکومت کی وجہ سے ویران ہونے نہ پائیں، اسی وجہ سے ایشیائے کوچک میں ہم سب کا ایک مشترک مفاد ہے، اگر ترک یہاں اچھی حکومت کرتے اور اسکا اچھا نظم ونسق قائم رکھتے تو یورپ کا کوئی ملک ایسا نہ ہوتا جو ان سے یہ نہ کہتا، خدا تمھارا بھلا کرے، تم پھلو پھولو" - پھر ہم لوگ یہاں مداخلت کرنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے، بلکہ ان کو اپنے مذہب کے ساتھ یہاں ترقی کرتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوتے، لیکن میرا خیال ہے کہ یہاں ترکوں کی حکومت پر اسلام فخر نہیں کر سکتا ہے، آپ ذرا اس نقطۂ نظر سے بھی ترکی کے مسئلے پر غور کریں، کیا اسلام ترکوں کی

بحیرۂ روم کے علاقے کے لیے ایک بڑا زراعتی گودام تھا جس کو ترکوں نے اپنی بری حکومت سے برباد اور ویران کر دیا، متمدن دنیا اس کو برباد ہوتے ہوئے دیکھنا گوارا نہیں کر سکتی تھی، پھر انھوں نے یہ کیسے کہا کہ جنگ کرتے وقت ترکی ان کے ذہن میں نہ تھا، مولانا محمد علی نے اس تضاد سے فائدہ اٹھایا، اور انھوں نے

اس کا جواب اس طرح دیا:

مولانا محمد علی۔ ترکوں پر ہولناک جرائم کے الزامات رکھے گئے ہیں، اسکے معنے یہ ہیں کہ ان کے حصے بخرے اس لیے کیے گئے کہ وہ غیر روادار، خراب اور نالائق حکمراں ثابت ہوئے،

وزیر اعظم۔ ان کی حکومت نا اہل تھی،

یہ جواب سن کر مولانا محمد علی اور بھی زیادہ تلملا گئے، ان کی ملی غیرت اور ایمانی حمیت جوش میں آگئی، اور پھر بڑی جرأت سے بولے:

مولانا محمد علی۔ بہت خوب جناب عالی! تو اب میں صرف یہ کہکر اپنے اس فرض کو ادا کروں گا جو میرے لوگوں نے مجھ کو سپرد کیا ہے کہ جہاں تک ہمارے مذہبی معاملات کا تعلق ہے، ہمارے لیے ان میں کسی قسم کی مصالحت کرنا ممکن نہیں، ہمارے مذہب کا ہم پر حق ہے، جس کو پورا کرنا ہے، ہمارے جو مذہبی فرائض ہیں ان کا احترام کرنا ہمارے لیے ضروری ہے، مسلمان برابر برطانوی حکومت کے ساتھ اپنا حق ادا کرتے رہے، ہم ان مسلمانوں سے واقف نہیں جن کی استثنائی مثالوں کا ذکر آپ نے کیا ہے، جنگ کے زمانہ میں ہندوستان میں کوئی ایسا مسلمان نہیں تھا جو ہز مجسٹی کی حکومت کا وفادار نہ رہا ہو، لیکن یہ وفاداری ان کی مذہبی

کے سلسلہ میں کچھ گذارش کرنی ہے، ہم لوگ ترکی کی حمایت یا مدافعت کرنا نہیں چاہتے، لیکن ہز مجسٹی کی حکومت کے لیے یہ بات ضرور غور طلب ہے کہ ترکی کے امپائر کی جنگ صرف برطانیۂ عظمیٰ سے نہ تھی، جب اتحادیوں کا ایک عظیم معاہدہ ہوا تو ترکوں کو یہ ضرور خیال پیدا ہوا ہو گا کہ ان اتحادیوں میں ان کا سب سے بڑا قدیم دشمن روس بھی ہے، مجھکو یقین کامل ہے کہ اگر یہ جنگ صرف انگلستان یا فرانس کی ہوتی تو کوئی ترک بھی ان دونوں ملکوں سے جنگ کرنے کا خواہاں نہ ہوتا۔

اسی زمانہ میں لائڈ جارج نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ جب وہ وزیر اعظم کے عہدہ پر ۱۹۱۵ء میں فائز ہوئے تو روس، فرانس، اٹلی اور یونان سے بہت سے معاہدے ہو چکے تھے، جن سے ترکی کے حصے بخرے ہو گئے، مگر اپنے اس بیان کو نظر انداز کرتے ہوئے مولانا محمد علی کو روک کر سراسر کذب بیانی سے کام لیا، اور بولے:-

وزیر اعظم میں یہ بات بالکل واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جب جنگ شروع ہوئی تو ہم لوگوں نے کوئی سمجھوتہ روس سے نہیں کیا تھا، کوئی ایسا معاہدہ نہیں ہوا تھا، جس سے ترکی یا اور کسی کو نقصان پہنچتا، اس موضوع پر کہیں کوئی بحث و تمحیص بھی نہیں ہوئی تھی، اور میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ ہم لوگوں نے جنگ کرتے وقت کوئی پوشیدہ معاہدہ بھی کسی سے نہیں کیا تھا، اس لیے ترکی کے لیے کوئی یہ خطرہ نہ تھا کہ ہم لوگ روس سے مل کر ترکی سے جنگ کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے، ہماری لڑائی تو صرف جرمن سے تھی، ہم لوگوں کے ذہن میں بھی ترکی نہ تھا۔"

اس جواب میں جو تضاد پیدا ہو گیا ہے، اس کی طرف ناظرین کا ذہن منتقل کرانا ضروری ہے، لائڈ جارج اپنی تقریر میں پہلے کہہ چکے تھے کہ ترکی کے ماتحت ایشیائے کوچک

فلسطین میں یہودیوں کے وطن کی بنیاد رکھ دی گئی، مسوپوٹومیا کے چودھری انگریز بنائے گئے، تھریس ترکی سے نکال کر یونان کے حلقۂ اثر میں دے دیا گیا، قسطنطنیہ کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے ترکوں اور اتحادیوں میں تقسیم کر دیا گیا، ترکی کو ایشیا میں بھی اقتدار اعلیٰ نہ دیا گیا، اور اقتصادی طور پر اس کو مفلوج کرکے بیرونی ملکوں کا محتاج کر دیا گیا، اور یہ سب کچھ حق خود اختیاری کے نام پر ہوا، جس کے سب سے بڑے علمبردار لائڈ جارج تھے، اور جو ہندوستان میں آزادی کی تحریک کو کچلنے کے لیے اپنی حکومت کی ساری قوت کو بروئے کار لانے کے لیے ہمیشہ مستعد رہتے تھے،

مولانا محمد علی لائڈ جارج سے بددل ہوئے تو انھوں نے برطانوی باشندوں کے ضمیر کو جگانے کی کوشش کی، جس کے لیے ۲۳ مارچ ۱۹۲۰ء کو ایسیکس ہال میں اینگلو اوٹامن سوسائٹی کے سکریٹری مسٹر آرتھر فیلڈ نے ایک جلسۂ عام کرایا، وہ ترکوں کے بڑے دوست تھے، اور جنگ کے زمانے میں جب برطانیہ میں ترکی ایک دشمن ملک قرار دے دیا گیا تھا، تو اس وقت بھی وہ ترکوں کے ساتھ انصاف کرانے کے لیے کوشاں اور خواہاں رہے، جلسہ میں بڑا اچھا اجتماع رہا، بہت سے برطانوی شہری جمع ہوئے، ممتاز شرکا میں وفد خلافت کے ارکین کے علاوہ مارماڈیوک پکتھال، لیلینڈ بکسٹن، آرنلڈ بکسٹن، ڈگلس فوکس پٹ، بی۔ جی ہارنی مین (اڈیٹر بمبئی کرانیکل) مسز سروجنی نائیڈو، جے۔ ایم۔ پارکھ (برٹش کمیٹی آف انڈین نیشنل کانگریس)، ام۔ ٹی۔ قادر بھائی (انجمن ضیاء الاسلام بمبئی) ڈاکٹر عابد لماجد

آزادی کے ساتھ مشروط رہی، ہم پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی تھی کہ خلیفہ کی دنیاوی طاقت کے برقرار رکھنے، مسلمانوں کے مقدس مقامات پر اس کی نگرانی کو بحال اور ان پر مسلمانوں کا قبضہ تسلیم کرانے کے معاملات کو اچھی طرح پیش کریں، ہم نے وائسرائے اور مسٹر فشر کے سامنے یہ مسائل پیش کیے، آپ سے بھی یہ کہنا ہے کہ ہم اپنے ان مذہبی معاملات کو ہر موقع پر اولیت دیں گے،

لائڈ جارج اپنی فرعونیت میں کچھ جھنجلا اٹھے، اور بولے کہ اگر ہم پھر بحث و مباحثہ کرنا شروع کر دیں گے تو پوری رات ختم ہو جائے گی،

اس کے بعد مولانا محمد علی نے رسمی شکریہ ادا کرتے وقت کہا کہ آپ نے جو کچھ کہا ہے، وہ ہم اپنے ہموطنوں تک پہنچا دیں گے۔

مولانا محمد علی اپنے دلائل سے برطانوی وزیر اعظم کے کالے ضمیر کو تو نہ جھنجھوڑ سکے، لیکن اس زمانہ کے ہندوستانی اخباروں میں لائڈ جارج کی تقریر کی غلط بیانیوں کے پرخچے اڑا دیے گئے،

برطانوی مدبروں کی امتیازی خصوصیات یہ رہی ہیں کہ وہ خوبصورت سیاسی اصطلاحات اور دل فریب الفاظ کی ٹٹیوں کی آڑ میں ہر طرح کے شکار بہت ہی ماہرانہ انداز میں کھیل سکتے ہیں، حق خود اختیاری اور آزادی پر لائڈ جارج نے نظری طور پر کیسی عمدہ تقریر کر دی، مگر ان کا اور ان کے اتحادیوں کا عمل کیا رہا، وہ اس سے اندازہ ہوگا کہ مصر تو برطانوی محافظت میں آگیا، شام کو *Mandatory power* قرار دے دیا گیا، اور اس پر فرانس کی نگرانی رکھی گئی، عادلیہ پر اٹلی مسلط کیا گیا، سمرنا یونان کے حوالے ہوا،

پیدا ہو گیا ہے، جو عیسائی دنیا کو متحد کر کے دنیا کے غیر عیسائیوں پر حاوی ہونا چاہتا ہے، اور ان کے استحصال کی فکر میں لگا ہوا ہے، ان کو اس مقصد کی برآری مقدس روس ہی کے ذریعہ نظر آئی، اس میں شک نہیں کہ ان کا یہ مقصد ان کے خیال میں تو بہت عمدہ ہے، لیکن یہ برطانوی امپائر کے مفاد اور دیرپا بقا کے لیے سراسر منافی ہے، اس امپائر کی بنیاد مذہبی رواداری پر رکھی گئی ہے، لیکن آج ہم کیا دیکھ رہے ہیں، ایک طرف تو لیگ آف نیشنز اور عیسائی قومیں ہیں جو دوسروں کو برباد کرنے میں لگی ہوئی ہیں، دوسری طرف برطانوی امپائر ہے جس میں بے اطمینانی، اجنبیت اور حکومت کی بدنظمی پھیلی ہوئی ہے، جب انگلستان اپنی عظیم روایات سے منہ موڑ کر روس کا ساتھی بن گیا، اسی وقت یہ ثابت ہو گیا کہ ہم نے ترکی کے ساتھ ایک برا کھیل کھیل کر بدنامی مول لی، پورا مشرق یہ بات جانتا ہے، لیکن خود ہم کو تاریکی میں رکھا گیا، روس کے ساتھ ہمارا اتحاد برطانوی امپائر کی تمام مشرقی رعایا کے لیے اشتعال انگیز ہو گیا، اس میں ذرا بھی شک کرنے کی ضرورت نہیں برطانوی حکومت کو بھی اس کا احساس تھا، لیکن اس نے روسیوں کی حکمت عملی کو قبول کر لیا، اور اسی پر عمل کرنا شروع کر دیا، یہ حکمت عملی ٹرکش امپائر کو ختم کرنے کے لیے بنائی گئی، اسی طرح کی اور مجنونانہ اور غیر ذمہ دارانہ تجویزیں روس کے ماہرین نے مرتب کر کے ہمارے سیاستدانوں کے حوالے کیں، جن کا مقصد مسلمانوں کی قوت پر ضرب لگانا تھا، جنگ کے زمانے میں جتنا پروپیگنڈا ہوا، اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ زار کا روس قائم رہے،

(اسلامک سوسائٹی) وغیرہ تھے،

جلسہ مارماڈیوک پکتھال کی صدارت میں ہوا، وہ اینگلو اوٹامن سوسائٹی کے صدر تھے. اسلام قبول کر لیا تھا، آخر میں ہندوستان آگئے تھے، حیدرآباد دکن کے مشہور رسالہ اسلامک کلچر کے اڈیٹر بھی رہے۔ Meaning of The Glorious Quran کے مصنف کی حیثیت سے بہت مشہور ہیں، دل میں اسلام کا درد شروع سے رکھتے تھے، انھوں نے اپنے صدارتی خطبہ میں لائڈ جارج کی تقریر پر سخت نکتہ چینیاں کیں اور ان کے تمام بیانات کو سراسر غلط قرار دیا. خلاصہ یہ ہے :-

"میں دعویٰ کرسکتا ہوں کہ میں ترکوں کے مسائل پر سند کی حیثیت رکھتا ہوں، میں نے ان کا مطالعہ پچیس[۲۵] سال تک کیا ہے، لائڈ جارج نے شاید پچیس منٹ بھی ترکی کی تاریخ کا مطالعہ نہ کیا ہوگا، میں نے جب ان کی تقریر انگریزی اخبار میں پڑھی تو میری گردن شرم سے جھک گئی، یہ ایسے غلط بیانات کا مجموعہ ہے کہ کوئی بھی مستشرق ان کی تردید کرسکتا ہے (تالیاں) انگلستان اور اس کے مشرقی امپائر کے درمیان جو تعلقات قائم ہیں، ان کی باہمی محبت و وفاداری کو استوار رکھنے کی خاطر ہم لوگ برسوں سے جد و جہد کر رہے ہیں، اسلیے لائڈ جارج کی تقریر میں برطانوی باشندوں کے ذہن کی عکاسی نہیں ہے (تحسین)، روس صدیوں سے ترکوں کے مسائل میں شیطانی حرکتیں کر رہا ہے، ماضی میں انگلستان، آزادی اور ترقی کا دوست بن کر روسیوں کی شیطنت سے ترکوں کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا رہا، لیکن سیاستدانوں کا ایک گروہ اب ایسا

کے مقدس مقامات سے علیحدہ نہ کیا جائے گا، جن میں فلسطین اور مسوپوٹومیا کا ایک حصہ بھی شامل ہے، یہ مقامات خلیفہ کی نگرانی میں ہوں، اگر ان میں سے کوئی حصہ بھی علیحدہ کیا گیا، تو اس کی بازیافت کے لیے مسلمان لڑیں گے، اگر خلیفہ کی نگرانی ان علاقوں پر ہوئی تو اس کے یہ معنے نہیں کہ وہاں سے لوگوں کو مکمل خودمختاری اور اپنی حکومت آپ کرنے کا اختیار نہ ہوگا، وہ پورے وقار اور طاقت کے ساتھ اپنی حکومت وہاں کرتے رہیں گے، ممکن ہے کہ اس مطالبہ کو مہمل اور بیکار قرار دیا جائے، کیا ہم نے فلسطین اور مسوپوٹومیا کو ہندوستان اور مصر کے بغیر فتح کر لیا ہے؟ کیا ہم فلسطین اور مسوپوٹومیا کو ہندوستان اور مصر کے بغیر اپنے زیر نگیں رکھنے میں کامیاب ہو جائیں گے؟ اگر آپ عیسائی ہیں تو آپ کہیں گے کہ فلسطین آپ کا مقدس مقام ہے، اگر آپ واقعی اس کو مقدس سمجھتے ہیں تو اس کو مسلمانوں کے پاس رہنے دیں، لیکن آپ بیت المقدس میں کارخانے، سینما، ہوٹل اور قہوہ خانے چاہتے ہیں۔ تو پھر اس کو خلیفہ سے ضرور علیحدہ کر لیں، ہندوستان سے خلافت کا وفد اس لیے آیا ہے کہ آپ کو آگاہ کر دے کہ برطانوی امپائر اب خطرہ میں ہے، اس کے اراکین جو کچھ کہیں گے ان کے متعلق آپ اپنی جو بھی رائے قائم کریں، مگر ہم کو ان کی ہمت کی داد دینی چاہیے، کہ وہ سادہ طریقہ پر یہاں آئے، اور مخلصانہ طور پر ایک خطرہ سے آگاہ کر گئے، ان کے لیے بھی یہ خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ وہ کسی لمحہ بھی ہندوستان واپس جانے سے روک دیے جائیں اور غصہ سے بھری ہوئی برطانوی حکومت کے یرغمال بنے رہیں (تالیاں)

بقیہ اور وں کا جو حشر ہو، لیکن روس کے زار کا خاتمہ ہوا، تو ہر طرف اطمینان کی سانس لی گئی، ۵ر جنوری ۱۹۱۸ء کو لائڈ جارج نے جو تقریر کی تو ایسا معلوم ہوا کہ اب برطانوی حکمت عملی میں کوئی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے، ۱۹۱۹ء کے آغاز تک لوگ مطمئن رہے، لیکن لائڈ جارج جب پیرس گئے تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے وعدوں سے منحرف ہونا چاہتے ہیں، سمرنا میں فوج اتار دی گئی، قتل اور غارتگری شروع ہوئی، جس سے ایک سنسنی پھیل گئی، اس وقت سے ہندوستان کے لوگ برطانوی امپائر کی مشرقی رعایا کی حیثیت سے چیخ پکار کر رہے ہیں کہ مشرق کے مسئلہ پر اُن کی آواز سنی جائے۔ اور ان کو سب کچھ کہنے کا حق اور دوسرے جزیروں کے رہنے والوں کے مقابلے میں زیادہ ہے، انکی نمائندگی برٹش امپائر کے نمائندے ہی کر سکتے ہیں، کسی اور کو حق نہیں (تالیاں) اور وہ کیا چاہتے ہیں، صرف یہی تو کہ انگلستان اپنے وعدوں کو پورا کرے، اور اجنبیوں پر ان کے جذبات کو ترجیح زیادہ دی جائے، اگر اجنبیوں کا زیادہ خیال رکھا گیا تو ہندوستان کے لوگوں کے لیے برطانوی امپائر کی رکنیت بے معنی ہو جائے گی، ان کی نظر میں برطانوی امپائر کی کوئی قدر و قیمت نہ ہوگی، ترکی کے علاقے تھریس، قسطنطنیہ اور اناطولیہ پر ترکوں کا اقتدار اعلےٰ رہنا چاہیے، کیونکہ انگلستان نے ہندوستان کے لوگوں سے ایسا ہی وعدہ کیا تھا، ان کا ایک اور مطالبہ ہے، جس کی اہمیت لوگوں کو کم سمجھائی گئی ہے، لیکن اس سلسلہ میں بھی انگلستان کا وعدہ تھا، اور وہ یہ کہ خلافت کے مسئلہ میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے گی، اور خلافت کا سوال مسلمانوں

کیا اسلامی قانون رومی قانون کا مرہونِ منت ہے

(پروفیسر فٹز جیرالڈ)

ترجمہ پروفیسر محمد حمید اللہ، پارس

یہ مضمون اس حیثیت سے بہت اہم ہے کہ اس میں خود ایک یورپین فاضل نے اس مشہور اعتراض کا کہ "اسلامی قانون رومن لا سے ماخوذ ہے" بڑا محققانہ اور مدلل جواب دیا ہے، جیسا کہ فاضل مترجم نے لکھا ہے کہ اصل مضمون کی عبارت اتنی پیچیدہ ہے کہ ترجمہ میں بھی اس کا اثر ہے۔ راقم نے اس میں سلاست پیدا کرنے کی کوشش کی ہے پھر بھی اس کی ژولیدگی پوری طرح دور نہ ہو سکی۔

"م"

رسالہ معارف جنوری ۱۹۵۳ء اور مارچ و اپریل ۱۹۵۸ء میں اطالوی پروفیسر نالینو (Nallino) اور فرانسیسی مستشرق بوسکے (Bousquet) کے خیالات کا ترجمہ مندرجہ عنوان کے موضوع پر پیش کیا جا چکا ہے، کلیۃ الشریعۃ مکہ معظمہ کے فاضل استاد ڈاکٹر محمد مصطفی الاعظمی نے میری توجہ ایک اور مضمون کی طرف منعطف کرائی ہے، ان کے دلی شکریہ کے ساتھ آج اس کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے مؤلف فٹز جیرالڈ (S.V. Fitzgerald) لندن یونیورسٹی کے مدرسۃ السنۃ شرقیہ میں استاد تھے، جن کا یہودی النسل رہا ہونا بیان کیا جاتا ہے، لندن کے سہ ماہی رسالہ "قانون" (Law Quarterly Review) جنوری ۱۹۵۱ء کے شمارے ص ۸۱ تا ۱۰۲ پر

مارماڈیوک پکتھال کی اس تقریر کے بعد مولانا محمد علی مجمع کو مخاطب کرنے کے لیے کھڑے ہوئے، انھوں نے باتیں تو وہی کہیں جو رائٹ آنریبل فشر اور لائڈ جارج کے سامنے کہہ چکے تھے، مگر کہنے کا انداز بدلا ہوا تھا، پہلے انھوں نے برطانوی حکومت کو مخاطب کیا تھا، اب اُن کا تخاطب برطانیہ کے باشندوں سے تھا، ان کو قائل کر کے ان سے ہمدردی حاصل کرنا آسان کام نہ تھا، وہ اپنے ملک کے اندر تو انتہا درجے کے جمہوریت پسند ہوتے ہیں، ایسے کہ ان سے پارلیمانی جمہوریت کا سبق ساری دنیا حاصل کرتی رہی ہے، لیکن وہ اپنے ملک سے باہر نکل کر انتہا درجے کے سامراجیت پسند ہو جاتے ہیں، مولانا محمد علی نے جس زمانہ میں ان کو مخاطب کیا تھا، اس وقت یہ برطانوی باشندے ایشیا اور افریقہ کے بڑے حصے کو اپنے زیرنگیں رکھکر وہاں کے باشندوں کو اپنا غلام بنائے ہوئے تھے، اس غلامی کے امپائر پر ان کو فخر تھا، اس پندار کے ساتھ جمہوریت کے بھی حامی اور دوست بنے ہوئے تھے، مولانا محمد علی انگریزوں کے اس مزاج سے واقف تھے، اس لیے ان کی مزاجداری کرتے ہوئے اپنی خطابت کا جوہر دکھایا جسکا لطف تو ان کی اصل انگریزی تقریر ہی کو پڑھ کر اٹھایا جا سکتا ہے، کہ کس طرح اس زبان کی نوک پلک پر قدرت رکھتے ہوئے اپنے سامعین کے جذبات کو اپنے مطابق بنانے کی کوشش کی، اردو ترجمہ میں وہ لطف حاصل نہ ہو سکے گا، لیکن اس کے مطالعہ سے مولانا کے سینہ کی انگیٹھی میں جو آگ سلگ رہی تھی وہ تو ہمارے ناظرین کے سامنے ضرور روشن ہوتی نظر آئیگی، اور بہت سے سیاسی معلومات بھی حاصل ہو جائیں گے، جو اس وقت تک فراموش ہو چکے ہیں، ان تقریروں کو یہاں پر پیش کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ یہ محفوظ ہو جائیں، ورنہ کہیں طاق نسیان کے نقش ونگار نہ بن جائیں۔

(باقی)

رومی قانون کی مدد سے انجام دی جا سکتی ہے، لیکن ابتک کسی نے اس مسئلے کا جامع مطالعہ نہیں کیا ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ اس کے لیے کسی ایک تنہا اہل علم کی تحقیقات کافی نہیں ہو سکتی، کیونکہ اس کے لیے نہ صرف قانون اور تاریخ کا گہرا مطالعہ کرنا ہوگا، بلکہ بہت سی کثیر زبانوں کے جاننے کی بھی ضرورت ہو گی،[1] دیگر شعبہائے علم کی طرح یہاں بھی ایک اکیلا محقق صرف یہ کر سکتا ہے کہ عمارت کی تعمیر میں اپنی پرت بھی لگا دے، یا ضرورت پر اپنی کدال کی مدد سے سابقہ تعمیرات کے مناسب حصے کو منہدم کر دے، پھر بھی زیر بحث موضوع کا معمہ برقرار رہتا ہے، فون کریمر[2] اور سانتیلانا[3] نے چند عمیق ملاحظات ضرور پیش کیے ہیں، لیکن تحقیقات میں کوئی منظم پیش روی نہیں کی ہے، قابل ترین اہل قلم میں سے بعض کا طریق عمل بھی یہ رہا ہے کہ مشابہت والے احکام کی ایک فہرست مرتب کر ڈالیں، جن میں بعض وقت واقعی مشابہت ہوتی بھی ہے، تو علی العموم سطحی، بلکہ اکثر تو خیالی اور فرضی، پھر یہ دعویٰ کریں کہ یہ مشابہتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ متاخر زمانے کا نظام قانون اپنے سے قدیم تر نظام قانون کا مدیون (اور مرہون منت) ہے، زیر نظر مسئلے سے بحث کے اس غیر علمی طریقے میں اگر مدد لی بھی جاتی ہے تو غیر تاریخی، اور غیر ثابت شدہ اوصاف [یا امور] کو ثابت شدہ قرار دیتے اور اپنے مفروضات

[1] نہ معلوم یہ اشارہ کس چیز کی طرف ہے، اسلامی قانون کے لیے عربی، اور رومی قانون کے لیے لاطینی اور ایک حد تک یونانی کا جاننا کافی ہے" (مترجم) [2] فون کریمر کی جرمن کتاب "زمانۂ خلفا میں مشرق کی ثقافتی تاریخ" Von Kremer, Culturgeschichte des Orients unter den Chalifen مطبوعہ ویانا (آسٹریا) ۱۸۷۵ء تا ۱۸۷۷ء، انگریزی ترجمہ از خدا بخش، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۲۰ء۔ (مؤلف) [3] سانتلانا کی فرانسیسی کتاب "تونسی اسلامی قانون کے مجموعے کا مسودہ، مطبوعہ ۱۸۹۷ء کا مقدمہ Santillana Avant-Props d'un projet de code de droit musuman tunisien نیز بار بار اس کے دیگر نشریات میں۔ مؤلف

اس کا ایک مضمون شائع ہوا ہے، جس کے انگریزی عنوان The alleged debt of Islamic to the Roman law کا لفظی ترجمہ ہوگا: "اسلامی قانون کی مزعومہ مدیونیت رومی قانون سے" میں ایک تتمے کا بھی وعدہ ہے، جو بہ ظاہر شائع نہیں ہوا، مؤلف کا اسلوب بہت ژولیدہ ہے، جس کا اثر ترجمہ میں بھی ہے، اس مقالے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اسلامی قوانین پر رومی تاثیر کے مدعیوں کا جواب دیا گیا ہے، اور جہاں حاشیے میں مترجم نے اپنی رائے ظاہر کی ہے، اس میں لفظ "مترجم" لکھ دیا ہے یا قوسین میں کر دیا ہے،

رسالے کے اڈیٹر سے ترجمے کی اجازت مانگی تھی، اس کے جواب میں خاموشی رہی، جسے عدم ممانعت سمجھتا ہوں، ترجمہ کئی سال سے تیار تھا، اب رمضان ۱۳۹۲ھ میں صاف کرنے کی نوبت آئی،

مقدمہ (۱) سر ولیم میکناٹن[1] (Sir William Machnaghten) بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ خود سر ولیم جونز[2] (Sir William Jones) کے زمانے سے لیکر آج تک رومی اور اسلامی قانون کے مابین جو پہلو بچانے والی مشابہت نظر آتی ہے، اس پر وقتاً فوقتاً توجہ منعطف ہوتی رہی ہے، خاص کر کوئی انگریز وکیل، جسے طلبہ کو اسلامی قانون کا درس دینے کی ضرورت ہو، اس کا احساس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اسلامی قانون کی توضیح و تمثیل انگلستان کے قانونی تصورات کے مقابلے میں کتنی زیادہ صفائی کے ساتھ

[1] اس کی کتاب Principles and Precedents of Mohammedan law (یعنی اصول و نظائر قانون محمدی) کلکتہ ۱۸۱۷ء میں، (مولف)، [2] اسکی کتاب Essay on Bailments (یعنی رہن پر مقالہ) مطبوعہ ۱۸۰۷ء میں۔ (مؤلف)

قسمت کی ستم ظریفی ہے کہ جس موضوع میں وہ سند مانا جاتا تھا، عرصہ ہوا علم کی موج اسے پیچھے چھوڑ کر اس کے پاس سے گزر چکی ہے، اور اب وہ یاد کیا جاتا ہے تو اس بدبختانہ دخل ہی کی بنا پر جو اس نے ایک ایسے موضوع میں کیا تھی، جس سے اسے بالکل ہی واقفیت نہ تھی، اس کی یہ خیال آرائی اس کی انگریزی کتاب "رومی قانونِ مدنی" Roman Civil law (جلد دوم صفحہ ۴۰۶ تا ۴۱۴) میں ملے گی، اس میں جو بہت سی فرضی چیزیں ہیں، اس کا اندازہ صرف ایک مثال سے ہو جائے گا، قانون روما میں ایک لاطینی قاعدہ ہے کہ "جو بات حکمراں کو پسند آئے وہ قانون کی تاثیر رکھتی ہے" (Quod principi placuit legis habet vigorem) اس کی مماثل چیز کی [اسلامی قانون میں] تلاش نے اسے بھٹکا دیا، اور اس نے یہ دعویٰ کر دیا کہ خلفاء کے احکام ہی اسلامی قانون کا اصل ماخذ ہیں، اگر وہ اس کو اسلامی قانون کی ایک متاخر شاخ تک جسے عام طور پر "عثمانی ترکوں کا قانون" کہا جاتا ہے، محدود رکھتا تو وہ ایک حد تک ــــ اور صرف ایک حد تک ہی ــــ درست ہوتا، مگر ایک ایسے نظام قانون کے متعلق، جو صرف خدا کی ذات کو قانون کا واحد ماخذ سمجھتا ہو، اور اس سے منکر ہو کہ کسی انسانی اقتدار کو بھی قانون سازی کا حق ہے، مذکورۂ بالا ادعا، حقیقت حال کے بالکل برعکس ہے، پہلے چار خلفاء [راشدین] کے جو فیصلے مذکور ہوئے ہیں، ان کی قانونی قدر و قیمت اس لیے نہیں ہے کہ وہ خلیفہ [صدر حکومت] تھے، بلکہ اس بنا پر کہ وہ پیغمبر اسلامؐ کے قریبی ساتھی رہے تھے، اور اس کا امکان تھا کہ وہ حضرت پیغمبرؐ کے ذہن [خیالات] سے واقف ہوں، اور اسی لیے ثانوی حیثیت میں سہی، ربانی ہدایت کی پرچھائیں سمجھے جائیں، دوسرے صحابۂ نبیؐ کے فیصلوں [فتووں] کا درجہ بھی یہی ہے،

اور اس کے نتیجے میں جو بیان ہمارے سامنے پیش کیے جاتے ہیں وہ کچھ اس طرح کے ہوتے ہیں کہ "قانونِ محمدی اصل میں جسٹی نین (Justinian) کا رومی قانون ہی ہے، عرب لباس میں ہے"، یا جیسا کہ ایک اجڈ اہل قلم نے لکھ مارا ہے کہ "عربوں نے رومی قانون میں چند اغلاط کے سوا اور کسی نئی چیز کا اضافہ نہیں کیا"، اس لیے بحث کو قابل اطمینان راستے پر چلانے کے لیے اولین ضرورت یہ ہے کہ پہلے زمین ہموار کی جائے تاکہ نئی بنیادیں رکھی جاسکیں ۔

(۲) جو رائے عام طور پر مقبول ہے اس کے اصل ذمہ دار تین شخص ہیں: پروفیسر شلڈن آموس (G. Shelden Amos)، سوّاس پاشا (Savvas Pasha) اور مشہور ماہر عربیات گولٹ سیہر[1] (Golzeher)۔ ان میں سے شلڈن آموس (۱۸۳۵ء تا ۱۸۸۶ء) دیکھو انگریزی قومی سوانح عمریوں کی قاموس (Dictionary of National Biographies) کا ضمیمہ، جلد اول صفحہ ۴۴) غالباً اپنے زمانے کا سب سے ممتاز انگریز سولیئن (رومی قانون مدنی کا ماہر) تھا، اور اصولِ قانون پر اپنی ایک تالیف کی بنا پر اسے سوائنے[2] انعام (Swiney) بھی ملا تھا،

---

[1] اس کے نام کا صحیح تلفظ گولٹ سیہر ہے، گولڈ زیہر غلط ہے (مترجم)۔ [2] سوا سو سال عرصہ ہوا سوائنے ایک مالدار مجنون گزرا ہے (جو غالباً یہودی تھا) بیماری اور جوشِ جنون کی حالت میں اس نے ایک وصیت نامہ لکھ کر انگلستان کی انجمن فنون لطیفہ کے دفتر کے دروازے پر چپکے سے ڈال دیا، خط کھولا گیا تو ایک وصیت ملی، کہ اس کی ساری جائداد قانون کی عمدہ تالیفوں پر انعامات دینے میں صرف کی جائے، چونکہ سوائنے کا انتقال ہوچکا تھا، اس لیے انجمن فنون لطیفہ نے جائداد تو حاصل کر لی لیکن انعام کا فیصلہ ملک کے مشہور اہل قانون کی مدد سے کرایا جاتا ہے، اس لیے اسے قانونی کتابوں کا "نوبل پرائز" قرار دیا جاسکتا ہے، (مترجم)

اس کے قلم سے اس بارے میں نکلی ہوئی دلیلیں، جن کو بڑی شہرت ہے، ایسی ہیں، جن کو خود اس نے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی، اور وہ اس مقالے کے اساسی رجحان کے بھی خلاف ہیں، کیونکہ گولٹ سیہر کے دوسرے بہت سے نشریات کی طرح، اس مقالے کا مقصد بھی اس پر زور دینا ہے کہ اسلامی تمدن اصولاً ایک عربی چیز ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ [رومی قانون کے اثرات کے متعلق] اپنے ان خیالات کو خود گولٹ سیہر نے اپنی بعد کی زیادہ پختہ تالیفوں میں ترک کر دیا تھا۔ ان ہی تینوں مؤلفوں کے دلائل پر غور کیا جائے گا۔

(۵) جو مؤلف مروجہ غلط خیالات ہی کو عام طور پر باور کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، ان میں حسب ذیل لوگ شامل ہیں: (۱) آیون (Amos) جس نے مجگین لا ریویو (Michigan law Review) (ج ۲، ص ۴۴ تا ۶۲، ۱۹۰ تا ۲۱۴، ۳۲۱ تا ۳۹۶) میں انگریزی میں ایک مقالہ لکھا ہے۔ (آیون نے اگرچہ بعض نئی چیزیں بھی پیش کی ہیں لیکن اس کے ہاں بھی یہی رجحان ہے، کہ واقعات کو توڑ موڑ کر پیش کیا جائے (تاکہ اس کے دعوے کے مطابق ہو سکیں)

(۲) شرمان Sherman کی انگریزی کتاب "رومی قانون جدید دنیا میں" (Roman law in the modern world) (طبع سوم، ص ۱۳۹ نیز ۸، ۱ تا ۱۸) ان کے ساتھ محمد اللہ M. Ullah کی انگریزی کتاب "مسلمان قانون نکاح پر مقالہ" Dissertation on the Muslim law of Marriage (مقدمہ ص ۴۶ و مابعد)، سکسینہ کی انگریزی تالیف "اسلامی قانون" Saksena، Muslim law ۱۹۳۷ء ص ۱۰۵ تا ۱۰۸)، میکڈانلڈ Macdonald (دیکھو اس کی انگریزی کتاب[۱] "اسلامی الہیات، اصول قانون اور نظریہ دستوری

[۱] اس کتاب کے آخری دو باب کا اردو ترجمہ اس ناچیز نے کیا تھا، جو حیدرآباد دکن کے ماہنامہ "روح ترقی" میں "اسلامی اصول قانون اور نظریۂ دستوری کا ارتقا" کے عنوان سے بالاقساط دسمبر ۱۹۴۵ء سے جولائی ۱۹۴۶ء تک چھپتا رہا (مترجم)

(۳) سنوا سن پاشا عثمانی [ترکی] سلطنت میں ایک ممتاز عیسائی افسر گزرا ہے،
معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ وہ پاشا کے رتبے پر فائز ہو چکا تھا، اس لیے اسے
اسلامی قانون اور ایشیائے کوچک کی تاریخ کا بھی ماہر رہا ہونا چاہیئے، اور یہ مشکل ہی سے
کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان مسائل میں جاہل مطلق تھا، اس لیے جب وہ اپنے ہمعصر زمانے کے
ترکی انتظام مملکت کے متعلق کچھ لکھتا ہے تو اس کے بیانات کو اس سے زیادہ اہمیت
دی جانی چاہیے جتنا کہ اب تک ہوتا رہا ہے، لیکن اس شخص کا دماغ غیر عالمانہ اور
غیر صحیح تھا، اور اس نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ایک سیاسی غرض کے مدنظر تھا، جیسا کہ خود اس نے
[فرانسیسی] میں لکھا ہے کہ "مغربی قانون کو مسلمان بنایا جائے" (Islamiser le
droit occidental) اور وہ اسکے لیے اپنے ہموطن مسلمانوں کو یہ باور کرانا چاہتا
تھا کہ اسلامی قانون ہمیشہ سے مغربی اثرات کو اتنا ہی قبول کرتا رہا جتنا سنوا سن پاشا
چاہتا تھا، اس لیے اگر کسی قانونی یا تاریخی واقعے کو تھوڑی سی تبدیلی کے بعد اپنے دعوے
کی دلیل بنایا جا سکتا ہو تو وہ اغلباً پوری دیانتداری کے ساتھ یقین کر لیا کرتا تھا کہ
مرممہ واقعہ ہی حقیقت ہے،

(۴) اگناتس گولڈ سیہر (۱۸۵۰ء تا ۱۹۲۱ء) عربی کے ماہر ترین لوگوں میں
سے ایک تھا، لیکن رومی قانون میں اس کی مہارت اس درجے کی نظر نہیں آتی، بہرحال

(حاشیہ ص ۵۹ سے) خلفائے راشدینؓ اور دیگر فقیہ صحابہ کے متعلق یہ بیان صحیح نہیں، انھوں
نے قرآن و حدیث کی تعبیر و استنباط سے قانونی احکام بیان کیے اور قرآن کے سکوت کی صورت میں (حدیث معاذؓ
میں رسول اکرم کی دی ہوئی اجازت ہی کی بنا پر) قیاس و اجتہاد سے کام لیا ہے، صحابہ میں باہمی علمی اختلاف رائے
بھی رہا ہے، جو مولف کے مفروضے کی تردید کرتا ہے۔ (مترجم)

یوحنہ[۱] (John The Eunuch) بھی، لیکن ان کا ایک تاریک پہلو بھی رہا ہے، اور [اسی وقت سے] آنے والی تباہی کے آثار نظر آنے لگے تھے، مغرب (یعنی رومی) [illegible] نے صرف ایک عارضی پردے کا کام دیا تھا کہ ٹیوٹانی [illegible] (Teuton) [illegible] اس حد تک بزنطینی سلطنت کی آقائی کو تسلیم کرلیں، ورنہ حقیقت میں وہ ان سرسبز علاقوں کے مالک بن گئے تھے جن پر انھوں نے قبضہ کیا تھا، اس سے شہنشاہ کے خزانے کی مشکلوں میں اضافہ ہو گیا تھا، اور مشرقی [بزنطینی] عوام کو کچل دینے والے محصولوں [illegible] برداشت کرنا پڑا، جسٹی نین کے جدید احکام (Novellae) کا ایک طویل [illegible] اس بات کا شاہد ہے کہ قرضوں کی کثرت بھی ایک ایسا مسئلہ بن گیا تھا جس پر فوری توجہ کی ضرورت تھی، گول میدان (Circus) [کھیل کود کا میدان] [illegible] جو طبقہ وار [illegible] برپا ہوتی تھیں وہ بھی اس بات کی علامت تھیں کہ جسد مملکت کی کوئی چیز بھی ٹھیک حالت میں نہ رہ گئی تھی، (اگرچہ اس کی تعبیر آسان نہیں) یہ [illegible] قسطنطنیہ کے گندے محلوں کے باشندوں کی حد تک ہی محدود نہ تھیں، بلکہ بزنطینی سلطنت کے ہر شہر میں پائی جاتی تھیں، حتیٰ کہ یروشلم [بیت المقدس] جیسے مقدس شہر میں بھی، اور مذہبی فرقہ واریت سے معیار اخلاق اتنا پست ہو چکا تھا کہ الہیاتی مباحث کے سلسلے میں مخالف پارٹی کے خلاف یہ خونریز ہنگامے کرائے جاتے تھے، خود شہنشاہ جسٹی نین بھی تنگ نظری کی طرف مائل تھا، اور آرتھوڈکس فرقے کا [بزنطینی] کلیسا دوسرے (بدعقیدہ) عیسائی فرقوں اور غیر عیسائی مذہبوں کے متعلق جو رجحان رکھتا تھا وہ عام طور پر

---

[۱] غالباً یہ بھی جسٹی نین کا کوئی کارندہ تھا، اس نام کا ایک راہب بھی گزرا ہے جس کو نہ قسطنطنیہ سے تعلق ہے اور نہ جسٹی نین سے (مترجم)

کا ارتقاء Development of Muslim Theology, Jurisprudence and Constitutional Theory (ص ۸۵ اور طیب جی (دیکھو ان کی انگریزی کتاب "قانون محمدی" Tyabji, Muhammedan law طبع سوم ص ۸۲)

جن کو عالمگیر قدر و شہرت حاصل ہے، اس کے متعدی اثر سے پوری طرح بچ نہ سکے۔

۲۔ تاریخ (۲) جسٹی نین کے مجموعۂ قوانین (Corpus juris of Justinian) کے نفاذ (۵۲۹ء تا ۵۳۳ء) اور پیغمبر اسلام حضرت محمد صلعم کی وفات (۶۳۲ء) کے ابین جو صدی گزری ہے وہ انسانی تاریخ کا سب سے بدقسمت زمانہ ہے، ہم لوگ [دو عالمگیر جنگوں کے زمانے میں] دو مرتبہ تباہی کے دہانے تک پہنچ چکے تھے، اور اب [۱۹۵۱ء میں] ایک عظیم تر تباہی کے کنارے جی رہے ہیں، اس لیے ہم لوگ مذکورۂ بالا صدی کی بدبختیوں کو اپنے آبا و اجداد کے مقابلے میں — جن کے شاندار زمانے میں شلاڈن آموس، سر آس پاشا، اور گولٹ میہر نے اپنی کتابیں تالیف کی ہیں — زیادہ بہتر سمجھ سکتے ہیں، یہ صحیح ہے کہ مذکورہ صدی دو ایسی حکمرانیوں سے شروع ہوئی تھی، جن کی شان و شوکت افسانوی اور ضرب المثل بن چکی ہے، یعنی مشرقی رومی [بیزنطینی] سلطنت میں جسٹی نین، اور ایران میں آنوشیروان عادل کی فرمانروائی، جسٹی نین کے نام سے ہمیں نہ صرف اس کا مجموعۂ قوانین یاد آتا ہے، بلکہ آیا صوفیا[۱] کی تعمیر، بیلیزاریس[۲] (Belisarius) کی فتوحات، نرسی[۳] (Narses) اور خواجہ سرا

---

[۱] آیا صوفیا شروع میں ایک کنیسہ تھا۔ جسٹی نین نے اس کو توڑ کر وہاں ایک عیسائی گرجا بنایا جس کی عمارت آج تک استانبول میں باقی ہے، سلطان محمد فاتح نے اسے خدائے واحد کی عبادت کے لیے مختص کیا تھا۔ کمالی دور میں اس مسجد میں نماز بند کر کے سیاحوں کے دیکھنے کی تفریح گاہ قرار دیا گیا (مترجم) [۲] جسٹی نین کی فوج کا ایک جرنیل جس نے اٹلی وغیرہ کو فتح کیا تھا (مترجم) [۳] جسٹی نین کا خواجہ سرا اور اس کی فوج کا ایک جرنیل جس نے ایران سے جنگ میں نمایاں حصہ لیا تھا (مترجم)

(۷) جسٹی نین کی ضعیفی اور وفات پر اس کی چمک دمک کم ہوگئی اور اس دور کے تاریک تر پہلو زیادہ نمایاں ہوگئے، ایران کی تاریخ کو بھی انوشیرواں کی وفات کے بعد ایسی ہی افسوسناک صورتِ حال پیش آئی، ان دونوں سلطنتوں نے اپنے کو مجبور پایا کہ بیرونی وحشی حملہ آوروں کے خلاف مدافعت کے لیے مسلسل 'خرچیلے' اور چوڑ چوڑ کردینے والے انتظامات کریں، (رومی سلطنت کے حدود پر صقلبی Slavs، آوار (Avars) خزر (Khazars) اور برجان (Bulgars) یعنی روس میں دریائے والگا پر بسنے والے قبائل کے، اور ایرانی سرحد پر منگولیوں کے حملے مراد ہیں) اسی طرح یہ دونوں سلطنتیں اندرونی ظلم و ستم اور بار بار کی خانہ جنگیوں کے باعث پارہ پارہ ہوگئی تھیں، ان سب کے باوجود ان دونوں کا باہمی حسد ختم نہ ہوا، اور انکی کشمکش کی آگ صدیوں تک سلگتی اور جلا کر راکھ کرتی رہی، لیکن زیر بحث (اسلام کے عین پہلے کا زمانہ معمول سے زیادہ خون آشام رہا، کیونکہ اس [صدی] میں بمشکل بیس سال برائے نام صلح رہی: ۵۳۱ء کی نام نہاد "ابدی دوستی اور حلیفی" صرف سات برس قائم رہی، اور ۵۶۱ء کی زیادہ متواضع نام ولی "پچاس سالہ صلح" بھی مختصر عرصہ تک باقی رہ سکی، یہ جنگیں بھی محض فوجی جھڑپیں نہ تھیں، بلکہ ہمہ گیر لڑائیاں تھیں، ایرانیوں نے دوسرے شہروں کے ساتھ انطاکیہ کو ۵۴۰ء اور ۶۱۱ء میں، قیساریہ کو ۶۱۲ء میں، دمشق کو ۶۱۴ء میں، یروشلم کو ۶۱۴ء میں اور اسکندریہ کو ۶۱۵ء میں جلا کر خاک کر دیا، دیہاتی رقبے بھی اسی طرح تاراج کیے گئے، پھر جب رومی (بزنطینیوں) کو موقع ملا تو انھوں نے بھی اسی طرح کا برتاؤ کیا، اس میں شک نہیں کہ تباہ کاری کے وسائل اس زمانے میں اس سے کم تھے، جتنے آج ہیں، لیکن تعمیر جدید کے وسائل بھی ویسے

عدم رواداری کا تھا، اگرچہ اس نے وہ ظالمانہ ایذا رسانی نہیں کی جو کبھی کبھی ایران میں نظر آتی ہے۔[1] تاریخی بیانات کے مطابق اثینہ (ایتھنس) کے مدارسِ فلسفہ کے باقیات صالحات کا معیار کتنا ہی پست کیوں نہ ہو گیا ہو مگر یہ واقعہ کہ جسٹی نین نے ان کی اصلاح کی کوشش کرنے کے بجائے ان کو سرے سے بند کرا دیا، ہماری ناچیز رائے میں اس حکمراں کے دور کے ثقافتی معیار کی بلندی نہیں ظاہر کرتا۔ ان [مدارس کو] خسرو [کسریٰ] کے تحت ایک نئی زندگی ملی، اور ایران میں پناہ گزیں [یونانی فلسفیوں] سے مسلمانوں نے افلاطون اور ارسطو کا نام سنا تھا،[2]

---

[1] ایران میں عام طور پر مذہبی رواداری برتی جاتی تھی، مذہبی ایذا رسانی ایک بیماری تھی جو صرف کبھی کبھی وہاں پھوٹ پڑتی تھی، مگر ایسے موقع پر وہ شدید ہوا کرتی تھی۔ (مؤلف) "یہ اس امر کی جانب اشارہ ہو سکتا ہے کہ جب قباذ کے زمانے میں مانی کے مذہب نے اباحیت پھیلائی اور زردشتیت سرکاری مذہب نہ رہا تو اس کے جانشین انوشرواں نے بزورِ تیغ اباحیت کا قلع قمع کیا، اور دوبارہ زردشتی مجوسیت پھیلائی لیکن مؤلف مقالہ کے یہودی النسل ہونے کی بنا پر گمان غالب یہ ہے کہ یہ بائبل کی کتاب ایستر کی طرف اشارہ ہو جس میں یہ واقعہ (جو در حقیقت نہایت تعلیمی و تلقینی افسانہ ہے) بیان ہوا ہے کہ ایک ایرانی بادشاہ نے اپنے وزیر کے مشورے سے ملک کے سارے یہودیوں کو قتل کرنے کا حکم دیا، شاہی محل میں ایک یہودن بھی تھی، اس نے بادشاہ کو مدہوش کر کے یہ حکم منسوخ کرا لیا کہ یہودیوں کو نہ چھیڑا جائے، اور وزیر اور دوسرے بہت سے ایرانی امرا کو جو یہودیوں کے مخالف سمجھے جاتے تھے، پھانسی پر چڑھایا جائے، اور اس حکم کی فوراً تعمیل بھی کرائی۔" (مترجم)

[2] غالباً جندیسابور کی طرف اشارہ ہے، لیکن یونانی فلسفہ زیادہ تر شامی سریانیوں کی مدد سے عربی میں منتقل ہوا، مامون نے راست یونانی کتابیں منگائیں، اور بغداد کے بیت الحکمہ میں ان کے ترجمے ہوئے، پھر ترجموں کی نظر ثانیاں بھی ہوتی رہیں۔ (مترجم)

وہ کس حد تک ٹھیک طور پر چل رہا تھا، مٹھی بھر مالدار لوگ عیش و نشاط میں مشغول تھے، لیکن شلڈن آموس کا یہ کہنا کہ عربوں نے شام کے شہروں کی "متمول اور منظم زندگی" پر قبضہ کیا تھا، ایک مبالغہ ہے، عربوں (مسلمانوں) کی برق آسا فتوحات کی ایک جزئی توجیہ شاید یہ ہے کہ [رومی سلطنت میں] عوام الناس کی نظروں میں ملک ایسی چیز نہ تھا جس کی خاطر جنگ کیجائے۔[1]

(۱۰) اس میں شک نہیں کہ تمدن کی عام تباہی کے وقت بھی لوگوں کو اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ ایک قسم کی قانونی تنظیم برقرار رکھیں، اور خواہ جان بوجھ کر ہو یا بے جانے بوجھے، وہ اسی عملدرآمد پر چپٹے رہتے ہیں، جس کے وہ اب تک عادی رہے ہیں، اس لیے اگر فون کریمر یہ کہتا ہے کہ "رومی بیزنطینی قواعد، رواجی قانون کی شکل میں برقرار رہے"، یا جب سانتلانا [فرانسیسی میں] یہ بیان کرتا ہے کہ اس بات کا امکان ہے کہ اس قسم کے قواعد: "مشرق میں تمدن کے جو دیگر عناصر تیر رہے تھے ـــــ (اس "تیرنے" کے کنایے کو نظرانداز نہ کرنا چاہیے) ـــــ انھیں کی طرح وہ بھی برقرار رہے" ہوں تو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو اصولاً غیراغلب ہو، سیلاب کی موجیں جن چیزوں کو بہالے جارہی ہوں ان کو لے کر ان سے ایک نیا نظام قانونی تعمیر کرنا اس سے بالکل الگ بات ہے، کہ جسٹی نین کے پیچیدہ اور نازک و لطیف اصول قانون کو من وعن لے لیا گیا ہو،

(۱۱) اس بات کو عام طور پر سب ہی مانتے ہیں کہ جسٹی نین کا مجموعۂ قوانین (Corpus) [illegible] کبھی بھی مغربی (یعنی اطالوی) رومی سلطنت میں رواج نہ پا سکا، وہاں جو رومی

---

[1] ایک مزید وجہ یہ ہے کہ شام اور مصر کی رومی فوج میں عرب سپاہی بکثرت تھے، اور یہ حملہ آور (مسلمانوں) کے ہم نسل تھے" (مؤلف) ـــــ غسان کے سردار نے رسول اکرمؐ کے سفیر تک کو قتل کرنے میں باک نہیں کیا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان عیسائی شدہ عربوں کو یونانیوں سے کہیں زیادہ اسلام سے نفرت تھی۔ (مترجم)

ہی [کم] تھے، ایک جلائے ہوئے شہر کو سنبھلنے میں بیسیوں برس لگتے تھے، انسانوں کی وحشت اور درندگی کے ہاتھوں جو بلائیں آتیں ان پر مستزاد وہ مصیبتیں تھیں جن کو قانون انگلستان میں بیحیائی اور تدین کے عجیب امتزاج کے ساتھ "افعال خدا" کا نام دیا گیا ہے یعنی طاعون، امراض متعدی، قحط (جو جنگ کے ناگزیر لوازم ہیں) نیز آتش زدگی اور سخت زلزلے۔

(۸) اگرچہ دونوں سلطنتوں کی حالت خراب تھی لیکن ان میں رومی (بیزنطینی) سلطنت کی حالت خراب تر تھی، جس مختصر عرصہ کے لیے ان میں صلح بھی رہی، ان میں بھی رومی سلطنت ایران کو خراج ادا کرتی رہی، اور یہ ہرقل کی فوجی عبقریت اور مہارت تھی جس نے ان عظیم مشکلات کے باوجود ایشیاے کوچک اور شام و مصر کو ایرانی قلمرو میں ضم ہو جانے سے روکے رکھا تھا۔

(۹) ان حالات میں جب مٹھی بھر دینی جنون والے عرب، ٹھنڈے دل سے کام کرنے والے جرنیلوں کے ماتحت دنیا کو فتح کرنے کے لیے نکلے تو انھیں رومی اور ایرانی سطوت سے نہیں بلکہ دو ایسی شہنشاہیوں سے سابقہ پڑا جو شکست خوردہ اور تھکی ہوئی تھیں، اور جان لیوا زخم سے مجروح تھیں[1]۔ رومی، الگزانڈری کا نظم و نسق تو جاری و برقرار رہا، لیکن یہ کہنا دشوار ہے کہ

---

[1] یہ ضرورت سے زیادہ مبالغہ ہے، اگر تھوڑی دیر کے لیے نینوہ کی شکست کے بعد ایران کو مہلک زخم سے مجروح بھی فرض کر لیا جائے تو رومی فاتحوں کے متعلق تو ایسا خیال نہیں کیا جا سکتا۔ ایران سے لڑنے کیلئے ہرقل نے جو فوج بھرتی کی تھی اس میں کئی لاکھ تربیت یافتہ سپاہی تھے (جن میں سے ایک لاکھ مسلمانوں سے لڑنے کے لیے ۸ھ میں موتہ بھیجے گئے تھے)۔ کیا ۱۹۳۹ء میں مٹھی بھر جبشی شکست خوردہ جرمنی نہیں بلکہ فاتح روس و امریکہ پر حملہ کر کے ان کو فتح کر سکتے تھے؟ مسلمانوں نے ایران و روم (بیزنطہ) دونوں سے بیک وقت مقابلہ کر کے دونوں پر قبضہ کیا تھا۔ (مترجم)

(۱۲) شام میں ایک نام نہاد "شامی رومی قانون کی کتاب" (Syro-Roman law book) ملی ہے۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ جسٹی نین کا "مجموعۂ قوانین" زندہ نہ رہا تھا، یہ دستاویز[1] اصل میں طلبہ کی ایک درسی کتاب ہے، اور اسے ایک طرح کا "رومی قانون کا خلاصہ" کہا جاسکتا ہے۔ اس میں صرف قانونِ مدنی (Jus Civile) ہے، اعزازی قانون[2] (Jus honorarium) نہیں، یہ بزنطینی شہنشاہ زینون[3] (Zenon) کے زمانے میں ۴۸۰ء میں اصل میں یونانی میں لکھی گئی تھی، اور شاید لاطینی میں بھی۔ کیا یہ تصور میں بھی آسکتا ہے کہ لارڈ برکنہیڈ[4] (Birkenhead) کے زمانے کی [جدید وکیثر] قانون سازی ہی سے پہلے نہیں بلکہ حکام عدالت کے قانون (Judicature acts) سے بھی پہلے۔ جس نے غیر مکتوبہ عام شائع و رائج قانون Common law اور قانون استحسان (Equity) کو ضم کرنے کا حکم دیا تھا[5] ـــ پہلے کے قانون انگلستان کو آجکل کے انگریز قانون پیشہ لوگ کسی متبدیوں

---

[1] لگے ہاتھوں یہ کہتے چلیں کہ اس کتاب اور اسلامی قانون میں جو واحد قابل ذکر چیز ملی ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی قانون میں کوئی شخص اپنی جائداد کا ایک تہائی سے زیادہ حصہ کسی کو بطور وصیت نہیں دے سکتا، جو اس [رومی] کتاب میں بھی مذکور ہے، اور ظاہر ہے کہ اصل متن میں کسی نے بعد میں اس کا اضافہ کردیا ہے۔" (مولف) یہ کتاب اسلامی عہد کی تالیف ہے، اور اس پر نالینو نے متعدد مقالے اطالوی میں لکھے تھے۔ (مترجم) [2] اعزازی قانون سے مراد وہ قانون ہوتا ہے جو مجسٹریٹ (حاکم عدالت) کے جاری کردہ اعلان سے بنے۔ (مترجم) [3] زینون کا زمانہ حکمرانی ۴۷۴ء تا ۴۹۱ء۔ (مترجم) [4] وزیر ہند بننے سے پہلے لارڈ برکنہیڈ نے جب پہلی جنگ عظیم کے بعد وزیر عدلیہ تھا تو اس زمانے میں متعدد مسائل پر انگلستانی رواج اور نظائر وغیرہ کی مدد سے پہلی دفعہ قانون وضع کرائے، مثلاً قانون جائداد وغیرہ۔ (مترجم)

[5] پرانے زمانے میں انگلستان میں بیک وقت دو قانون رائج تھے۔ چنانچہ جب کوئی شخص اپنے مقدمے کے لیے "عام شائع قانون کی عدالت" (Common law court) میں جاتا تو ایک طرح سے فیصلہ ہوتا، اور اگر محکمۂ قانون استحسان (چانسری کورٹ) (Chancery Court) کی طرف رجوع کرتا تو اس کے برعکس فیصلہ ہوتا۔ ۱۸۷۳ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے جب اصلاح عدلیہ کا قانون (Judicature act) منظور کیا تو یہ فرق ختم ہوا اور ساری عدالتیں ایک ہی قانون کے نافذ کرنے کی پابند کی گئیں۔ (مترجم)

قانون پھر زیرِ عمل تھا، وہ تھیوڈوسیوس [روم] کا مدونہ (Theodosian Code) تھا، لیکن اس میں ان وحشی [جرمنوں] کے رسم و رواج کی بھی تھوپا تھاپی کی گئی تھی، جو جسٹی نین کی فتوحات کے باوجود فرمانروا طبقہ بنے رہے، اور اہلِ روما کے ساتھ ایک ماتحت قوم کا سلوک کرتے رہے، حتیٰ کہ ملک میں بعض جگہ Romanus (یعنی رومی) کے معنے بالآخر "غیر آزاد شخص" کے ہو گئے تھے، ان حالات میں مغربی [اطالوی] رومی قانون کے لیے یہ بات مشکل تھی کہ اسلامی قانون کی تاسیس میں کوئی اثر رکھے، خواہ ہم اس یقینی بات کو تھوڑی دیر کے لیے نظر انداز ہی کیوں نہ کر دیں کہ اس [اسلامی] قانون کے بنیادی اصول، مدینۂ منورہ کے مشہور امام مالکؒ کے متبعین کے ہمراہ آٹھویں صدی عیسوی [دوسری صدی ہجری] کے نصف دوم میں [اندلس و] مغرب اقصیٰ میں پہنچنے سے پہلے ہی، مدینہ منورہ میں مدون ہو چکے تھے، مشرقی (بیزنطینی) رومی سلطنت کی حالت اس سے مختلف تھی، وہاں جسٹی نین کے وضع کردہ قانون ہی پر بیزنطینی عدالتی افسر عمل کرتے تھے، اور بیزنطہ (قسطنطنیہ) میں تعلیم پائے ہوئے وکیل (دعوے بیچ Lawyers) اسی کے مطابق وکالت کرتے تھے، [مصری یا بربری یعنی] بردی کاغذوں پہ لکھی ہوئی جو دستاویزیں ملی ہیں ان کی شہادت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم [بیزنطینی صوبۂ] مصر میں رسم و رواجی قواعد کا قابل لحاظ حصہ برقرار تھا جو رومی قانون کے ساتھ یا تو مسابقت و مقابلہ کرتا تھا، یا اس کے ساتھ ایک تکلیف دہ طفیلی زندگی گزار رہا تھا، یہ جو کہا گیا کہ جسٹی نین نے "دو غلے نظریوں" کو برخاست کرنے کی کوشش کی تھی، اس کے معنی غالباً یہی ہیں کہ اس کی کوشش یہ تھی کہ رومی نظام قانون کی مصر کے مقامی رواج کے ذریعے سے ترمیم کو روکا جائے، زیرِ بحث تحقیقات میں اسکی زیادہ اہمیت نہیں ہے، مگر اس سے ضمناً یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ مسلمان اہلِ فقہ کو اپنے نظام قانون کی عمارت کھڑی کرنے میں بر وقت جو سامان اور مواد ملا تھا، اس میں صرف رومی قانون کے اجزا ہی نہ تھے [بلکہ ہر جگہ کے مقامی رواجات بھی تھے]

خریطۂ جواہر

از شاہ معین الدین احمد ندوی

(۲)

فصاحت خاں راضی: بندگی گشتم تمیز کعبہ و دیرم کجاست دیدہ ام ہر جا درے انجام سجودے ساختم

میرا مذہب تو بندگی ہے، مجھے دیر و حرم کا امتیاز کہاں، جہاں کوئی در نظر آیا وہیں سجدہ کر دیا۔

ع جہاں دیکھا کوئی جلوہ وہیں رکھ دی جبیں میں نے

رضی گیلانی: بخت گر در خواب یک شب ہمدم یارم کند دل طپد از ذوق چندانیکہ بیدارم کند

اگر کبھی قسمت یار کو خواب میں دکھاتی ہے تو دل ذوق و شوق میں اتنا تڑپتا ہے کہ بیدار کر دیتا ہے، یعنی خواب میں بھی لذت ملاقات حاصل نہیں ہو پاتی۔

میر محمد یعقوب راہب: بسان چشم کہ گرید بہ درد ہر عضوے غمے بہر کہ رسد می کند ملول مرا

میرا حال آنکھ کے جیسا ہے کہ جسم کے کسی عضو میں بھی درد ہونے لگتی ہے، اسی طرح ہر انسان کا غم مجھے ملول کر دیتا ہے۔

کلن حسین راغب: صد نامہ نوشتیم و جوابے نہ نوشتی ایں ہم کہ جوابے نہ نویسند جواب است

میں نے سیکڑوں خطوط لکھے مگر تو نے کسی کا جواب نہ دیا، درحقیقت جواب نہ دینا بھی ایک قسم کا جواب ہے۔

محمد امین ذوقی: ہم نشینم بخیال تو و آسودہ دلم کیں وصالیست کہ در پے غم ہجرانش نیست

میں تیرے خیال میں مست اور آسودہ دل ہوں، یہ وہ وصال ہے جس میں غم جدائی کا خطرہ نہیں۔

کے لیے لکھی ہوئی ایک چھوٹی سی درسی کتاب کی اساس پر نافذ کر سکیں؟ مگر یہی وہ کارنامہ ہے جسے جسٹی نین کی قانون سازی کے بعد شامی رومی قانون کی کتاب" کو استعمال کرنے والے قانون پیشہ لوگ انجام دینے کی کوشش کر رہے تھے، اور یہی وہ بدنصیب رسالے کی کتاب تھی جس کا شام اور عرب کی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا اور جسے شام کے گرجاؤں[1] میں قانون کی درسی کتاب کے طور پر رائج کیا گیا۔ نالینو[2] کے اس ادعا میں صداقت پائی جاتی ہے کہ نویں صدی عیسوی (تیسری صدی ہجری) کے شامی [عیسائیوں] نے جسٹی نین کا بطور قانون کبھی نام بھی نہ سنا تھا، ایسی حالت میں کیا اس کا امکان ہے کہ ان کے حاکم عربوں نے اسے سنا ہو؟ اسلامی فقہ کی کتابوں میں کسی رومی سند [یا ماخذ] کا کوئی ایک بھی حوالہ نہیں پایا جاتا، (باقی)

---

[1] جیسا کہ مولف آگے خود بھی بیان کریگا، اسلامی حکومت میں اہل ذمہ کامل عدالتی خود مختاری سے متمتع تھے، مثلاً جب کسی مقدمے کے فریقین عیسائی ہوتے تو قانون بھی عیسائی ہوتا، حاکم عدالت بھی اور محکمہ عدالت بھی عیسائی ہوتے، اور یہ حاکم عدالت عموماً طبقہ اہل دین یعنی پادریوں اور راہبوں سے چنے جاتے، اسی لیے گرجا والوں کو قانونی کتاب کی ضرورت پیش آئی کیونکہ انجیل میں قانونی احکام نہیں ہیں، اسلیے ہمعصر بیزنطینی عیسائی سلطنت کے قانون پر عمل کرنا کافی سمجھا گیا۔ (مترجم) [2] نالینو کی اطالوی کتاب "بیزنطینی قانونی کتابیں" (Nallino scritti juridici byzantini) صفحہ ۸۵ تا ۱۵۹، نیز اسی کی دوسری اطالوی کتاب (Sul libro siro-romano) (یعنی شامی رومی کتاب کے متعلق جو مقالات بونفنتے (Studi P. Bonfante) نامی تالیف میں شائع ہوئی] دیکھو جلد اول مطبوعہ پاویا (Pavia) ۱۹۲۹ء، اس "شامی رومی قانون کی کتاب" کے متعلق نالینو کا نظریہ ہم قبول کرتے ہیں، لیکن اگر متیٹس (Mitteis) کا یا کسی اور کا نظریہ قبول بھی کریں تو ایک طرف تو اس "شامی رومی قانون کی کتاب" کے اور جسٹی نین کے "مجموعۂ قوانین" کے نہایت ترقی یافتہ اصول کے درمیان اور دوسری طرف نہایت لطیف قیاسی استدلال کرنے والے ابتدائی مسلمان فقہا کے ذہن کے درمیان فرق کی جو خلیج پائی جاتی ہے وہ بعید وسیع ہو جاتی ہے (مولف)

[3] اسلامی قانون کے مقابلے میں کچھ کم ہی سہی، اسلامی فلسفہ بھی خدا پر مرکوز ہے، اسکے باوجود مسلمان مولف کھلے بندوں اسکا اعتراف کرتے ہیں کہ وہ افلاطون اور ارسطو کے مدیون اور مرہون منت ہیں، (مولف) ——— یعنی کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان فلاسفہ اور اطباء کے مقابلے میں مسلمان فقہا کم دیانتدار رہے ہوں، اگر فقہ میں بیرونی مصادر سے واقعی مدد لی گئی ہوتی تو وہ ضرور اسکا اعتراف کرتے۔ (مترجم)

خوش کر سکتا ہے۔ دل بہلانے کے لیے کوئی سامان تو ہونا چاہیے۔

رفیقی استرآبادی: بد خو مکن بوعدۂ وصل اہل درد را — بگذار تا بمحنتِ ہجرِ تو خو کنند

وصل کا وعدہ کر کے اہل درد کی عادت نہ بگاڑ انکو انکے حال پر چھوڑ دے کہ وہ تیرے ہجر کی مشقت برداشت کرنے کے عادی ہو جائیں۔

زین خاں کوکلتاش: بیک شب چہ عشرت تواں کرد با تو — تماشا کنم مے خورم راز گویم

ایک رات میں تیرے ساتھ کیا عیش و عشرت کیجا سکتی ہے۔ تیرے ... نظارہ کروں، شراب پیوں، راز و نیاز کی باتیں کروں، کیا کیا کروں۔

سید حسین رفیقی: راست کن کار خود امروز کہ فردا چون تیر — گر در رفتن چو شوی روے بپس نتواں کرد

اپنا جو کام کرنا ہے آج ہی کر لو، کل جب تیر کی طرح عمر گریزاں جا کے گی تو پھر مڑ کر دیکھنے کی مہلت نہ ملے گی۔

شیخ سعدی: دوست می دارم من ایں نالیدنِ جانسوز را — تا بہر نوعے کہ باشد بگذرانم روز را

میں اس جانسوز نالہ کرنے کو اس لیے دوست رکھتا ہوں تا کہ جس طرح بنے اس مشغلہ میں دن کاٹ دوں۔

حدیثِ عشق چہ داند کسے کہ در ہمہ عمر — بسر نکوفتہ باشد درِ سرائے ترا

وہ شخص عشق و محبت کا ماجرا کیا جان سکتا ہے جس نے ساری عمر میں کبھی ترے در پر سر نہ پٹکا ہو۔

دلے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است — ز عشق تا بصبوری ہزار فرسنگ است

جو دل عشق میں صبر کرنے والا ہو وہ دل نہیں پتھر ہے، کیونکہ عشق اور صبر کے درمیان ہزاروں کوس کا فاصلہ ہے۔

پس از عمرے کہ بہر پرسشِ ما یار می آید غمِ خود با کہ گویم ہمرہِ اغیار می آید

اگر ایک مدت کے بعد محبوب میری پرسشِ حال کے لیے بھی آتا ہے تو اپنے ساتھ غیروں کو بھی لاتا ہے، اس لیے غمِ دل کس کو سناؤں۔

ملا حیدر ذہنی: چہ سود ازیں کہ حریم دلم نشیمن تست کہ درمیانِ من و دل ہزار فرسنگ است

اس سے کیا فائدہ کہ میرا حریم دل تیرا نشیمن ہے، او [illegible] یاد ہے، اس لیے کہ خود مجھ میں اور میرے دل میں ہزاروں کوس کا فاصلہ ہے، اس لیے میری [illegible] ہو سکتی ہے،

زکی ہمدانی: عذرے ستمے ساخت کہ خونیں جگرم کرد می خواست تلافی کند آزردہ ترم کرد

اس نے اپنے جور و ستم کی معذرت کرکے اس کی تلافی کرنا چاہی، مگر اس کی معذرت نے مجھکو اور زیادہ رنجیدہ کردیا۔

یک ناوکِ کاری زکمانِ تو نخوردیم ہر زخم تو محتاج بزخمِ دگرم کرد

تیری کمان سے ایک کاری تیر بھی نہ لگا جو آسودہ کر دیتا، اس لیے ہر زخم کے بعد دوسرے زخم کی احتیاج باقی رہی،

دلم بحسرت آں مرغِ ناتواں میرد کہ در قفس بہ تمنائے آشیاں میرد

میرا دل اس مرغِ ناتواں کی حسرت پر مرتا ہے جو قفس میں آشیانہ کی تمنا میں مرجاتا ہے،

زکی دیارِ محبت غریب ملکے ایست در و کسے کہ بہ پیری رسد جواں میرد

زکی محبت کی دنیا بھی عجیب ملک ہے، اس میں جو بڑھاپے کو پہنچتا ہے وہ بھی جوان مرتا ہے یعنی محبت پر بڑھاپا نہیں آتا، وہ ہمیشہ جوان رہتی ہے،

زلالی اورگنجی: نہ نکہتے نہ گلے نے خراش از خارے دریں چمن بچہ دل خوش کند گرفتارے

ایسے چمن میں جہاں نہ خوشبو ہو، نہ پھول ہو، نہ کانٹے کی خراش ہو کوئی تو گرفتار کس سے دل

میر کہتے ہیں :

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ ان سے بھی تو پوچھئے تم اتنے پیارے کیوں ہوئے

دی زمانے بر سعدی بہ تکلف بنشست فتنہ بنشست چو بر خاست قیامت بر خاست

کل تھوڑی دیر کے لیے محبوب سعدی کے پہلو میں تکلف سے بیٹھا، جب تک بیٹھا فتنہ بیٹھا رہا

جب اٹھا تو قیامت بن کر اٹھا۔

سعدیا نوبتی امشب دہل صبح نکوفت یا مگر صبح نباشد شب تنہائی را

سعدی کیا بات ہے کہ گھڑیال بجانے والے نے آج رات صبح کا گھنٹہ نہیں بجایا یا شب تنہائی

کی صبح ہی نہیں ہوتی کہ اس کا گھنٹہ بجتا۔

سلمان ساوجی : گاہ زدل بود گلہ گاہ زدیدہ ام من انچہ دیدہ ام از دل و دیدہ دیدہ ام

مجھکو کبھی دل کا گلہ ہے اور کبھی آنکھ کا، مجھے جو کچھ دیکھنا پڑا انہی دونوں کی بدولت دیکھنا پڑا۔

چشم سرمست ترا عین بلا می بینم لیکن ابروئے تو چیزیست کہ بالا بلاست

تیری مست آنکھ خود ایک بلا تھی، لیکن تیرے ابرو تو اس سے بڑھ کر بلا ہیں، ابرو آنکھ کے

اوپر ہوتے ہیں، شاعر نے اس کو بالائے بلا سے تعبیر کر کے شعر میں اک لطف پیدا کر دیا،

مرزا سام سامی : آزردہ شد از چشم من امشب کف پایت لے وائے کف پائے ترا چشم رسیداست

آج رات کو تیرے قدموں پر آنکھ ملنے سے ترے نازک تلووں کو تکلیف پہنچ گئی، افسوس

دل کی وجہ سے اس کو نظر لگ گئی۔

ملا جمال سپہری : ندانم آنکہ بدرگاہ کعبہ رو آورد بعذر خواہی آں خاک آستاں چہ کند

میں نہیں سمجھتا کہ جو شخص کعبہ کا رخ کرتا ہے، وہ محبوب کی خاکِ آستاں کے

سامنے کیا عذر کرے گا،

دل از سنگ بباید بسر راہ وداع　　کہ تحمل کند آں لحظہ کہ محمل برود

محبوب کے محمل کی روانگی کے وقت اس کی رخصتی کا منظر برداشت کرنے کیلیے پتھر کا دل چاہیئے

خبرے ما برسانید بمرغانِ چمن　　کہ ہم آواز شما در قفسے افتادست

میری یہ خبر مرغانِ چمن کو پہنچا دو کہ تمھارا ایک ہم آواز قفس میں گرفتار ہو گیا ہے،
(اس سے اُن کی کچھ تسلی ہو جائے گی)

بلطف دلبرمن درجہاں نہ بینی دوست　　کہ دشمنی کند و دوستی بیفزاید

میرے دلبر کے جیسا مہربان دوست دنیا میں نہیں مل سکتا کہ وہ دشمنی کرنے پر بھی دوستی بڑھاتا ہے یعنی اس کی دشمنی سے بھی اس کی محبت بڑھتی ہے۔

دو عالم را بیکبار از دلِ تنگ　　بروں کردیم تا جائے تو باشد

میں نے اپنے دل تنگ سے اکبارگی دونوں جہان کو نکال دیا تاکہ تیرے لیے جگہ خالی ہو جائے یعنی تیرے سوا اب اس دل میں کسی کی گنجایش نہیں، اسلیے تجھے آجانا چاہیے،

گفتہ بودم چو بیائی غمِ دل با تو بگویم　　چہ بگویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی

میں نے سوچا تھا کہ جب تو آئیگا تو غم دل تجھ سے بیان کروں گا مگر جب تو آجاتا ہے تو سارا رنج وغم جاتا رہتا ہے۔ اس لیے غم دل کیا بیان کروں،

میر کا یہ شعر اسی سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے

کہتے تو ہو یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا　　سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

مردماں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم　　باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ میں نے تجھکو کیوں دل دیا، حالانکہ پہلے تجھ سے پوچھنا چاہیے کہ تو اتنا خوبرو کیوں ہے؟

یہی وقت ہے کہ صبح کو میرے سرہانے آجاؤ، کیونکہ میری شمعِ حیات ایک دو نفس کی مہمان ہے، زیادہ زحمت نہ کرنا پڑے گی۔

من آں نیم کہ نسیمِ گلم فریب دہد بآشنائیٔ بلبل گہے بباغ روم

مجھکو پھولوں کی نسیم فریب نہیں دے سکتی (میں پھولوں کی سیر کے لیے نہیں) بلکہ بلبل کی دوستی میں باغ میں جاتا ہوں۔

فریدوں سابق: اس شعر کی سادگی قابل دید ہے:

قاصد بخدا آں بتِ عیار چہ می گفت قربانِ زبانِ تو بگو یار چہ می گفت

قاصد خدا کے لیے بتا دے کہ اس بتِ عیار نے تجھ سے کیا کہا، تیری زبان کے قربان بتا دے یار نے کیا کہا۔

محمد قلی سلیم: در چمن دوش صبا بوئے تو سودا می کرد گل بکف داشت زر و غنچہ گرہ وا می کرد

کل چمن میں بادِ صبا تیری خوشبو کا سودا کر رہی تھی، اس کو خریدنے کے لیے پھول زرِ گل ہاتھ میں لیے تھا اور غنچہ گرہ کھول رہا تھا۔ (غنچہ کے کھلنے کو گرہ کھولنے سے تشبیہ دی ہے)

آئینہ بکف گیر کہ از رشک بمیرم در کشتنِ ما حاجتِ شمشیر ندارد

مجھکو قتل کرنے کے لیے تلوار کی حاجت نہیں ہے، تم آئینہ ہاتھ میں لے لو، میں خود رشک میں مر جاؤں گا۔

محمد افضل سرخوش: در عدم ہم ز عشق شورے ہست گل گریباں دریدہ می آید
در تہِ خاک نیز راحت نیست سبزہ دامن کشیدہ می آید

عدم میں بھی عشق کا ہنگامہ ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ جو پھول عدم سے وجود میں آتا ہے وہ گریباں دریدہ ہوتا ہے اور زیرِ خاک بھی راحت میسر نہیں، چنانچہ جو سبزہ اگتا ہے وہ دامن کشیدہ

سحابی استرآبادی: کارم گہے صنمگری و گہ شکست اوست ۔ بیتاب عشق ہرچہ کند حق بدست اوست

مرا کام کبھی بت بنانا ہے اور کبھی اس کو توڑنا ہے، بیتاب عشق جو بھی کرتا ہے حق اور صحیح کرتا ہے، اس لیے بت شکنی و بت گری دونوں صحیح ہیں ۔

سلطان محمد قمی: از قتلِ من مترس کہ دیوانیانِ حشر ۔ مجرم کنند بہر تو صد دادخواہ را

میرے قتل پر مواخذہ کا خوف نہ کر کیونکہ حشر کے دفتر والے تیرے لیے سیکڑوں دادخواہوں کو الٹا مجرم بنا دیں گے ،

کاشی: نہ تاب دیدن و نے طاقتِ شکیبائی ۔ تو چوں نقاب کشی رحم بر تماشائی است

نہ تو تجھکو دیکھنے کی تاب ہے اور نہ صبر کی طاقت ہے، اس لیے ترا نقاب ڈال لینا درحقیقت تماشائی پر رحم ہے،

در روزگارِ عشقِ تو من ہم فدا شدم ۔ افسوس کز قبیلۂ مجنوں کسے نماند

ترے عشق کے روزگار میں میں نے بھی جان فدا کر دی، افسوس کہ مجنوں کے قبیلہ کا کوئی بھی باقی نہیں رہ گیا ،

چشم بر راہند میخواراں کہ کے باراں شود ۔ ابر می خواہند مستاں خانہ گو ویراں شود

میخوار انتظار میں ہیں کہ کب پانی برستا ہے، وہ ابر کے متمنی ہیں، خواہ بارش سے ان کا گھر ہی ویران ہو جائے،

اینم دیت بس است کہ ہنگامِ بازخواست ۔ نعشم بر آستانۂ قاتل نہادہ اند

میرے قتل کا یہ خونبہا کافی ہے کہ جنازہ لیجاتے وقت میری نعش لوگوں نے قاتل کے آستانہ پر رکھدی ۔

وقت است کہ چوں صبح بہ بالینِ من آئی ۔ شمعِ سحرم یک دو نفس بیش ندارم

شہیدی قمی: خوش آں زماں کہ نکویان کنند غارت شہر　　مرا تو گیری و گوئی کہ ایں اسیر من است

وہ وقت بھی کیسا پرلطف ہو کہ جب خوبرو شہر کو غارت کر رہے ہوں تو تو مجھے پکڑ لے اور کہے کہ یہ میرا قیدی ہے (اس کو نہ غارت کرو)

شرمندۂ ز طعنۂ مردم برائے من　　خوبیِ تو بلائے تو ہم شد چہ جائے من

تجھکو میری وجہ سے لوگوں کے طعن وطنز سے شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ میرا کیا ذکر تیرا حسن خود تیرے لیے مصیبت بن گیا ہے۔

بہ بیدرداں نشینی کہ قدر بر من نگاہ از تو　　نہ درد عشق می دانی نہ قدر حسن آہ از تو

تو بے دردوں کا ہم نشین ہے، تیری نگاہ مجھ پر کیسے پڑ سکتی ہے۔ افسوس کہ تو نہ درد عشق کو جانتا ہے اور نہ حسن کی قدر پہچانتا ہے۔

شاپور طہرانی: نشست آنقدر کہ ببینم خوش قدش　　چشمش ہزار کار و دلش صد خیال داشت

محبوب اتنی دیر بھی نہ بیٹھا کہ میں اس کے حسن کا پورا نظارہ کرسکتا۔ اتنی دیر میں بھی اس کی چشم فسوں ساز ہزاروں کام کرتی اور اس کا دل ہزاروں خیالات میں مشغول رہا یعنی اس نشست میں بھی یکسوئی سے نہ بیٹھا۔

سینہ بر خنجر او زن کہ شہادت بر ما　　ناقص است ار مدد کشتہ بہ قاتل نرسد

محبوب کی تیغ زنی کے وقت خود اپنے سینہ کو ہدف بنا دے کہ وہ شہادت ناقص ہے جس میں مقتول کی مدد شامل نہ ہو۔

حال مرغیست دلم را کہ بہ انداز چمن　　ز آشیاں آید و در دام گرفتار شود

میرے دل کا حال اس چڑیا کی طرح ہے جو چمن میں جانے کے خیال سے آشیانہ سے نکلتی ہے مگر دام میں پھنس جاتی ہے، میں بھی حسن کی بہار سے لطف اندوز ہونے کے لیے نکلا تھا مگر عشق کے اندوہ میں گرفتار ہو گیا۔

اُگتا ہے،

میر جلال الدین سیادت: فزود چشم ترمن شکوہ خوباں را کنارِ آب دو چنداں کند چراغاں را

میری چشم گریاں نے حسینوں کی شان بڑھا دی جس طرح پانی کے کنارے چراغوں کے عکس سے چراغاں دو نا دکھائی دیتا ہے، اس طرح میرے آنسوؤں نے ترے حسن کو بڑھا دیا۔

کدام ماہ جبیں دوش مجلس آرا بود کہ شمع از درِ فانوس در تماشا بود

کل یہ کون مہ جبین مجلس آرا تھا کہ شمع محفل بھی فانوس کے در سے اسکا تماشا کر رہی تھی،

شد از اشکم رفتہ رفتہ دیدۂ گریاں سفید میکند ابرِ سیہ را عاقبت باراں سپید

میرے آنسوؤں کی کثرت سے رفتہ رفتہ آنکھیں سپید ہوگئیں جس طرح سیاہ ابر کو آخر میں بارش سپید کر دیتی ہے، اور پانی برسنے کے بعد ابر کی سیاہی جاتی رہتی ہے،

ملا علی اکبر سودا: از چاک دل نظر برخ یار می کنم سیر چمن برخنۂ دیوار می کنم

میں دل کے چاک سے یار کے رخ کا نظارہ کرتا ہوں یعنی رخنۂ دیوار سے چمن کی سیر کرتا ہوں

مرزا اشرف قزوینی: رفتی و سراپائے ترا سیر ندیدیم داغے بجگر ماند زہر جائے تو مارا

تو چلا بھی گیا اور تیرے سراپا کو جی بھر کر دیکھ سکا تیرے ہر عضو سے جگر میں ایک داغ رہ گیا،

خوش آں ساعت کہ پنہانی برُوئے یار می دیدم چو می گردد نظر سویم سوئے اغیار می دیدم

وہ وقت کیا خوش آیند تھا کہ میں پوشیدہ محبوب کی طرف دیکھتا تھا جب وہ میری طرف دیکھتا تھا تو میں دوسروں کی طرف دیکھنے لگتا تھا،

شریفی تبریزی: زگردوں مرگ می خواہم حیاتی می دہد آئے فلک بسیار زنیساں لطفہائے بے محل دارد

میں آسمان سے موت مانگتا ہوں وہ زندگی دیتا ہے، وہ ایسی بے محل مہربانیاں بہت کرتا ہے۔

احتراز کرتا ہے۔ یہ احتراز خود خیال آنے کی دلیل ہے،

خواجہ شیدا: بجرم آنکہ شبہا دردسر مید جاناں را بزنداں کردہ ام در تنگنائے سینہ افغاں را

اس جرم میں کہ میری فریاد و فغاں راتوں کو محبوب کے سر میں درد پیدا کرتی ہے میں نے اس کو سینے کے قید خانہ میں قید کر دیا ہے یعنی اس کے درد سر کے خیال سے فریاد و فغاں (ہی) نہیں کرتا۔

غنیمہ شفائی: امروز نشد از فنا ما! چہ شود باز آں لطف کہ دیروز بجاے دگراں داشت

کل جو لطف و مہربانی غیروں کے ساتھ تھی وہ آج میرے حال پر مبذول ہے، دیکھیں اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ یہ لطف بے سبب نہیں ہے،

دل بہ آں درد نہ بندم کہ چوں زخم ہوس ہر در وصل بدریوزۂ درماں برود

میں ایسے درد و الم سے دل نہیں لگاتا جو زخم ہوس کی طرح وصل کے دروازے پر درماں کی بھیک مانگنے جاتا ہے، یعنی میرا درد و الم وصل کے درماں کا طالب نہیں ہے

نمیدانم کہ دل را از کدامی عشوہ بستانم ربودندش چنداں کہ مسکیں از میاں گم شد

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ محبوب کے کس عشوہ سے دل گم گشتہ کا مطالبہ کروں، ان سب نے مل کر اس کو اس طرح چھپایا ہے کہ غریب درمیان سے گم ہو گیا اور اب اس کا ملنا مشکل ہے۔

حال آں مرغ چہ باشد کہ پس از گل ناچار غنچۂ دل بخس و خار گلستاں بندد

اس غریب مرغ کا کیا حال ہوگا جو فصل گل کے بعد چار و ناچار غنچۂ دل کو گلستاں کے خار و خس سے لگاتا ہے۔

پرستارے ندارم بر سر بالین بیمارے مگر درد دمم ازیں پہلو بہ آں پہلو بگرداند

تیمار داری کے لیے کوئی لونڈی غلام بھی بیمار کے سرہانے نہیں ہے، خود میرے درد کا اضطراب پہلو بدلواتا ہے۔

چہ کنم حسرتِ پروازِ گلستان اے کاش   بگذارند کہ کنجِ قفس گرم کنم

میں گلستان میں پرواز کی تمنا کیا کر سکتا ہوں، کاش مجھے کنجِ قفس ہی میں رہنے کے لیے چھوڑ دیں۔

بہر گلشن کہ بایں نغمہ پردازی وطن کردم   زیارتگاہ مرغانِ چمن شد آشیانِ من

ایسی نغمہ پردازی کے ساتھ جس گلشن کو بھی میں نے وطن بنایا، میرے نغمہ کی دلآویزی سے میرا آشیانہ مرغانِ چمن کی زیارت گاہ بن گیا۔

شجاع کاشی: تا کے ملامتِ مژۂ اشکبارِ من   یکبار ہم نصیحتِ چشمِ سیاہِ خویش

میری اشکبار مژہ کو کب تک ملامت کرتے رہوگے، ایک بار اپنی چشمِ سیاہ کو بھی تو نصیحت کرو جس نے اشکبار بنایا ہے۔

کشتن مرا تغافلت دی چو شد دو چارِ من   امروز گشت عاشقی واے بروزگارِ من

کل جب تیرا سامنا ہوا تو تیرے تغافل نے مجھے مار ڈالا، آج پھر میرا عشق ظاہر ہوا میرے لیے مصیبت بن گیا۔

میر کا یہ شعر اسی سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے

ہائے اتلاف اس بیاکش کا   جس کو عاشق وہ اپنا جان گیا

شریف خاں شیرازی: ز برکتِ عشق با کجہ بینی عدو کامل کردم   تو خصم کردہ ز ما دوستی تماشا کن

میں نے عشق کی برکت سے دونوں عالم سے عدو کیا، تم مجھ سے دشمنی کرکے میری دوستی کا تماشا دیکھو تو میں دشمنی کے بعد بھی دوست ہی رہوں گا۔

شوری: زمن بغیر خیال تو ماندہ است ہنوز   بخاطرت چو رسم از من احتراز کنی

تو بھی میرے خیال سے خالی نہیں رہتا، چنانچہ جب تیرے دل میں میرا خیال آتا ہے تو اس سے

دل کو وہیں چھوڑ دیا۔

چوں لب از قصۂ اظہار محبت واماند بزبانِ نگہ گرم تماشش کردم

جب لب محبت کی روداد بیان کرنے سے قاصر رہے تو نگاہ گرم کی زبان سے میں نے اسکو پورا کیا یعنی جو بات زبان سے نہ کہہ سکا اس کو نگاہوں نے کہہ دیا،

عجب متاعِ زبونیست ایں وفاداری کہ مفت ہم نخریدند ہر کجا بُردم

وفاداری کی متاع ایسی کھوٹی ہے کہ جہاں لے جاتا ہوں اس کو کوئی مفت بھی نہیں خریدتا یعنی اس زمانہ میں اس کی کوئی قدر نہیں رہ گئی ہے،

تو بجلوہ چوں درآئی اجل از سر ترحم ہمہ جا کند منادی ز تو احتراز کردن

تو جب جلوہ طرازی کرتا ہے تو موت از راہ ترحم ہر جگہ تجھ سے بچنے کی منادی کرتی پھرتی ہے کہ تجھے دیکھنا موت کو پیام دینا ہے،

شکیبی اصفہانی: لائقِ مجلس نیم لیک ز بہرِ چشم زخم شاخ خشکے نیز در کار است بستانِ ترا

اگرچہ میں تیری بزم کے لائق نہیں ہوں لیکن تیرے باغ حسن کو نظر بد سے بچانے کے لیے خشک شاخ کی بھی ضرورت ہے، یہی سمجھکر مجھکو اپنی محفل میں جگہ دیدینی چاہیے،

شبہائے ہجر را گذرانیدیم زندہ ایم مارا بسخت جانیِ خود ایں گماں نبود

ہجر کی راتوں کو گذار کر بھی زندہ ہوں، مجھے اپنی سخت جانی سے اسکی امید نہ تھی،

شوقی: دوریم بصورت ز تو نزدیک بمعنی مانند دو مصرع کہ ز ہم فاصلہ دارد

میں ظاہر میں تو تجھ سے دور رہوں مگر باطن میں نزدیک ہوں، جس طرح ایک شعر کے دو مصرع ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں، مگر معنی کے لحاظ سے قریب اور ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں،

بایں شوخی نمیدانم چہ خواہی کرد مستوری کہ گرجائے دوچار خود شود بدنام می گردد

بایں شوخی و شرارت اپنے کو کس طرح چھپا سکتا ہے اگر کسی جگہ خود اپنے سے بھی دوچار ہوتا ہے تو خود اس کی شوخی و شرارت بدنام کردیتی ہے،

دلم از بدگمانی تا بصدرہ افگند قاصد حکایت گوید و عمداً در اثنائے سخن خندد

قاصد میرے دل کو بدگمانی کی وجہ سے سیکڑوں قسم کے خیالات میں مبتلا کردیتا ہے کیونکہ محبوب کی حکایت بیان کرتے وقت اثنائے سخن میں ہنستا جاتا ہے جس سے طرح طرح کے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔

شہرت ننگ دعوی عشق است وگرنہ زاں گونہ تواں زیست کہ جانانہ نداند

دعوی عشق کے ننگ کی شہرت نے مجبور کردیا ہے، ورنہ اس طرح بھی زندگی بسر کیجا سکتی ہے کہ محبوب کو بھی خبر نہ ہونے پائے۔

نشد فرصت کہ چنداں لذت وصل تو بگیرم کہ در ایام محرومی من و دل را بکار آید

مجھے اس کی فرصت ہی نہیں ملی کہ وصل کی لذت اتنی حاصل کرلیتا کہ ہجر کی محرومی کے زمانہ میں میرے اور دل کے کام آسکے۔

کارمے نیست فروغ رخ عالم سوزش ایں چراغیست کہ از خون من افروختہ است

محبوب کے رخ عالم سوز پر جو فروغ اور رونق ہے، وہ شراب کا اثر نہیں ہے، بلکہ اس چراغ کو میرے خون کی سرخی نے روشن کیا ہے ع اس میں کچھ خونِ تمنا بھی ہے شامل میرا

ردکردہ نگاہے کہ رقیبے نہ پسندد قربان سر ناز کن و سوے من انداز

وہ ردّ کی ہوئی نگاہ جس کو رقیب پسند نہیں کرتا اسکو اپنے ناز کے صدقے میں مجھ پر ڈالدے۔

غافل زبس شدیم ز کوئش دم وداع دل را ز اضطراب ہماں جا گذاشتیم

محبوب کے کوچہ سے رخصت ہوتے وقت بیخودی میں ایسا غافل ہوا کہ غائیت اضطراب میں

میرا دل ایسے زخم کا طالب نہیں ہے، جس کو مرہم کی ضرورت ہو، مجھکو تو ایسے درد کی راحت مطلوب ہے جس کو درماں سے عار ہو۔

میر سعد شعلہ: آں بخت نداریم کہ ہم بزم تو باشیم ... ما و سر راہے تو و آہے و نگاہے

میری قسمت ایسی کہاں کہ تیری بزم کے لائق بن سکوں۔ میرا حصہ تو تیری رہگذر، آہ کرنا اور تیری ایک نگاہ غلط انداز ہے۔

میر صبری صفاہانی: ایں بس جزائے کشتن صبری کہ روز حشر ... حسرت نمی خورد کہ چرا بسمل تو نیست

صبری کے خون کے معاوضہ کے لیے یہ کافی ہے کہ حشر کے دن اس کو اس کی حسرت نہیں رہ گئی کہ وہ تیرا بسمل کیوں نہ ہوا۔ یعنی عاشق کے قتل کا سب سے بڑا معاوضہ یہی ہے کہ وہ محبوب کے ہاتھ سے قتل ہوا ہے۔

من بہ پیشش درد دل گویم بصد امید و او ... منتظر کیں گفتگوئے من بہ پایاں کے رسد

میں تو سیکڑوں امیدوں سے اس کے سامنے درد دل بیان کرتا ہوں اور اس کا حال یہ ہے کہ وہ اس کے انتظار میں رہتا ہے کہ یہ دکھڑا کب ختم ہوتا ہے۔

مجنوں بہ ریگ بادیہ غمہائے خود شمرد ... یاد زمانۂ کہ غم دل حساب داشت

مجنوں صحرا کی ریگ پر لکیریں کھینچکر اپنا غم دل شمار کیا کرتا تھا، اب وہ زمانہ گیا کہ دل کے غموں کا شمار ہو سکتا تھا، یعنی میرے غم حد شمار سے باہر ہیں۔

نکردہ خاطرم اے خوشدلی چہ میگردی ... کدام روز ترا با من آشنائی بود

خوشدلی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تو نے یہ کیا کیا کہ کبھی میری خاطر نہیں کی، کس دن تجھ کو مجھ سے آشنائی تھی، یعنی [illegible] نہیں تھی اور کبھی خوشی حاصل نہیں ہوئی۔

تنفری ساوجی: دل [illegible] سر از رضائے تو پیچید مگذاراں ... با من کہ بود نیز بہ فرمان ما نبود

ملا شیدا: گہے بہ روئے تو گاہے بسوئے گل نگرم — کند مقابلہ کس چوں کتاب را تنہا

میں کبھی تیرا چہرہ دیکھتا ہوں اور کبھی پھول پر نظر ڈالتا ہوں جس طرح ایک تنہا شخص کسی کتاب کا مقابلہ کرتا ہو۔ (مقابلہ کرنا ایک ہی کتاب کے دو نسخوں کو صحت کے لیے ملا کر دیکھنے کو کہتے ہیں)

شاہ نظیر: وقت مردن دامنِ قاتل بدست آید مرا — آخرِ عمر آرزوئے دل بدست آید مرا

کاش مرتے وقت قاتل کا دامن ہاتھ میں آجاتا تو آخری عمر میں دل کی آرزو حاصل ہو جاتی

ز قتلم بنوعے سخن می کند — کہ گوئی مرا دیگرے کشتہ است

مرے قتل پر (انجان بنکر) اس طرح باتیں کرتا ہے کہ گویا اس نے نہیں بلکہ کسی دوسرے نے قتل کیا ہے۔

یک جور را ہزار دلیل آورد بہ بعد — یارب کہ دلربائے کسے نکتہ داں مباد

محبوب ایک ظلم کے جواز کی ہزار دلیلیں دیتا ہے، خدا کسی کے دلربا کو نکتہ داں نہ بنائے،

دست من گیر کہ ایں دست ہماں است کہ من — سالہا در غمِ ہجرِ تو بہ سر زدہ ام

میرا ہاتھ تھام لے کہ یہ وہی ہاتھ ہے جس نے ترے غم ہجر میں برسوں سر پیٹا ہے، اس لیے تیری دستگیری کے لائق ہے۔

محمد ابراہیم شوکتی: ز پارہ دل من ہیچ گوشہ خالی نیست — کدام سنگدل ایں شیشہ بر زمیں زدہ است

کس بیدرد نے مرے شیشۂ دل کو زمین پر پٹکا ہے کہ چور چور ہو گیا ہے اور اس کا کوئی گوشہ بھی اس کے ٹکڑوں سے خالی نہیں ہے۔ ہر جگہ اس کے ٹکڑے بکھرے ہوئے ہیں،

ملا شیدا انصاری: باہر کہ حرفِ دوستی اظہار میکنم — خوابیدہ دشمن است کہ بیدار می کنم

میں جس سے بھی دوستی کا اظہار کرتا ہوں گویا ایک خوابیدہ دشمن کو بیدار کرتا ہوں، یعنی اس زمانہ میں جس سے بھی دوستی کیجائے وہ بعد میں دشمن نکلتا ہے،

میر ناظم تبریزی: نمی خواہد دلم زخمیکہ با مرہم بود کارش — من و آسایش دردے کہ از درماں بود عارش

مکتوب حمید

پیرس ۱۰ ذو القعدہ ۱۳۹۵ھ دوشنبہ

مخدومی زاد فضلکم　　　سلام مسنون و رحمۃ اللہ و برکاتہ

آج معارف جنوری سنہ ۷۶ء سے سرفراز ہوا،

اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی

میں معارف میں کم لکھتا ہوں تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ میری نظر میں اس کی عزت کم ہے واقعہ یہ ہے کہ آج معارف دنیائے اسلام میں، عرب ہو کہ عجم، کوئی اسلامی رسالہ اسلامیات پر اعظم گڈھ والے معارف کے معیار کا نہیں، اوروں کے ہاں کاغذ اور طباعت بہتر ہو سکتی ہے، لیکن مضامین کے مندرجات میں علمی معیار بدقسمتی سے کچھ بھی نہیں، خدا معارف کو سلامت باکرامت رکھے، میں خود معارف میں جگہ پاؤں تو اپنے لیے باعث عزت سمجھتا ہوں لیکن جہاں رہتا ہوں وہاں والوں کی تشنہ لبی کی خدمت پہلا فریضہ ہے، خدا کا کرم ہے کہ مقامی زبان میں بھی خامہ فرسائی کر لیتا ہوں اور خوش ہوں کہ کالے کرم اللہ کا احسان ہے کہ گزشتہ پچیس سال میں ہزارہا صفحے چھپ چکے ہیں، اور عظیم تر احسان یہ کہ ان کا تاثر بھی توقع سے کہیں زیادہ اچھا ہوا ہے، مثلاً فرانسیسی میں ۳۶ تراجم قرآن میں، میرا ترجمہ تقریباً ہر سال مکرر چھپتا ہے دو دو دس دس ہزار نسخے، ناشر کے ہاں ہاتھوں ہاتھ چند ماہ

اگر میرا دل تیرے منشا سے روگردانی کرتا ہے تو اس کو معاف کر دے، کیونکہ وہ جب میرے پاس تھا تو میرے کہنے میں بھی نہ تھا۔

تو کہ ذوقِ عیش داری بشنو پیامِ قاصد　　　کہ بجز ہلاکِ صفری خبرے دگر ندارد

معشوق سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تجھکو عیش و عشرت کا ذوق ہے تو قاصد کا پیام سن لے، اسکے پاس صبری کی موت کے علاوہ اور کوئی خبر نہیں ہے۔ اس سے تیرا عیش منغض نہ ہوگا بلکہ اور اطمینان ہو جائیگا۔

صلحی ازندرانی: صلحی ترا کہ طاقتِ رنجِ وصال نیست　　　در حیرتم کہ در شبِ ہجراں چہ می کنی

صلحی تجھ میں تو رنجِ وصال برداشت کرنے کی بھی طاقت نہیں ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ شبِ ہجر میں کیا کرتا ہوگا۔

قاسم صیرفی: غنچۂ نگذاشت کارامِ دلِ بلبل کند　　　باغباں امروز گل اسحت بیرحمانہ چید

باغبان نے پھولوں کو اتنی بیدردی سے توڑا کہ ایک غنچہ بھی نہ چھوڑا کہ وہی بلبل کے دل کے لیے آرام بنتا

حاجی محمد صادق: در خانۂ شکستہ نگیرد کسے قرار　　　ترسم کہ رفتہ رفتہ غمم از دل بدر شود

ٹوٹے ہوئے گھر میں کوئی نہیں ٹھہرتا، اس لیے مجھے ڈر ہے کہ رفتہ رفتہ میرے دلِ شکستہ سے ترا غم نہ نکل جائے۔

چہ شد گر غیر جا در بزمِ آں پیماں شکن دارد　　　دو روزے دیگرے بیچارہ ہم احوالِ من دارد

اگر آج اس پیماں شکن کی بزم میں رقیب کی پذیرائی ہے تو کیا حاصل، دو دن کے بعد اس بیچارے کا بھی وہی حال ہوگا جو میرا ہوا۔

زکویت می برد امروز فردا غیرت عشقم　　　اگرچہ زندگانی بے تو دشوار است میدانم

عشق کی غیرت آج ہی کل میں تیرے کوچہ سے نکلنے پر مجبور کر دے گی، گو یہ معلوم ہے کہ تیرے بغیر زندگی دشوار ہے۔

(باقی)

وفیات

مرزا احسان احمد صاحب مرحوم

افسوس ہے کہ ہمارے شہر کے مشہور وکیل اور نامور شاعر مرزا احسان احمد صاحب کا گذشتہ مہینہ انتقال ہوگیا، ان کی صحت عرصہ سے خراب تھی، ادھر کچھ دنوں سے صاحب فراش ہوگئے تھے، ۲۲ر دسمبر کو وفات پائی، وفات کے وقت ۷۰ سال کی عمر تھی، مرحوم شاعری کے ساتھ اردو کے ادیب ونقاد بھی تھے، ان کا ادبی ذوق بڑا بلند اور پاکیزہ تھا، ان کے کلام اور ادبی مضامین کا مجموعہ شائع ہوچکا ہے، ایک زمانہ میں ان کے اور اقبال احمد خاں صاحب سہیل مرحوم کے دم سے اعظم گڈھ میں شعر و شاعری کا بڑا چرچا تھا، جگر مرحوم جب چشمہ کے ایجنٹ اور بعد میں شاعر کی حیثیت سے اعظم گڈھ آتے تھے تو مرزا صاحب ہی کے یہاں ٹھہرتے تھے، اور شعر و شاعری کی محفل گرم ہوتی تھی، اس میں مولانا عبد السلام مرحوم پابندی سے اور کبھی کبھی سید صاحبؒ بھی شریک ہوتے تھے، جگر صاحب کے کلام کا پہلا مجموعہ داغ جگر اعظم گڈھ ہی سے شایع ہوا، اس پر مرزا احسان احمد صاحب کا مبسوط مقدمہ ہے، اسی سے جگر صاحب کی شہرت کا آغاز ہوا، مرزا صاحب کے گھرسے دار المصنفین کے تعلقات بڑے گہرے تھے، ان کے بڑے بھائی مرزا سلطان احمد صاحب مرحوم دار المصنفین کی مجلس انتظامیہ کے ہمیشہ رکن رہے، ان کے بعد مرزا صاحب منتخب ہوئے، اور اپنی وفات تک رہے، ان کی زندگی بڑی سادہ اور درویشانہ تھی، استطاعت کے باوجود تکلفات سے ہمیشہ بری رہے، طبیعت میں بڑا استغنا تھا، ان کا پیشہ ضرور وکالت تھا مگر اس کی طرف ان کا طبعی رجحان نہ تھا، بس بقدر ضرورت ہی وکالت

میں ختم ہو جاتے ہیں، آج کل آٹھواں اڈیشن چھپ رہا ہے، (پروف آرہے ہیں) کوئی پچاس صفحے کے حواشی بڑھائے ہیں، کوئی دوسرا ترجمہ اتنا زیادہ نہیں چھپتا۔ ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔

سیرۃ النبی کی دو ضخیم جلدیں بھی انشاء اللہ اب مکرر چھپنے والی ہیں، ان میں بھی پچاس ساٹھ صفحوں کے چند نئے ابواب بڑھائے ہیں، مضامین بھی الحمد للہ مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں میں شوق سے پڑھے جاتے ہیں، مقامی اسلامی اور نصرانی ادارے بھی تقریروں کے لیے آئے دن بلاتے رہتے ہیں۔

یہ تعلی کے لیے عرض نہیں کر رہا ہوں، بلکہ عذر کے طور پر کہ اس مشغولیت کے بعد اتنا وقت نہیں ملتا کہ اردو میں کچھ لکھوں اور ضمیر کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیتا ہوں کہ الحمد للہ اردو میں اسلامیات پر لکھنے والے اچھے اور کافی ہیں، میری ضرورت نہیں۔

بعض لوگ "معصومانہ" تجویز پیش کرتے ہیں کہ اپنے فرانسیسی جرمن مقالوں کا اردو ترجمہ کر دو، لیکن اگر میں اپنی ہی تحریروں کا مختلف زبانوں میں ترجمہ کرنے لگوں تو نئے اور زیرِ تیاری مقالات کی تکمیل کون کرے؟

رومی قانون کا مضمون نہ معلوم آپکے ہاں کونسا پہنچا ہے، نہ معلوم بچوں نے اصل مضمون بھیجا یا اصل اپنے پاس رکھ کر نقل بھیجی، التماس ہے کہ ان سے اصل منگوائیں، کیونکہ نقل نویس بعض وقت نادانستہ غلطیاں کرتے ہیں، اور خاصکر اس مضمون میں اتنے اجنبی نام اور الفاظ ہیں کہ نقطہ بھی جگہ سے ہٹ جائے تو بعض وقت مطلب خبط ہو جائے، کیا یہ ممکن ہے کہ اس مضمون کے کچھ مثلاً پچیس پچاس زائد نسخے نکالے جائیں؟ مصارف گزران دوں گا۔

محترم صباح الدین صاحب عمر اور دیگر احباب کی خدمت میں سلام نیازمندانہ عرض ہے۔

خادم محمد حمید اللہ

مطبوعات جدیدہ

مغربی تہذیب آغاز و انجام: مرتبہ جناب محمد ذکی صاحب لکچرار شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

متوسط تقطیع کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۲۰۰ مجلد قیمت عہ مصنف سے مذکورہ بالا پتہ پر ملیگی۔

مغربی تہذیب اس کتاب کا موضوع بحث ہے، اس میں دکھایا گیا ہے، کہ اس کی ابتدار کب اور کس طرح ہوئی، اور پھر وہ کن کن مراحل سے گذر کر موجودہ مقام تک پہنچی ہے، مصنف کے خیال میں دنیا میں بنیادی حیثیت سے دو ہی تہذیبیں ہیں، ایک اسلامی دوسری غیر اسلامی، اسی موخر الذکر کا نام مغربی تہذیب ہے، جو کوئی نئی تہذیب نہیں ہے، بلکہ قدیم زمانہ سے آج تک چلی آرہی ہے، اسی نقطۂ نظر سے اس کتاب میں پہلے انسانی تاریخ کی ابتدا سے بحث کی ہے پھر مغربی تہذیب کے آغاز سے ابتک کی مفصل تاریخ اور خصوصیات بیان کی گئی ہیں مگر اول تو مصنف کا یہ دعویٰ ہی ناقابلِ قبول ہے، دوسرے یہ پتہ نہیں چلتا کہ آخر وہ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟ اور کیوں ان کے نزدیک اسلامی اور مغربی تہذیب کے صالح عناصر میں ہم آہنگی ناممکن ہے؟ اس سلسلہ میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی پر ان کے اعتراضات بیجا معلوم ہوتے ہیں، تاہم اس سے قطع نظر اس کتاب میں تہذیب و ثقافت کے بعض مرکزوں اور گہواروں جیسے عراق، مصر، یونان، روم اور قرون وسطی کے کلیسائی نظام اور فرانس (انقلاب سے پہلے اور بعد) وغیرہ کے سیاسی، مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی حالات اور رجحانات کے بارہ میں مغربی مورخین

کرتے تھے، اور ادھر دس بارہ سال سے بالکل چھوڑ دی تھی، طبیعت بڑی مرنجاں مرنج تھی، کسی کے معاملات اور مقامی سیاست سے ان کو کوئی تعلق نہ تھا، اپنے حال میں مست رہتے تھے، صاحب خیر بھی تھے، کار خیر میں بڑی فیاضی سے صرف کرتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، "م"

مولانا عبد المجید حریری مرحوم

دوسرا علمی حادثہ مولانا عبد المجید حریری مرحوم کی وفات ہے، انھوں نے بھی گذشتہ مہینہ وفات پائی، مرحوم مئو ہ بنارس کے ایک ممتاز انصاری خاندان سے تھے، عربی اور انگریزی دونوں زبانوں کے فاضل تھے، عربی کی تکمیل کے بعد انگریزی کی تعلیم علی گڈھ کالج میں حاصل کی تھی اور اپنے دور کے ممتاز طلبہ میں تھے یہیں سے خلافت اور نان کوآپریشن کی تحریک میں شریک ہوئے اور ایک زمانہ تک جنگ آزادی میں سرگرمی سے حصہ لیتے رہے، اس دور کے تمام بڑے بڑے لیڈروں سے ان کے تعلقات تھے، ہندوستان کی آزادی کے بعد حکومت ہند نے انکو سعودی عرب میں قونصل جنرل مقرر کیا، کئی سال تک اس عہدہ پر رہے، اس سے سبکدوش ہونے کے بعد کچھ دنوں تک سعودی عرب کے پایہ تخت ریاض میں قیام رہا، مرحوم ہندوستان کے ممتاز صاحب قلم تھے، عربی زبان پر ان کو اہل زبان کی جیسی قدرت حاصل تھی، مقرر بھی اچھے تھے، لیکن افسوس انکے سیاسی ذوق نے انکے علمی جوہر دں کو چمکنے کا موقع نہ دیا، ایک عرصے سے اسکا دائرہ بھی مقامی سیاست تک محدود ہو گیا تھا، اسلئے وہ جس علمی شہرت کے مستحق تھے وہ انکو حاصل نہ ہوئی اور اب عرصہ سے خانہ نشینی اختیار کر لی تھی، وہ مسلکاً اہلحدیث تھے لیکن ہر مسلک کے علماء اور اہل علم سے انکے تعلقات تھے، دارالمصنفین کے بزرگوں سے بھی انکے پرانے روابط تھے اس سلسلہ میں کئی مرتبہ یہاں آنا ہوا گذشتہ سال ایک تقریب سے بنارس جانا ہوا تو ملاقات کے لئے انکی خدمت میں بھی حاضر ہوا تھا، بہت ضعیف ہو چکے تھے دماغ بھی پوری طرح کام نہ دیتا تھا، تعارف کے بعد پہچانا اور بڑی شفقت و محبت سے پیش آئے اسیوقت اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ چراغ زیادہ دنوں چلنے والا نہیں، ایک زمانہ میں علمی اور سیاسی حلقوں میں انکی خاصی شہرت تھی، مگر اس دور کے لوگ تو انکے نام سے بھی واقف نہ ہوں گے، البقاء للہ وحدہٗ، اللہ تعالیٰ انکی مغفرت فرمائے،

"م"

اردو کشمیری فرہنگ جلد اول، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، بڑی تقطیع صفحات ۴۳۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت تحریر نہیں، ناشر سکریٹری جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، جموں

جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز اردو اور کشمیری دونوں زبانوں کی مفید خدمات انجام دے رہی ہے، زیر نظر کتاب اسی کا نمونہ ہے، اس میں اردو زبان کے الفاظ اور ان سے بنے ہوئے محاوروں ترکیبوں اور کہاوتوں کے کشمیری زبان میں معانی لکھے گئے ہیں، کتاب کئی جلدوں میں مکمل ہوگی، زیر نظر جلد میں صرف الف سے شروع ہونے والے الفاظ اور محاورون کے معانی لکھے گئے ہیں، کتاب بڑی محنت و کاوش سے، اور گو ان لوگوں کے لئے لکھی گئی ہے، جو اردو سے کشمیری زبان میں ترجمہ و تصنیف کا کام کرتے ہیں، مگر دونوں زبانوں سے واقفیت رکھنے والے عام لوگوں کے لئے بھی یہ مفید ہے،

ترجمان مسلم پرسنل لا نمبر، مرتبہ مولانا عبدالحمید رحمانی صاحب، بڑا اخباری سائز، کاغذ، کتابت، طباعت اچھی صفحات ۰ ۵ صفحے، قیمت ۵۰؁، پتہ منیجر ترجمان، ۳۰- پرلیس اسٹریٹ [illegible] دہلی نمبر ۶،

ہندوستان کی آزادی کے بعد مسلمان جن گوناگوں مسائل سے دوچار ہیں، اُن میں اس وقت سب سے اہم مسئلہ مسلم پرسنل لا کا ہے اور مسلمان من حیث القوم اس کے تحفظ پر متفق اور اس میں حکومت کی مداخلت اور مشترکہ سول کوڈ کے خلاف ہیں، جماعت اہلحدیث کے پندرہ روزہ اخبار "ترجمان" نے اسی مسئلہ پر یہ مسلم پرسنل لا نمبر شائع کیا ہے، جو اس کے جملہ مسائل اور اس سے متعلق مفید اور معلوماتی مضامین پر مشتمل ہے، "پوتے کا حق وراثت" (مولانا عبیداللہ رحمانی)، ہندوستانی مسلمان اور تحفظ شریعت (مولانا محمد عثمان فارقلیط) "مسلم پرسنل لا" (قاضی محمد عدیل عباسی) "مشترکہ سول کوڈ" (ظفر احمد صدیقی)، اور قانون فسخ نکاح مسلمین ۱۹۳۹ء (پروفیسر طاہر محمود) خصوصیت سے اہم

کے حوالہ سے مختلف النوع معلومات آگئے ہیں،

قومی تہذیب اور ہندوستانی مسلمان مرتبہ جناب سید اوصاف علی و عابد رضا بیدار صاحبان، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۲۹۰ مجلد مع گرد پوش قیمت ۵۰ روپیہ

پتہ: رامپور انسٹی ٹیوٹ آف اورئینل اسٹڈیز ۲۰۶ کلاں محل - دہلی نمبر ۶

۱۹۶۹ء میں "عربی اسلامی مدارس کا نصاب و نظام تعلیم اور عصری تقاضے" کے موضوع پر نئی دہلی میں جو سمینار منعقد ہوا تھا، یہ کتاب اس کی روداد ہے، اس سمینار میں مولانا عبد السلام خاں رامپوری پروفیسر سید مقبول احمد، جناب اخلاق احمد، مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور پروفیسر محمد شفیع آگوانی نے مضامین پڑھے تھے، اور بحث میں حصہ لینے والے چند ممتاز لوگوں کے نام یہ ہیں: پروفیسر عبد العلیم وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، پروفیسر افضل خاں مرحوم، بیرسٹر نور الدین احمد مولانا سعید احمد اکبر آبادی ڈاکٹر سعید انصاری، قاضی سجاد حسین، مولانا عبد السلام قدوائی ندوی، جناب لطیف اعظمی اور خود فاضل مرتبین،

عابد رضا بیدار صاحب نے ان حضرات کے مضامین اور تقریروں کے علاوہ اس موضوع سے متعلق بعض دوسری مفید تحریریں بھی جمع کر دی ہیں، اور شروع میں ایک فکر انگیز اور قابل قدر مقدمہ لکھا ہے، اس اعتبار سے یہ اس موضوع پر بڑی جامع کتاب ہو گئی ہے، گو اس کے تمام خیالات سے اتفاق ضروری نہیں، مگر موجودہ زمانہ میں عربی مدارس کے نصاب میں اصلاح کی ضرورت مسلم ہے، اس سلسلہ میں اس کتاب سے بڑی مدد ملے گی، صفحہ ۲۴ پر سعید انصاری صاحب کے بارہ میں لکھا گیا ہے کہ "ایک عرصہ تک دار المصنفین میں رہ چکے ہیں" حالانکہ موصوف کا وطن اعظم گڈھ ضرور رہے، اور وہ دار المصنفین کے موجودہ انتظامیہ کے ارکان میں بھی ہیں لیکن اس سے وابستہ کبھی نہیں رہے، در اصل دار المصنفین سے وابستہ ان کے ہمنام مولانا سعید انصاری مرحوم صاحب سیر انصار تھے،

جسٹرڈ نمبر ال (۵۲۰)

مارچ ۱۹۷۳ء

معارف

مجلس دار المصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپیے سالانہ

دفتر دار المصنّفین اعظم گڈھ

(مکتبہ اقبال احمد)

اور قابلِ ذکر مضامین ہیں، یہ بڑی محنت سے مرتب کیا گیا ہے اور اس کی اشاعت نے وقت کی ایک اہم اور بڑی قومی و ملی ضرورت پوری کی ہے۔

دیوانِ خواجہ میر درد۔ مرتبہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۳۲۸، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۔/ے، پتہ مکتبہ شاہراہ اردو بازار دہلی نمبر ۶۔

یہ اردو کے نامور شاعر اور مشہور صوفی خواجہ میر درد کے اردو دیوان کا نیا ایڈیشن ہے جس کو ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی ریڈر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے دیوان کے کئی مطبوعہ اور قلمی نسخوں اور متعدد تذکروں کی مدد سے مرتب کیا ہے، حاشیہ میں انھوں نے مختلف نسخوں کے اختلافات کی تصریح کر دی ہے، غزلیں حروفِ تہجی کی ترتیب سے دی گئی ہیں، آخر میں فردیات، قطعات، رباعیات، ترکیب بند اور مخمس وغیرہ شامل ہیں، شروع میں ڈاکٹر صاحب کے قلم سے ایک پُرمغز اور قابلِ مطالعہ مقدمہ ہے، اس میں خواجہ صاحب کی شخصیت، شاعری اور تصوف پر بڑے اعتدال و توازن کے ساتھ سنجیدہ بحث کی گئی ہے اور آخر میں [illegible] اور غریب الفاظ کے فرہنگ دیئے گئے ہیں، دیوانِ درد کا یہ ایک عمدہ ایڈیشن ہے [illegible] جامع اور درد کی شاعری اور تصوف کے بارے میں مفید معلومات پر مشتمل ہے۔

اردو کے حروفِ تہجی۔ مرتبہ ڈاکٹر محمد انصار اللہ صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۹۶، قیمت ۶/ روپے، پتہ: ادارۂ المخدوم، ڈاکخانہ تندا، ضلع [illegible]، اتر پردیش۔

ڈاکٹر محمد انصار اللہ نوجوان اور لائق اہلِ قلم ہیں، مخطوطات اور غالبیات وغیرہ پر ان کے بعض محققانہ مضامین نے اصحابِ علم و نظر کو ان کی جانب متوجہ کر دیا ہے، اس مختصر رسالہ میں اردو کے حروفِ تہجی کے عہد بعہد ارتقا کا ذکر، اب تک ان کے سلسلہ میں ہونے والی اصلاحات و ترمیم کا جائزہ، ان کی وضع و ایجاد کے موقع اور اردو کے فارسی رسم الخط اختیار کرنے کے وجوہ و نتائج وغیرہ پر گفتگو کی گئی ہے، مصنف نے رسم الخط کی اصلاح کے سلسلہ میں عربی و فارسی کے مخصوص حرفوں کو ترک کرنے کی رائے کی شدت سے مخالفت کی ہے، آخر میں اس موضوع کے متعلق میر امن دہلوی کی تحقیق کے چند صفحات اور ایک مفید رسالہ کا ضروری حصہ بھی مختصر تعارف کے ساتھ شامل کیا گیا ہے، یہ کتابچہ مفید معلومات پر مشتمل ہے۔

(ض)

جلد ۱۱۱ ماہ صفر المظفر ۱۳۹۳ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۷۳ء عدد ۳

مضامین

شذرات — شاہ معین الدین احمد ندوی — ۱۶۲-۱۶۴

مقالات

مولانا محمد علیؒ کی یاد میں، — سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے — ۱۶۵-۱۸۴

کیا اسلامی قانون، رومی قانون کا مرہونِ منت ہے۔ — ترجمہ جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب (پیرس) — ۱۸۵-۲۰۰

غالب کا مذہبی رجحان اُن کے کلام کی روشنی میں، — ڈاکٹر ام ہانی، ریڈر شعبہ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ — ۲۰۱-۲۱۴

شذرات جواہر، — شاہ معین الدین احمد ندوی، — ۲۱۵-۲۲۸

باب التقریظ والانتقاد

ایران سوسائٹی سلور جوبلی سووینیر (۱۹۴۴ء - ۱۹۶۹ء) — سید صباح الدین عبدالرحمن، — ۲۲۵-۲۲۹

مطبوعات جدیدہ

"ض" م — ۲۳۶-۲۴۰

تو ملک آزاد عالی دماغ انسانوں سے محروم ہو جائیگا جو جمہوریت کے لئے بڑا المیہ ہوگا۔

ہندوستان کا دستور جمہوری اور سکولر ہے، اس نے اقلیتوں کو اپنی ضرورت کے مطابق ادارے قائم کرنے کا حق دیا ہے، اسلئے کسی اقلیتی ادارہ کو اس کے کردار سے محروم اور اُن کی متحدہ آواز کو نظر انداز کرنا دستور کے بھی خلاف ہے اور جمہوریت کے بھی، باقی کچھ مسلمان تو ہر مسئلہ میں حکومت کے ہم نوا بن جائیں گے، مگر انکی جو حیثیت ہے وہ خود حکومت کی نگاہوں سے مخفی نہیں، اُن میں وہ مسلمان بھی ہیں جو کلام مجید کے صریح احکام میں تبدیلی چاہتے ہیں اور وہ بدبخت بھی ہیں جو اس کو نام نہاد ترقی میں مزاحم و قیانوسی کتاب سمجھتے ہیں، ایسے لوگ مسلمان کہلانے کے کب مستحق ہیں، اور اُن کو مسلمانوں کا ترجمان سمجھنا کہاں تک صحیح ہے اگر جان بوجھکر حکومت ان کو سہارا دیتی ہے تو دونوں فائدہ اٹھانے کے لئے ایک دوسرے کو دھوکا دیتے ہیں، ہندوستان مختلف نسلوں مختلف مذہبوں اور مختلف تہذیبوں کا گہوارہ ہے، اور اس کا حسن اسی رنگارنگی میں ہے، اسی لئے اس کا دستور سکولر رکھا گیا ہے اور ان سب کو اپنے مذہب اور تہذیب و روایات کو قائم رکھنے کا پورا حق دیا گیا ہے، اس لئے قومی ایکتا اور قومی دھارے کے نام پر ان سب کو ایک رنگ میں رنگنے کی کوشش دستوری ضمانت کے سراسر خلاف ہے قومی ایکتا اور قومی دھارے کا مطلب آپس کے تعلقات میں اتحاد و خوشگواری اور ملک کی خدمت اور اس کے مفاد میں اتحاد و یکجہتی ہے، یہ ہرگز نہیں ... کہ سارے فرقے اپنی خصوصیات مٹا کر ایک ہی دھارے میں بہ جائیں، اس کو کوئی فرقہ بھی گوارا نہیں کرسکتا، اس سے اتحاد و یکجہتی کے بجائے اور اختلاف و انتشار پیدا ہوگا،

کچھ لوگوں کو مسلم یونیورسٹی میں فرقہ پروری کی بو آتی ہے اور اُن کے نزدیک اس کا علاج یہ ہے کہ اُس کا اقلیتی کردار ختم کر دیا جائے، اس کا بھی الٹا اثر پڑے گا، اس سے فرقہ وارانہ جذبات اور ابھریں گے لیکن

شذرات

مسلم یونیورسٹی کے بارہ میں مسلمانوں میں جو اضطراب اور جس طرح اس مسئلہ پر اُن کی آواز متحد ہے اس سے حکومت کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ وہ کسی حال میں بھی اس سے دست بردار ہونے کیلئے تیار نہیں ہیں مسلم یونیورسٹی اُن کی عزیز ترین متاع، اُن کی تمناؤں کا مظہر، اُن کی ایک صدی کی محنت کا پھل اور اُن کے دل و دماغ کا سرچشمہ ہے، اُن کی تقریباً تمام بڑی بڑی شخصیتیں اسی نے پیدا کیں جنھوں نے ہر میدان میں نمایاں کارنامے کئے اور ملک وملت دونوں کی بہترین خدمات انجام دیں مسلمان اس کو کس طرح گوارا کرسکتے ہیں کہ اس کے تعلیمی کردار کو ختم کرکے اس کی روح نکال لی جائے اور اس سرچشمہ کو ہمیشہ کے لئے خشک کر دیا جائے۔

مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ تنہا مسلمانوں کا نہیں بلکہ جمہوریت، سیکولرزم اور تعلیم کی آزادی کا ہے اسی لئے بہت سی جمہوری پارٹیاں اور آزادی تعلیم کے حامی مسلمانوں کے ساتھ ہیں، یونیورسٹیوں میں بھی اس کے خلاف احتجاج ہو رہا ہے، درحقیقت تعلیم گاہیں ہی وہ سرچشمے ہیں جن سے روشن دماغ اور اعلیٰ صلاحیتوں کے افراد پیدا ہوتے ہیں، جو ملک کی خدمت بھی انجام دیتے ہیں، اور حکومت کو اس کی غلط روی پر ٹوک بھی سکتے ہیں۔ اس لئے روس کے علاوہ سارے مہذب ملکوں میں تعلیم حکومت کے اثر سے آزاد ہے۔ اس کو صرف اس حد تک مداخلت کا حق ہے کہ اُن کا کوئی عمل ملک کے مفاد کے خلاف نہ ہو اگر انھیں بھی انسانوں کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنے کی فیکٹری بنا لیا جائے

مقالات

مولانا محمد علی کی یادیں

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۴)

مارماڈیوک پکتھال کے خطبۂ صدارت کے بعد ایسکس ہال کا مجمع مولانا محمد علی کی تقریر سننے کا مشتاق تھا۔ انھوں نے حاضرین کو مخاطب کرکے کہا:۔

"میں ایک ایسی جگہ آیا ہوں جو جمہوریت کا قلب ہے، اور میں دنیا کے اس حصہ سے آرہا ہوں جو کہ بیسویں صدی میں بھی استبدادی طریقے کے لیے بدنام ہے، لیکن یہاں آکر میرے لیے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ساڑھے چھ ہزار میل کی بحری اور بری مسافت کو طے کرنے کے بعد کوئی فرق نظر آتا ہے، ہم نے محسوس کیا کہ ترکوں کے دشمنوں نے ان کے خلاف عرصہ دراز سے پروپگنڈا جاری کر رکھا ہے، ہمارے پاس اس پروپگنڈے کی تردید کے لیے تو صرف سچائی ہے اور ہمارا ضابطۂ اخلاق ہے جو چاہیے، لیکن ہم کو کچھ کرنا ہے، ہم جس پیام کو لیکر آئے ہیں اس کو یہاں کے لوگوں تک پہنچانا ہے، ان کو اس اشتباہ سے بھی آگاہ کرنا ہے جو ہم کو دیا گیا ہے،

یہاں بہت کم لوگ ہیں جو ترکوں کے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں، ترکوں کو نہ صرف برے دن کا سامنا کرنا ہے بلکہ ان کو بدنامیوں سے بھی سابقہ ہے، ہاں ایسے انگریز ضرور ہیں جو ترکوں سے واقف ہیں، اور جو ان سے واقف ہیں وہ ان سے ہمدردی رکھتے ہیں، میری ملاقات کسی ایسے انگریز سے اب تک نہیں ہوئی جو ترکوں سے لڑا لیکن ان کے بارے میں اچھی رائے نہ رکھتا ہو (صدائے تحسین) برطانیہ کے ایسے لوگوں کی تعداد بکثرت ہے جو وطن سے باہر نہیں نکلے ہیں، اور جو ترکوں کو مطلق نہیں جانتے ہیں،

یہ الزام ہی سرے سے غلط ہے جس یونیورسٹی نے مولانا محمد علی، شوکت علی، عبدالمجید خواجہ، تصدق احمد خاں شروانی، ڈاکٹر سید محمود، رفیع احمد قدوائی، اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے سیکڑوں قوم پرور پیدا کئے ہوں، اور جنھوں نے اس زمانہ میں انگریزوں کے نظام تعلیم کا بائیکاٹ کیا ہو اور مسلم یونیورسٹی کے مقابلہ میں ایک آزاد قومی یونیورسٹی قائم کردی ہو جبکہ مالوی جی نے قوم پرور ہندوؤں کو ہندو یونیورسٹی میں قدم نہ رکھنے دیا تھا، اس پر فرقہ پروری کا الزام سراسر بہتان ہے۔ یہ قومی یونیورسٹی آج بھی قوم پروری اور سیکولرزم کی سب سے بڑی معلم ہے، باقی کسی تعلیمی ادارے سے سو فیصدی ایک خیال کے لوگ پیدا نہیں ہوتے، کیا ہندو یونیورسٹی سے مہا سبھائی اور جن سنگھی نہیں پیدا ہوئے، وہ تو آج بھی آر۔ ایس۔ ایس۔ کا گڑھ ہے لیکن کیا اس جرم میں کسی میں اس پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت ہے، یہی معاملہ مسلم یونیورسٹی کے ساتھ بھی ہونا چاہئے۔

ہمارا نقطۂ نظر تو یہ ہے کہ ہندو اور مسلم دونوں یونیورسٹیوں کو تعلیم کے ساتھ ہندو اور مسلم تہذیب و ثقافت کا بھی مرکز ہونا چاہئے، یہ فرقہ پروری نہیں بلکہ حکومت کی سیکولرزم کا عملی نمونہ ہوگا، کسی تہذیب و ثقافت کا مرکز ہونا کوئی فرقہ پروری نہیں، بلکہ دوسری تہذیبوں کی مخالفت فرقہ پروری ہے، ان دلائل سے قطع نظر حکومت کو اپنے وعدوں کا بھی تو لحاظ کرنا چاہئے۔ وہ گزشتہ الیکشن سے پہلے کیا وعدہ کرتی چلی آئی تھی۔ اور اب اس کا عمل کیا ہے۔ اس کا اثر مسلمانوں پر کیا پڑے گا۔ اس لئے یقین ہے کہ وہ بھی دیر سویر صحیح نتیجہ پر پہنچے گی، لیکن جس قدر جلد [illegible] ہو جائے۔ اسی قدر بہتر ہوگا۔

برطانوی امپائر کو ایک خطرناک منزل کی طرف لے جا رہے ہیں، اگر آپ کو اپنے امپائر کی قدر ہے. تو آپ صبر و سکون کے ساتھ میری باتوں کو سنیں اور میں جو کچھ کہوں اس پر غور کریں،

بعض حلقوں میں ہمارے وفد کی اہمیت کم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، خواتین و حضرات! میں آپ کو بتاؤں کہ ہم کون ہیں، ہم کس کی نمایندگی کرنے آئے ہیں، ہم کو یہاں آل انڈیا خلافت کانفرنس نے بھیجا ہے، جو اس وقت ہندوستان کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ نمایندہ قومی جماعت ہے، انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ بڑی اور اہم سیاسی تنظیمیں ہیں، لیکن ہم جس کانفرنس کی نمایندگی کر رہے ہیں، وہ ان دونوں سے بڑی اور اہم ہے، آل انڈیا خلافت کانفرنس کے جس اجلاس میں یہ طے ہوا کہ ہم وفد کی شکل میں یہاں آئیں، اس میں بیس ہزار ہندو اور مسلمان شریک تھے، اور اس کی کارروائی شام کے چھ بجے سے شروع ہوئی اور دو بجے رات تک جاری رہی، میں نے اپنی پوری زندگی میں ہندوستان کے کسی جلسہ میں وہ جوش و خروش نہیں دیکھا جو اس میں دیکھنے میں آیا، اور اب ہم جب کہ یہاں ہیں، ہندوستان کے اندر کیا ہو رہا ہے، ہمارے پاس ہندوستان کے ہر حصہ سے تار پہنچ رہے ہیں، چاٹگام جیسی چھوٹی جگہ میں پندرہ ہزار لوگوں کا مجمع ہوا، ان کی طرف سے بھی تار آیا، ہم کو یہاں لوگوں نے بھیجا ہے، ہم ان سرکاری حکام کی طرف سے نہیں آئے ہیں، جو کسی کی بھی نمایندگی نہیں کرتے، ہمارے متعلق یہ بھی جان لیں کہ ہم میں سے بعض لوگوں نے قید کی سزا کی مشقت جھیلی ہے، اور ایسی سزا جو مذہبی سرگرمیوں کی خاطر کسی مقدمہ کے بغیر محض حکام کے وہم پر دی گئی، اور ہندوستان میں قانون کا استعمال اس طرح

پھر بھی وہ ان کے خلاف تعصب رکھتے ہیں، یہ محض اس لیے کہ ترکوں کے دشمنوں نے تعصب کا زہر اس طرح پھیلا رکھا ہے کہ اس کا نقش مٹائے نہیں مٹتا۔ ایسی صورت میں لوگ میرے پاس آئے اور انھوں نے مجھ کو یہ رائے دی کہ میں اپنے مطالبات میں سختی نہ برتوں، انگریزوں کے مزاج کو غلط طریقہ سے برہم نہ ہونے دوں بلکہ معتدل بن کر کامیابی حاصل کروں"۔ یہ سن کر میں نے اپنے سے پوچھا کہ کیا اس وقت میں جمہوریت کی ایسی سرزمین میں ہوں جہاں کہ برسراقتدار لوگ اپنی سیاست لوگوں کی خواہش کے مطابق بناتے ہیں، یا میں ایسے ملک میں ہوں جہاں کے کروڑوں کی آبادی اپنی سیاست میں مٹھی بھر غیرملکی استبداد کی محتاج رہتی ہے، (صدائے تحسین) جب ہم اس ملک میں پہنچے تو ہم پر زور دیا گیا کہ ہم ان خیالات کی نمایندگی نہ کریں جنکو لے کر ہم یہاں آئے ہیں، بلکہ ہم یہاں کے اونچے حلقہ کے استبداد پسندوں کے خیالات کو مدنظر رکھ کر ان کی مزاجداری کریں، لیکن اے خواتین وحضرات! میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں اپنے لوگوں کے خیالات میں ترمیم کرکے اعتدال نہ پیدا کروں گا، کیونکہ ان کے مطالبات خود ہی معتدل ہیں، ہم اس پیام کو یہاں کے لوگوں تک ضرور پہنچائینگے، جو ہم اپنے لوگوں کی طرف سے لے کر آئے ہیں، میں اپنا کوئی مطالبہ آپ پر تھوپنے کی کوشش نہ کروں گا، میں جو کچھ پیش کروں گا، اس میں دلائل ہوں گے، اس کے لیے آپ سے بحث ومباحثہ کروں گا، اس کی تصریح کروں گا، اور اگر میری کوئی بات غیر واضح ہو یا بالکل نئی ہو یا چونکا دینے والی ہو تو میں اس انصاف اور کھلے ہوئے ذہن کا سہارا لوں گا جو انگریزوں کی پرانی روایت رہی ہے، (تالیاں) سامراج پسند، استحصال کرنے والے اور ہاتھوں میں کلہاڑی رکھنے والے لوگ

اس لیے کہ وہ بہت پسند کیے جاتے تھے۔ ان کو پریس ایکٹ کی گرفت میں لاکر عوام یوں
میں جانے سے روک دیے گئے، میرا انگریزی ہفتہ وار کامریڈ بھی اسی تحت میں لایا گیا،
اس کی ضمانت صرف ایک مضمون کے شائع ہونے پر اسی روز ضبط کر لی گئی جس روز
کہ مارننگ پوسٹ، ڈیلی ٹیلی گراف اور نیو اسٹیٹسمین میں اس کی تعریف نکلی، میرا
اردو اخبار ہمدرد بھی اسی قانون کی زد میں آگیا۔ حالانکہ جنگ عظیم کے زمانے میں
اس کی تعریف وہی حکام کرتے رہے جنھوں نے اس کو کسی اطلاع کے بغیر موت کے
گھاٹ اتارا، یہ تو صرف دو مثالیں ہیں، اسی قسم کا رویہ مسلمان رہنماؤں کے ساتھ
بھی اختیار کیا گیا، دیوبند کے مولانا محمود الحسن صاحب ہندوستان کے بہت بڑے
مذہبی پیشوا ہیں۔ حکومت نے ان کو اپنے مطلب کی خاطر استعمال کرنا چاہا، مگر انھوں نے
بزدلی نہیں دکھائی، ان کی عمر ستر سال کے قریب ہے، لیکن ان کو ہندوستان چھوڑنا پڑا،
ان کو ڈر پیدا ہوا کہ مذہب کے نام پر ان سے کسی ایسی تحریر پر دستخط لیے جانے کی
کوشش کی جائے گی جو ان کا ضمیر پسند نہ کرے، وہ مکہ معظمہ ہجرت کر گئے، جہاں امید تھی
کہ ان کے ضمیر پر کوئی جابرانہ رویہ اختیار نہ کیا جائے گا، لیکن وہاں بھی ان پر اسی بات
کے لیے دباؤ ڈالا گیا جس کا انھیں ڈر تھا، اور اس کا نتیجہ کیا ہوا، وہ اسلام کی مقدس ترین
جگہ میں شریف کے ذریعہ گرفتار کیے گئے اور مصر بھیج دیے گئے۔ لیکن حکومت کو یہ خوف
پیدا ہوا کہ ایسے ایماندار اور پاک ضمیر رکھنے والے شخص کی موجودگی سے مصر کے باشندے
کہیں متاثر نہ ہو جائیں، اس لیے ان کو مالٹا میں لیجاکر محبوس کر دیا گیا، اور وہ اب تک
وہاں ہیں، حالانکہ شاہی اعلان سے اور سب کو معافی دے دی گئی ہے، یہ شکایت بھی
سننے میں آئی کہ ان کو اور انکے ساتھیوں کو پوری ہی غذا نہیں دی جاتی ہے۔ معلوم نہیں

کیا جا رہا ہے کہ ہم میں سے جو سب سے اچھے لوگ ہیں وہ جیل جانا اپنی بڑی عزت سمجھتے ہیں، کیا اس کی ضرورت ہے کہ ہم آپ کو آپ کی پرانی تاریخ کے واقعات یاد دلائیں، ہیمپڈن نے کیا کیا مصائب اس آزادی کی خاطر برداشت کیے جن پر آج آپ کو فخر ہے، میں انگریز مردوں اور خواتین سے درخواست کرتا ہوں کہ ہم کو اس حق سے محروم نہ کریں جس سے ہم آپ سے کچھ کہہ سن سکیں محض اس بنا پر کہ ہندوستان میں آپ کے نمایندوں نے ہم کو آزادی سے محروم کر رکھا ہے، (صدائے تحسین)

گذشتہ جمعہ کو مسٹر لائڈ جارج نے ڈاوننگ اسٹریٹ میں کہا کہ انھوں نے مسلمانوں کی نمایندہ رائے سے مشورہ لیا ہے، اور ہندوستان کی رعایا کے خیالات کے احترام کا پورا لحاظ رکھا ہے، میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ کون سے لوگ ہیں جن کی حکومت نے سماعت کی، ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں میں سے کوئی بھی صلح کانفرنس میں شریک نہیں ہوا، لارڈ سنہا میرے ذاتی دوست ہیں، میں ان کی عزت ہی نہیں بلکہ ان سے محبت بھی کرتا ہوں، وہ ہندوستان کے نمایندے نہیں ہو سکتے، اگر حکومت نے ہندوستان کی دو قسم کی رائیں حاصل کر لی ہیں تو پھر یہ شائع ہونی چاہییں، تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ صلح کانفرنس میں ان نامعلوم لوگوں نے کیا کہا، ہندوستان کی صحیح آواز تو دبا دی گئی ہے، وہاں کوئی آدمی ایسی بات کہتا ہے جو حکومت کو پسند نہیں ہوتی ہے تو وہ قید میں ڈال دیا جاتا ہے، اخبارات کی اشاعت بند کر دی جاتی ہے، اور ایسے اخبارات شائع نہیں ہونے دیے جاتے جو ہندوستانی مسلمانوں کے خیالات کا اظہار کر سکیں، میں ایسے ایک درجن اخبارات کا نام بتا سکتا ہوں، جو چھ مہینے سے زیادہ جاری رہنے نہیں دیے گئے، اس لیے نہیں کہ ان کے پڑھنے والے نہیں تھے، بلکہ

لوگ اور بھی آسکتے ہیں، اگر ان کی سماعت ہو......

ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہم ترک تو نہیں ہیں، ترکوں سے ہمارا کوئی سیاسی تعلق نہیں، پھر ہم ترکوں کے ساتھ سمجھوتہ کرانے میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہیں، ہم ترکوں کے وکیل نہیں ہیں، بلکہ ہم ہندوستانی دعویٰ کی وکالت کرنے آئے ہیں، ہم ترکوں کی خاطر بولنے نہیں آئے ہیں، ہم تو اپنے حق کو جتانے کے لیے آئے ہیں، ہم اس کی تصریح کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارا مسئلہ صرف ترکوں کا نہیں، بلکہ اسلام کا ہے۔ اسلام جغرافیائی اور نسلی حد بندی کا قائل نہیں، موجودہ یورپ کی قومیت نے تو انسانی ارتباط اور انسانی ہمدردی میں رکاوٹ پیدا کر دی ہے، اسلام قومیت کے بجائے مافوق القومیت کی تعلیم دیتا ہے، ہم ایسی قومیت کے مندر کے پجاری نہیں ہیں جہاں یہ مالا جپا جاتا ہو کہ ہمارا ملک چاہے صحیح یا غلط کام انجام دے ہم بہرحال اس کے حامی ہیں (تالیاں) گذشتہ جنگ عظیم میں انسان کا سارا ہنر انسانیت کے تحفظ کے لیے نہیں بلکہ انسانیت کی غارتگری کے لیے خرچ کیا گیا، اور یہ جنگ قومیت کے نام پر لڑی گئی، موجودہ قومیت کی شیطنت کو اب ختم کرنے کا وقت آگیا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک ترک محض ایک انسان نہیں ہے، بلکہ وہ ان کا بھائی ہے، وہ ایک ملک اور ایک مشترکہ نسل کے نہ سہی، کتوں اور گھوڑوں کی تفریق نسل کی حیثیت سے کی جاتی ہے، انسانوں کی تفریق اس طرح نہیں کیجاتی، زندگی سے متعلق ہمارا اور ترکوں کا مطمحِ نظر ایک ہے، ہم دونوں ایسے ادارے اور قوانین کے پابند ہیں جن سے ہمارے نقطۂ نظر میں ایسا اشتراک پیدا ہوتا ہے جو اسلام کا کلچر کہلاتا ہے، ترک اور ہم دونوں انسانیت کے فروغ کے علمبردار

یہ صورت حال ابھی تک جاری ہے یا ختم کر دی گئی، ان کی مشروط رہائی کی خبر ملی تھی لیکن انھوں نے مشروط طور پر رہا ہونا پسند نہیں کیا۔ سورہ یوسف میں خود حضرت یوسفؑ کی زبانی ہے کہ "اے میرے مولیٰ قید خانہ مجھکو اس چیز سے زیادہ عزیز ہے جس کے لیے مجھکو دعوت دی جاتی ہے"۔ ہندوستان کے تمام مسلمان اس برے رویہ پر احتجاج کر رہے ہیں، اور اگر مولانا کی جلد رہائی نہیں ہوئی تو اس کے نتائج بہت ہی خطرناک ہونگے۔

ہندوستان میں مسٹر مانٹیگو آئے، تو میری اور میرے بھائی کی نظر بندی پہ احتجاج کی تجدید ہوئی، ان کے پاس ایک روز میں لاکھوں تار پہنچے، ہم دونوں کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا، اس احتجاج سے ہم اپنی مقبولیت پر خوش ہو سکتے ہیں لیکن ہم خوش نہیں ہو سکتے، یہ مقبولیت در اصل خلافت تحریک کی تھی جس کو ہم نے مذہبی فریضہ سمجھ کر فروغ دیا، ٹائمس اخبار کی نظر میں یہ ساری باتیں مذمت کے لائق ہیں، لیکن ہمارے اور ہمارے دوستوں اور رشتہ داروں کے لیے یہ باتیں قابل فخر ہیں،

ہم کو یہ کہنے کا حق ہے کہ ہم یہاں ہندوستان کے لوگوں کی نمایندگی کرنے آئے، ہمارے وفد میں دو تو صحافت نگار ہیں جو ہندوستان کی رائے عامہ کی ترجمانی کرتے رہے ہیں، اور وہ یہاں اس لیے بھیجے گئے ہیں کہ وہ برطانوی سیاست سے نا واقف نہیں ہیں لیکن ہمارے لوگوں نے ہمارے ساتھ ایک مشہور ممتاز مستشرق اور عالم کو بھی بھیجا ہے، تاکہ وہ ہندوستان کے علماء کی نمایندگی کر سکیں، کیونکہ ہم جو مسئلہ پیش کرنے آئے ہیں، وہ مذہبی ہے، اس لیے ہندوستان کے مذہبی طبقہ کی نمایندگی بھی ضروری تھی، ہمارے ساتھ اور بھی افراد آتے لیکن وقت گذر رہا تھا، اس لیے اس پہلی جماعت ہی کو بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا، کچھ اور لوگ جلد ہی آئیں گے، اور بہت سے

ہمارے مذہب کا علمبردار بن سکتا ہے ۔

ذرا مجھکو خلیفہ کی دنیاوی قوت کے متعلق کچھ وضاحت کردینی چاہیئے ۔ اسلام محض اتوار ، یوم السبت اور جمعہ کی حد تک محدود نہیں ہے ، خلیفہ صرف تسبیح پڑھنے کے لیے مقرر نہیں کیا جاتا ہے ، ہمارے مذہب کا دفاع بھی اس کا اصلی فرض ہے ، عیسائیت نے حضرت عیسیٰؑ کے وعظ کو سیاسی مفاد کی خاطر رد کر رکھا ہے ، کمزور عیسائیت دنیا کی سلطنت کی مالک نہیں بنی ہوئی ہے ، پھر اسلام سے یہ کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے بائیں گال کو اس کے سامنے پیش کردے ، جس نے اس کے دائیں گال کو زخمی کیا ہے ، مسلمانوں کے پاس جو کچھ ہوتا ہے چاہے وہ جسمانی قوت ہی کیوں نہ ہو ، وہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں صرف کیے جانے کے لیے ہے ، اور اگر کوئی مسلمان اپنی کسی چیز کو بھی اسلام کی حمایت میں استعمال کرنے میں گریز کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے مشن کی خیانت کرتا ہے ، اور اگر قوت کو انسانی مسائل کے حل کرنے کے سلسلہ کو بالائے طاق رکھ دینے کا فیصلہ کر لیا جائے تو سب سے پہلے مسلمان اپنے اسلحہ اور تلوار کو ہل جوتنے میں لگا دیں گے (تالیاں) لیکن آج ہم کیا دیکھ رہے ہیں ، لارڈ برائس تو اپنے اتحادیوں کو یہی تلقین کر رہے ہیں کہ خلافت کے خلاف موٹا ڈنڈا استعمال کیا جائے ، وہ کہتے ہیں کہ مشرق کے لوگ اس کے علاوہ اور کچھ سمجھنے کے لیے تیار نہیں لیکن ذرا میں پوچھوں کہ مغرب کے لوگ اس کے علاوہ اور کیا سمجھنے کے لیے تیار رہتے ہیں ؟ ہم اتحادیوں کے متعلق تو کچھ نہ کہیں گے لیکن جرمنوں ، اسٹریا کے باشندوں اور بالشویکوں کے متعلق کچھ کہنے میں کم خطرہ ہے ، کیا یہ لوگ مغرب کے رہنے والے نہیں ہیں ؟ وہ موٹے ڈنڈے کے علاوہ اور کیا جانتے ہیں ، کیا جرمنوں کو صلح کے لیے جو راضی کیا گیا ہے ، اس میں لارڈ برائس کی زبان کی فصاحت دبلاغت

بنائے گئے تھے، ہم دونوں تمام پیغمبروں کے وارث ہیں، یہ صحیح ہے کہ ہم جس مشن کو لے کر آئے تھے، اس کی تکمیل میں ہم کامیاب نہیں ہو سکے ہیں، اور ہم پہ خدا نے جو اعتماد کیا تھا، اس کو ہم پورا نہ کر سکے ہیں، آپ ہم کو ملامت کر سکتے ہیں، لیکن ہم کو جو مشن دیا گیا ہے وہ ملامت کے قابل نہیں.......

اسلام میں ایسے عقائد اور نظریات نہیں ہیں جن کی آڑ میں اور دوسرے پیشوا انسانیت کو ستیاناس کرتے رہتے ہیں، اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، ایک صحیح کردار کی مکمل تلقین ہے، ایک ایسی معاشرتی سیاست ہے جو انسانی نسل بلکہ پوری تخلیق کی طرح وسیع ہے، اس کے دو مرکز ہیں، اس کا ایک مرکز تو خلیفہ کی ذات میں ہے، اور دوسرا مکانی مرکز جزیرۃ العرب ہے، جو اسلام کی مقدس سرزمین ہے، خلیفہ امیر المومنین ہوتا ہے، اس کے حکم کی تعمیل ہر مسلمان کے لیے اس وقت تک کے لیے لازمی ہے، جب تک یہ قرآن اور سنت کے خلاف نہ ہو، اسلام کے خلیفہ کی حیثیت پوپ سے زیادہ بھی ہے اور کم بھی ہے، زیادہ اس لحاظ سے ہے کہ اسلام دنیاوی اور مذہبی تفریق کا قائل نہیں، کم اس خیال سے ہے کہ خلیفہ کی ذات کوتاہیوں سے بالاتر نہیں سمجھی جاتی ہے، اگر اس میں اور مسلمانوں میں اختلاف ہو جائے تو پھر خدا کا حکم ہی ثالث بن جاتا ہے، اور آخری فیصلہ قرآن اور سنت کے مطابق ہی کیا جاتا ہے، مسلمان خلیفہ کے رحم و کرم کا ماتحت نہیں ہوتا ہے، اس کا ضمیر آزاد رہتا ہے، اگر خلیفہ کا کردار غیر اسلامی ہو جاتا ہے تو مسلمان اس کو معزول کر دیتے ہیں، اور اگر اس کا حکم اسلام کے مطابق ہوتا ہے تو اسلام کی تعلیم ہے کہ اس کے حکم کی تعمیل کیجائے، اس طرح خلیفہ ہی نہ کہ کوئی اور حکمران

پر جو چیز اچھی سمجھی جاسکی ہے، وہ یہ ضرور ہے، ترکی کے ساتھ بے رحمانہ سلوک صدیوں سے
کیا جارہا ہے، اسی لیے یہ یورپ اور ایشیا میں اپنے بہت سے علاقوں سے محروم ہوگیا ہے،
طرابلس میں اس کے لیے جو کچھ ہوا، اس کو خود اتحادیوں نے شرمناک قزاقی کہا ہے،
اب ہم اعتدال پسندی کی خاطر اس بات کے خواہاں ہیں کہ بلقان کی جنگ کے بعد
ترکی کے پاس جو کچھ رہ گیا ہے، وہ رہنے دیا جائے، یورپ اور امریکہ کے مدبرین خصوصاً
صدر ولسن کا خیال تھا کہ جنگ عظیم کے بعد نئے آسمان اور نئی زمین دکھائی دے گی،
السس لورین اس کے اصلی حقداروں کو واپس کردیا گیا ہے، اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس سے
انصاف کا بول بالا ہوا ہے، اسی طرح جو علاقے ترکی سے لیے گئے ہیں، اگر ترکوں کو واپس
کردیے جائیں یا طرابلس کا جو حصہ عربوں سے چھین لیا گیا ہے، اگر ترکوں کو نہ سہی عربوں
کو لوٹا دیا جائے، یا مصر کا وہ حصہ جو اس سے کاٹ لیا گیا ہے، اگر مصر کو دیدیا جائے تو کیا
اس سے انصاف کی صدا بلند نہ ہوگی. لیکن ہم یہ نہیں چاہتے، گرچہ ان علاقوں کو اپنے
بھائیوں کے حق خود اختیاری سے پوری ہمدردی رکھتے ہیں، ہم جو کچھ چاہتے ہیں وہ
بہت ہی کم ہے، اور اگر وہ لوگ بھی جو مسائل کا جائزہ لیتے وقت کبھی دو متضاد قسم
کے معیار کو اپناتے ہیں، ہمارے اس مطالبہ پر غور کریں گے، تو اس کو معتدل پائینگے،
جنگ میں جرمنی کی قوت توڑ دی گئی، لیکن اتحادی ابتک مضبوط ہیں، کیا وہ ترکی
سے وہی خطرہ رکھتے ہیں، جو وہ جرمنی سے رکھتے تھے؟ ہم ایسا نہیں سوچ سکتے. انگلستان
بہت کچھ کھو چکا ہے، لیکن امید ہے کہ اس کی وہ حیثیت ضائع نہیں ہوئی ہے، جس سے
وہ دوسروں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرسکے، کیا اس کی سمجھ اتنی برباد ہوچکی ہے،
کہ وہ اپنی بقا ترکوں کی بربادی ہی میں تصور کرنے پر مجبور ہو جائے، اس طرح کے

کارگر ہوئی ہے، یا اتحادیوں کے اور زیادہ موٹے ڈنڈے! (قہقہہ) ہاں، جب تک آپ کے لارڈ برائس جیسے لوگ ہیں، اور جب تک آپ کے پاس موٹے ڈنڈے ہیں تو ہم کو بھی کسی قسم کا موٹا ڈنڈا اپنے مذہب کے دفاع کے لیے چاہیے، تاکہ ہم اپنے کو ایسے لوگوں کے غلبہ و استیلاء سے بچا سکیں جو ہمارے ضمیر کے لیے خطرناک بنے ہوئے ہیں، (تالیاں) یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے خلیفہ کے لیے دنیاوی طاقت کے بھی خواہاں ہیں، آپ اگر یہ سمجھتے ہیں کہ آپ ہندوستان کے مسلمانوں کو اس طرح خوش رکھ سکتے ہیں کہ آپ ترکوں کو صرف قسطنطنیہ میں محدود کردیں اور خلیفہ کو ویٹیکن کے پوپ سے بھی بدتر بناکر رکھیں، اور وہ محض ایک قیدی بن کر رہے، تو حضرات و خواتین! آپ کو نہ صرف اسلام بلکہ ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوستانیوں کے متعلق بہت کم معلومات ہیں، یہ ذلت کبھی گوارا نہیں کیجا سکتی ہے، مسلمان فوجی اس منحوس جنگ میں جو شریک ہوگئے ہیں، اس سے آپ مطمئن نہ رہیں، اور جو یہ شورش اور ہیجان بپا ہے، اس کو آپ فرضی اور خیالی نہ سمجھیں، آپ مسلمان فوجیوں کو اس پر مجبور نہ کریں کہ وہ آپ کے جھوٹ کا پول کھولنے کے لیے ایسے اقدام کر بیٹھیں جو آپ اور ہمارے دونوں کیلیے کڑوے ثابت ہوں، خبردار، خبردار (تالیاں)

ہندوستان کے مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ خلافت کے ساتھ اتنی دنیاوی قوت ہو کہ اس سے ہمارے دین کی حفاظت ہو سکے، اس کے ساتھ ٹرکی سے یہ ضمانت لے لی جائے کہ اس کی آزادی اور اقتدار اعلیٰ کو برقرار تو ضرور رکھا جائیگا، لیکن اسکی حکومت میں جو مختلف لوگ یعنی عیسائی، مسلمان اور یہودی ہیں، ان کو خود مختارانہ طور پر ترقی کرنے کی اجازت ہوگی، ایسی مصالحت ممکن ہے، جو بہت اچھی تو نہیں لیکن دوسرے درجہ

یہ وہ جگہ ہے جہاں قبر پانے کیلئے ہم خواہاں رہتے ہیں (تالیاں)۔ خواتین و حضرات!
آپ ہم کو یہ باور نہیں کرا سکتے کہ اتحادیوں کی سپریم کونسل ہم سے زیادہ عربوں
سے محبت رکھتی ہے، ترک بھی ہم سے عربوں سے زیادہ محبت کے خواہاں نہیں ہو سکتے
لیکن یہ عربوں اور ترکوں کا سوال نہیں رہا، یہ تو اب اسلام کا سوال ہے (تالیاں)
اسلام ہم لوگوں کو ترکوں اور عربوں سے زیادہ عزیز ہے، اور خود عرب اور
ترک اسلام کو سب سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں، عربوں کی خود مختاری کا سوال خود
مسلمانوں پر چھوڑ دیا جائے، اور ہم کو اس میں کوئی مشکل نظر نہیں آتی کہ ایک وفاق
میں عربوں کو ہر طرح کی خود مختاری حاصل ہو۔

ہمارا تیسرا دعویٰ یہ ہے کہ مکہ، مدینہ، بیت المقدس اور مسو پوٹومیا کی
مقدس زیارت گاہیں خلیفہ کی نگرانی میں رہیں، یہ دعویٰ کہ جزیرۃ العرب مسلمانوں
کے ماتحت رہے، ہمارے رسول کی آخری وصیت پر مبنی ہے۔ کلام پاک اور حدیث
سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، برطانوی حکومت کے ساتھ ہماری وفاداری اس
شرط کے ساتھ ہے کہ ہم کو اپنے مذہبی معاملات میں پوری آزادی حاصل ہو گی،
جب یہ شرط ہے تو ہم کو حق حاصل ہے کہ ہم اس کے لیے اصرار کریں کہ خلافت قائم رکھی
جائے، جزیرۃ العرب پر عیسائیوں کو استیلا اور اقتدار حاصل نہ ہو، اور خلیفہ
مسلمانوں کے تمام مقدس مقامات کا محافظ ہو، وزیر اعظم کہتے ہیں کہ ہندوستان
کے مسلمانوں کے ان جذبات کا احترام کیا گیا ہے، لیکن جب مسلمانوں کو انکے
مذہبی حقوق نہیں دیے جا رہے ہیں تو پھر ان کے جذبات کے احترام کا سوال
کہاں آتا ہے، وزیر اعظم صرف یہ کہکر مسلمانوں کو تسلی دینا چاہتے ہیں کہ خلیفہ قسطنطنیہ میں

وغیرہ سے نہ امپائر بنائے جاتے ہیں اور نہ برقرار رکھے جاتے ہیں ،

ہمارا دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ فرات اور دجلہ کی چوتھی سرحد یعنی جزیرۃ العرب پر مسلمانوں کا اقتدار باقی رہے ، ہم یہ بیکار سی بات تو سوچ نہیں سکتے کہ آپ خلافت کو برقرار رکھنے کے لیے خلیفہ کو کچھ اور سرزمین اپنی طرف سے دیدیں ، لیکن ہم یہ ضرور چاہتے ہیں کہ شام ، فلسطین اور میسوپوٹومیا عثمانی سلطنت کے اندر رہیں ، یہ سارے علاقے بنجر ہیں ، گو ہم اس دوری پر بھی اس نیل کی بو سونگھ رہے ہیں ، جس کی خاطر آپ کی نظر خلیج فارس پر بھی اٹھی ، ہماری مقدس ترین سرزمین ایک غیر ذی زرع وادی میں آباد ہے ، لیکن اس سرزمین کے ریت کا ایک ذرہ بھی ہمارے لیے سونے کے سیکڑوں من سے زیادہ عزیز ہے ، ہم حضرت ابراہیمؑ ، حضرت موسیٰؑ ، اور حضرت عیسیٰؑ کے جانشین ہیں ، ہم ان کے لیے علیہ السلام کا جز اسی طرح استعمال کرتے ہیں جس طرح ہم اپنے آخری پیغمبر کے لیے صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں ، ہمارے لیے اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے کہ ہم اس مقدس سرزمین میں مذہبی حکومت اور توحید کو باقی رکھیں ، اگر ترک اس علاقہ کے کسی حصہ پر غیر مسلموں کے تسلط کے لیے راضی بھی ہو جائیں تو ہم ہندوستانی اور دنیا کے اور مسلمان ان سے برسرِ پیکار ہو جائیں گے ، اور اس سرزمین کے تقدس کی روایت کو برقرار رکھیں گے ، ....

جہاں تک عربوں کا تعلق ہے ، دنیا کے مسلمانوں سے بڑھ کر ان کا اور کون ہمدرد ہو سکتا ہے (تالیاں) کیا ہمارے پیغمبر عرب نہ تھے ؟ کیا کلام پاک اور حدیث کی زبان عربی نہیں ہے ؟ کیا ہم مکہ کی طرف منہ کر کے پانچوں وقت کی نماز نہیں پڑھتے ہیں ؟ اور مدینہ ! یہ وہ سرزمین ہے جس نے ہمارے رسول اور ان کے صحابہ کو پناہ دی ، اور

خواتین و حضرات! آپ پوچھیں گے کہ آرمینیوں کے قتل کے متعلق ہمارا کیا خیال ہے، ہم اس کو نظر انداز کرنے کے قائل نہیں، اسلام آشتی اور امن کا مذہب ہے، ہم اسلام کی وکالت کیسے کر سکتے ہیں جب ہم دہشت انگیز واقعات کو نظر انداز کریں گے، لیکن ہم کہتے ہیں کہ گذشتہ صدی کے آخری ربع سے پہلے ہم نے آرمینیا کے قتل کی خبر کبھی نہیں سنی، مگر اب وہاں کے قتل کی خبریں مشتہر کی جا رہی ہیں، اس کے اسباب ہم آپ کو بتائیں۔ روس، بلقان کے ترکی علاقے میں قتل کا بازار گرم کیے رہا، یہاں اس کی دھوکہ دھڑی ہر طرح اسکی توقع سے بہت زیادہ .... مفید ثابت ہوئی، پھر تو اس کو یہ خیال پیدا ہوا کہ کیا اچھا ہوتا کہ اس کو بحیرہ گراڈ سے پشاور تک ایک کھلا راستہ مل جاتا، اس منزل مقصود کو حاصل کرنے کے لیے اس کی نظر آرمینیا کی طرف اٹھی، آرمینیا میں اس وقت جو قتل ہوا اس کو ابھی نظر میں نہ رکھئے، بلکہ اس کو جاننے کی کوشش کیجئے کہ یہ قتل کب سے شروع ہوا؟ کیوں شروع کیا گیا؟ اسکے پہلے کیوں نہیں شروع ہوا؟ اس کے شروع کرانے میں کس کا ہاتھ تھا؟ اس سلسلہ میں اندر اور باہر کیا کیا سازشیں ہوئیں؟ قتل کیے جانے میں غیر مسلح امن پسند شہری تھے یا مسلح باغی تھے؟ اگر مسلح باغی تھے تو کیا ان کے ساتھ وہی سلوک نہیں کیا گیا جو اور جگہ ہوا کرتا ہے؟ کیا فوجوں کے ذریعہ سے غیر مسلح اطاعت گذار شہریوں کا خاتمہ کیا گیا یا ان مسلح باغیوں سے فوج لڑی جو رات دن برابر کی ٹکر لینا چاہتے تھے؟ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ آرمینی صلح کانفرنس میں اپنی نمایندگی کے خواہاں محض اس لیے ہوتے کہ وہ بھی لڑنے والے فریقوں میں سے تھے؟ کیا وہ اب بھی اس کا دعویٰ نہیں کر رہے ہیں کہ انھوں نے اپنی حکومت کے خلاف اتحادیوں کو مدد پہنچائی، اسلیے

آرام سے رہے گا، لیکن وہ وہاں کیوں رہے؟ مسٹر لائڈ جارج، مسٹر بونر لا اور سر ایڈورڈ کارسن نے صاف طور سے یہ کہدیا ہے کہ اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں، مجھکو تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ روس کا زار اگر مستبدانہ روش اختیار نہ کرتا تو شاید وہ زار گراڈ کی طرح قسطنطنیہ پر بھی حکومت کرنے کا دعویدار ہوجاتا، پھر خلیفہ کو اسلام بول میں محدود کرکے مسلمانوں کے جذبات کا احترام کیا جاتا، بات یہیں پر ختم ہوتی نظر نہیں آتی، خلیفہ یہاں اس لیے رکھا جائے گا کہ اتحادیوں کی بندوقوں کی زد میں یرغمال بنا رہے، اور اسی سے گویا مسلمانوں کے جذبات کا احترام کا اظہار ہوگا، سچ تو یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات کے احترام کیے جانے کے بجائے ان کی باتوں کو سننے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی گئی، آپ ان کے اخبارات کو بند کرادیں، ان کے رہنماؤں بلکہ ان کے مذہبی پیشواؤں کو جیل بھجوادیں، اور جب اس دہشت انگیزی سے لوگ خاموش ہوکر رہ جائیں، تو آپ یہ کہیں کہ آپ نے ان کی باتیں احتیاط اور سکون سے سن لی ہیں (تالیاں)۔ وزیر اعظم نے ہماری معروضات کے جواب میں جو کچھ کہا اس کا جواب بھی ہم کو دینے کی اجازت نہیں دی گئی، کیونکہ وقت ختم ہوگیا تھا، رات کا وقت تھا، جواب دینے میں رات ختم ہوجاتی، لیکن مسئلہ جب برسوں اور قرنوں کا ہو تو ایک رات کے ختم ہونے کا کیا اندیشہ ہونا چاہیے تھا، قتل اور خونریزی میں معلوم نہیں کتنی راتیں گذاری گئیں، جس کے بعد لوگ عدل اور انصاف کی روشنی پانے کے لیے اپنی نیند کو حرام کرکے بہت سی بیقرار راتیں گذار چکے ہیں، وہاں ایک رات کے ختم ہونے کا اندیشہ کہاں تک صحیح ہے (تالیاں)

والے آئے ہیں کہ اگر برے قسم کے صلحنامے ہوئے تو پھر کیا کیا خطرناک نتائج پیدا ہو سکتے ہیں، صلحنامے پر تو دستخط ہو جائیں گے، لیکن یہ صلح صلح نہ ہوگی، بلکہ آیندہ جنگ کا پیش خیمہ ہوگی، جس کے بعد انسانوں کے خون کی جنگ تو نہ ہوگی لیکن ضمیر اور عقائد کی سخت جنگ ہوگی، ہم دھمکی نہیں دیتے ہیں، ہم کرنل ویجوڈ کی باتوں سے متفق ہیں جن کی تقریر سننے کے لیے ہم دار العوام گئے، ہم کو بھی یقین ہے کہ ہم انگریزوں کو دھمکی دیکر ان سے کچھ نہیں لے سکتے بلکہ انکو قائل کر کے ان سے کچھ حاصل کر سکتے ہیں، کرنل ویجوڈ جب یہ کہتے ہیں کہ ہم کس چیز سے دھمکی دے سکتے ہیں، تو ہمارا جواب یہ ہے کہ ہم لڑائی کے طاقتور انجنوں سے تو دھمکی نہیں دے سکتے ہیں لیکن ہم آپ کو دھمکی دے سکتے ہیں اور دیتے ہیں، اور یہ دھمکی حق وصداقت کے اسلحہ کی قوت پر دیتے ہیں جس کے لیے کوئی سپر نہیں، ہم اپنے اس ناقابل تسخیر ارادے کے سہارے دھمکی دے سکتے ہیں جو کسی ناانصافی کے ساتھ ضم نہیں ہو سکتے، ہم اس عزم کی طاقت کے بل پر دھمکی دے سکتے ہیں جو ہم کو تکمیل کے سلسلہ میں مرنا سکھاتا ہے (تالیاں) میں آج کے جلسہ میں برطانوی قوم کو مخاطب کر رہا ہوں، میں آپکے ذریعہ بادشاہ سلامت کے پاس بھی ایک پیام پہنچانا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ کیا بادشاہ سلامت اپنی مسلمان اور ہندوستان رعایا کی وفاداری پر اعتماد کر سکتے ہیں، جب یہ رعایا اپنے تمام بادشاہوں کے بادشاہ (یعنی خدا) کی وفاداری سے منحرف ہو جائے گی (تالیاں) کیا بادشاہ سلامت غلاموں اور بزدلوں کی اسی قوم پر حکومت کرنا پسند کرینگے جو ایسی غیر منصفانہ صلح کو قبول کر لے جو اب صلح کانفرنس میں ہونے والی ہے .... (تالیاں)

مولانا محمد علی کے بعد سید حسین بولنے کے لیے کھڑے ہوئے، انکی تقریر مختصر تھی لیکن دھمکیوں سے بھری ہوئی تھی، انھوں نے کہا کہ ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہندوستانی مسلمان غیر مسلح ہیں،

وہ صلہ پانے کے مستحق ہیں؟ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ آرمینیوں کے قتل کی شہرت اس وقت کیجاتی ہے جب اتحادی ان علاقوں کے متعلق اپنا کوئی فیصلہ صادر کرنا چاہتے ہیں؟ کیا اس قتل کو مشتہر کرنے میں پس پردہ سرمایہ دار اپنی سرمایہ داری کی ایک بندہ گاہ اور سامراجی طاقتیں اپنی فوجی گزرگاہ کیلئے سامراجی ریل کے راستہ کے خواہاں ہوتے ہیں؟ ہم ان مسائل پر کیا روشنی ڈال سکتے ہیں اور نہ ہم لاکھ نفس مسئلہ کے متعلق کچھ قبل از وقت کہنا چاہتے ہیں، ہم تو برابر اس کیلئے اصرار کر رہے ہیں کہ اس قتل کی تحقیقات کے لیے ایک غیر جانبدار بین الاقوامی کمیشن مقرر کیا جائے، اور اس میں کل ہند خلافت کانفرنس کی بھی مناسب نمایندگی ہو، کیا ہمارا یہ مطالبہ حق و انصاف کی خاطر ہے یا قاتلوں کی حمایت کے لیے ہے؟

اس غیر جانبدار کمیشن کے بغیر اب کسی ایک مسلمان یا کسی ایک ہندوستانی کو قائل نہیں کر سکتے کہ آپ وہ رائے نہیں رکھتے ہیں جو آپ کے وزیر اعظم رکھتے ہیں، آپ کے وزیر اعظم نے لارڈ ایلن بائی کو خراج تحسین پیش کرتے وقت کہا ہے کہ صلیبی جنگ کی یہ آخری کامیاب لڑائی تھی، اور جو لڑائی کئی صدیوں سے پورے یورپ کی بہادری سے نہیں جا سکی تھی، اس کے جیتنے کا سہرا برطانیہ کے سر پر ہے، ہم تو صلیبی جنگ کا ذکر نہیں کرتے، اس پر تو آپ کے وزیر اعظم کو فخر ہے،

خواتین و حضرات! ہماری باتیں آپ کے سامنے ہیں، اب آپ خود فیصلہ کریں کہ ہم نے جو کچھ کہا ہے اس سے قتل اور غارتگری کرنے والی حکومت کی مدافعت ہوتی ہے، یا اس میں عدل و انصاف کو ابھارنے کی خواہش ہے، آپ ہماری باتوں سے اندازہ کریں کہ ہم یہاں ایک غیر وفادار رعایا کی حیثیت سے برطانوی حکومت کو دھمکی دینے آئے ہیں، یا وفادار رعایا کی حیثیت سے حکومت اور قوم کی توجہ انصاف

گمراہ کن باتوں کی طرف توجہ دلائیں، ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر یونانیوں کو مشرقی تھریس دیدیا گیا تو پھر وہ مغربی تھریس کو بھی حاصل کرنے کیلیے طرح طرح کے دلائل پیش کرینگے۔

مسز سروجنی نائڈو بھی اس جلسہ میں موجود تھیں، وہ بولنے کے لیے کھڑی ہوئیں، انھوں نے بڑے جذباتی انداز میں کہا کہ میں ہندوؤں کی طرف سے کہہ سکتی ہوں کہ ہندو اس مسئلہ میں اپنے مسلمان ہموطنوں کا ساتھ مرتے دم تک دیں گے۔ خلافت کے تاریخی امپائر کے لیے اتحادیوں کی فتوحات کے نیچے کوئی مقبرہ بنایا گیا تو پھر اتحادیوں کو ہمارے مسلمان ہموطنوں کے لیے بھی مقبرہ بنانے کے لیے تیار رہنا چاہیے، لیکن جب ہمارے کروروں مسلمان ہموطن موت سے زیادہ بدتر صورت حال سے دوچار ہیں تو ہم ہندو الگ رہ کر ان کو بے سہارا چھوڑنا پسند نہ کریں گے، برطانوی باشندوں کو فخر ہے کہ ان کی حکومت رائے عامہ پر قائم ہے، تو کیا اس وقت عدل و انصاف کا جو مذاق اڑایا جا رہا ہے، اس کے وہ صرف تماشائی بن کر رہنا پسند کریں گے؟ کیا آپ یہ دیکھنا پسند کریں گے کہ آپ اپنی آزادی کی عظیم روایت کو جھٹلا رہے ہیں؟ کیا آپ علٰحدہ کھڑے ہو کر ایک بڑے امپائر کو ختم ہوتے ہوئے دیکھنا گوارا کریں گے اور اس امپائر سے چھوٹے چھوٹے علاقے بنائے جانے پر مطمئن ہو جائیں گے؟ آپ حق خود اختیاریت اور آزادی کی باتیں کرتے ہیں، ہم بھی تو حق خود اختیاریت اور آزادی کی آواز بلند کرتے ہیں، لیکن آپ اس کو دبا رہے ہیں، کیا عیسائیت کے لیے علٰحدہ قانون ہے اور غیر عیسائیوں کے لیے علٰحدہ اصول ہیں؟ اگر آپ خلافت کے امپائر کو توڑنا چاہتے ہیں تو دوسرے امپائر کو بھی مسمار کریں، پھر ان ہی مسمار شدہ امپائر سے دنیا کی جمہوریتیں بنائی جائیں گی۔

اس جلسہ میں تقریر کرنے والوں میں مسٹر آرنلڈ لپٹن بھی تھے، انھوں نے کہا کہ عقلمندی کا تقاضا

ان کے ہموطنوں کے پاس بھی ہتھیار نہیں ہیں، وہ کیا کچھ کر سکتے ہیں، یہ سوال بڑا سیدھا اور سادہ ہے، تھوڑی دیر کے لیے مان لیجئے کہ ہم جواباً کچھ نہیں کر سکتے۔ لیکن کیا حکومت برطانیہ اپنی رعایا کو اسی طرح دبا کر اپنی برطانوی دولت مشترکہ کو قائم رکھنا چاہتی ہے؟ کیا ہماری وفاداری اسی لیے ہے کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے"؟ آگے چل کر سید حسین نے کہا کہ میں برطانوی تاج کا وفادار بن کر رہنا چاہتا ہوں لیکن اس شرط پر کہ مجھکو پوری مذہبی آزادی حاصل ہو، اور میں اپنے جسم کی روح کو اپنی روح کہہ سکوں (تالیاں)

اس کے بعد حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی ایک مختصر تقریر ہوئی، وہ ہندستانی زبان میں بولے، انھوں نے فرمایا کہ وہ ان علماء کے طبقہ کی نمایندگی کرتے ہیں جس نے سیکولر قسم کی شورش سے اپنے کو کبھی وابستہ نہیں کیا ہے، وہ اس ملک میں اس کے اثری، تاریخی اور قومی خزانوں کو دیکھنے کے لیے نہیں آئے ہیں، بلکہ اس مسئلہ پر اپنے طبقہ کے علماء کے ان مذہبی جذبات کی ترجمانی کرنے آئے ہیں جو دنیا کے مسلمانوں کے لیے موت و زیست کا سوال بنا ہوا ہے (تالیاں)

اس کے بعد مسٹر لے لینڈ بکسٹن کی تقریر ہوئی جس میں انھوں نے کہا کہ مجھکو تو ایسا معلوم ہوتا ہے مشرق قریب میں یونانیوں کا ایک امپائر قائم کیا جانے والا ہے (صدائے تحسین) میں یونانی سامراجیت کو دنیا کے اس حصہ کے امن کے لیے عظیم ترین خطرہ سمجھتا ہوں، یونانیوں کے حوصلے لامحدود بھی ہیں اور وحشیانہ بھی، میں وزیر اعظم کی اس بھول کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جسکی بنا پر انھوں نے دعویٰ کیا ہو کہ تھریس میں مسلمان اقلیت میں ہیں، یہ بالکل جھوٹ ہی ہو پورے تھریس میں مسلمان بہت بڑی اکثریت میں ہیں لیکن تھوڑی دیر کیلئے مان لیجئے کہ یہ اعداد و شمار صحیح ہیں، تو پھر مسلمان اور بلغاری ملکر یونانیوں سے کہیں زیادہ ہو جاتے ہیں، یونانیوں کو مشرقی تھریس دینے کے معنی یہ ہیں کہ وہاں کی آبادی کو اسکے بدترین دشمنوں کے حوالے کرنا ہے، میں اپنے ہندوستانی دوستوں سے کہوں گا کہ وہ وزیر اعظم کو ان کی

کیا اسلامی قانون رومی قانون کا مرہون منت ہے؟

ترجمہ

جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب پیرس

(۴)

(۲۷) چونکہ [رومی قانون کے فقہ پر اثر کے سلسلے میں] گولڈ سیہر کا ممتاز نام پیش کیا جاتا ہے، اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے بیانات اور پھر ان کے جوابات کو بہ ترتیب پیش کیا جائے۔

(۱) "اسلامی علم قانون دوسری صدی ہجری میں پیدا ہوا"

(۲۸) اس واضح اور متفقہ روایت کو ترک کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی جس میں یہ بیان ہوا ہے کہ [دوسری صدی ہجری کے بہت پہلے] اسلامی قانون وراثت کو تفصیل سے elaboration خلفائے راشدین کے زمانے میں یعنی آنحضرت صلعم کی وفات کے تیس ہی سال کے اندر زید بن ثابت، ابوموسیٰ اشعری، عمر بن الخطاب اور علی بن ابی طالب [رضی اللہ عنہم] نے مرتب کر دیا تھا[1]، یہ سب کے سب صحابی ہیں،

---

[1] قانون وراثت بڑی جامع تفصیل سے قرآن مجید میں مذکور ہے، مذکورہ صحابہ تقسیم ترکہ کی حساب دانی کے لیے مشہور ہیں، نہ کہ اس قانون کے بانے والوں کی حیثیت سے، (مترجم)

یہ ہے کہ عثمانی سلطنت کو ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے، وہ اور دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں کسی صورت سے برے نہیں ہیں، یہ تو نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ اور سب سے اچھے ہیں، لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان کے لیے ہم سے زیادہ برا ہونا ممکن نہیں، انگریز بہت ہی اچھے اور بہت ہی چالاک ہوتے ہیں لیکن ان میں کچھ لوگ بہت ہی بدمعاش بھی ہیں، عثمانیوں نے ہماری طرف اپنا ہاتھ بڑھایا ہے، وہ ہم سے مدد کے طلبگار ہیں، گرچہ انکو ہماری مدد لینے میں کوئی فخر کی بات نہیں ہے، ہم ان سے لڑ چکے ہیں لیکن اب ہم کو کوشش کرنی چاہیے کہ انکے ساتھ ملکر کام اور تجارت کریں۔

اس جلسہ میں ڈاکٹر عبدالمجید ام، ٹی قادر بھائی اور مسٹر بی، جی، ہارنی مین نے بھی تقریریں کیں، جلسہ بڑے جذباتی جوش وخروش سے ختم ہوا،

ایسکس ہال کے اس اجتماع سے پہلے مولانا محمد علی نے اپنے وفد کے ارکان کے جذبات سے تار کے ذریعہ سے امریکہ کو بھی آگاہ کیا تھا، کیونکہ وہ گذشتہ جنگ عظیم میں اتحادیوں کا حامی تھا، فرانس بھی اتحادیوں میں تھا، اسلیے مولانا محمد علی اپنے وفد کے ساتھ پیرس بھی گئے تھے، ۲۴ر مارچ ۱۹۲۰ء کو اس وفد کا خیر مقدم موسیو برٹلی نے کیا جو فرانس کے وزیر خارجہ تھے، اسکے بعد پیلی ہوشے میں ایک عام جلسہ ایم جے لیس روشے کی صدارت میں ہوا، جس میں شام کے مشاہیر کے علاوہ ٹیونس، چین، روس اور مصر کے کچھ مسلمان بھی شریک تھے، اس میں مولانا محمد علی اور سید حسین نے انگریزی میں تقریریں کیں، اور وہی باتیں کہیں جو انگلستان میں کہہ چکے تھے، مولانا سید سلیمان ندوی رح نے عربی میں تقریر کی، جس کا فرانسیسی ترجمہ ٹیونس کے ایک مسلمان نے کیا، صدر جلسہ کے علاوہ پیٹ پال بلوسین، جین میلا اور لاکوکونیر کی بھی تقریریں ہوئیں، اور ایک تجویز کے ذریعہ وفد کے کاموں کے ساتھ دوستی اور ہمدردی کا اظہار کیا گیا۔

(باقی)

بو موسیٰ الاشعریؓ] اگرچہ صرف زبانی روایت[1] کی صورت میں محفوظ رہی ہیں لیکن یقین لیا جاسکتا ہے کہ وہ صحیح ہیں، اور ان کے مندرجات رومی قانون سے نہیں بلکہ ربیّون کے یہودی قانون سے ماخوذ ہیں، جیساکہ مارگولیوث نے بیان کیا ہے کہ اس ہدایت نامے کے لکھنے والے [حضرت عمرؓ] کے پہلو میں ایک یہودی قانون پیشہ موجود تھا۔" اس ہدایت نامے میں بڑی وضاحت کے ساتھ اس طریقۂ تفکر کا ذکر ہے جن کے متعلق اس ابتدائی زمانے کے مسلمان عالم عدالت سے توقع کیجاتی تھی کہ وہ اس کو اپنا رہبر بنائے گا، اور واقعہ بھی یہ ہے کہ اسلامی قانون اسی کے مطابق مرتب و مدون بھی ہوا ہے، اسلامی قانون کے ابتدائی مولف اور معلم جن کی کتابیں ہم تک پہنچی ہیں یعنی چاروں سنی مذاہب کے امام اگرچہ دوسری صدی ہجری کے ہیں،[2] لیکن یہ یقینی ہے کہ بہت بڑی مقدار میں قانونی تالیف کا کام ان سے پہلے ہوچکا تھا، یہ مولفین بعض تفصیلات میں باہم اختلاف رکھتے ہیں، لیکن قانون کا بنیادی خاکہ سب کے ہاں ایک ہی ہے۔ تفصیلات میں اس طرح کا اختلاف اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ بنیادی اساس مستحکم طور پر ڈال نہ دی گئی ہو، اور یہ اساس شام یا مصر، یا خود بغداد میں نہیں ڈالی گئی، جیساکہ شیلڈن آموس کا خیال ہے، بلکہ مدینہ منورہ اور کوفے میں ڈالی گئی، جیساکہ ہم اوپر بیان کرچکے ہیں،

(۲) "عربی لفظ فقہ کے متعلق یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ وہ لاطینی لفظ Prudentea کا ترجمہ ہے، دونوں کے معنے معقولیت Reasonableness کے ہیں۔"

---

[1] اسکا اصل وثیقہ صدیوں مرسل الیہ کے خاندان میں محفوظ رہا، "زبانی" روایت کہنا درست نہیں۔ (مترجم)

[2] امام ابوحنیفہ اور امام مالک کی وفات دوسری صدی ہجری میں ہوئی۔ امام شافعی اور امام ابن حنبل کی تیسری صدی میں۔ (مترجم)

(۲۹) اس سلسلے میں شلڈن آموس کا بیان ہے کہ صحابہ کو اس کام کی "نہ فرصت تھی، نہ ان میں مطلوبہ ذہنی صلاحیت تھی، اور نہ وہ ایسے لوگ تھے جن کی ضرورت تھی" تاکہ ایک نفیس ترقی یافتہ قانون کی عمارت کھڑی کریں۔ یہ بیان جتنا ہمہ گیر ہے اتنا ہی غلط بھی ہے۔ مکے اور مدینے کے لوگ پیغمبر اسلام کے صدیوں قبل سے شہروں میں زندگی گزارنے کے عادی ہو چکے تھے، اور وہاں وہ سب چیزیں تھیں جو حضری زندگی کے لیے ضروری ہوتی ہیں، فقہا اور علمائے دین کا امیروں [حاکموں] اور سپہ سالاروں سے الگ۔ ہمارا ایک ایسا واقعہ ہے جو اسلام کی ابتداء ہی سے پایا جاتا ہے، [حضرت] "عمر کے ہدایات قاضی کو"[1] [بنام حضرت

---

[1] "Omar's Instruction to the Qadi" کے عنوان کے مضمون میں [مارگولیوث] نے انگلستان کی انجمن مستشرقین کے سہ ماہی رسالے "جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی" بابت ۱۹۱۰ء کی جلد میں صفحہ (۷۰۰-۳۰۷) وما بعد پر [حضرت] ابو موسیٰ اشعری کو دی ہوئی ان ہدایتوں کا [انگریزی میں] ترجمہ کیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وثیقے کی صحت کے متعلق مارگولیوث کی رائے بدلتی رہی ہے۔ مذکورہ بالا مضمون میں انھوں نے اس کی صحت کا صاف الفاظ میں اعتراف کیا ہے لیکن راقم الحروف [فٹزجیرالڈ] سے اس کے کئی سال بعد اس نے اس سے بہت زیادہ پرزور الفاظ میں اس کی صحت کی تائید میں رائے ظاہر کی تھی۔ (مترجم) ___ راقم الحروف (محمد حمید اللہ) نے اس موضوع پر ایک مفصل مضمون پیرس کے ماہوار رسالے "فرانس اسلام" France - Islam کے شمارے ۳۲ تا ۳۵ (۱۹۶۹ء تا ۱۹۷۰ء) میں فرانسیسی میں شائع کیا، پھر مزید نظرثانی و اصلاح کے بعد انگریزی میں "جرنل آف پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی" کے جنوری ۱۹۷۱ء کے شمارے میں چھپوایا اور لوگوں کے آراء کی تحلیل کے علاوہ اس میں مارگولیوث کا بھی خاص ذکر ہے۔ مارگولیوث نے اپنے مضمون میں شروع تو کیا اس ہدایت نامے کو جعلی قرار دینے کے لیے، لیکن لفظ "قیاس" کا اس ہدایت نامے میں ذکر دیکھ کر اسے خیال آیا کہ یہ عبرانی لفظ "ہقش" سے ماخوذ ہوگا ___ اگرچہ قیاس کا مادہ عربی میں "قیس" ہے جس کو "ہقش" سے کوئی تعلق نہیں، اور عبرانی میں ہقش کے معنے تقسیم کے ہیں ___ اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ حضرت عمرؓ کو کسی یہودی نے یہ ہدایت نامہ مرتب کر دیا ہوگا۔ اس فرضی یہودی کی دریافت پر وہ اتنا آپے سے باہر ہو گئے کہ ہدایت نامہ اس کی رائے میں صحیح ہو گیا۔ (مترجم)

(۳۲) یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ عربوں کے لیے لاطینی سے براہ راست کوئی چیز مستعار لینے کا موقع نہ تھا،[1] اور "قانون کو جاننے" prudens / دنےوزز کے لیے یونانی لفظ پرونی موس pronimos (مالک قانون) نہیں ہے، بلکہ "نومی کوس" nomikos یعنی "قانونی" بصیغۂ (صفت) یا "اسخولاسطیکوس" Scholastikos (تدقیق کنندہ) ہے،[2] گولٹ سیہر کے اس خیال کی صحیح قدر و قیمت کا جاننا مشکل ہے کہ "اس کا مماثل عبرانی لفظ بھی مماثل معنے رکھتا ہے"[3]، لیکن ایسا ہو بھی تو ربی (یہودی) قانون کے ماہروں نے فہم انسانی کا استعمال روما سے نہیں سیکھا تھا،

---

[1] غالباً یہ مراد ہو کہ مسلمان بزنطینی یونانیوں کے ہمسایہ تھے، لاطینی روما کے نہیں لیکن حضرت عثمانؓ کی خلافت کے زمانے ہی میں نہ صرف شمالی افریقہ بلکہ اسپین پر بھی مسلمان جزءً قابض ہو چکے تھے، امویوں نے مغربی یورپ میں بہت سی فتوحات حاصل کیں، اور یہاں لاطینی ہی بطور علمی زبان کے رائج تھی، اس طرح تاثیر کے امکان کی حد تک مسلمانوں کے لیے یونانی اور لاطینی میں کوئی فرق نہ تھا، یہی حال سنسکرت کا ہے کہ خلافت فاروقی ہی سے مسلمان سندھ اور گجرات میں پہنچ چکے تھے (مترجم)، [2] جسٹی نین کی کتاب "خلاصہ" (ڈائجسٹ ۱/۳/۲) میں ڈیموستھینس Demosthenes کا ایک اقتباس ہے جو ارسطوجیتون کی رائے کی تردید Contra Aristogeitonem کے لیے ہے، بادی النظر میں اسلامی قانون تصورات سے ایک مماثلت کا حامل ہے، ڈیموستھینس [یونانی میں] بیان کرتا ہے کہ قانون ایک تحفۂ طیبہ ہے جو خداؤں کا عطیہ ہے۔ کتاب "خلاصہ" کے عیسائی کاتبوں نے تبدیلی کر کے اسے بصیغۂ واحد "خدا کا عطیہ" کر دیا۔ جو نتائج کی بصیرت رکھنے والے لوگوں کی آراء سے حاصل ہوتا ہے"، لیکن یہ مماثلت محض سطحی ہے، کیونکہ "نتائج کی بصیرت رکھنے والے" یہاں کسی علمی اصطلاح کے طور پر نہیں بلکہ صرف "لوگوں" کی صفت کے طور پر، اور ڈیموستھینس کا لفظ "ڈوگما" dogma "تعلیم" کا مفہوم نہیں رکھتا ہے، جو کلیسا نے اب اسے دے رکھا ہے اور جو اسے لفظ "فقہ" کا اچھا ترجمہ بنا دیتا ہے، یونانی جملہ "الکشاف" اور "خداؤں کا عطیہ" میں اور سامی قوموں [یعنی یہودی و اسلامی، (مترجم)] کے تصور قانون میں کہ وہ امر خداوندی کا نام ہے، فرق کی ایک پوری دنیا پائی جاتی ہے (مؤلف)

(۲۶) میرے فاضل رفیق کا مسٹر وارشلکی Zvartske کا بیان ہے کہ یہودی لفظ حاخام [یعنی حاکم] مفہوم کے لحاظ سے یونانی لفظ "اسخولاسطیکوس" (یعنی تدقیق کنندہ) سے قریب تر ہے، بہ نسبت لاطینی لفظ "پروڈنس" prudens کے جس کے معنی ہیں اندرونی نظر رکھنے والا شخص، ایک مدراس [یعنی توریت کی تشریح] بھی پائی جاتی ہے، (دیکھو کتاب تکوین پر مدراس ربہ Midrash Rabbah ۲۴) جس میں شہنشاہ ہڈریان Hadrian کے زمانے کے رومی افسر ربی (یہودی) قانون کے ایک بڑے ماہر کو توریت کے اسخولاسطیکوس کے نام سے یاد کرتے بیان کیے گئے ہیں (مؤلف)، [3] غیر منصوص قانون کے لیے گولٹ سیہر نے اگر کوئی نام

(باقی ص ۱۹۰ پر)

(۳۰) یہ جملے لکھنے کے بعد [گولٹ سیہر نے] دائرۂ معارف اسلامیہ (انسائکلوپیڈیا آف اسلام) میں "فقہ" پر جو مقالہ لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورۂ بالا جملے میں "معقولیت" اس کے [ہنگری لفظ کا] غلط ترجمہ ہے، گولٹ سیہر کی مراد اس سے استعقال یا ملکۂ استدلال کا استعمال Raciocination, The use of reasoning faculty ہے، بعض ابتدائی عرب مولفین "فقہ" یعنی ملکۂ استدلال کو "علم" یعنی وحی Revelation اور حدس intuition کے ذریعے سے حاصل ہونے والی واقفیت Knowledge کے برعکس چیز کے طور پر استعمال کرتے ہیں، وینسنک wensinck نے ["فقہ" کا ترجمہ] insight [یعنی داخلی نظر و واقفیت] کیا ہے، جو پرانی عربی، نیز لاطینی سے قریب تر ہے، لیکن اس سے یہ بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ یہ [لاطینی سے] براہ راست مستعار لی ہوئی اصطلاح نہیں ہے، بلکہ وہ چیز ہے جس کے متعلق مذکورۂ بالا کتاب میں سانتلانا Santillana نے [فرانسیسی میں] صحیح کہا ہے کہ: l'identite essentielle de l'esprit humain یعنی وہ "انسانوں کے فکر کی بنیادی یکسانیت" کے باعث ہے،

(۳۱) حقیقت میں سارے ہی قانونی نظام ناگزیر طور پر عقل اور استدلال reason کے استعمال پر مبنی ہوتے ہیں، کیا اس کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ کوئی ایسا قانون پیشہ شخص بھی ہو سکتا ہے جسے اس کا شعور نہ ہو کہ اس کے پیشے میں ملکۂ استدلال کے استعمال کی ضرورت ہوتی ہے؟ کہا تو یہ بھی جا سکتا ہے، اگرچہ یہ احمقانہ بات ہوگی، کہ سنسکرت کے الفاظ "نیایا" (منطق) اور "میمانسا" (تعبیر و تاویل) — جو ہندو قانون میں ہندو مکاتب فلسفہ کے طریقۂ بحث کو داخل کرتے ہیں — روما سے تعلق ظاہر کرتے ہیں۔

پر عمل واجب ہوتا ہے[1]، یہ ایک فطری ارتقا ہے، اور ایسے نظام ہائے قانون میں بھی پایا جاتا ہے جن میں رواسے ماخوذ ہونے کا کوئی سوال نہیں، مثلاً انگلستان میں عام وشائع قانون Common law اور قانون موضوعہ Statute میں ایسا ہی فرق ہے، یا وہ تدریجی فرق جو ہندو قانون کے سرتی Srute اور اسمرتی Smirti میں ہے، پھر اسمرتی اور نبندھا Nilandha میں بھی پایا جاتا ہے،

(۳۵) علماء کے جوابات (فقہا کے فتاوی، responsa prudentium) کو، جو رومی قانون کا ایک جزو ہیں، جسٹی نین نے "لکھے ہوئے قانون" میں داخل کیا ہے، اس کی وجہ بظاہر یہ ہے کہ رومی "قانون اقتباسات lex citationem" نے

---

[1] یہ کہنا درست نہیں معلوم ہوتا کہ فقہ میں نص کا وجوب لفظ بلفظ ہوتا ہے، اور فقہا کے قیاسات میں لفظ پر نہیں بلکہ مضمون پر عمل کرنا واجب ہوتا ہے۔ ہماری ناچیز رائے میں دونوں ہی پر لفظاً بلفظ عمل کرنا واجب ہے، فرق یہ ہے کہ نص صرف ایک ہوتی ہے۔ اس کا وجوب ابدی ہے۔ اور اس کا انکار کرنے والا کافر ہے۔ اسکے برخلاف قیاسات ایک ہی مسئلے میں متعدد بلکہ متضاد بھی ہو سکتے ہیں، اور اختلاف مذاہب میں (جو بسا اوقات خود ایک مذہب اور ایک مکتب فقہ کے اندر بھی ہوتا ہے) باہم تکفیر نہیں کیجاتی، اور کسی سابقہ فقیہ کا قیاس بعد کے بزرگ تر فقیہ کے قیاس کے باعث غیر مرجح قرار پاکر نظر انداز بھی کیا جا سکتا ہے، دوسرے الفاظ میں نص کا وجوب یقینی یا قطعی ہے اور قیاس میں غلطی کا احتمال ہوتا ہے، کیونکہ نص خدا اور نبی معصوم کیجانب سے ہوتی ہے اور قیاس غیر معصوم انسانوں کیجانب سے۔ اس مثال سے اسکی وضاحت ہوگی: حنفی مذہب میں پانی کے جانوروں میں سے صرف مچھلی کا کھانا جائز ہے، اور جھینگا ناجائز، شافعی مذہب میں جھینگا بھی حلال ہے۔ اس حرام و حلال کے باوجود حنفی اور شافعی ایک دوسرے کو کافر نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ متاخر احناف جھینگے کو حلال قرار دیدیں اور سابقہ حنفی قیاس غیر مرجح سمجھا جانے لگے۔ مترجم)

(۳۰) [احکام فقہ کا] دو قسموں یعنی لکھے ہوئے leges scriptae اور نہ لکھے ہوئے leges non scriptae میں منقسم ہونا رومی قانون سے ماخوذ ہے۔"

(۳۳) اس بیان میں "نص" کو ـــ جو مستند قانونی عبارت [یعنی قرآن و حدیث] کے معنی رکھتا ہے، "لکھے ہوئے قانون" Lex scripta کا مترادف قرار دے لیا گیا ہے، گو لٹ سیہر کے مضمون میں دوسری قسم [یعنی بن لکھے قانون] کا [عربی] نام تو نہیں دیا گیا ہے، مگر اس کی مراد "قیاس" سے ہے ۲۶/الف

(۳۴) لکھے ہوئے jus scriptum اور نہ لکھے ہوئے قانون jus non scriptum میں جو فرق ہے وہ جسٹی نین کی کتاب "عہود" (انسٹی ٹیوٹس ۱/۲/۳) میں بیان ہوا ہے۔ لکھا ہوا قانون وہ ہے جس کا رسمی وجوب formal validity اس لیے ہوتا ہے کہ اسے کوئی قانون ساز فرد یا گروہ معین طور پر وضع کرتا ہے، بن لکھا قانون وہ ہے جس کا وجوب محض قدیم زمانے سے پائے جانے والے رسم و رواج کے باعث ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف نص اور قیاس میں فرق یہ ہے کہ نص ایک اساسی قانون ہے، اور قیاس میں اہل علم نص سے کوئی منطقی استنباط کرتے ہیں، لکھے ہوئے اور بن لکھے قانون، اور نص و قیاس میں سوا اس کے کوئی چیز مشترک نہیں کہ ان دونوں میں قانونی احکام کی تقسیم یوں کی گئی ہے کہ ایک وہ قانون ہے جس کا وجوب لفظ بہ لفظ ہوتا ہے، اور دوسرا وہ ہے جس کے لفظ پر نہیں بلکہ جس کی روح (مفہوم

(بقیہ حاشیہ ص ۱۸۹) نہیں دیا تو اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس میں صرف قیاس ہی نہیں بلکہ استدلال، اجتہاد، استنباط، استحسان، استصلاح، استمرار سنن انبیاء، سلف وغیرہ بکثرت چیزیں داخل ہوتی ہیں (مترجم)

امت کے عام اتفاق کا نام ہے)۔ شہنشاہ یولیان Julian (دیکھو کتاب ڈائجسٹ ۱/۳/۳۲) پوچھتا ہے کہ "اس کی کیا اہمیت ہے کہ قوم اپنی خواہش کا اظہار ووٹ کے ذریعے سے کرے، یا خود اشیاء و اعمال میں؟" لیکن اگر کوئی رواج اتنا قوی ہو کہ اسے قوم کی خواہش کا غیر مشتبہ اعلان قرار دیا جا سکتا ہو تو وہ اسلامی قانون میں اجماع الامت ہے اور اسی لیے وہ ایک "نص" ہے[۱]، ایک کہاوت ہے کہ "زبانِ خلق نقارۂ خدا" Vox populi vox Dei (عوام کی آواز خدا کی آواز ہے)، لیکن یہ رومی قانون کا کبھی کوئی کلیہ نہ رہا۔ البتہ ان معنوں میں اسلامی قانون کا ایک کلیہ ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کی طرف منسوب ایک قول کی بنا پر یہ قرار دیا گیا ہے کہ جو بات سارے مسلمان متفقہ طور پر قبول کریں، یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ خدا کی ہدایت ہے[۲]، جو رواج اس سے کم متفقہ ہو، وہ محض رواج ہونے کی بنا پر قانون بالکل نہیں سمجھا جاتا، بجز متاخر مالکی مذہب کے[۳]، اگرچہ

---

[۱] معلوم نہیں کس حد تک قابل قبول ہے کہ اجماع کو نص سمجھا جائے۔ اجماع بے شک واجب العمل ہے، اور قرآن و حدیث کے برابر سمجھا جاتا ہے، بشرطیکہ ان دونوں پر مبنی ہو، اس کے خلاف اجماع قابل تبدیل چیز ہے، جیسا کہ اصول بزدوی میں صراحت سے بیان ہوا ہے کہ جدید تر اجماع قدیم تر اجماع کو منسوخ کر سکتا ہے۔ (مترجم)

[۲] نہ معلوم اس سے کس حدیث کی طرف اشارہ ہے۔ "لا تجتمع امتی علی ضلالۃ" (میری امت کسی گمراہی پر کبھی متفق نہ ہوگی)، "ما رآہ المسلمون حسنا فہو عند اللہ حسن" (جو مسلمانوں کی نظروں میں اچھا ہو وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہے)، "ید اللہ مع الجماعۃ" (جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے) حدیث میں بے شک ملتے ہیں، لیکن مؤلف کا بیان ان میں سے کسی کا لفظی ترجمہ نہیں۔ (مترجم)

[۳] مسٹر جیر الڈ کی انگریزی کتاب "قانون محمدی" Mohammedan Law صفحہ (۱۴)

فتووں کو قانون موضوعہ Statute law کے برابر مؤثر قرار دیا ہے، نیز اس لیے کہ ساری کتاب "خلاصہ" (ڈائجسٹ) [جو علماء کے آراء پر مشتمل ہے] قانون موضوعہ تھی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قانون روما کے ایک قدیم تر زمانۂ ارتقاء میں فتووں کو بن لکھا قانون سمجھا جاتا تھا۔[1] اگر ہمارا یہ گمان صحیح ہے تو رومی قانون میں لکھے ہوئے اور بن لکھے ہوئے قانون میں جو فرق ہے وہ قانون اسلام کے [نص و قیاس] کے فرق سے قریب تر ہوگا، کیونکہ قانون اسلام کے دورِ تدوین سے بہت عرصہ بعد تک علماء کے استنباطات کو "نص" نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اور اسلامی قانون میں ایسی کوئی چیز نہیں جو رومی قانون کے "لیکس" Lex (یعنی قانون شہنشاہی)، "پلے بی سیتاس Pleebiscitas (قانون بر استشارۂ عوام)، "سیناتس کونسولتا Senatus consulta (مجلس حکومت کے فیصلے)، "پرین کی پیوم پلاکیتا" Princypium placita، اور "ماگسترا توم لے دکتا" magistratum edicta (مجسٹریٹ کے حکمناموں) کے، جن کا جسٹی نین نے اپنی تقسیم قوانین میں ذکر کیا ہے، مماثل ہو۔ اسی طرح قانون روما میں ایسی کوئی چیز نہیں جو اسلامی قانون کے اس دعوے کے مماثل ہو کہ وہ احکام الٰہی کا نام ہے، جس پر اسلامی نظام قانون قائم ہے۔ اسلامی قانون کے مستند احکام (نص) صرف قرآن پر مبنی نہیں ہیں، اور خود قرآن اس لیے واجب العمل نہیں کہ وہ لکھا ہوا ہے، بلکہ اسلیے کہ وہ ندائی وحی پر مشتمل ہے — بلکہ اس میں حدیث (جو اسلام کے آغاز سے ڈیڑھ سو سال تک قلمبند نہیں کی گئی[2]) اور اجماع بھی شامل ہے (جو علمائے قانون یا ساری

---

[1] دیکھو کتاب ڈائجسٹ ۱/۲/۲/۱۲ میں پومپونیوس Pomponius (مؤلف) [2] یہ بیان صحیح نہیں، بہت سے صحابہ نے حدیث کو عہد نبوی ہی میں قلمبند کرنا شروع کر دیا تھا، بعض نے بعد میں یا تو خود لکھا، یا لکھوایا، اس کے متعلق کچھ معلومات علامہ شبلی کی سیرۃ النبی ج اول میں ملیں گے، کچھ تفصیل میری کتاب "صحیفۂ ہمام بن منبہ (خاص کر اس کے انگریزی ترجمے) کے مقدمے میں ہے۔ (مترجم)

(۳۷) مگر یہ ایک تاریخی غلط فہمی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اپنی انانیت کی وجہ سے جسٹینین نے [لاطینی میں] یہ کہا ہے کہ tam conditor quam interpres legum solus imperator (یعنی صرف شہنشاہ ہی بہ یک واضع قانون اور تعبیر کنندۂ قانون ہے)[1]۔ گویا یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کی دریافت کا سہرا اس کے سر ہو، حقیقت میں وہ کم از کم دقیانوس (دقلطیانوس[2] Diocletian فوت ۳۰۵ء) کے زمانے سے معلوم تھی، کیونکہ اس وقت مّتازالی قانون دان اثر قانون کی نشو و نما کے لیے شہنشاہ کے نام سے شہنشاہی مجلس شوریٰ راز Privy council میں ڈالا جانے لگا تھا، عہد زریں میں ماہر قانون پاپی نیان[3] Papinian بھی اس خدمت کو انجام دے چکا تھا، اور رومی ماہرین قانون میں سے آخری جو اس کے مجاز ہیں کہ قانون بنائیں quibus permissum est jura condere اور جن کے متعلق یہ خیال کرنا درست ہے کہ ان کی رائے قانون کا ماخذ ہے — مودیسینوس Modestinus تھا، [زمانہ ۲۲۶ تا ۲۴۴ء] جو اسلام سے چار صدی پیشتر گزرا ہے[4]، واضح رہے کہ کوئی قوم بعض وقت کسی دوسری قوم کے تمدن سے وہ چیزیں مستعار لیتی ہے جو اس کے زمانے میں اس کے ہاں پائی جاتی ہوں، لیکن

---

[1] دیکھو جسٹینین کا مدونہ قوانین ۱/۱۴/۱۲ (Code , xiv , 12) (مؤلف)

[2] یہ رومی شہنشاہ ہے، جو ۳۰۵ء میں فوت ہوا۔ (مترجم)

[3] یہ ایک رومی قانون دان ہے، جسے شہنشاہ کاراکلا Caracalla نے ۲۱۲ء میں سزائے موت دی تھی (مترجم) [4] جس آخری قانون والے کا ذکر ملتا ہے وہ ہرموگے نیانوس Hermogenianus ہے جو محض ایک معلومات کو جمع کرنے والا مؤلف Compiler ہے [جس میں کوئی اپج نہ تھی] اور یہ بھی اسلام سے تین صدی پہلے گزرا ہے۔ (مولف)

قانون کے ماتحت وہ واجب العمل ہو سکتا ہے،

(۲۳) اس سلسلے میں گولٹ سیہر نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ لکھے ہوئے اور بن لکھے قانون میں جو فرق ہے وہ اسلام سے تقریباً پچاس سال قبل یہودیوں نے رومی قانون سے لیکر ربیوں کے قانون میں داخل کر دیا تھا، لیکن یہ فرق فی الحقیقت "ہمارے رب[1]" [نعوذ باللہ] کے زمانے میں بھی موجود تھا، اور اس وقت [یہودیوں کو] رومی تسلط سے جو نفرت تھی اس کے باعث ایسی کوئی تاثیر عملاً ہو نہیں سکتی تھی۔[2] گولٹ سیہر کے ذہن میں بہ ظاہر یہودی عقائد کا ایک متاخر تغیر تھا کہ بن لکھے قانون کو بھی لکھے ہوئے قانون کے برابر توریت کا جزء سمجھیں اور یہ مانیں کہ وہ بھی [حضرت] موسیٰؑ پہ جبل حورب Horeb (یعنی طور سینا) پہ نازل ہوا تھا، لیکن یہ بالکل غیر رومی تصور ہے۔

(۴) "جس طرح روما کے اہل قانون کی رائے opinion میں علمائے قانون کی رائے "بہت وزن دار چیز تھی، اسی طرح مسلمان فقہاء نے بھی یہ امتیازی حق حاصل کر لیا کہ ایک واجب العمل موضوعی [شخصی] رائے ظاہر کر سکیں۔ عربی اصطلاح "رائے" لاطینی اصطلاح opinio کا لفظی ترجمہ ہے۔"

---

[1] یعنی حضرت عیسیٰؑ اس لفظ Our Lord کے استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف نے عیسائی مذہب قبول کرنے کا اعلان کر دیا تھا، اسی لیے پیدائشی عیسائیوں سے زیادہ زور و شور سے اس کا ۔۔ کرتا ہے۔ (مترجم)

[2] دیکھو انجیل متی باب ۲۵، جملہ ۲، اور انجیل مرقس باب ۷، جملہ ۵ تا ۱۳، جن میں ہے کہ "خدا کی بات کو تم اپنے رواج کے باعث بے اثر بنا دیتے ہو ۔ (کامل عبارت ۱۵/۱ تا ۲ میں یوں ہے: "فریسی لوگ اور کاتبان توریت یروشلم سے یسوع کے ہاں آئے اور پوچھا: ایسا کیوں ہے کہ تیرے تبعے پرانے لوگوں کے عملدرآمد پہ دست درازی کرتے ہیں؟ کیونکہ وہ کھانا کھاتے وقت ہاتھ نہیں دھوتے! جواب دیا: اور تم اپنے عملدرآمد کی خاطر اللہ کے احکام پر کیوں دست درازی کرتے ہو؟ ... مرقس کے ہاں قصہ زیادہ تفصیل سے ہے، اور وہاں جملہ ۸ تا ۹ میں ہے: "تم اللہ کے حکم کو نظر انداز کرتے ہو اور انسانوں کے عملدرآمد کو ملحوظ رکھتے ہو، اور یہ بھی فرمایا: تم بے تردد اللہ کے حکم کو باطل قرار دیتے ہو تاکہ اپنے عملدرآمد کی حفاظت کر سکو۔" (مترجم)

کے نام سے معروف ہے، "اہل رائے" (یعنی رائے کی مدد سے قانون استنباط کرنے والے) کی اصطلاح سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اولاً امام ابوحنیفہؒ کے متبعین کے متعلق انکے مخالفین نے بطور اعتراض و طنز کے استعمال کیا۔ اس سے [ضمناً] یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ساری دنیا کے دیگر اہل قانون کی طرح مسلمان فقہا بھی اس کو ماننے سے ہچکچاتے تھے، کہ وہ اپنی شخصی رائے سے قانون سازی کرتے ہیں ــــ چاہے وہ حقیقت میں ایسا کرتے تھیوں۔ اس کی مماثل شہادت اس روایت میں ملتی ہے، جس کے مطابق امام مالک نے کہا تھا کہ اگر کبھی وہ قیاس سے کام لیں تو انھیں کوڑے لگائے جائیں۔ ایک اور قدیم فقیہ کی طرف یہ قول منسوب ہے کہ "قیاس سور کے گوشت کی طرح ہے: اس کا کھانا صرف اس وقت جائز ہے، جب کوئی اور چیز موجود نہ ہو۔[1]

---

[1] "القیاس کالخنزیر لایوکل الا عند الضرورۃ" یہ قول بعض انتہائی متشدد تابعین کی طرف منسوب ہے، بات تو حق ہے لیکن اسے برے اور گندے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، اس کے مفہوم سے کسی کو اختلاف نہیں، اور خود "اصحاب الرائی" اور قیاس کا برملا استعمال کرنے والے بھی یہی کہتے ہیں۔ اس قول سے مراد یہ ہے کہ پہلے قرآن و حدیث پر عمل کیا جائے، اگر یہ دونوں ساکت ہوں تو اجماع پر اور سب سے آخر قیاس پر۔ اس کے سوا کوئی اور صورت درست نہیں، زیادہ شدید اس وقت پیش آئے گی جب اسکے بارہ میں قرآن و حدیث ساکت ہوں، جیسا کہ سلیم العوانی از راہ عنایت مطلع کیا ہے کہ امام شافعی نے بھی اپنی کتاب "الرسالہ" میں اسکی مماثل عبارتیں لکھی ہیں، "اس وقت ایسی صورتوں میں اجماع کے مطابق حکم دیگا، پھر قیاس جو اس [یعنی نص] سے ضعیف تر ہے، مگر وہ ضرورت کے موقع پر ہوتا ہے، نہ کہ جب "خبر" (یعنی حدیث) موجود ہو تو قیاس جائز نہیں ہوتا جس طرح تیمم کہ اس سے سفر میں طہارت اس وقت حاصل ہوتی ہے جب پانی موجود نہ ہو، لیکن اگر پانی موجود ہو تو اس سے طہارت حاصل نہیں ہوتی"۔ (الرسالہ ص ۱۰۱۷، شائع کردہ احمد شاکر) (مترجم)

تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی قوم نے کسی دوسری قوم کی طویل و قدیم تاریخ قانون میں آہستہ آہستہ ارتقاء کی جو تدبیریں ہوئی تھیں ان کو مستعار لیا ہو، اسلام کی ابتدائی دو صدیوں میں ایسے (غیر مسلم) علمائے قانون Prudentes پائے جاتے تھے جن کی مسلمان فقیہ نقل کر سکتے تھے، اور شاید انھوں نے نقل کی بھی[1]، لیکن یہ رومی نہیں بلکہ بابلی یہودی تھے، جو سورا اور پمبادیتا میں رہتے تھے، اور کتاب تلمود[2] کی تعلیم گاہوں کے عمدہ (گؤنیم Gaonim) تھے، ہم اوپر [ص ۳۳] اس ممکنہ مماثلث کی طرف اشارہ کر چکے ہیں، رومی علمائے قانون Prudentes اگر شہنشاہ کی مرضی کے تابع ہوا کرتے تھے تو اس کی مثال ربّی [یہودی] اہل قانون کے ہاں بھی ملتی ہے، ان میں سے ایک اپنے زردشتی مربی اور شہنشاہ ایران کے نام سے منسوب ہو کر عام طور پر شاپور کے

---

[1] یہودی عبرانی میں لکھتے تھے، اور اسے غیر یہودیوں سے مخفی رکھتے تھے، ان کی کسی چیز کا عربی میں ترجمہ نہیں تھا، ان کی تعداد بھی مٹھی بھر تھی، جن سے مسلمان اہل علم کو کبھی سابقہ ہی نہیں پڑتا تھا، اس لیے وہ سارے اعتراض جو رومی اثر کے مدعی پر کیے جا سکتے ہیں، اس پر بھی وارد ہوتے ہیں کہ یہ یہودی اثر مسلمانوں پر کب اور کس طرح پڑا ہر بچہ پیدا ہوتے وقت روتا ہے، یہودی بھی مسلمان بھی اور کوئی کسی دوسرے سے نہیں سیکھتا جب کوئی طریقۂ عمل معلوم نہ ہو تو ہر انسان پہلے اپنے ہاں کے قانون ہی کی طرف رجوع کرتا ہے، پھر خود سوچتا ہے، سورا اور پمبادیتا میں نہ مسلمان جاتے تھے اور نہ وہاں سے کوئی مسلمان فقیہ پیدا ہوا، مسلمان فقہا میں کسی نو مسلم یہودی کا بھی پتہ نہیں چلتا (مترجم) [2] دیکھو اوپر حاشیہ ۱۸/ب

[3] "تلمود کا" کا عبرانی لفظ وہی ہے جو عربی میں تلمذ اور تلمیذ (یعنی شاگردی اور شاگرد) کی شکل میں ملتا ہے، یہ توریت کی گویا شرح، اور ربیوں کی آراء پر مشتمل ہے، اس نام کی دو کتابیں ہیں، ایک بابلی تلمود اور دوسری یروشلمی تلمود۔ (مترجم)

(۴۰) مذکورۂ بالا دلائل کی اساس پر گولٹ سیہر نے جو دعویٰ ثابت کرنا چاہا ہے، وہ یہ ظاہر ہے کہ رومی قانون کے ایک سابقہ [قدیم تر] دور کی صورت حال سے اسلامی فقہا نے وہ ذہنی آلہ کار مستعار لیا جس کی مدد سے انھوں نے اپنے نظام قانون کی تعمیر کی ہو، لیکن اس طرح مستعار لینے کی کوئی شہادت نہیں ملتی، اور حقیقتاً میں یہ سارا تصور ہی غلط ہے۔ اگر اس کی کوئی ضرورت پڑی بھی ہو [illegible] یعنی [مسلمان فقہا کو] ان کی ذاتی قابلیت بلحاظ استدلال قابلیت کے سوا کسی [illegible] ضرورت پڑی بھی ہو تو وہ ایسے ماخذ ہیں جو زیادہ قرین قیاس ہیں، ان دونوں کا اوپر ذکر ہو چکا ہے: مسلمان کا سابقہ تھا عیسائیوں کے مدرسہ ہائے قانون، اور ان یونانی فلسفیوں کے جانشین جن کو جسٹینین نے ایتھنز سے جلاوطن کر دیا تھا، اور جنھوں نے ساسانی [ایرانی] سلطنت میں پناہ لی تھی۔ [illegible] احتراز کرتے [illegible] فلسفہ کے اثرات کی ایک مثال یہ ہے کہ [illegible] اصطلاح "فاسد" کی تعریف "جوہر" اور "عرض" کے واسطے سے کی جائے،[1] [illegible] ارسطاطالیسی منطق کی یاد دلاتا ہے، اگرچہ اس میں جو بنیادی تصور ہے، وہ خالص اسلامی چیز ہے۔ اسلامی قانون کا ایک اور ممکنہ ماخذ رہا ایک دوسری ہی چیز یعنی عبادات سے متعلق ہے، اور جس کی طرف خود گولٹ سیہر نے اشارہ کیا ہے، وہ ساسانی سلطنت کا

۱؎ اگر اس [illegible] مضمون میں کوئی طباعتی غلطی نہیں ہوئی ہے تو اس مختلف جملے کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی چیز کے "جوہر" میں برائی آئے تو وہ باطل اور حرام ہو جاتی ہے، اور اگر برائی "عرض" یعنی ذیلی چیز میں ہو تو وہ فاسد ہو جاتی ہے، اصل عبارت یہ ہے:

The definition of the important word fasid in terms of 'essence' and 'accident' is reminiscent of Aristotelian logic". (مترجم)

(۵) "عربی [اسلامی] قانون میں مصلحت یا استصلاح کا جو اصول پایا جاتا ہے وہ
رومی قاعدہ "مفادِ عامہ" Utilitas publica سمجھا ہے۔"

(۳۸) "مفادِ عامہ" کو رومی قانون کی ترقی کیلیے بطور اصول کبھی صراحت سے تسلیم نہیں کیا گیا،
پہلی مرتبہ وہ قرونِ متوسطہ کے طلبہ میں اصولوں میں سے ایک کے نام کے طور پر دکھائی دیتا ہے[1]
یہ ایک بالکل مختلف قانونی اصول تھا۔ اس کے برخلاف یہودی قانون کا ایک ممتاز اصول ہے،
مثلاً کتاب مشنا گیتین Mishna Gittin ۴ اور ۵/ہر) "عوام کی بھلائی کی پیش بندی
میں" کا جملہ کم سے کم بارہ مرتبہ دہرایا گیا ہے، اسلامی قانون میں اس اصول کی سب سے بڑی ترقی
[امام مالک کے ہاتھوں] مدینہ منورہ میں ہوئی، مدینے میں یہودی اثر مسلمانوں کی دسترس
میں تھا[2]، لیکن یہ مقام رومی اثرات سے بہت دور تھا۔

(۳۹) اسی طرح اسلامی نظریہ "اجماع الامہ" (یعنی ماہر اہلِ علم کا اتفاق رائے) گو کہ میری
نظر میں عیسائی کلیسا سے مشابہ ہے[3]، اگر یہ مماثلت قبول بھی کیجائے تو اس سے رومی قانون
سے ماخوذ ہونا ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ علما کا اتفاق رائے کبھی بھی رومی قانون کا کوئی مستند
و مسلّمہ Lex ماخذ نہیں رہا، شہنشاہ ودتیانوس (ولنطیانوس) کے زمانے سے تو
یقیناً ماخذ نہیں رہا۔ البتہ ربیوں کے [یہودی] قانون کا ایک باقاعدہ ماخذ ہے، چنانچہ
تلمود میں اکثر یہ جملہ دہرایا گیا ہے کہ "ہمارے سارے ربی یہ رائے رکھتے ہیں کہ ......"

---

[1] ممکن ہو کہ اندلس، صقلیہ اور مغرب کے مسلمانوں ہی سے یہ تصور یورپ میں گیا ہو۔ (مترجم) [2] امام مالک
کے زمانے میں مدینے میں کوئی یہودی نہ تھا، وہ عہد نبوی ہی میں وہاں سے جا چکے تھے۔ (مترجم) [3] اس سے مراد یہ ہے کہ
کیتھولک کلیسا کے مطابق پاپا دین کے اجماع پر روح القدس کا سایہ رہتا ہے اور ان کے فیصلے غلطی سے مبرا اور معصوم
ہوتے ہیں۔ الجماعۃ اور "لا تجتمع امتی علی ضلالۃ" کے مماثل ہے۔ (مترجم)

غالبؔ کا مذہبی رجحان
ان کے کلام کی روشنی میں

از ڈاکٹر ام ہانی ریڈر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی

مضمون نگار نے غالب کے مذہبی رجحان اور آیات قرآنی پر ان کی نظر کے ثبوت میں
جو اشعار پیش کیے ہیں وہ ان کے ساتھ مخصوص نہیں، آیات قرآنی سے متعلق اس قسم کی
تلمیحات اس قدر عام ہیں کہ ان سے کم و بیش ہر پڑھا لکھا مسلمان واقف ہے اور ان
. . . . سے کسی مسلمان شاعر کا کلام خالی نہیں نکل سکتا۔
اس لیے یہ مضمون غالب سے زیادہ آیات قرآنی پر خود مضمون نگار کی نظر کا ثبوت ہے،
اور اس حیثیت سے نئی چیز ہے کہ انھوں نے غالب کے کلام سے یہ اشارے ڈھونڈ نکالے
اور ان سے متعلق آیات پیش کر دیں، اب تک کسی نے اس نقطۂ نظر سے کلام غالب کا مطالعہ
نہیں کیا تھا۔ اس میں ان لوگوں کا بھی جواب ہے جو غالب کو مذہب سے بالکل بیگانہ اور
محض ایک آزاد مشرب رند لاابالی کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ "م"

ہندوستان اور پاکستان میں شاید ہی کسی شاعر پر اتنی تحقیق و تنقید کی گئی ہو جتنی
مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ پر کی گئی ہے خصوصاً گذشتہ صد سالہ برسی کے موقع پر تو ایسا معلوم ہوتا
تھا کہ ان موضوعات کا ایک سمندر امنڈ آیا ہے، لیکن پھر بھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

نظام قانون ہے، لیکن اس کے متعلق معلومات بہت کم پائی جاتی ہیں۔[1]

(۴) [رومی تاثیر کے متعلق] خود گولڈسیہر نے اپنی ان دلیلوں کو جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، کوئی زیادہ اہمیت نہیں دی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تاثیر کے متعلق اس کا یہ گمان خود اسکے اس [ہنگروی] مضمون کے دوسرے اجزاء سے مشکل مطابقت رکھتا ہے، جس میں یہ نظریہ بیان ہوا ہے، کیونکہ وہاں اور اس کی دوسری چوٹی کی تالیفوں میں یعنی "اسلامی مسائل" Muhammedan-ische Studien (مطبوعہ ۱۸۸۹ء تا ۱۸۹۰ء) اور "اسلام پر لکچر" Vorlesungen uber den Islam (مطبوعہ ۱۹۱۰ء) میں اس نے جو نقطۂ نظر پوری صراحت سے بیان کیا ہے اور جو آغاز اسلام کے وجوہ کا پتہ چلانے کے سلسلے میں اسکی نہایت قیمتی علمی خدمت رہی ہے، وہ یہی ہے کہ اسلام کے سارے نظام کی تعمیر میں عربوں کی قدامت پسندی نے جو حصہ لیا اس پر زور دیا جائے۔

(باقی)

---

[1] ایک ایرانی مولف علی مظاہری نے کچھ عرصہ ہوا پاریس کے رسالے "افکار شیعہ" Pensee Chiite نمبر ۱، جنوری ۱۹۵۲ء میں ص (۱۱ تا ۲۰) پر فرانسیسی میں ایک چھوٹا سا مقالہ لکھا ہے جس کا عنوان ہے "ساسانی قانون کا اسلامی قانون سے مقابلہ" Le droit sassanide compare au droit musulman اس میں اولاً یہ لکھا ہے کہ مسلمانوں ہی کی طرح مجوسی بھی یہ خیال کرتے تھے کہ قانون ایک خدائی امر ہوتا ہے؛ وہ الحاد، جادوگری اور ارتداد کو بھی حرام قرار دیتے تھے۔ پھر اس جملے کی آڑ لی ہے کہ "ساری مشابہتوں کے ذکر کیلیے ہمیں ایک پوری کتاب لکھنے کی ضرورت ہوگی"۔ جو سب سے بڑی مثال مشابہت کی انھیں ملی ہے وہ یہ ہے کہ ساسانی قانون میں "وزغ" کو (جس کے معنی پہلوی میں "مینڈک" کے ہیں) قتل کی اجازت ہے۔ اسلامی فقہ کی کتابوں میں بھی "وزغ" کے (جس کے معنے عربی میں چھپکلی کے ہیں) قتل کی اجازت ہے، البتہ فقہا نے مینڈک کے قتل سے صراحۃً منع کیا ہے، مگر اس عالمانہ بحث سے ساسانی قانون کی فقہ پر تاثیر کیا ہوئی، کچھ واضح نہیں ہوتا۔ (مترجم)

حمید صاحب نے غالب کے مذہب کے متعلق ان سے دریافت کرنا چاہا تو انھوں نے کہا: "ان کے مذہب کا کیا ٹھکانا، جہاں بیٹھے اس طرف ہو گئے"۔ (مقالہ غالب کی خانگی زندگی کی ایک جھلک" آئینۂ غالب، گورنمنٹ آف انڈیا پریس ۱۹۶۹ء ص ۹)

عرشی صاحب نے بنظر احتیاط خود غالب کے الفاظ نقل کر دیے ہیں: "اگرچہ فاسق و فاجر ہوں مگر وحدانیت خدا اور نبوت خاتم الانبیاء کا بدل معتقد اور بزبان معترف ہوں۔ (مکاتیب غالب دیباچہ ص ۱۸)

پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں "میر کو بچپن سے تصوف کے اثرات ملے، اقبال کو گھریلو ماحول میں درویشی اور گہری مذہبیت ملی، غالب کو بےفکری اور عیش امروز ملا" (مقالہ غالب کی عظمت (مجموعہ) اردو کے کلاسکی شعراء پر تنقیدی مضامین، مرتبہ حبیب خاں، انڈین بک ہاؤس، قاضی پاڑہ، علی گڑھ، ص ۱۸)

پروفیسر رشید احمد صدیقی تحریر فرماتے ہیں: "وہ جو کچھ سوچتے تھے، یا جس طرح سوچتے تھے، وہ اتنا ہندی یا اسلامی نہ تھا جتنا عجمی، عقیدے اور ذہن دونوں اعتبار سے وہ عجمی کے اتنے قائل نہیں معلوم ہوتے جتنے عجم کے، غالب اپنے قول و فعل کا جواز ڈھونڈ ھتے تھے، عجم میں یہ فخر بھی کرتے تھے، کہتے ہیں

خوئی آدم دارم آدم زادہ ام   آشکارا دم زعصیاں می زنم

(غالب کی شخصیت اور شاعری، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی ص ۸)

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں "ایک اور دلچسپ مسئلہ مرزا غالب کا مذہب ہے، ان کی تصانیف سے پتا چلتا ہے کہ مذہب سے دلچسپی عوام سے زیادہ رہی، "مہر نیم روز" جس کے شروع میں ابتدائے آفرینش کے متعلق ہندو عقائد کا خلاصہ درج ہے اور بعض اشعار

ان کے کلام کا ایک پہلو اگر اچھوتا نہ رہ جاتا تو شاید ان کی زندگی کے اس گوشے کا بھی پتا چل جاتا جہاں ابتک محققین کی رسائی نہیں ہوئی۔ ان کے ذاتی حالات اور مذہبی رجحانات کے متعلق تمام نقاد اور محقق اس پر متفق ہیں کہ (توحید وجودی پر پختہ یقین رکھنے کے علاوہ) تمام عمر وہ مذہب سے بیگانہ ہی نہیں رہے بلکہ ان کے اعمال و اشغال و اقوال مذہب کے منافی تھے حتیٰ کہ ان کے اس وصف نے خانگی تعلقات کو بھی درہم برہم کر دیا تھا، چنانچہ مختلف اصحاب قلم کی رائے ملاحظہ ہو:-

مولانا حالی جن کو ذاتی طور سے غالب کی قربت حاصل رہی ہے، اور ان کی تصنیف "یادگار غالب" مابعد کی تحقیق اور تنقید میں سنگ بنیاد کا درجہ رکھتی ہے، لکھتے ہیں:-

"مرزا کی بیوی جو الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی تھیں، وہ نہایت متقی اور پرہیزگار اور نماز روزے کی پابند تھیں" (یادگار غالب، شانتی پریس الہ آباد ص ۹۲)

حالی نے ایک لطیفہ سے اس قول کی تائید بھی کر دی ہے،

"پنڈت موتی لال، میر منشی لفٹنی پنجاب مرزا سے ملنے آئے، کچھ پنشن کا ذکر چلا مرزا صاحب نے کہا" تمام عمر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر اور ایک دفعہ نماز پڑھی ہو تو گنہگار، پھر میں نہیں جانتا کہ سرکار نے مجھے باغی مسلمانوں میں کیوں شمار کیا۔ (ایضاً ص ۲۷)

ان ہی بنیادوں پر مرزا کی مذہبی بے مبالاتی کا عقیدہ اتنا راسخ ہو گیا کہ بعد کے لوگوں نے اس کے خلاف کوئی جستجو نہ کرتے ہوئے ان بنیادوں پر فلک شگاف عمارتیں تعمیر کر دیں، حمید احمد خاں لکھتے ہیں کہ انھیں جولائی ۱۹۳۰ء میں غالب کی ایک قریبی رشتہ دار بگا بیگم سے ملنے کا اتفاق ہوا جنھوں نے غالب کی خانگی زندگی کو آنکھوں سے دیکھا تھا جب

اور بازاری عورتوں پر گرویدگی، یہ دلچسپیاں مذہب کے منافی ہیں لیکن جب ہم ان کے کلام پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو معتد بہ اشعار ایسے ملتے ہیں جو ہم کو یہ سمجھنے پر مجبور کرتے ہیں کہ ان کے کردار کے سلسلے کی کچھ کڑیاں امتداد زمانہ میں کھو گئی ہیں اور جو کچھ معلوم ہوا اس میں مبالغہ زیادہ اور اصلیت کم ہے۔ اب رہ گیا خود ان کا بیان جو علما نے ان کے کردار کے متعلق بطور سند پیش کیا ہے، وہ مختلف وجوہ کی بنا پر مستند قرار نہیں دیا جا سکتا، اس لیے کہ

(۱) غیر مسلم حکومت کا زمانہ تھا، ان کو اپنا مفر مسلمان نہ بننے ہی میں نظر آیا، جیسا کہ پنڈت موتی سے ان کی گفتگو ظاہر کرتی ہے، (۲) اقرار گناہ مذہبی حیثیت سے بھی مستحسن سمجھا جاتا ہے، چنانچہ قرآن نے بھی مغفرت اور کشایش کے لیے اقرار گناہ کی تعلیم دی ہے، اور پیغمبروں کا اس پر عمل رہا ہے، مسلمانوں کے عام عقیدے کے مطابق مقبول ترین دعا آیۃ الکرسی کے نام سے مشہور ہے، اس میں حضرت یونس ؑ نے لغزش کا اعتراف کیا ہے،

لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ

اور یہ دعا بارگاہ الٰہی میں مقبول ہوئی تھی، خدا کے اسی قانون کو مدنظر رکھتے ہوئے حافظ نے کہا ہے:

تو در طریق ادب کوش و گو گناہ منست

(۳) صوفیہ کے یہاں شطحیات اور طامات کی گنجایش بھی رکھی گئی ہے جس کے وسیلے سے شاعر کو اظہار خیال کی مخصوص آزادی حاصل ہوتی ہے، (۴) شعراء کی قدیم رسم چلی آئی ہے کہ وہ انفرادی حیثیت اختیار کرنے اور ناصح، واعظ اور امام شہر کی ضد میں مذہب کی زیادہ سے زیادہ مخالفت ظاہر کرتے ہوئے اپنی ذات کو انتہائی گنہ گار کی شکل میں پیش کرتے ہیں،

میر کے دین و مذہب کو کیا پوچھو ہو ان نے تو　　قشقہ کھینچا، دیر میں بیٹھا، کب کا ترک اسلام کیا

تو کیا اس کو لفظ بلفظ صحیح مانا جا سکتا ہے؟

(مثلاً تحفۂ دیر) سے ہندو مذہب کے عقائد کے متعلق مرزا کی جو غیر معمولی واقفیت ظاہر ہوتی ہے وہ شاید آج بہت کم مسلمانوں کو ہوگی، دبستان مذاہب اکثر ان کے زیر مطالعہ رہتی تھی، اور پارسیوں کی مذہبی کتب مثلاً دساتیر سے ان کی ذاتی واقفیت تھی، ممکن ہے کہ مذاہب عالم سے مرزا کی یہ دلچسپی ہرمزکی تعلیم کا اثر ہو، لیکن اس میں کوئی شبہہ نہیں ہے کہ انھیں یہ دلچسپی ضرور تھی، اور اس مسئلے کے متعلق ان کے کئی نہایت پاکیزہ اشعار ہیں، جو رسمی قافیہ پیمائی سے زیادہ قلبی کاوش کا پتہ دیتے ہیں، اس کے بعد انھوں نے کئی اشعار نقل کیے ہیں، منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے :-

با من میاویز ای پدر فرزند آزر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد (غالب نامہ ص ۱۷۱)

اکرام صاحب نے ان کو دبستان مذاہب اور دساتیر میں بھٹکتا چھوڑ دیا اور اس سے قطعاً صرف نظر کر گئے کہ مندرجۂ بالا شعر میں قرآن کی بہت واضح تلمیح ہے

ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری انتہائی مبالغے سے کام لیتے ہوئے کہتے ہیں "یہ سراہ اللہ اکبر کے نعرے لگا رہے ہیں، یہ سرمستی اور مدہوشی کم مائگی نہیں ہے، بلکہ خمخانۂ جاوید میں داخل ہو کر بے اندازہ پی گئے ہیں، یہ کیف سرمدی ہے، یہ عشق الٰہی کے نشے میں غش ہیں، کون ایسا ہے جو اس کیف سے سرشار ہو کر ہوشمند رہ سکتا ہے"، (محاسن کلام غالب مطبوعہ سرفراز قومی پریس، لکھنؤ، ص ۵۷)۔ مگر بجنوری صاحب اس کا کوئی ثبوت نہیں پیش کر سکے۔

اس میں شبہہ نہیں کہ غالب کی زندگی اب تک جو ہمارے سامنے آئی ہے، وہ دنیاداری اور عیش امروز کا ایک طویل سلسلہ ہے، ان کی شراب خوری خواہ "نشاط" کی غرض سے ہو یا "تجودی" کی ضرورت سے مگر ان کی زندگی کا جزو لاینفک بن چکی تھی، اس کے ساتھ ساتھ قماربازی

جاماسپ، جام وجمشید، آتشکدوں اور لالہ زاروں اور ان سب کے رسم و روایات کے ردت اس کا سراغ ان کے اردو کلام یا خطوط میں اس قدر نہیں ملتا جتنا فارسی کلام میں ملتا ہے۔" (غالب کی شخصیت اور شاعری ص ۱۸)

لیکن اگر موازنہ کیا جائے تو غالب کے اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے کلام میں خدا، محمد، جنت، دوزخ، حور، رضوان، یوسف، آدم، ابراہیم، ادریس، سلیمان، عیسیٰ، موسیٰ، ایوب، یعقوب، اوامر و نواہی اور آیات قرآنی کے اقتباسات عجمی حوالوں سے کہیں زیادہ پائے جاتے ہیں، ساتھ ہی یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ غالب کے یہاں محض یہی نہیں کہ یہ حوالے دوسرے فارسی اور اردو شاعروں سے زیادہ ملتے ہیں، بلکہ غالب کی تلمیحات قرآنی دوسرے شاعروں کی بہ نسبت متن قرآنی سے زیادہ قریب ہیں، اور یہ کمال معمولی محنت سے نہیں حاصل ہو سکتا، یہ کاوش انھوں نے کس زمانے میں کی۔ اس کا سراغ لگانا اب مشکل ہے، کیونکہ ان کی وفات کو سو سال سے زیادہ گزر چکے ہیں، معاصرین میں کوئی موجود نہیں، قریب العہد سوانح نگاروں نے اس طرف توجہ نہیں کی اور یہ بہت افسوس اور تعجب کی بات ہے، اس لیے کہ کلام غالب کی یہ غیر معمولی خصوصیت جو شاید کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہوئی، اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ غالب کا یہ کمال اپنے مذہب میں غیر معمولی دلچسپی کا نتیجہ ہے، اس لیے کہ ان کو عربی زیادہ نہیں آتی تھی، مولانا حالی لکھتے ہیں:۔

"مرزا نے عربی میں صرف و نحو کے سوا اور کچھ استاد سے نہیں پڑھا۔" (یادگار غالب ص۵۵)

مگر جو اصحاب قلم کسی قدر غالب کے "طرفدار" ہوئے بھی تو انھوں نے "سخن فہمی" کا حق ادا نہیں کیا۔ یوسف حسین صاحب نے اس سلسلے میں صرف اسی قدر کہا ہے کہ

اور کبھی صاف صاف اعلان کر دیتے ہیں کہ ہماری گناہگاری صرف زاہد کی ضد میں ہے

ہمیں تو حضرت زاہد کی ضد نے پلوائی — یہاں ارادۂ شرب مدام کس کا تھا

اقرار گناہ کے مضامین فارسی شعراء کے یہاں بھی بہت ملتے ہیں

خیام۔ من بندۂ عاصیم رضائے تو کجاست — تاریک دلم، نور صفائے تو کجاست

مارا تو بہشت اگر بطاعت بخشی — آں بیع بود، لطف عطائے تو کجاست

حافظ شیرازی جن کا شمار صوفیائے کرام میں ہوتا ہے، اور ان کو علیہ الرحمہ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، اور خود انھوں نے جا بجا اپنی قرآن دانی نیز عبادت اور ریاضت پر فخر کیا ہے، کہتے ہیں:

حافظا در کنج فقر و خلوت شبہائے تار — تا بود وردت دعا و درس قرآں غم مخور

صبح خیزی و سلامت طلبی چوں حافظ — ہر چہ کردم ہمہ از دولتِ قرآں کردم

لیکن پھر بھی وہ کہتے ہیں:

قدم دریغ مدار از جنازۂ حافظ — کہ گرچہ غرق گناہست میرود بہ بہشت

غالب انکساری میں ایک قدم اور آگے بڑھ گئے، انھوں نے کبھی اپنی قرآن دانی کا اظہار نہیں کیا لیکن کلام کو جا بجا اس طرح قرآنی مضامین سے مزین کیا ہے جس طرح انگوٹھی پر نگینہ جڑ دیا جاتا ہے، اس کے بارے میں خورشید صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"غالب طبعاً عجمی تھے، مسلمان، موحد اور صوفی بعد میں، اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ انھوں نے حمد و نعت و منقبت میں عقیدت کے ہدیے پیش کیے ہیں لیکن انکی شخصیت کا پہلو جتنا اتقیاد و طاعت کا ہے اتنا فکر و تخیل کی بلندی و برنائی اور عرفان و یقین کا نہیں ہے، وہ شاعر اور شخص دونوں اعتبار سے عجمی ہیں، عجم کے یزدان و اہرمن، لہراسپ

لیکن جہاں تک شاعری میں قرآنی تلمیحات کا تعلق ہے، فارسی کے بڑے بڑے شعرا غالب کی کمیت و کیفیت کو نہیں پہنچتے، فارسی کے شاعروں نے اس ضمن میں بہت خطرناک حد تک غلطیاں کی ہیں، چنانچہ جمالی دہلوی ایک متبحر بزرگ ہونے کے باوجود ایک نعتیہ قصیدے میں کہتے ہیں :

موسیٰ ز ہوش رفت بیک پرتو صفات تو عین ذات می نگری در تبسمی

مولانا آزاد نے ترجمان القرآن کے مقدمہ سورۂ فاتحۃ الکتاب میں یہ شعر نقل کر دیا ہے اس کی سند میں علمہ شدید القویٰ، ذو مرۃ فاستویٰ، وھو بالافق الاعلیٰ ثم دنی فتدلیٰ، فکان قاب قوسین او ادنیٰ کو پیش کیا ہے، (ترجمان القرآن، ساہتیہ اکاڈمی ص ۹۴-۹۵)

حالانکہ مندرجہ بالا آیات حضرت جبرئیلؑ سے متعلق ہیں، اور قرآن میں دوسری جگہ صاف صاف لکھا ہے

لاتدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار (۱۰۳- انعام ۶)

لہٰذا "عین ذات می نگری" کا دعوی پایۂ تصدیق کو نہیں پہنچتا، فارسی کے وہ شعرا جن پر ایران کو ناز ہے، اور اس سلسلے میں دوسرے بھی ایرانیوں کے ہم نوا ہیں، انکا حال سنیے :

فردوسی نے شاہنامہ لکھا، مگر اس میں تلمیحات کی گنجایش نہیں تھی، اس کمی کو فوراً ایک مستقل تصنیف مثنوی یوسف زلیخا کے نام سے پورا کرنے کی کوشش کی (اگرچہ بعض ایرانیوں نے اس میں شبہہ ظاہر کیا ہے، کہ یہ فردوسی کی تصنیف ہے، لیکن اب وہ فردوسی کے نام سے چھپ چکی ہے،) شاعر نے آغاز ہی میں ظاہر کر دیا کہ اس کا ماخذ قرآن ہے :-

"انھوں نے اپنے عصیاں پر پردہ ڈالنے کی کبھی کوشش نہیں کی اور نہ کبھی ریاکاری کا لبادہ اوڑھ کر اپنے آپ کو ایسا ظاہر کیا جیسے وہ حقیقت میں نہیں تھے"۔ (غالب اور آہنگ غالب، غالب اکیڈمی، نئی دہلی)

مگر جن خوبیوں کے وہ حامل تھے، اور کلام میں جو قرآنی رنگ آمیزی کر کے مذہبی عقیدت کا جو ثبوت دیا ہے، اس کا کوئی ذکر نہیں، ایک آدھ فقرہ رشید صاحب نے ان کی نکوکاری کے سلسلے میں ضرور لکھ دیا ہے، مگر وہ کافی سے بہت کم ہے:۔

"خطوط غالب کے مطالعے کے بعد اور اس کے صلے میں غالب کو عرش معلی کے جوار میں کوئی محل ضرور الاٹ ہو گیا ہو گا"۔ (غالب اور انکی شخصیت ص ۲۵)

لیکن میرا عقیدہ یہ ہے کہ اس واجبی عربی قابلیت کے ساتھ غالب نے متن قرآنی کو سمجھنے میں جتنی محنت کی تھی، اس کو فرشتوں نے "حسنات" میں لکھ کر تخلیق کلام ہی کے صلے میں غالب کو فردوس بریں کا کوئی محل الاٹ کرا دیا ہوگا، اس لیے کہ تلمیحات قرآنی کا استعمال فارسی اور اردو شعراء میں جتنا عام ہے، اتنا ہی ان کے لیے دشوار بھی ہے، عرفی نے نعتیہ قصیدے میں جس احتیاط کی تلقین کی ہے وہی یہاں بھی صادق آتی ہے،

ہشدار کہ رہ بر دم تیغ است قدم را

چونکہ غالب کو اپنی فارسی شاعری پر ناز تھا

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہای رنگ رنگ — بگزر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ منست

اس لیے دوسروں نے بھی ان کی مدح میں ان کو فارسی شعراء کے ہم پلہ ٹھہرایا ہے، چنانچہ ان کے محبوب دوست حالی نے ان کے مرثیے میں کہا ہے:

عرفی و صائب و اسیر و کلیم — لوگ جو چاہیں ان کو ٹھہرائیں

اس کو صرف شاعری کا سحر ہی کہا جا سکتا ہے، کہ ایک بلند پایہ مترجم اور مفسر نے اس مثنوی کی اتنی تعریف کر دی، حالانکہ جامی نے بلند پایہ صوفی ہونے کے باوجود بھی اس مثنوی کو زلیخا کے خواب سے شروع کیا ہے جس کا قرآن میں کوئی ذکر نہیں، (ان کا دارومدار مسیحی کتابوں پر ہے)

مولانا روم کی مثنوی پر "ہست قرآں در زبان پہلوی" کی چھاپ لگ چکی ہے لیکن ان ہی کے زمانے میں ان پر متن قرآنی سے انحراف کرنے پر اعتراض کیا گیا تھا تو انھوں نے جواب دیا کہ ہماری مراد اصل واقعے کی تبلیغ نہیں ہے، بلکہ ایک مثال قائم کر کے اپنے مقصود کے مطابق نتیجہ نکالنا ہے،

ای برادر قصہ چوں پیمانہ ایست — معنی اندروی بسانِ دانہ ایست
گفت نحوی زید عمراً قد ضرب — گفت چونش کرد بی جرمی ادب
عمر را جرمش چہ بد کاں زید خام — بگینہ او را بزد چوں غلام
گفت ایں پیمانۂ معنی بود — گندمش بستاں کہ پیمانہ است رد
عمرو زید از بہر اعراب است ساز — گر دروغ است آں تو با اعراب ساز

شیخ سعدی نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف گلستاں میں تلمیحات قرآنی کا شاذ و نادر ہی استعمال کیا ہے، مثلاً

پسر نوح با بداں بنشست — خاندان نبوتش گم شد
سگ اصحاب کہف روزی چند — پی نیکاں گرفت و مردم شد

اس میں صرف "خاندان نبوتش گم شد" کا جملہ متن قرآنی سے ہے، "با بداں بنشست" اگرچہ "انہ عمل غیر صالح" (سراپا خطا) کی تفسیر ہو سکتا ہے، مگر متن قرآنی سے خارج ہے۔

الف لام تلک آیات را　　بخواں تا بدانی حکایات را

لیکن فوراً ہی بعد "خوان آراستن یعقوب پنہاں از عصیا و آمدن بخدمت پدر و خبر کردن رفتن اسحاق بکار قربان بگمان اینکہ خوان از عصیا است و دعا کردن و مستجاب شدن دعا در حق یعقوب" کے عنوان سے خارج از قرآن حکایتیں نظم کر دیں، اس تصنیف میں متعدد موضوعات اسی نوعیت کے ہیں، اور یہاں بے محل نہ ہوگا اگر جامی کا ذکر بھی کر دیا جائے۔ انھوں نے بھی یوسف زلیخا پر ایک منظوم تصنیف چھوڑی ہے، جو اپنے موضوع کے لحاظ سے مشہور ترین اور مقبول ترین مثنوی ہے، عبداللہ یوسف علی اس سورہ کے ضمن میں لکھتے ہیں:۔

"In Persian the great Firdousi tried his hand at it. But the greatest masterpiece is that of Jami. I consider it one of the masterpieces of the world's literature..... The original persian is so grand and instructive that it is a pity that our Islamic students do not study it with the attention which it deserves."
(Appendix VI Translation and commentary Shaikh Mohd Ashraf, Kashmiri Bazar Lahore 1938 P 594)

حافظ شیرازی کا دیوان جس کو "لسان غیب" کہا جاتا ہے، اور حافظ شیرازی قرآن دانی کی قسم کھاتے ہیں

ندیدم خوشتر از شعر تو حافظ بقرآنی کہ اندر سینہ داری

اشعار کی تعداد دیکھتے ہوئے ان کا دیوان زیادہ تلمیحات قرآنی کا حامل نہیں، اور جو تلمیحات شامل بھی ہیں، ان کا طریقہ [illegible] کے خلاف ہے، اور حافظ علیہ الرحمہ کے شایان شان نہیں، مثلاً وہ کہتے ہیں:

در عیش نقد کوش کہ چون آبخور نماند

آدم بہشت روضۂ دارالسلام را

دونوں مصرعے اصلیت سے خارج ہیں، کہتے ہیں "چون آبخور نماند" حالانکہ قرآن میں صاف ہے: وکلا منہا رغدا حیث شئتما۔ "آدم بہشت" یعنی آدم نے چھوڑ دیا، حالانکہ قرآن کہتا ہے: واخرجہما مما کانا فیہ۔ یوں تو چھوڑ دینے اور نکالے جانے کا عملی نتیجہ ایک ہی ہوتا ہے، مگر جبر و قدر میں اس مسئلے کی اہمیت بڑھ جاتی ہے، "دار السلام" بھی شاید وزن و قافیے کی ضرورت سے لائے ہیں، حالانکہ قرآن میں کہیں اس کی صراحت نہیں ہے، قرآن میں صرف جنت کا لفظ ہے: یا آدم اسکن انت و زوجک الجنۃ، اور دار السلام اس کا ایک طبقہ ہے۔

غالب:

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن

بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

یہاں بھی "خلد" کا لفظ کھٹکتا ہے، "اخرج" سے زیادہ قریب ہے بہ نسبت چھوڑنے (بہشت) کے۔

اسی طرح "مردم شد" کا جملہ بھی ہے۔

دوسری جگہ حضرت یعقوبؑ کا ایک مکالمہ تحریر کرتے ہیں۔

یکی پرسید ازاں گم کردہ فرزند کہ اے روشن گہر پیر خردمند

ز مصرش بوئے پیراہن شنیدی چرا در چاہ کنعانش ندیدی

متن قرآنی کے لحاظ سے اس واقعے میں تھوڑی سی اصلیت ہے کہ کنعانی کنوئیں میں حضرت یوسفؑ رہے، لیکن حضرت یعقوبؑ نے ان کو نہیں دیکھا، مگر مصر سے پیراہن کی خوشبو سونگھ لی، یہ کسی قدر اصلیت کے خلاف ہے، اور اس میں غالب سے بھی لغزش ہوئی ہے،

بوئے پیراہن ز مصر آورد صبا دیدۂ یعقوب ازو پر جلا

قرآن کہتا ہے:

ولما فصلت العیر قال ابوهم انی لاجد ریح یوسف۔ (۹۴ - یوسف ۱۲)

(یعنی جب اونٹوں کا قافلہ مصر سے روانہ ہو گیا)

اسی طرح بوستان میں حضرت عیسیٰؑ، ابراہیمؑ اور یوسف علیہم السلام کے متعلق جو حکایتیں ہیں ان کے اخلاقی مقاصد نہایت خوب ہیں، خصوصاً وہ جس میں حضرت ابراہیمؑ کو خدا کی طرف سے ہدایت ہوئی ہے،

منش دادہ صد سالہ روزی و جاں

ترا نفرت آمد ازو یک زماں

یہ اس وقت ہندوستان میں قومی ایکتا کے لیے بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے، لیکن متن قرآنی سے دور ہے۔

خریطۂ جواہر

از

شاہ معین الدین احمد ندوی

(۴)

نورالدین ظہوری، عشق آں خانخاں خرابے ہست   کہ ترا آوردہ بخانہ ما

عشق ایسا خانہ خراب ہے کہ تجھکو میرے گھر لاتا ہے، اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ اس کی خانہ خرابی کا ثبوت یہ ہے کہ وہ ایسے گھر میں لاتا ہے جو خود ویران ہے، یا اس کو بھی رفتہ رفتہ ویران کرنا چاہتا ہے،

با کم سخنیش می تواں ساخت   ایں است بلا کہ کم نگاہ است

معشوق کی کم سخنی سے تو نباہ کیا جا سکتا ہے مصیبت یہ ہے کہ وہ کم نگاہ بھی ہے، یعنی نگاہ و ادا کا بھی روادار نہیں،

بر جگر تشنگی خضر دلم می سوزد   کہ سرچشمۂ تیغ دم آبے نچشید

خضر کی اس جگر تشنگی پر میرا دل کڑھتا ہے کہ تلوار کے سرچشمہ کا پانی نہیں چکھا، اور آب حیوان کے پھیر میں رہ گئے،

اس پر میر کا شعر یاد آگیا،

لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا   کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا

اسی طرح کہتے ہیں :

من ازاں حسن روز افزوں کہ یوسف داشتم
کہ عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخا را

قرآن کو سرتا سر دیکھ جائیے، اس میں کہیں لفظ عشق موجود نہیں ہے، اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ یہ انتہائی محبت کا نام ہے تو زلیخا کا جو کیرکٹر قرآن نے پیش کیا ہے اس سے زلیخا کی محبت کا کہیں ثبوت نہیں ملتا، یہی شہرت ہے جس پر غالب نے طنز کیا ہے :

سب رقیبوں سے ہیں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہ کنعاں ہوگئیں

جس کو واقعی محبت ہوتی ہے وہ نہ ناموس کی پروا کرتا ہے اور نہ رقیب کا وجود گوارا کرتا ہے

یا حافظ کا یہ شعر :

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور
کلبۂ احزاں شود روزے گلستاں غم مخور

یوسف گم گشتہ کی واپسی قرآن میں کہیں بھی مذکور نہیں، اور جب وہ واپس نہیں آئے تو ظاہر ہے کہ "کلبۂ احزاں" کیسے "گلستاں" ہو سکتا تھا، بر عکس اس کے حضرت یوسفؑ کے اعزہ خود مصر گئے تھے۔ (باقی)

غالب

(مدح و قدح کی روشنی میں)

غالب پر ایک اہم زیر طبع کتاب مؤلفہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے

یہ کہ تیرا چہرہ دیکھ کر کس میں تیرے خلاف شہادت دینے کی ہمت ہوگی، اسلئے روزجزا بھی انصاف کی امید نہیں،

بلوحِ تربت پروانہ ایں رقم دیدم — کہ آتشے کہ مرا سوخت خویش را ہم سوخت

میں نے پروانہ کی تربت پر یہ تحریر دیکھی کہ جس آگ نے مجھکو جلایا اس کا انجام یہ ہوا کہ اپنے کو بھی جلا لیا، کیونکہ شمع بھی جل کر ختم ہو جاتی ہے،

ہرگز مگو کہ کعبہ ز بتخانہ خوشتر است — ہر جا بود کہ جلوۂ جانانہ خوشتر است

یہ ہرگز مت کہو کہ کعبہ بتخانہ سے بہتر ہے جہاں بھی محبوب کا جلوہ ہو وہ جگہ بہتر ہے،

از خاکِ کشتگانِ تو ہر گل کہ می دہد — معلوم می شود کہ دل پارۂ کسے است

تیرے کشتوں کی خاک سے جو پھول بھی کھلتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ کسی کے دل کا ٹکڑا ہے،

خونابۂ حسرت چکدم از مژہ ہرگاہ — بینم کہ خداوندکے بندہ نواز است

جب میں دیکھتا ہوں کہ کسی کا آقا بندہ نواز ہے، تو میری آنکھوں سے حسرت کا خونابہ ٹپکتا ہے کہ کاش میرا آقا و محبوب بھی بندہ نواز ہوتا،

عرفی بحالِ نزع رسیدی و بہ شدی — شرمت نیامد از دلِ امیدوار دوست

عرفی تو نزع کے حال میں پہنچکر بھی اچھا ہوگیا، تجھے محبوب کے امیدوار دل سے شرم نہ آئی جو تیری موت کی امید لگائے ہوئے تھا،

رفت آں آفتِ دیں از برم اے ہوش بیا — تا بہ بینم کہ چہا بر سرِ ایماں رفتہ است

ہوش سے کہتا ہے کہ وہ آفت دین یعنی محبوب میرے پہلو سے چلا گیا، اب تو واپس آجا کہ یہ معلوم ہو کہ ایمان پر کیا گذری وہ سلامت رہا یا وہ بھی رخصت ہوگیا،

لب بدنداں دست در زیرِ زنخ دارد مسیح — گفتہ اے ہم نشیں گویا کہ ایں بیمار کیست

(تقی) مرنج از من اگر در بزم وصلت کلفتے دارم — سرت گردم چہ پنہاں از تو اندک غیرتے دارم

اگر تیری بزم وصال میں مجھے کلفت ہوتی ہے تو اس سے رنجیدہ مت ہو، تیرے قربان تجھ سے کیا پردہ تھوڑی بہت غیرت مجھ میں موجود ہے، اس لیے کلفت ہوتی ہے، یا تیری رقیب نوازی سے کلفت ہوتی

(قربان وہمی) لوکمان ہجو ماند از خاک کویت پیراہن است بر تنم — آں ہم ز اشک دیدہ صد چاک تا بدامن

ترے کوچہ کی خاک اتنی چھانی ہے اور وہ جسم پر اتنی پڑی ہے کہ لباس بن گئی ہے، اس کا بھی یہ حال ہے کہ آنسوؤں کی کثرت سے دامن تک سیکڑوں جگہ سے چاک ہے، کیونکہ اشک ریزی سے جسم کی خاک جگہ جگہ سے بہ رہی ہے،

(حیدر آغا) بہ تو چوں رسد ضعیفی کہ بفرط ضعف جانش — ز دل فگار تا لب بہزار جا نشستہ

وہ مریض تجھ تک کس طرح پہنچ سکتا ہے جس کی جان کو ضعف کی شدت سے دل سے لب تک پہنچنے میں ہزاروں جگہ دم لینے کے لئے بیٹھنا پڑتا ہے،

ز ہلاک نیست باکم غم آں کند ہلاکم — کہ بمیرم و بکام دگراں گذارم او را

مجھکو موت کا خوف نہیں ہے، مگر یہ غم مجھے مارے ڈالتا ہے، کہ میں مرجاؤں، اور محبوب کو دوسروں کے لئے چھوڑ جاؤں،

(وصل) من بحسرت دور گر دو مدعی مغرور وصل — اے محبت خاک بر سر باد تاثیر ترا

اے محبت تیری تاثیر کے سر پر خاک کہ میں تو حسرت کا مارا دور دور رہوں اور رقیب وصل پر مغرور اور اس سے شاد کام ہو،

(عرفی شیرازی) خاطرم از پرسش روز جزا ہم جمع نیست — بسکہ می بینند مردم درمیاں روئے ترا

روز جزا کی پرسش سے بھی میرا دل مطمئن نہیں ہے، کیونکہ وہاں لوگ تیرا چہرہ دیکھیں گے، اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ تجھ پر لوگوں کی نگاہوں کا پڑنا میرے لئے تکلیف کا باعث ہے، دوسرے

محبوب رقیب کے ساتھ جا رہا ہے اور کہتا ہے کہ عرفی تو بھی ساتھ چل، بڑی مہربانی، مگر مجھے معاف کرو، اس حالت میں میرے پاؤں میں چلنے کی طاقت نہیں ہے،

لازم در گوشہ تنہا و بریزم خون خود عرفی
مباد اقدر دمردن ناشناسی دست من گیرد

عرفی میں اسلئے گوشہ تنہائی میں جاکر اپنا خون گراتا ہوں کہ جو لوگ مرنے کی قدر نہیں جانتے میرا ہاتھ پکڑ لیں اور مرنے نہ دیں،

دیتِ قتل من اینست کہ در روز جزا
بزنم دست بدامانش و دامن بکشد

روز جزا میرے قتل کا خون بہا یہ ہے کہ میں اس کا دامن تھامنا چاہوں اور وہ دامن کھینچ لے، یہ ادا خون بہا کے لئے کافی ہے،

بلحد چگونہ زیں غم دلم آرمیدہ باشد
کہ بے چاں بمرگم چو توئی گزیدہ باشد

قبر میں اس غم سے مجھے کس طرح سکون مل سکتا ہے کہ میری موت پر پشیمانی نے تو لبوں کو چبا رہا ہے تیری یہ ندامت پشیمانی بھی میرے لئے باعث اذیت ہے،

چشم ز بہر خویش دم نزع تر شود
ترسم کہ من بمیرم و غم در بدر شود

نزع کے وقت اس خوف سے اپنے لئے روتا ہوں کہ میرے مرنے کے بعد غم کا ٹھکانہ نہیں رہے گا، وہ مارا مارا پھرے گا،

اس سے ملتا جلتا ہوا غالب کا یہ شعر ہے،

آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

نہ ز مہر آمدہ بر سر بالین دمِ نزع
حیف آید کہ گذاری بدلم حسرت خویش

تو نزع کے وقت میرے سرہانے ازراہ لطف نہیں بلکہ اس لئے آیا ہے کہ میرے دل میں اپنی حسرت باقی نہ رہنے دے، اپنا دیدار دکھا کر اس سے بھی محروم کرنا چاہتا ہے

محبوب جو بیمار عشق کا مسیح ہے، اس طرح بوں کو دانتوں سے دبائے اور ٹھوڑی کو ہاتھوں پر ٹیکے بیٹھا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود کشتی کا بیمار ہے، یعنی اپنے بیمار کی حالت دیکھکر خود اس کی حالت بیماروں جیسی ہو گئی ہے،

گر فتم اینکہ بہشتم دہند بے طاعت قبول کردن و رفتن نہ شرط انصاف است

میں نے مانا کہ بغیر اطاعت و بندگی کے بھی مجھکو بہشت دیں گے، لیکن جو بہشت بغیر طاعت کے ملے اسکو قبول کرنا اور اس میں جانا قرین انصاف نہیں ہے،

یک سجدۂ مستانہ وصد سال بطاعت فہمیدن این مسئلہ موقوفِ دو جام است

اس مسئلہ کو سمجھنا کہ ایک سجدۂ مستانہ سو سال کی عبادت کے برابر ہے، دو جام شراب پر موقوف ہے یعنی بے وحدت کی مستی ہی سے اسکو سمجھا جا سکتا ہے،

عشق می گویم و میگریم زار طفل نادانم و اول سبق است

اس نادان بچہ کی طرح جو پہلی مرتبہ سبق پڑھنے پر روتا ہے میں عشق کے پہلے سبق یعنی عشق کا نام لیکر زار زار روتا ہوں،

گماں مبر کہ تو چوں بگذری جہاں بگذشت ہزار شمع بکشتند و انجمن باقیست

یہ گمان نہ کرو کہ تمہارے ختم ہونے سے ساری دنیا ختم ہو جائیگی، ہزاروں شمعیں گل کیجا چکی ہیں مگر محفل اسی طرح قائم ہے، کسی کے مرنے پر بزم عالم کی رونق ختم نہیں ہو سکتی،

شرمسار ہمت عشقم کہ در ہنگام نزع اضطراب جان سپردن مانع دیدار نیست

میں عشق کی اس ہمت پر شرمسار ہوں کہ نزع کے وقت جان نکلنے کی کھینچ بھی دیدار سے مانع نہیں ہے، اس حالت میں بھی اس میں طاقت دیدار باقی ہے،

میردی باغیر و میگوئی بیا تو ہم لطف فرمودی برو کیں پائے را رفتار نیست

جس نے تیری تلوار کے نیچے آنے کے بعد تیرے چہرہ پر نگاہ ڈال لی اس کو قتل ہونے سے پہلے خونبہا مل گیا، تیرے چہرہ کو دیکھ لینا ہی قتل کا خون بہا ہے،

قاضی عہدی: بچہ اندیشہ ام از خاطر ناشاد روی — چہ بہا طر بگذارم کہ تو از یاد روی

تو کس اندیشہ سے میرے دل سے نکلا جاتا ہے، جب تیری یاد ہی نکل جائیگی تو پھر دل میں رہنے کے لئے کیا رہ جائے گا،

ملا علی: نشد کہ از سر ما فتنہ دست بردارد — ہر زمانکہ رسیدیم آسمان پیداست

مجھے فتنہ سے کبھی نجات نہیں ملی، جس سرزمین میں بھی گیا، فتنہ پردازی کیلئے آسمان پیدا ہو گیا،

غنی خان: ز مردم یاری پرسد کہ حالی کیست تنہا — کہ عمرم در محبت رفت و کار آخر رسیدہ اینجا

میری یہ قسمت بھی دیکھنے کے لئے لائق ہے کہ میری ساری عمر تو محبت میں گذر گئی، اس کے باوجود محبوب مجھ کو نہیں پہچانتا اور لوگوں سے پوچھتا ہے کہ یہ تنہا کون شخص ہے،

من و این مہربانیہا و قاصد چہ میگوئی — مسازد پیش خود حرفے کہ میدانم زبان او

میں اور اس کی یہ مہربانیاں! قاصد تو کیا کہہ رہا ہے، اپنی طرف سے بات نہ بنائیں اسکی زبان پہچانتا ہوں یہ باتیں اس کی نہیں ہو سکتیں،

حسرت این است کہ صیاد مرا چند انی — در قفس داشت کہ راہ چمن از یادم رفت

افسوس اور حسرت اس کی ہے کہ صیاد نے مجھ کو اتنے دنوں تک قفس میں رکھا کہ چمن کا راستہ ہی بھول گیا، اب اگر آزاد بھی ہو جاؤں تو وہاں تک نہیں پہنچ سکتا،

تا کجے آں بیوفا از وعدہ خاموشم کند — یا کند فکرے بحالم یا فراموشم کند

بے وفا محبوب مجھے کب تک وعدوں سے بہلاتا رہے گا، یا اس کو میرے حال کی فکر کرنی چاہئے یا بالکل بھلا دینا چاہئے، کہ اس گومگو سے نجات ملے،

دہن خویش ببوسند و لب خویش گزند چوں در آئینہ بیند بتاں صورت خویش

یعنی جب خوبرو آئینہ دیکھتے ہیں تو اپنی صورت پر فریفتہ ہو کر خود اپنا منہ چومنے اور اپنا لب چوسنے لگتے ہیں،

بیا اے عشق رسوائے جہانم کن کہ یک چندے نصیحتہائے بیدرداں شنیدن آرزو دارم

مجھ کو بیدردوں کی نصیحت سننے کی آرزو ہے، اس لئے اے عشق آکر مجھے ساری دنیا میں رسوا کر دے کہ ناصحوں کو نصیحت کا موقع ملے،

بہ تہمت گنہے می کشند بر دارم کہ از نہ کردن آں قتل را سزا دارم

مجھ کو ایسے گناہ کے الزام میں دار پر چڑھا رہے ہیں کہ اس کے نہ کرنے پر سزا کا مستحق ہوں یعنی اس جرم پر سزا دی جا رہی ہے کہ میں نے وہ گناہ کیوں نہیں کیا،

خوش آں ساعت کہ میرفتی و طاقت می شد از من تغافل از تو می بارید و حسرت می چکید از من

وہ وقت بھی کیسا خوش آیند تھا یا ہوگا کہ تم رخصت ہو رہے ہو اور میری طاقت جواب دے رہی ہو، تمھاری طرف سے تغافل برس رہا ہو اور مجھ سے حسرت ٹپک رہی ہو،

تو و بزم عیش عرفی من و کوچۂ کہ ہر سو سر خوں چکاں فتادہ دل بنوا نشستہ

عرفی بزم عیش تیرا حصہ ہے، یا تجھکو مبارک ہو، میری قسمت میں تو وہ کوچہ ہے، جہاں ہر طرف خوں چکاں سر اور بینوا دل پڑے ہوئے ہیں،

قلی بیگ یکتی :- دور از انصاف است برق آشیانِ من شدن مشت خاشاکے بصد محنت فراہم کردہ است

میں نے بڑی مشقت سے ایک مٹھی تنکے فراہم کئے ہیں، اس لئے میرے آشیانہ کی برق بننا اور اسکو جلانا انصاف سے بعید ہے،

ہر کس کہ زیر تیغ بہ دونیت نگاہ نکرد زاں پیشتر کہ کشتہ شود خونبہا گرفت

از پئے او روان شدم دست زدم بدامنش — کرد تبسمے بمن رو بقفا کہ ایں چنیں

میں اس کے پیچھے چل رہا تھا، اس کا دامن تھامنا چاہا تو وہ منہ پھیر کر مسکرا دیا کہ لو اس طرح،
اس "ایں چنیں" کی وضاحت مرزا غالب کے اس شعر سے ہوگی،

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی — سن کے ستم ظریف نے مجھکو اٹھا دیا کہ یوں

نہ آشنا و نہ بیگانہ، منید انم — کہ اختلاط چنیں را کسے چہ نام کند

تو نہ تو پورا آشنا ہے اور نہ بالکل بیگانہ، سمجھ میں نہیں آتا ایسے تعلق کو کس نام سے یاد کیا جائے،

دلا بحالت مرگم ترا بشارت باد — کہ بعد از ایں بود ایام آرمیدن تو

دل سے کہتا ہے کہ میری موت تیرے لئے خوشخبری ہے کہ اس کے بعد تیرے آرام و راحت کا زمانہ ہوگا، تجھے ساری کلفتوں سے نجات مل جائیگی،

میرم و بر زندگانم رحم می آید مرا — خو بہ آں بیداد ہا داری کہ با من کردۂ

مرتے وقت مجھ کو زندہ لوگوں پر اس لئے رحم کرتا ہے کہ تجھکو تو ایسے مظالم کی عادت ہو گئی ہے جو تو نے مجھ پر کئے ہیں، میرے بعد ان کو یہ ظلم سہنا پڑینگے،

نکند رحمت عام تو در آمرزش ما — کہ تقاضا بر ضمیر کہ گنہ کردہ پشیماں گردم

تری رحمت عام کی شان یہ ہے کہ اس کو عفو میں اتنا توقف بھی گوارا نہیں کہ مجھ کو اپنے اعمال پر پشیمان ہونے کی ضرورت پیش آئے، اس سے پہلے ہی تو معاف کر دیگا،

داری ہوس کہ غیر برائے تو جاں دہد — آہ ایں چہ آرزوست مگر مردہ ام

معشوق سے کہتا ہے کہ تجھکو اس کی ہوس ہے کہ رقیب تیرے لئے جان دے، آہ یہ کیسی آرزو ہے، گویا میں مرگیا ہوں، یعنی میرے جیتے جی یہ تیری آرزو، آخر میری زندگی کس لئے ہے،

میر کا شعر ہے،

دوش ازاں شوخِ جفا پیشہ خود نالیدم — دل کشید آہ کہ یار است چہ می باید کرد

کل جب میں نے اس جفا پیشہ کے ظلم پر نالہ کیا تو دل نے آہ کھینچکر کہا کہ دوست کا معاملہ ہے کیا کیا جائے، بہر حال اس کو برداشت کرنا ہے،

فتنہ در چشم نگار است چہ می باید کرد — گردش لیل و نہار است کہ من می دانم

اس نگار کی آنکھوں میں فتنہ کے آثار ہیں کیا کیا جائے، اس لیل و نہار کی گردش کو میں ہی جانتا ہوں

بے تو ہر گہ کہ تماشائے گلستاں کردم — ہمچو گل دامن خود پر زگریباں کردم

میں نے جب بھی تیرے بغیر گلستاں کی سیر کی، تو جوش دیوانگی میں پھولوں کی طرح دامن کو گریبان کے ٹکڑوں سے بھر دیا، یعنی تیری یاد میں گریبان کو تار تار کر دیا،

حیف این ست کہ جاں در غم ہجراں تو رفت — کاش در روزِ وصال تو فدا می کردم

افسوس اس کا ہے کہ تیرے ہجر میں جان گئی، کاش وصل کے دن میں اسکو تجھ پر نثار کر دیتا

پیش صیادِ من بیدرد از بہر خدا ضامن شو — یک پریدن تا سر دیوار می خواہد دلم

خدا کے واسطے بیدرد صیاد کے سامنے میری ضمانت لے لو، صرف دیوار کے کنارے تک اڑنے کا دل چاہتا ہے، اس سے آگے نہ جاؤنگا۔

من بیدرد بہ فتوائے وفا کشتنیم — یار را از گلہ جور پشیماں کردم

میں تو اپنی وفا کے فتوی ہی سے قتل کے لائق ہوں، کیونکہ میں نے محبوب کو جور کا گلہ کرکے پشیمان کیا ہے، جس کی سزا قتل ہونا چاہیئے،

چہ بیدردانہ امشب درد دل اظہار می گفتم — کہ او کم شنید از من من بسیار می گفتم

میں نے اس بے دردی سے آج کی رات یار سے درد دل بیان کیا کہ وہ بہت کم سنتا تھا، اور میں پوری داستان بیان کر رہا تھا،

آنکھ کھل گئی یعنی دنیا میں آگیا، یہاں دیکھا کہ شبِ فتنہ باقی ہے، یعنی دنیا کے ہنگاموں کو دیکھ کر پھر آنکھ بند ہو گئی،

بچرخ فانوسِ خیال و عالمے حیران درو
مرد ماں چوں صورتِ پروانہ سرگرداں درو

عالم ایک خیالی فانوس ہے، جس میں ساری دنیا حیران ہے، اور انسان اس فانوس کے گرد پروانوں کی طرح سرگرداں ہے، یعنی دنیا ایک خیالی حیرت خانہ ہے اور ایک عالم اس کے پیچھے سرگرداں ہے،

اسی سے ملتا جلتا غالب کا یہ شعر ہے،

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

صفیر بلگرامی: می شوم گستاخ ہر گہ مہربانی می کند
او بہ من کم لطفی از بسیار دانی می کند

محبوب اس سے واقف ہے کہ جب وہ لطف و مہربانی سے پیش آتا ہے تو میں گستاخ و بے تکلف ہو جاتا ہوں اس بسیار دانی کی وجہ سے وہ نگاہ لطف کم کرتا ہے اس میں صنعت کم و بسیار کی تجنیس ہے،

غضنفری: یارانہ با رقیب بسے گفتگو کنم
تا در میان تفحصِ احوالِ او کنم

میں رقیب سے اس لئے دوستانہ زیادہ باتیں کرتا ہوں تاکہ اس سے محبوب کے حالات کا کچھ پتہ چلے،

تا بفراق خو کنم صبر کجا قرار کو
وعدۂ وصل گر دہد طاقتِ انتظار کو

اتنا صبر و قرار کہاں کہ اپنے کو فراق کا عادی بنالوں اگر محبوب وصال کا بھی وعدہ کرے تو انتظار کی طاقت کس میں ہے،

محمد حسین غنی: بر شیشۂ دلم مفگن سنگِ امتحاں
آں عضو نیست دل کہ تواں بست چوں شکست

میرے شیشہ دل پر امتحان کا پتھر نہ مار، دل وہ عضو نہیں ہے جو ٹوٹنے کے بعد پھر جوڑا جا سکے،

جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف اے کشتۂ ستم تری غیرت کو کیا ہوا

ناصر علی:- در فیض است منشین از کشایش ناامید اینجا برنگ دانہ می روید زہر قفلے کلید اینجا

یہ فیض کا دربار ہے، اس لئے کشود کار سے ناامید نہ ہو، یہاں دانہ کی طرح ہر قفل کی کنجی اُگتی ہے،

یعنی ہر کام بن جاتا ہے، اس لئے ناامیدی کی کوئی وجہ نہیں،

رہائی دادہ بر پا رشتہ پیچیدہ صیادم کہ تا باشد وبال خون من بر گردن خویشم

مرے صیاد نے میرے پاؤں میں تاگہ باندھ کر اس لئے رہا کر دیا ہے تاکہ میرے خون کا وبال میری

گردن پر رہے، صیاد پر اس کی ذمہ داری باقی نہ رہے، چڑیا کے پاؤں باندھنے کے بعد اسکا جینا دشوار ہوتا ہے

علی عظیم:- از بیابان عدم تا سر بازار وجود بتلاش کفنے آمدہ عریانے چند

انسان عریاں پیدا ہوتا ہے اور مرنے کے بعد صرف کفن اس کے ساتھ جاتا ہے، اس سے فائدہ

اٹھا کر کہتا ہے کہ عدم کے بیابان سے چند عریاں بدن بازار وجود یعنی دنیا میں کفن کی تلاش میں آئے ہیں

میر عبد الجلیل:- یا در حریم محفل دلہا قدم زدند آہستہ باش تا نہ شکستی شیشہا بہم

دلوں کی محفل کے حرم میں قدم رکھے جاتے ہیں، سلئے آہستہ چلو کہ تیز روی سے دل کے شیشوں کا

ٹکرا و یعنی تعلقات میں ایک دوسرے کا باعث ٹوٹنا ضروری ہے،

انیس کہتے ہیں:

خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

نظیری:- حسن شہرت عشق رسوائی تقاضائی کند جرم معشوق و گناہ عاشق بیچارہ چیست

حسن کا فطری تقاضا شہرت اور عشق کا رسوائی ہے اس میں نہ عاشق کا قصور ہے اور نہ معشوق کا

شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم دیدیم کہ باقی است شب فتنہ غنودیم

دنیا میں آنے اور پھر یہاں سے واپس جانے کا فلسفہ بیان کرتا ہے کہ ازل میں شور وجود

اشکباری کے بعد آنسوؤں کے بجائے دل باہر نکل آئیگا، کیونکہ جب دریا میں پانی کم ہوجاتا ہے تو سطح کی مٹی نکل آتی ہے،

غنی کشمیری: غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ روشن کرد نور دیدہ اش چشم زلیخا را

غنی پیر کنعاں (حضرت یعقوبؑ) کا یہ روز سیاہ بھی دیکھنے کے قابل ہے کہ اس کے نور دیدہ (حضرت یوسفؑ) نے اپنے دیدار سے زلیخا کی آنکھوں کو روشن کیا، مشہور ہے کہ حضرت یوسفؑ کے غم میں حضرت یعقوبؑ کی آنکھوں کی روشنی جاتی رہی تھی،

کس وقت نزع بر سرم از بیکسی نبود
شرمندہ ام ز عمر کہ آمد بسر مرا

میں اپنی اس بیکسی پر اپنی عمر سے شرمندہ ہوں، کہ وہ ختم کے قریب آگئی، مگر نزع کے وقت بھی کوئی سرہانے کھڑا ہونے والا نہ تھا،

نمی کند بمن ناتواں نگاہ آں شوخ
ز بیم آنکہ نگویند ناتواں بیں است

وہ شوخ اس خوف سے مجھ ناتواں کی طرف نہیں دیکھتا کہ لوگ اسکو ناتواں بیں نہ کہیں، (ناتواں بینی عیب ہے)

کند در ہر قدم فریاد خلخال
کہ حسن گلرخاں پا در رکاب است

چھاگل پاؤں میں پہننے کا زیور ہے، اس کے گھنگرو چلنے میں بجتے ہیں، اس سے یہ مضمون پیدا کیا ہے کہ چھاگل ہر قدم پر فریاد کرتا ہے کہ گلرخوں کا حسن پا در رکاب یعنی عارضی اور زوال پذیر ہے، گھنگھرو، قدم اور پا بر رکاب [illegible] ظاہر ہیں،

زاہد اگر نکردۂ پشیماں نگشتۂ
در ہر نماز دست بزانو چرا می زند

شیعہ نماز کے قعدہ میں زانو کو ہاتھ سے تھپتھپاتے ہیں اور زانو پر ہاتھ مارنا پشیمانی کے موقع پر ہوتا ہے، اس سے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ اگر زاہد اپنے اعمال (عبادات) وغیرہ پر پشیمان

اے کاش خاک رہگذرے دوست بودمے تا رخ بکامِ دل بکفِ پاش سودمے

کاش میں محبوب کی راہ کی خاک بنجاتا کہ دل کی آرزو برآری کیلئے اس کے تلووں سے منہ ملتا، یعنی میری خاک اس کے قدموں میں لگتی، اس طرح دل کی آرزو پوری ہوتی،

عرفی شیرازی: ستم رسیدہ دلے دیدم از غم مردم کہ تند خو و ستمگر دریں دیار یکیست

میں نے جب کسی ستم رسیدہ دل کو دیکھا تو یہ سمجھ کر اس کے غم میں مرگیا کہ اس دیار میں صرف ایک ہی تند مزاج و ستمگر (یعنی محبوب) ہے، یہ بھی اسی کا ستایا ہوا ہوگا،

عمرے گذشت و براہِ سلامے نیافتم شرمندۂ دلم کہ چہا در خیال داشت

میں دل سے شرمندہ ہوں کہ اس کے کیا کیا خیالات تھے، مگر ایک عمر گذر گئی اظہار مدعا کا کیا ذکر اس کو سلام کرنے کا موقع بھی نہیں ملا،

چو بیخبر شوم از دیدن تو رشک برم کہ درمیانِ تو و دل چہ راز می گذرد

جب تجھکو دیکھ کر اپنے سے بیخبر ہو جاتا ہوں تو اس خیال سے بڑا رشک آتا ہے کہ میری بیخبری میں تیرے اور دل کے درمیان کیا کیا راز و نیاز ہوا ہوگا،

غیاث حلوائی: چو مرگم شد یقینت لطفہا کردی کہ می بخشد مریضِ مردنی را ہر چہ در دل آرزو باشد

جب میری موت کا تجھکو یقین ہوگیا، اس وقت تونے لطف و مہربانی کی نظر کی کیونکہ جو مریض مرنے والا ہوتا ہے اسکی جو آرزو ہوتی ہے پوری کی جاتی ہے،

بپائے شمع خود شاید کہ من ہم جاں بر افشانم زبانِ خویش اے پروانہ دستے بر سرم کن

پروانہ سے کہتا ہے کہ اپنے پرو بال کا ہاتھ میرے سر پر رکھ دے، شاید اسی کی مدد سے تیری طرح میں بھی اپنی شمع کے قدموں پر جان دیدوں،

سرخوشی: بعد ازیں در عوض اشک دل آید بیروں آب، چوں کم شود از دجلہ گل آید بیروں

باب التقریظ والانتقاد

ایران سوسائٹی سلور جوبلی سووینیر

(۱۹۴۴ء - ۱۹۶۹ء)

از

سید صباح الدین عبد الرحمن

یہ انگریزی کتاب ایران سوسائٹی، کلکتہ کی تازہ مطبوعات کیا، بلکہ فتوحات میں سے ہے، یہ ادارہ ۱۹۴۴ء سے کام کر رہا ہے، جس سے معارف کے ناظرین اچھی طرح واقف ہیں، یہ اپنے سہ ماہی انگریزی رسالہ انڈو ایرانیکا اور متعدد مطبوعات کے ذریعہ سے فارسی علوم و فنون کی مفید خدمات میں، گذشتہ ۲۵ برس سے لگا ہوا ہے، اسی کے ساتھ اسلام کے مشاہیر کی یاد میں کئی یادگار جلدیں بھی شائع کر چکا ہے، جن میں بو علی سینا اور البیرونی کی دو ضخیم جلدیں بہت مقبول ہوئی ہیں،

زیر نظر کتاب اس ادارہ کی سیمیں جوبلی کی یاد میں شائع کی گئی ہے، اس کی ضخامت ۴۰۲ صفحے ہے، کلکتہ میں جو عمدہ سے عمدہ چھپائی ہو سکتی تھی، اسی معیار کے لحاظ سے یہ طبع کی گئی ہے، کاغذ بھی بہت ہی اچھا لگایا گیا ہے، ان ظاہری خوبیوں کے ساتھ اندر معنوی خوبیاں بھی ہیں، اس میں ایشیا یورپ اور امریکہ کے ۲۶ اہل قلم کے مضامین ہیں، جیسا کہ حسب ذیل فہرست سے اندازہ ہوگا، (۱) تمہید از ادارہ (۲) ایران سوسائٹی کی مختصر تاریخ از جناب خواجہ محمد یوسف صاحب کلکتہ (۳) فرخ بیگ مصور کی

نہیں ہے، تو نماز میں زانو پر کیوں ہاتھ مارتا ہے،

برداشت چو بلبل آشیاں را گل گفت کہ "خس کم و جہاں پاک"

آشیاں خس یعنی تنکوں سے بنتا ہے "خس کم جہان پاک" اردو میں بھی ایسے موقع پر بولتے ہیں جب کسی ناگوار چیز سے چھٹکارا ملے اور وہ دور ہو جائے، اس سے فائدہ اٹھا کر کہتا ہے کہ بلبل نے جب چمن سے آشیانہ اٹھایا تو پھول نے کہا کہ "خس کم جہاں پاک" اس بلا سے نجات ملی،

جاں بلب از ضعف نتوانم رسید ما بزور ناتوانی زندہ ایم،

میری جان میں ضعف کی وجہ سے لب تک آنے کی بھی طاقت نہیں ہے اس لئے نہیں نکل پاتی، اس لئے میں گویا ناتوانی کی طاقت سے زندہ ہوں جو درحقیقت موت کا سبب ہوتی ہے،

حسن سبز بخط سبز مرا کردہ اسیر دام ہمرنگ زمیں بود گرفتار شدم

شکاری شکار کو دھوکا دینے کے لئے جال پر گھاس وغیرہ ڈال کر زمین کا ہمرنگ بنا دیتے ہیں صباحت و ملاحت کی طرح حسن کا ایک رنگ سبز بھی ہے "خط سبز" سبزۂ آغاز ہونے کو کہتے ہیں اس سے یہ تخیل پیدا کیا ہے، کہ ایک سبزہ رخ حسین نے اپنے خط سبز سے مجھ کو اسیر کر لیا ہے، کہ جال زمین کا ہمرنگ تھا،

عزت شاہ و گدا زیر زمیں یکساں است میکند خاک برائے ہمہ کس جا خالی

مرنے کے بعد سب زمین میں دفن ہوتے ہیں، اس میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا، اس سے یہ مضمون پیدا کیا ہے کہ زیر زمین شاہ و گدا سب کی عزت یکساں ہے، وہ ہر شخص کے لئے جگہ خالی کر دیتی ہے، کسی کے ساتھ امتیاز نہیں برتتی،

"دربانی"

اوپر کی فہرست سے ظاہر ہوگا کہ یہ مضامین بڑی محنت اور کاوش سے جمع کئے گئے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ایک المیہ یہ ہے کہ یہ تمام مضامین ایرانی سوسائٹی کے بانی ڈاکٹر محمد اسحٰق نے جمع کئے ان کو ایڈٹ کر کے مرتب بھی کیا، مگر یکایک وہ جنت کو سدھارے، اور اپنی محنت کو کتاب کی صورت میں دیکھ نہ سکے، ان کی وفات کے بعد اڈیٹروں کے ایک بورڈ نے اس کو مرتب کیا، جس کے اراکین ڈاکٹر اے. کے. برق، مسٹر وی. بولاڈین، جناب خواجہ محمد یوسف اور جناب عبد المجید تھے، ان اراکین نے بڑی خوش سلیقگی سے اس کتاب کو علم کے شائقین کے ہاتھوں میں دیکر ڈاکٹر صاحب مرحوم کی روح کو خوش کیا ہے، اس کے ناظرین کو ڈاکٹر صاحب مرحوم کی روح بجا طور پر یہ کہہ سکتی ہے،

دل حسرت زدہ تھا مائدۂ لذت درد کام یاروں کا بقدر لب و دنداں نکلا

اس مجموعہ میں مقالات کی ابتدا ڈاکٹر نذیر احمد کے مقالہ سے ہوئی، جو اپنی تحقیق کی گہرائی اور دیدہ وری کے لئے علم و فن کی صف میں اب تک بہت نمایاں ہو چکے ہیں، اس مضمون میں اس تصویر پر بحث ہے جس میں بیجاپور کا ابراہیم عادل شاہ ثانی (۱۵۸۰ء-۱۶۲۷ء) بیٹھا ساز بجا رہا ہے اس کے سامنے تین درباری بیٹھے اس کو داد دے رہے ہیں، پھولوں اور درختوں سے تصویر بہت ہی نظر افروز کر دی گئی ہے، حاشیہ میں گل کاری ہے، اور جا بجا پرندے چہک رہے ہیں، ابراہیم عادل شاہ کی تصویر بڑی جیتی جاگتی ہے، یہ تصویر اس زمانہ کے مشہور مصور فرخ بیگ کی بنائی ہوئی ہے، جو اکبر ابراہیم عادل شاہ ثانی اور جہانگیر کے دربار سے وابستہ رہا، اس تصویر سے متعلق زیکوسلواکیہ کے ایک اہل قلم لیوبر جاجک ایک اور یورپین اہل نظر رابرٹ اسکلٹن اور خود ڈاکٹر نذیر احمد کی رائے میں کچھ اختلاف پیدا ہو گیا ہے، اسی پر پورے مضمون میں ایک فاضلانہ بحث ہے، اس سلسلہ میں فرخ بیگ اور محمد حسین زریں قلم پر مفید معلومات فراہم ہو گئی ہیں،

اس کتاب میں جتنے اور فاضلانہ مضامین ہیں ان میں سے راقم نے اپنے ذوق کے مطابق بعض

بنائی ہوئی ابراہیم عادل شاہ کی شبیہ از پروفیسر نذیر احمد علی گڈھ (۴) ایک یہودی ایرانی مناظر از پروفیسر ڈاکٹر جے۔ پی اسموسین، کوپن ہیگن، (۵) ہندوستان میں ایرانی النسل ارمنی از زینی بابسل (۶) تصوف کا سلسلۃ الذہب از پروفیسر فیروز، سی داور، احمد آباد (۷) مطبع کی گنج معانی از ڈاکٹر ضیاء الدین عبدالحیٔ دیسائی ناگپور (۸) بنگال میں ترک افغان عہد ۱۵۳۸ (۱۲۰۳ء) میں عربی اور فارسی لٹریچر از ڈاکٹر جن مائی دت، کلکتہ (۹) نئی فارسی کے الفاظ میں دار اور تار کا استعمال از پروفیسر ڈاکٹر ول ہیلم الرس، ورزبرگ، مغربی جرمنی (۱۰) محمد عارف شیدا، از ڈاکٹر محمد عبد الحمید فاروقی احمد آباد (۱۱) خراسان میں عربی زبان از پروفیسر رچرڈ ان فرائی ہرورڈ یونیورسٹی، (۱۲) ایک ہندوستانی شہزادہ اور فرانسیسی انقلاب از پروفیسر محب الحسن، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، (۱۳) رودکی نئی فارسی شاعری کا ابو الآباء از ڈاکٹر محمد اسحٰق (۱۴) جیمس موریہ اور اس کا ناول حاجی بابا اصفہانی از ڈاکٹر حسن جاودی تبریزی طہران (۱۵) ایک اعلیٰ مذہبی پروہت منوس چہرگوشتا جن کے خیال میں از پروفیسر ام۔ اف۔ کانگا، پونا (۱۶) ختم شدہ پہلوی لٹریچر کی جھلکیاں از مسٹر جمشید کاؤس جی کتراگ، بمبئی (۱۷) ۱۹۰۵-۱۹۱۱ء میں ایران کا دستوری انقلاب از ڈاکٹر نیگی۔ ار۔ کیڈی لاس انجلس (۱۸) گیارہویں صدی کی ایک اسپینی عربی تصنیف میں قدیم ایران پر ایک باب از ڈاکٹر محمد عابد خان (۱۹) مصور فطرت محمد تقی بہار از پروفیسر فرانسس زیک مچال سکی (۲۰) رودکی کے مجموعہ کلام کا ایک جعلی نسخہ از پروفیسر عبدالغنی مرزویو (۲۱) فارسی زبان کے ہندی الاصل شعراء از سید صباح الدین عبدالرحمن (۲۲) قدیم مسوپوٹومیا کے میں ایرانی طرز کا ایک پیتل کا ہل از پروفیسر اہ ماس سیلونن (۲۳) قدیم ایران کا ایک حجری کتبہ از ریورنڈ ر ایت فارمن شارپ (۲۴) قطب شاہی سلطنت کے زوال کے وقت کچھ ثقافتی پہلو (۲۵) ملک الشعراء بہار: دانشور از پروفیسر رشاد سلام شاہ محمود (۲۶) رسالۃ الصفات الذاکرین والمتفکرین، از استاذ ابو محفوظ الکریم معصومی،

میری نظر اس پر بھی گئی کہ ہندوستان کے اندر فارسی زبان کے ہندی الاصل اہل قلم اور شعراء پر اس مجموعہ میں کیا کچھ لکھا گیا ہے، اس سلسلہ میں ڈاکٹر ضیاء الدین عبدالحیٔ دیسائی کے فاضلانہ مضمون "مطیع کی گنج معانی" کو بہت شوق سے پڑھا، ڈاکٹر ڈیسائی نے اس مقالہ کے سلسلہ میں گجرات میں بہت سی لکھی ہوئی فارسی تصانیف کا ذکر کرکے اپنے ناظرین کو مستفید کیا ہے، مثلاً گجرات کے ایک بزرگ حضرت شاہ عالم (المتوفی ۱۴۷۵ء) کی نو تصانیف جمعۃ الشاہیہ، رسالہ مفاتح خزائن اللہ، رسالہ حسینیہ وحسنیہ رسالہ باقریہ، رسالہ کاظمیہ، رسالہ رضوانیہ، رسالہ محمدیہ اور رسالہ جلالیہ کا ذکر کیا ہے، اسی طرح مدارج المعارف از حضرت قطب عالم، زاد العاشقین فی سبیل الصادقین از مولانا شیخ عبداللطیف، منیۃ العارفین وحلاوت العارفین از شیخ عبدالغنی بیٹنی، شرح اسمار الاسرار از میر سید کمال قزوینی، شرح مقاصد از مولانا سعدالدین، جواہر جلال از مولانا فضل اللہ، کنوز محمدی از شیخ فریدالدین محمد، مرأۃ الجنان از یافعی، جامعۃ الطرق البرہانہ، ملفوظات قطبیہ از حضرت شاہ عالم، فتوح الحرمین از محی لاری وغیرہ کے متعلق بھی معلومات فراہم کئے ہیں، گجرات کے فارسی شعراء میں ملک محمود پیا، مولانا خواجہ شروانی حسینی، مولانا صدر الدین حسین، اللہ دیا، شرف جہاں کو روشناس کرایا ہے، اس قسم کے معلومات فراہم کرکے لائق مقالہ نگار نے گجرات کے ایک شاعر مطیع کی مثنوی گنج معانی پر بڑا پر مغز مقالہ لکھا ہے، مطیع سولھویں صدی کا شاعر ہے، جو کچھ دنوں گجرات کے مظفر شاہ کے لڑکے بہادر شاہ (۱۵۲۶-۳۷ء) کے دربار سے وابستہ رہا، یہ مثنوی بہادر شاہ کی مدح میں لکھی گئی تھی، فاضل مقالہ نگار نے اس میں سے کچھ تاریخی معلومات بھی حاصل کئے ہیں،

ڈاکٹر جیا لی دت نے اپنے مضمون میں بنگال کے ان تمام سلاطین کا ذکر کیا ہے، جنھوں نے بنگال میں عربی اور فارسی زبان و ادب کی ترویج کی کوشش کی ہے، ان کی تحقیق ہے کہ بنگال کے اولین مسلم مصنف قاضی رکن الدین ابو حامد محمد بن محمد العمیدی سمرقندی تھے، ان کی وفات بخارا میں ۱۲۱۸ء

مضامین کو بڑی دلچسپی سے پڑھا، پہلے تو خود ڈاکٹر محمد اسحٰق مرحوم کے مقالہ کی طرف نظر گئی، مولانا شبلی نے شعرالعجم کی پہلی جلد میں رودکی پہ بڑا اچھا باب لکھاہے، اس میں وہ رقمطراز ہیں کہ رودکی ہومر کی طرح مادر زاد اندھا تھا، لیکن ڈاکٹر صاحب مرحوم نے یہ بتایاہے کہ اس نے کافی عمر پا کر اپنی بینائی کھوئی، ثبوت میں اس کے چند اشعار پیش کئے ہیں، جن سے اس کے چشم دید مشاہدات کا اندازہ ہوتا ہے، مثلاً ایک جگہ وہ کہتا ہے،

مہر دیدم بامداداں چوں بتافت | از خراساں سوے خاور می شتافت

اب معلوم نہیں یہ شاعرانہ انداز بیان ہے یا ایک امر واقعہ، مولانا شبلی نے رودکی کی صرف ایک مثنوی کلیلہ دمنہ کا ذکر کیاہے جس کو انھوں نے نایاب بتایاہے، ڈاکٹر صاحب مرحوم بھی یہی لکھتے ہیں البتہ انھوں نے رودکی کی تین اور مثنویوں کے نام لکھے ہیں، دوران آفتاب، عرائس النفائس اور سندبادنامہ، مگر ان کو بھی وہ نایاب ہی بتاتے ہیں،

اسی کے بعد پروفیسر عبدالغنی مرزویو کے مضمون کو پڑھا جس میں رودکی کے اشعار کے ایک جعلی مخطوطہ پر بحث کرتے ہوئے، بہت سے ایسے اشعار پیش کئے ہیں جو ان کے خیال کے مطابق رودکی کے نہیں بلکہ قطران کے ہیں، اس مقالہ کے بعد رودکی کے اشعار جب نظر سے گزرینگے، یہ شبہہ پیدا ہو جائیگا کہ معلوم نہیں اسی کے ہیں یا اس کی طرف منسوب کر دیئے گئے ہیں، جب تک کہ رودکی کا کوئی مستند مجموعہ کلام ہاتھوں میں نہ آجائے۔ یہ فارسی شاعر اب سے پہلے ایک ہزار ساٹھ سال پہلے گذرا ہے، لیکن اس کی شاعری اب تک ارباب ذوق کو قائل کئے ہوئے ہے، یہ وہی شاعر ہے جس کی شاعری پر نظامی سمرقندی کے زمانہ میں کسی نے اعتراض کیا تو نظامی نے اس کے جواب میں لکھا،

اے آنکہ طعن کردی در شعر رودکی | ایں طعن کردن تو از جہل و کودکی است
کانکس کہ شعر داند، داند کہ در جہاں | صاحب قران شاعری استاد رودکی است

کارناموں کا بھی مطالعہ کریں کیونکہ ممکن ہے کہ ہندوستان کی آیندہ نسل فارسی زبان سے بالکل اجنبی ہو جائے، پھر یہ قیمتی وراثت کے تنہا حصہ دار اور مالک ایرانی ہی ہو کر رہیں گے۔

پروفیسر ہارون خاں شروانی دکن کی مسلمان حکومتوں کے بڑے مستند مورخ سمجھے جاتے ہیں اس مضمون میں دکن کی قطب شاہی حکومت کے آخری دور میں زبان، تعمیرات، مصوری، رقص اور ڈرامہ نویسی میں جو سرگرمیاں دکھائی دیں ان کی تفصیل ہے، زبان کی ترقی کے سلسلہ میں دکنی اردو اور تیلگو کا ذکر ہے، فارسی تصنیف میں حدیقۃ السلاطین پر ایک تبصرہ ہے، جو ۱۶۴۱ء میں لکھی گئی، شاہی حکمرانوں کے ساتھ اور دوسرے فارسی شعرار کا بھی تذکرہ ہے، ایک مضمون فارسی زبان میں ملک الشعرار بہار اور ایک عربی زبان میں رسالۃ صفات الذاکرین والمتفکرین میں ہے، موخرالذکر مضمون کے لکھنے والے مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی ہیں، جو ہندوستان کے ان چند عربی اہل قلم میں ہیں جو عربی میں مضامین بڑی بے تکلفی سے لکھتے ہیں۔

اس طرح اس پورے مجموعہ میں علم و فن کا ایک اچھا خزانہ جمع ہو گیا ہے، اس کی ترتیب و تدوین کے لئے اڈیٹوریل بورڈ کے ارکین مبارکباد کے مستحق ہیں، جناب خواجہ محمد یوسف اور ام۔ اے مجید صاحب خاص طور پر اہل علم کی طرف سے تہنیت قبول کریں کہ ان کی غیر معمولی محنت و کاوش سے یہ جلد علمی حلقہ تک پہنچی، اس کی قیمت پچاس روپیہ ہے، ایران سوسائٹی، ۱۲، ڈاکٹر محمد اسحٰق اسٹریٹ کلکتہ ۱۶ سے مل سکتی ہے،

ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں

مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمن ام اے

ضخامت ۲۵۴ صفحے ——— قیمت پانچ روپیے،

میں ہوئی، وہ کتاب "لارشاد" کے مصنف ہیں، انھوں نے سنسکرت کی مشہور کتاب امرت کنڈ کا ترجمہ بھی فارسی اور عربی میں کیا، اس کا نام حوض الحیاۃ رکھا، یہ کتاب یوگ پر ہے، اس مضمون میں حضرت شرف الدین یحییٰ منیری کے مرشد شیخ شرف الدین ابو توامہ کی علمی سرگرمیوں کا بھی ذکر ہے، فاضل مقالہ نگار نے اس مضمون میں ڈھاکہ کے مشہور مورخ عبد الکریم کے حوالہ سے اس کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ بنگال کے سلطان باربک شاہ کے دربار سے بہت سے علما، اور شعرا وابستہ تھے، ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں، ابراہیم قوام فاروقی ملک الشعرا، امیر زین الدین ہروی، افتخار الحکما، حکیم کرمانی، منصور شیرازی، ملک یوسف بن حامد، سید جلال، سید محمد رکن، سید حسن، شیخ وحیدی وغیرہ، لیکن بدقسمتی سے اب ان میں سے کسی کی کوئی علمی یا ادبی چیز باقی نہیں ہے، صرف اتنا معلوم ہے، امیر شہاب الدین نے ایک لغت لکھی، ابراہیم قوام فاروقی نے ایک فارسی لغت فرہنگ ابراہیمی المعروف بہ شرفنامہ تصنیف کی۔

ڈاکٹر محمد عبد الحمید فاروقی کا مضمون "محمد عارف بیشہ" پر ہے، بیشہ جہانگیر اور شاہ جہاں کے دربار سے وابستہ رہا، اپنے زمانہ کا بہت ہی ذہین، پرگو اور ذی علم شاعر تھا، تمام شعرا اس کی نکتہ گیری، عیب جوئی اور ہجو گوئی سے عاجز تھے، وہ ہندی الاصل شاعر تھا، اس لئے ان ایرانی الاصل شعرا کی خبر خوب لیتا رہا، جو اپنے پندار اور غرور میں ہندوستانی نژاد فارسی شعرا کو قابل اعتبار نہیں سمجھتے، اس کے دیوان میں تقریباً ایک لاکھ اشعار تھے، اردو میں اس شاعر کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا تھا، لیکن ڈاکٹر فاروقی نے اس شاعر کو انگریزی داں طبقہ میں روشناس کر کے مفید کام انجام دیا، یہ شاعر اس کا مستحق ہے کہ اس پر پوری ایک کتاب لکھی جائے۔

اس مجموعہ میں راقم کا بھی مضمون ہند نژاد فارسی شعرا پر ہے، اس مضمون کے متعلق تو اس مجموعہ کے ناظرین خود اپنی رائے قائم کر لیں، لیکن اس مضمون کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ ایرانی شعرا سبک ایرانی کے تعصب اور پندار کو چھوڑیں، اور غیر جانبداری سے ہند نژاد شعرا کے

علامہ اقبال، مولوی وحید الدین سلیم، صفی لکھنوی، مولانا ظفر علی خاں، رضا علی وحشت اور مولوی امجد علی اشہری جیسے مشاہیر علم و فن کے علاوہ دوسرے متعدد اہل کمال کی منظومات پر مشتمل ہے، فاضل مرتبین نے نظموں کے ساتھ ہر اجلاس کی ضروری کارروائی صدروں کے مختصر حالات اور اہم تجویزیں بھی قلمبند کر دی ہیں اور بعض صدارتی تقریروں، خطبوں اور اہم تقریروں کے اقتباسات بھی نقل کر دئے ہیں، جن شعراء کی نظمیں ہیں آخر میں اُن کے مختصر حالات بھی دیدئے ہیں، سب سے آخر میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے گذشتہ تمام جلسوں کے سنین، مقامات اور ان کے صدر کے ناموں کی فہرست بھی دیدی ہے، مجموعہ کے شروع میں بریلوی صاحب کے قلم سے مقدمہ ہے، جس میں سرسید کی اصلاحی، تعلیمی اور قومی خدمات، علی گڑھ تحریک اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے مقاصد اور کارناموں کا ذکر ہے اس لحاظ سے یہ مجموعہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی مختصر تاریخ اور اس کے کارناموں کی سرگذشت بھی ہے۔

فضائل درود شریف:۔ مرتبہ مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی، متوسط تقطیع کاغذ کتابت و طباعت معمولی صفحات ۱۶۴ مجلد قیمت ۸/ روپیے ناشر کتبخانہ یحیوی مظاہر علوم سہارنپور۔

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کے افادات میں بعض اعمال و عبادات کے فضائل و برکات سے متعلق مفید رسائل بھی ہیں، زیر نظر رسالہ اسی نوعیت کا ہے، اس میں درود شریف کے فضائل تحریر کئے گئے ہیں، چند سال قبل اسکا پہلا اڈیشن چھپا تھا، اب دوسرا اڈیشن نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے، یہ پانچ فصلوں میں ہے پہلی فصل میں درود شریف کے فضائل کی بعض آیتیں اور متعدد حدیثیں اور دوسری میں خاص خاص درودوں کی فضیلت کی روایتیں درج ہیں، تیسری میں درود نہ پڑھنے کے بارہ میں حدیثوں کے اندر وارد وعیدوں کو نقل کیا

مطبوعات جدیدہ

علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں:- مرتبہ جناب سید الطاف علی بریلوی و محمد ایوب قادری صاحبان، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۴۶۴، مجلد، قیمت ۱۲ روپے، پتہ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس سعیدہ منزل متصل سرسید گرلس کالج ناظم آباد کراچی ۱۸

سرسید احمد خاں مرحوم نے مسلمانوں میں جدید تعلیم کے فروغ اور بعض دوسرے قومی و ملی مقاصد کے لئے ۱۸۸۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی تھی، جو آگے چل کر مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے مشہور ہوئی، اس کے سالانہ اجلاس تقریباً ساٹھ سال تک ملک کے بڑے اور مرکزی شہروں میں ہوتے رہے، جن میں ملت کے نامور ارباب فضل و کمال اور منتخب اصحاب الرائے شریک ہو کر اپنے خیالات ظاہر کرتے تھے، کانفرنس کے اجلاس میں فاضلانہ خطبۂ صدارت، عالمانہ تقریروں اور مفید تجویزوں کے ساتھ اکابر شعراء ولولہ انگیز نظمیں بھی پڑھتے تھے جن سے قوم و ملت کو درس عمل حاصل ہوتا تھا، اب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (علی گڑھ) کے سابق اور آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی کے موجودہ سکریٹری جناب سید الطاف علی بریلوی نے اپنے رفیق کار محمد ایوب صاحب قادری کے تعاون سے ان تاریخی اور اہم نظموں کو مرتب کر کے شائع کیا ہے، ان میں اردو کے علاوہ فارسی اور عربی کی بھی بعض نظمیں ہیں، یہ مجموعہ مولانا شبلی، مولانا حالی، ڈپٹی نذیر احمد، فضل حق آزاد، علی حیدر طباطبائی، بے نظیر شاہ، اسماعیل میرٹھی، مولانا محمد علی جوہر،

طباعت اچھی صفحات ۲۰۸ مجلد مع گرد پوش قیمت للعہ پتہ فیضی نظام پوری ،

۱۵۔ نظام پورہ بھیمڑی ضلع تھانہ ۔

جناب فیضی نظام پوری (بھیمڑی بمبئی) کے ایک نوجوان شاعر ہیں، یہ مجموعہ انکی نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے، انھوں نے موجودہ ادبی بے راہ روی سے اپنے کلام کو محفوظ رکھا ہے اور روایتی انداز کی شاعری میں بھی جدید حالات و مسائل کی عکاسی کی ہے، انکی بعض نظمیں، "یوم آزادی، امن و جنگ"، "آزاد و محکوم" اور "اردو زبان" وغیرہ خاصی ولولہ انگیز ہیں بعض نظموں میں انھوں نے قوم و وطن کے نوجوانوں کو درس و پیام دیا ہے اور غزلوں میں غم جاناں کے ساتھ غم دوراں کی حکایت بھی ہے فیضی صاحب میں شعر و سخن کا ذوق و استعداد موجود ہے مشق و ممارست کے بعد ان کے کلام میں مزید پختگی پیدا ہو گی ۔

مسلمان اور عصری مسائل :۔ مرتبہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۶۸ مجلد قیمت صہ پیسے پتہ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ جامعہ نگر، نئی دہلی ۔

مشہور علمی رسالہ "اسلام اور عصر جدید" میں بلند پایہ علمی مضامین کے ساتھ اس کے فاضل اڈیٹر کے قلم سے "مسلمان اور مسائل حاضرہ" پر بھی اظہار خیال ہوتا ہے، ڈاکٹر صاحب ادیب اور مفکر بھی ہیں اور ان کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کا درد بھی ہے، وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان ترقی کے میدان میں کسی سے پیچھے نہ رہیں، اس لئے ان کے خیالات بڑے مفکرانہ اور سنجیدگی کیساتھ غور و فکر کے لائق ہوتے ہیں، اسمیں شبہہ نہیں کہ مسلمانوں کے لئے جدید مسائل کا حل ضروری ہے مگر یہ بڑا نازک کام ہے، اسکے لئے فہم و تدبر علمی و عقلی نقطہ نظر کیساتھ دین سے لگاؤ اور دینی نقطہ نظر سے واقفیت بھی ضروری ہو تاکہ اسلام کا سررشتہ بھی ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے اور مسلمان اسی دور

گیا ہے چوتھی فصل میں درود کی اہمیت و آداب سے متعلق عام فوائد بیان کئے گئے ہیں اور پانچویں فصل میں بزرگوں کی ان حکایتوں کا ذکر ہے جن سے درود شریف کا وسیلۂ نجات اور ذریعہ بخشائش ہونا ثابت ہوتا ہے، یہ رسالہ بڑا بیش قیمت ہے، اردو میں غالباً اس سے بہتر اور جامع رسالہ فضائل درود میں نہیں لکھا گیا ہے، حضرت شیخ نے فضائل درود کی جو حدیثیں نقل کی ہیں ان کے ہم معنی اور بہت سی حدیثیں نقل کرکے عجیب عجیب حقائق اور دلچسپ نکات تحریر فرمائے ہیں لیکن غالباً فضائل و ترغیبات میں توسع کی بنا پر ضعیف روایات نقل کرنے سے احتراز نہیں کیا گیا ہے۔

قرآن سے ستاروں تک:۔ مرتبہ جناب محمد عبد اللہ صاحب: علوی تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۲۰۰ مجلد قیمت سے رپتہ مکتبہ نور حضرت نظام الدین نئی دہلی ۱۳۔

موجودہ خلائی پرواز اور سیاروں پر انسانی قدم پہنچنے سے مذہب کے متعلق بہت سے سوالات پیدا ہوگئے ہیں۔ اس کے جواب میں کئی کتابیں لکھی گئی ہیں، یہ کتاب اسی سلسلہ کی کڑی ہے اس میں سائنسی انکشافات اور خلائی پروازوں کے بارہ میں اسلامی نقطۂ نظر پیش کرکے دکھایا گیا ہے کہ ان سے اسلامی تعلیمات کو نقصان پہونچنے کے بجائے اسکی تائید ہوتی ہے اور کائنات سے متعلق قرآنی آیات اور احادیث نبوی کی روشنی میں دکھایا گیا ہے کہ موجودہ ایجادات و انکشافات اور خلائی پرواز وغیرہ میں سے کوئی چیز بھی اسلام کے خلاف نہیں ہے بلکہ اسکی موید اور منشائے الٰہی کی تکمیل ہے، اس سلسلہ میں بڑے دلچسپ نکات آگئے ہیں، اس موضوع پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں اختصار کے باوجود یہ کتاب ان سب میں بہتر ہے۔

مضراب:۔ از جناب فیضی نظام پوری صاحب متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و

جلد ۱۱۱ نمبر (۴)

اپریل ۱۹۷۳ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کتبہ سید اقبال احمد)

مسابقت میں کسی سے پیچھے بھی نہ رہیں، ڈاکٹر صاحب میں یہ سب شرائط پائے جاتے ہیں، اسلئے انکے خیالات میں بڑا اعتدال و توازن ہے، انکا قلم جامِ شریعت اور سندان عشق دونوں کا حق ادا کرتا ہے، اور حتی الامکان انکے ہاتھ سے دین کا سررشتہ نہیں چھوٹتا، یہ مضامین اسکا نمونہ ہیں لیکن مغربی تہذیب کی بنیاد تمامتر مادیت پر ہے اور اس سے پیدا شدہ مسائل کا نقطۂ نظر بھی مادی ہے جسکی کوئی اخلاقی بنیاد نہیں ہوتی، اسلئے اعتدال و توازن کے باوجود بعض مسائل میں دونوں کا سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے، مصنف کو بھی یہ دشواری پیش آئی ہے، جس کی جھلک ان مضامین میں نظر آتی ہے، لیکن عموماً ان کا قلم جادۂ اعتدال پر قائم رہتا ہے، اور اس حیثیت سے ان کے خیالات بڑے قابل قدر اور مسلمانوں کے غور و فکر کے مستحق ہیں۔ "م"

فارم ۱۷

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت :- دارالمصنفین اعظم گڈھ

نوعیت اشاعت :- ماہانہ

نام پرنٹر :- سید اقبال احمد

قومیت :- ہندوستانی

پتہ :- دارالمصنفین اعظم گڈھ

نام پبلشر :- "

قومیت :- ہندوستانی

پتہ :- دارالمصنفین اعظم گڈھ

اڈیٹر :- شاہ معین الدین احمد ندوی

قومیت :- ہندوستانی

پتہ :- دارالمصنفین اعظم گڈھ

نام و پتہ مالک رسالہ

میں سید اقبال احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔ "سید اقبال احمد"

جلد ۱۱۱ ماہ ربیع الاول ۱۳۹۳ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۷۳ء عدد ۴

مضامین

شذرات — شاہ معین الدین احمد ندوی — ۲۴۲-۲۴۴

مقالات

مولانا محمد علیؒ کی یاد میں، — سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے، — ۲۴۵-۲۶۴

مولانا شبلی کا نثری اسلوب — جناب عبدالخالق صاحب پٹنہ — ۲۶۵

غالب کا مذہبی رجحان اُن کے کلام کی روشنی میں — ڈاکٹر راقم ہانی ریڈر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

کیا اسلامی قانون رومی قانون کا، مرہونِ منت ہے؟ — ترجمہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب پیرس — ۳۱۷

مطبوعاتِ جدیدہ، — "م" — ۳۱۸-۳۲۰

ہیں جن کے نتائج سے خود مغرب کے مفکرین نالاں اور اُن کے خلاف آواز بلند کرتے رہتے ہیں جن لوگوں کو مذہب کا کچھ پاس و لحاظ یا رائے عامہ کا خوف ہے وہ مذہب کو ان کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں جو زیادہ ترقی پسند ہیں، انھوں نے یہ پردہ بھی اٹھا دیا ہے، اور مذہب کو فرسودہ اور اس زمانہ کے لئے ناقابلِ عمل سمجھتے ہیں۔ جس کا مشاہدہ موجودہ دور کے مسائل میں کیا جا سکتا ہے،

مغربی تہذیب میں جو کمی رہ گئی تھی، وہ کمیونزم نے پوری کر دی، اہلِ مغرب کی زندگی سے اگرچہ عملاً مذہب خارج ہو چکا ہے۔ لیکن اس کا نام باقی ہے، کمیونزم نے اُس کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اس کی بنیاد تمام تر مادیت اور الحاد پر ہے۔ وہ ہر اخلاقی قید سے آزاد ہے، اور اس زمانہ میں ترقی پسندی کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے ایک دنیا اس سیلاب میں بہی چلی جا رہی ہے، ہندوستان میں بھی اس کا سکہ رواں ہے، اس لئے مسلمانوں کا وہ طبقہ جس کو دانشور کہا جاتا ہے۔ اس کا شکار ہے۔ اور اسلام و ملت اسلامیہ کی بیخ کنی کی خدمت بھی انجام دے رہا ہے،

یہ تو مسلمانوں کے مذہب کا حال ہے، اس کا کردار یہ ہے کہ اُن کے خواص کو جن پر قوم و ملت کی رہنمائی اور صلاح و فلاح کی ذمہ داری ہے، اپنے ذاتی فائدے کے لئے مسلمانوں کی قیمتی سے قیمتی متاع کو قربان کر دینے میں تامل نہیں ہوتا، مسلمانوں کی تاریخ گواہ ہے کہ ان کے خواص نے دین و ملت کے لئے کیسی کیسی قربانیاں کی ہیں۔ پوری تاریخ دہرانے کی ضرورت نہیں۔ خود ہندوستان میں دینی طبقہ میں مجدد سرہندی سے لیکر حضرت

شذرات

قوموں اور ملتوں کی موت وحیات اور ترقی وتنزل کے بہت سے عناصر ہیں، ان میں بنیادی عنصر جس میں ساری چیزیں آجاتی ہیں، اپنے تصورِ حیات پر یقینِ واثق، اس کا تحفظ، اس پر مضبوطی سے قیام اور اس کے مطابق سیرت وکردار کی تعمیر ہے، جو قوم بھی اپنا تصورِ حیات چھوڑ دے گی، اور سیرت وکردار سے محروم ہوگی، وہ زندہ نہیں رہ سکتی، اپنے سے زیادہ طاقتور قوم میں ضم ہوجائے گی، یا اس کا ضمیمہ بن کر رہے گی اس لئے کلام مجید نے ان پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس کا مقصد ہی انہی کی تعلیم و تلقین ہے جس کو اس نے ایمان اور عمل صالح سے تعبیر کیا ہے، ایمان سے مراد اسلامی تصورِ حیات پر راسخ ویقین، اور اس پر قیام، اور عملِ صالح سے مراد اسلامی اعمال و اخلاق، اور سیرت وکردار کی تعمیر ہے

اگر اس پہلو سے ہندوستان کے مسلمانوں پر نظر ڈالی جائے تو ان کی حالت بڑی عبرتناک ہے وہ مسلمان ضرور ہیں، مگر ان میں نہ اسلامی تصورِ حیات پر پورا عمل ہے، اور نہ سیرت وکردار باقی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ حکومت، سیاست، تعلیم، اقتصادیات ہر محاذ پر پسپا ہوچکے ہیں۔ مگر ان کے تصورِ حیات میں اب بھی وہ قوت ہے کہ وہ اس کے سہارے زندہ رہ سکتے ہیں، ان کا منصب تو یہ تھا کہ وہ دوسری قوموں کی رہنمائی کرتے، مگر حال یہ ہے کہ وہ خود ان کی نقالی میں گرفتار ہیں۔ ہر نئی ہوا کے ساتھ بہہ جاتے ہیں، جو چیز بھی مغرب سے برآمد ہوتی ہے، اس کا لحاظ کئے بغیر کہ ان کے تصورِ حیات سے کہاں تک مطابقت کرتی ہے، بے تحاشا اس کی طرف لپکتے ہیں۔ بلکہ ان چیزوں کو بھی اسی ذوق وشوق سے قبول کرتے

مقالات

مولانا محمد علی کی یاد میں

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۵)

مولانا محمد علی نے نہ صرف اپنی تقریروں سے انگلستان میں انگریزوں اور انکی حکومت کے ضمیر کو خلافت کے مسئلہ پر بیدار کرنے کی کوشش کی، بلکہ امریکہ اور اس زمانے میں ہونیوالی سپریم کونسل کی توجہ بھی خلافت کے مسئلہ کی طرف دلائی، سین ریمو میں سپریم کونسل کے اجلاس میں عثمانی سلطنت کی قسمت کا فیصلہ کیا جانے والا تھا، مولانا محمد علی نے اس کونسل میں وفد کے خیالات کو پیش کرنے کیلئے ہر طرف لمبے لمبے تار دیئے اور خطوط لکھے، لیکن انگلستان کے وزیر اعظم لائڈ جارج نے اپنے فاتحانہ غرور اور پندار میں وفد کی اس خواہش کو ٹھکرا دیا، مگر مولانا محمد علیؒ ہمت ہارنے والوں میں نہ تھے، انھوں نے اپنی کوشش سے کنگسوے ہال میں ایک بڑا اجتماع کرایا اور ایسے انگریزوں کو جمع کیا، جو ترکوں سے ہمدردی رکھتے تھے، وہ دل میں ہمدردی نہ رکھتے ہوں، لیکن مولانا محمد علیؒ کی شخصیت اور جادو بیانی کا یہ اثر تھا کہ ان انگریزوں کی زبان سے انگریزی حکومت کی عیاری اور مکاری کا پول کھلوا دیا، اس جلسہ میں حاضرین کی بہت بڑی تعداد تھی، اسکی صدارت اس زمانہ کی لیبر پارٹی کے مشہور لیڈر جارج لینسبری نے کی، اور ان کو یہ کہنا پڑا کہ جب ادھر کے دو تین برسوں کی تاریخ لکھی جائیگی، تو مورخوں کو یہ لکھنا پڑیگا کہ جب جمہوریت کی حکمرانی تھی، تو لاکھوں مردوں، عورتوں اور بچوں کی قسمت کا فیصلہ اٹلی یا کسی اور جگہ بیٹھکر وہ تین مغرور آدمیوں نے کردیا، یہ تین بڑے آدمی Big Three اور ان کے ایک درجن ساتھیوں

شیخ الہند اور مولانا حسین احمد صاحب مدنی تک اور جدید طبقہ میں سرسید اور اُن کے رفقاء نے ملت اسلامیہ کے لئے کیسی کیسی مصیبتیں جھیلیں، اور کتنے بڑے بڑے کام کر گئے، اپنے کو مٹا کر ملت کو زندہ کر دیا۔ ان کے مقابلہ میں آج کا طبقۂ خواص اپنے جاہ و اقتدار کے لئے ملت اسلامیہ کے ناموس کو جس طرح بیچ رہا بلکہ نیلام کر رہا ہے اس سے ہر شخص واقف ہے اس پر اقبال کا یہ قول آج بھی صادق آتا ہے ع

بیچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفےٰ

جو علماء سیاست میں ہیں افسوس ہے کہ وہ بھی اس کی نجاستوں سے اپنا دامن نہ بچا سکے لیکن بحمد اللہ ابھی جمہور مسلمانوں کا احساس مردہ نہیں ہوا ہے، اور جو کچھ امیدیں ہیں وہ انہی سے ہیں۔

ہر حکومت اپنے مطلب کے آدمی پیدا کر لیتی ہے اس لئے وہ قابل الزام نہیں، مگر ایک جمہوری حکومت سے یہ سوال ضرور کیا جا سکتا ہے کہ جمہور مسلمانوں کی آواز کو نظر انداز کر کے ان لوگوں کو مسلمانوں کا نمائندہ اور ترجمان قرار دینا جن کو مسلمانوں کا ادنیٰ اعتماد بھی حاصل نہیں ہے۔ کونسی جمہوریت ہے یہ لوگ تو اپنے غلط مشوروں سے مسلمانوں کو حکومت سے اور دور کرتے ہیں۔ اگر وہ ان کو محض اپنا آلۂ کار بنانا چاہتی ہے۔ تب تو کچھ کہنے سننے کی گنجایش نہیں ہے لیکن اگر حقیقۃً مسلمانوں کو مطمئن کر کے اُن کو قریب لانا چاہتی ہے تو مسلمانوں کے معاملات میں ان مسلم تنظیموں اور شخصیتوں کو نمایندگی کا حق ہے جن کو مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہے، اُن کو فرقہ پرست کہہ کر خاموش تو کیا جا سکتا ہے لیکن مطمئن نہیں کیا جا سکتا، جو مسلمانوں کے لئے مفید ہے۔ اور نہ ایک جمہوری حکومت کے شایان شان ہے،

سے بھی ملتا رہا، دنیا کے وزرائے اعظم اور رہنماؤں کو تار بھی بھیجتا رہا، لیکن یہ ساری کاوشیں مفید ثابت نہیں ہوئیں،

استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی اس وفد کے ساتھ تھے، وہ وفد کی سرگرمیوں کا حال اپنے بزرگوں، عزیزوں، دوستوں اور ساتھیوں کو مختلف خطوط میں ہندوستان لکھتے رہے، جواب برید فرنگ کے نام سے شائع ہو گیا ہے، اس سے وفد کی ساری تفصیلات معلوم ہو سکتی ہیں، حضرت سید صاحب کے جو تاثرات اس سلسلہ میں ہوتے رہے، انکی جستہ جستہ تھوڑی سی جھلکیاں ان ہی کے الفاظ میں ملاحظہ کریں، اس سے انگلستان کے جمہوری اور سیاسی ذہن کا بھی اندازہ ہوگا، اور سید صاحب کے اسلامی درد اور تڑپ کی کیفیت بھی سامنے آجائیگی،

"جب سے ہمارا وفد یہاں آیا ہے اپنے کام میں شب و روز منہمک ہے، آخری فیصلہ جو کچھ ہو، اور یقیناً وہ تمام تر ہماری خواہشوں کے مطابق نہ ہوگا، لیکن ہم کو اپنا فرض ادا کرنا ہے، بیمار اگر مر گیا تو تیمار دار کے حقوق فراموش نہ ہونگے، لیکن مسلمان اس سے نا امیدی کا سبق نہ لیں، بلکہ ہمیشہ کے لئے اپنے دشمن کو تاریخی دشمن سمجھنا چاہئے، اور ہلاکو و چنگیز کے بعد ایک تیسرے نام کا اور اضافہ کرنا چاہئے، اور پھر نئے سرے سے ہم ایک نئی دنیا قائم کریں گے، اور ضرور قائم کریں گے، یورپ آکر ہم کو جو نئی بات ملی وہ یہ ہے کہ ہم اپنی عالمگیر تباہی سے مایوس نہ ہوں، یہاں متعدد قومیں ہیں جو ہماری طرح خستہ حال ہیں، انھوں نے ابتک ہمت نہیں ہاری ہے، اور مشغول جد و جہد ہیں، ان کی تعداد دشمنوں کے مقابلہ میں نہایت قلیل ہے، اور مسلمان تو دنیا میں اپنی بیشمار تعداد رکھتے ہیں وہ کیوں مایوس ہوں، ہزاروں سال کے بعد کون کہہ سکتا ہے، کہ یہودیوں کی آخری

اور ان ہی کی قسم کے اور لوگوں کی زیادتی تھی، کہ وہ دنیا کا نقشہ بدل رہے تھے، اور قومیت کے نام پر ایسی حکومت قائم کرانا چاہتے تھے، جو یہ قومیں خود تو اپنے لئے نہیں چاہتی تھیں، بلکہ یہ چند معزز لوگ اپنے مفاد کے لئے چاہتے تھے، پرانے زمانے میں استبداد پسند حکمراں وہ سب کچھ کر ڈالتے تھے، جو عام لوگوں کے مفاد کے خلاف ہوتا تھا، اور ان کو کوئی خبر بھی نہیں ہوتی تھی، وہ اسی لئے استبداد پسند حکمراں کہلاتے تھے، لیکن موجودہ دور میں جمہوریت کے سیاست داں کیا کر رہے ہیں، وہ مل بیٹھتے ہیں، عام لوگوں سے مشورے بھی نہیں کرتے ہیں، اور دنیا کی قسمت کا فیصلہ کر دیتے ہیں، اور یہ جمہوریت کے علم بردار اپنے مفاد کی خاطر وہ سب کچھ کر جاتے ہیں جو پرانے زمانے کے جابر حکمراں سوچ بھی نہیں سکتے تھے، جارج لینسبری نے زور دیکر کہا کہ مورخ یہ لکھیں گے کہ اس وقت جو صلحنامے کئے جا رہے ہیں وہ سراسر عیاری اور دھوکہ بازی تھی، جو جمہوریت کے نام پر عمل میں آئے۔

اس جلسہ میں انگریزوں میں کرنل ویجوڈ ایم۔ پی، مسز ڈس بارڈ اور مسٹر بی ہارنی مین بھی موجود تھے، سروجنی نائیڈو کی تقریریں ہوئیں، وفد خلافت کی طرف سے سید حسین نے مسئلہ کی وضاحت کی، لیکن جمہوری دور کا اب یہ منافقانہ مسلک ہو گیا ہے کہ دلپذیر اور دل نشیں تقریروں سے سامعین کے دلوں کو خوش کر دو، اور کر وہی جو خود چاہتے ہو،

مولانا محمد علیؒ نے بی جی ہارنی مین کی صدارت میں مینچسٹر میں ایک جلسہ اور کرایا پھر وفد کو کیمبرج مسلم ایسوسی ایشن کی طرف سے ایک عشائیہ بھی دیا گیا، وہاں بھی ایک اچھا اجتماع ہوا، یہ وفد اڈنبرا اور آکسفورڈ بھی گیا، پیرس کا سفر دو مرتبہ ہوا، ہر جگہ وفد نے اپنے حالات کا اظہار موثر انداز میں کیا، ٹیونس، مراکش، حجاز اور مصر وغیرہ کے وفد

اعلانات اس طرح شائع ہوتے ہیں کہ اب بہت کم اخبار گذشتہ بیانات کی تردید کے لئے جگہ نکال سکتے ہیں، اخبارات میں ایک درخواست مظلومی و دادخواہی ارمنوں کی طرف سے شائع کی گئی کہ اس کی خانہ پُری کر کے لوگ اپنے دائرہ کے ممبران پارلیمنٹ کے پاس بھیجیں، ترکوں کے شدید دشمنوں میں ایک بزرگ لارڈ برائس ہیں، ہاؤس آف لارڈز میں ان کے دیدار سے مشرف ہوا، انھوں نے تین چار سو صفحوں کی ایک کتاب مرتب کی اور جو گورنمنٹ برطانیہ کی طرف سے شائع کی گئی ہے، اس میں مشنریوں اور بعض اخبارات اور دیگر بظاہر مستند ذرائع کی شہادتوں کو جمع کیا ہے، جس کی بنیاد پر ترکوں کو ستمگری کا مورد بنایا ہے اور ارمنوں کی معصومی بے چارگی اور بے گناہی پایہ ثبوت تک پہنچائی گئی ہے، یونانی انگلش انجمن قائم ہے، جس کی طرف سے رسائل اور مضامین کا انبار لگ رہا ہے، جس میں یہ نظام تیار کیا جارہا ہے کہ یونان ڈیڑھ ہزار برس پہلے ایشیائے کوچک اور دیگر مشرقی ممالک میں جس طرح حکمران تھا اس کو پھر اسی طرح حکمران کر دیا جائے، سمرنا کا قبضہ اسی سفر کی پہلی منزل ہو (لندن ۱۴ اپریل ۱۹۲۰ء)

حجاز و شام کے عربوں کا وفد لندن آیا ہے، نوری سعید پاشا اور حداد پاشا نائبین امیر فیصل اس کے سربراہ ہیں، پہلے صاحب مسلمان اور دوسرے عیسائی ہیں اور بھی چند مسلمان و عیسائی ممبر ساتھ ہیں، ایک دن پہلے عربی میں ان سے خط لکھ کر دریافت کیا کہ اگر کوئی مانع سیاسی نہ ہو تو ہم لوگوں کو ملنے کی اجازت دیں، ٹیلیفون سے جواب آیا کہ ۱۲ اپریل کو دس بجے ملئے میں اور محمد علی صاحب اُن سے ملنے گئے، سید حسین پیرس گئے ہوئے تھے کہ وہاں کی خبر لائیں، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ملاقات رہی، نوری سعید پاشا ایک نوجوان، تیز طبع، اور ہوشمند شامی عرب ہیں، پہلے ترکی کی فوج میں لفٹنٹ تھے، اور اب جنرل ہیں، فوجی وردی میں تھے، بہت محبت اور تپاک سے ملے، میں نے عربی میں خلافت و جزیرۃ العرب کے مسائل اور ہندوستان کے مسلمانوں

سنگری کے بعد دنیا میں اپنی ہستی قائم رکھ کر ۱۹۲۲ء میں تلوار پکڑ کر فلسطین میں اپنا حق قائم کر گئے
لیکن اگر سچ پوچھو تو ترقی کے لیے نہ تو تعداد کوئی چیز ہے اور نہ رقبہ کا کوئی سوال ہے، صرف روحانی
طاقت اور اخلاقی قوت اصل بنیاد ہے، روحانی طاقت اور اخلاقی قوت سے خدا جانے تم کیا مطلب
سمجھو، رقبہ اور تعداد کے لحاظ سے روس اور جاپان میں کیا نسبت ہے؟ انگلینڈ اور ہندوستان
میں کیا مناسبت ہے؟ میں چاہتا ہوں کہ ہر مسلمان اب اس نئے عقیدہ کو اچھی طرح سمجھ لے (اپریل ۱۹۲۳ء)
یہاں آکر ایک چیز میں نے بالکل نئی سنی اور معلوم ہوا کہ پالٹکس کی دنیا میں اس کا بڑا نظام ہے
اور وہ لفظ پروپگنڈا ہے، یعنی تم اپنے مقصد کے لحاظ سے سچ یا جھوٹ جو بات تمام دنیا کو تم
منوانا چاہتے ہو اسکو اخبارات، اشتہارات، جلسوں اور ایجنٹوں کے ذریعہ سے اس قدر ہر جگہ
پھیلا دو کہ اس گنبد مینا کے نیچے، ہر گوشہ اور ہر کونہ سے وہی صدا سنائی دے، اور وہ تاریخی
واقعہ بن جائے، اور تمام مہذب قوموں کو اس کا یقین آجائے، خواص کو کتابوں میں اور عوام
کو ناٹکوں اور تھیٹروں میں وہی تماشے دکھائے جائیں، معلوم ہوا کہ یورپ میں طلب حقوق کا
یہی ذریعہ ہے، اور تمام قوموں نے باری باری سے اس کو آزمایا ہے، لیکن کس پر؟ غریب ترکوں
پر! یونان نے یہی کیا، سرویا اور بلگیریا نے یہی کیا، اب یہی نسخہ ارمنی آزما رہے ہیں، یہاں
پر قدم رکھنے کے ساتھ جس سے گفتگو ہوئی وہ اسی پروپگنڈے کا مسحور نظر آیا، کوئی امریکہ کا
رسالہ پیش کرتا ہے، کوئی امریکہ کے مشن کی رپورٹ کا حوالہ دیتا ہے، کوئی جرمن مستشرق
پادریوں کی یادداشت سناتا ہے، کوئی کسی سیاح کے بیان کا حوالہ دیتا ہے، ادکش آن
سول یعنی روح کا نیلام ایک ناٹک لکھا گیا ہے، جو یہاں تمام تھیٹروں میں کھیلا جا رہا ہے اور
جس میں ترکوں کے مظالم اور آرمینیوں کی بیکسی کی خون آلود داستان ہے، میں چند منٹ
سے زیادہ اس کتاب کو نہ پڑھ سکا، یہاں کے اخبارات میں ان کے اجرتی مضامین اور

چالاک ترین، حیلہ ساز دشمنوں کا مقابلہ ہے، جن کے وعدوں کے الفاظ مقابلہ کی قوت وضعف کو دیکھ کر ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں، جن کے فلسفۂ اخلاق میں عدل وانصاف اور صداقت و ایمانداری کے ابواب نہیں، جنرل نوری نے کہا تاریخ میں نے بھی پڑھی ہے، اور جانتا ہوں کہ کیونکر احوال بدلتے ہیں، ہم اپنے ملک کے لئے خالص آزادی کے طالب ہیں، کسی صورت کی حکم برداری یا کسی اور قسم کی حاکمیت ہرگز ہرگز گوارا نہیں، اس معاملہ میں تمام عرب عیسائی، یہودی مسلمان سب یکدل اور یک زبان ہیں، عیسائی ممبروں نے کہا کہ ہم اس معاملہ میں متفق ہیں ہم کو ارمنوں پر قیاس نہ کرو، ان کی قومیت الگ ہے، ان کی زبان ایک ہے، ہماری قومیت ایک ہے، ہماری زبان ایک ہے، ہمارا ملک ایک ہے، ارمنوں کا ذکر آیا تو انھوں نے کہا کہ ان کی مظلومی وقتل عام کی داستان محض یاروں کی گپ اور وزارت خانوں کی من گھڑت ہے، ہم ترکوں سے تھریس، قسطنطنیہ اور سمرنا لینے کے حامی نہیں ہیں، محمد علی صاحب نے کہا کیا یہ ممکن نہیں کہ جس طرح حکومت برطانیہ اور کینڈا اور آسٹریلیا میں تعلقات شہنشاہی ہیں اسی طرح پورے عرب کی آزادی اور مستقل حقوق کے ساتھ خلیفۃ المسلمین کی شاہنشاہی عرب وشام وعراق پر قائم رہے، لیکن اس کا انھوں نے جواب نہیں دیا، میں نے کہا مسلمانانِ ہند یہ تصور کرکے کہ عرب کی مقدس سرزمین بھی ان کے لئے اب امن وامان کا گھر نہیں، غمزدہ ہیں، وہ حاجیوں کی زبانی یہ سنکر کہ وہاں انگریزی فوج برسراقتدار ہے، خون کے آنسو روتے ہیں، ہندوستان کے مقدس ترین عالم، علمائے ہند کے شیخ مسلم اور ہمارے ملک کے پیشوا ملت وامام شریعت مولانا محمود الحسن نے ہندوستان سے ہجرت کرکے بلد الامین میں اقامت کی، وہ پالٹیکس اور سیاست کے نام سے بھی آگاہ نہیں، وہ ہند سے بھاگ کر نور وایمان کے مسکن میں گئے

کی کیفیت اور ان کے مطالبات بیان کئے، اور ذرا موثر اور شاعرانہ عبارت میں مطلب ادا کیا، وفد والوں کے اکثر ممبر انگریزی سمجھتے تھے، محمد علی صاحب سے رہا نہ گیا، انھوں نے انگریزی میں خطبہ شروع کر دیا، ترک وعرب کے اختلاف وجنگ نے اسلامی مصالح اور دینی مقاصد کو کہاں تک صدمہ پہنچا دیا، اس کی تفصیل کی، آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مذہب کا درد اور ملت کا غم زیر خاکستر انگارہ ہے، جو عرب وعجم، ترک وکرد ہر دل میں جو کلمۂ اسلام کا معتقد ہے، چھپا ہوا ہے تقریروں کا سلسلہ ایسا موثر ہوا کہ دونوں طرف دل بھر آئے، اور آنکھوں سے اپنی بیکسی پر آنسو ٹپک پڑے، محمد علی کے دیدۂ پرنم نے اوروں کو بھی رلایا، جنرل نوری سعید نے کہا، میں خدا اور رسول اور اپنی عزت کا واسطہ دیتا ہوں کہ یہ یقین کرو کہ ہم نہ ترکوں کے مخالف تھے اور نہ ہیں اور خلیفۃ المسلمین سلطان المعظم کی خلافت کے منکر ہیں، اور نہ خاندان عثمانی سے کوئی بغض وعداوت ہے ہم کو ان چند نوجوان ترکوں سے مخالفت ہے، جو سالہا سال سے ترکی عنانِ حکومت پر قابض ہو گئے ہیں، اور جن کی پالیسی ہم سمجھتے ہیں کہ اسلام کے لئے مہلک ثابت ہو گی، یہ یقین کرو اور خدا اور رسول کا واسطہ دیتا ہوں کہ یقین کرو کہ ہم عراق، شام، فلسطین اور عرب کے استقلال تام اور آزادی کامل کے طالب ہیں، اگر ہماری زمین کا ایک چپہ بھی کسی نے دبانا چاہا تو ہم لڑیں گے اور لڑینگے، اتحادی سلطنتوں کے تعلقات دوستانہ کے ہم دل سے خواستگار ہیں لیکن محکوما اور حاکم کے تعلقات ہم کبھی قبول نہیں کر سکتے، مسلمانان عالم کو ہم پر اعتبار کرنا چاہیئے، عرب ترکوں سے زیادہ خدمت اسلام کے مدعی ہیں"؛ ہم نے کہا کہ اگر ہمکو یہ یقین ہو جائے کہ عرب موجودہ مشکلات عالم کا بار اٹھا سکیں گے اور دشمنوں کے مقابلہ کی طاقت پیدا کر سکینگے تو ان سے زیادہ اسلام کی عزت وآبرو کا حامی اور کون ہو سکتا ہے، لیکن افسوس کہ یقین پیدا کرنے کے وجوہ ہمارے پیش نظر نہیں، صرف طاقتور دشمن کا مقابلہ نہیں بلکہ

اس کو الفاظ کا طلسم جانو، کچھ پہلے بھی علم تھا لیکن اب علم الیقین ہے کہ بہترین مدبر یہاں وہ سمجھا جاتا ہے جو فن کذب و دروغگوئی میں سب سے زیادہ کمال رکھتا ہو، چنانچہ مسٹر لائڈ جارج یہاں کے بہترین مدبر ہیں، روزانہ پارلیمنٹ میں، اخباروں میں، اسٹیجوں میں ان کے مخالف بیان کی ایک نئی مثال ملتی ہے، اصول موضوعہ سلف ڈٹرمنیشن ہر جگہ ان کے لئے سیاہی کا داغ ہے، آجکل آئرلینڈ کے لئے ہوم رول بل پاس ہو رہا ہے، لیکن وہ لوگ اس اصول مسلمہ سلف ڈٹرمنیشن کی بنیاد پر ری پبلک کے طالب ہیں، ان کے جواب میں ۱۰ مارچ کی پارلیمنٹ میں وزیر اعظم فرماتے ہیں کہ وہ قومیں ایک مدت دراز یعنی صدہا سال سے برابر ایک حکومت کے ماتحت چلی آتی ہیں، ان کے سلف ڈٹرمنیشن کے کیا معنی؟ ذرا اس بیان کی تفسیر آپ اپنے لفظوں میں تو کیجئے،

فرانسیسیوں کے متعلق میری رائے بدل رہی ہے، میں ان کو بڑے درجہ کا منافق سمجھتا ہوں، ظاہری نمائشی اخلاق ان میں بہت ہے، دکھاوے کی ہمدردی ان کی خاص خوبی ہے، منہ پر ہر قسم کی چکنی چپڑی باتیں کریں گے، مگر دل میں جو نفاق ہے وہ ظاہر نہیں کرینگے دنیا کی حریت طلب اقوام کے بیسیوں وفود ان کی باتوں سے دھوکا کھا کر ان کے سہارے پر آزادی کے لئے اختر شماریاں کر رہے ہیں، (۱۰ رجون ۱۹۲۰ء)

آج کل بالشویک سفیر کرسین اور مسٹر لائڈ جارج میں کچھ چھپ چھپ کر ملاقاتیں ہو رہی ہیں خبریں تو آپ اخبارات میں پڑھ چکے ہونگے، مسٹر لائڈ جارج کا صاف وصریح مطلب یہ ہے کہ اگر بالشویک ہماری مشرقی پالیسی اور برطانوی سیاسیات میں دخل اندازی نہ کریں تو ہمیں ان سے کوئی مخالفت نہیں، بالشویکوں کے مقابلہ میں اس وقت برطانوی پالیسی یہ ہے کہ انھیں چین سے بیٹھنے نہ دیا جائے، پولینڈ، یوکرین تو پہلے ان کے مقابلہ میں کھڑے کئے گئے تھے اب

تھے، لیکن وہاں بھی انھیں پناہ نہ ملی، کیا یہ بلد الحرام کی تحقیر نہیں، جو عاصی و آثم کا بھی امن ہے لیکن امن نہیں تو اس مسلمان کے لئے نہیں جو ملت بیضا کا ہادی اور شریعت غراء کا ثنا ہے، ہمارے صوبہ کی کونسل میں جب ان کی قید کے متعلق سوال کیا گیا، تو جواب ملا کہ ان کو برٹش گورنمنٹ نے نہیں، بلکہ عرب گورنمنٹ نے قید کیا ہے، اگر یہ سچ ہے تو کیونکر کسی عرب حکومت کی خود مختاری کا مسلمانان ہند کو یقین آئے، حداد پاشا نے کہا میں نے بھی اس کے متعلق کچھ سنا ہے، نوری سعید نے کہا مجھے معلوم نہیں، میں اس کی تحقیق کرونگا اور مولانا کا نام کاغذ پر لکھ لیا، اس کے بعد شکریہ ادا کیا، رخصت ہوئے اور دروازے تک نوری سعید نے مشایعت کی، (۱۴ر اپریل ۱۹۲۰ء)

"یہ کیا کہتے ہو کہ وزیر اعظم سے مرعوب ہوگئے، مرعوبیت اتنی بھی ہوئی ہو جس قدر مجھے اپنے بھائی کے سامنے ہوتی ہو، تو کفر! اس انگلینڈ میں جہاں بادشاہ بھی رسمی اور قدیم الدستور تعظیم کے سوا کسی عزت کے مستحق نہیں، وزیر اعظم سے رعب کھانا قابل مضحکہ تخیل ہے، اب تک ارکان وفد کے جس قدر بیانات، تقریریں، اعلانات ہوتے ہیں ان کا عشر عشیر بھی اب تک کوئی ہندوستانی یہاں آکر ظاہر نہ کر سکا، اب تک کس ہندوستانی کو ہمت ہوئی تھی کہ انگلینڈ کی سرزمین میں آکر جہاد کی تہدید کرے، کس ہندوستانی نے یہ جرات کی تھی کہ انگلینڈ میں بیٹھ کر غیر بادشاہوں کے نام معروضے بھیجے، اب تک کس ہندوستانی نے یہ خطرہ گوارا کیا کہ یورپ کے دیگر وزراء کے سامنے اپنے بیانات پیش کرے،

(۱۶ر جون ۱۹۲۰ء)

آپ کہتے ہونگے کہ وزیر اعظم نے جب سوکھا سا جواب دیدیا تو اب تم لوگ کیا کرتے ہو، بھائی جان! یہاں کی اندرونی پالٹکس یہ ہے کہ جب تک کوئی کام واقعی نہ ہو جائے

یہ ہمارے وعدوں کے خلاف ہے، یا مسلمانوں کے مطالبات یہ ہیں بلکہ اسلئے ہے کہ عراق کی آمدنی کم اور اخراجات زیادہ ہیں، اس لئے پرتا ٹھیک نہیں پڑتا، (۱۰ رجون ۱۹۲۰ء)

یورپ کی جمہوریت کا رعب تو یہاں آکر فوراً اتر گیا، یورپ کی جمہوری ترقی کی اصلیت صرف اس قدر ہے کہ ابتدائے ایام میں صرف بادشاہ مالک ہوتا تھا، اس کے بعد زمیندار و تعلقہ دار اور نواب ہوگئے تھے، اب تمامتر قوت تاجروں، دولتمندوں اور سوداگروں کے ہاتھ میں ہے، ان کا مقصد سیاست صرف رونقِ تجارت اور حصولِ دولت ہے، اور بس (۱۶ رجون ۱۹۲۰ء)

"ہندوستان کی طرف واپسی ہے، فلارن (یعنی اٹلی کے ایک شہر) میں معلوم ہوا کہ امیر فیصل چند روز پیشتر میلانو میں تھے، اور اب یہاں سے کچھ دور ایک قصبہ میں مقیم ہیں، چنانچہ منزل مقصود قریب پاکر اس وقت ان کو رات کے دس بجے ٹیلیفون کیا، وہاں سے جواب آیا اور یہ طے پایا کہ کل تاریخ کو گیارہ بجے ملاقات کا وقت مقرر ہو، دوسرے دن دس بجے کے قریب روانہ ہوئے، موٹر سے سوا گھنٹہ کا راستہ تھا، سوا گیارہ کے قریب ان کے ہوٹل میں پہنچے، ان کی طرف سے لطف اللہ ایک شامی عیسائی اور رستم حیدر ایک شامی مسلمان نے استقبال کیا، اور ان کے کمرے میں لے گئے، کمرہ میں امیر فیصل کے علاوہ نوری سعید ایک فوجی افسر، رستم حیدر اور امیر فیصل کا چھوٹا بھائی تھا، رسم ملاقات کے بعد ہم نے عربی میں ان سے گفتگو شروع کی، طعن و طنز، ذکر ماضی، فتنۂ حاضرہ، مصائب اسلام کے موضوع کے بعد یہ بحث چھڑی کہ گذری جو گذرنی تھی، اب چاہیئے کیا کرنا، گفتگو میں بجائے جلالۃ الملک (ہز مجسٹی کنگ) حسین کے ہمیشہ شریف حسین کہتا رہا، یہ گویا اشارہ تھا کہ مسلمانانِ ہند نے تمھارے خطابات کو تسلیم نہیں کیا ہے، انھوں نے کہا کہ میری نسبت، میرے والد کی نسبت

کر دیا بھی کھڑا کیا جا رہا ہے، صاف و صریح مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی تباہی و بربادی کے لئے اگر وہ بھی ہماری طرح زار کے عہد ستم کی مطابق آمادہ و مستعد ہوں تو ہماری دوستی کا نذرانہ حاضر ہے، ورنہ تمھیں بھی مسلمانوں کی طرح چین سے بیٹھنے نہ دیا جائیگا، ایشیاے وسطیٰ کی جن اسلامی ریاستوں کو تم نے آزاد کیا ہے، یا تو انھیں پھر تم اپنا غلام بنالو یا مجھے اپنی غلامی میں انھیں لینے دو، ایران و عراق کو یا تو مسلّم ہمیں ہضم کرنے دو یا تم اپنا حصہ لیکر ہم کو اپنا کام کرنے دو، آپ سمجھتے ہیں کہ انگلینڈ نے آرمینیا کے لئے اس قدر کیوں زمین و آسمان سر پر اٹھا لیا ہے، صرف دو سبب سے ایک تو باکو کے تیل کے لئے، دوسرے اس لئے کہ ترکوں تاتاریوں اور ترکمانوں کی مسلمان ریاستوں کے درمیان ایک آرمینیا نام کی دیوار قائم کردیجائے تاکہ اتحاد اسلامی کا تخیل پورا نہ ہو سکے، ایران کے حدود میں برطانوی اور بالشویکی آویزش محض بازی طفلانہ ہے، تاکہ پولینڈ کی برطانی سیاست کا ایران میں جواب دیا جائے، کل کی خبر آپ نے پڑھی ہوگی، کہ انزلی کے بعد انگریزوں نے رشت بھی خالی کر دیا، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کو بالشویک یا کسی اور کے بھروسہ پہ ہرگز کام نہ کرنا چاہیے بلکہ اپنے پانوں پر آپ کھڑا ہونا چاہیئے، کوئی ان میں مسلمانوں کا سچا بہی خواہ نہیں ہے، صرف اپنا وجود ان کو آپ مطلوب ہے، فرانسیسی حلقہ میں یہ خیال ہے کہ چونکہ برطانیہ چاہتا ہے کہ ایران پر اپنا پورا تصرف قائم کرے، لیکن اور ملک اس کے لیے منظوری نہ دینگے، اسلئے بالشویکی حملوں کی نمایش کر کے لیگ آف نیشنز سے ایران کی حفاظت کی اجازت حاصل کر لیجائے، بعض ارباب سیاست انگریز لائڈ جارج کی پالیسی کی سخت تنقید اخبارات میں کر رہے ہیں، کرنل لارنس جس نے عربوں کو آمادۂ بغاوت کیا، اس کا خط بھی اخبارات میں لائڈ جارج کی پالیسی کی مخالفت میں شائع ہوا ہے، مگر یہ مخالفت اس لئے نہیں کہ

(۳) ایک کمیشن مقرر کیا جائیگا جو درۂ دانیال کے بحیرۂ روم کے اور باسفورس کے بحیرہ اسود کے ناکوں پر تین میل تک اپنا اقتدار رکھے گا، یہ ان دریاؤں میں امن اور جنگ کے زمانے میں آزادانہ جہازرانی کی دیکھ بھال کرتا رہے گا،

(۴) کردستان کے لوکل سلف گورنمنٹ کے لئے ایک اسکیم تیار کی جائیگی، وہاں کی اقلیتوں کا تحفظ کیا جائیگا، لیگ آف نیشنز کے ذریعہ سے یہ طے کیا جائیگا، کہ کرد کے لوگ اگر ترکی سے علٰحدہ ہونا چاہتے ہیں تو ان کو آزادی دی جائے،

(۵) سمرنا کے کچھ علاقے علٰحدہ کر کے یونان کی حکومت میں دیدیئے جائیں، ترکی کا اقتدار اعلٰی اس پر چند برسوں کے لئے اس وقت تک تسلیم کیا جا سکتا ہے، جب تک سمرنا کے لوگ اپنی قسمت کا فیصلہ خود نہ کر لیں،

(۶) تھریس کا مشرقی علاقہ یونان کے ماتحت کر دیا جائے، اڈریانوپل میں لوکل سلف گورنمنٹ کا انتظام کیا جائے،

(۷) ترکی کے آرمینیا کے اضلاع آرمینیا کی جمہوریت کے ماتحت کر دئے جائیں ترکی اور آرمینیا کی سرحدوں کا تعین امریکہ کے صدر کریں، ان کا فیصلہ قطعی اور آخری ہوگا،

(۸) شام میسوپوٹامیا (یعنی عراق کا علاقہ) اور فلسطین عارضی طور پر آزاد ریاستیں قرار دیدی جائیں، لیکن ان پر نگرانی رکھنے والی قوتیں اُس وقت تک نگرانی کرتی رہیں گی جب تک وہ اپنے پاؤں پر کھڑی نہ ہو جائیں، شام کی نگرانی فرانس کریگا، عراق اور فلسطین میں یہودیوں کا ایک قومی وطن ۸ نومبر ۱۹۱۸ء کے اعلان کے مطابق بنایا جائیگا،

(۹) حجاز ایک آزاد ریاست ہوگا، حجاز کا بادشاہ مکہ اور مدینہ میں مسلمان حاجیوں کو آنے کی اجازت دیتا رہیگا،

میرے خاندان کی نسبت اور عموماً تمام عربوں کی نسبت عالم اسلام اور خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں میں بہت سے غلط خیالات پیدا ہیں، اور بہت سے الزامات قائم ہیں، افسوس ہے کہ واقعات اس قدر پیچ پیچ اور مخفی ہیں، کہ فیصلہ مشکل ہے، مگر وہ جب منصۂ اعلان پر آجائیں گے تو قوم کو امید ہے کہ ہماری نسبت یہ تمام غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی، محمد علی صاحب نے بہت سی باتیں ان کے سامنے پیش کیں، خلافت کے مسئلہ کا ذکر کیا گیا، بلاد مقدسہ کے مستقبل پر گفتگو ہوئی، جو گمان تھا وہ تحقیق کو پہونچا، کہ اس احمق سے انگریز اور فرانسیسی سیاسی چالبازوں نے اس قدر زور زبانی اور تحریری عہد و مواثیق کئے تھے، کہ وہ مستقبل کو نہ سمجھ سکا، انھوں نے جس طرح مشرق کے سرفائن قومی سے برتاؤ کیا ہے، وہی اس کے ساتھ بھی کیا، گو وہ اب بھی بہت کچھ امیدیں دلاتا ہے، لیکن جس کو پہلے پر اعتبار نہیں وہ آیندہ پر کیونکر اعتبار کر سکتا ہے، فیصل کا لمبا قد، لمبا منھ، چھوٹی چھوٹی ترشی ہوئی داڑھی اور بڑی بڑی آنکھیں ہیں، مسکرا مسکرا کر باتیں کرتا ہے، بہر حال ڈیڑھ گھنٹے کی گفتگو اور مباحثہ کے بعد ہم لوگ واپس ہوئے، اس نے وعدے تو بہت کچھ کئے ہیں، کچھ متاثر سا بھی معلوم ہوتا تھا، لیکن ہم میں سے کسی کو اس کی گفتگو پر اعتبار نہیں، لیکن بہرحال یہ ملاقات مفید رہی، اس وفد کا خاتمہ الاعمال یہی ملاقات ہونی چاہئے تھی (فلارن، ۹ ستمبر ۱۹۲۰ء)

یہ وفد انگلستان ہی میں تھا کہ سپریم کونسل نے صلحنامہ پر دستخط کرکے اپنا فیصلہ صادر کر دیا جسکا خلاصہ یہ تھا

(۱) ترکی کی سرحدوں کا تعین ایک کمیشن کے ذریعہ سے کیا جائیگا، ترکی کے حدود میں تھریس کا وہ حصہ رہیگا، جو قسطنطنیہ سے ملا ہوا ہے، اسی طرح ایشیائے کوچک میں ترکی کے وہی علاقے اس کی سرحد کے اندر رہیں گے، جہاں ترکی کی آبادی کی اکثریت ہے،

(۲) قسطنطنیہ میں ترکوں کے حقوق اور حکومت میں مداخلت نہ کی جائے گی لیکن انھوں نے صلحنامے کے شرائط کو پورا نہ کیا تو اس شرط میں تبدیلی کی جا سکتی ہے،

تک تقریباً ۹ خلفاء ہوئے، مگر ترکی امپائر کے خاتمہ کے ساتھ ۱۹۲۲ء میں خلافت بھی ختم ہو گئی، جو اسلامی تاریخ کا ویسا ہی المناک حادثہ ہے، جیسا کہ بنو امیہ، بنو عباس اور ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے سقوط کا تھا، اس صلحنامہ سے متعلق انگلستان میں خلافت کے وفد کے ارکان پر کیا اثرات مترتب ہوئے، وہ استاذی المحترم کے ایک خط کے حسب ذیل ٹکڑے سے ظاہر ہوگا

"اس عہدنامہ کی مفصل کاپی ہمارے ہاتھ میں ہے، اگر یہ اس صورت میں تسلیم کر لیا گیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ دنیائے اسلام کا خاتمہ ہو گیا، مصر، سوڈان، ٹیونس، مراکو، طرابلس، تھریس، سمرنا، ارض روم، شام، عراق، کردستان، اور حجاز پر دشمنوں کا قبضہ تمام دنیا نے قبول کر لیا، اور باقی ترکی کی حالت مصر یا حیدرآباد کی ہو جائیگی، مقامات مقدسہ برٹش اقتدار میں آجائیں گے، کیا اس ننگ کو پیروان محمدؐ ماننے کو تیار ہیں؟ سیاست کے پردہ میں مذہبی تعصب کا کھیل کھیلا جا رہا ہے" (۲۰ مئی ۱۹۲۰ء)

"صلح ترکی کے دفعات اور واقعات تو اخباروں سے معلوم ہوئے ہونگے، لیکن وہ صرف سرکاری خلاصہ ہے، اصل صلحنامہ کے شرائط و دفعات ایک اچھی خاصی تصنیف ہے، جس کے معنی صفحۂ کائنات سے ٹرکی کو محو کر دینا ہے، نیشن ایک مشہور ہفتہ وار صحیح الفکر انگریزی اخبار ہے، جس میں ایک مضمون نگار نے لکھا ہے کہ صلح ترکی کے معنی انگریزوں کو تیل، اہل اٹلی کو کوئلہ اور فرانس کو ریل ہے" (پیرس ۲۰ مئی ۱۹۲۰ء)

صلحنامے کی آڑ میں ترکی امپائر کی لوٹ میں یونان، فرانس اور برطانیہ سب ہی شامل ہو گئے، آرمینیا ایک الگ علاقہ ہو گیا، شام پر فرانس ایک انتدابی قوت Mandatory Power کی حیثیت سے حکومت کرنے لگا، عراق اور فلسطین پر برطانیہ انتدابی طاقت کے روپ میں مسلط ہو گیا، فلسطین میں یہودیوں کا قومی گھر بن گیا، حجاز کو ایک آزاد ریاست تسلیم کیا گیا، مگر اس کے

(۱۰) ترکی کو مصر، سوڈان اور سائپرس سے اپنے حق سے دست بردار ہونا پڑیگا،
(۱۱) ترکی کو مراکش اور ٹیونس پر فرانسیسی محافظت کو تسلیم کرنا پڑیگا،
(۱۲) ترکی کو ایجین کے جزیرے پر سے اپنے دعویٰ کو واپس لینا پڑیگا،
(۱۳) ترکی کو اپنی بری، بحری اور ہوائی طاقت کو کم سے کم کرنا ہوگا، سلطان کے محافظ دستے سات سو ہوں گے، اندرونی امن کے رکھنے اور اقلیتوں کو محفوظ کرنے کی خاطر پچاس ہزار لشکری رکھے جا سکتے ہیں، ترکی کے بحری بیڑے جو جنگ میں پکڑے گئے، وہ ضبط کر لئے جائیں، ترکی بحری بیڑے میں چھ غوطہ زن کشتیاں اور سات غرابین رکھی جا سکتی ہیں، ترکی کو بحری بری اور ہوائی فوجوں کے رکھنے کی اجازت نہ ہوگی،
(۱۴) ترکی خزانہ پر بھی اس وقت تک نگرانی رکھی جائیگی، جب تک کہ یہ اطمینان نہ ہو جائے، کہ اس نے بین الاقوامی ذمہ داریاں پوری کیں،

صلح نامے کے ان شرائط پر پچاس برس کے بعد اب غور کیا جائے، تو یہی فیصلہ کرنا پڑیگا کہ یورپ کی جمہوری قوتوں نے ترکی کے لئے وہ سب کچھ کیا، جو اپنے زمانہ میں چنگیز خانی بھی نہیں کر سکتے تھے، ترکی امپائر کی نہ صرف تکابوٹی کر دی گئی، بلکہ ترکی کے لئے جو انتہائی ذلت آمیز شرطیں ہو سکتی تھیں، وہ سب صلحنامے میں رکھی گئیں،

ترکی امپائر کو ختم کر کے اسلام کی اجتماعی قوت برباد کر دی گئی، اور اس کی مرکزیت کو اس طرح پاش پاش کر دیا گیا کہ پھر مجتمع نہ ہو سکی، یہ نہ صرف ترکی امپائر بلکہ اسلام کے خلاف ایک بہت بڑی سازش تھی، جو کامیاب ہوئی، ترکی امپائر کے خاتمہ کے بعد اسلام کی سیاسی قوت اجتماعی حیثیت سے پھر موثر نہ ہو سکی، اسلام کا شیرازہ ایسا بکھرا کہ پھر جمع نہ ہو سکا، ترکی میں خلافت ۱۵۱۷ء سے قائم ہوئی تھی، اور اس وقت سے ۱۹۲۲ء

کی فتح و کامرانی میں پورا ساتھ دیا جس کے لئے اتحادی لڑتے رہے، اب برطانوی امپائر ایک مضبوط بنیاد پر نئے اصولوں کے ساتھ قائم ہو چکا ہے، اس کے اندر ہندوستان کے مسلمان اپنی سیاسی ترقی اور مادی خوشحالی کے لئے پورے کوشاں ہو سکتے ہیں، برطانوی حکومت کے اندر مسلمانوں کو پوری مذہبی آزادی رہی، جنگ عظیم سے پہلے برطانیہ ترکی کا دوست تھا، اس صلحنامہ کے بعد برطانیہ اور ترکی میں دوستی کا رشتہ پھر جلد قائم ہو جائیگا، اور یقین ہے کہ ترکی پھر سے ابھر کر اسلام کا ستون بن جائیگا، اور یہی امید ہے کہ یہی خیال مسلمانوں کو صلحنامے کے شرائط کو بہت صبر اور تحمل کے ساتھ قبول کرنے پر آمادہ کرے گا، اور وہ برطانیہ کے تاج کے وفادار رعایا بنکر رہیں گے،

ہندوستان میں برطانیہ کی سیاست میں ایسی میٹھی چھریاں برابر چلتی رہیں، اس کے مدبر اپنی سفاکی، عیاری اور دھوکہ دھڑی پر خوبصورت نقاب ڈالنے میں بڑے ہوشیار تھے اور اسی نقاب پوشی سے حکومت کرتے رہے، مگر ہندوستانی جاگ چکے تھے، انگریزوں کی عیارانہ سیاست سے اچھی طرح واقف ہو چکے تھے، اس لئے لارڈ چیمسفورڈ کی اپیل کا اثر مسلمانوں پر نہیں ہوا، انھوں نے ایک جواب مرتب کیا، جس پر اس زمانہ کے رہنماؤں میں سے یعقوب حسن، مظہر الحق، مولانا عبد الباری، مولانا حسرت موہانی، ڈاکٹر کچلو، میاں محمد چھوٹانی اور مولانا شوکت علی کے دستخط تھے، انھوں نے اپنی یادداشت میں وائسرائے کو مہذب طور پر بتایا کہ اس صلحنامہ سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوئے ہیں، ہندوستان کی حکومت نے مسلمانوں سے جو وعدے کئے تھے ان سے صریحاً خلاف ورزی ہے، ترکی کے ساتھ انتہائی طور پر بے انصافی کی گئی ہے، اتحادیوں نے جن اور قوموں کو شکست دی ہے، ان کے ساتھ اتنا برا سلوک نہیں کیا گیا ہے، پھر وائسرائے سے یہ درخواست کی گئی کہ وہ اتحادیوں پر زور دیں کہ صلحنامے میں ترمیم کی جائے تاکہ ہندوستان کے مسلمانوں کا اشتعال کم ہو، معروضہ کے آخر میں یہ کہا گیا کہ اگر اس میں ترمیم نہ ہوئی تو

حکمراں شریف حسین انگریزوں کے دست نگر کیا بلکہ غلام بن کر رہ گئے، مصر اور سوڈان پر انگریزوں کی بالادستی رہی، مراکش اور ٹیونس پر فرانس کا استیلا ہوگیا، اور یہ سب کچھ حق خود اختیاریت کے نام پر کیا گیا، عربوں نے قومیت کے جوش میں ترکوں کی پیٹھ میں ضرور چھرا مارا، اب پچاس سال کے بعد تاریخ کا کیا فیصلہ ہے، عراق، اردن، شام، لبنان، مصر، لیبیا، ٹیونس، مراکش، سوڈان اور الجیریا وغیرہ میں عربوں کی حکومتیں ضرور ہیں، مگر ان کی حیثیت کیا ہے؟ وہ یورپ اور امریکہ کی بڑی قوموں کے محض سیاسی کھلونے ہیں، ان قوتوں کے ہاتھوں وہ کٹھ پتلی ہیں، عرب اپنی کمزوریوں سے اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں، انھوں نے اپنے کو عرب نیشنلزم کے نام پر متحد کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام ہیں، وہ اپنی تاریخ پیچھے مڑ کر دیکھیں، تو ان کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ ٹرکش امپائر نے مذہب اور اسلام کے نام پر مسلمانوں اور ان کے علاقوں کو تقریباً چار سو برس تک متحد رکھا، مذہب اس دور میں خواہ کتنا ہی مطعون ہو، لیکن اس کے پیچھے جو تاریخ اور اس کا جو یہ فیصلہ ہے، اس کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے،

اس زمانہ میں ہندوستان کے وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ تھے، انھوں نے ہندوستان میں ان شرایط کو شائع کیا تو ہندوستانی مسلمانوں کو مخاطب کرکے یہ بیان دیا کہ سپریم کونسل نے بڑے غور و خوض اور احتیاط کے ساتھ یہ فیصلے کئے ہیں، اور ہز مجسٹی کی ہندوستانی سلطنت کی مسلمان رعایا کے ان جذبات کا خیال رکھا ہے، جو انھوں نے مختلف یادداشتوں کے ذریعہ سے ہز مجسٹی کی حکومت کو پیش کیا تھا، ان فیصلوں میں اعلیٰ اصولوں کو سامنے رکھا گیا ہے، گو ان کی بعض باتیں مسلمانوں کے لئے تکلیف دہ ہوں گی، لیکن میری ہمدردی اور حوصلہ افزائی ان کے ساتھ ہے، برطانوی امپائر کے آڑے وقت مسلمان بہت کام آئے انھوں نے بادشاہ سلامت کی آواز پر بڑا شاندار تعاون کیا، انھوں نے اس انصاف

گاندھی جی نے جہاں خلافت کی حمایت میں طرح طرح کے دلائل دیئے وہاں ہندوؤں کی رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے یہ بھی لکھا میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ میرے اور مولانا محمد علی کے نزدیک مسئلہ خلافت مرکزی اہمیت رکھتا ہے، مولانا محمد علی کا تو یہ مذہب ہے اور میرے نزدیک اس کی مرکزی حیثیت اس وجہ سے ہے کہ خلافت کی خاطر میں اپنی جان پیش کرکے گائے کو جو میرا دھرم ہے، مسلمانوں کی چھری سے محفوظ کرسکوں گا (ینگ انڈیا ۱۰ر مئی ۱۹۲۰ء)

مولانا محمد علی اپنے وفد کے ساتھ انگلستان ہی میں تھے کہ مولانا شوکت علی نے اور مسلمان رہنماؤں کے ساتھ برطانوی حکومت کے خلاف عدم تعاون کی تحریک چلانے کا پورا عزم کرلیا، گاندھی جی ہندوستان کی آزادی کی لڑائی کو تیز سے تیز تر کرنا ہی چاہتے تھے، انھوں نے بھی عدم تعاون کی تحریک کی حمایت کی اور لارڈ چیمسفورڈ کو حسب ذیل خط لکھ کر اپنی دھمکی سے بھی مطلع کیا۔

یور ایکسلنسی!

مجھ پر آپ کا تھوڑا بہت اعتماد رہا ہے میں بھی برطانوی امپائر کا فرمانبردار بہی خواہ ہونیکا دعویٰ کرتا ہوں اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کے ذریعہ بادشاہ سلامت کے وزراء پر خلافت کے سوال پر اپنی رائے کو ظاہر کردوں، جب جنگ شروع ہوئی تو میں لندن میں تھا، انڈین والنٹیرز ایمبولنس کور کی تنظیم کررہا تھا، اسی وقت سے مجھکو خلافت کے مسئلہ سے دلچسپی ہوئی، اس وقت میں نے محسوس کیا کہ لندن میں جو تھوڑے بہت مسلمان تھے، انکو اس بات پر تشویش تھی کہ ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا، میں جب جنوری ۱۹۱۵ء میں ہندوستان آیا تو ہندوستان کے جن مسلمانوں سے میری ملاقات ہوئی، ان میں بھی تشویش اور تردد پایا، پھر یہ تردد اور بھی گہرا ہوگیا، جب انکو وشیدہ معاہدوں کی خبریں معلوم ہوئیں، ان کے ذہن میں برطانوی ارادوں کی بے اعتمادی پیدا ہوئی اور ان پر مایوسی طاری ہوگئی، اس وقت میں نے اپنے مسلمان بھائیوں کو مایوس نہ ہونے کی نصیحت کی، ان کو اپنے ناامیدی کا اظہار پرامن طریقہ پر کرنے کو کہا، یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ ہندوستانی مسلمانوں نے گذشتہ پانچ سال بڑے

ہندوستان کے تمام مسلمان حکومت ہند سے عدم تعاون کریں گے، اور عدم تعاون کی یہ تحریک پُرامن طریقہ پر چلائی جائیگی،

لارڈ چیمسفورڈ کی طرف سے جو جواب ملا، وہ مایوس کن تھا، مسلمانوں میں بڑا اشتعال پیدا ہوا، جلیان والا باغ اور رولٹ ایکٹ سے بے چینی، بدظنی اور آزادی کی خاطر قربانی کرنے کے جذبات پہلے ابھر چکے تھے، اتحادیوں کے فیصلہ سے برطانوی حکومت کے خلاف ہندوستان کے ہر طبقہ میں نفرت پھیل گئی، پھر تو ہندو مسلمان کے میل ملاپ کا وہ منظر دیکھنے میں آیا کہ ملک کے گوشے گوشے میں اس اتحاد کے دودھ اور شہد کی نہریں بہنے لگیں، اس وقت ہندوستان میں گاندھی جی کی مقبولیت اور محبوبیت کا دور شروع ہوگیا تھا، وہ مولانا محمد علیؒ سے شیر و شکر ہو چکے تھے، مولانا محمد علیؒ خلافت کی جنگ انگلستان کے محاذ پر لڑ رہے تھے، تو گاندھی جی خلافت کی حمایت میں مسلسل بیانات دے رہے تھے، اپنے ہفتہ وار اخبار ینگ انڈیا میں تحریریں لکھ کر ہندو مسلمان دونوں کے جذبات کی ترجمانی کر رہے تھے، انھوں نے اپنی ایک تحریر میں لکھا کہ "ترکی کو جو سزا دی گئی ہے، وہ مسلمانوں کے جذبات کے مطابق ناقابل برداشت ہے برطانوی حکومت نے ہندوستانی مسلمانوں سے جو وعدے کئے تھے، وہ پورے نہیں کئے، ان کے مذہبی جذبات کا لحاظ نہیں رکھا گیا، گاندھی جی نے ہندوؤں کو مخاطب کرکے لکھا کہ مسلمانوں کا مطالبہ صحیح ہے، ہندوؤں کا اس کی پوری حمایت نہ کرنا ایک بزدلانہ عہد شکنی ہوگی، پھر وہ مسلمانوں کی جانب سے کسی رعایت کے حق کو بالکل تلف کر دیں گے، اس لئے پبلک کے ایک خدمت گذار ہونے کی حیثیت سے میں ہرگز اس پوزیشن کا مستحق نہ ہونگا، جس کا میں دعویٰ کرتا ہوں، اگر میں نے خلافت کو برقرار رکھنے کی جنگ میں مسلمانوں کی حمایت نہ کی"

(ینگ انڈیا، ۲۰ر اپریل ۱۹۲۰ء)

مولانا شبلی نعمانی کا نثری اسلوب

از

جناب عبدالخالق صاحب پٹنہ

مولانا شبلی نعمانی کے نثری اسلوب کا جائزہ لینے سے قبل مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ہم اسلوب کے مفہوم کا تعین کر لیں تاکہ ایک نثر نگار اور صاحب طرز نثر نگار کی حیثیت سے اُن کا مقام متعین کرنے میں سہولت ہو۔

اسلوب کو عام طور پہ طرز تحریر یا انداز نگارش کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے، یعنی کسی مصنف کی تحریر کی جو مخصوص نہج، روش اور ڈھرا ہوتا ہے اسکا تذکرہ کرکے یہ بتایا جاتا ہے کہ فلاں ادیب کا انداز تحریر آسان، سلیس و سادہ اور عام فہم ہے اور فلاں کی طرز تحریر گنجلک، مغلق اور پیچیدہ ہے اور فلاں کا انداز بیان رنگین، مرصع، اور ڈرامائی ہے، بلا شبہ اسلوب کا مفہوم اس سے واضح ضرور ہو جاتا ہے لیکن یہ مفہوم سطحی ہے۔

اسلوب وہ آئینہ ہے جس میں فن اور فنکار دونوں اپنے تمام نشیب و فراز اور رنگ و آہنگ کیساتھ منعکس ہو جاتے ہیں، اس کی گہرائی میں اترنے سے حیرت انگیز

ضبط وتحمل سے گذارے، انکے رہنماؤں نے انکو متشددانہ طریقہ پر بے قابو ہونے کے بجائے قابو میں رکھا، اب صلحنامہ کے جو شرائط شائع ہوئے ہیں، اور آپنے انکی جو موافقت کی ہے اس سے ہندوستان کے مسلمانوں کو ایسا شدید صدمہ پہنچا ہی کہ اس کا جانبر ہونا مشکل ہے، صلح کی شرطیں ان وعدوں کے خلاف ہیں جو برطانوی وزرا نے کئے تھے، ان میں مسلمانوں کے جذبات کا لحاظ بالکل نہیں رکھا گیا ہے، میں ایک پکے ہندو کی حیثیت سے اپنے مسلمان ہموطنوں کے ساتھ پوری دوستی کا حق ادا کرنا چاہتا ہوں میں بھارت کا نالائق سپوت ہونگا اگر ان مسلمانوں کی آزمائش کے وقت انکا ساتھ نہ دونگا، میری حقیر رائے میں وہ حق پر ہیں، ان کا مطالبہ ہے کہ اگر انکے جذبات کا لحاظ ہے، تو ترکی کو سزا نہ دینی چاہیئے، مسلمان سپاہی جنگ اسلئے نہیں لڑے کہ ان کے خلیفہ کو سزا دیجائے یا اسکو اسکے علاقہ سے محروم کر دیا جائے، گذشتہ پانچ سال کے عرصہ میں مسلمانوں کا جو رویہ رہا ہے، اس میں یکسانیت رہی ہے، میں برطانوی سلطنت کا وفادار رہا ہوں، اسی وفاداری کی بنا پر میں اس ظالمانہ تشدد کا مقابلہ کرنا چاہتا ہوں جو مسلمانوں کے جذبات کے ساتھ کیا گیا ہے، جہانتک مجھ کو علم ہے، مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کو برطانوی انصاف اور رویہ پر اعتماد نہیں، ہنٹر کمیٹی کے ارکین کی اکثریت کی جو رپورٹ ہے، آپ کی اس پر جو تحریر ہے، اور مسٹر مانٹیگو نے اس کا جو جواب دیا ہے، اس سے بداعتمادی اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہے،

مجھکو برطانوی دستور کا خیال ہے لیکن میں نے اپنے مسلمان دوستوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ آپ کی حکومت کی حمایت نہ کریں، ہندوؤں سے بھی یہ کہا ہے کہ وہ مسلمانوں کا ساتھ دیں، جب تک صلحنامہ کی شرطوں میں برطانوی وزرا کے وعدے اور مسلمانوں کے جذبات کے مطابق ترمیم نہ ہوگی ترک موالات کی تحریک اب بھی روکی جا سکتی ہے، مسلمانوں نے آپکے پاس جو تحریر بھیجی ہے اسمیں آپ سے درخواست کی ہے، اس تحریک کی رہنمائی آپ خود کریں جس طرح کہ آپکے پیشرو نے جنوبی افریقہ کے ہنگامہ کے موقع پر کی تھی، اگر آپ ایسا نہ کرسکے اور ترک موالات کی تحریک لابدی بھی ہوگی، تو میں امید کرتا ہوں آپ مجھکو اور ان لوگوں کو جنھوں نے میرے مشوروں کو قبول کیا ہے، اس بات پر آفرین کہیں گے کہ جو کچھ ہوا وہ ایک اہم فرض کی ادائیگی کے لئے کیا گیا،

بمبئی ۲۲ رجون ۱۹۲۰ء

مجھکو فخر ہے کہ میں آپکا فرمانبردار خادم ہوں

ام ۔ کے ۔ گاندھی

(باقی)

یعنی شبلی نام ہے حسن اخلاق و اطوار اور خوبیٔ فطرت و عادت کا،
ملک الشعرا محمد تقی بہار نے اسلوب یا سبک کو اس کے بنیادی مفہوم میں ہی استعمال کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:۔

"سبک در اصطلاح ادبیات عبارتست از روش خاص ادراک و بیان افکار بوسیلۂ ترکیب کلمات و انتخاب الفاظ طرز تعبیر سبک یک اثر ادبی و جنبۂ خاص خود از لحاظ صورت و معنی و القا می کند و آن نیز بنوبۂ خویش وابستہ بہ طرز تفکر گوینده یا نویسنده درباره حقیقت می باشد" (سبک شناسی جلد اول مقدمہ)

انگریزی کا ایک مصنف اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ کسی فرد کیلئے جو اہمیت سلیقہ، تہذیب اور ادب کی ہے تحریر میں یہی اہمیت اسلوب کو حاصل ہے یعنی اسلوب تحریر کی تزئین و تحسین کا واحد وسیلہ ہے، ورس فولڈ کہتا ہے:۔

"What manner is to the individual, Style is to the writer. It is right, therefore to say that style is the man in the same sense and with the same reservations as we say, "manners makyth man."

(W.B. Worsfold: Judgement in Literature P. 92)

یہی آواز بازگشت ایک دوسرے مصنف آرتھر کوئیلر کوچ کے یہاں سنائی دیتی ہے:۔

"What style in writing is much the something as good manners in other human intercoure."

غرض انگریزی مصنفوں میں بھی ایسے لوگوں کی خاصی تعداد موجود ہے جو اسلوب کو تحریر

اور تعجب خیز نتیجہ بر آمد کرتا ہے، اسلوب کو بہتر طور پر برتنے سے اگر علم و فن کو دوام حاصل ہوتا ہے تو یہ فنکار کی شخصیت کو بھی بے نقاب کرتا ہے، اس کی مزید توضیح یہ ہو سکتی ہے کہ ہر ادیب کے سامنے دو منزلیں آتی ہیں، پہلی منزل تجربہ و مشاہدہ کی ہے یعنی فنکار جو کچھ دیکھتا اور محسوس کرتا ہے وہ اس کے احساس کو جھنجھوڑ کر اور جذبات میں تلاطم پیدا کر کے تخلیق پر اکساتا ہے' اس کے بعد دوسری منزل پیش کش کی آتی ہے جس میں فنکار مشاہدہ و تجربہ کو اپنے فکر و شعور، ذوق و ظرف، مزاج و میلان کی روشنی میں دیکھتا اور انھیں پیش کرتا ہے یعنی ایک طرف خارجی اثرات کار فرما ہوتے ہیں اور دوسری طرف داخلی محرکات اس کے اظہار کیلئے مجبور کرتے ہیں، اس کے لئے جس وسیلۂ ابلاغ کا سہارا لیا جاتا ہے اسے اس موضوع کا اسلوب کہتے ہیں۔

اسلوب کی وضاحت دو طرح سے کی گئی ہے، فنکاروں اور دانشوروں کے ایک طبقے نے خارجی اجزا ر ــــــ مثلاً الفاظ کے انتخاب میں سلیقہ مندی، فقروں کی تراش و خراش میں مہارت، پیراگراف کی ترکیب میں چابکدستی صنعتوں کے فنکارانہ استعمال وغیرہ کی اہمیت کے لحاظ سے اسلوب کی وضاحت و صراحت کی ہے کیونکہ اسلوب، طرز، سبک شیلی، اور اسٹائل اپنے بنیادی مفہوم کے لحاظ سے زیب و زینت عطا کرنا، کلام کو حشو سے پاک کرنا، بیل بوٹے بنانا وغیرہ معنوں میں استعمال ہوتا ہے، قدیم سنسکرت کے عالموں مثلاً اچاریہ بھرت، راج شیکھر اور بھوج نے ریتی (रीति) لفظ کا استعمال اخلاق و آداب، تراش و خراش کے لئے کیا ہے یہی مفہوم انگریزی مصنفوں کے یہاں بھی ملتا ہے' ہندی میں اس کے لئے شیلی (शैली) مستعمل ہے جس کی تشریح ان لفظوں میں ملتی ہے:

"शीलमेव स्वार्थ अंण्डीप/चरित्रे आचार्याणिमिय शैली"

کے ذہن کی آواز ہے، اور ہڈسن کا خیال ہے کہ "یہ شخصیت کا عکس ہوتا ہے" غرض ابلاغ کا مسئلہ ایک اہم مسئلہ ہے جسکو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جب ہم کچھ کہتے ہیں تو ہمارا مطمح نظر یہ ہوتا ہے کہ دوسرے بھی اس کو سنیں، اس سے اثر پذیر ہوں اور ہم اسکا ردِ عمل دیکھیں، ایک فنکار جب کچھ کہنا چاہتا ہے تو اس کے مطابق میڈیم اس لئے اختیار کرتا ہے کہ اس کے ذریعہ وہ اپنی بات دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے اسکے لئے جہاں خارجی اجزا (مثلاً انتخاب و تصرفات الفاظ، فقروں کی تراش وخراش اور ان کے درمیان ربط و ہم آہنگی) پر عالمانہ عبور ضروری ہے، وہاں شخصیت میں ندرت، عظمت، نکھار اور توازن بھی لازمی ہے۔

مولانا شبلی نعمانی کا شمار اردو کے ایسے ہی انشاپردازوں میں ہوتا ہے جو نثر کے خارجی اجزا پر عالمانہ اور فنکارانہ عبور رکھنے کے ساتھ ایک وقیع تہہ دار متنوع اور نکھری ہوئی شخصیت کے بھی حامل تھے یہی سبب ہے کہ ان کا اسلوب بڑا قابل قدر بے مثال اور اردو ادب کیلئے مایۂ افتخار ہے، انھوں نے جہاں الفاظ کی نشست و برخاست اور حسن استعمال، فقروں اور جملوں کی حد تا عانہ تنظیم و ترتیب اور ان کے درمیان حسین اور فنکارانہ ربط و ہم آہنگی اور توازن، موضوع کی وضاحت کیلئے منطقی استدلال کا لحاظ رکھا ہے، وہاں اپنی انفرادیت وانانیت، شخصیت کی گونج اور اپنے خون جگر کو بھی شامل کیا ہے۔ الفاظ کا استعمال تو سبھی کرتے ہیں لیکن خون جگر کی آمیزش بڑے فنکار ہی کا کام ہے، مولانا شبلی کا فن اس لئے زندہ و پائندہ تابناک و تابدار رہے گا کہ انھوں نے اپنے فن میں خون جگر کو بھی شامل کیا ہے اور وہ فن کبھی مر نہیں سکتا جس میں خونِ جگر کی آمیزش کی گئی ہو۔

کی دلکشی اور زیب وزینت دینے کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔ اس کیلئے انتخاب الفاظ تصرفات الفاظ تراش خراش ترتیب وتنظیم اور ربط وہم آہنگی کو انتہائی ضروری سمجھتے ہیں، یعنی انھوں نے اسلوب کے خارجی اجزا ہی پر قناعت کی ہے، لیکن فنکار جس تخلیقی جذبہ سے دوچار ہوتا ہے اس کی تہہ تک پہونچنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ہربرٹ ریڈ کا خیال ہے کہ یہ نہ تو ذریعۂ تزیین ہے اور نہ مشق ومزاولت سے اِسے حاصل کیا جاسکتا ہے نہ اس میں کسی قسم کی پیچیدگی ہے۔ یہ اس صلاحیت کا نام ہے کہ اپنے مافی الضمیر کو بہتر پیرایے میں کس طرح پیش کیا جائے"

دوسرا طبقہ مصنف کی تہہ دار شخصیت کی تہیں کھول کر اس کے تخلیقی جذبہ کے محرکات کا سراغ لگانے کی سعی کرتا ہے، اس کے نزدیک جسطرح انسانی شخصیت پیچیدہ، تہہ دار مرکب در مرکب ہوتی ہے اور اس کو سمجھنا اور سمجھانا اتنا آسان نہیں ہوتا اسیطرح اسلوب بھی پیچیدہ اور مرکب در مرکب ہوتا ہے، اسلوب میں انفرادیت، شخصیت کی گونج اس کے نکھار اور اس کی انانیت سے پیدا ہوتی ہے، گویا اسلوب میں شخصیت کا اظہار ہوتا ہے اسطرح دونوں لازم وملزوم ہیں یہی سبب ہے کہ ایک ہی موضوع پر جب مختلف فنکار طبع آزمائی کرتے ہیں تو ان کے پیش کرنے کے طریقہ میں فرق واختلاف ہوتا ہے، اسلوب کا یہ فرق شخصیت کے اختلاف کا نتیجہ ہوتا ہے،

اس سلسلے کی نہایت اہم اور جامع تعریف لارڈ بوفان کی تسلیم کی گئی ہے، اس کا خیال ہے کہ "اسلوب ہی انسان ہے"۔ بظاہر یہ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تعریف ایجاز بلیغ کی عمدہ مثال ہے۔ اسلوب ہی انسان ہے، اس کا مطلب یہ ہے؟ کہ انسانی شخصیت کے تمام نقوش الفاظ وعبارت کی شکل میں ابھرتے ہیں اور اس سے جو اسلوب بنتا ہے اس میں مصنف کی شخصیت نمایاں ہوتی ہے، ایمرسن کہتا ہے کہ "یہ انسا

ادیب تھے، ادب میں ادبیت کے قائل تھے لیکن یہ جانتے تھے کہ ایسی ادبیت جو موضوع
احاطہ نہ کرسکے یا موضوع پر غالب آجائے غیر مناسب ہوتی ہے، اسی لئے انھوں نے مولانا
حسین آزاد کی رنگینی و رعنائی اور مرصع کاری سے اجتناب کیا، ان کا شعور ایک ناقد کا
تھا اس لئے وہ اس حقیقت سے بھی واقف تھے کہ سرسید کی تقلید غیر مفید ہے، ایسی سادگی
غیر فطری، خشک اور بے کیف ہو، اور ایسی سلاست جو میکانکی معلوم ہو، ادب کے لئے
سودمند نہیں ہوسکتی، چنانچہ مولانا شبلی نے خواہ وہ تنقید ہو یا تاریخ، تذکرہ ہو یا سوانح، میانہ روی
اختیار کی جس میں نہ تو سرسید کی سادگی کا رنگ زار ہے نہ آزاد کی مینا کاری اور طلسمی دنیا
سادگی اور سلاست ہے تو وہ بھی فطری جس پر ہزار آرایش و زیبایش قربان ہیں، اور
ادبی اور جوش بیان ہے تو وہ بھی حقیقی اور موضوع سے مکمل طور پر ہم آہنگ، رعنائی اور
مرصع کاری ہے تو وہ بھی حسب حال۔

مولانا میں علمی مذاق قدرت کا عطیہ تھا جس کو ان نامی گرامی اساتذہ نے چمکایا تھا جو اپنے
وقت کے مسلم الثبوت استاد تھے، جن کے ذریعہ ان کے شعور کو تابندگی اور ذہن و فکر کو
بصیرت ملی، اور جب وہ علی گڈھ پہنچے تو وہاں انھیں ایک نئی دنیا نظر آئی، ایک طرف زندگی
کی نئی ہوائیں چل رہی تھیں اور دوسری طرف سرسید کا کتب خانہ تھا جو بہترین اور منتخب کتابوں
کا مجموعہ تھا اس سے بڑھ کر شبلی کی علمی تشنگی بجھانے کیلئے اور کیا سامان چاہئے تھا جس نے شبلی کو
شبلی بنا دیا۔

مولانا کے ذہن و شعور کی بالیدگی اور شخصیت کے ارتقا کا یہ پس منظر بڑا شاندار
اور تابناک ہے، اگر سرسید کی جوہر شناس طبیعت اس گوہر نایاب کو سرتاج نہ بناتی
تو ان کی شہرت دوسری نوعیت کی ہوتی، انکی ذہنی نشو و نما میں علیگڈھ کا بھی حصہ رہا ہے۔

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

عظیم شخصیتیں ہر ملک اور ہر زمانے میں کمیاب ہوتی ہیں، ان میں کچھ تو ایسی ہوتی ہیں کہ زمانہ انھیں ان کی زندگی ہی میں قدر و منزلت عطا کر کے قبول عام کی سند بخشتا ہے اور کچھ کی اہمیت ان کی موت کے بعد تسلیم کیجاتی ہے، غالبؔ کو عمر بھر اپنی ناقدری کا شدید احساس رہا، سرسید احمد خاں کو مرتد اور نیچری کے لقب سے نوازا گیا، لیکن مولانا شبلی ان خوش نصیبوں میں ہیں جنھیں قبول عام اور شہرت دوام کا شرف اپنی زندگی ہی میں حاصل ہوگیا تھا، یہ اردو زبان و ادب کی خوش بختی تھی کہ اردو کو شبلی جیسا خادم ملا جس نے گیسوئے اردو کی شانہ آرائی کر کے اس میں حسن و نکھار پیدا کر دیا، مہدی افادی نے صحیح لکھا ہے،

"غالب زندہ ہوتے تو شبلی کو اپنی اردوئے خاصہ کی داد ملتی جس نے ایک نوخیز بازاری یعنی کل کی چھوکری کو جس پر انگلیاں اٹھتی تھیں آج اس لائق کر دیا کہ وہ اپنی بڑی بوڑھیوں اور ثقہ بہنوں یعنی دنیا کی علمی زبانوں سے آنکھیں ملا سکتی ہے۔" (افادات مہدی ص ۱۵۸)

شبلی نعمانی سرسید کے رفقاء میں علمی و ادبی نقطۂ نگاہ سے سب سے بلند و بالا شخصیت کے حامل تھے۔ سرسید، حالی، ذکاء اللہ اور نذیر احمد نے نثر اردو میں جو اضافے کئے ہیں وہ بلاشبہ اہم اور قابل ستایش ہیں، لیکن ان میں سے کسی ادیب کی شخصیت ادبی حیثیت سے اتنی وقیع، تہہ دار، بلند قامت اور گٹھی ہوئی نہ تھی، جو مولانا شبلی کو قدرت نے ودیعت کی تھی، یہی سبب ہے کہ جب انھوں نے تصنیف و تالیف کا آغاز کیا تو نہ صرف مسلمانوں میں بیداری پیدا کی بلکہ نثر اردو کے دامن کو گل ہائے رنگ رنگ سے بھر دیا، انھوں نے جس موضوع کی طرف توجہ کی اس کا حق ادا کر دیا، جس چیز کو لیا اسے پایۂ تکمیل تک پہونچا دیا ــــ وہ ایک

نگاہ سے دیکھنے اور سب سے بڑھ کر یہ تمام علوم وفنون دکھاکر فیصلہ کرتے کہ کونسی چیزیں کس حدتک قبول کرنے کے قابل ہیں اور ان کی تحقیقات کو علوم قدیمہ کے ساتھ کیوں کر پیوند کیا جاسکتا ہے........ ان کی روشنی میں ہم اس قدر معلوم کرسکتے ہیں کہ یہ نئے راستے میں کیوں کر قدم اٹھانا چاہئے اور قدیم و جدید راہیں کہاں پر جاکر مل جائیں گی"۔ (بحوالہ شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں صنٰ)

مولانا شبلی متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی تصنیفوں کو مندرجہ ذیل خانوں میں تقسیم کرسکتے ہیں:۔

(۱) سیرت و سوانح — سیرۃ النبی، سیرۃ النعمان، سوانح مولانا روم

(۲) تذکرہ و تنقید — شعرالعجم، موازنہ انیس و دبیر، حیات خسرو

(۳) تاریخ و تحقیق — المامون، الفاروق، جہانگیر اور تزک جہانگیری

(۴) علم الکلام — الغزالی، الکلام، علم الکلام

(۵) مقالات و مکتوبات — مقالات شبلی آٹھ حصوں میں، مکاتیب دو جلدوں میں۔

یہ کوئی حتمی تقسیم نہیں ان میں سے سوانح کو تاریخ اور تاریخ کو سوانح اور تنقید میں شمار کیا جاسکتا ہے ممکن ہے اس تقسیم کا مدعا صرف ان کے نثری اسلوب کی نشاندہی ہے صاحب طرز ادیب زبان وبیان پر پوری قدرت رکھتا ہے اس کے پیش نظر یہ حقیقت رہتی ہے کہ اسکا اسلوب موضوع سے پورے طور پر ہم آہنگ ہو اسی ہم آہنگی شاعری کی کامیابی کا راز ہے، اس لئے موضوع کے ساتھ ساتھ اسلوب بھی بدلتا رہتا ہے، مولانا شبلی نعمانی ایک صاحب طرز انشاپرداز تھے، اسکا یہ مطلب نہیں ہے کہ انھوں نے اپنی تمام تصنیفوں میں ایک ہی اسلوب اختیار کیا ہے، موضوع کے لحاظ سے انکا اسلوب

سرسید محسن الملک، وقار الملک، ذکاء اللہ، چراغ علی وغیرہ معاشرہ اور قوم کی تہذیب و اصلاح اور فلاح و ترقی چاہتے تھے اس لئے ان کی کوششیں اسی دائرہ میں محدود تھیں، ادب خصوصاً نثر کی خدمت اور اصلاح ثانوی حیثیت رکھتی تھی۔ مولانا شبلی نعمانی کا مطمح نظر ان لوگوں سے قدرے مختلف تھا۔ انھوں نے اپنی قوم کو صرف ترقی یافتہ قوموں کے دوش بدوش کھڑا کرنے کے بجائے اُن کے علوم و فنون پر نگاہ ڈالی اسکو مسلمانوں کا سنہری زمانہ یاد دلایا اور اس میں اپنے علوم و فنون اور اپنی تاریخ و تہذیب کو زندہ کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ زاویہ نگاہ کا یہی وہ اختلاف ہے جس سے انھیں اپنے ہم عصر ادیبوں پر فوقیت حاصل ہے، اور یہی وہ جذبہ ہے جس نے مولانا شبلی کو ایک عظیم پایہ اور بے مثال ادیب بنا دیا۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مغربی علوم و فنون سے مرعوب نہیں ہوتے، انھیں اسکا فخر ہے کہ ان کے اسلاف دنیا کی مثالی قوم تھے اور خود ان کے علوم و فنون کا سرمایہ قابل فخر ہے اور ترقی یافتہ قوموں کے ہم دوش ہونے کے لئے ہمیں اپنے اسلاف کی پیروی کرنی چاہیئے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

یورپ نے تمام علوم و فنون کا قالب بدل دیا ہے، فلسفہ نے بالکل نئی صورت پیدا کر لی ہے، منطق میں نئے برگ و بار پیدا ہو گئے ہیں، معانی و بلاغت کا اسلوب بدل گیا ہے، تاریخ ایک قسم کا فلسفہ بن گئی ہے، مذہبی مباحث کے نئے نئے پہلو نکل آئے ہیں .... اسی گذشتہ خیال کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج اگر اسلاف موجود ہوتے تو علوم و فنون جدید کو پیش نظر رکھکر وہی کرتے جو انھوں نے علوم قدیم کے ساتھ کیا تھا، علم کلام کو فلسفۂ جدید کے مقابل میں مرتب کرتے، تاریخ اور واقعہ نگاری و مسائل جدیدہ کو تحقیق کی

نقوش پیش کیے جائیں، نہ جبر و زور سے کام لیا جائے بلکہ فضائل اخلاق کا
ایک پیکر مجسم سامنے آجائے جو خود ہمہ تن آئینہ عمل ہو جس کی ہر جنبش لب ہزاروں
تصنیفات کا کام دے، جس کا ایک ایک اشارہ اوامر سلطانی بن جائے۔"

(دیباچہ سیرۃ النبی ص ۱)

سیرۃ مولانا کی آخری اور معرکتہ الآرا تصنیف ہے۔ اس کا اسلوب نہایت پختہ، اثر انگیز، دلنشین اور ایجاز بلیغ کا بہترین نمونہ ہے۔ ہربرٹ ریڈ کا خیال ہے کہ اچھی اور معیاری نثر اپنی خصوصیات کے سبب شاعری سے قریب ہوتی ہے، یعنی جو اجزا شاعری کو حسین اور عظیم بناتے ہیں وہ نثر کو بھی حسن اور پائداری عطا کرتے ہیں۔ مولانا شبلی کی نثر میں جہاں الفاظ کا حسن انتخاب، جملوں کی ہم آہنگی، عبارت کی روانی، تشبیہہ و استعارے کا فن کارانہ استعمال نظر آتا ہے وہاں یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ موضوع کو مصنف نے اس طرح قبول کیا ہے کہ وہ اس کی شخصیت میں تحلیل ہو گئے ہیں اور اس نے اس کو اس طرح احساس، ادراک، تخیل اور جذبہ کی مدد سے پیش کیا ہے کہ اس میں تخلیقی نثر کی شان پیدا ہو گئی ہے
ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"عین اس وقت جبکہ معرکۂ کارزار گرم ہے، تیروں کا مینہ برس رہا ہے، تمام میدان لالہ زار بن گیا ہے، ہاتھ اور پاؤں اسطرح کٹ کٹ کر گر رہے ہیں جسطرح موسم خزاں میں پتے جھڑتے ہیں، دشمنوں کی فوجیں سیلاب کی طرح بڑھتی آرہی ہیں، عین اس حالت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دست دعا آسمان کیطرف بلند ہے، جنگ آور باہم نبرد آزما ہیں اور سر مبارک سجدۂ نیاز میں ہے، معرکۂ بدر میں حضرت علیؓ عین شدت جنگ میں تین بار خبر لینے

بدلتا رہتا ہے مگر ان سب میں انفرادیت کی شان ہوتی ہے، یہی انفرادیت انکو دوسرے ادیبوں سے ممتاز کرتی ہے، مولانا نے مختلف موضوعات کی وضاحت کے لئے مختلف اسالیب اختیار کئے ہیں اور جس موضوع پر لکھا ہے اس کا پورا حق ادا کر دیا ہے۔ جہاں علمی طرز کی ضرورت تھی وہاں علمی طرز اور جہاں سادگی و سلاست اور وضاحت وصراحت کی ضرورت تھی وہاں سادگی و سلاست اختیار کی ہے مگر ان کی سادگی میں بھی پرکاری ہے

سیرت و سوانح کے عنوان سے جن تصنیفات کا ذکر کیا گیا ہے ان کی طرز تحریر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں جس اسلوب کو اختیار کیا ہے اس سے بہتر اسلوب ممکن نہ تھا۔ ان کی تنقیدی بصیرت ساتھ ساتھ چلتی ہے اس لئے کسی تحریر میں کوئی کمی یا خامی نظر نہیں آتی ۔ مثلاً سیرۃ النبی کو لیجئے اس کے دیباچہ میں انھوں نے سیرت نگاری پر جو بیحد جامع بحث کی ہے اور سیرۃ پر جو مواد فراہم کیا ہے وہ اسکا ثبوت ہے کہ مصنف کو موضوع پر غیر معمولی عبور حاصل ہے۔ یہ بحث بڑی عالمانہ اور محققانہ ہے اور سیرت نگاری پر ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے، مصنف کی بصیرت ان الفاظ سے ظاہر ہوتی ہے، اور مقصد تصنیف بھی واضح ہو جاتا ہے۔

"...... اس مقصد کے حصول کا عام طریقہ وعظ و پند ہے، اس سے زیادہ متمدن طریقہ یہ ہے کہ فن اخلاق میں اعلیٰ درجہ کی کتابیں لکھی جا کر تمام ملک میں پھیلائی جائیں اور لوگوں کو ان کی تعلیم دلائی جائے۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ لوگوں سے بہ جبر محاسن اخلاق کی تعمیل کرائی جائے........ اس ترقی یافتہ دور میں بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جا سکتا لیکن سب سے زیادہ صحیح، سب سے زیادہ کامل، سب سے زیادہ عملی طریقہ یہ ہے کہ نہ زبان سے کچھ کہا جائے نہ تحریری

لوگوں کی ہو۔

(۴) بیان میں سلاست و روانی ہو، اسما و ضمائر کی غیر ضروری تکرار سے عبارت میں کراہت آجاتی ہے۔

(۵) الفاظ ایک سطح کے ہوں، عربی کے ادق الفاظ اور بھاشا کے نرم الفاظ کا ایک ساتھ استعمال تنفر پیدا کر دیتا ہے جو فصاحت کے لئے معیوب ہے۔

(۶) عبارت نہ اتنی مختصر ہو کہ مطلب خبط ہو جائے اور نہ اتنی طویل کہ جی اکتا جائے۔

(۷) عبارتوں کی ترکیب اور ساخت میں ایک توازن قائم رہے"

حسن معنی کے لئے وہ مندرجہ ذیل امور کو ضروری قرار دیتے ہیں:۔

(۱) یہ تو معلوم ہے کہ الفاظ ایک قسم کی آواز ہیں اور آواز کی مختلف صورتیں ہیں جن سے مطلوب اثر پیدا کیا جاتا ہے اس لئے الفاظ کا انتخاب معانی کے اعتبار سے ہونا چاہئے، رنج و غم کے الفاظ ایسے ہوں جن سے فسردگی اور اضمحلال ٹپکے، مسرت و کامرانی کیلئے ایسے ہی الفاظ ہوں جن سے عشرت و شادمانی کی فضا پیدا ہو سکے، حسن و عشق کے اظہار کے لئے دل کش، نرم و گداز الفاظ لائے جائیں .....،،

(۲) اگر کلام میں تاکید اور زور پیدا کرنا مقصود ہو تو سیاق و سباق کے اعتبار سے الفاظ بھی اسی طرح کے استعمال کرنے چاہئیں۔ (۳) معنی مقصود نفس الامر کے خلاف نہ ہو (۴) جس سماں کو بیان کیا جائے اس کی پوری تصویر اس لئے ضروری ہے کہ جس سماں کا بیان کرنا مقصود ہے، اس کا پورا نقشہ سامنے ہو اور جو آلہ اظہار اختیار کیا جائے اس پر پورا دسترس۔ (۵) معنی کی ادائیگی میں مراتب کا احساس ملحوظ رہے۔ (۶) معنی کے لئے انتخاب الفاظ کا صحیح ذوق موجود ہو۔ الفاظ ایسے ہوں جو زیادہ سے زیادہ

آئے اور ہر دفعہ دیکھا کہ وہ مقدس پیشانی خاک پر ہے، فوجیں تیروں کا مینہ برسا رہی ہیں اور لڑائی کا فیصلہ نہیں ہوتا...... عین اس وقت جب کہ صفیں باہم معرکہ آرا ہیں ہر طرف تلواریں برس رہی ہیں، ہات پانوں کٹ کٹ کے زمین پر بچھے جاتے ہیں، موت کی تصویریں ہر طرف نظر آ رہی ہیں، اتفاق سے نماز کا وقت آجاتا ہے، دفعتاً نماز کی صفیں قائم ہو جاتی ہیں۔ سپہ سالار امام نماز ہے، فوجیں صفوف نماز۔ رجز کے بجائے اللہ اکبر کی صدائیں بلند ہیں، جوش و خروش، تہور و جاں بازی، غیظ و غضب، اب عجز و نیاز، تضرع و زاری اور خضوع و خشوع بن جاتا ہے۔" (سیرۃ النبی جلد ۱ صفحہ ۴)

مولانا ایک دیدہ ور نقاد اور الفاظ و معانی کی اہمیت، قدر و قیمت سے بخوبی واقف تھے اس کا اظہار انھوں نے کئی جگہ کیا ہے، اپنے ایک مقالہ میں لکھتے ہیں:۔

(۱) الفاظ گراں اور نامانوس نہ ہوں، ثقیل اور بھدے نہ ہوں کہ ان کے تلفظ میں زبان کو دقت محسوس ہو، واضح رہے کہ کوئی لفظ بذاتہ نہ ثقیل ہے نہ کریہہ مگر دوسرے الفاظ کے ساتھ مل کر ثقل و کراہت پیدا کر دیتا ہے، بے جوڑ بے ضرورت اور بے موقع استعمال سے بعض اچھے الفاظ بھی برے ہو جاتے ہیں اس لئے انشا پرداز کا فرض ہے کہ فحوائے کلام کا ہر وقت لحاظ رکھے اور کسی منظر کو زیادہ طول نہ دے کہ بے جا طوالت فحوائے کلام کا خیال اکثر ادیبوں کے دماغ سے جاتا رہتا ہے اور وہ بے جوڑ اور بھرتی کے الفاظ استعمال کر جاتے ہیں جس سے عبارتیں بے آہنگ ہو جاتی ہیں۔"

(۲) طرز ادا سہل اور سادہ ہو لیکن سپاٹ اور بے رنگ نہ ہو۔"

(۳) روزمرہ اور عام بول چال کا استعمال ہو لیکن وہ زبان عوامی نہ ہو بلکہ مہذ

صدائیں بلند ہیں، جوش و خروش، تہور و جانبازی، غیظ و غضب، عجز و نیاز، تضرع و
زاری اور خضوع و خشوع بن جاتا ہے۔ "جوش و خروش" کے "عجز و نیاز" کی صورت اختیار کر
لینے، "تہور و جانبازی" کے "تضرع و زاری" میں تبدیل ہو جانے اور "غیظ و غضب" "خشوع و
خضوع" بن جانے کی کیفیت کو شبلی جیسا عظیم ادبی جینئس (genius) نثر نگار ہی پیدا کر
سکتا ہے۔ یہی بات سیرۃ النعمان اور دوسری تصنیفوں کے متعلق کہی جا سکتی ہے۔

شعر العجم کی نثر اپنی ادبی شان کے لحاظ سے لاجواب ہے۔ اس کتاب کو فارسی شاعری
کی تاریخ اور فارسی شعرا کا تذکرہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ تاریخ اور تذکرہ سے قطع نظر تحقیق و تنقید
کے نقطۂ نگاہ سے بھی یہ کتاب بڑی اہم ہے۔ اس میں مولانا نے شاعری، تخیل، محاکات، تصرفات
الفاظ اور کلام کی صفائی، فصاحت و بلاغت وغیرہ کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ کئی حیثیتوں
سے اہم ہے۔ شعر العجم سے قبل مولانا محمد حسین آزاد اپنی مشہور زمانہ نثر میں آب حیات
لکھ چکے تھے اور مولانا حالی کا مقدمہ شعر و شاعری بھی لکھا جا چکا تھا۔ یہ دونوں کتابیں
طرز اسلوب کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن تنقیدی نقطۂ نگاہ سے انہیں
تھوڑی سی یکسانیت بھی ہے اور فرق بھی۔ آزاد نے جستہ جستہ تنقیدی خیالات پیش کیے ہیں
اور مولانا حالی نے مختلف عنوانوں کے تحت شاعری کے اجزا پر سیر حاصل بحث کی ہے۔
شبلی نے شعر العجم میں ان مباحث پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انگریزی مصنفوں اور شاعروں
کے خیالات سے استفادہ کیا ہے اور خود بھی ایک متوازن رائے پیش کی۔ شاعری کی
تعریف، اس کی اہمیت و ماہیت کے متعلق مولانا نے جو کچھ لکھا ہے اس سے جن لوگوں کو
اختلاف ہے وہ بھی اس کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔

تحقیق تنقید اور تاریخ تینوں لازم و ملزوم ہیں۔ تحقیق تنقیدی شعور کے بغیر ناقص

عرصہ تک زمانہ کا ساتھ دے سکیں۔

اس روشنی میں مولانا کی انشا کو دیکھئے تو اس معیار پر ان کی عبارتیں پوری اترتی ہیں۔ اب اس حیثیت سے پیش کردہ اقتباس کا جائزہ لیجئے، مذکورہ بالا عبارت میں مولانا کا حُبِ نبی شدت کے ساتھ موجود ہے، جذبات کا ایک سیل ہے جو الفاظ کی صورت میں اُمڈا چلا آتا ہے، تصویریت (Personification) اور مرقع نگاری پورے آب و تاب کیساتھ تاباں ہے، محاکات کی اہمیت نثر میں بھی بشرطیکہ حسب موقع ہو، مولانا کی تصویریں حقیقی فطری اور زندہ و پایندہ ہیں، معرکۂ جنگ کی منظرکشی کے لئے جو الفاظ انھوں نے استعمال کئے ہیں وہ نہایت موزوں، برمحل اور بالکل مناسب ہیں۔ اس اقتباس کے ہر فقرے سے تصویر تیر ابھرتی ہے "معرکہ کارزار گرم ہے، تیروں کا مینہ برس رہا ہے، تمام میدان لالہ زار بن گیا ہے، ہات اور پاؤں اس طرح کٹ کٹ کر گر رہے ہیں جسطرح موسم خزاں میں پتے جھڑتے ہیں" یہ فقرے اس حسن کاری کیساتھ ترتیب دئے گئے ہیں کہ ہر فقرہ اپنی مکمل اور آزاد حیثیت رکھتے ہوئے بھی زنجیر کی کڑی کی طرح ایک دوسرے سے مربوط اور پیوستہ ہے، تشبیہ و استعارے اگر نادر، اچھوتے اور شگفتہ ہوں تو شاعری اور نثر دونوں کی دلکشی میں اضافہ کرتے ہیں، اس اقتباس میں نہایت عمدہ اور شگفتہ تشبیہوں اور استعارات کا استعمال ہوا ہے "تیروں کا مینہ برس رہا ہے" "ہات اور پاؤں اس طرح کٹ کٹ کر گر رہے ہیں جسطرح موسم خزاں میں پتے جھڑتے ہیں" "دشمنوں کی فوجیں سیلاب کی طرح بڑھتی آرہی ہیں۔ دفعتہ" فوجوں کا بادل پھٹ کر مطلع صاف ہو جاتا ہے" تشبیہوں کا حسین استعمال۔ ایجاز اور اختصار بلیغ کا یہ نمونہ ملاحظہ ہو، ہر لفظ ایک کیفیت اور ایک سماں پیدا کر رہا ہے "سپہ سالار امام نماز ہے، فوجیں صفوف نماز ہیں، رجز کے بجائے اللہ اکبر کی

کا اظہار کر دے تو سارا پارٹ غارت ہو جائے گا، شاعر اگر اپنے نفس کے بجائے
دوسروں سے خطاب کرتا ہے دوسروں کے جذبات کو ابھارنا چاہتا ہے،
جو کچھ کہتا ہے اپنے لئے نہیں، بلکہ دوسروں کیلئے کہتا ہے تو شاعر نہیں بلکہ خطیب
ہے، اس سے یہ واضح ہوگا کہ شاعری تنہا نشینی اور مطالعۂ نفس کا نتیجہ ہے،
بخلاف اس کے خطابت، لوگوں سے ملنے جلنے اور راہ و رسم رکھنے کا ثمرہ ہے،
اگر ایک شخص کے اندرونی احساسات تیز اور مشتعل ہیں تو وہ شاعر ہو سکتا ہے؛

(شعر العجم صـ جلد چہارم)

اس اقتباس میں مولانا نے شاعری اور خطابت کے فرق کی وضاحت کی ہے اور اپنے تنقیدی خیالات کو پیش کرنے کے لئے جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ منطقی تجزیاتی اور توضیحی اسلوب ہے، تجزیاتی اسلوب میں دلائل و براہین اور منطقی استدلال ناگزیر ہے جو پیش نظر نکات و حقائق کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں پر نگاہ ڈالتے اور منطقی استدلال کے ذریعہ پیش کرتے ہیں، اور معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے جو کچھ محسوس کیا ہے اُسے پُر تاثیر انداز میں پیش کر دیا ہے، اسلوب کا یہی وہ مقام ہے جہاں خارجی اور داخلی اجزا کلی طور پر ہم آہنگ ہو جاتے ہیں، اسی بنا پر اسلوب کا مسئلہ ذوقی بھی ہے اور وجدانی بھی، موضوع اور الفاظ میں مصنف کے جذبات و احساسات جو رنگ بھرتے ہیں وہ اسلوب کی صورت میں رونما ہوتا ہے، چونکہ فنکار کو زبان و الفاظ پر عبور حاصل ہے اور اس کی شخصیت بھی وسیع اور رچی ہوئی ہے اس لئے اسلوب بھی جاندار اور وقیع ہے، ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں
ان کے اسلوب کی اوّلین صفت اس کی وہ قوت اور جوش ہے جو ان کے احساس کمال اور احساس عظمت کی پیدا وار ہے، یہ احساس جب کسی مقصد عظیم کیساتھ مل جاتا ہے

رہتی ہے، ایسا محقق جس میں تنقیدی شعور نہ ہو سطحی ادب اور اعلیٰ ادب میں تفریق و امتیاز نہیں کر سکتا، اسی طرح تاریخ بغیر تحقیق کے دفتر کذب و افترا سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، اور ادب سے ان سب کا رشتہ ہے، اگر وہ ادبی تقاضے پورے نہیں کرتیں تو ادبی نقطۂ نگاہ سے ان کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ مولانا شبلی اس راز سے پوری طرح باخبر تھے اس لئے شعر العجم میں انھوں نے تاریخ، تنقید اور تحقیق کی سرحدوں کو ملا دیا اور اس صناعانہ چابک دستی سے کہ موضوع کا حق بھی ادا ہو گیا اور ادب و فن کے تقاضے بھی پورے ہو گئے، شجاعت علی سندیلوی لکھتے ہیں:-

"اپنے معاصرین میں شبلی کا مرتبہ ادب میں نہایت بلند ہے، یہ بلندی اور بڑائی اس وجہ سے نہیں ہے کہ انھوں نے بہت بڑا ذخیرۂ ادب چھوڑا، نہ اس وجہ سے کہ وہ ہر فن پر عبور رکھتے تھے، بلکہ اس لئے ہے کہ انھوں نے جو کچھ لکھا اس انداز سے لکھا کہ شگفتگی و حقیقت دلچسپی اور افادیت قائم رہی۔ اعلیٰ سے اعلیٰ اور پیچیدہ سے پیچیدہ علمی و فلسفیانہ مسائل کو سلیس و بلیغ انداز میں بیان کر دینا علامہ شبلی کی انشاء پردازی کی خاص خصوصیت ہے"

"شعر العجم" کے ایک اقتباس سے یہ واضح ہو جائیگا کہ یہ طرز تحریر کتنی سائنٹفک اور سیرۃ النبی کے اسلوب سے کس قدر مختلف ہے:-

"اصلی شاعری وہی ہے جس کو سامعین سے کچھ غرض نہ ہو، لیکن جو لوگ بے تکلف شاعر بنتے ہیں ان کا بھی فرض ہے کہ ان کے انداز کلام سے یہ مطلق نہ پایا جائے کہ وہ سامعین کو مخاطب کرنا چاہتے ہیں۔ ایک ایکٹر کو خوب معلوم ہے کہ بہت سے حاضرین اس کے سامنے موجود ہیں لیکن اگر ایکٹ کی حالت میں وہ اس علم

اسے پوری دیانت کے ساتھ پیش کر دیا لیکن یہ پیش کش اسقدر میکانکی تھی کہ پڑھنے والوں کیلئے اس میں کوئی کشش نہ تھی، یہ تاریخی دیانت ان کی شہرت میں رکاوٹ بن گئی، مولانا شبلی ادیب پہلے ہیں مورخ بعد میں۔ وہ جانتے تھے کہ تاریخی واقعات کو یکجا کر دینے سے تاریخ نویسی کا حق ادا نہیں ہوسکتا اس لئے انھوں نے تاریخ کی خشکی کو ادب کی چاشنی سے پرلطف بنا دیا، تاریخ میں واقعات کی کڑیاں اسطرح ملی ہوئی ہیں کہ منطقی ربط ہر جگہ قائم رہتا ہے، مضمون کی خشکی دور کرنے کیلئے جا بجا دلچسپ تشبیہوں اور استعاروں سے بھی کام لیا ہے۔ الفاروق کے دیباچہ میں انھوں نے طرزِ تحریر کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کی روشنی میں کہہ سکتے ہیں کہ اس کیلئے انھوں نے بہترین اسلوب اختیار کیا ہے، اسی اسلوب کے متعلق سرسید فرماتے ہیں:

> "اردو زبان نے بہت کچھ ترقی کی ہے مگر اس بات کا بہت کم لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہر فن کیلئے زبان و طرزِ بیان جداگانہ ہے، تاریخ کی کتابوں میں ناول اور ناول میں تاریخانہ طرز گو کیسی ہی فصاحت و بلاغت سے برتا گیا ہو دونوں کو برباد کرتا ہے۔ ہمارے لائق مصنف (شبلی) نے اسکا بہت کچھ خیال رکھا ہے اور باوجود تاریخی مضمون ہونے کے ایسی خوبی سے اسکو ادا کیا ہے کہ عبارت بھی فصیح اور دلچسپ ہے اور تاریخانہ اصلیت بدستور اپنی اصلی حالت پر موجود ہے۔ جو خوبصورت ہے خوبصورت ہے، جو بھونڈی ہے بھونڈی ہے، نہ خوبصورتی کو زیادہ خوبصورت بنایا ہے اور نہ بھونڈے کو زیادہ بھونڈا، اور درحقیقت یہی کمال تاریخ نویسی کا ہے۔"

غرض مولانا کی نثر اس قدر سلجھی اور منجھی ہوئی ہے کہ ہر قسم کے خیالات بآسانی ادا کئے جاسکتے ہیں حتیٰ کہ الکلام اور علم الکلام جیسے خشک موضوع کیلئے بھی اسقدر واضح اور رواں پیرایہ بیان اختیار کیا ہے، کہ اسلوب کی دل کشی اور جاذبیت میں فرق نہیں آنے پاتا۔

تو مصنف کے اظہارات میں غیر معمولی جوش اور قوت پیدا کر دیتا ہے ۔ ...... شبلی کی نثر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فکری قوت اور منطقی توانائی کے ساتھ ساتھ لطف اور اثر بھی پایا جاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ فکر کے خاکوں میں تخیل کا رنگ بھرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا تخیل دراصل اسی رجحان نظری کے زیر اثر مبالغہ و اغراق کی وہ صورتیں اور تصویریں تلاش کرتا ہے جو خود مصنف کی پُرجوش ہیجان پسند طبیعت کی پیداوار ہونے کے ساتھ ساتھ قارئین و سامعین کے لئے بھی جوش انگیزی اور ہیجان خیزی کا سامان بہم پہنچاتی تھیں" (بہترین مقالات مرتبہ اختر جعفری ص ۵۵۹)

مولانا کی تاریخ و تحقیق کی کتابوں کے متعلق بھی یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ ادبی تقاضے بھی پورا کرتی ہیں، اور مصنف کی شخصیت کی ترجمان بھی ہیں، الفاروق ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر خود مصنف کو ناز تھا اور بقول مولانا سید سلیمان ندوی "اب ان کو علمی تشنگی بجھانے کے لئے کنوؤں اور نہروں کا پانی نہیں سمندر درکار تھا، الفاروق جسکے لکھنے کیلئے وہ بیتاب تھے اس کے لئے ہندوستان کے کتب خانے کافی نہ تھے، اس کے لئے مصر و شام اور قسطنطنیہ کے کتب خانوں کو کھنگالنے کی حاجت تھی، انھوں نے ان کتب خانوں سے استفادہ کر کے اردو ادب میں ایک گراں بہا اضافہ کیا، الفاروق تاریخ اور سوانح کا ایک سنگم ہے جس میں تاریخی اور سوانحی اجزا خوبصورتی سے سموئے گئے ہیں" (حیات شبلی ص)

مولانا کی تاریخی تصانیف کے طرز سے واضح ہے کہ تاریخ نویسی میں بھی ان کا انداز نہایت دلچسپ و دلنشیں ہے۔ تاریخ کی داغ بیل مولانا محمد حسین آزاد نے ڈالی اور اس کو اسقدر دلچسپ بنا دیا کہ تاریخ پر افسانہ کا گمان ہونے لگا، یہ تاریخ نگاری کی معراج تھی، مولوی ذکاء اللہ کے پیش نظر تاریخی وقائع کی اہمیت تھی اسلئے انھوں نے

غالب: ہر شمیمی را شامی در خور است   بوے پیراہن بکنعان می رود

یعنی کنعان میں خوشبو جاتی ہے، تو صرف حضرت یعقوبؑ ہی اس سے محظوظ ہوتے ہیں، اس کے بعد پیراہن ان کی آنکھوں پر ڈالا گیا تو وہ روشن ہو گئیں جیسی کہ حضرت یوسفؑ کی پیشین گوئی تھی،

اذھبوا بقمیصی ھذا فالقوہ علیٰ	میرا یہ کرتا لیتے جاؤ اور میرے والد کے چہرہ
وجہ ابی یأت بصیرا (یوسف ۔۱۱)	پر ڈال دو ان کی آنکھوں کی روشنی لوٹ آئیگی
فلما ان جاء البشیر القٰہ علیٰ وجھہ	جب خوشخبری دینے والا آیا تو اُن کے چہرہ پر کرتا ڈال دیا
فارتد بصیرا (یوسف ۔۱۱)	پس فوراً ان کی آنکھیں روشن ہوگئیں۔

غالب: بتوان گفت ہاں اے تن پرست   پیر کنعان بود پیراہن پرست

جب زلیخا نے حضرت یوسفؑ کو اپنے فریب میں پھانسنا چاہا تو انھوں نے کہا

قال معاذ اللہ انہ ربی احسن	کہا خدا کی پناہ (یہ بڑا گناہ ہے) پھر میرے
مثوای (یوسف ۔)	آقا نے کیسی اچھی طرح رکھا ہے ۔

اس کے بعد جب عزیز مصر کے سامنے معاملہ پیش ہوا تو اس نے زلیخا ہی کی ترغیب سے حضرت یوسفؑ کو جیل بھیج دیا اور وہ زلیخا کی قید سے آزاد ہو گئے۔

غالب: بندہ اے را کہ بفرمان خدا داہ رود   نگزارند کہ در بند زلیخا ماند

زلیخا کی لغو خواہش پر جب مصر کی عورتوں نے نکتہ چینی کی تو اس نے مصر کی عورتوں کو بلا کر ہر ایک کے ہاتھ میں ایک چھری دی اور حضرت یوسفؑ کو وہاں بلا لیا۔ عورتوں نے عالم محویت میں اپنے ہاتھ کاٹ لیے اس سے حضرت یوسفؑ کی شہرت دوبالا ہو گئی۔

فلما رأینہ اکبرنہ وقطعن	عورتوں نے جب ان کو دیکھا تو ان کے حسن سے

غالب کا مذہبی رُجحان

ان کے کلام کی روشنی میں

از

ڈاکٹر اتم ہانی ریڈر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

(۲)

ان بزرگ پایہ شاعروں کا یہ حال دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ شاید قرآن کا مزاج ہی شاعری کے مزاج سے اتنا مختلف ہے کہ شاعر "زیبِ داستان" پر مجبور ہو جاتا ہے، لیکن غالب نے (معدودہ چند اشعار کے سوا) بیشمار اشعار کے ذریعے اس وہم کا ازالہ کر دیا ہے لہذا اب یہ دیکھا جائے کہ ان کے اشعار کی تلمیحات متن قرآنی سے کتنی قریب ہیں، اگرچہ یہ مختصر مضمون کلام غالب کے تمام اشعار پر حاوی نہیں ہے، مگر ان کے رجحان اور قدرتِ اظہار کی نشاندہی ضرور کرے گا۔ حضرت یوسفؑ کا قصّہ عام طور سے شاعری کا موضوع کار رہا ہے، چنانچہ بوئے پیرہن کے حضرت یعقوبؑ تک پہنچنے کے متعلق قرآن کہتا ہے،

ولمّا فصلت العیر قال ابوھم	جب قافلہ چلا ہی تھا کہ ان کے باپ حضرت یعقوبؑ نے
انّی لاجد ریح یوسف لولا ان	کہا اگر تم مجھکو بہکی باتیں کہنے والا نہ سمجھو تو میں کہوں
تفندون ۞ قالوا تاللہ انک لفی	کہ مجھکو یوسفؑ کی مہک آرہی ہے۔ ان لوگوں نے
ضلالک القدیم ۞ (سورۂ یوسف)	کہا کہ آپ اپنے پرانے خیال میں مبتلا ہیں،

غالب: نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی | سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

غالب: قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر | لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

حضرت موسیٰ کے بارے میں

ولما جاء موسیٰ لمیقاتنا وکلمہ ربہ قال رب ارنی انظر الیک، قال لن ترانی ولکن انظر الی الجبل فان استقر مکانہ فسوف ترانی فلما تجلیٰ ربہ للجبل جعلہ دکا وخرّ موسیٰ صعقا۔

(اعراف)

جب موسیٰ ہمارے وقت موعود پر آئے اور ان کے رب نے ان سے باتیں کیں تو عرض کیا اے میرے پروردگار اپنا دیدار مجھکو دکھا دیجے، میں آپ کو ایک نظر دیکھ لوں ارشاد ہوا کہ تم مجھکو ہرگز نہیں دیکھ سکتے البتہ اس پہاڑ کی طرف دیکھو اگر وہ اپنی جگہ پر برقرار رہے تو تم بھی مجھکو دیکھ سکتے ہو پس جب ان کے رب نے پہاڑ پر تجلی فرمائی تو تجلی نے اس کے پرخچے اڑا دیے اور موسیٰ بیہوش ہو کر گر پڑے۔

اس مضمون کو غالب نے طرح طرح سے باندھا لیکن سب کی تصدیق متن قرآنی سے ہو جاتی ہے،

غالب: تجلی شاکہ ز موسیٰ ربود ہوش بطور | بشکل کلب علی خان دگر نمود ظہور

ایضاً: رفت آنکہ باز حسن مدارا طلب کنیم | سر رشتہ در کف ارنی گوے طور بود

ایضاً: لن ترانی بجواب ارنی چون و چرا | من نہ ایم بشناس و توانی بشنو

نکتہ ای داریم در باب زبان نمیگوئیم فاش | طالب دیدار باید تاب دیدار آورد

ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے (sic: ہے کیا ضرور سب کے ملے ایک سا جواب) | آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

ایدیھن وقلن حاش للہ ماھذا بشراً ان ھذا الا ملک کریم (یوسف۔)

حیران رہ گئیں۔ اور بدحواسی میں اپنے ہاتھ کاٹ لیے اور بولیں ماشاءاللہ یہ آدمی نہیں، تو کوئی بزرگ فرشتہ ہے،

غالب: قرابہ بغوغاے یوسف دوبھر
ترنج دکف خندہ گبرانِ شہر

(ترنج کا ذکر متنِ قرآنی سے خارج ہے۔)

پھر جب وہ جیل میں پہنچ گئے تب بھی خدا کی محبت ان کے دل میں باقی رہی۔

ان الحکم الا للہ، امر الا تعبدوا الا ایاہ۔ (یوسف)

حکم خدا ہی کا ہے اس نے یہ حکم دیا ہے بجز اس کے اور کسی کی عبادت نہ کرو۔

غالب: ہنوز اک پرتو نقش خیال یار باقی ہے
دل افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

حضرت یوسف تو دل میں بیٹھ کر کنوئیں سے نکلے تھے۔

وجاءت سیارۃ فارسلوا واردھم فادلیٰ دلوہ، قال یابشریٰ ھذا غلام

اور ایک قافلہ آنکلا اور انھوں نے اپنا آدمی پانی لانے کے لیے بھیجا اس نے اپنا ڈول ڈالا اور کہا ارے یہ بڑی خوشی کی بات ہے یہ تو ایک لڑکا نکل آیا۔

غالب: نشگفت کہ یوسف بمیان داشتہ باشد
دومن از پی چاہ گر انبار بر آید

حضرت یعقوب کی آنکھیں حضرت یوسف کی جدائی سے روتے روتے سفید ہوگئی تھیں۔

وقال یااسفیٰ علی یوسف وابیضت عیناہ من الحزن (یوسف)

اور کہا ہائے افسوس یوسف پر، اور حالت یہ کہ ان کی آنکھیں غم سے سفید ہوگئی تھیں۔

اسی سفیدی کا غالب نے حوالہ دیا ہے،

اذ فرقنا بکم البحر فانجینا کم و	اور جب ہم نے تمھاری وجہ سے
غرقنا آل فرعون وانتم تنظرون	دریا کو پھاڑ دیا، پھر ہم نے تم کو نجات دی اور
(بقرہ ۵)	فرعون کے لوگوں کو تمھارے دیکھتے ڈبو دیا،
باتو ام خرمی خاطر موسیٰ بر طور	بعد و م خستگی لشکر فرعون بنیل
تجھ سے دنیا پہ کھلا رابطۂ قرب کلیم	تجھ سے عالم میں بچھا مائدۂ بزم خلیل
واحلل عقدۃ من لسانی (طہ)	اور میری زبان کی گرہ کھول دے۔
خون ز غم در دلِ کلیم فسرد	لاجرم عقدہ بر زبان افتاد
وما تلک بیمینک یموسیٰ قال ھی	اور موسیٰؑ تمھارے داہنے ہاتھ میں یہ کیا ہے
عصای اتوکؤا علیھا (طہ)	کہا یہ میری لاٹھی ہے میں اس پہ سہارا لگاتا ہوں
فیض حق است قبول سخن و شادی فتح	بقلم نازم اگر تکیۂ موسیٰ بعصاست

حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں

وابری الاکمہ و	اور میں اندھوں اور کوڑھیوں کو بھلا
الابرص و احی الموتیٰ	چنگا اور مردوں کو زندہ کر دوں گا اللہ کے
باذن اللہ (آل عمران)	حکم سے۔
غالب ثلث پردہ کشائی دم عیسیٰ ست	چون بر روش خرد خداداد بجنبد
نفسے اگرہ جو لانکہ مسیح دمی ست	زمن ہمنفسان وطن مبارکباد
از بست فیض دم عیسیٰ اگر جویم رواست	زانکہ رشحۂ خامہ ات را آبحیوان دیدہ ام
در خیال صدمۂ چاہ ذقنش قعر تپش	میجہد از دیدۂ عیسیٰ چراغ آفتاب
تا بود یاری بخت بلند	چارۂ عیسیٰ نفسے سودہ

بہ دورِ تو شد لن ترانی کہن — فصاحت مکرر نسنجد سخن

تراخواستگار است یزدان پاک — ہر آئینہ از لن ترانی چہ باک

فلما اتہا نودی من شاطی الواد — پھر جب موسیٰؑ آگ کے پاس پہنچے تو مبارک

الایمن فی البقعۃ المبارکۃ من — جگہ میں میدان کے داہنے کنارے پر درخت

الشجرۃ ان یا موسیٰ انی انا اللہ رب — سے ان کو آواز آئی کہ موسیٰؑ! ہم اللہ ہیں

العالمین ۔ (قصص ۔ ۴) — سارے جہان کے پروردگار ۔

ہم انا اللہ خوان درختی را بگلزار آورد — ہم انا الحق گوے مردی را بسردار آورد

وادخل یدک فی جیبک تخرج بیضاء — اور اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں رکھ تو وہ بے داغ

من غیر سوء فی تسع ایات الی فرعون — سفید نکلے گا (یہ ان) نو معجزوں میں سے ہے

وقومہ (نمل) — جن کے ساتھ تم کو فرعون اور اس کی قوم کے

پاس بھیجا ہے ۔

نسیمش چون دم عیسیٰ روان بخش — صباحش چون کف موسیٰ منور

ہیں عیسیٰ دسامان نوائش نفس گرم — ہاں موسیٰ و برہان کمائش یدِ بیضا

از حرف من اندیشہ گلستان خلیل است — از روی کف در دست کلیم است

واذکر فی الکتاب موسیٰ اسند کان — اور کتاب میں موسیٰ کا مذکور بیان کرو بیشک

مخلصا وکان رسولا نبیا ونادینٰہ من جانب — وہ ہمارے خاص بندے اور پیغمبر صاحب شریعت

الطور الایمن وقربنٰہ نجیا ووھبنا — تھے اور ہم نے ان کو طور کی داہنی طرف سے

من رحمتنا اخاہ ھارون نبیا (مریم) — آواز دی اور راز کہنے کے لیے ہم نے انکو قریب

بلایا اور اپنی مہربانی سے ان کے بھائی ہارون کو

[illegible]

وما صلبوہ ولکن شبہ لھم ۔ ۔ ۔ بل رفعہ اللہ الیہ و کان اللہ عزیزاً حکیما (النساء)

نہ ان کو سولی پر چڑھایا، مگر ان کو ایسا ہی معلوم ہوا ۔ ۔ ۔ بلکہ ان کو اللہ نے اپنی طرف اٹھا لیا۔

حضرت ادریسؑ کے لیے

ورفعنہ مکاناً علیاً

اور ہم نے انکو اٹھا کر بڑی اونچی جگہ میں داخل کیا

دل مایوس را تسکین بہ بردن میتوان دادن

چہ امید است آخر خضر و ادریس و مسیحا را

حضرت نوحؑ کے بارے میں۔ (عنکبوت)

فلبث فیھم الف سنۃ الا خمسین عاماً

تو وہ پچاس برس کم ہزار برس ان میں رہا

از عمر نوح عرض برد انتظار تو

در عرض شوق تاب نیاوردی لنگ را

حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں۔

قلنا یا نار کونی برداً و سلاماً علی ابراھیم (انبیاء ۔ ۱۱)

(انبیاء) ہم نے حکم دیا کہ اے آگ ابراہیمؑ کے حق ٹھنڈک اور سلامتی بن۔

شنیدہ ای کہ بآتش نسوخت ابراہیم

ببین کہ بی شرر و شعلہ میتوانم سوخت

نگین چمنے زشعلہ آرائی

براہیمی نہ آزر آورد

واذ قال ابراھیم لابیہ وقومہ اننی براء مما تعبدون ط (زخرف ۔ ۳)

اور جب ابراہیمؑ نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ جن بتوں کی تم پرستش کرتے ہو مجھکو تو ان سے کچھ سروکار نہیں

ہمان میاو ویدا ے پدر فرزند آزر را نگر

ہر کہ شد صاحب نظر دین بزرگان خوش نکرد

یہاں "صاحب نظر" میں انتہائی بلاغت ہے اس لیے کہ ان کی بصیرت ہی شروع ہوتی تھی

نسیمش چون دمِ عیسی روان بخش	صبا جیش چوں کفِ موسی منور
ہی عیسی دساماںِ لوائش نفس گرم	ہاں موسی ویرہان کمالش یدبیضا
نظم را موجۂ حیوان فہمند	نثر را نسخۂ اعجاز مسیحا بنیذ
تم یک رشحہ فیض است کہ تاریخت فرد	در دلش رای شد و بر لب عیسی اعجاز
ب تو زندہ کن معجز مسیحائی	رخِ تو جلدہ دہ شوکتِ سلیمانی
براہیم خوے، سلیمان فری	مسیحا دمی، مصطفی گوہری
لو ہم مریض عشق کے تیمار دار ہیں	اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج
ایک کھیل ہے اورنگ سلیماں مرے نزدیک	اک بات ہے اعجاز مسیحا مرے آگے
ابن مریم ہوا کرے کوئی	مرے دکھ کی دوا کرے کوئی
ویکلم الناس فی المھد وکہلا	اور گہوارہ میں اور بڑی عمر کا ہوکر لوگوں
وکان من الصالحین۔	کے ساتھ کلام کریگا۔ اور وہ نیک بندوں
(آل عمران)	میں سے ہوگا۔
ایدتک بروح القدس تکلم	ہم نے روح القدس سے تمھاری مدد کی
الناس فی المھد وکہلا	تم گہوارے میں اور بڑے ہوکر لوگوں سے
(مائدہ)	گفتگو کرتے تھے۔
فاشارت الیہ قالوا کیف نکلم	تو (مریم) نے ان (عیسیٰ) کی طرف اشارہ کیا
من کان فی المھد صبیا (مریم)	لوگ لگے کہنے ہم گود کے بچے سے کیسے بات کریں
زشاہ معجزہ آمدم طلب کہ در جنبش	بگاہوارہ سخن گوکند مسیحا را
وما قتلوہ	اور نہ تو انھوں نے ان کو قتل کیا

۷۔ فانطلقا (کہف) پھر دونوں چلے۔

غالب: بہیابانی گری خامہ شدم روی شناس در رہت خامۂ خضر بیابان منست

حضرت ایوبؑ کے بارے میں:-

۴۴- اناوجدناہ (ص) بیشک ہم نے ایوبؑ کو بڑا صابر پایا۔

غالب: بصبر کم نیم اما عیار ایوبی بقدر آنکہ گرفتند کامل افتاد است

قرآنی اشخاص کے علاوہ احکام وعقائد کا بھی حوالہ دیا ہے اور آیات کی بھی متعدد جگہ تضمین پائی جاتی ہے۔

۵۱۔ وان یکاد الذین کفروا لیزلقونک بابصارہم لما سمعوا الذکر ویقولون انہ لمجنون (قلم - ۲) اور اے پیغمبر کافر جب قرآن سنتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمکو گھور گھور کر خدا کے رستے سے پھسلا دینگے اور کہتے ہیں کہ یہ تو ایک دیوانہ ہے۔

غالب: آں لابہ ہای حمزہ فزار اہل تماند برخوان خود یکاد کہ مار اسپند نیست

۱۳۔ ینبؤا الانسان یومئذ بما قدم واخر (قیامہ) اس دن انسان کو بتا دیا جائیگا کہ کیسے اعمال اس نے آگے کئے ہیں اور کیسے پیچھے چھوڑے ہیں۔

غالب: آنم روز کہ پیش رود از ہر چہ گذشت کاش با ما سخن از حسرت ما نیز کنند

" ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کو ملے داد یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

۸۷۔ انہ لا یایئس من روح اللہ (یوسف) بیشک خدا کی رحمت سے وہی لوگ ناامید الا القوم الکافرون ہوا کرتے ہیں جو کافر ہیں۔

۳۸۔ ان اللہ لا یحب کل خوان کفور (حج) بیشک اللہ کسی دغاباز ناشکرے کو پسند نہیں کرتا۔

ستارے، چاند اور سورج کو غروب ہوتے دیکھ کر وہ ان کی پرستش سے بیزار ہوئے تھے۔

حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کے بارے میں:-

۱۰۲۔ یابنی انی اری فی المنام انی اذبحك فانظر ماذا تری قال یاابت افعل ما تؤمر (صافات)

بیٹا! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تمکو ذبح کر رہا ہوں، پس تم سوچو کہ تمھاری کیا رائے ہے، کہا ابا جان! آپکو جو حکم ہوا ہے اس کی تعمیل کیجئے۔

غالب: فرزند زیر تیغ پدر می نہد گلو — گر خود پدر در آتش نمرود می رود

ولہ: زخونیکہ در کربلا شد سبیل — او اگر دوام زبان خلیل

۲۵۸-۲۔ الم تر الی الذی حاج ابراھیم فی ربہ ان اتاہ اللہ الملك (بقرہ)

کیا تم نے اس شخص پر نظر نہیں کی جو صرف اس وجہ سے کہ خدا نے اسکو سلطنت دے رکھی تھی ابراہیم سے ان کے پروردگار کے بارہ میں حجت کرنے لگا۔

غالب: نہ مرا دولت دنیا نہ مرا اجر جمیل — نہ چو نمرود توانا نہ شکیبا چو خلیل

حضرت خضرؑ کے بارے میں:-

(اگرچہ قرآن میں کہیں انکی شخصیت کو اس نام سے متعارف نہیں کرایا گیا ہے لیکن باتفاق جمہور یہ وہی شخص ہیں جنھوں نے حضرت موسیٰؑ کی رہنمائی کی تھی اور سورہ کہف میں اسکا بالتفصیل ذکر آیا ہے)

۶۶۔ قال لہ موسی ھل اتبعك علی ان تعلمن مما علمت رشدا (کہف)

موسیٰ نے اس سے کہا کہ کیا میں آپکے ساتھ رہوں بشرطیکہ جو علم آپکو سکھایا گیا ہے اس میں سے

[illegible]

غالب سعی یا مشکور و نقد ما ردوا — چیست آں کا ز اشاری انا ردوا

۸۵ وما اوتیتم من العلم الا قلیلا (اسراء) اور تم لوگوں کو بس تھوڑا ہی سا علم دیا گیا ہے

غالب قدرت حق بیش ازیں ہم بودہ است — ہرچہ اندیشی کم از کم بودہ است

" لیس کمثلہ شیاءٌ (سوریٰ) کوئی چیز اس جیسی نہیں۔

غالب صانع عالم چنیں کرد اختیار — کش بعالم مثل نبود زینہار

در ایں نہ عجز است اختیار است ای فقیہ — خواجہ بی ہمتا بود لا ریب فیہ

۲۰ ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الاٰخرۃ حسنۃ و قنا عذاب النار (بقرہ) — اے ہمارے پروردگار ہمیں دنیا میں بھی خیر و برکت دے اور آخرت میں بھی خیر و برکت دے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔

غالب دھوپ کی تابش آگ کی گرمی — وقنا ربنا عذاب النار

۷۰ ویبقیٰ وجہ ربک ذو الجلال والاکرام (رحمٰن) — اور صرف تمہارے پروردگار کی ذات باقی رہیگی جو عظمت والی اور بزرگ ہے۔

غالب قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ — مظہر ذو الجلال والاکرام

بعض بعض مقامات پر تو یہ گمان ہوتا ہے کہ قرآنی فقروں کو بالفاظ مبدل نظم میں پیش کر دیا گیا ہے۔

۲۶ قل اللھم مالک الملک (آل عمران) تو کہہ اے خدا ملک کے مالک

علم الانسان مالم یعلم (علق) — اس نے انسان کو وہ باتیں سکھائیں جو اس کو معلوم نہ تھیں۔

غالب ناامیدی از تو کفر و تو راضی نہ ای بکفر — نومیدیم دگر بتو امید وار کرد

۳۵ ونبلوکم بالشر والخیر فتنۃ — ہم تمکو بری اور بھلی حالتوں میں آزماتے ہیں

والینا ترجعون ہ (انبیاء) اور تمکو ہماری طرف لوٹ کر آنا ہے۔

غالب از آنکہ خیر و شر جز بقضا نبودہ است — کار جہان ز بد دلی بیخبرانہ کردہ ایم

۷۲ وتلک الجنۃ التی اورثتموھا — اور یہ جنت کی میراث جو تم کو ملی ہو تو ان

بما کنتم تعملون (زخرف) اعمال کے عوض میں جو تم کرتے رہے ہو۔

غالب میراث جم کہ بود اینکہ بمن سپار — زیں بیں رسد بہشت کہ میراث آدم است

ان الشیطان للانسان عدو مبین (یوسف) اس میں شک نہیں کہ شیطان آدمی کا کھلا دشمن ہے۔

غالب شیطان عدوست لیک از ان نا ہر وقی — بخشد خدا اماں ز تہیب عدو مرا

۵۴ فتوبوا الی بارئکم فاقتلوا انفسکم — تو اپنے خالق کی جناب میں توبہ کرو اور اپنے

(بقرہ) تئیں ہلاک کرو۔

۵۳۔ لا تقنطوا من رحمۃ اللہ (زمر) تم لوگ اللہ کی رحمت سے ناامید نہ رہو۔

غالب ہر جا کہ گشت ترجمۂ اقتلوا رقم — گردید نوک خامہ بہ تیزی دم حسام

ہر جا کہ رفتہ معنی لا تقنطوا بکار — پیچیدہ بوی سنبل فردوس در مشام

۳۵ اللہ نور السموات والارض (نور) اللہ ہی کے نور سے آسمان و زمین کی روشنی ہے۔

نور محض و اصل ہستی ذات اوست — ہر چہ جز حق بینی از آیات اوست

ولہ برآورد بی کلفت سمت و سوی — بنور السموات والارض روی

۱۹ کان سعیھم مشکورا (اسراء) جنکی محنت مقبول ہو گی۔

(یٰسین)	پرانی ٹہنی کی طرح رہ جاتا ہے۔
غالب بگردش در آرندۂ نو سپہر	بگردون برآرندۂ ماہ و مہر
ثم سواہ و نفخ فیہ من روحہ	پھر اسکو درست کیا اور اسمیں اپنی روح
(سجدہ ۲)	پھونکی۔
۵ علمہ البیان ط (رحمٰن)	اس کو بولنا سکھایا۔
زبان را بدانست سرمایہ ساز	زبان را بگفتار پیرایہ ساز
۲۲ وتوتی الملک من تشاء ط (آل عمران)	تو جس کو چاہے سلطنت دے۔
بشاہی نشانندۂ خسرواں	ز رہزن رہانندۂ رہرواں
۶۳ قل اللہ ینجیکم منھا ومن کل کرب (انعام)	تم کہو کہ ان سے اور ہر طرح کی سختی سے
(الخامس)	خدا ہی تم کو نجات دیتا ہے۔
غالب جگر راز خونابہ آشام دہ	نفس راز بیتابی آرام دہ
واذا سألک عبادی عنی فانی قریب	اور جب ہمارے بندے تم سے ہمارے
اجیب دعوۃ الداع اذا دعان (بقرہ)	بارہیں دریافت کریں تو ان سے کہدو
(بقرہ)	کہ ہم ان کے پاس ہیں جب کبھی کوئی ہم سے
	دعا کرے تو ہم دعا کرنے والے کی دعا
	کو قبول کر لیتے ہیں۔
غالب بہر دم ز آوازِ پیوند بخش	بہر ہیکر از دل جگر بند بخش
ھوالذی یریکم البرق	وہی ہے جو تم لوگوں کو بجلی کی چمک
(رعد)	دکھاتا ہے۔

۵۔ هو الذی جعل الشمس ضیاء (یونس) وہی ہے جس نے آسمان کو چمکتا ہوا بنایا

۵۔ وسخر الشمس والقمر اور اسی نے سورج اور چاند کو مطیع کر

کل یجری لاجل مسمیٰ (زمر) رکھا ہے سب وقت مقرر تک چلے جائینگے۔

غالب جہان داور دانش آموزگار بہر روشنائی دہ روزگار

یوم نطوی السماء کطی السجل للکتب جس دن کہ ہم آسمان کو اسطرح لپیٹیں گے

کما بدأنا اول خلق نعیدہٗ جیسے خطوں کا کتوب لپیٹ لیا جاتا ہے

(انبیاء) جسطرح ہمنے اول بار پیدا کیا تھا اسی طرح

انکو دوبارہ بھی پیدا کریں گے،

ولقد زینا السماء الدنیا اور ہم نے قریب والے آسمان کو چراغوں سے

بمصابیح (ملک) اسجا رکھا ہے.

غالب کشایندۂ گوہر آگیں پرند زبردین بہ پنہای آن نقشبند

۱۲ ولقد خلقنا الانسان من سلالۃ اور ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا

من طین ثم جعلنہ نطفۃ پھر ہم ہی نے اس کو حفاظت کی جگہ میں

فی قرار مکین (مومنون) نطفہ بنا کر رکھا۔

غالب نگارندۂ پیکر آب و گل شمارندۂ گوہر جان و دل

والشمس تجری لمستقر لہا اور آفتاب اپنے ایک ٹھکانے کیطرف کو

ذالک تقدیر العزیز العلیم چلا جا رہا ہے یہ اندازہ خدا کا باندھا ہوا ہے

والقمر قدرنہ منازل حتی جو زبردست اور آگاہ ہے اور چاند کیلیے

عاد کالعرجون القدیم ط ہمنے منزلیں ٹھیرادیں یہانتک کہ وہ کھجور کی

لا تاخذہ سنۃ ولا نوم ط — نہیں لیتے والا اسکو اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔

جہان آفرین را غور و خواب نیست — تو فارغ چہ خسپی بالیست

۱۵ ان یقولوا سمعنا و اطعنا و اولئک (نور) — تو یہی کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور حکم مانا

ھم المفلحون ط (نور) — اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

غالب: نظارۂ خوبان دمی و نغمہ حرامست — دیدیم و شنیدیم و سمعنا و اطعنا

۔ و علم آدم الاسماء کلھا ط (بقرہ) — اور آدم کو سب کے نام بتادئے۔

آن رشحہ کہ گوئی ز گرانمایگی ناز — مہر یست بگنجینۂ کیفیت اسما

۳۲ ذالک الکتٰب لا ریب فیہ ھدی — یہ وہ کتاب ہے جس میں کچھ بھی شک نہیں

للمتقین الذین یومنون بالغیب — پرہیزگاروں کی رہنما ہے، جو غیب پر

و یقیمون الصلوٰۃ و مما رزقناھم — ایمان لائے اور نماز پڑھتے اور جو کچھ

ینفقون ط — ہم نے ان کو دے رکھا ہے اس میں سے

(بقرہ) — خرچ کرتے ہیں۔

غالب: شرط اسلام بود ورزش ایمان بالغیب — ای تو غائب ز نظر مہر تو ایمان ماست

۔ ان الذین یبایعونک انما — (اے پیغمبر) جو لوگ تمہارے ہاتھ پر

یبایعون اللہ ید اللہ فوق — بیعت کر رہے ہیں وہ خدا ہی سے بیعت

ایدیھم (فتح) — کر رہے ہیں، خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے

غالب: بگمر بحکم ید اللہ فوق ایدیھم — کرامت تو بہ دو نم ازین فشار کشید

فقال انا ربکم الاعلی ط (نازعات) — اور کہدیا کہ میں تمہارا بڑا پروردگار ہوں

غالب: خوبت کہ نشنوم ز سر خود رای — گلبانگ انا ربکم الاعلی

۵۷ حتیٰ اذا اقلت سحابا ثقالا سقناہ لبلد میت فانزلنا بہ الماء (اعراف) یہاں تک کہ جب ہوا بھاری بادلوں کو لے اڑتی ہے تو ہم کسی بستی کی طرف جو مری پڑی تھی بادل کو ہانک دیتے ہیں پھر اس سے پانی برساتے ہیں،

(اعراف)

غالب ہم رگ ابر را اشکباری از اوست
دم برق را بیقراری از اوست

۴۴ وان من شیٔ الا یسبح بحمدہ ولکن لا تفقھون تسبیحھم (اسراء) اور جتنی چیزیں ہیں سب اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کر رہی ہیں مگر تم لوگ ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔

۷۷ اولا یعلمون ان اللہ یعلم ما یسرون وما یعلنون ط (بقرہ) کیا ان لوگوں کو یہ بات معلوم نہیں کہ جو کچھ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں اللہ سب کو جانتا ہے۔

(بقرہ)

غالب زبانہای خاموش گویای او
نہانہای اندیشہ پیدای او

فاما من ثقلت موازینہ فھو فی عیشۃ راضیہ واما من خفت موازینہ فامہ ھاویہ
(قارعہ)

تو جس کے اعمال تول میں زیادہ ٹھہریں گے تو وہ خاطر خواہ عیش میں ہوگا۔ اور جسکے اعمال تول میں کم ٹھہریں تو اسکا ٹھکانا ہوگا ہاویہ،

غالب بدوش ترازو منہ بار من
نسنجیدہ بگزار کردار من
بکہ دارسنجی میفزای رنج
گرانباری در دعمرم بسنج

۵۵ اللہ لا الہ الا ھو الحی القیوم (بقرہ) اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، زندہ

یہاں غالب پر ناواقفیت کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ اس لئے کہ وہ خدا کے اس قانون سے واقف تھے، چنانچہ اوپر اس معنی کا ایک مضمون گذر چکا ہے

بدوش ترا نہ دمنہ بارمن الخ

یا

غالب، لاتقربوا الصلوٰۃ زنہیم بخاطر است — وازامر بادہ ماندہ کلوا واشربوا مرا

حالانکہ قرآن میں صاف موجود ہے،

لاتقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ — جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز کے

حتیٰ تعلموا ما تقولون — پاس بھی نہ جانا یہاں تک کہ جو کچھ

(نساء) — کہتے ہو اسکو سمجھنے لگو۔

ممکن ہے کہ (سوانح نگاروں کی روایت کے مطابق) غالب کو نماز پڑھنے میں یہی عذر مانع رہتا ہو، لیکن اس کے جواز کے لئے امر قرآنی کی آڑ ڈھونڈنا صحیح نہیں ہے۔

اور بعض مقامات پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ متن قرآنی سے واقفیت کے باوجود بھی انھوں نے معنی پر غور نہیں کیا اور عربی اور فارسی میں فرق نہیں کر سکے، مثلاً

غالب نہ بادۂ طہور رغم محتسب کجا — در عیش خلد لذت بیم زوال کو

در بہشت بہشت و بادہ حلال است در — گر باز پرس رود بود ازمن جواب خواہ

وحلوا اساور من فضۃ وسقاھم — اور ان کو چاندی کے کڑے پہنائے

ربھم شرابا طھورا — جائیں گے اور ان کا پروردگار انکو

(دھر) — پاکیزہ شراب پلوائیگا۔

یہاں شراب کے معنی "بادہ" یعنی "خمر" کے نہیں ہیں جو غالب نے لیے ہیں بلکہ محض پینے کی چیز کے ہیں جو قرآن میں متعدد بار وارد ہوا ہے،

اس موقع پر یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ غالب نے قرآنی مطالب میں کچھ تحریف بھی کی ہے، ان میں سے بعض تو صرف مزاح کی خاطر ہیں جن کا ان کے مزاج میں غلبہ تھا مثلاً

غالب۔ پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق	آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

یہاں وہ قرآنی سیاق و سباق سے قطعاً صرف نظر کر گئے، کیونکہ قرآن نے جا بجا اسکی تصریح کر دی ہے کہ گناہگار کو سزا کے حکم سے پہلے اس کے اعمالنامے دکھائے جائیں گے اور وہ خود اپنے گناہوں کا اقرار کرے گا۔

یومئذ یصدر الناس اشتاتا لیروا اعمالھم فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ

(زلزال)

اس دن لوگ مختلف حالتوں میں لوٹیں گے تاکہ ان کے عمل انکو دکھائے جائیں۔ تو جس نے ذرہ بھر نیکی کی وہ اسکو دیکھ لیگا اور جس نے ذرہ بھر برائی کی وہ اسکو دیکھ لے گا۔

ووضع الکتاب فتری المجرمین مشفقین مما فیہ ویقولون یاویلتنا مال ھذا الکتاب لا یغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصاھا ووجدوا ما عملوا حاضرا ولا یظلم ربک احدا

(کہف)

اور رجسٹر رکھا جائیگا تو تم گنہگاروں کو دیکھو گے کہ جو کچھ رجسٹر میں لکھا ہے اس سے ڈر رہے ہیں اور کہتے جاتے ہیں کہ ہائے ہماری کمبختی یہ کیسا رجسٹر ہے کہ بے قلمبند کئے نہ کسی چھوٹے ہی گناہ کو چھوڑتا ہے اور نہ بڑے ہی کو اور جو کچھ ان لوگوں نے کیا تھا موجود پائیں گے، اور تمہارا پروردگار کسی پر ظلم نہیں کرتا۔

کیا اسلامی قانون رومی قانون کا مرہونِ منت ہے؟

ترجمہ جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب پیرس

(۵)

۳۔ عام ملاحظات

۴۳۔ اسلامی قانون اگر رومی قانون کا مدیون ہے تو بہرحال یہ نہیں ہوا کہ ایک ماہرین قانون نے دوسرے کے ماہرین قانون سے براہ راست کوئی چیز مستعار لی ہو۔ اس کے دلائل ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں:۔

۴۴۔ الف: لغوی شہادت: جب کوئی ادارہ یا نظریہ ایک قوم کسی دوسری قوم سے مستعار لیتی ہے تو عام طور پر نہ صرف وہ نظریہ بلکہ وہ بیرونی علامت (لیبل) بھی مستعار لیتی ہے جس سے وہ نظریہ [مستعار دہندہ کے ہاں] موسوم و معروف ہوتا ہے، مثلاً جب رومی قانون میں "ہیپوطیقا" *hypotheca* (رہن)، "خیرو گرافا" *cheirographa* (قلمی معاہدہ مع دستخط)، "سنگرافے" *syngraphae* (سارے فریقان معاہدہ کے ایک ساتھ دستخط)، "امفوتیوسیس" *emphyteusis* (طویل المیعاد رہن) کی اصطلاحیں نظر سے گذرتی ہیں تو فوراً ان سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یونان سے آئی ہیں [کیونکہ یہ لفظ یونانی ہیں، لاطینی نہیں] تلمودی قانون میں بھی معبّر (یعنی عبرانی بنائے ہوئے) یونانی اور معبّر لاطینی الفاظ کی بھرمار ہے۔ دیگر زبانوں کے مقابلے میں عربی کو بیرونی الفاظ مستعار لینے کی کم ضرورت ہوتی ہے۔

ھوالذی انزل من السماء	وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا
ماء لکم منہ شراب (نحل)	جس میں کچھ تمہارے پینے کا ہے ۔
یخرج من بطونھا شراب	مکھیوں کے پیٹ سے پینے کی ایک چیز (شہد)
مختلف الوانہ فیہ شفاء للناس	نکلتی ہے جس کی رنگتیں کئی طرح کی ہوتی
(نحل)	ہیں، اس میں لوگوں کے لیے شفاء،
ارکض برجلک ھذا مغتسل	اپنے پاؤں سے ٹھوکر دو، تمہارے
بارد و شراب (ص)	نہانے اور پینے کیلئے یہ ٹھنڈا پانی ہے،

ان لغزشوں کے باوجود بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کو قرآن سے خاص شغف تھا، اور وہی ان کے شاعرانہ فکر و تخیل کا محور تھا، اور اسکو مذہب اسلام کی طرف بجز سوا کسی اور چیز سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا اور یہاں " ای تو غالب ز نظر مہر تو ایمان ملت " کی تصدیق ہوتی ہے ۔

اقبال کامل

اس میں اقبال کے سوانح حیات کے بعد، ان کی اردو شاعری، پھر فارسی شاعری کے مفصل تبصرہ اور ان کے کلام کی تمام ادبی خوبیاں دکھائی گئی ہیں، اسکے بعد ان کی شاعری کے اہم موضوعات مثلاً فلسفۂ خودی، فلسفہ بیخودی، نظریۂ ملیت تعلیم، سیاست صنف لطیف (عورت) فنون لطیفہ اور نظام، اخلاق وغیرہ کی نہایت دیدہ وری کے ساتھ تشریح کی گئی ہے

مرتبہ مولانا عبدالسلام ندوی :- قیمت :- آٹھ روپے

میں جو ہوسینین قانون [ائمۂ فقہ] تھے وہ ان حکمرانوں [یعنی خلفاء] سے نفرت کی وجہ سے پہلوتہی کرتے تھے کیونکہ ان خلفاء کا ادّعاءِ اسلام بڑے شبہات پیدا کرتا تھا[1]۔ یہ کہنے میں کوئی مبالغہ ہوگا کہ اگر اموی خلفاء کوئی بات پسند کرتے تھے تو یہ واقعہ ہی اس بات کے لئے کافی تھا کہ وہ فقہاء کے لئے ناپسندیدہ ہے اور اپنی حد تک یہ خلفاء اور ان کے حاشیہ بردار قانون [فقہ] سے ذرا بھی دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ خراج گزار ذمی قوموں کو اجازت دیدی گئی تھی کہ وہ[2] اپنے معاملات اور مقدمات کا خود ہی فیصلہ کر لیا کریں، اور یہ تصور کر لیا گیا تھا کہ دو عدد قاضی[3] اس بات کے لئے کافی ہیں کہ ساری وسیع اسلامی شہنشاہی کے ان جھگڑوں کی سماعت کریں جو عربوں [مسلمانوں میں (جو عسکری پیشہ کرتے تھے)] پیدا ہوں، اور دیگر مسائل سے [خارج عدالت] حل نہ ہوں۔ اس لئے اسلامی قانون کی وسیع فہرست اصطلاحات میں ایک بھی ایسی نہیں جو لاطینی یا یونانی سے ماخوذ [معرب] ہو۔ البتہ اس سے خود لفظ "قانون" کو مستثنیٰ کرنا چاہئے لیکن اس لفظ سے نظم و نسق کے احکام اور بعض وقت رسم و رواج) مراد ہوتے تھے، نہ کہ صحیح (قانون ملک، فقہ)[4] امویوں کے

---

[1] شاید ولید بن یزید جیسے آخری اموی خلفاء کی حد تک ایک حد تک صحیح ہو۔ سارے اموی خلفاء کو ایک لاٹھی سے ہانکنا صحیح نہیں۔ (مترجم) [2] ذمیوں کی قانونی اور عدالتی آزادی قرآنی احکام کے تحت تھی اور عہد نبوی سے چلی آ رہی تھی، امویوں کی ایجاد نہیں تھی۔ (مترجم) [3] معلوم نہیں اس غلط فہمی کی اساس کیا ہے۔ بصرہ و کوفہ ہی نہیں، قاضی تقرر ہیا تھے۔ (مترجم) [4] دیکھو فٹزجیرالڈ کی مذکورہ انگریزی کتاب "قانون محمدی" صفحہ ۱۲)۔ (قانون بمعنی فقہ نہ قانون کے نہ رسم و رواج کے معنوں میں ائمہ مذاہب کے زمانے میں استعمال ہوا۔ یہ بہت بعد کی چیز ہے مترجم) ۔ عثمانی سلاطین کے زمانے میں "قانون" کو جو عظیم اہمیت دی گئی وہ دوسرا معاملہ ہے۔ پھر بھی خود عثمانی زمانے میں نظریے کی حد تک یہ قاعدہ برقرار رہا کہ سلطان کوئی "قانون" اس وقت تک جاری نہیں کر سکتا جب تک کہ شیخ الاسلام اس کے مطابق شریعت ہونے کی توثیق نہ کرے۔ کہا جاتا ہے کہ عربی لفظ "زندیق" لاطینی لفظ ہیریس *haeresis* کا معرب ہے اور "دین" (یعنی قرض) یونانی لفظ دانے گیون *daneion* سے ماخوذ ہے، لیکن یہ دونوں باتیں صحیح نہیں کیونکہ یہ دونوں عربی لفظ پرانے سامی مادوں سے نکلے ہیں۔ (بقیہ ص [illegible])

گو وہ بھی بعض وقت مستعار لیتی رہی ہے[5]۔ ہم یہاں ایک حیران کن نکتے سے دوچار ہوتے ہیں
یہ خیال کرنے کے وجوہ ہیں کہ اموی خلفاء نے جنھوں نے اپنے پایۂ تخت دمشق کی آرائش و زیبائش
کی اتنی کوشش کی، کشوری اور عسکری نظم و نسق کے رومی تصور کو برقرار رکھا، یا اسے زندہ کیا
اور چند بیرونی لفظ جو انھوں نے مستعار لئے ان کو پہلی بار استعمال کیا، باقی وہ تھے جو پہلے

سے قرآن مجید میں پائے جاتے تھے۔ نئے الفاظ اس خیال کی تائید کرتے ہیں، لیکن مدینے اور کو

بقیہ حاشیہ ص ۳۰۳		سلہ مثلاً لفظ فرنی "Pherny" (دلہن کا جہیز) بار افرنا "Parapherna" (بیوی کی شخصی جائداد) "سونیگور" Sonygoros" (وکیل و مدافع) "سونہیدریون" Sonhedrion (اتفاقِ باہمی) "فی خرسیس" ... (تبادلہ یا خلاف مسیح) جو عبرانی میں برتے جاتے ہیں سب یونانی الاصل ہیں۔ عبرانی میں غیر زبانوں سے لئے ہوئے الفاظ بہ کثرت ہیں۔ (مؤلف)

سلہ مثلاً جیفری کی انگریزی کتاب Jeffery, The Foreign Vocabulary of the Quran (قرآن مجید میں غیر عربی لفظ)، مطبوعہ بڑودا ۱۹۳۸ء الفاظ کی اجنبی اصلیت کے متعلق جیفری کے بعض استنباطات قابل اعتراض ہیں لیکن وہ نکتہ جس سے ہیں یہاں بحث ہے یہ ہے کہ قرآنی لفظ "سجل" کو قانونی ذائقہ عصر قرآنی کے بہت بعد حاصل ہوا [یعنی سورہ ۲۱ آیت ۱۰۴ میں وارد شدہ لفظ "یوم نطوی السماء کطی السجل للکتب" میں سجل لاطینی - Sigillum کا معرب ہے جس کے معنی مہر کے ہیں اور اس سے مراد خط پر مہر لگانے اور خط کے ہیں مگر بعد میں سرکاری دفتر میں درج کرانے کے معنی ہو گئے (مترجم)]۔ اموی دور میں مستعار لئے ہوئے لفظوں میں سے "برید" (ڈاک) یونانی ہے، "دوس" اور لاطینی "دسے رے دس" Veredus سے ماخوذ ہے۔ "شرط" یعنی خلیفہ کا محافظ دستہ لاطینی "کوہورتیم" cohortem سے "قاردوس" - [شاید کردوس مراد ہے (مترجم)] یعنی فوجی ٹولی یا سواروں کا دستہ غالباً ہمارے انگریزی لفظ اسکاڈرن squadron ہی کی طرح سے اگر کسی لاطینی لفظ مثلاً "کوادراتوس" Quadratus یعنی مربع سے نکلا ہو تو معقول بات ہوگی۔ رومی لفظ فوجی زبان میں باقی رہ سکتے ہیں، مثلاً انگریزی فوجی اصطلاح میں ہندوستان کی زبان قابل لحاظ ہیں۔ [ہندوستان انگریزی مقبوضہ رہا۔ اس کی زبان اور نظم و نسق اب تک انگریزی ہے۔ عرب پر نہ رومیوں کی کبھی حکومت رہی نہ رومی زبان مسلمانوں میں رائج رہی۔ (مترجم)] لیکن صاحب الشرطہ جو سرکاری جلاد اور ایک قسم کا مجسٹریٹ (حاکم عدالت) ہوا تھا، کبھی شریعت [یعنی اسلامی قانون] کے نفاذ کے سلسلے میں حاکم عدالت [قاضی] نہیں رہا، اس کے فرائض منصبی "عہد جدید" [یعنی انجیل متی ۲۷/۲ ، انجیل مرقس ۱۵/۴۴ (مترجم)] میں مذکورہ امیران صدہ Centurion کی طرح اصل قانون کے نہیں بلکہ نظم و نسق کے متعلق ہوتے تھے۔ (مؤلف)

لکھنے پڑھنے والی قوم ہو چکی تھی[1] یہ کہ خود قرآن (۲/۲۸۲-۲۸۳) سفارش کرتا [حکم دیتا] ہے کہ معاہدات کو شہادت [ثبوت] کی ضرورتوں کے لئے لکھ لیا جایا کرے[2] [اس طویل آیت مداینہ کا اہم حصہ یہ ہے: اے ایمان والو، جب تم کسی ایسے قرض کا معاملہ کرو جو کسی معین مدت کے لئے ہو تو اسے لکھ لیا کرو... اور اپنے مرد لوگوں میں سے دو گواہوں کی شہادت حاصل کر لو" یہ خدا کے نزدیک زیادہ منصفانہ ہے اور شہادت کے لئے زیادہ درست، اور اس بات کے لئے زیادہ قریب ہے کہ تم شک میں نہ پڑو....." (مترجم)]- اور یہ کہ ابتدائی زمانے ہی سے یہ احتیاط برتی جا چکی تھی کہ قرآن مجید کو لکھ لیا جائے۔ بے شک جو لغوی شہادت اوپر پیش کی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عرب فاتح اس قدر و قیمت سے واقف تھے جو روزمرہ نظم و نسق میں تحریر کو حاصل تھی، پھر بھی شریعت کے مؤسس [ائمہ] نے اس پر کوئی توجہ نہیں کی۔ نہ صرف یہ کہ [اسلامی] قانون اس بات کو قبول کرنے میں ناکام رہتا یا اس سے انکار کرتا ہے کہ تحریر کے ذریعہ کسی قانونی عمل دستاویز Legal Instrument یا معاملہ طے کرنے کا کوئی وثیقہ dispositive Element تیار ہو، بلکہ تحریری شہادت کی قدر و قیمت زبانی شہادت کے مقابلے میں کم قرار دی گئی ہے۔ [کیونکہ گواہ سے کرید کرید کر پوچھا جا سکتا اور مزید معلومات حاصل کئے جا سکتے ہیں، دستاویز سے نہیں (مترجم)] تحریری دستاویز صرف اس واقعے کے تفصیلات کی شہادت دیتی ہے جو فریقین میں زبانی طے ہوتا ہے[3]، اور ایک

---

[1] بلاذری وغیرہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حرب بن امیہ اور عبدالمطلب کے زمانے میں مکے کی زبان لکھی جانے لگی تھی مگر دس پندرہ افراد سے پوری قوم لکھنے پڑھنے والی نہیں سمجھی جاتی۔ لکھنے پڑھنے کی ترقی قرآنی احکام اور اوامر کے باعث ہوئی تھی۔ (مترجم)

[2] ساری دنیا میں یہی ہوتا ہے اور یہی ہو بھی سکتا ہے۔ (مترجم)

جانشین عباسی خلفاء کی ریاکارانہ اور دکھاوے کی دینداری کا مظاہرہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنا پایۂ تخت بغداد میں منتقل کر دیا جو یونانی تمدن کے بھوت کی دسترس سے باہر تھا اور اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ ان کے زمانے میں باہمی کشاکش کے باوجود unease فقہاء اور امراء یعنی اہل قانون اور ارباب نظم ونسق میں ایک طرح کی رفاقت پائی جاتی تھی جو تاریخ اسلام میں نادر چیز ہے۔[۱] بہرحال ترکی سلطان "سلیمان قانونی" کے وقت سے پہلے لفظ "قانون" سے مراد قانون ملک نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ قاعدہ جو قانون کے ماتحت ہو۔

۴۴۔ ب عثمانی ترکوں سے پہلے اسلامی قانون میں تحریر کو مشکل کوئی جگہ حاصل تھی[۲] یہ قانون عمل حتی کہ قاضی کا تقرر بھی زبانی ہونا ضروری تھا[۳] بجز اس استثنار کے کہ عمل کنندہ شخص بہرا اور گونگا ہو جس پر زبان سے ادائی ناممکن ہے مگر اس صورت میں بھی اہل قانون نے کوشش کی کہ اسکا کوئی جسمانی بدل پیدا کریں مثلاً سر کو جھکا کر اپنی قبولیت ظاہر کریں۔

۴۵۔ ممکن ہے اسکا سبب یہ رہا ہو کہ ابتدائی عرب اہل قانون کا تحریر پہ اعتماد نہ رہا ہو مگر اس بنا پہ قابل ملاحظہ [قابل حیرت] ہے کہ اسلام سے پہلے عرب ایک

بقیہ حاشیہ ص ۵۰۳: اور وہ یونانی یا رومی تاثیر سے بہت قبل توریت (بائبل) کی عبرانی زبان میں بھی ملتے ہیں، دوسرے ان عربی لفظوں کے معنی ان کے گمان کردہ لاطینی اور یونانی ماخذوں سے بالکل مختلف ہیں، رومی "ہیریس" اور عربی "وارث" میں اس اتفاقی بات کے سوا ان میں کوئی مماثلت نہیں کہ ان دونوں عربی و لاطینی لفظوں کا ترجمہ جدید یوروپی زبانوں میں ایک ہی طرح کیا جاتا ہے (انگریزی میں) heir، (فرانسیسی میں) heritier اور (اطالوی) میں erede اور یونانی لفظ "ڈانے ٹیون" اس سے مراد صرف نقد قرض ہوتا ہے، اس کے برخلاف عربی لفظ "دین" سے ہر قابل ناش... مراد ہوتی ہے اور یہ عربی لفظ جس مادے سے نکلا ہے اس کے معنی عبرانی اور عربی دونوں میں بدلہ chose in action دینے کے ہیں (مؤلف) — ["دان" کے معنے عربی میں اطاعت کرنے کے بھی ہیں۔ (مؤلف)]

[۱] یہ گولٹ سیہر کی ایجاد بندہ ہے، اور دلیل کی صحت بھی مشتبہ ہے، اس دلیل سے دعوے کا ثبوت بہرحال نہیں ملتا مگر یہاں بحث اور تردید کی شاید ضرورت بھی نہیں۔ (مترجم)۔ [۲] اس میں بڑی مبالغہ آرائی ہے۔ کتاب الام (۶/۲۱۶-۲۱۸) میں امام شافعی قدیم امام نے لکھا ہے کہ قاضی شہادت کو قلمبند کر کے محفوظ رکھے اور کتاب القاضی الی القاضی میں قاضی کا لانے والا شخص خط کے مندرجات اور مہر کے صحیح ہونے کی زبانی شہادت دینے کا پابند تھا، تو مزید احتیاط کیلئے نہ کہ تحریر کی عدم اہمیت کے باعث۔ (مترجم) [۳] معلوم نہیں اس سے کیا مراد ہے، عہد نبوی ہی سے قاضیوں کا تقرر تحریری پروانوں کے ذریعے

واقعہ یہ ہے کہ کسی مصدق (نوٹری) کے ہاں ملکیتِ جائداد کو اور اختیاری ہونے کے باوجود عام طور پر نکاح اور طلاق کو رجسٹر کرانا مصر، شمالی افریقہ، ہندوستان نیز ترکی میں پوری طرح پھیل گئے لیکن یہ اصل [اسلامی] قانون کا جزء نہ تھا، جہاں تک عثمانی قلمرو کا تعلق ہے، اس میں شک نہیں کہ وہاں [رجسٹر کرانے کے متعلق] بیزنطینی قانون سے ایک متاخر زمانے میں بالتقریب حاصل ہوئی تھی لیکن یہ ترقی (یعنی رجسٹر کرانے کا رواج) دوسرے مقاموں پر بھی ہوا۔ جو یہ عدالتوں کی کارروائی Procedure کے باعث ہوا تھا۔[۱]

۴۔ رومی قانون سے براہ راست اور جان بوجھ کر کسی چیز کے مستعار لینے کے تصور کی تردید کرنے والا ایک تیسرا امر یہ ہے کہ مسلمانوں کے سارے قانونی ادبیات (کتب)

---

[۱] مسٹر حمیداللہ کی مذکورہ انگریزی کتاب قانون محمدی صفحہ ۲۰، شاخت Schacht کا گمان ہے کہ رجسٹری کا رواج رومی دور کے باقیات میں سے رہا ہوگا۔ لیکن اگر ایسا ہوا بھی تو وہ قانون شریعت کا جزء نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ ایسی چیز رہی ہوگی جو موجود تو تھی لیکن شرعی قانون کو مدون کرنے والے استدلال پسند فقہاء Canonists اس کو نظر انداز کرتے رہے۔ مگر ادب کے ساتھ عرض کیا جاتا ہے کہ یہ فرض کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں معلوم ہوتی کہ یہی کوئی رومی چیز موجود رہی ہو جس کی شہادت بہت کم ملتی ہے یا بالکل نہیں ملتی، اور اس مقبول توجیہ کو ترک کر دیا جائے کہ مسلمانوں نے یہاں کا نظام مصدق (نوٹری) ایک تاریخی اور تدریجی (داخلی) نشو و نما کا نتیجہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی برقراری کی کوئی شہادت نہیں ملتی، رجسٹر کرانے کی دو صورتیں بہت عام تھیں: ایک قاضی کا فیصلہ، تاکہ سازشی جعلسازی نہ ہو (Collusive decrees)، دوسرے عدول یعنی سرکاری گواہوں کے رکارڈ کو محفوظ رکھنا تاکہ آیندہ گواہی دینے میں مدد ملے۔ ان دونوں کے متعلق بہ مشکل کہا جا سکتا ہے کہ وہ رومی قانون سے آئے ہیں۔ شاخت کی تازہ تالیف Origins of Mohammadan Law (قانون محمدی کے مصادر آغاز) اس مضمون کے طبع ہونے تک شائع نہیں ہوئی ہے، اس کے خیالات کی طرف اشارہ نامکمل ہوگا۔ کیوں کہ وہ مبنی ہے ان دو مختصر تنقیدوں پر جو شائع ہوئی ہیں اور جن کی نقل شاخت نے از راہ عنایت بھیجی ہے۔ (مؤلف)

مستقل شہادت کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ باتیں واقعی [فریقین میں] لکھی گئی [۱] اور طے ہوئی تھیں خود گواہوں کا دستاویز پر دستخط کر کے اس کی تصدیق کرنا ایک ایسا امر ہے جو اگرچہ فطرۃً قانون کی مابعد کی ترقی کے باعث نشو ونما پاتا ہے، لیکن اسلامی نظام کی ابتدائی صدیوں میں قانون شریعت کے ماہرین کے ہاں بہرحال وہ غیر معروف رہا ہے [جس کی وجہ یہ ہے کہ عربوں میں دستخط کی جگہ مہر کا رواج تھا اور اسی لئے سرکاری مہر کی حفاظت ہمیشہ قابل اعتماد افسروں کے تفویض ہوتی رہی ہے۔ (مترجم)]

۱۴۔ اس صورت حال کے بالمقابل معاملہ طے کرنے کا وثیقہ، مثلاً ذمی وصیت نامہ جس پر سات گواہوں کی شہادت ثبت ہوتی تھی، یا عبرانی (یہودی) طلاق نامہ ایسی چیز ہیں جو اس بات کی تردید کرتی ہیں کہ [مسلمانوں نے] براہ راست ایسی کوئی چیز مستعار لی ہو۔ مصر میں بردی کاغذوں (پاپیرس) پر ملی ہوئی دستاویزوں سے وہاں کے جس رواجی قانون کا پتہ چلتا ہے وہ بھی اسلامی شریعت سے بعید نظر آتا ہے، کیونکہ وہاں رواجی قانون یہ تھا کہ اراضی کی انتقال ملکیت یا ان کو کرائے پر دینا، اسی طرح نکاح اور دیگر قانونی اعمال عام طور پر ایسی دستاویزوں کے ذریعے انجام دئے جاتے تھے جن پر متعدد گواہوں کی شہادت ثبت ہوتی تھی [۲]۔ اس میں شک نہیں کہ عثمانی سلطنت میں قسطنطنیہ کی فتح کے بعد، اس سے کسی قدر مختلف تصور کو کارفرمائی حاصل ہوتی ہے، کم از کم اراضی کی انتقال ملکیت کے متعلق

۱۔ یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ زبانی شہادت اس بات کی دی جاتی تھی کہ دستاویز اصلی ہے، نہ کہ مندرجہ امور کے طے ہونے کے متعلق اگر ابتدائی گواہ مرچکے ہوں تو دستاویز کی اہمیت لازماً بڑھ جائے گی۔ (مترجم)

۲۔ یہ واضح نہیں ہوتا کہ مؤلف یہ رواج اسلامی دور کے متعلق بیان کرنا چاہتا ہے یا اسلام سے پہلے کے زمانے کے متعلق ایسی تحریری دستاویز یا اسلامی دور میں مصر کے ساتھ مخصوص نہیں رہ سکتیں، چاہے وہ مصر میں محفوظ رہ گئی ہوں اور دوسرے مقاموں پر ضائع ہو گئی ہوں۔ (مترجم)

نہیں جو مسلمان مؤلف خود بیان کرتے ہیں۔

۴۴۔ شریعت [یعنی اسلامی قانون] کو مدون کرنے والے [ائمہ] اور حدیثوں کو جمع کرنے والے ابتدائی مؤلف دیانتدار لوگ تھے (چاہے وہ بعض صورتوں میں بھولے اور زود یقین کیوں نہ رہے ہوں[۱])، اور ایسے کام میں مشغول تھے جسے وہ ایک مقدس فریضہ سمجھتے تھے کہ خدائی قانون کی وضاحت کریں۔ انھیں اپنے کام کی مذہبی حیثیت کا جو احساس تھا وہ انھیں ہر ایسی چیز سے روکتا تھا جو چوری چھپے کی ہو۔ ظاہر ہے کہ اس سے یہ امکان خارج نہیں ہو جاتا کہ مستعار لینا خواہ بالواسطہ اور غیر شعوری طور پر ہوا ہو۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھو تو حدیثیں ایک ایسی کوشش نظر آتی ہیں کہ اس وقت کے موجودہ رواج یا مختلف فقہاء کے آراء کو پیغمبر اسلامؐ کی حقیقی یا مفروضہ قبولیت کی کسوٹی تک پہنچا دیں[۲]۔ ان حدیثوں میں جو رواج بھرا ہوا ہے وہ کسی حد تک رومی الاصل ہے، ہم اس کا کسی آیندہ وقت مطالعہ کریں گے، لیکن یہ بات بالکل یقینی ہے کہ [جسٹی نین کے "مجموعۂ قوانین" Corpus juris] سے فقہ میں کوئی چیز براہ راست مستعار نہیں لی گئی۔

۴۵۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، اسلامی شریعت اور رومی قانون کے درمیان خصوصیت اور مقصد دونوں میں بنیادی فرق پایا جاتا ہے۔ رومی قانون اس وقت بھی جب وہ انتہائی مجرد مفہوم اور علمی بحث میں مشغول ہو ہمیشہ قانون پیشہ لوگوں کا [یعنی انسانی] قانون رہتا ہے، جیسا کہ مسلم ہے hominum causa omne just constitutum

[۱] امام بخاری جیسا شخص جس نے ایک مرتبہ سوا لبنہ کو لے کر [؟] دنیائے اسلام کا دورہ کیا تھا وہ اس میں کامیاب ہو گیا کہ جلد یا بدیر وہ جواب پالے جس کی اسے فرورت تھی، وہ یہ کہ عظیم مقدار میں Wholesale جعلی حدیثیں بنائی گئیں اسے ہر شخص تسلیم کرتا ہے (مؤلف) مگر یہ بھی بتاتا ہے کہ کونسی چیز صحیح اور کونسی موضوع یا ضعیف ہے (مترجم)

[۲] یہاں مؤلف کے قلم نے بہک کر خواہش کو واقعہ قرار دے لیا ہے، بہتر ہوتا اگر وہ اپنے فن قانون ہی میں رہتا، حدیث جیسے اجنبی فن میں

میں کہیں بھی، ایسے ماخذ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ یہ دونوں [اسلامی اور رومی] نظام حقیقت پر اس بنیادی اصول کے بارے میں ناقابل مطابقت طور پر مخالف رائے رکھتے ہیں کہ قانون کا صحیح ماخذ کیا ہے۔ اسلام میں قانون ایک خدائی چیز ہے اور خدا ہی قانون کا واحد وضع کنندہ ہے، کوئی انسانی حکمران قانون سازی کا کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ [اسی لئے فقیہ ہر مسئلے میں ہوگا تلاش اللہ اور رسول کے اقوال میں کرتا ہے (مترجم)]۔ اور مشیت عامہ [اجماع] کو صرف اس وقت قبول کیا جاتا ہے جب وہ بڑی حد تک اتفاق رائے پر مبنی ہو، تاکہ یہ سمجھا جائے کہ وہ خدا کی آواز کی نمائندگی کرتی ہے۔ اسی لئے اس بات پر زور دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی قانون کے مؤسس اپنے لئے یہ بات مشکل پاتے کہ رومی قانون کے مدیون ہونے کو قبول کریں، خواہ ایسا ہونے کا انھیں شعور بھی نہ رہا ہو، پیشگی فیصلہ کئے بغیر محض بحث کی خاطر ہمیں یہ اعتراف کر لینا چاہئے کہ جو لوگ عام طور پر مشہور نظرئے کی رومی تاثیر کے متعلق تائید کرتے ہیں، وہ اپنے دعوے کو ثابت کرنے سے بہت دور ہیں، اور محض یہ کہہ دینے سے کہ اس تاثیر کا مسلمانوں نے [بد دیانتی سے] اعتراف نہیں کیا ہے، یہ ثابت نہیں ہو جاتا کہ مسلمانوں نے باہر سے کوئی چیز واقعتہً مستعار لی ہو۔ اسی لئے جب سر رولنڈ ولسن نے اپنی [انگریزی] کتاب "انگریزی اسلامی قانون کا خلاصہ" (Sir Roland Wilson, Digest of Anglo Mohammadan Law) (طبع پنجم صفحہ ۲۴) میں یہ لکھا کہ عرب مؤلفوں میں ان ماخذوں کے متعلق جن سے انھوں نے مواد لیا ہے "سکوت برتنے کے لئے ایک مقدس سازش" پائی جاتی ہے تو قابل ثبوت چیز کو ثابت شدہ فرض کر لینا چاہئے، ایسی سازش کا کوئی وجود نہیں، اور یہ خیال کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ اسلامی قانون کے ماخذوں کے متعلق ہمیں جن چیزوں کا علم ہے وہ اس سے ذرا بھی مختلف کوئی چیز

لہ بد دیانتی کے اس امکان کی مؤلف نے خود نیچے اسی فصل میں تردید کی ہے۔ (مترجم)

رتے ہیں، دلچسپی کے حامل نہیں ہوسکتے، اگر یہ لوگ رومی قانون سے واقعتہً واقف بھی ہوتے
ب ہم "اسلامی قانون" یا "محمڈن لا" (قانون محمدی) کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو ہماری
راد شریعت ہی سے ہوتی ہے، اسی طرح شریعت میں لازماً ایسی بہت سی چیزوں سے
بحث ہوتی ہے جن سے روما کے اہل قانون کو کوئی دلچسپی نہیں ہوسکتی اور شریعت کے احکام
ایسے لحوظات پر مبنی ہوتے ہیں جو رومیوں کے لئے بالکل اجنبی اور بیگانہ ہیں۔

۵۰۔ توقع ہے کہ آیندہ ایک مضمون میں تعمیری نوعیت کے ایسے چند عارضی خیالات بطور
تجربہ tentative اس امر کے متعلق پیش کئے جائینگے کہ کن میدانوں میں رومی قانون کے
بالواسطہ اثر کا پتہ چلایا جاسکتا ہے، اور وہ کونسی راہیں ہیں جن سے گذر کر یہ اثر مسلمانوں
تک پہنچا ہوگا؟ نیز چند ایسی چیزیں بھی واضح کی جائینگی جن کی حد تک رومی اور اسلامی
قانون میں توارد محض اتفاقی ہے۔

ہندوستان کی بزم رفتہ کی سچی کہانیاں

اس میں تاریخ کی مستند کتابوں سے رعایا پروری، خلق دوستی، ہند نوازی، عدل
پروری، رحمدلی، بہادری، مہمان نوازی، حلم، بردباری، حق گوئی، سخاوت،
وداداری، خدا پرستی، وغیرہ جیسے فضائل اخلاق سے متعلق عہد مغلیہ سے پہلے
کے حکمرانوں، مذہبی رہنماؤں، اور روحانی پیشواؤں کی دلچسپ کہانیاں لکھی
گئی ہیں، جو ہر عمر کے لوگوں کے لئے سبق آموز ہیں،

مرتبہ:۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم۔ اے قیمت صر

[یعنی جو قانون بھی وضع ہوا وہ انسان ہی کے باعث وضع ہوا ہے] اس کے برخلاف اسلامی شریعت بنیادی طور پر ایک ایسا نظام ہے جو فرد انسانی کی روح کے خدا کے ساتھ تعلق پر استدلالی طور پر خیر و شر کا فیصلہ کرنے میں casuistic مشغول ہوتا رہتا ہے، چنانچہ فقہ کی کتابوں میں نماز، روزہ، حج اور اسی قسم کی دوسری چیزیں داخل ہیں، اور جب بیع اور رہن جیسے خالص مدنی (دنیوی) معاملات کے احکام سے بحث ہوتی ہے تو بھی اکثر ان میں بھی جو صرف فریقین سے متعلق ہوتے ہیں، مذہبی پہلو غالب آجاتا ہے[1]، اس کا نتیجہ، جیسا کہ ممتاز اہل علم نے بیان کیا ہے، یہ ہے کہ شریعت پر بطور ایک نظامِ قانون کے، غالباً کبھی بھی کامل طور پر عمل نہیں کرایا گیا، لیکن دوسری طرف وہ شاذ ہی عدل گستری پر طاقتور اثر ڈالنے میں ناکام رہی ہو، ہماری موجودہ بحث کے نقطۂ نظر سے، ایک نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ رومی نظام قانون کے بہت سے مندرجات ایسے ہیں جو شریعت کے ماہرین کے لئے، جو خیر و شر کا استدلالی مطالعہ

---

[1] اس کی مثال کے لئے دیکھو وہ حنفی دلیل جو قبضۂ بیجا Trespass کے ہرجانے کے سلسلے میں سر عبد الرحیم نے اپنی کتاب "مسلم جورس پروڈنس" [یعنی نام محمڈن جورس پروڈنس Principles of Mohammadan Jurisprudence ہے اور کلکتہ میں چھپی ہے، دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ نے اسکا اردو ترجمہ اصول فقہ کے نام سے شائع کیا ہے، اس کا اطالوی ترجمہ بھی ہوا ہے، (مترجم)] اس کے صفحہ (۱۶۲ تا ۱۶۳) میں دی ہے کہ یہ بہتر ہے کہ ایک معصوم شاکی کو کسی بیجا مداخلت کرنیوالے کے ہاتھوں ضرر پہنچے بہ نسبت اس کے کہ اس شاکی کو حد سے زیادہ ہرجانا دلایا جائے، کیونکہ ایسا ہرجانہ دلانے کے معنی یہ ہیں کہ خدا کو ظلم میں شریک قرار دیا جائے یعنی بیجا مداخلت کرنے والے کو۔ اسی کتاب میں جو مثال جوہر دعوض کے متعلق دی گئی ہے وہ بھی عملی قانون سے دور ہی کا واسطہ رکھتی ہے۔ (مؤلف) جسٹس سر عبد الرحیم مرحوم نے توضیح التلویح لصدر الشریعہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ غاصب کو مال مغصوبہ کی واپسی کا حکم تو دیا جائیگا لیکن حنفی مذہب کے مطابق اس نے قبضۂ غاصبانہ کے زمانے میں جو استفادہ کیا تھا اسکا معاوضہ دینے کا پابند نہ کیا جائیگا، کیونکہ استفادہ ایک غیر محسوس چیز ہے جسکی ٹھیک ٹھیک مالیت معین نہیں کی جا سکتی، اگر ہم ایسے ضرر کا جس کی مقدار معلوم نہیں معاوضہ دینے کا حکم دیں تو ممکن ہے کہ زائد از ضرورت ہرجانہ دلایا جائے، جوہر عرض کے حوالے کا صفحہ مؤلف نے نہیں دیا ہے اور باوجود تلاش کے وہ ہمیں نہ ملا۔ توضیح التلویح بھی یہاں نہ ملی کہ اس کی تحقیق کر لی جاتی۔ کار دنیا کسے تمام نہ کرد۔ (مترجم)

پہلو چھوٹنے نہیں پایا ہے، اور محض مالوف اور رائج شرح پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے، بلکہ جا بجا نئی باتیں بھی ہیں جو دوسری شرحوں میں نہیں مل سکتیں، اور اس کو ان شرحوں سے ممتاز کرتی ہیں، ان تقریروں کی جامعیت اور تحقیقی شان کا اندازہ کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے۔

کتاب کے شروع میں دو مقدمے ہیں، ایک حضرت کے تلمیذ رشید مولانا تقی الدین کے قلم سے اس میں ہندوستان میں علم حدیث کی مختصر تاریخ، حضرت شیخ کے خدماتِ حدیث کا اجمالی ذکر اور درس و تقریر بخاری کی خصوصیات کی تفصیل ہے، دوسرا مقدمہ حضرت شیخ کے قلم سے جو فنِ حدیث کے متعلق اہم اور ضروری معلومات پر مشتمل ہے، اس میں اختصار اور جامعیت کے ساتھ وہ تمام باتیں آگئی ہیں، جن سے واقفیت حدیث کے طلبہ کے لئے ضروری ہے، یہ مقدمہ اپنے فائدہ کے لحاظ سے مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے، حدیث کی یہ تقریریں حدیث کے طلبہ سے زیادہ اس کے اساتذہ کے استفادہ کے لائق ہیں، اس سے اردو میں بخاری کی ایک اہم شرح کا اضافہ ہوا،

مکتوباتِ تصوف از حضرت شیخ الحدیث مرتبہ مولانا محمد شاہد صاحب، تقطیع بڑی ضخامت: ۴۰۰ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، جلد معمولی، قیمت چار روپے پتہ: کتب خانہ اشاعت العلوم، محلہ مفتی سہارنپور،

یہ حضرت شیخ کے عارفانہ مکتوبات کا مجموعہ ہے، اکابر صوفیہ اور مشائخ کے ملفوظات و مکتوبات عرفان و تصوف کا گنجینہ اور سالکینِ طریقت کی اصلاح و تربیت کا نصاب ہوتے ہیں، اس لئے ہر دور کے اکابر شیوخ کے ملفوظات و مکتوبات جمع کئے گئے، اس دور کے سب سے بڑے شیخ حضرت مولانا محمد زکریا دامت برکاتہم کے ملفوظات اس سے پہلے شائع ہو چکے ہیں، اب مولانا محمد شاہد صاحب نے آپ کے مکتوبات کا مجموعہ مرتب کر کے شائع کیا ہے،

مطبوعات جدیدہ

تقریر بخاری اردو (حصہ اول) از حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مرتبہ مولانا محمد شاہد صاحب، تقطیع بڑی، ضخامت ۲۰۶ صفحات، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، جلد معمولی، قیمت آٹھ روپیے، پتہ :- کتب خانہ اشاعت العلوم محلہ مفتی سہارن پور،

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب دامت برکاتہم کی پوری زندگی حدیث نبویؐ کی خدمت میں گذری، تقریباً نصف صدی تک صحاح ستہ خصوصاً بخاری کا درس دیا، آپ کا درس اتنا مشہور تھا کہ دور دور سے شائقین حدیث استفادہ کے لئے آتے تھے، تدریس کے ساتھ علمی وتصنیفی حیثیت سے بھی حدیث کی بیش بہا خدمات انجام دیں، متعدد کتابوں کی شرحیں اور حواشی لکھے، اوجز المسالک شرح موطا امام مالک، مقدمہ لامع الدراری اور الکوکب الدراری کے حواشی، الابواب والتراجم للبخاری، حاشیہ بذل المجہود وغیرہ حدیث پر آپ کی وقت و وسعت نظر کی شاہد ہیں، حضرت شیخ کے متعدد لائق تلامذہ نے آپ کے درس بخاری کی تقریریں قلمبند کی تھیں جو غیر مطبوعہ تھیں، ضرورت تھی کہ حدیث کے طلبہ اور اساتذہ کے استفادہ کے لئے اس خزانہ کو عام کیا جائے، مولانا محمد شاہد صاحب اہل علم کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ان سب تقریروں کو سامنے رکھ کر ایک جامع تقریر مرتب کی ہے، جو بالاقساط کتابی شکل میں شائع ہوگی، مذکورۂ بالا کتاب اس کا پہلا حصہ ہے، جو کتاب الایمان اور کتاب العلم کی حدیثوں کی تقریروں پر مشتمل ہے، یہ تقریریں اس قدر جامع ہیں کہ کوئی تشنہ طلب

رجسٹرڈ نمبر ال (۵۲۰)

مئی ۱۹۷۳ء

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڑھ

(کتبہ سید اقبال احمد)

اس میں ۲۱۱ مکتوبات ہیں، حضرت شیخ کی ذات گرامی شریعت و طریقت کا مجمع البحرین تھی آپ محدث جلیل بھی ہیں، اور صاحب ارشاد و ہدایت شیخ طریقت بھی، اس لئے یہ مکتوبات بھی شریعت و طریقت کا عطر اور سالکین طریقت کے لئے ہدایت و رہنمائی کا صحیفہ ہیں، ان دونوں کا اجتماع ہی درحقیقت تصوف ہے جو اس سلسلۃ الذہب کے سوا اس زمانہ میں کمیاب ہے، یہ مکتوبات نہ صرف سالکین طریقت بلکہ عام دیندار مسلمانوں کی اصلاح کے لئے بھی مفید اور ان کے مطالعہ کے لائق ہیں، انھیں پڑھ کر اپنی کوتاہیوں اور غفلتوں کا احساس، اور اصلاح حال کا جذبہ پیدا ہوتا ہے،

دیوان حافظ (مترجم) از مولانا قاضی سجاد حسین صاحب تقطیع بڑی۔ ضخامت ۴۸۰ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت اعلیٰ و دیدہ زیب، قیمت قسم اول مجلد پندرہ روپئے، پتہ:۔ سب رنگ، کتاب گھر دہلی،

ہمارے فاضل دوست مولانا قاضی سجاد حسین صاحب پرنسپل مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی، فارسی کا بھی بڑا ستھرا اور بلند مذاق رکھتے ہیں، انھوں نے فارسی نظم و نثر کی متعدد اہم کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے، ان میں دیوان حافظ بھی ہے، اس کا پہلا اڈیشن کئی سال ہوئے، شائع ہوا تھا، اب انھوں نے اس کا دوسرا اڈیشن بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے، اس کا اعلیٰ اڈیشن مترجم کے حسن ذوق کا نمونہ اور حسن و نفاست میں عروس جمیل و لباس حریر کا مصداق ہے، حافظ کی شراب طہور اسی زرین و بلورین جام و مینا کی مستحق تھی ترجمہ کی خوبی کے لئے مترجم کا نام ضمانت ہے، یہ اڈیشن اپنے حسن و دلکشی کے لحاظ سے کتبخانوں کی زینت بننے کے لائق ہے:۔

"م"

جلد ۱۱ ماہ ربیع الثانی ۱۳۹۳ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۷۳ء عدد ۵

مضامین

شذرات — شاہ معین الدین احمد ندوی — ۳۲۲-۳۲۴

مقالات

ملا محمود جون پوری — جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری، اڈیٹر البلاغ بمبئی — ۳۲۵-۳۴۲

فن توشیح — جناب ڈاکٹر غلام مصطفےٰ صاحب ریڈر شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ — ۳۴۳-۳۶۳

ہمارے کیلنڈر تاریخ کے آئینہ میں — جناب بدیع الزماں صاحب اعظمی — ۳۶۴-۳۸۱

خزینۂ جواہر — شاہ معین الدین احمد ندوی — ۳۸۲-۳۹۷

مطبوعات جدیدہ — "م، ض" — ۳۹۸-۴۰۰

مجلسِ ادارت

۱- جناب مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی

۲- جناب مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی

۳- شاہ معین الدین احمد ندوی،

۴- سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے

اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں

مصر و شام و حجاز وغیرہ اسلامی ملکوں کے مقابلہ میں ہمارے ملک ہندوستان میں بھی اسلامی علوم و فنون پر کچھ کم کام نہیں ہوا ہے، تقریباً تمام علوم پر ہندوستانی علماء اور مصنفین کی بہترین کتابیں موجود ہیں جن سے تمام دنیا متمتع ہو رہی ہے، لیکن اُن کی کوئی جامع فہرست اُردو میں کیا کسی زبان میں بھی مرتب نہیں ہوئی تھی، اسی خلاء کو پُر کرنے کے لئے مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحب نزہۃ الخواطر نے الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند کے نام سے عربی میں ایک فہرست مرتب کی تھی جو اب دمشق سے شائع بھی ہو گئی ہے، یہ اوسی عربی کتاب کا ترجمہ ہے، اس میں ہندوستانی علماء و مصنفین کی تمام معلومہ تصانیف کے ذکر کے ضمن میں اجمال کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کے علمی تعلیمی و دینی و فکری تاریخ بھی آگئی ہے، اس طرح سے یہ کتاب ہندوستان کے اسلامی دور کے محققین کے لئے ایک مستند ترین ماخذ بن گئی ہے،

ضخامت :- ۴۰۰ صفحے قیمت :- دس روپئے،

مترجمہ مولانا ابوالعرفان ندوی

ملک دشمن قرار دیا جاتا ہے، اس لئے خود حکومت بتائے کہ مسلمان کریں تو کیا کریں، یا موجودہ حالت پر قانع ہو جائیں جس کو کوئی اقلیت بھی گوارا نہیں کر سکتی یا اپنے حقوق منوانے کی جو راہ بھی اُن کو نظر آئے اُس کو اختیار کریں اسلئے جس چیز کو حکومت فرقہ پروری کہتی ہے اس کو پیدا کرنے کی ذمہ دار وہ خود ہے اگر مسلمانوں کو ان کے دستوری حقوق مل جائیں تو خود بخود فرقہ پروری ختم ہو جائے گی، اتنی بڑی اقلیت کو جو اپنی تعداد اور اپنی شاندار تہذیب و تاریخ کے اعتبار سے ایک مستقل قوم کی حیثیت رکھتی ہے نظر انداز کرنا نہ ملک کے لئے مفید ہے، اور جمہوری حکومت کے شایان شان ہے،

اس کی ذمہ داری ان قوم پرور مسلمانوں خصوصاً مسلمان وزراء اور پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کے مسلمان ممبروں پر بھی عائد ہوتی ہے جو ہمیشہ مسلمانوں کو کانگریس کی حمایت کی تلقین کرتے رہتے ہیں، ان کو [illegible] عہدے تنہا کانگریسیت کے رستہ سے نہیں ملے ہیں، بلکہ اس میں مسلمانوں کی نمائندگی کو بھی دخل ہے جس کو انھوں نے بالکل فراموش کر دیا ہے، وہ مسلمانوں کی ترجمانی کے بجائے ہر مسئلہ میں حکومت کے ہمنوا بن جاتے ہیں بلکہ انکو اپنے ذاتی فوائد کے لئے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں بھی تامل نہیں ہوتا اور [illegible] کی خدمت وہی انجام دیتے ہیں، مسلمانوں کا کوئی محضر ایسا نہیں ہوتا جس پر ان کے دستخط ہوں، مستثنیٰ مثالیں شاذ ہیں،

اس موقع پر ڈاکٹر سید محمود مرحوم کا ایک واقعہ یاد آگیا، جو ان مسلمانوں کے سبق کیلئے درج کیا جاتا ہے، یہ واقعہ خود انھوں نے ہم لوگوں سے بیان کیا تھا، دلی کے مسلم کنونشن میں جو پنڈت جواہر لال نہرو کی زندگی میں ہوا تھا، ڈاکٹر صاحب نے اپنی تقریر میں مسلمانوں کی شکایتوں کے سلسلہ میں یہ بھی کہا کہ مسلمان دوسرے درجہ کا شہری سمجھا جاتا ہے، پنڈت جی کو اسکی خبر ہوئی تو انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو بلاکر بڑی برہمی ظاہر کی اور کہا کہ "تم سے اسکی امید نہیں تھی کہ میری پیٹھ میں چھرا بھونکو گے"، ڈاکٹر صاحب ہی کا بیان ہے کہ اس وقت

شذرات

مسلمانوں کا مسئلہ اُن سے زیادہ خود ہماری جمہوری اور سیکولر حکومت کی توجہ کا مستحق ہے، آزادی کی بہار آئے ہوئے چھبیس [۲۶] سال ہوا چاہتے ہیں، مگر مسلمانوں کے لیے اب تک موسمِ خزاں ہے، ہندوستان کے دستور نے اقلیتوں کو جو حقوق دیے ہیں، مسلمان عملاً اُن سے بھی محروم ہیں، اُن کے ساتھ زندگی کے ہر شعبہ میں امتیاز برتا جاتا ہے، اور مختلف طریقوں سے انکی ملّی اور تہذیبی خصوصیات کو مٹانے کی کوشش جاری ہے، یہ واقعات اتنے کھلے ہوئے ہیں کہ ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں، اگر مسلمان اس پر احتجاج کرتے ہیں تو اُن کو فرقہ پرست قرار دیا جاتا ہے، اور اس کا دائرہ اتنا وسیع کر دیا گیا ہے کہ کسی مسئلہ میں مسلمانوں کے لئے لب کشائی کی گنجائش باقی نہیں رہ گئی ہے، اکثریت کو حکومت کی پالیسی پر سخت سے سخت تنقید بلکہ مخالفت کی آزادی ہے، اس سے اُس کی قوم پروری میں فرق نہیں آتا، لیکن اگر مسلمان کسی مسئلہ میں ذرا بھی اختلاف بھی کریں تو اُن پر غداری کی ذمہ داری عائد کی جاتی ہے، پاکستان تو اُن کیلئے ہوا بنا دیا گیا ہے، بات بات پر انکو پاکستانی ہونے کا طعنہ دیا جاتا ہے۔

مسلمانوں کی سب سے بڑی محافظ کانگریس، اسکی حکومت اور اُس کا دستور ہے، دستوری حقوق سے وہ بڑی حد تک محروم ہیں، ان کی اکثریت نے ہمیشہ کانگریس کا ساتھ دیا، مگر اُن کیساتھ جو سلوک ہوا وہ کانگریس ہی کے دورِ حکومت میں ہوا، گذشتہ الیکشن میں مسلمانوں نے سو فیصدی کانگریس کا ساتھ دیا، اُس کا صلہ اُن کو یہ ملا کہ مسلم یونیورسٹی کا کردار اور اسکی آزادی ختم کر دی گئی، ایسی حالت میں اگر مسلمان مجبور ہو کر اپنے حقوق منوانے کیلئے اپنی الگ تنظیم قائم یا دوسری پارٹیوں سے مفاہمت کرتے ہیں تو اُن کو فرقہ پرور

مقالات

مُلّا محمود جونپوری

از مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری، اڈیٹر البلاغ بمبئی

آج ہم شاہجہاں کے "شیراز ہند پورب" کے ایک ایسے فاضل کا تذکرہ کر رہے ہیں جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ہندوستان کے اسلامی عہد میں یہاں اتنا بڑا حکیم و فلسفی پیدا نہیں ہوا تھا اور عجب کیا ہے کہ شاہجہاں نے اپنے دور کے اسی عالم کے فضل و کمال کی بنا پر "پورب شیراز ماست" کہا ہو، ہماری مراد حضرت علامہ شیخ ملا محمود فاروقی جونپوری صاحب شمس بازغہ متوفی ۱۰۶۲ھ سے ہے جو پرگنہ محمد آباد گوہنہ کے ایک قریہ سے علم و حکمت کا آفتاب بنکر جونپور کے مطلع پر ہر طرف جلوہ گر ہوئے جس کی روشنی سے پورے عالم اسلام کی علمی مجلسیں منور ہو گئیں، مگر افسوس کہ دیار مشرق کے دوسرے بہت سے ارباب فضل و کمال کی طرح ملا محمود جونپوری کا مفصل و مرتب تذکرہ بھی موجود نہیں ہے جس سے اس عبقری کی شخصیت کے خد و خال معلوم کئے جا سکیں، اسی کمی کو پورا کرنے کے لئے یہ تذکرہ پیش کیا جا رہا ہے۔

سلطان ابراہیم شاہ شرقی والیٔ جونپور کے دور میں حضرت شیخ خضر فاروقی اور

تو پنڈت جی بہت برہم ہوئے لیکن بعد میں انھوں نے لوگوں سے کہا کہ جب محمود جیسے شخص کو بھی اس قسم کی شکایت ہے تو اس میں ضرور کچھ نہ کچھ حقیقت ہوگی اور اسکو ہمیں دور کرنا چاہئے، اس واقعہ کے نقل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے مسائل کو محض فرقہ پروری کہکر نہ ٹالنا چاہئے، بلکہ اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے، اس تحریر کا مقصد تنقید یا شکوہ نہیں بلکہ اصلاح اور خیر خواہی ہے، اسی روشنی میں اس کو دیکھنا چاہئے، اور یہ دیکھکر کچھ امید بندھتی ہے کہ اب کانگریس ہائی کمان کو بھی اس کا احساس ہوا ہے، اور مرکزی حکومت نے مسلمانوں کی شکایت کے ازالہ کی طرف توجہ کی ہے، اور ترقی پسند پارٹیاں بھی انکے ساتھ انصاف چاہتی ہیں مگر اصل سوال ارادہ کا نہیں بلکہ عمل کا ہے اور اسکی پہلی کسوٹی مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ ہے،

مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کے اسلوب تفسیر اور ان کی خصوصیات سے اہل علم واقف ہیں، انھوں نے اپنی پوری عمر کلام مجید کے فہم و تدبر اور اس کی تفسیری خدمت میں صرف کر دی، اور اس کا ایسا محققانہ اور دلنشیں اسلوب پیدا کیا جس کو اہل علم میں بہت حسن قبول حاصل ہوا، دائرہ حمیدیہ نے اُن کے بہت سے تفسیری رسالے اور کلام مجید کے دوسرے پہلوؤں پر اُن کی تصانیف اور اُن کے اردو ترجمے شائع کئے، لیکن مالی دشواریوں کی وجہ سے ان کا ایک حصہ اب تک غیر مطبوعہ ہے جس کا مالی دشواریوں کی وجہ سے ان کا شائع نہ ہونا بہت افسوسناک ہے، اس لئے اس کی اشاعت کیلئے دائرہ حمیدیہ کی نئی تنظیم عمل میں آئی ہے، اور اس کے کارکنوں نے یہ عزم کیا ہے، کہ جس طرح بھی ممکن ہو اس گنج گرانمایہ کو چھاپ کر شائقین تک پہنچایا جائے، اُن کی طباعت و اشاعت کے مصارف کا تخمینہ جنتی ۲ ہزار ہے، جو کام کی اہمیت کے مقابلہ میں بہت کم ہے، اتنی رقم تو تنہا اعظم گڈھ کے اندر فراہم کر سکتے ہیں، ہم کو پوری امید ہے کہ اہل خیر عموماً اور اعظم گڈھ کے لوگ خصوصاً اس کی طرف توجہ کریں گے جو لوگ اس کارِ خیر میں حصہ لینا چاہیں، وہ امدادی رقوم عبد الرحمن ناصر دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر اعظم گڈھ کے نام ارسال فرمائیں،

حالات ان کی پیدائش اور ابتدائی تعلیم وغیرہ کے بارے میں بڑے مستند اور معتبر معلومات ہیں، مولانا شاہ حاجی ابوالخیر فاروقی ملا محمود سے عمر میں آٹھ سال بڑے تھے، اور ان سے تین سال پہلے فوت ہوئے، مناقب غوثی مصنفہ شمس الدین حیدری کے بیان کے مطابق ان کی تین بیویوں میں سے ایک ملا محمود کی بہن بھی تھیں، شاہ ابوالخیر شاہجہاں اور شایستہ خاں کے مقربین میں تھے اور مراحم خسروانہ سے نوازے گئے تھے، ۱۰۵۶ھ میں حج و زیارت کی دولت حاصل کی، اس کے بعد اپنے وطن میں ۱۰۵۹ھ میں فوت ہوئے، ان کی کتاب شیر وشکر نایاب ہے، سنا ہے کہ اس کا کوئی قلمی نسخہ دائرۂ شاہ اجمل الہ آباد میں موجود ہے، خیال ہے کہ اس کتاب میں ملا صاحب کے مزید حالات ہوں گے، اس کے باب سوم کے کچھ حصہ کی نقل محترم حاجی مقبول احمد صاحب محمد پوری کے توسط سے راقم کو ملی ہے جو بسا غنیمت ہے، اس میں نہایت نادر معلومات ہیں،

۲- ملا صاحب کا دوسرا قدیم اور مستند تذکرہ، ان کے ایک تلمیذ رشید کی کتاب صبح صادق میں ہے، مولانا غلام علی آزاد نے سبحۃ المرجان میں، اور مولانا خیرالدین محمد جونپوری نے تذکرۃ العلماء میں اس کتاب کے حوالہ سے ملا صاحب کے کچھ حالات لکھے ہیں، غالب گمان ہے کہ اس کتاب میں ملا صاحب کے علمی وفنی کمالات کا ذکر زیادہ ہوگا، اور شاگرد نے اپنے استاد کے ذکر میں قلم کی جولانی دکھائی ہوگی، مگر افسوس کہ اس کتاب کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے،

۳- مولانا شاہ خوب اللہ محمد یحییٰ الہ آبادی متوفی ۱۱۴۴ھ نے بسط الکلام فی وفیات الاعلام میں ملا صاحب کا ذکر کیا ہے، یہ کتاب ملا صاحب کی وفات کے پچاس سال بعد لکھی گئی ہے، اس وقت تک ان کے تلامذہ اور صحبت یافتہ حضرات موجود تھے اسلئے

ان کے صاحبزادے حضرت شیخ محمد فاروقی دہلی سے جونپور آئے، شیخ محمد کی وفات کے بعد سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے ان کے صاحبزادے شیخ مشید کو پرگنہ محمد آباد میں قریہ ولید پور وغیرہ کی جاگیر دی، اس لئے اس خانوادہ کے افراد جونپور سے یہاں آکر آباد ہوگئے، جس میں مولانا شاہ ابو سعید، ان کے صاحبزادے مولانا ملا شاہ حاجی ابو الخیر، شاہ اسمٰعیل قاضی مجھن قاضی جونپور، شیخ بڑے مولانا شاہ ابو الغوث گرم دیوان، مولانا شاہ ابو اسحٰق جیسے علماء و فضلاء، اور مشائخ پیدا ہوئے، اسی خانوادہ کے چراغ ملا محمود جونپوری بھی ہیں، یہ خاندان علم و فضل، روحانیت و مشیخت اور جاہ و جلال میں ہمیشہ سے ممتاز رہا ہے، آخری دور میں اس خانوادہ کی مشہور شخصیت سر شاہ سلیمان مرحوم تھے، جنھوں نے انگریزی دور میں ہندوستان میں سب سے بڑا سرکاری عہدہ پایا، اور مشہور نظریہ اضافیت میں ایک نیا فکر یورپ کے جدید عقلاء و فلاسفہ کے سامنے پیش کیا، وہ علم و حکمت، ادبی ذوق اور اونچے منصب میں ملا محمود کی یادگار تھے،

ملا محمود کی سوانح کے مآخذ (۱) ملا محمود جونپوری کا سب سے قدیم اور مستند تذکرہ شجرۂ شکر نامی کتاب میں ملتا ہے جسے ملا صاحب کی وفات سے پانچ چھ سال پہلے ۱۰۵۶ھ میں ان کے خاندان کے مشہور معاصر عالم اور ان کے بہنوئی مولانا حاجی شاہ ابو الخیر بن شاہ ابو سعید فاروقی بھیروی، (۱۰۰۰ھ ۱۰۵۹ھ) نے حج و زیارت کے موقع پر لکھا تھا، اس کتاب میں کل چار ابواب ہیں، تیسرے باب میں ان کے خاندانی حالات اور جونپور سے پرگنہ محمد آباد آکر آباد ہونے کی تفصیل درج ہے، باب سوم در ذکر نسب آل فاروق و برخے از سوانح احوال خانوادۂ فاروقیان، و سبب توطن قبیلۂ کاتب الحروف بولایت جونپور وغیرہ کہ تعلق بدان احوالی دارد، اس باب میں ملا صاحب کے آباء و اجداد کے

۱۰۔ مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے شمس بازغہ کے آخر میں "ترجمہ مؤلف الشمس البازغۃ" کے ماتحت ملا صاحب کا مختصر حال لکھا ہے جس میں ان کی تصانیف پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے

تلک عشرۃ کاملۃ، یہ سب کتابیں اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں،

ان قلمی اور مطبوعہ کتابوں کے علاوہ بعض دیگر کتابوں میں ملا صاحب کے حالات کسی نہ کسی انداز میں پائے جاتے ہیں مگر ان میں کوئی نئی بات نہیں ہے،

ملا صاحب کا اجمالی تعارف

اس مضمون میں شیراز ہند پورب کی بزم حکمت و ادب کے جس امام عالی مقام کا تذکرہ ہوگا، اس کی عظیم شخصیت و عبقریت کے تفصیلی تعارف سے پہلے اجمالی تعارف یہ ہے کہ ان کے بارہ میں تذکرہ نگاروں کے اقوال نقل کئے جاتے ہیں، آثر الکرام میں ہے کہ استاذ الملک ملا محمد افضل نے اپنے اس عزیز ترین شاگرد رشید کے متعلق بارہا اپنی مجلسوں میں فرمایا تھا،

"می گفتند کہ علامہ تفتازانی و جرجانی از عالم رفتہ اند کسے اجتماع دو فاضل جلیل بفضیلت در یک شہر نشان ندادہ یعنی ملا محمود و شیخ عبدالرشید"[1]

صاحب تجلی نور نے بھی معمولی فرق کے ساتھ اس قول کو اس طرح نقل کیا ہے،

"استاذش بارہا فرمودے کہ بعد علمائے تفتازانی و جرجانی اجتماع دو فاضل اجل مانند ملا محمود و دیوان عبدالرشید در یک شہر بیک زمان بوجود نہ آمدے"[2]

ملا محمود کے ہم وطن، ہم خاندان، معاصر اور رشتہ دار مولانا شاہ ابوالخیر فاروقی متوفی ۱۰۵۰ھ نے اپنی کتاب شہر و تشکرہ میں ملا صاحب کا ذکر جمیل کرتے ہوئے لکھا ہے،

ایشان را حق سبحانہ بمزید کرم فرزند ... اللہ تعالیٰ نے شیخ محمد کو ایک ایسا فرزند

---

[1] آثر الکرام ج ۲ ص ۲۰۳ [2] تجلی نور ج ۲ ص ۹۴،

یہ کتاب بھی ان کے مستند تذکروں میں ہے، نزہتہ الخواطر میں وفیات الاعلام کے حوالہ سے انکی بیعت وارادت اور اوراد وظائف کا بیان ہے، خیال ہے کہ اس کتاب میں ان کی روحانی اور احسانی زندگی کے حالات درج ہوں گے، یہ نادر کتاب بھی ہماری نظر سے نہیں گذری، مگر ان تینوں کتابوں سے بالواسطہ ملا صاحب کے تذکرہ میں کچھ نہ کچھ استفادہ ہوسکا ہے جو بسا غنیمت ہے،

۴-ان نایاب تذکروں کے بعد مولانا غلام علی آزاد نے ۱۱۷۷ھ میں سبحۃ المرجان تصنیف کی جس میں ملا صاحب کا تذکرہ ہے، یہ کتاب ۱۳۰۳ھ میں بمبئی میں چھپی ہے،

۵-آزاد نے مآثر الکرام میں بھی ملا صاحب کے حالات درج کئے ہیں جن میں بعض باتیں سبحۃ المرجان سے زائد ہیں، یہ کتاب ۱۳۲۸ھ میں مفید عام پریس آگرہ میں چھپا ہے،

۶-مولانا خیر الدین محمد جونپوری نے ۱۲۱۶ھ میں تذکرۃ العلماء لکھی جس میں ملا صاحب کے حالات تفصیل سے درج کئے ہیں، خاص طور سے ان کے علمی وفنی کمالات پر زور دیا ہے، ۱۳۵۲ھ میں الطافی پریس کلکتہ میں چھپی ہے،

۷-مولوی سید نور الدین زیدی ظفرآبادی نے تجلی نور کی دوسری جلد میں ملا صاحب کا تذکرہ بڑے شاندار الفاظ میں کیا ہے، یہ جلد جادو پریس جونپور میں چھپی ہے۔

۸-مولوی رحمان علی نے تذکرہ علمائے ہند میں ملا صاحب کا حال لکھا ہے۔ مگر اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے، ۱۹۱۴ء میں نولکشور پریس لکھنؤ میں چھپی ہے،

۹-مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب نے نزہتہ الخواطر کی پانچویں جلد میں ملا صاحب کے حالات نسبتہً تفصیل سے لکھے ہیں، اور وفیات الاعلام کے واسطے سے بعض اہم حالات درج کئے ہیں، حیدرآباد دکن میں چھپی ہے،

آگے چل کر یہاں تک لکھدیا ہے،

ولاریب انہ لم یظھر بالھند مثل	بلاشبہہ ہندوستان میں دو فارقیوں کی
الفارقیین، احدھما فی علم الحقائق	مثال نہیں ملتی ہے، ان میں سے ایک
وھو مولانا الشیخ احمد السرھندی	شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی علم حقائق
والثانی فی العلوم الحکمیۃ والادبیۃ	میں اور دوسرے ملا محمود علوم حکمیہ و ادبیہ
وھو الملا محمود،[1]	میں۔

اور مآثر الکرام میں ملا صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں

نقادۂ علمائے اشرقیین و سلالہ حکمائے متائین است، در فنون عقلی و نقلی میحا حکمت سرآمد افاضل و مشار الیہ انامل بود[2]

مولانا ...الدین محمد جونپوری نے تذکرۃ العلماء میں مآثر الکرام کی مذکورہ بالا عبارت نقل کرکے ملا صاحب کی حکمت و ادب کی جناب میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے[3] صاحب تجلی نور نے بھی مآثر الکرام کا یہ بیان نقل کرکے یہاں تک لکھا ہے کہ

شہرۂ فضیلت بچہار دانگ ہندوستان	ان کی فضیلت کا شہرہ ہندوستان کے
بلند آوازگی یافت، از روز استحکام بنائے	چار دانگ میں گونج اٹھا جب سے ہندوستان
اسلام بعلوم فلسفہ و حکمت شخصے در ہند	میں اسلام کی بنیاد پڑی فلسفہ اور حکمت
ہمچو ملا محمود پیدا نگشتہ ...... جامع سبحۃ المرجان	میں ملا محمود جیسا کوئی شخص پیدا نہیں ہوا،
می فرماید کہ ملا محمود نہ فخر استاذ بل باعث	صاحب سبحۃ المرجان نے لکھا ہے کہ ملا محمود
تفاخر و مباہات دانایان سبق بود، در علم	اپنے استاذ کے لئے باعث فخر نہیں ہیں بلکہ

[1] سبحۃ المرجان صفحہ ۵۴، [2] مآثر الکرام ج: ۱ ص ۲۰۷، [3] تذکرۃ العلماء، ص ۴۵،

کرامت نمود کہ یگانہ انفس و آفاق و آفتاب مکارم اخلاق است، فرزند حال او را دفترے جداگانہ می بایست کہ برخے از آن نوشتہ آید و اما اجمال ایں احوال آنکہ وہو الامام الاعظم، والمولیٰ المکرم، جامع المناقب شمس المشارق والمغارب السراج الوہاج فی الملۃ الحنیفیۃ والبحر المتواج فی العلوم الحقیقیۃ علم الہدیٰ والعلامۃ المقتدیٰ وملک العلماء الراسخین افتخار الملۃ والدین، الشیخ محمود ابن محمد مد اللہ تعالیٰ ظلالہ علیٰ راس المستفیدین

(شیر و شکر باب سوم)

مرحمت فرمایا جو انسانوں اور کائنات میں بے مثال اور مکارم اخلاق کا آفتاب ہے، اس فرزند کے مختصر طور پر حالات بیان کرنے کے لئے علحدہ دفتر چاہئے، مجمل طور پر یہ ہے کہ وہ امام اعظم مولائے مکرم، جامع مناقب، آفتاب مشرق و مغرب، ملت حنیفیہ کے روشن چراغ، علوم حقیقیہ کے بحر ذخار، منیارۂ ہدایت، علامۂ مقتدیٰ ملک علمائے راسخین، دین و ملت کے افتخار، شیخ محمود بن محمد ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے سایہ کو طالبان فیض کے سروں پر قائم رکھے۔

اس آئینہ میں ملا صاحب کی علمی، دینی اور اخلاقی شخصیت کے خد و خال کی پوری عکاسی موجود ہے،

مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے سبحۃ المرجان میں والہانہ اور عقیدت مندانہ انداز میں لکھا ہے:

ھو العلامۃ الاوحد بین العلماء الغوارب وسلب نظیرۃ اسطقس القضایا السالبۃ نقاوۃ العلماء الاشراقین، وسلالۃ الحکماء المشائین،

وہ یورپ کے علماء میں یگانہ اور بے نظیر تھے، اشراقیوں اور مشائیوں کے نقاوہ اور خلاصہ تھے،

وکان غایۃ فی الذکاء والفطنۃ وسیلان الذہن وقوۃ الحفظ والادراک[1]، تیزی ذہن، قوت حافظہ اور شدت ادراک انتہا درجہ کی تھی،

ہمارے عہد و دیار کے مشہور معقولی عالم اور استاذ الاساتذہ مولانا محمد شریف مصطفیٰ آبادی متوفی ۱۳۴۲ھ نے الافاضۃ القدسیہ فی المباحث الحکمیۃ کے مقدمہ میں ملا صاحب کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ علمائے حکمت و فلسفہ کے حلقہ کی آخری رائے ہو، وہ لکھتے ہیں،

کان علامۃ الاشراقیین ونقادۃ المشائین کان من اجل تلامذۃ الشیخ محمد افضل الجونفوری[2]، ملا صاحب اشراقیوں کے علامہ اور مشائیوں کے نقاد اور شیخ محمد افضل جونپوری کے سب سے جلیل القدر شاگرد تھے،

نام و نسب اور خاندانی حالات ملا محمود بن شیخ محمد بن شیخ بڈھ (بڑے) بن شیخ محمود بن شیخ قاضی منجھن (قاضی معین) بن شیخ چاند بن شیخ معروف ثانی بن شیخ منید بن شیخ معروف اول بن شیخ محمد بن شیخ خضر بن سلطان غیاث الدین محمد بن سلطان تاج الدین محمد بن سلطان عز الدین محمد بن ابو الفوارس مؤید الدین سلطان سلیمان شاہ بن نعمان شاہ بادشاہ ابن مظفر الدنیا والدین سلطان السلاطین سلطان احمد فرخ شاہ بن امیر بہاء الملۃ مسعود بن امام الائمہ مولانا واعظ الاصغر بن امام الائمہ مولانا واعظ الاکبر ثانی ابو الفتح ابن امام اسحاق بن امام سالم بن حضرت عبد اللہ بن امیر المومنین ابو حفص عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما،

مولانا شاہ ابو الخیر بن شیخ ابو سعید فاروقی فرخشاہی بھیروی متوفی ۱۰۵۹ھ نے نیر و شکر میں اپنے خانوادہ کے نسب نامہ میں بھی ایسا ہی لکھا ہے، شمس العلماء مولانا ظفر

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۹۸-۳۰۷ [2] الافاضۃ القدسیہ ص ۱۶ طبع انوار احمدی الہ آباد ۱۳۴۲ھ،

حکمت کوس لمن الملکی نواخت، و در
فن فلسفہ غلغلۂ لیس کمثلی انداخت،
نظیرش در ہندوستان بروشنی شمع شعور
نتواں یافت، و در اقالیم سبعہ ہیچ عالم
پنجہ علمش نہ برتافت[1]

قدیم حکماء و عقلا کے لئے فخر و مباہات کا باعث
تھے وہ علم حکمت کی اقلیم کے شہنشاہ تھے اور
فلسفہ میں اپنی مثال نہیں رکھتے تھے ان کی
نظیر ہندوستان میں ارباب عقل و شعور
کو نہیں مل سکی اقالیم سبعہ میں کوئی عالم
ان کے پنجۂ علم کو موڑ نہ سکا،

جامع المعقول والمنقول مولانا عبدالحی فرنگی محلی متوفی ۱۳۰۴ھ نے لکھا ہے،

ھو العلامۃ فی عصرہ الفہامۃ فی دھرہ
محقق العلوم الحکمیۃ مدقق العلوم
العقلیۃ مولانا محمود الجونفوری[2]

وہ علامۂ زمانہ، فہامۂ وقت علوم حکمت
کے محقق علوم عقلی کے مدقق تھے،

صاحب تذکرہ علمائے ہند کے تاثرات ملا صاحب کے بارے میں یہ ہیں،

"در علوم حکمیہ وادبیہ پایہ بلند داشت اگر بوجودش سرزمین جونپور برہر زبوم
شیراز تفاخر می جست روا بودے"،[3]

مولانا عبدالحی نے نزہۃ الخواطر میں لکھا ہے،

الشیخ العالم الکبیر العلامۃ الشھیر
محمود بن محمد العمری الجونپوری احد
الافاضل المشھورین، لم یکن فی زمانہ
مثلہ فی العلوم الحکمیۃ والمعارف الادبیۃ

شیخ عالم کبیر علامہ شہیر ملا محمود جونپوری مشہور
فضلا میں سے تھے، ان کے زمانہ میں حکمت وادب
کے علوم و معارف میں کوئی عالم ان کا
ہم پلہ نہیں تھا، ان میں ذکاوت فطانت

---

[1] تجلی نور ج ۲، ص ۱۳۹، [2] ص ۵۰، تذکرہ ترجمہ ملا محمود در آخر شمس بازغہ، [3] علمائے ہند ص ۲۲۱،

خاص وعام بن گئے، اس زمانہ میں تیموری حملہ کی وجہ سے دہلی بہت پرآشوب تھا اور یہاں کے بہت سے علماء وفضلا اور مشائخ دوسرے مقامات کی طرف ہجرت کر رہے تھے، یہ سلطان ابراہیم شاہ شرقی کا دور تھا، اور جونپور دار العلم اور دہلی ثانی بن رہا تھا، اس لئے دوسرے بہت سے علماء وفقراء کی طرح شیخ خضر اور ان کے صاحبزادے شیخ محمد نے بھی جونپور کا رخ کیا، اور محلہ سپاہ کے کھلے میدان میں ایک درخت کے سایہ میں بال بچوں سمیت فروکش ہوگئے، سلطان ابراہیم شاہ شرقی کو اس کا علم ہوا تو اس نے مکان کا انتظام کیا، اس کے بعد یہ خاندان جونپور میں مستقل طور سے آباد ہوگیا، یہ نویں صدی ہجری کی ابتدائی دہائیوں کا واقعہ ہے،

شیخ خضر کی وفات کے بعد شیخ محمد ان کے جانشین ہوئے، شیر وشکر میں ہے کہ سلطان ابراہیم شاہ نے کوشش کی کہ شیخ محمد کوئی خدمت قبول کرلیں مگر انھوں نے منظور نہیں کیا، جونپور کے اعاظم واکابر اور علماء ومشائخ ان سے عقیدت ومحبت رکھتے تھے، قاضی شہاب الدین دولت آبادی اکثر انکی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، قاضی صاحب نے حواشی کافیہ کا ایک نسخہ ان کے پاس بھجوایا کہ آپ کی نگاہ فیض ہوجائے تو یہ کتاب مقبول ہوسکتی ہے، انھوں نے ملاحظہ کے بعد فرمایا "کافیہ را زینت دادہ است" اور کافیہ کے شروع میں حمد وثنا نہ ہونے پر قاضی صاحب اور دیگر فضلا نے جو کچھ لکھا ہے اسے دیکھکر کہا کہ من نسخہ دیدم قدیم وکہنہ کہ دروے بودہ نوشتہ" ایک مرتبہ سلطان ابراہیم نے والی بنگالہ کے خلاف لشکر کشی کی اور قاضی شہاب الدین کو اپنا سفیر بنا کر اس کے پاس بھیجا، اس وقت شیخ محمد نے قاضی صاحب سے کہا کہ وہ سلطان کو سمجھائیں کہ اس تعدی سے باز آجائے، ایسے اقدام سے فقراء کے دل کو رنج ہوتا ہے، اور یہ اچھی بات نہیں ہے، اس سلسلہ میں قاضی صاحب کی طرف سے کچھ تلخ کلامی بھی ہوئی، شیخ محمد صاحب تصانیف عالم تھے، مولانا ابوالخیر نے تصریح

حسین عینی مبارک پوری متوفی ۱۳۴۷ھ نے اپنے خاندانی شجرہ میں شیخ بڈھہ کی جگہ شیخ بڑے اور قاضی منجھن کی جگہ راضی معین لکھا ہے، یہ شجرہ مطبوعہ ہے، بڈھہ اور بڑے میں صرف تلفظ کا فرق ہے، قاضی منجھن اور راضی معین میں یا تو تحریف ہوگئی ہے، اور نہ معین نام اور منجھن عرفیت ہوگی، بعض مآخذ میں راجی بھی ملتا ہے، ہمارے خیال میں قاضی ہے،

شیخ محمد بن خضر فاروقی جونپوری متوفی ۸۱۱ھ اور ان کے بعد کے افراد کے حالات میں مستند معلومات ملتی ہیں، اور ان ہی سے دیار پورب میں اس خانوادہ کی تاریخ شروع ہوتی ہے، ان سے پہلے کے سلسلہ نسب کے بارے میں وثوق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کہاں تک صحیح ہے اس میں کئی نام مجہول قسم کے معلوم ہوتے ہیں، مولانا ابوالخیر نے شیر وشکر میں اوپر کے بعض حضرات کے متعلق جو معلومات درج کی ہیں، ان کی حیثیت خاندانی روایت کی ہے، تجلی نور میں شیخ محمد بن خضر جونپوری متوفی ۸۱۱ھ کے حالات اور مناقب غوثی میں شاہ ابو الغوث گرم دیوان لہراوی متوفی ۱۱۰۷ھ کے خاندان .... کے حالات زیادہ تر شیر وشکر سے ماخوذ ہیں،

شیخ محمد بن خضر کی جونپور میں آمد مولانا شاہ ابوالخیر نے شیر وشکر کے تیسرے باب میں لکھا ہے کہ اس خانوادہ کے جد امجد شیخ خضر اور ان کے صاحبزادے شیخ محمد دہلی سے جونپور تشریف لائے، شیخ خضر نے حضرت شیخ ابو الفتح رکن الدین بن شیخ الاسلام زکریا ملتانی سے سلسلۂ سہروردیہ میں بیعت کرکے خلافت حاصل کی تھی، اور وہ اس سلسلہ کے مشائخ کبار میں شمار کئے جاتے تھے، بعد میں ملتان سے دہلی چلے آئے اور یہیں ان کے صاحبزادے شیخ محمد پیدا ہوئے، جو اپنے والد سے تعلیم وتربیت حاصل کرکے ان کی حیات ہی میں مرجع

گذر بسر کا انتظام کر دیا جائے مگر شیخ مشید اس کے لئے آمادہ نہ ہوتے تھے، جب سید اجمل کا اصرار بہت زیادہ بڑھا تو استخارہ کے بعد پرگنہ محمد آباد[1] میں ولید پور وغیرہ بارہ[2] قریات قبول کر لئے جہاں اس خانوادہ کے اکثر افراد آکر آباد ہو گئے مگر ان کا تعلق جونپور سے آخر تک قائم رہا، مولانا ابوالخیر کے الفاظ یہ ہیں" تا بجہت پاس خاطر سید اجمل بعد تقدیم استخارہ از ارواح بزرگان دوازدہ قریہ بجہت خرچ فقراء قبول فرمودند، و از آں جملہ قریہ ولید پور کہ امروز اکثر قبیلۂ ایشاں را آں جا توطن دارند، شمس الدین حیدری نے مناقب غوثی کے باب ہشتم میں لکھا ہے کہ شیخ محمد بن خضر کی وفات سے سلطان ابراہیم شاہ شرقی کو بہت زیادہ رنج ہوا، اور اس نے شیخ مشید کو یہ جاگیر عنایت کی "سلطان ابراہیم از تعزیت نہایت کوفتہ شد آخر الامر حضرت مشید را صدر و جانشین آں مسند محتشم گردانید بالجمال نیاز مندی در پرگنہ محمد آباد قریہ ولید پور با دیگر مواضع در وجہ معاش مقرر داشت[2]،

اس جاگیر کا تذکرہ اعظم گڈھ گزیٹیر میں بھی ہے، یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ بارہ مواضع کون کون سے تھے، البتہ یہ یقینی ہے کہ ولید پور اور بھیرا (سلطان پور) کے مغرب میں مبارکپور سے متصل لہراتک اس کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا، تجلی نور میں ہے، از اولاد حضرت شیخ محمود مواضع بھیرا و لہرا ضلع اعظم گڈھ سکونت پذیر است (ج ۱ ص ۴۸) چنانچہ شاہ ابوالغوث گرم دیوان متوفی ۱۱۸۰ھ نے (سلطان پور) بھیرا کا قیام ترک کر کے لہرا (وحدت آباد) میں سکونت اختیار کی اور یہاں خانقاہ و مدرسہ تعمیر کر کے درس و تدریس اور ذکر و شغل میں مشغول ہو گئے، اور یہیں فوت ہوئے، مولانا شاہ ابوالخیر نے لکھا ہے کہ اس شاہی جاگیر کی

---

[1] تیموری دور میں سرکار جونپور کے اکتالیس پرگنوں میں سو محمد آباد گوہنہ بھی ایک پرگنہ اور دارالقضا تھا، اعظم گڈھ سے مشرق میں تقریباً بارہ میل پر واقع ہے،
[2] مناقب غوثی باب ہشتم قلمی مملوکہ دارالمصنفین اعظم گڈھ،

کی ہے، "وحضرت مخدوم قدس سرہ را در ایام تحصیل وحین حیات پدر بزرگوار تصانیف وتوالیف بود در علوم دینیہ، وامروز اثرے ازان پیدا نیست"، ان کی وفات ۲ جمادی الاولیٰ ۱۱۸۰ھ میں جونپور میں ہوئی،

مخدوم شیخ محمد بن خضر کے دو لڑکے تھے، شیخ وجیہ الدین اور شیخ مشید، شیخ وجیہ الدین سے نسل نہیں چلی، شاہ ابو الخیر نے لکھا ہے کہ میں نے بعض مشائخ سے سنا ہے کہ بعض قصبات میں ان کی صاحبزادیوں کی اولاد موجود ہے، مخدوم شیخ مشید اپنے آبار کرام کے طریقہ پر زندگی بسر کرتے تھے، ظاہری علوم وکمالات کی تحصیل وتکمیل کے بعد اپنے پدر بزرگوار سے طریقت حاصل کی اور مسند ارشاد وتلقین پر متمکن ہوئے،

پرگنہ محمد آباد میں جاگیر اور توطن

سلطان ابراہیم شاہ شرقی[1] (۸۰۴ھ تا ۸۴۴ھ) آپ کے عقیدت مندوں اور نیاز مندوں میں تھا، میر صدر جہاں سید اجمل اور شیخ مشید دونوں بچپن کے یار غار اور ایک دوسرے کے غمخوار تھے، اور دونوں کے تعلقات نے برادرانہ حیثیت حاصل کر لی تھی[2]، میر صدر جہاں سید اجمل نے بارہا سلطان کی طرف سے اور خود اپنی طرف سے التماس کی کہ اگر بار خاطر نہ ہو تو فقرار اور واردین وصادرین کے اخراجات کے لئے کچھ جاگیر دیدی جائے اور متعلقین کے

---

[1] تیسرے تکملہ سے منقولہ عبارت میں سلطان حسین شاہ شرقی ۸۶۲ھ تا ۸۸۱ھ کا نام ہے، جو صحیح نہیں معلوم ہوتا ہے،

[2] خواجہ صدر جہاں سید اجمل علوم شریعت وطریقت کے جامع، ورع وتقویٰ میں بلند پایہ اور اپنے زمانہ کے نامور مشائخ میں سے تھے، ایک مرتبہ سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے دربار میں صدر جہاں سید اجمل اور قاضی شہاب الدین دولت آبادی میں آگے پیچھے بیٹھنے پر نوک جھونک ہو گئی تھی، اور قاضی صاحب نے سادات کے مقابلہ میں علماء کی افضلیت پر ایک کتاب لکھی تھی، سلطان ابراہیم خواجہ صدر جہاں سے بہت زیادہ عقیدت رکھتا تھا، ان کیلئے دریا کے کنارے نہایت خوبصورت مسجد بنوائی تھی، جو آج بھی جھجھری مسجد کے نام سے موجود ہے، سلطان ابراہیم کے ایک لڑکے کو ان کی خانقاہ کے قریب دفن کیا گیا۔ (تجلی نور ج ۱، ص ۵۰، اعظم المطابع جونپور ۱۸۸۹ء)

تھے، ایک شیخ ماہ، دوسرے قاضی مجھن، ان دونوں کے بچپن تک جاگیر کا انتظام شیخ بایزید ابن شیخ علی کے ذمہ رہا، ان کے بعد تمام املاک دونوں بھائیوں یعنی شیخ معروف اور شیخ علی کی اولاد میں تقسیم ہوگئی، شیخ ماہ کے دو صاحبزادے شیخ چاند اور شیخ عثمان تھے، شیخ چاند مدتوں خاندان کے رئیس و امیر رہے، ان کے ایک صاحبزادے شیخ بھیکہ اور تین صاحبزادیاں تھیں،

قاضی مجھن ملا محمود کے جد اعلیٰ جونپور میں عہد قضا پر فائز تھے اسلئے انکا قیام زیادہ تر جونپور ہی میں رہتا تھا، مولانا ابوالخیر نے تصریح کی ہے "شیخ قاضی مجھن مدتے بالزام حکام منصب قضائے جونپور رونقے دادند، وازیں جہت بیشتر اوقات در شہر جونپور بسر می بردند" [1]

قاضی مجھن کے صاحبزادے شیخ محمود ملا محمود کے پردادا ہیں، ان کے صاحبزادے شیخ بڈھو (بڑے) بڑی شان وشوکت اور عقل و دانش کے مالک تھے، شیخ بڑے کی شادی سید گھورن قاضی محمد آباد کی صاحبزادی سے ہوئی تھی، اور وہ مخدوم ابراہیم سے بیعت تھے، [2] مولانا ابوالخیر لکھتے ہیں "وے را آثار...... و بزرگواری و سرداری ہویدا بود" انھوں نے ولید پور میں انتقال کیا، ان کا مزار آج بھی وہاں کھجوروں کے جھنڈ میں ہے اور "بڑے صاحب" کے نام سے مشہور ہے، ان کے پانچ لڑکے تھے، شیخ محمد، شیخ مشید، شیخ قطب الدین، شیخ حافظ، اور شیخ عبدالحی، اور چار لڑکیاں تھیں،

یہی شیخ محمد بن شیخ بڑے ملا محمود کے والد ہیں، ان کے حالات مولانا ابوالخیر کی زبانی یہ ہیں،

شیخ محمد مکارم اخلاق، ہمت و خدمت اور مروت کے اوصاف سے متصف تھے، ایک	"شیخ محمد بہ صفات فاضلہ و مکارم اخلاق و علو ہمت و خدمت و فتوت متصف بود، مدتے

[1] شہر دلنگر سے منقولہ عبارت میں ہر جگہ راجی مجھن درج ہے اور بعض دوسری جگہ راضی بھی نظر آیا مگر ہم نے ہر جگہ "قاضی" لکھا ہے، [2] شیخ بڑے کس مخدوم ابراہیم کے مرید و خلیفہ تھے، اس کی تصریح نہیں ہے، ہمارے

(بقیہ ص ۳۴۰ پر)

نگرانی اور انتظام کے لیے چند ملازم رکھے تھے جو انکی آمدنی وصول کرتے تھے، ان میں دو ملازم سرخیل اور مرغوب نامی نے شیخ مشید کے نام و نسب کی آڑ میں اکثر مواضعات ان کے مالکوں سے چھین کر اپنے قبضہ میں کر لئے اور بڑے کروفر کی زندگی بسر کرنے لگے، البتہ اجناس اور غلہ جات وغیرہ سال بہ سال جونپور کی خانقاہ روانہ کرتے رہے شیخ مشید کو ملازموں پر اعتماد تھا، وہ دینی مصروفیات کی وجہ سے اس صورت حال سے بالکل بے خبر تھے، ان کو اس کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہیں ملی تھی، اسی دوران میں میر صدر جہاں سید اجمل سلطان ابراہیم شاہ شرقی[1] کی طرف سے بنگالہ کی سفارت پر گئے تھے، واپسی میں جب ان مواضعات سے گذرے تو ان کو ان حالات کا علم ہوا انھوں نے جونپور پہونچکر شیخ مشید سے اس کو بیان کیا اس کے بعد شیخ مشید کے دونوں صاحبزادے شیخ معروف اور شیخ علی ایک جماعت کے ساتھ یہاں آئے اور زمینداری کے جملہ انتظامات کو اپنے ہاتھ میں لے لیا مولانا ابوالخیر نے لکھا ہے "بفرمودن امیر مذکور حضرت شمس العلماء زبدۃ الاتقیاء مخدوم شیخ معروف کہ اکبر الاولاد مخدوم بودند با جماعت صوفیاں بقریہ مذکورہ آمدند، آنہا مواضعات مخدوم رسی نمودند، مدتے بریں بگذشت سال دیگر برادر خورد تر مخدوم شیخ علی ہم باشارۂ میر مذکور آمدند، و بتدریج املاک و مواضع بستند، بعد وفات شیخ مشید سکونت دریں قریہ اختیار افتاد"

ملا صاحب کے قریبی آباء و اجداد

شیخ مشید نے جونپور میں انتقال کیا اور ان کے دونوں لڑکے شیخ معروف اور شیخ علی قریہ ولید پور کے قریب سلطان پور کے نام سے ایک بستی آباد کر کے اس میں سکونت پذیر ہوئے، شیخ علی کے کئی اولادیں تھیں، ان کے چھوٹے صاحبزادے شیخ بایزید جاگیر اور زمینداری کے نگران و منصرم تھے، اور شیخ معروف جو قطب وقت اور صاحب ولایت تھے، اپنے والد شیخ مشید کے جانشین بنے، ان کے صاحبزادے شیخ چاند نے اپنے آباء و اجداد کے طریقہ پر ظاہری اور باطنی علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل کی تھی، ان کے دو صاحبزادے

---

[1] اس جگہ بھی شرح تذکرے منقولہ عبارت میں سلطان حسین شاہ شرقی ہے،

ملا صاحب کے جد مادری شیخ شاہ محمد | ملا صاحب باپ کی طرف سے فاروقی اور ماں کی طرف سے عثمانی تھے صحیح معنوں میں نجیب الطرفین اور لائیں سی ائی جانبہ اطول کے مصداق تھے، ان کے نانا شیخ شاہ محمد بن شیخ سلطان محمود عثمانی تھے، ملا صاحب نے ادب و عربیت کی تعلیم ان ہی سے حاصل کی تھی، مولانا ابوالخیر کا بیان ہے،

والدۂ ماجدۂ آنحضرت دختر شیخ العصر البحر	ملا محمود کی والدہ ماجدہ شیخ العصر البحر مدقق،
المدقق العلامۃ المحقق شیخ شاہ محمد بن شیخ	علامہ محقق شیخ شاہ محمد بن شیخ المشائخ قطب
المشائخ قطب الآفاق مخدوم شیخ محمود است	الآفاق مخدوم شیخ محمود ہیں جن کو سلطان
و شیخ محمود را سلطان محمود می خوانند کہ	محمود کہتے ہیں، وہ شیخ مبارک خیری اور
خلیفہ شیخ مبارک خیری و خلیفہ حضرت	میر علی عاشقان سر آمیری کے خلیفہ تھے، میں
عاشقان سید میر علی قوام است، و فقیر	ان کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، علوم و
خدمت شاہ محمد کردہ ام، و در فنون و	فنون میں یگانہ تھے، اور محاسن اخلاق
علوم یگانہ وقت، و در مکارم اخلاق و	حلم وحیا، مروت، وقار، اور تواضع سے
حلم وحیا و مروت و وقار، تواضع و ایثار	متصف تھے،
کار فرمود،	

اس کے بعد لکھا ہے کہ ان کے رگ و ریشہ میں اہل بیت رسول کی محبت اسطرح سرایت تھی کہ دن میں کئی بار ان کے ذکر سے آنکھیں نم ہو جاتی تھیں، اہلبیت سے غایت محبت و عقیدت کی بنا پر کچھ لوگ ان کی نسبت رفض و تشیع کی طرف کرتے تھے، ۱۰۳۲ھ میں ان کا انتقال ہوا، تذکرۂ علمائے ہند میں ان کا مختصر حال ہے کہ شیخ شاہ محمد فاروقی اکابر علمائے جونپور میں سے ہیں، ورع و تقویٰ سے متصف اور افادہ و درس میں مصروف تھے، ملا محمود جونپوری انکے

از بہر اعانتِ مومناں و رعایتِ خویشاں صحبت
سلوک اختیار کرد، و آخریں عتبۂ عزلت اختیار
کرد و در سنۃ یکہزار و بست و ہفت و دویم
ربیع الاول بجوار الٰہی ارتحال کرد، و ایشان
را حق سبحانہ بمزید کرم فرزندے کرامت فرمود
کہ یگانۂ انفس و آفاق و آفتاب مکارم اخلاق
است فرزند حال او را دفترے جداگانہ می
بایست کہ بعضے ازاں نوشتہ آید درا اجمال
ایں احوال آنکہ ہو الامام الاعظم الخ

زمانہ تک مسلمانوں کی اعانت اور خویش و
اقربار کی رعایت کی خاطر روکھی پھیکی زندگی
بسر کی اور آخر میں گوشہ نشین ہو گئے ۲ ربیع
الاول ۱۰۲۷ھ میں فوت ہوئے، ان کو
اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل و کرم سے ایک
ایسا فرزند عنایت فرمایا جو یکتائے زمانہ اور
بے مثال اور حسن اخلاق کا آفتاب ہے، اس کے
مختصر حالات لکھنے کے لئے الگ سے دفتر کی ضرورت
ہے مختصر یہ ہے کہ وہ ...... شیخ محمود ہے۔

ہم نے ملا صاحب کے آباء و اجداد کے ذکر میں اس لئے تفصیل سے کام لیا ہے کہ ان کے حالات
بہت کم ملتے ہیں،

صفحہ ۳۳۹ کا حاشیہ:- خیال ہے یہ بزرگ راجہ سید ابراہیم بن راجہ سید عبدالحق بن راجہ سید سلیمان
بن راجہ سید بندگی (شیخ مجتبیٰ) بن راجہ سید مبارک ہیں، مانک پور کے راجگان چشت راجہ سید حامد
شاہ مانک پوری کے زمانہ سے دیار پورب میں آتے جاتے تھے، اور ان کے فیوض و برکات یہاں
عام ہوئے، آئینہ اودھ میں ہے کہ راجہ سید ابراہیم کے خدام جنات تھے، (ص ۲۸۲)
اسی خانوادہ میں بعد میں ایک اور بزرگ راجہ سید ابراہیم ثانی بن راجہ سید میراں جی بن راجہ
سید ابراہیم بن راجہ سید عبدالحق گذرے ہیں، راجہ سید غلام معین الدین عرف راجہ دانی
متوفی ۱۱۳۰ھ ان کے مرید و خلیفہ تھے، مناقب عوثی میں ان کو حضرت حجۃ العارفین ملاذ
السالکین راجی سید ابراہیم قدس سرہ کے القاب سے یاد کیا گیا ہے، غالباً یہی راجہ ابراہیم ثانی موضع
ابراہیم پور کے بانی ہیں، جب کہ راجہ دانی کے بھائی راجہ سید خیر اللہ شاہ خیرآباد کے بانی ہیں،
اور ان کے پوتے موضع علی راجہ سید مبارک شاہ مبارک پور کے بانی ہیں، ایک اور بزرگ شیخ مخدوم ابراہیم
دانشمند بن شیخ اسمٰعیل کلاں ہیں جن کا مزار محمد آباد کے علاقہ گھرانی میں ہے، مگر یہ اکبری دور سے تعلق رکھتے
ہیں (مرآۃ الاسرار)

فن توشیح

از
ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صاحب، ریڈر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی،

توشیح عربی شاعری کی ایک مخصوص صنعت ہے، جس کا ظہور اندلس میں غنا وموسیقی کے عوامی ماحول کے اثر سے نویں صدی عیسوی کے اواخر میں ہوا اور جو شاعری اس صنعت سے آراستہ ہوئی اس کو موشح کا لقب ملا، یہ عربی شاعری کی ایک ایسی صنف ہے جس میں مختلف قوانی ایک خاص ترتیب کے ساتھ بار بار آتے ہیں اور کبھی کبھی اس کا وزن بھی عام روایتی اوزان سے مختلف ہوتا ہے، نیز اس کے بعض اجزاء میں عجمی اور عوامی زبان کا استعمال کیا گیا ہے اور غنا سے اس کا بہت گہرا تعلق ہے،

موشح عربی شاعری کا ایک خوشنما گلدستہ ہے جسے اہل اندلس نے مقامی پھول پتیوں سے سجایا ہے اور اس فن میں اہل مشرق نے ان کی شاگردی کی ہے. ابن دحیہ کے الفاظ میں یہ شاعری کا مکھن، اس کے جوہر کا خلاصہ اور اس کا انتخاب ہے اور اس فن میں اہل مغرب اہل مشرق سے بہت آگے نکل گئے ہیں، اس میں وہ درخشندہ آفتاب اور روشن ستارہ کی طرح نمایاں اور ممتاز ہیں[1].

---

[1] المطرب من أشعار أهل المغرب، قاهره، ۱۹۵۴ء، ص: ۲۰۴،

فرماتے تھے، ۱۰۲۳ھ میں وفات پائی۔ [1]

شیخ شاہ محمد کے دادا مفتی حمزہ عثمانی علاقہ مازندران کے شہر دماوند کے رہنے والے تھے، وہاں سے ہجرت کرکے ہندوستان کی خاک چھانتے ہوئے قصبہ رودولی پہونچے، یہ سلاطین شرقیہ جونپور کا دور تھا، ہر طرف علم و علماء کی چہل پہل تھی، اس لئے یہیں فروکش ہوگئے، اور رودولی ہی میں ان کے صاحبزادے ملا محمد افضل اور سلطان محمود پیدا ہوئے، شیخ سلطان محمود سن رشد کو پہونچکر اپنے بڑے بھائی استاذ الملک ملا محمد افضل کے ساتھ جونپور تشریف لائے اور محلہ سپاہ میں قیام پذیر ہوئے، اسی محلہ میں شیخ مبارک خیری متوفی ۱۶ شوال ۹۸۳ھ اپنے مرشد حضرت میر علی عاشقان بن قوام الدین سرائے میری متوفی ۹۵۰ھ کے حکم سے خانقاہ بنا کر تعلیم و تدریس اور ارشاد و تلقین میں مشغول تھے، شیخ سلطان محمود کی شادی ان کی صاحبزادی سے ہوئی اور انھوں نے اپنے بھائی ملا محمد افضل سے علوم ظاہری کی تحصیل و تکمیل اور اپنے خسر شیخ مبارک خیری سے بیعت کی اور تھوڑی ہی مدت میں سلوک و معرفت کی تمام منزلیں طے کرلیں، میر علی عاشقان سے بھی فیوض و برکات حاصل کئے اس سونے پر سہاگہ سے ان کی شخصیت بڑی پرکشش ہوگئی اور ان کی ذات سے خلق اللہ کو بڑا فیض پہونچا، جونپور میں وفات پائی، محلہ چاچک پور میں ان کا مزار ہے، [2] ان کی اولاد جونپور، الہ آباد، کوڑہ جہان آباد میں پھیلی، ان ہی کے صاحبزادے شیخ شاہ محمد ملا صاحب کے نانا اور استاد اور ان کے بڑے والد ملا محمد افضل ملا صاحب کے شیخ الکل ہیں،

(باقی)

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۴۸، [2] تجلی نور ج ۱ ص ۸۷-۷۷،

متعلق جو بھی کتاب، مقالہ یا مخطوطہ مجھے ہاتھ آیا میں نے اس کا مطالعہ کیا لیکن اب تک اطمینان بخش نتائج تک میں نہیں پہنچ سکا، میں اب بھی یہی سمجھتا ہوں کہ یہ میدان نیا اور اچھوتا ہے اور اس کے متعلق کسی امر میں کوئی قطعی فیصلہ کرنا ایک بے تکی بات ہے جو خطرہ سے خالی نہیں ہے"[1]

یہ خیال صرف پروفیسر گب کا ہی نہیں ہے بلکہ بہت سے علمائے ادب جنھوں نے موشحات کا مطالعہ کیا ہے اسی خیال کے حامل ہیں، بہرحال اس بات پر تو تمام ادبا و مورخین کا اتفاق ہے کہ فن توشیح کے مخترع اہل اندلس ہیں۔ مگر کن اسباب کے تحت یہ فن وجود میں آیا، اس بارے میں ان کی رائیں مختلف ہیں، بعض علما کے نزدیک موشح کی اصل خالص عربی ہے وہ اسے مسمّط کی ارتقائی شکل قرار دیتے ہیں نکل اور رتشوتی ضیف بھی اسی خیال کے حامی ہیں[2]، اس میں شک نہیں کہ عہد عباسی کے دور اوّل ہی میں مشرقی شعرانے قافیہ بندی کے نئے نئے طریقے ایجاد کئے تھے، خاص طور پر مسمّط کی مختلف صورتیں کافی معروف تھیں جس میں کئی بند ہوتے تھے اور ہر بند متعدد مصرعوں پر مشتمل ہوتا تھا، بند کے آخری مصرعہ کے علاوہ تمام مصرعے ہم قافیہ ہوتے تھے، اور ہر بند کے ابتدائی مصرعوں میں نئے نئے قوافی استعمال کئے جاتے تھے، لیکن آخری مصرعہ میں شروع سے آخر تک ایک ہی قافیہ کی پابندی کی جاتی تھی، اس طرح مسمّط قافیہ بندی اور ہیئت کے اعتبار سے موشح سے کافی مشابہ معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر موشح کے مخترعین نے قافیہ سازی میں مسمّط سے استفادہ کیا ہو تو کچھ مستبعد نہیں ہے۔

---

[1] مصطفیٰ عوض الکریم: فن التوشیح، بیروت ۱۹۵۹ء، ص: ۱۰

[2] فن التوشیح ص: ۸۰ اور ص: ۱۰۹

موشح کا لفظ وشاح سے ماخوذ ہے، وشاح چمڑے کے اس تسمہ کو کہتے ہیں جو جواہرات سے مرصع ہو، عرب کی قدیم عورتیں اسے ہار کے طور پر استعمال کرتی تھیں، مشہور جاہلی شاعر امرؤ القیس نے اپنے معلقہ میں کہا ہے،

تجاوزت أحراسا إليها ومعشرا علیّ حراصا لو یسرّون مقتلی

إذا ما الثریا فی السماء تعرضت تعرض أثناء الوشاح المفصل

"میں محبوبہ کے پاس ان نگہبانوں کے درمیان سے گذر کر پہنچا جو میرے قتل کو اگر چھپا سکتے تو مجھے قتل کرنے میں ذرا بھی تامل نہ کرتے، جب کہ ثریا آسمان میں اسطرح [illegible] تھی جیسے وہ ہار جس میں مختلف رنگ کے جواہرات جڑے ہوں"

پھر اسی لفظ وشاح سے مصدر توشیح بنایا گیا جس کے معنی آراستہ کرنے اور سجانے کے ہیں، جیسا کہ چوتھی صدی ہجری کا ایک شاعر اپنے قصیدہ کے متعلق کہتا ہے۔[1]

وهذی القصیدة مثل العروس موشحة بالمعانی الملاح

(یہ قصیدہ دلہن کی طرح عمدہ معانی سے آراستہ ہے۔)

غرض یہ نظم مختلف اجزا و قوافی سے اسطرح آراستہ ہوتی ہے جیسے وہ ہار جو مختلف جواہرات سے مرصع ہو، اسی لئے اس کو موشح اور اس کے ناظم کو وشاح کہا جاتا ہے۔

اسباب وعوامل | موشح کو وجود میں لانے میں کن اسباب و عوامل کا ہاتھ ہے، اس کی اصل کیا ہے اور کس طرح اس کی ابتدا ہوئی، یہ ایسے سوالات ہیں جن کا کوئی قطعی جواب نہیں دیا جا سکتا، چنانچہ پروفیسر گب نے بھی ایک موقع پر کہا تھا کہ اندلسی موشحات کا مطالعہ کرتے ہوئے چوتھائی صدی سے زیادہ زمانہ گذر گیا اور اس عرصہ میں اس سے

---

[1] ثعالبی: یتیمة الدهر، دمشق، ۱۳۰۲ھ ج: ۲، ص: ۲۱۴

کی ضرورت ہوتی تھی جو مختلف الحان میں ہوتے تھے۔ اسی مشابہت کی بنا پر فواد رجائی نے بھی اسی خیال کی تائید کی ہے[1]۔

لیکن ڈاکٹر مصطفیٰ عوض الکریم کہتے[2] ہیں کہ اس سلسلے میں بہت سے حیران کن سوالات کا تشفی بخش جواب اسی وقت ممکن ہے جبکہ اس نظریہ کو تسلیم کر لیا جائے کہ موشحات عجمی غنائی شاعری کی تقلید میں وضع کئے گئے ہیں۔ متعدد مستشرقین نے بھی اسی نظریہ کی حمایت کی ہے۔ اس مسئلہ میں وہ اس طرح استدلال کرتے ہیں کہ موشح مشرقی شاعری کے اصناف مسمط اور مخمس وغیرہ سے بالکل مختلف ہے۔ وہ محض غنا کے مقصد کے لئے اختراع کیا گیا ہے، اور اس کے جدید اوزان جن سے مشرقی شاعری نا آشنا تھی خود اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ عجمی اوزان سے ماخوذ ہیں۔ مزید برآں موشحہ کا آخری جز جو خرجہ کہلاتا ہے، اور عجمی بھی ہو سکتا ہے وہی موشح اور اس عجمی غنائی شاعری کے درمیان ایک کڑی ہے۔ پس اغلب یہی ہے کہ اندلس کے کچھ عرب شعرا نے وہاں ایک ایسی عجمی غنائی شاعری سنی جس کے نغمہ ولحن سے ان کے قلوب بہت متاثر ہوئے۔ لہذا انھوں نے اسی انداز پہ عربی میں شاعری کی ابتدا کی اور اس طرح موشح کا وجود عمل میں آیا، اور یہ کام صرف اندلس کے عرب شعرا ہی نے نہیں کیا بلکہ وہاں کے یہودی شعرا نے بھی عربی زبان میں ایسی نظمیں کہی ہیں جو عربی موشحات سے بہت مشابہ ہیں اور کہیں کہیں جو خرجہ عربی موشحہ میں پایا جاتا ہے بعینہ وہی خرجہ عربی نظم کے اندر بھی مل جاتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خرجات درحقیقت چھوٹے چھوٹے عجمی گیت تھے جن پر تضمین کر کے شاعروں نے اپنے موشحات مرتب کئے ہیں۔

---

[1] فن التوشیح، ص: ۸۸، [2] فن التوشیح، ص: ۱۰۷ و مابعد۔

اس سلسلے میں دوسری رائے یہ ہے کہ اندلس میں مشرقی طرزِ غنا کو جو ترقی ہوئی اس کے اثر سے موشح کا ظہور ہوا، مشرق میں خلافت راشدہ کے بعد ہی سے غنا و موسیقی کا رواج بڑھنے لگا تھا، چنانچہ اموی دور میں عرب مغنیوں نے فارسی اور رومی الحان بھی سیکھ لئے اور ان کے باہمی اختلاط سے مزید نئے نئے الحان ایجاد کئے جو بہت مقبول ہوئے، عہد عباسی کے اوائل میں خلفاء و امراء نے غنا و موسیقی کی سرپرستی کی جس کا اثر عربی شاعری پر بھی پڑا، ابو نواس (م: ۸۱۴ء) اور ابو العتاہیہ (م: ۸۲۷ء) وغیرہ نے جدید اوزان اور عجمی الحان میں اشعار نظم کئے جن کو مجالس عیش و طرب میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی،

ان باتوں کا اہل اندلس پر اثر پڑنا لازمی تھا، خوشحالی، دولت کی فراوانی اور ماحول کے اثر سے اندلس کے عرب جلد ہی غنا و موسیقی کی طرف مائل ہو گئے تھے، اندلس کی کشش مشرق کے مغنیوں کو بھی وہاں کھینچ لے گئی، مشہور عرب مغنی ابراہیم موصلی (م: ۸۰۴ء) کے ایک شاگرد علی بن نافع زریاب نے اندلس میں غنا کا ایک مدرسہ قائم کیا، اور اس نے عود کے تاروں میں پانچویں تار کا اضافہ کر کے نئے نئے راگ ایجاد کئے[1]، ابتدا میں غنا و موسیقی کی مجلسیں اندلسی امرا کے محلوں میں قائم ہوتی تھیں لیکن جلد ہی اس کا اثر گلی کوچوں اور بازاروں تک پھیل گیا، چنانچہ تاریخ و تذکرہ کی کتابیں ان مجالس کے ذکر سے بھری ہوئی ہیں، اس لئے بعض علماء کا خیال ہے کہ اندلس میں غنا و موسیقی کا یہی ارتقاء اور بالخصوص زریاب کا طریقۂ غنا موشح کے وجود کا باعث ہوا، کیونکہ جس طرح موشح میں وزن و قافیہ کے اعتبار سے مختلف اجزاء ہوتے ہیں اسی طرح اس طرزِ غنا میں بھی متعدد غنائی قطعات

---

[1] مقری: نفح الطیب، مصر ۱۹۴۹ء، ج: ۴، ص: ۱۱۲-۱۲۹،

کیا ہے کہ فن توشیح مغرب کی ایجاد ہے اور ان کی اس مفاخرت سے اہل مشرق نے کوئی تعرض نہیں کیا بلکہ پوری فراخدلی کے ساتھ ان کی افضلیت و برتری کا اعتراف کیا ہے۔ پس یہ حقیقت بھی اس بات کا ثبوت بہم پہنچاتی ہے کہ موشح کی اصل، روایتی عربی شاعری یا مشرقی غنا کے اندر نہیں ہے بلکہ کہیں اور ہے،

موشح کی عجمی الاصل ہونے کے لئے یہ بات بھی بطور دلیل کے پیش کی جاتی ہے کہ جو مورخین و علماء مشرقی شاعری اور ہر اس چیز کے دلدادہ تھے جس کی اصل مشرقی ہو انھوں نے موشح کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا بلکہ اسے حقیر اور کمتر درجہ کی چیز خیال کیا اور اسی لئے اپنی تصنیفات میں اس کو جگہ نہیں دی چنانچہ ابن عبدربہ (م: ۹۴۰ء) کی مشہور مبسوط کتاب "العقد الفرید" موشح کے ذکر سے بالکل خاموش ہے۔ متعدد جلدوں کی اس ضخیم کتاب میں اس کی طرف کوئی ہلکا سا اشارہ بھی نہیں ملتا حالانکہ بعض علمائے ابن عبدربہ کو نہ صرف موشح کے مخترعین میں شمار کیا ہے بلکہ اس کو اس فن سے دلچسپی رکھنے والا بتایا ہے، چنانچہ اسی بناء پر ڈاکٹر مصطفیٰ عوض الکریم نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے[1] کہ شاید جس ابن عبدربہ کو بعض علما نے موشح کا موجد قرار دیا ہے وہ العقد الفرید کا مصنف احمد بن محمد بن عبدربہ نہیں ہے بلکہ اس کا بھتیجا سعید ابن عبدالرحمن بن محمد بن عبدربہ ہے،

ابن بسام (م: ۱۱۴۷ء) نے بھی اپنی مشہور کتاب "الذخیرة" میں موشحات کو شامل نہیں کیا حالانکہ اس نے ان کے وجد آفریں الحان کی تعریف کی ہے۔ اس کا عذر اس نے یہ پیش کیا ہے کہ موشحات اس تصنیف سے خارج ہیں کیونکہ وہ عربی شاعری کے اوزان پر نہیں ہیں[2]۔ فتح بن خاقان (م: ۱۱۳۴ء) تو ابن بسام سے بھی زیادہ موشح کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے،

---

[1] فن التوشیح، ص ۱۱۲۔ [2] الذخیرة، قاہرہ، ۱۹۴۲ء، ج: ۲، ص: ۲

اس کے علاوہ اگر موشح مشرقی مسمط کی ارتقائی شکل ہوتا جیسا کہ بعض علما کا خیال ہے تو اس کا ظہور مشرق ہی میں ہونا چاہیئے تھا نہ کہ اندلس میں۔ اور اگر کسی وجہ سے ایسا نہیں ہو سکا تھا تو کم از کم بعد میں جب اہل مشرق نے اندلسی وشاحوں کی تقلید میں موشح کہنا شروع کیا تھا تو اس میں ان کو کچھ تکلف نہ ہونا چاہیئے تھا، ایسی صورت میں وہ اس فن میں نہ صرف اندلسی وشاحوں کا مقابلہ کر لیتے بلکہ ان سے سبقت لے جاتے، مگر حقیقت یہ ہے کہ مشرقی شعرا کے موشحات میں تکلف و تصنع بہت پایا جاتا ہے۔ وہ اس فن کی تقلید میں اندلسی وشاحوں کے شاگرد رشید بھی نہ بن سکے، چنانچہ ابن خلدون کہتا ہے[1] کہ مشرقی شعرا نے جو موشحات لکھے ہیں ان کے اندر تکلف نمایاں طور سے پایا جاتا ہے، اس کے نزدیک ان کے بہترین موشحات میں صرف ابن سناء الملک مصری کا ایک موشحہ ایسا ہے جو تکلف سے خالی اور کافی مشہور ہے، ابن سناء الملک نے خود اعتراف کیا ہے کہ اس کے موشحات اندلسی موشحات کے مقابلہ میں ناقص ہیں، کیونکہ اس کو اندلسی ماحول میسر نہیں ہوا اور موشح نگاری میں وہی شاعر کامیاب ہو سکتا ہے جس نے اندلس کے مخصوص ماحول میں زندگی گذاری ہو۔[2]

اسی طرح اگر موشح اس مشرقی غنا کے اثر سے وجود میں آیا ہوتا جو زریاب اور اس کے تلامذہ کی کوشش سے اندلس میں کافی رائج تھا تو اس صورت میں بھی اہل مشرق کو موشحات نظم کرنے میں کوئی تکلف نہ ہوتا اور وہ با آسانی اندلسی وشاحوں کی تقلید میں خود عمدہ موشحات نظم کر لیتے، نیز یہ کہ پھر موشحات ابتدا میں عوامی طبقات تک ہی محدود نہ رہتے بلکہ امرا و روسا کے محلوں میں بھی موجود ہوتے جہاں مشرقی غنا کا بول بالا تھا۔

مزید برآں اندلسی مورخین نے جا بجا مشرق کے مقابلہ میں بڑے فخر کیا تھا اس کا ذکر

---

[1] مقدمہ ابن خلدون، مصر ۱۳۲۲ھ، ص: ۵۹۴، [2] فن التوشیح، ص ۱۰۷،

مختلف ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عجمی شاعری تحریری شکل میں موجود نہیں تھی بلکہ اس کی نقل زبانی کی جاتی تھی، پس اس سلسلے میں بھی کوئی قطعی بات اس وقت تک نہیں کہی جا سکتی جب تک کہ اس شاعری کے نمونے دستیاب نہ ہوں، بہر حال گمان غالب یہی ہے کہ موشح نگاروں نے محض اس کی تقلید ہی پر اکتفا نہ کی ہوگی بلکہ قافیہ سازی، صنعت کاری اور خیال آرائی کے لحاظ سے اس کے اندر انھوں نے بہت سی جدتیں بھی پیدا کی ہونگی، تب جاکر ان کے لئے یہ ممکن ہو سکا کہ انھوں نے اس فن کو عوامی سطح سے بلند کرکے اعلیٰ ادب کے مرتبہ تک پہنچا دیا۔

موجد و مخترع موشح کی ابتدا کب ہوئی اور اس کا مخترع کون ہے اس بارے میں بھی مورخین مختلف الخیال ہیں، ابن بسام کے نزدیک اس فن کا موجد قبرہ کا ایک نابینا شاعر محمد بن محمود قبری ہے[1]، مقری کی ایک روایت کے مطابق اس کا مخترع مقدم بن معافی قبری قرار پاتا ہے[2]، جو امیر عبد اللہ بن محمد مروانی (دور حکومت: ۸۸۸ - ۹۱۲ء) کے شعراء میں تھا، ابن سعید المغربی سے سیوطی نے نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے جس نے موشحات نظم کئے وہ ابو عمر احمد بن عبد ربہ (م: ۹۴۰ء) ہے، لیکن ابن خلدون کا بیان ہے کہ ابن عبد ربہ نے یہ فن مقدم ہی سے حاصل کیا ہے[3]، بہر حال یہ ضروری نہیں کہ اس فن کا موجد کسی ایک ہی شخص کو قرار دیا جائے، بہت ممکن ہے کہ جب اس کے لئے حالات سازگار ہوگئے ہوں تو اول کے طور سے متعدد شعراء نے اس میں طبع آزمائی شروع کی ہو، البتہ ان بیانات سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ نویں صدی عیسوی کے اواخر میں اس کی بنیاد پڑ گئی تھی۔

---

[1] الذخیرہ، قسم اول، ج: ۲، ص: ۱، [2] ازہار الریاض، ج: ۲، ص: ۲۵۳،

[3] مقدمہ ابن خلدون، ص: ۵۸۸،

اگرچہ اس نے اپنی تصنیفات "قلائد العقیان" اور "مطمح الانفس" میں بہت سے ایسے شعرا کا ذکر کیا ہے جو موشحات نظم کرتے تھے لیکن اس نے صرف ان کے روایتی قصائد ہی کو اپنی کتابوں میں درج کیا ہے، ایک موقع پر تو اس نے ایک موشح نگار کے متعلق یہ لکھا ہے کہ وہ عمدہ چیز کو چھوڑ کر ایک ردّی چیز کی طرف مائل ہو گیا ہے اور میری کتاب ایسی نہیں ہے کہ میں اس کی فضولیات کو اس میں شامل کروں[1]۔ عبد الواحد مراکشی (م: ۶۱۲۲۴) نے اپنی کتاب "المعجب" میں موشحات کو شامل نہ کرنے کی وضاحت کی ہے کہ عام طور پر مصنفین ان کو اپنی تصنیفات میں شامل نہیں کرتے[2]۔ مقری (م: ۶۱۶۳۳) نے اگرچہ اپنی تالیفات "نفح الطیب" اور "ازہار الریاض" میں کافی تعداد میں موشحات کو نقل کیا ہے لیکن وہ ان کو ہزل قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ زیادہ مناسب تو یہی تھا کہ انکو حذف کر دیا جاتا لیکن یہ ان کو شامل کر لیا گیا ہے کہ علما کی کتابوں میں اس قسم کی باتیں اکثر پائی جاتی ہیں جن کو تفریح قلب اور تفنن طبع کے طور پر بیان کر دیا کرتے ہیں[3]۔

اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ روایتی عربی شاعری کے شائقین موشحات کو غیر سمجھتے تھے کیونکہ وہ ان کے نزدیک عجمی الاصل تھے۔

مذکورہ حقائق کے پیش نظر یہی بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ موشح کسی عجمی غنائی شاعری سے نکلا ہے لیکن وہ عجمی شاعری کیا تھی، اندلس کے کسی علاقہ اور کس طبقہ میں رائج تھی اور اندلسی وشاحوں نے اس کی کہاں تک تقلید کی ہے اس بارے میں علما کی رائیں

[1] مطمح الانفس، قسطنطینیہ، ۱۳۰۲ھ، ص: ۸۸

[2] المعجب فی تلخیص أخبار المغرب، قاہرہ، ۱۹۴۹ء، ص: ۹۲

[3] أزہار الریاض، قاہرہ، ۱۹۴۲ء، ج: ۲، ص: ۲۲۷،

دیگر شاعروں میں ابن اللبانہ، محمد بن ارفع راسہ، ابو عامر بن الفرج اور معتصم بن صمادح حاکم مریہ کی بیٹی ام الکرام کا شمار ہوتا ہے۔

ابھی تک جن شعرا نے موشح کی طرف توجہ کی تھی وہ سب، عبادی کے سوا دوسرے اور تیسرے درجہ کے شاعر تھے، اعلیٰ درجہ کے شعرا عام طور پر اس سے اجتناب کرتے تھے مثال کے طور پر ابن ہانی (م: ۹۷۳ء)، ابن دراج (م: ۱۰۳۰ء) اور ابن زیدون (م: ۱۰۷۱ء) نے کوئی موشحہ نہیں لکھا، یہ سب قصیدہ گوئی کیطرف مائل تھے اور موشح کو ادنیٰ درجہ کی چیز سمجھکر منہ نہیں لگاتے تھے۔

لیکن جیسے ہی مرابطین کا زمانہ (۱۰۹۵ء - ۱۱۴۹ء) آیا متعدد اعلیٰ درجہ کے شعرا نے بھی موشح لکھنا شروع کر دیا، جن میں ایک نابینا شاعر ابو العباس الاعمیٰ تطیلی کا نام سر فہرست ہے۔ موشح نگاری میں الاعمیٰ کے مرتبہ کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک بار اشبیلیہ کے ایک جلسہ میں موشح نگاروں کی ایک جماعت شریک ہوئی جس میں قرطبہ کا ایک مشہور وشاح ابن بقی (م: ۱۱۴۵ء) بھی موجود تھا، جلسہ میں سنانے کیلئے ہر وشاح نے بہتر سے بہتر موشحہ تیار کیا تھا، الاعمیٰ نے ابتدا کی اور اپنا موشحہ سنانا شروع کیا، ابھی اس نے مطلع ہی پڑھا تھا کہ ابن بقی نے اپنا موشحہ پھاڑ ڈالا اور اس کی تقلید میں دوسرے موشح نگاروں نے بھی ایسا ہی کیا۔[۱] الاعمیٰ کے اس موشحہ کا مطلع یہ ہے:-

ضاحك عن جمان ـــــ سافر عن بدر

ضاق عنه الزمان ـــــ وحواه صدري

(وہ ہنستا ہے تو موتی چمکنے لگتے ہیں، نقاب اٹھاتا ہے تو چاند نکل آتا ہے۔ زمانہ اس کے لئے تنگ ہے اور میرے سینہ میں وہ سمایا ہوا ہے)

---

[۱] مقدمہ ابن خلدون ص ۵۸۸۔

لیکن ان ابتدائی تجربوں کے کچھ آثار نہیں ملتے جن سے ان کی نوعیت کے متعلق کچھ اندازہ لگایا جا سکے، محمد بن حمود اور مقدم بن معافی تو غیر معروف اشخاص ہیں لیکن ابن عبدربہ جو ایک مشہور عالم، ادیب اور مصنف ہے اس کے موشحات کے نمونے بھی کہیں نہیں ملتے، اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ابتدا میں موشح کی حیثیت ایک سماعی فن کی سی تھی، جس کو محض تفریح طبع کے لئے نظم کیا جاتا تھا۔ لوگ اسے سنتے تھے اور محظوظ ہوتے تھے لیکن اسے کتابوں میں درج نہیں کرتے تھے، کیونکہ وہ اسے مبتذل اور عوامی چیز خیال کرتے تھے، اس لحاظ سے اس کی حیثیت غالباً وہی رہی ہوگی جو آجکل اردو میں ہزل گوئی کی ہے،

اس کے بعد ایک قرطبی شاعر یوسف بن ہارون رمادی (م: ۱۰۱۲ء) اس فن کیطرف متوجہ ہوا اور اس کے ارتقا میں اس نے بڑا حصہ لیا، اس سے قبل موشح کے اجزا بسیط اور مفرد ہوتے تھے، رمادی نے ان کے مرکزی اجزا کو مرکب اور متنوع بنا دیا[1]، پھر یہ فن ترقی کے منازل طے کرتا ہوا عبادۃ بن ماءالسماء (م: ۱۰۳۰ء) کے ہاتھوں پایہ تکمیل کو پہنچ گیا، جو مروانی خلافت کے آخری دور کا شاعر تھا، عبادہ نے موشح کے دیگر اجزا میں بھی تنوع پیدا کر کے اس کی صورت کو بہت حسین وجمیل بنا دیا[2]، وہ مختلف اجزا کو متعدد فقروں سے ترکیب دیتا اور ان کے اندر متعدد قوافی کا التزام کرتا تھا، اس طرح اس نے فن توشیح کو بام عروج پر پہنچا دیا اور کثیر تعداد میں موشحات نظم کئے لیکن صرف ایک یا دو کے سوا وہ سب ضائع ہوگئے، یا اس کے بعد کے ایک دوسرے وشاح محمد بن عبادۃ القزاز کے موشحات سے غلط ملط ہو گئے، ابن القزاز ملوک طوائف کے دور (۱۰۳۱ - ۱۰۹۵ء) کا شاعر ہے، اور عبادۃ بن ماءالسماء کے بعد سب سے بڑا موشح نگار گذرا ہے، اس دور کے

---

[1] الذخیرہ قسم اوّل، ج: ۲، ص: ۲، [2] ایضاً،

جادك الغيث إذا الغيث همى ـــــــ يا زمان الوصل بالأندلس

لم يكن وصلك إلا حلما ـــــــ في الكرى أو خلسة المختلس

(اے اندلس کے زمانہ وصل! جب بھی بارش ہو تو وہ تجھے خوب سیراب کرے۔

تیرا وصال تو بس ایسا ہی تھا جیسے سونے کی حالت میں خواب یا جھپٹ کر

چھیننے والے کی ایک جھپٹ)

اس موشحہ کی گونج اب تک کبھی کبھی سنائی دے جاتی ہے، چنانچہ دورِ جدید میں

احمد شوقی نے بھی ایک موشحہ "صقر قریش" کے عنوان سے اسی نہج پر لکھا ہے[1] جس کا مطلع یہ ہے:

من لنضو يتنزى ألما ـــــــ برح الشوق به في الغلس

حن للبان وناجى العلما ـــــــ أين شرق الأرض من أندلس

(کون اس لاغر اونٹنی کی مدد کرے گا جو رنج و الم سے کروٹیں بدل رہا ہے، رات

کے پچھلے پہر کی تاریکی میں شوق نے اسے دردمند کیا ہے، وہ بان[2] کے اشتیاق

میں روتا ہے اور نقوش و علامات سے سرگوشی کرتا ہے، کہاں سرزمین مشرق

اور کہاں اندلس۔)

عہد موحدین (۱۱۴۹ء - ۱۲۴۸ء) کے خاتمہ کے ساتھ ہی اندلس میں فن توشیح کا آفتاب

بھی مائل بہ زوال ہو گیا، اور لوگوں کی توجہ اس سے ہٹ کر زجل کیطرف مبذول ہو گئی۔

پھر کچھ عرصہ کے بعد ابن الخطیب (م: ۱۳۷۴ء) نے اسے زندہ کرنے کی کوشش کی اور

ایک کتاب بھی "جیش التوشیح" کے نام سے تالیف کی جس میں اندلسی موشحات کو جمع کیا۔ انکے

---

[1] الشوقیات، مصر ۱۹۴۸ء، ج: ۲، ص: ۲۱۴،

[2] بان: بید کے مثل ایک درخت ہوتا ہے جس سے محبوب کے قد کو تشبیہ دی جاتی ہے۔

الاعمی نے بہت عمدہ اور نفیس موشحات نظم کئے اور ابن بقی نے تو تقریباً تین ہزار موشحات لکھے۔ غرض ان دونوں کی توجہ سے موشح کا مرتبہ بہت بلند ہوگیا۔ اب اسکی ادبی حیثیت مسلم ہوگئی اور وہ قصیدہ کی ہمسری کرنے لگا۔ اسطرح فن توشیح کا عہد زرین شروع اور موشح نگاری کا بازار گرم ہوگیا۔ مشہور موشح نگاروں میں حسب ذیل شعرا خاص طور پر قابل ذکر ہیں:-

ابن باجہ (م: ۱۱۳۸ء)، ابن قزمان (م: ۱۱۶۰ء)، ابوجعفر بن سعید (م: ۱۱۶۴ء)، ابن حزمون (؟)، ابن زہر (م: ۱۱۹۸ء)، ابن عربی (م: ۱۲۴۰ء) اور ابن سہل (م: ۱۲۵۱ء)

ان وشاحوں میں ابن سہل کو بڑی شہرت حاصل ہوئی اور اس کے موشحات اپنی لطافت و نرمی کی وجہ سے بہت مقبول ہوئے۔ اس کا سب سے مشہور موشحہ وہ ہے جو اسطرح شروع ہوتا ہے

ہل دری ظبی الحمیٰ اَن قد حمیٰ —— قلب صبّ حلہ عن مکنس

فہو فی حرّ و خفق مثلما —— لعبت ریح الصبا بالقبس

(کیا وادی محفوظ کے ہرن کو معلوم ہے کہ جس دل میں وہ قیام پذیر ہے اس کو اس نے آگ اور گھر سے جلا دیا ہے۔ پس وہ ایسی سوزش اور دھڑکن میں مبتلا ہے جیسے باد صبا چنگاری کے ساتھ کھیل کرے۔)

ابن سہل کا یہ موشحہ اس قدر مقبول ہوا کہ بہت سے وشاحوں نے اس کی تقلید کی کوشش کی[1] اور اسی وزن و قافیہ میں موشحات نظم کیے لیکن ان میں سب سے زیادہ کامیابی لسان الدین ابن الخطیب کو حاصل ہوئی جس کے موشحہ کا مطلع اسطرح ہے[2]:-

---

[1] نفح الطیب ج: ۹، ص: ۲۲۶، ۲۲۷، مرص: ۲۷۱ و مابعد

[2] مقدمہ ابن خلدون ص: ۶۲۰، ۵۹۴

رنگین پھلوں، سرسبز چراگاہوں، سایہ دار درختوں، سربلند پہاڑوں، گنجان جنگلوں، موسلادھار بارشوں، پرشور ندیوں اور پرسکون تالابوں، حوضوں اور چشموں کے پرکیف تذکروں سے اندلسی شاعری کا دامن بھرا ہوا ہے، اور موشح تو خاص طور پر لحن و طرب اور نغمہ و سرود ہی کے لئے نظم کیا گیا تھا اس کا دامن ان سے کیونکر خالی رہ سکتا تھا، ابن اللبانہ کے ایک موشحہ کے ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں[۵۱]،

فی نرجس الاحداق۔ وسوسن الأجیاد	نبت الهوی مغرس۔ بین القنا المیاد
وفی نقا الکافور	والمندل الرطب
والهودج المزرور	بالوشی والعصب
تصنب من البلور	حمین بالقضب
اذابت الاشواق۔ روحی علی اجساد	اعارها الطاؤس من ریشه ابراد

نرگس جیسی آنکھوں میں اور سوسن جیسی گردنوں میں جھبو لتے ہوئے خوشہ کے درمیان محبت کا پودا لگا ہوا ہے، اور کافور کے ٹیلے میں اور خوشبودار تروتازہ ٹہنی میں اور ایسی محمل میں جو منقش اور رنگین چادروں سے آراستہ ہے بلور کی شاخیں جلوہ افروز ہیں جن کی تلواروں کے ذریعہ نگہبانی کی جاتی ہے، جذبہ شوق نے میری روح کو ان قدوں پر پگھلا دیا ہے جن کو طاؤس نے اپنے پروں کا لباس مستعار دیا ہے،

لیکن اسی کے ساتھ موشحات کے معانی و خیالات میں کوئی جدت، گہرائی اور بلندی نہیں تھی، الفاظ میں یقیناً سلاست، شیرینی اور موسیقیت ہوتی تھی، معمولی اور عوامی

---

۵۱ ابن شاکر الکتبی: فوات الوفیات، مصر ۱۹۵۱ء، ج ۲: ص ۵۱۵،

بعد آخری قابل ذکر وشاح جسے اندلس نے پیدا کیا، وہ ابن زمرک (م: ۱۳۹۳ء) ہے۔ بالآخر زوال غرناطہ (۱۴۹۲ء) کے ساتھ اندلس میں توشیح کا ستارہ بھی عزوب ہو گیا۔

اب صرف اہل مشرق ہی اس کے سرپرست رہ گئے۔ مشرق میں یہ فن کب کس کے ذریعہ اور کس طرح آیا اسکا کچھ پتہ نہیں چلتا، مگر قدیم ترین مشرقی وشاحوں میں عثمان بن عیسی البلطی (م: ۱۲۰۲ء) کا نام لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد مشرقی وشاحوں میں یہ اشخاص خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں:-

ابن سناء الملک (م: ۱۲۱۱ء)، ابن بنیہ (م: ۱۲۲۲ء) محمد بن یوسف تلعفری (م: ۱۲۷۶ء) محمد بن سلیمان تلمسانی (م: ۱۲۸۹ء) محمد بن عمر کی (م: ۱۳۱۶ء) صفی الدین حلّی (م: ۱۳۴۹ء) صلاح الدین صفدی (م: ۱۳۶۲ء) اور ابن نباتہ (م: ۱۳۶۶ء)

غرض اہل مشرق نے کسی نہ کسی طرح آجتک اس فن کو زندہ رکھا، چنانچہ دور جدید کے مشہور وشاحوں میں سلیمان بستانی کا نام خاص طور پر نمایاں ہے جس نے ہومر کی ایلیڈ کا ترجمہ توشیح ہی کے طرز میں کیا ہے، یہ ضرور ہے کہ مغرب میں اس فن کا جو تعلق غنا و موسیقی سے تھا وہ مشرق میں آکر باقی نہیں رہا۔ اب یہ صرف مسمط وغیرہ کی طرح عربی شاعری کی ایک صنف کی حیثیت سے معروف ہے اور اس میں عام طور پر طویل نظمیں فصیح زبان میں لکھی جاتی ہیں۔

مضامین و موضوعات موشح کا پودا چونکہ غنا و موسیقی کے عوامی ماحول میں اگا تھا اس لئے ابتدا میں وہ غزل، خمریات اور مناظر فطرت کے موضوعات تک ہی محدود رہا، غزل و خمریات تو مجالس عیش و طرب کے لازمی عناصر ہیں اور قدرتی مناظر کا بیان اندلس کی شاعری کی نمایاں خصوصیات میں ہے، چنانچہ حسین و جمیل مناظر، شاداب باغوں، دلکش بہاروں، روح پرور فضاؤں، معطر ہواؤں، خوش الحان پرندوں، خوشنما پھولوں،

مدح کی طرف گریز کر کے ممدوح کے اصلی اور فرضی اوصاف کی تعریف میں زور صرف کیا جاتا تھا اسی کے ساتھ بعض وشاحوں نے مدح رسول میں بھی موشح لکھنا شروع کر دیا لیکن نعتیہ موشحات شوق و محبت کے پرخلوص جذبات سے معمور اور ایمان و یقین کے انوار سے منور ہوتے تھے، مقری نے اپنی کتاب میں موشحات کو شامل کرنے کی یہی وجہ بیان کی ہے کہ ان سے مدحِ رسول مقصود ہے۔[۱]

جب موشح کا دروازہ مدح کے لئے کھل گیا تو ہجو کے لئے کیوں کر بند رہ سکتا تھا، چنانچہ موشحات کے ذریعہ ہجو گوئی بھی شروع ہو گئی، ایک موشح میں ابن حزمون نے ایک قاضی کی ہجو لکھی جس کی بینائی کمزور تھی، اس کا مطلع یہ ہے:[۲]

یا ایہا القاضی فتظلم لا تعرف الاشہاد۔ ولا الذی یسطر
تخونک العینان بہ یرسم

"اے قاضی تیری آنکھیں تجھ سے خیانت کرتی ہیں پس تو ظلم کرتا ہے، تو نہ گواہوں کو پہچانتا ہے اور نہ اس کو جو تحریر کیا جاتا ہے۔"

اسی کے ساتھ مرثیہ گوئی بھی موشح کے دائرہ میں داخل ہو گئی، چنانچہ ابن حزمون ہی نے بہت سے موشحات مرثیہ کے بھی نظم کئے، اس کے بعد زہد اور تصوف بھی موشح میں شامل ہو گئے، ابن عربی (م: ۶۴۰ھ) اور ابو الحسن ششتری (م: ۶۶۹ھ) نے متعدد موشحات لکھے جن میں تصوف کی اصطلاحوں کا استعمال کیا اور صوفیانہ رموز و اسرار اور تصورات و افکار کی تشریح کی، ابن عربی کا ایک صوفیانہ موشح اسطرح شروع ہوتا ہے۔[۳]

---

[۱] ازہار الریاض، ج: ۲، ص: ۲۲۸،

[۲] ابن سعید: المغرب فی حلی المغرب، قاہرہ ۱۹۵۳ء، ج: ۲، ص: ۲۱۶،

[۳] الموشحات الاندلسیہ، سلسلہ مناہل الادب العربی نمبر ۲، بیروت، ص: ۳۷،

خیال کو متناسب الفاظ اور مترنم قوافی سے آراستہ کرکے پیش کر دیا جاتا تھا، اگر کہیں کوئی بلند خیال یا دقیق معنی ہوتے بھی تھے تو الفاظ کی نغمگی و موسیقیت اور قوافی کی آرائش و زیبائش ذہن کو اس درجہ متاثر کر لیتی تھیں کہ ان سے آگے بڑھ کر وہ کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتا تھا، غنا و موسیقی سے عمیق ربط ہونے کی بنا پر الفاظ میں نرمی و لطافت تو لازمی تھی، عوامی ذوق کے لحاظ کیوجہ سے ابتذال و رکاکت کی جھلک بھی پیدا ہوگئی تھی، کیونکہ جس شاعری کا تعلق عوامی ذوق اور غنا سے ہوتا ہے اس میں کچھ نہ کچھ رکاکت ضرور آجاتی ہے، چنانچہ اس دور میں اندلس کی عام شاعری جو غنا کیلئے استعمال کی جاتی تھی اس میں بھی رکاکت بہت زیادہ تھی، ابن عبدربہ نے اس قسم کی شاعری کی بڑی مذمت کی ہے، اور ان مغنیوں پر نوحہ و ماتم کیا ہے جو عمدہ اشعار کو چھوڑ کر رکیک اشعار غنا کیلئے پسند کرتے ہیں، اس نے اس قسم کے چند اشعار نقل کرکے لکھا ہے کہ یہ شاعری کم سے کم جس انعام کی مستحق ہے وہ یہ ہے کہ اس کے نظم کرنے والے کو پانچ سو کوڑے لگائے جائیں اور اس کے راگ بنانے والے کو چار سو کوڑے، پھر اس کے گانے والے کو تین سو کوڑے لگائے جائیں اور اس کے سننے والے کو دو سو[۵]،

غرض ابتدا میں موشح کے موضوعات بہت محدود تھے، ہر وشاح انہی مضامین کو بار بار مختلف الفاظ و قوافی میں دہرایا کرتا تھا، پھر جلد ہی اس کا دائرہ وسیع ہونے لگا، سب سے پہلے اس میں مدح کا عنصر شامل ہوا، کیونکہ وشاحوں نے اسے کسب معاش اور حصول منفعت کا ذریعہ پایا، اس لئے انھوں نے موشح میں قصیدہ نگاروں کی تقلید شروع کر دی اور مدحیہ قصائد کی طرح مدحیہ موشحات کی ابتدا بھی غزل و تشبیب سے کیجاتی تھی بلکہ

---

۵ العقد الفرید، قاهره، ۱۹۴۹ء، ج ۶، ص: ۸۷

تغیر کر لیا گیا ہے تاکہ روایتی اوزان سے مشابہت نہ رہے۔ اس تغیر کی مختلف صورتیں ہوتی تھیں۔ کبھی دو ایک لفظ مستزاد کے طور پر استعمال کر لیتے تھے، جیسے ایک وشاح کہتا ہے:-[۵۱]

صبرت والصبر شیمۃ العانی ـ ولم أقل للمطیل ہجرانی ـ معذبی کفانی

(میں نے صبر کیا اور صبر ہی عاشق کا شیوہ ہے اور میں نے ہجر کو طول دینے والے سے یہ نہیں کہا کہ اے مجھے تکلیف دینے والے! بس اب کافی ہے،)

یہ شعر بحر منسرح میں ہے لیکن وشاح نے آخر میں "معذبی کفانی" کا اضافہ کر کے اس بحر سے اس کو خارج کرنے کی کوشش کی ہے، اس قسم کا مستزاد کبھی شعر کے شروع میں اور کبھی درمیان میں بھی لایا جاتا تھا،

اسی طرح کبھی شعر کے درمیان میں کسی حرف کو لازم قرار دے کر اسے قافیہ بنا لیا جاتا تھا، اور اس کا التزام نظم کے دیگر اشعار میں بھی کیا جاتا تھا، اس سے وزن ٹوٹ کر دو اجزاء میں منقسم ہو جاتا تھا، ابن بقی کہتا ہے:-[۵۲]

یا ویح صب الی البرق ـ لہ نظر　　　وفی البکاء مع الورق ـ لہ وطر

(ہائے وہ عاشق جس کی نظر برق کی طرف لگی ہوئی ہے اور کبوتروں کے ساتھ گریہ و بکا ہی کی اس کو حاجت ہے،)

یہ بحر بسیط ہے لیکن درمیان میں قاف مکسور کا التزام کر کے ایک قافیہ مزید اختیار کر لیا گیا ہے جس کی وجہ سے وزن ٹوٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔

اس کے علاوہ کبھی ایک ہی موشحہ میں مختلف اوزان استعمال کئے جاتے تھے، بعض اجزاء ایک وزن پر اور بعض دوسرے وزن پر ہوتے تھے، نیز کبھی کسی بحر کو ایسے مختلف اجزاء میں

---

۵۱ بطرس البستانی: أدباء العرب فی الاندلس، بیروت، ۱۹۵۸ء، ص: ۱۶۲، ۵۲ أیضاً

سر الاعیان - لاحت علی الاکوان - للناظرین　　والعاشق الغیران - من ذاک فی حران - یبدی الانین

(موجودات کے اسرار ناظرین کے لئے کائنات پر روشن ہو گئے اور غیرتمند عاشق اس سے دردمند ہو کر آہ و فغاں کر رہا ہے،)

یہ موشح اس طرح ختم ہوتا ہے:-

جنان یا جنان - اجن من البستان - الیاسمین　　وحلل الریحان - بحرمة الرحمان - للعاشقین

(باغبان! اے باغبان! تو باغ سے یاسمین کو چن لے اور ریحان کو حرمت رحمان کے صدقہ میں عاشقین کے لئے مباح کر دے،)

غرض اس طرح رفتہ رفتہ وہ تمام موضوعات موشح کے دائرہ میں آگئے جو اس سے پہلے قصیدہ کے قبضہ میں تھے،

بحور و اوزان | عربی علم عروض کا موجد خلیل بن احمد نحوی (م: ۱۸۶ھ) ہے اس نے اس کے اصول و ضوابط مرتب کئے، اور عربی اشعار کو سامنے رکھکر ان سے پندرہ[15] بحریں نکالیں اسکے بعد اخفش (م: ۲۳۰ھ) نے ایک اور بحر کا اضافہ کیا اسطرح بحروں کی کل تعداد سولہ[16] ہو گئی،

عربی شعراء عام طور پر انہی اوزان کی پیروی کرتے رہے، بعض بحروں کا استعمال زیادہ ہوا اور بعض کا کم، کچھ شعراء نے ہلکی پھلکی بحریں پسند کیں اور زحافات وغیرہ کے ذریعہ ان کے اندر تنوع پیدا کیا، مگر روایتی اوزان سے انھوں نے بغاوت نہیں کی اور نہ جدید اوزان ہی کا اختراع کیا عجمی اوزان بھی شاذ و نادر ہی استعمال کئے گئے،

لیکن اندلس کے موشح نگار شعراء روایتی اوزان سے آزادی کی طرف مائل تھے اسلئے انھوں نے عام روش سے ہٹنے کی کوشش کی، اسی لئے اندلسی موشحات ان اوزان پر بہت کم ملتے ہیں اور جو کچھ ملتے ہیں تو وہ ان اوزان پر ہیں جو متروک یا بہت کم مستعمل رہے یا ان میں کچھ

ان کو پڑھتے وقت صاف محسوس ہوتا ہے کہ وزن ٹوٹ گیا مگر ابن سناء الملک کے بیان کے مطابق درحقیقت یہی اعلیٰ درجہ کے اصلی موشحات ہیں اور اس قسم کے موشحات صرف اس فن کے اندلسی ائمہ ہی نظم کر سکتے تھے، جن کو اس نے اس صنعت کے ملائکہ مقربین کا خطاب دیا ہے، ان کی موزونیت صرف غنا و تلحین ہی کے ذریعہ محسوس کی جاسکتی ہے جسمیں کسی حرف کو بڑھا کر، کسی کو گھٹا کر اور کبھی کسی حرف کو دوسرے حرف میں مدغم کرکے موزوں کرلیا جاتا ہے، اور پھر ذوق سلیم بھی اس کے وزن میں کوئی نقص محسوس نہیں کرتا۔

اس موقع پر اردو کے بعض فلمی گانوں کی طرف ذہن مائل ہو جاتا ہے جو عروض کے اصول کے لحاظ سے وزن سے ساقط ہوتے ہیں لیکن جب ایک مخصوص راگ میں وہ گائے جاتے ہیں تو موزوں معلوم ہوتے ہیں۔ جس طرح نئے راگوں کی تعلید میں یہ فلمی گانے لکھے جاتے ہیں، اسی طرح اندلسی موشحات بھی عجمی راگوں کے تحت نظم کئے جاتے تھے۔ (باقی)

تاریخ اندلس

جلد اوّل

شروع میں اندلس کا طبعی و تاریخی جغرافیہ ہے، اس کے بعد اندلس کی قدیم تاریخ، اسکے باشندوں اور مختلف دوروں میں وہاں جو حکومتیں قائم ہوئیں اون کی تفصیل، پھر اندلس پر مسلمانوں کے حملوں اور ان کی فتوحات کا بیان ہے، پھر فاتح اندلس طارق بن زیاد سے لے کر عبد الرحمٰن اوسط تک اندلس کی مکمل سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ قلم بند کی گئی ہے،

تقسیم کر دیا جاتا تھا کہ بعض جزء میں ایک ہی رکن اور بعض میں کئی ارکان ہوتے تھے جیسے ابن حزمون کے ایک موشحہ کا مطلع ہے[۵]:

یا عین بکی السراج ۔ الازھر ۔ النیرا ۔ اللائح ۔ وکان نعم الرتاج ۔ فکسرا ۔ کی تنثرا ۔ مدامع

(اے آنکھ! اس چراغ پر رو جو شگفتہ، روشن اور چمکیلا تھا اور وہ ایک بہترین باب تھا جو توڑ دیا گیا تاکہ آنسو بہائے جائیں!)

غرض اندلسی موشحہ نگار اگر اپنے موشحات میں روایتی بحروں کا استعمال کرتے تھے، تو عام طور پر ان میں کچھ تغیر و تبدل کر لیا کرتے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اندلسی موشحات زیادہ تر ایسے جدید اوزان پر ملتے ہیں جن کا روایتی اوزان سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے اور یہ جدید اوزان اس قدر کثیر تعداد میں ہیں کہ ان کو ضبط میں لانا بہت مشکل ہے۔ ابن سناء الملک نے ان کو منضبط کرنے کی کوشش کی تھی لیکن جب یہ دفتر بے پایاں اس کے قابو میں نہ آسکا تو اس نے یہ کہکر چھوڑ دیا کہ ان کا عروض صرف تلحین، ان کا ضرب محض مضراب، ان کے اوتاد سارنگی کی کیلیاں اور ان کے اسباب عود کے تار ہیں، اور صرف اس طرح ان کے اوزان کو پہچانا جاسکتا ہے[۶]۔

ان جدید اوزان میں بھی بعض ایسے ہیں جن کا ذوق سلیم ادراک کر لیتا ہے، اور ان کی موزونیت سے لطف اندوز ہوتا ہے جسطرح عام اشعار کے اوزان کا ادراک ایک موزوں طبع شخص بآسانی کر لیتا ہے اور اس کے لئے علم عروض کے اصول و ضوابط سے واقفیت کی اس کو حاجت نہیں ہوتی۔ اندلسی موشحات میں زیادہ تر ایسے ہی اوزان کا استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن کچھ موشحات ایسے بھی ہیں جن کے وزن کا ذوق سلیم بھی ادراک نہیں کر سکتا

۵ المغرب، ج ۲، ص: ۲۱۷؛ ۶ دار الطراز(؟) التوشیح، ص: ۶۸؛

شمسی گردش پر کی، ان کا سال بارہ مہینوں میں اور ہر مہینہ ۳۰ دنوں میں منقسم تھا، اس طور پر ان کا شمسی سال ۳۶۰ دنوں پر مشتمل تھا مگر ان کے مشاہدہ نے تھوڑی ہی مدت میں یہ ثابت کر دیا کہ سورج کو اپنی گردش پورا کرنے میں ۳۶۵ دن لگ جاتے ہیں، اسلئے انھوں نے سال کے آخر میں پانچ دنوں کا اضافہ کر دیا، اضافہ والے یہ پانچ دن مذہبی جشن کیلئے مخصوص کر دیئے گئے۔ فراعنہ مصر نے مصر کے مذہبی پیشواؤں کے سپرد یہ کام کر دیا تھا کہ وہ ان پانچ دنوں کے شایان شان مذہبی تقریبات کا پروگرام بنا لیا کریں، مصریوں نے اپنے سالہا سال کے تجربہ سے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ دریائے نیل کی طغیانی ہر مہینہ تک رہتی ہے۔ طغیانی کے بعد زمین کی کاشت اور فصل کی کیاری تک چار مہینے لگ جاتے ہیں، اور پھر فصل کو کاٹنے کھیتی کے کام کو ختم کرنے میں مزید چار مہینے لگ جاتے تھے، انھوں نے اپنے مشاہدہ سے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ روشن تارا شعریٰ، شامی سورج کے ساتھ جس وقت طلوع ہوتا ہے جبکہ نیل میں پانی بڑھنا شروع ہوتا ہے، اس لئے انھوں نے اپنے سال کو تین موسموں کے اعتبار سے تقسیم کر دیا تھا، ہر موسم کی مدت چار مہینہ ہوتی تھی، اور ان کا نیا سال اس تاریخ سے شروع ہوتا تھا جب ستارۂ شامی سورج کے ساتھ ساتھ طلوع ہوتا تھا۔ جو آج کل کے گریگورین کیلنڈر کی رو سے ۱۹ر جولائی کو پڑتا ہے،

امریکہ کے مشہور ماہر آثار قدیمہ مسٹر جیمس ہنری بریسٹڈ JAMSHENRY BREASTED کی تحقیق کے مطابق مصریوں کا ۳۶۵ دن والا شمسی سال ۴۲۳۶ ق م میں تشکیل پا چکا تھا، ان کا خیال ہے کہ یہ کیلنڈر دنیا کا قدیم ترین کیلنڈر ہے، ۴۲۳۶ ق م نہ صرف کیلنڈر کی قدامت کی دلیل ہے، بلکہ انسانی ذہنی ارتقاء کی تاریخ میں اولین تاریخ ہے، مصریوں کا یہ کیلنڈر دراصل آج کل کے گریگورین کیلنڈر کا باوا آدم کہا جا سکتا ہے،

ہمارے کیلنڈر

تاریخ کے آئینہ میں

از جناب بدیع الزماں صاحب اعظمی

ہم یہ جانتے ہیں کہ بنی نوع انسان نے تاریخ کی ابتدا کے قبل ہی قمری سال کی تشکیل کرلی تھی، ملک چین سے لیکر رومہ تک ہر متمدن ملک میں قمری سال کی جنتریاں رائج تھیں مثال کے طور پر ہندوستان ہی کو لے لیجئے، یہاں پر آج بھی گری گورین کیلنڈر (GREGORIAN CALENDAR) کے علاوہ بودھ سمبت، وکرم سمبت، شک سمبت، بنگ سمبت، سنہ فصلی سنہ ہجری وغیرہ رائج ہیں، چونکہ قمری مہینے کبھی ۲۹ دن کے ہوتے ہیں اور کبھی ۳۰ دن کے، اسلئے قمری سال شمسی سال کے مقابلہ میں ۱۰ یا ۱۱ دن چھوٹا ہوتا ہے بعض کیلنڈروں میں اس کمی کو ہر تیسرے سال ایک مہینہ کا اضافہ کرکے پورا کیا جاتا ہے، صرف سنہ ہجری اس اصول سے مستثنیٰ ہے، اسلئے سنہ ہجری کا ہر مہینہ ہر سال ۱۰ یا ۱۱ دن قبل شروع ہوکر ہر موسم کی بہار لیتا ہوا چکر کاٹتا رہتا ہے، بالآخر ۳۶ سال کی مدت میں اس کا چکر پورا ہو جاتا ہے، آج کل تقریباً ساری دنیا میں گری گورین کیلنڈر ہی رائج ہے، چونکہ اس کیلنڈر کا تعلق شمسی سال سے ہے اس لئے اس کیلنڈر اور دوسرے شمسی کیلنڈروں کی تشکیل پر ہی روشنی ڈالنا مناسب ہے،

مصریوں کا شمسی کیلنڈر اہل مصر نے سب سے پہلے اپنے کیلنڈر کی تشکیل قمری گردش سے ہٹ کر

کل ۳۶۰ دن ہوتے تھے، پورا سال "تن" (TUN) اٹھارہ ماہانہ تہواروں کی مناسبت سے اٹھارہ مہینوں میں منقسم تھا، اور ہر مہینہ ۲۰ دن کا ہوتا تھا، جس میں پانچ پانچ دن کے چار ہفتے ہوتے تھے، ۲۰ سال کا تن (KATUN) ۷۲۰۰ دنوں کا ہوتا تھا، مصریوں کی طرح سال کے آخر میں پانچ دنوں کا اضافہ کرلیا جاتا تھا جو غیر ضروری اور نحس سمجھے جاتے تھے، ان پانچ دنوں میں نہ تو کوئی نیا کام شروع کیا جاتا تھا اور نہ کوئی سفر پر جاتا تھا، نہ شادی بیاہ کی تقریبات انجام پاتی تھیں، مذہبی پیشوا ان پانچ دنوں کیلئے مخصوص پروگرام بناتے رہتے تھے، دنوں اور مہینوں کی الگ الگ نشانیاں تھیں، اور الگ الگ مندرجۂ ذیل نام تھے،

مہینوں کے نام		دنوں کے نام	
پاپ	POP	آئی مکس	IMIX
یو	UO	اِک	IK
زپ	ZIP	اکبل	AKBAL
زوٹا	ZOTA	کان	KAN
زک	TZEK	چائی سین	CHICEHAN
زُل	XUL	سی می	CIMI
یاکن	YAXKIN	مانک	MANIK
مال	MOL	لامت	LAMAT
شین	CHAN	ملک	MULAK
یاز	YAX	اوک	OK
زیک	ZAC	چوئن	CHUEN

صدیوں بعد مصری ہیئت دانوں کو اس بات کا بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ ۳۶۵ دنوں والا شمسی سال کسی قدر چھوٹا ہوتا ہے، اسلئے کہ ان کے نئے سال کی پہلی تاریخ کبھی دریائے نیل میں طغیانی آنے کے وقت، کبھی فصل کی کٹائی کے ایام میں اور کبھی فصل کی تخم ریزی کے اوقات میں پڑنے لگی، اس فرق کی چھان بین کرنے سے وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ پورا سال ۳۶۵ ¼ دنوں پر مشتمل ہوتا ہے، چنانچہ ۲۳۸ ق م میں شہنشاہ بطلیموس نے اس کمی کو ہر چوتھے سال ایک دن کا اضافہ کرکے سال کو ۳۶۶ دنوں کا بنانے کی کوشش کی، اس اضافہ شدہ دن کو خیر و برکت والے دیوتاؤں سے منسوب کرکے مذہبی جشن منانے کا فرمان جاری کیا، مگر مذہبی پیشواؤں اور مصری عوام نے اپنی قدامت پرستی کی بنا پر ہزاروں سال کے پرانے دستور میں کسی قسم کی ترمیم یا اضافہ مناسب نہ سمجھا، اور مصری کیلنڈر اپنی اس خامی کے ساتھ دنیا کی نظروں سے بچکر چلتا رہا۔

مایا قوم کا کیلنڈر مصری کیلنڈر کی طرح مایا قوم کا بنایا ہوا کیلنڈر بھی دنیا کی نظروں سے روپوش رہا، وسطی امریکہ میں بسنے والی مایا قوم نے امریکہ کی دریافت سے ڈیڑھ ہزار سال قبل یعنی ۲۰۰ ق۔م میں ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد ڈال لی تھی، ان کا تمدن مصریوں سے ٹکر لیتا تھا، جس وقت یورپ بربریت کے دور سے گذر رہا تھا، مایا قوم کے سیاست داں ایک ستھرے سماج کی تعمیر کر چکے تھے اور حکومت کا ایک مکمل نظام بنا چکے تھے، اس کے انجینیر ایسی عمارتوں کی تعمیر میں لگے ہوئے تھے، جو اہرام مصر کی طرح عجائب روزگار کہلانے کی مستحق ہوں، اس کے مذہبی پیشوا اور ہیئت داں ستاروں سے وقت کی ناپ کا راز معلوم کر رہے تھے، اس کے ریاضی داں ایک کیلنڈر کی تشکیل میں لگے ہوئے تھے، مایا قوم اپنے کیلنڈر کے لئے ممتاز ہے، انھوں نے ۲ قسم کے کیلنڈر بنائے تھے، جن کی بنیاد گھڑیوں کے شمار پر تھی، ان میں سے خاص کیلنڈر وہ تھا جو مصری کیلنڈر کی طرح شمسی سال پر مبنی تھا، اور جس میں

لوگوں کا عروج ہوا تو انھوں نے بھی اپنے کیلنڈر کی بنیاد ماہا قوم کے کیلنڈر پر رکھی، ان کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ پورا سال ۳۶۵ دنوں اور ایک چوتھائی دن پر مشتمل ہوتا ہے، چنانچہ وہ چوتھائی دن یعنی چھ گھنٹے کی مدت سال بہ سال وہ محفوظ رکھتے تھے اور باون[2] سال میں ۱۲ ½ دن کے حساب سے ایک سو چار سال کے بعد پچیس دنوں کا اضافہ کرکے اپنے کیلنڈر کو موسم کا سہارا دینے کے قابل بنا دیتے تھے،

جولینی کیلنڈر (JULIAN CALENDAR) مصری شمسی کیلنڈر چالیس[4] صدیوں تک اس نہج پر چلتا رہا کہ مصر کے حدود کے باہر کسی کو اس کی بھنک نہ لگنے پائی لیکن جب جولیس سیزر کا قیام مصر میں ہوا، تو اسے اس کیلنڈر کی افادیت کا علم ہوا، اس کے نزدیک یہ کیلنڈر اس قمری کیلنڈر سے بدرجہا بہتر تھا جو مملکت روما میں رائج تھا، رومن کیلنڈر اگرچہ قمری کیلنڈر تھا مگر اس کی تشکیل اس طرح کی گئی تھی کہ سال کے بارہ مہینوں میں سے سات مہینے تو انتیس[29] دن کے ہوتے تھے، اور چار مہینے اکتیس[31] دن کے اور فروریہ (فروری) ۲۸ دن کا اس طرح سال میں کل ۳۵۵ دن ہوتے تھے، جیسا کہ مندرجہ ذیل نقشہ سے ظاہر ہوگا۔

نام مہینہ	تعداد دن	نام مہینہ	تعداد دن
mensis Martius مریخ کا مہینہ (مارچ)	۳۱	September ساتواں مہینہ (ستمبر)	۲۹
mensis Aprilis بہار کا مہینہ (اپریل)	۲۹	October آٹھواں مہینہ (اکتوبر)	۳۱
mensis Maius مشتری کا مہینہ (مئی)	۳۱	November نواں مہینہ (نومبر)	۲۹
mensis Junius جونی دیوی کا مہینہ (جون)	۲۹	December دسواں مہینہ (دسمبر)	۲۹
mensis Quintilis پانچواں مہینہ (جولائی)	۳۱	mensis Januarius جینس دیوتا کا مہینہ (جنوری)	۲۹
mensis Sextilis چھٹواں مہینہ (اگست)	۲۹	mensis Februarius فبروآ کا مہینہ (فروری)	۲۸

مہینوں کے نام		دنوں کے نام	
سہہ	CEH	اب	EB
میک	MAC	بن	BEN
کانکن	KANKIN	اکس	IX
موآن	MUAN	من	MEN
پاز	PAX	سب	CIB
کایاب	KAYAB	کابن	CABAN
کمھو	CHMHU	ازناب	EZNAB
		کاک	CAJAC
		آؤ	AHAU

اس کیلنڈر میں ایک خوبی یہ تھی کہ سال کے پہلے مہینے کی پہلی تاریخ کو جو دن پڑتا تھا وہی دن نہ صرف دورانِ سال بلکہ سال بہ سال ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو پڑا کرتا تھا جس کی وجہ سے دن اور تاریخ معلوم کرنے میں کوئی دقت نہ ہوتی تھی، گویا یہ ایک دائمی کیلنڈر تھا دوسرا کیلنڈر وہ تھا جس میں صرف ۲۰ ہفتے ہوتے تھے، اور ہر ہفتہ ۱۳ دن کا ہوتا تھا، سال میں کل ۲۶۰ دن ہوتے تھے، اس کیلنڈر کا نام ٹونال مل (TONALMAL) تھا اور اس کا استعمال مذہبی رسومات کے سلسلے میں ہوتا تھا، دنوں کے نام ظاہر کرنے کے لئے مخصوص نشانیوں سے کام لیا گیا تھا، جسے ہر کس و ناکس سمجھنے سے قاصر رہتا تھا، صرف مذہبی اجارہ دار ہی آسانی سے سمجھ لیتے تھے:

ازٹک لوگوں کا کیلنڈر وسطی امریکہ اور میکسیکو میں جب مایا قوم کے زوال کے بعد ازٹک (AZTEC)

کے قرار پائے جیسا کہ آج کل رائج ہے، البتہ ہر چوتھے سال فروری میں ایک دن کا اضافہ ہونے لگا، مگر اس طور پر کہ ۲۴ فروری کی تاریخ کو جو یکم مارچ یعنی کیلنڈز سے چار دن قبل پڑتی تھی اُسی کو دہرا دیا جاتا تھا۔

۴۲ سنہ ق.م کا سال پرانے اور نئے کیلنڈر دن کی خلیج کو پُر کرنے کے لئے ۴۴۵ دنوں کا تسلیم کیا گیا، ۴۵ سنہ ق.م، در اصل اس نئے کیلنڈر کا پہلا سال تھا، جولیس سیزر نے تاریخوں کے شمار کرنے کے لئے کیلنڈز آئیڈز اور نونز کا مروجہ اور پیچیدہ طریقہ برقرار رکھا، رومن درباریوں نے ماہ کوئنٹلس (QUINTILIS) کو جولیس سیزر کے نام سے منسوب کر کے جولیس (جولائی) رکھدیا، ۴۴ سنہ ق.م میں جولیس سیزر کا قتل ہو گیا، اس کی موت کے بعد پادریوں نے سال کبیسہ (۳۶۶ دنوں والا سال) میں ترمیم کر دی، اور چوتھے سال کی جگہ ہر تیسرے سال ایک دن کا اضافہ کر کے اسے سال کبیسہ قرار دیا جانے لگا، اس طرح جولین کیلنڈر موسموں کا ساتھ نہ دے سکا، جب آگسٹس سیزر (AUGUSTUS CAESAR) شہنشاہ روم بنا، اور اس نے دیکھا کہ موجودہ کیلنڈر میں کسی قدر انحراف ہو گیا ہے، تو اس نے ۸ سنہ ق.م اور ۸ سنہ ء کے درمیانی کبیسہ کے سالوں کو منسوخ کر کے کیلنڈر میں پیدا شدہ خامیوں کو دور کر دیا، اس کے خوشامدی درباریوں نے شہنشاہ کو خوش کرنے کے لئے ماہ سکسٹی لیز (SEXTILIS) کو، جو اسکی سالگرہ کا مہینہ تھا، اس کے نام سے منسوب کر کے اگست رکھدیا، اس انداز پر جولین کیلنڈر چلتا رہا،

۳۲۱ سنہ ء میں شہنشاہ قسطنطین (CONSTANTINE) نے ایک فرمان کے ذریعہ کیلنڈز آئیڈز و نونز کے ذریعہ تاریخ کے تعین کرنے کا طریقہ ختم اور مہینہ کی تقسیم ہفتوں میں کر کے ہفتہ کے سات دنوں کا نام بھی تجویز کر دیا، شہنشاہ نے ہفتہ کی تشکیل سات دنوں پر کیوں کی، اس کے متعلق تین روایتیں ہیں، پہلی یہ کہ توریت کی کتاب آفرینش کے مطابق دنیا

دس دن کی سالانہ کمی کو ہر تیسرے سال ایک مہینہ کا اضافہ کر کے پورا کر لیا جاتا تھا مارٹیس (مارچ) سال کا پہلا مہینہ شمار ہوتا تھا، لیکن ۱۵۳ ق م میں جنوری کو سال کا پہلا مہینہ قرار دیا گیا، مہینہ کی تاریخوں کے شمار کرنے کا طریقہ بہت پیچیدہ تھا، تین مخصوص تاریخیں تھیں جن کی مدد سے تاریخوں کا شمار ہوتا تھا، وہ کیلنڈر، آئیڈ، اور نون کہلاتی تھیں، کیلنڈر (CALEND) تو ہر مہینہ کی یکم تاریخ کو پڑتی تھی، آئیڈس (Ides) مارچ، مئی جولائی اور اکتوبر کی پندرہ تاریخ کو اور دوسرے مہینوں کی تاریخوں کی تیرہ کو پڑتی تھی، نون (Nones) ہر آئیڈ سے آٹھ دن قبل پڑتی تھیں،

یہ کیلنڈر پادریوں کی ایک بااختیار کونسل کے کنٹرول میں دیدیا گیا تھا، وہی مذہبی تہواروں کی تاریخوں کا تعین کرتی تھی، اور ہر تیسرے سال ایک مہینہ کا اضافہ اپنی مصلحت کی بنا پر جب چاہتی تھی کر لیتی تھی، ۶۳ ق م میں جولیس سیزر (Julius Caesar) نے ایک ڈکٹیٹر کی حیثیت سے جب عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی اس وقت تک اس کیلنڈر میں بہت سی خامیاں آچکی تھیں، اس نے ۴۶ ق م میں کیلنڈر کی اصلاح کے لئے قدم اٹھایا، اور عالمگیر شہرت رکھنے والے یونانی ہیئت داں مسمی سوسی جین (Sosigenes) سے مشورہ طلب کیا، سوسی جین نے یہ مشورہ دیا کہ مصری شمسی کیلنڈر کی موجودگی میں رومن کیلنڈر کی تصحیح کرنے سے کوئی خاص اور مفید مطلب نتیجہ نہ نکلے گا، چنانچہ جولیس سیزر نے ایک شاہی فرمان کے ذریعہ رومن قمری کیلنڈر کو منسوخ کر کے اسکی جگہ مصری شمسی کیلنڈر مملکت روما میں نافذ کر دیا، اس کیلنڈر میں پورا سال ۳۶۵ دن اور چھ گھنٹہ کا تسلیم کیا گیا، اور ہر چوتھے سال ایک دن کا اضافہ کر کے اسے ۳۶۶ دنوں کا بنا دیا، اسکی تشکیل اس طرح عمل میں آئی کہ سات مہینے ۳۱ دن کے اور چار مہینے ۳۰ دن کے اور فروری ۲۸ دن

سال میں ۱۱ منٹ ۱۴ سکنڈ کے اضافہ نے اس وقت تک جولین کیلنڈر کو شمسی سال کے مقابلہ میں دس دن آگے بڑھا دیا تھا، اس بے ضابطگی کو دور کرنے کے لئے پاپائے روم گریگوری سیزدہم نے مشہور ہیئت داں ال، گھیرالڈی (LLGHIRALDI) اور ریاضی داں کلیوئیس (CLAVIUS) کے مشورے سے دس دن حذف کرنے کا حکم دیا، کلیوئیس (CLAVIUS) کی مدد سے ایک نیا کیلنڈر ۱۵ اکتوبر ۱۵۸۲ء میں تشکیل پایا جو گریگورین کیلنڈر کہلاتا ہے، اس کی رو سے ہر چوتھے سال فروری میں ایک دن کا اضافہ تو قائم رکھا گیا مگر ۱۱ منٹ اور ۱۴ سکنڈ کے سالانہ اضافہ کی بے قاعدگی کو یوں دور کیا گیا کہ پوری صدی والے سال اسی وقت سال کبیسہ قرار پائیں گے، جب وہ ۴ سے نہیں بلکہ ۴۰۰ سے پورے پورے تقسیم ہو جائیں، چنانچہ ۱۶۰۰ء تو سال کبیسہ قرار پایا، مگر ۱۷۰۰ء، ۱۸۰۰ء اور ۱۹۰۰ء سال کبیسہ قرار نہ پائے، اس طرح چار سو سال کے اندر ۱۱ منٹ اور ۱۴ سکنڈ کے حساب سے تک بھگ ۳ دن کا جو اضافہ ہو سکتا تھا اسے تین پوری صدیوں کے سال کو سال کبیسہ نہ مان کر دور کر دیا گیا، اب ۲۰۰۰ء کو جو ۴۰۰ سے پورا پورا تقسیم ہو جاتا ہے، سال کبیسہ مانا جائیگا، ہیئت دانوں کا خیال تھا کہ اس نہج پر عمل کرنے سے تقریباً چار ہزار برس تک اس کیلنڈر میں مزید ترمیم کی ضرورت نہ پڑے گی، البتہ چار ہزار برس کی مدت گذرنے کے بعد ۲۶ سکنڈ سالانہ کے حساب سے کیلنڈر بھی شمسی سال کے مقابلہ میں ایک دن کے بقدر تجاوز کر جائیگا، اسلئے یہ بھی طے پایا کہ ۴۰۰۰ء اور چار ہزار سے تقسیم ہونے والی صدیاں جیسے ۸۰۰۰ء، ۱۲۰۰۰ء، ۱۶۰۰۰ء وغیرہ بھی سال کبیسہ نہ قرار پائیں گے تاکہ اس کیلنڈر میں مزید کمی بیشی کا امکان ہی نہ رہے،

اس کیلنڈر کا نفاذ اٹلی، فرانس، اسپین اور پرتگال میں ۱۵۸۲ء میں ہوا، فرانس میں یہ کیلنڈر ۱۷۹۳ء تک چلتا رہا، انقلاب فرانس کے بعد جب فرانس کی نئی جمہوریہ قائم ہوئی تو

کی تخلیق چھ دنوں میں ہوئی تھی اور ساتواں دن آرام کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا، دوسری روایت ہے کہ ہفتوں کے دنوں کی تقسیم چاند کے اشکال کی بنا پر ہوئی، کیونکہ قمری مہینہ کی ہر چوتھائی میں چاند کی سات سات شکلیں بنتی ہیں، تیسری روایت یہ ہے کہ ہفتہ کے دنوں کی تعداد سیاروں کی تعداد کے مطابق رکھی گئی تھی، اور ہر دن کو ایک ایک سیارے سے منسوب کر دیا گیا تھا، جیسا کہ مندرجہ ذیل سے ظاہر ہوتا ہے،

Sunday سیارہ سورج کا دن	Wednesday سیارہ عطارد کا دن
Monday سیارہ چاند کا دن	Thursday سیارہ مشتری کا دن
Tuesday سیارہ مریخ کا دن	Friday سیارہ زہرہ کا دن
	Saturday سیارہ زحل کا دن

نوٹ:۔ آج یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ سورج سیارہ نہیں ہے بلکہ ایک روشن ستارہ ہے اور چاند تو کرہ ارض کا ایک تابع ہے،

اگرچہ ہفتہ کے دنوں کی تشکیل نے تاریخ کے تعین کا کام بہت آسان کر دیا، مگر ایک سال کا کیلنڈر دوسرے سال کے لئے قابل استعمال نہ رہتا تھا، اس خامی کے باوجود جولین کیلنڈر اسی نئے انداز پر چلتا رہا،

گری گورین کیلنڈر (GREGORIAN CALENDAR) پاپائے روم گریگوری سیزدہم کے عہد میں یہ اندازہ ہوا کہ جولین کیلنڈر بھی ہیئت دانوں کے سال سے کسی قدر انحراف کر گیا ہے، اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ہر چوتھے سال فروری میں ایک دن یا چوبیس ۲۴ گھنٹے کا اضافہ ضرورت سے زیادہ تھا کیونکہ زمین کو اپنے سالانہ چکر میں ¼ ۳۶۵ دن (۳۶۵ دن اور ۶ گھنٹے) کے بجائے ۳۶۵ دن ۵ گھنٹے ۴۸ منٹ اور ۴۶ سکنڈ درکار ہوتے ہیں، اس حساب سے پورے ایک

کیلنڈروں میں اصلاحی کوششیں | اگرچہ گرگورین کیلنڈر میں علمائے ہیئت اور ریاضی دانوں نے ہر ممکن اصلاح کر کے اسے دائمی کیلنڈر کا رتبہ بخش دیا ہے، مگر اب بھی اس میں ایک خاص کمی یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ کیلنڈر ہر سال کے لئے نیا کیلنڈر ہوتا ہے، مثلاً اگر کسی سال یکم جنوری کو اتوار تھا، تو دوسرے نئے سال میں یکم جنوری کو اتوار کے بجائے دوشنبہ ہوگا، اور سال کبیسہ میں تو دو دن کا فرق پڑجاتا ہے،

کیلنڈر میں اصلاح اور ترمیم کے خاکے بنتے اور بگڑتے رہے، بالآخر بین الاقوامی چیمبر آف کامرس کی ۱۹۲ء کی عرضداشت پر ادارہ جمعیۃ الاقوام (League of Nations) نے ۱۹۲۳ء میں کیلنڈر کی اصلاح کا کام رسل و رسائل کی ایک ٹیکنیکل مجلس شوریٰ کے سپرد کر دیا، اس سلسلے کی ابتدائی میٹنگ جون ۱۹۳۱ء میں منعقد ہوئی، اور اسی سال ماہ اکتوبر میں ایک بین الاقوامی کانفرنس اسی غرض سے طلب کی گئی، کانفرنس میں پانچسو زائد کیلنڈروں کے نمونے پیش کئے گئے، ان میں بہت سے پانچ دن یا چھ دن یا دس دن کا ہفتہ والے کیلنڈر بھی تھے، ایک کیلنڈر ایسا بھی تھا جو ۳۵ دن والے چار مہینوں اور ۲۸ دن والے ۸ مہینوں پر مشتمل تھا، جتنے بھی نمونے پیش کئے گئے، ان میں سے صرف دو قابل توجہ سمجھے گئے، ایک تیرہ مہینوں والا کیلنڈر تھا، اور دوسرا عالمی کیلنڈر تھا۔

تیرہ مہینوں والا کیلنڈر | اس کیلنڈر میں ہر مہینہ چار ہفتوں پر اور سال کا ہر چوتھائی حصہ ۱۳ ہفتوں پر مشتمل تھا، اس طور پر ہر مہینہ ۲۸ دنوں کا اور سال ۳۶۴ دنوں کا رکھا گیا تھا، ایک دن کی کمی ۲۸ دسمبر اور یکم جنوری کے درمیان اضافہ کر کے پوری کی گئی تھی جسے سالانہ دن کے نام سے منسوب کیا گیا تھا، اسی طرح سال کبیسہ میں ایک دن کا اضافہ ۲۸ جون کے بعد کرنا تھا، جو یوم کبیسہ کہلاتا، گرگورین کیلنڈر کے بارہ مہینوں کے نام برقرار رکھے

تو اس نے ایک نیا کیلنڈر ۲۲ ستمبر ۱۷۹۳ء میں جاری کیا، اور ۲۲ ستمبر کی تاریخ نئے سال کا پہلا دن قرار پایا، مگر ۹ ستمبر ۱۸۰۵ء کو جب نپولین اعظم نے حکومت کی باگ ڈور ہاتھ میں لی تو اس نے ایک فرمان کے ذریعہ اس کیلنڈر کو ختم کر کے گریگورین کیلنڈر کو دوبارہ رائج کر دیا، سوئٹزرلینڈ، ہالینڈ، پروشا اور جرمنی کی کیتھولک ریاستوں نے ۱۵۸۳ء میں اس کو اپنا لیا، پولینڈ نے ۱۵۸۶ء میں ہنگری نے ۱۵۸۷ء میں اور جرمنی کی پروٹسٹنٹ ریاستوں نے ۱۷۰۰ء میں اسے اختیار کیا، سویڈن نے ۱۷۰۰ء سے لیکر ۱۷۴۰ء تک پڑنے والے جملہ سالہائے کبیسہ کو سال کبیسہ مان کر اسے اپنے یہاں رواج دیا، برطانیہ نے اپنے یہاں ۱۷۵۲ء میں اس طرح رائج کیا کہ ۳ ستمبر کی تاریخ کو ۱۴ ستمبر مان کر ۱۱ دن کی بیشی کو دور کر دیا، اسی سال یہ کیلنڈر برطانوی نوآبادیات میں بھی جاری کیا گیا، جاپان نے ۱۸۷۳ء میں، چین نے ۱۹۱۲ء میں بلغاریہ نے ۱۹۱۵ء میں روس نے پہلے ۱۹۱۸ء میں پھر ۱۹۲۴ء میں، یوگوسلاویا اور رومانیہ نے ۱۹۱۹ء میں یونان نے ۱۹۲۴ء میں، ترکی نے ۱۹۲۶ء میں اسے اپنے یہاں رائج کیا، آج اسی گریگورین کیلنڈر کا بول بالا ہے، اور اسے اپنی مقبولیت کی بنا پر بین الاقوامی درجہ حاصل ہے، یہ کیلنڈر اس وقت ساری دنیا میں رائج ہے، اسکی جامعیت سے ابتک کسی کو انکار نہیں، پھر بھی ایسے بیدار مغز انسانوں کی کمی نہیں ہے، جو اس میں ایسی ترمیمیں سوچتے رہتے ہیں، جس سے یہ کیلنڈر ہر آنے والے سال پر لاگو ہو کر سہل الاستعمال بن سکے، چنانچہ ۱۸۲۴ء میں ایک رومن کیتھولک پادری مسمی ابی مارکو مستروفین (ABBE MRRCO MASTROFINI) نے اس کیلنڈر میں یہ ترمیم پیش کی کہ ۵۲ ہفتوں کی مناسبت سے سال میں کل ۳۶۴ دن ہونے چاہئیں عام سالوں میں ایک دن اور سال کبیسہ میں دو دن کا اضافہ کر لیا جایا کرے، اس کیلنڈر میں یہ خوبی تھی کہ یکم جنوری ہمیشہ اتوار کو پڑا کرتی،

JULY

S	M	T	W	TH	F	SAT
1	2	3	4	5	6	7
8	9	10	11	12	13	14
15	16	17	18	19	20	21
22	23	24	25	26	27	28

AUGUST

S	M	T	W	TH	F	SAT
1	2	3	4	5	6	7
8	9	10	11	12	13	14
15	16	17	18	19	20	21
22	23	24	25	26	27	28

SEPTEMBER

1	2	3	4	5	6	7
8	9	10	11	12	13	14
15	16	17	18	19	20	21
22	23	24	25	26	27	28

OCTOBER

1	2	3	4	5	6	7
8	9	10	11	12	13	14
15	16	17	18	19	20	21
22	23	24	25	26	27	28

NOVEMBER

S	M	T	W	TH	F	SAT
1	2	3	4	5	6	7
8	9	10	11	12	13	14
15	16	17	18	19	20	21
22	23	24	25	26	27	28

DECEMBER

S	M	T	W	TH	F	SAT
1	2	3	4	5	6	7
8	9	10	11	12	13	14
15	16	17	18	19	20	21
22	23	24	25	26	27	28

YEAR
DAY

Thirteen Month Calendar — تیرہ مہینہ والا کیلنڈر

اگرچہ یہ کیلنڈر ایک دائمی کیلنڈر کی حیثیت رکھتا تھا مگر اس پر اعتراضات کی بھرمار ہو گئی۔ سب سے
زیادہ مخالفت امریکی نمائندوں نے کی۔ ان کا یہ اعتراض حق بجانب تھا کہ امریکہ کا یوم آزادی ۴ جولائی
کے بجائے سول (ماہ sol) کی ۱۷ تاریخ کو پڑتا تھا، جو کسی طرح قابلِ قبول نہ تھا۔ بین الاقوامی چیمبر آف کامرس
نے بھی بہت سی کاروباری پیچیدگیوں کی بنا پر اسے رد کر دیا۔ حکومتوں کے وزرائے مالیات نے بھی

گئے تھے، تیرہواں مہینہ جون اور جولائی کے درمیان سول (sol) کے نام سے نکالا
کہ دی ہوئی شکل سے معلوم ہوتا ہے:-

JANUARY

S	M	T	W	TH	F	SAT
1	2	3	4	5	6	7
8	9	10	11	12	13	14
15	16	17	18	19	20	21
22	23	24	25	26	27	28

FEBRUARY

S	M	T	W	TH	F	SAT
1	2	3	4	5	6	7
8	9	10	11	12	13	14
15	16	17	18	19	20	21
22	23	24	25	26	27	28

MARCH

S	M	T	W	TH	F	SAT
1	2	3	4	5	6	7
8	9	10	11	12	13	14
15	16	17	18	19	20	21
22	23	24	25	26	27	28

APRIL

S	M	T	W	TH	F	SAT
1	2	3	4	5	6	7
8	9	10	11	12	13	14
15	16	17	18	19	20	21
22	23	24	25	26	27	28

MAY

S	M	T	W	TH	F	SAT
1	2	3	4	5	6	7
8	9	10	11	12	13	14
15	16	17	18	19	20	21
22	23	24	25	26	27	28

JUNE

S	M	T	W	TH	F	SAT
1	2	3	4	5	6	7
8	9	10	11	12	13	14
15	16	17	18	17	20	21
22	23	24	25	26	27	28

SOL

یوم کبیسہ ۲۸ جون کے بعد کا دن

سالانہ دن ۲۸ دسمبر کے بعد والا دن

S	M	T	W	TH	F	SAT
1	2	3	4	5	6	7
8	9	10	11	12	13	14
15	16	(17)	18	19	20	21
22	23	24	25	26	27	28

عالمی کیلنڈر (WORLD CALENDAR)

جنوری

یکشنبہ	دوشنبہ	سہ شنبہ	چہارشنبہ	پنجشنبہ	جمعہ	سنیچر
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷
۸	۹	۱۰	۱۱	۱۲	۱۳	۱۴
۱۵	۱۶	۱۷	۱۸	۱۹	۲۰	۲۱
۲۲	۲۳	۲۴	۲۵	۲۶	۲۷	۲۸
۲۹	۳۰	۳۱				

فروری

یکشنبہ	دوشنبہ	سہ شنبہ	چہارشنبہ	پنجشنبہ	جمعہ	سنیچر
			۱	۲	۳	۴
۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۱۱
۱۲	۱۳	۱۴	۱۵	۱۶	۱۷	۱۸
۱۹	۲۰	۲۱	۲۲	۲۳	۲۴	۲۵
۲۶	۲۷	۲۸	۲۹	۳۰		

مارچ

یکشنبہ	دوشنبہ	سہ شنبہ	چہارشنبہ	پنجشنبہ	جمعہ	شنبہ
					۱	۲
۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹
۱۰	۱۱	۱۲	۱۳	۱۴	۱۵	۱۶
۱۷	۱۸	۱۹	۲۰	۲۱	۲۲	۲۳
۲۴	۲۵	۲۶	۲۷	۲۸	۲۹	۳۰

اپریل

یکشنبہ	دوشنبہ	سہ شنبہ	چہارشنبہ	پنجشنبہ	جمعہ	شنبہ
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷
۸	۹	۱۰	۱۱	۱۲	۱۳	۱۴
۱۵	۱۶	۱۷	۱۸	۱۹	۲۰	۲۱
۲۲	۲۳	۲۴	۲۵	۲۶	۲۷	۲۸
۲۹	۳۰	۳۱				

مئی

یکشنبہ	دوشنبہ	سہ شنبہ	چہارشنبہ	پنجشنبہ	جمعہ	شنبہ
			۱	۲	۳	۴
۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۱۱
۱۲	۱۳	۱۴	۱۵	۱۶	۱۷	۱۸
۱۹	۲۰	۲۱	۲۲	۲۳	۲۴	۲۵
۲۶	۲۷	۲۸	۲۹	۳۰		

جون

یکشنبہ	دوشنبہ	سہ شنبہ	چہارشنبہ	پنجشنبہ	جمعہ	شنبہ
					۱	۲
۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹
۱۰	۱۱	۱۲	۱۳	۱۴	۱۵	۱۶
۱۷	۱۸	۱۹	۲۰	۲۱	۲۲	۲۳
۲۴	۲۵	۲۶	۲۷	۲۸	۲۹	۳۰

W**

W** سے مراد یوم کبیسہ (LEAPYEAR DAY)

اسکی مخالفت کی، اسلئے یہ کیلنڈر گریگورین کیلنڈر کا نعم البدل بننے کے قابل نہ سمجھا گیا،

عالمی کیلنڈر اس کیلنڈر کو ہر مکتبۂ خیال کے لوگوں نے پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا، اس میں گریگورین کیلنڈر کے بارہ مہینے برقرار رکھے گئے ہیں، سال کا ہر چوتھائی حصہ ۹۱ دنوں یا ۱۳ ہفتوں یا تین مہینوں پر مشتمل ہوتا ہے، سال کے ہر چوتھائی کے تینوں مہینے بالترتیب ۳۱-۳۰-۳۰ دنوں کے رکھے گئے ہیں ہر مہینہ ہفتہ کے ۲۶ دنوں اور اس مہینہ میں پڑنے والے اتوار کی تعداد پر مشتمل ہوتا ہے، اس کیلنڈر کی خوبی یہ ہے کہ ایک سال کا کیلنڈر سال بہ سال کام دیتا رہے گا، مثلاً یکم جنوری کو اگر یکشنبہ ہے، تو ہر سال یکم جنوری کو یکشنبہ ہی رہے گا، ۲۶ جنوری یا ہمارا یوم جمہوریہ ہمیشہ پنجشنبہ کو، یوم آزادی یا ۱۵ اگست ہمیشہ چہارشنبہ کو گاندھی جینتی یا ۲ اکتوبر ہمیشہ دوشنبہ کو، ۱۴ نومبر یا یوم اطفال ہمیشہ سہ شنبہ کو، کرسمس یا ۲۵ دسمبر ہمیشہ دوشنبہ کو اور سال کی آخری تاریخ ہمیشہ شنبہ کو پڑا کریں گی،

ہر چوتھائی میں ۹۱ دن ہونے کی وجہ سے سال میں کل ۳۶۴ دن ہونگے، چونکہ سال میں ۳۶۵ دن ہوتے ہیں، اس لئے ۳۰ دسمبر اور یکم جنوری کے درمیان ایک دن کا اضافہ کرکے اسے عالمی دن (WORLD'S DAY) تسلیم کیا جائیگا، جو ساری دنیا میں تعطیل کا دن ہوگا، اس سال کبیسہ میں ۳۰ جون اور یکم جولائی کے درمیان ایک دن کا اضافہ کرکے یوم کبیسہ قرار پائیگا، یہ دن بھی عام تعطیل کا دن ہوگا، عالمی دن (WORLD'S DAY) اور یوم کبیسہ (LEAPY DAY) بالترتیب W. DECEMBER اور (JUNE W) کہلائیں گے یہ عالمی کیلنڈر اور گریگورین کیلنڈر یکم ستمبر سے ۲۸ فروری تک ایک دوسرے سے مماثلت بھی رکھتے ہیں، اس کیلنڈر کی تشکیل مندرجہ ذیل شکل میں ملاحظہ ہو،

جب سنہ ۱۹۳۷ء میں جمعیۃ الاقوام (League of Nations) نے ممبر ملکوں اور غیر ممبر ملکوں سے اس عالمی کیلنڈر پر رائے طلب کی تو ۱۴ ملکوں نے اس کیلنڈر کے حق میں رائے دی، ۲ ملکوں نے اسے مسترد کر دیا، ۸ ملکوں نے خاموشی اختیار کر لی، ۱۰ ملکوں نے جواب دینے سے انکار کر دیا اور سات ملکوں نے کہا کہ نئے کیلنڈر کا نفاذ ابھی قبل از وقت ہے، اور زمانہ بھی سازگار نہیں ہے، کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ محوری طاقتیں زور پکڑ رہی تھیں اور ان کی جارحانہ کارروائیاں نہ صرف براعظم یورپ اور مشرقی ایشیا میں ہیجانی کیفیت پیدا کئے ہوئے تھیں بلکہ امن عالم کو بھی خطرہ لاحق ہو گیا تھا، اس لئے نئے کیلنڈر کے نفاذ کا سوال عالمی کشمکش کی بنا پر التوا میں پڑ گیا،

یہ عالمی کیلنڈر (WORLD CALENDAR) اب یو۔ این۔ او کے زیر غور ہے، اسے کافی مقبولیت حاصل ہو رہی ہے، ہو سکتا ہے یہی کیلنڈر مستقبل قریب میں ساری دنیا میں رائج ہو جائے کیا ہی اچھا ہوتا اگر یو۔ این۔ او میں مزدوروں کی زبانی حمایت کرنے والے نمائندے، تیرہ ۱۳ مہینہ والا کیلنڈر لانے کی کوشش کرتے تاکہ محنت کش طبقہ کی کچھ تشفی ہو سکتی۔

جولائی

یکشنبہ	دوشنبہ	سہ شنبہ	چہارشنبہ	پنجشنبہ	جمعہ	شنبہ
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷
۸	۹	۱۰	۱۱	۱۲	۱۳	۱۴
۱۵	۱۶	۱۷	۱۸	۱۹	۲۰	۲۱
۲۲	۲۳	۲۴	۲۵	۲۶	۲۷	۲۸
۲۹	۳۰	۳۱				

اگست

یکشنبہ	دوشنبہ	سہ شنبہ	چہارشنبہ	پنجشنبہ	جمعہ	شنبہ
			۱	۲	۳	۴
۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۱۱
۱۲	۱۳	۱۴	۱۵	۱۶	۱۷	۱۸
۱۹	۲۰	۲۱	۲۲	۲۳	۲۴	۲۵
۲۶	۲۷	۲۸	۲۹	۳۰		

ستمبر

یکشنبہ	دوشنبہ	سہ شنبہ	چہارشنبہ	پنجشنبہ	جمعہ	شنبہ
					۱	۲
۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹
۱۰	۱۱	۱۲	۱۳	۱۴	۱۵	۱۶
۱۷	۱۸	۱۹	۲۰	۲۱	۲۲	۲۳
۲۴	۲۵	۲۶	۲۷	۲۸	۲۹	۳۰

اکتوبر

یکشنبہ	دوشنبہ	سہ شنبہ	چہارشنبہ	پنجشنبہ	جمعہ	شنبہ
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷
۸	۹	۱۰	۱۱	۱۲	۱۳	۱۴
۱۵	۱۶	۱۷	۱۸	۱۹	۲۰	۲۱
۲۲	۲۳	۲۴	۲۵	۲۶	۲۷	۲۸
۲۹	۳۰	۳۱				

نومبر

یکشنبہ	دوشنبہ	سہ شنبہ	چہارشنبہ	پنجشنبہ	جمعہ	شنبہ
			۱	۲	۳	۴
۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۱۱
۱۲	۱۳	۱۴	۱۵	۱۶	۱۷	۱۸
۱۹	۲۰	۲۱	۲۲	۲۳	۲۴	۲۵
۲۶	۲۷	۲۸	۲۹	۳۰		

دسمبر

یکشنبہ	دوشنبہ	سہ شنبہ	چہارشنبہ	پنجشنبہ	جمعہ	شنبہ
					۱	۲
۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹
۱۰	۱۱	۱۲	۱۳	۱۴	۱۵	۱۶
۱۷	۱۸	۱۹	۲۰	۲۱	۲۲	۲۳
۲۴	۲۵	۲۶	۲۷	۲۸	۲۹	۳۰
						W ★

W ★ سے مراد عالمی دن (WORLD'S DAY)

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست　　　بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

حسینوں کی خوبی محض کرشمہ و ناز اور طرزِ خرام نہیں ہے، ان کی بہت سی ایسی ادائیں ہیں جن کا کوئی نام ہی نہیں ہے، اور نام لے کر انکو نہیں بتایا جا سکتا۔

بروزِ حشر فغانی ز باز پرس مترس　　　تو بیکسی و غریبی ترا چہ می پرسد

فغانی حشر کی باز پرس سے مت ڈرو، تم بیکس اور غریب ہو تمکو کون پوچھے گا، پرسش تو بڑے لوگوں کی ہوتی ہے۔

چو شبنم صبحدم گریاں بگلگشتِ چمن رفتم　　　نہادم روے بر روئے گل از خویشتن رفتم

صبح کے وقت شبنم کی طرح روتا ہوا چمن کی سیر کے لئے گیا اور کسی گل چہرہ کی یاد میں پھول کے منھ پر منھ رکھکر از خود رفتہ ہوگیا۔

بزعمِ من کشد بر دیگراں شمشیر و می ترسم　　　کہ در روزِ جزا خواہند خون صد شہید از من

وہ دوسروں پر مجھ جیسا سمجھکر تلوار کھینچتا ہے اس لئے مجھے ڈر ہے کہ روزِ جزا مجھ سے سیکڑوں شہیدوں کے خون کا مطالبہ کریں گے کیونکہ میری وفا کے دھوکے میں انکو قتل کیا ہے۔

نورعلی تبریزی

ہر کس کہ جاں سپرد حیاتِ ابد گرفت　　　از ہیچ کشتہ قاتلِ ما شرمسار نیست

محبوب نے جن لوگوں کو قتل کیا ہے یا اسکی محبت میں جنکی جان گئی ہے ان کو ابدی زندگی حاصل ہوگئی، اس لئے میرے قاتل کو کسی سے شرمندگی نہیں ہے، شرمندگی تو ہلاکت پر ہوتی ہے نہ کہ ابدی زندگی پر۔

منادی می کند امروز زنارِ سرِ زلفش　　　کہ بے ایماں بمیرد ہر کہ ایماں را نگہ دارد

محبوب کے زلف کی زنار منادی کرتی ہے کہ جو شخص اس زنار (زنار غیر مسلموں کے ساتھ

خریطۂ جواہر

از شاہ معین الدین احمد ندوی

(۵)

بگمہ در قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا　　　کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

عشق کی راہ اتنی طویل اور دشوار گذار ہے کہ دوڑنے سے بھی طے نہیں ہوتی بلکہ انگور کی بیل کی طرح قطع کرنے سے (کاٹنے) اور بڑھتی ہے، "قطع" کے لفظ سے یہ مضمون پیدا کیا ہے۔

حاجی اسمٰعیل غافل

کار آسان نیست بے او زیستن　　　سخت جانیہا حساب دیگر است

محبوب کے بغیر جینا آسان نہیں ہے، یہ اور بات ہے کہ سخت جانی نہ مرنے دے اور اسکی بدولت زندہ رہوں، کار آسان اور سخت جانی کی مناسبت سے مضمون پیدا کیا ہے۔

فرخی

ترا چہ غم کہ ترا ہر کسے بجائے من است　　　مراست غم کہ مرا ہیچ کس بجائے تو نیست

تجھے کیا غم کہ میری طرح تیرا ہر شخص چاہنے والا ہے، غم مجھے ہے کہ میرے لئے تیرا کوئی بدل نہیں، اور تیرے سوا میرا کوئی نہیں۔

فغانی شیرازی

نظر آیا، واقعہ کے لحاظ سے بھی یہ صحیح ہے کہ محبوب کا حسن زمین پر ہے اور چاند آسمان پر۔

ذوقی سبزواری

گرد سرت شوم بعزونی ستم مکن — آخر چہ شد اسیر تو شد بندۂ خدا است

تیرے سر کے قربان اتنا زیادہ ستم نہ کر اگر فلاں تیرا مبتلا ہو گیا تو کیا ہوا، آخر وہ بھی تو خدا کا بندہ ہے۔

محمود بیگ فسونی

من کز نوید آمدن تو بیخبر شدم — آں از زماں کہ بہ من بیخبر رسید

میں تیرے آنے کی خوشخبری سن کر اپنے سے بیخبر ہو گیا، آہ! تو ایسے وقت آیا کہ میں بیخبر ہو چکا تھا،

شفیقی مروزی

عالم ماتمی [illegible] ما پر است — شد عندلیب خاک و چمن از نوا پر است

میں [illegible] میں نہ رہا لیکن وہ اب بھی میری فغاں و فریاد سے بھری ہوئی ہے، عندلیب تو خاک ہو گئی لیکن چمن اس کی نواؤں سے معمور ہے،

خوباں ہزار سنگ جفا بر دلم زدند — ایں شیشۂ شکستہ ہنوز از وفا پر است

حسینوں نے میرے دل پر جور و ظلم کے ہزاروں پتھر برسائے لیکن یہ ٹوٹا ہوا شیشہ اب تک وفا سے معمور ہے ان کے ظلم سے اس کی وفا میں فرق نہیں آیا۔

شربت وصل کند رنج من افزوں حکیم — ہیچ کس را خبرے از دل بیمارم نیست

میں کیا کروں شربت وصل بھی میرے رنج و بیماری کو بڑھاتا ہے، کسی کو بھی میرے دل بیمار کی خبر نہیں ہے کہ اس کا صحیح علاج کر سکے۔

در مذہب ما ہر چہ بجز دوست حرام است — گر خود ہمہ ذوق طلب دوست حرام است

مخصوص اور انکا مذہبی نشان ہے، اور زلف کی صفت کیلئے آتا ہے) کے مقابلہ میں ایمان کی حفاظت کرے گا وہ کافر مرے گا عشق بتاں کی زنار سے وابستگی ہی ایمان ہے۔

میر فائض نظری

ز درد ما اگر آگہ نئی عجب نبود غرور حسن ترا از تو بیخبر دارد

اگر تو میرے درد دل سے واقف نہیں ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، تیرا غرور حسن تو تجھکو خود اپنے سے بھی بیخبر رکھتا ہے۔

میر فائض گیلانی

عشق پیش از اجلم کشت و بمردن نگذاشت شادم از اینکہ مرا دوست بدشمن نگذاشت

عشق نے مجھے اجل مقررہ سے پہلے ہی مار ڈالا اور (ایڑیاں رگڑ رگڑ کر) مرنے کیلئے نہیں رہنے دیا، اس کی مجھے خوشی ہے کہ دوست (عشق) نے مجھے دشمن (موت) کے ہاتھوں میں نہیں چھوڑا۔

نمیدانم ز منع گریہ مطلب چیست ناصح را دل از من دیدہ از من وکنار از من

دل بھی میرا اپنے آنکھیں بھی میری ہیں آغوش بھی میری ہے، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ رونے سے منع کرنے سے ناصح کا مطلب کیا ہے جو کچھ نقصان پہونچتا ہے وہ مجھکو پہنچتا ہے اس کا کیا بگڑتا ہے۔

میر علی رضو ثنائی

غبارم کن خدایا در رہے کاں ماہ می گذرد او دامان کشاں روزے مرا از خاک بردارد

اے خدا مجھے اس گلی کا غبار بنا دے جس سے وہ ماہرو گذرتا ہے کہ کسی دن وہ دامن کشاں گذرے اور مجھکو خاک سے اٹھا لے یعنی میری خاک کی دامن سے لپٹ جائے۔

بمیزان نظر حسن ترا با ماہ سنجیدم میان ایں و آں فرق زمیں تا آسماں دیدم

میں نے تیرے اور چاند کے حسن کو نظر کے ترازو میں تولا تو اس میں زمین و آسمان کا فرق

ذریب سعی نصیبی مخور کہ کعبۂ وصل — بدلنوازی پائے شکستہ می آید

نصیبی سعی (اس سے مراد ہے حج کی سعی جس میں دو پہاڑیوں کے درمیان، دوڑنا پڑتا ہے)
کے فریب میں نہ آؤ اس لئے کہ کعبۂ وصل خود شکستہ پا لوگوں کی دلداری کے لئے آتا ہے (یعنی
رحمت الٰہی خود اس کی طرف متوجہ ہوتی ہے) اصل چیز دل کا گداز اور شکستگی ہے، اس شعر کا
مفہوم اردو کے اس شعر سے واضح ہوگا۔

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ — جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

مسکین نصیبی دوش جاں می داد و می نالید غم — کامشب چراغ زندگی مارا ز بالیں میرود

نصیبی مسکین کل جب جان دے رہا تھا تو غم نالہ کر رہا تھا کہ آج میری زندگی کا چراغ مرے
سرہانے سے گل ہو رہا ہے اس لئے کہ غم کی زندگی اس سے وابستہ تھی، اب اسکا اٹھانے والا کوئی
نہ رہا۔

فریفتہ دا بر نوک مژگان ستم کیشان شدم — آں قدر زخمیکہ دل می خواست در پیکان نبود

میرا دل جتنی جراحت کا طالب تھا وہ پیکان کے زخم میں نہ تھی اس لئے اپنے کو ستم کیشوں
کی مژگان کا ہدف بنایا ہے کہ انکا زخم پیکان سے زیادہ کاری ہے۔

جان فدائے جذبہ حسنے کہ ہر سو بنگرم — موکشاں نظارہ ام را جانب خویش آورد

میں اس جذبۂ حسن پر فدا ہوں کہ میں جس طرف بھی نظر ڈالتا ہوں، نظارہ میرے بال پکڑ
کر اپنی طرف کھینچ لاتا ہے یعنی نظر سر پھر کر اپنے اصلی مرکز حسن پر آجاتی ہے۔

نصیبی ہمدانی

دلا عذرت چساں خواہم کہ ہیچ از من نیاسودی

دو روزے کاندریں محنت سرا مہمان من بودی

میرے مذہب میں دوست کے سوا جو کچھ بھی ہے سب حرام ہے حتیٰ کہ اسکی طلب بھی حرام ہے کہ وہ بھی دوست کی غیر ہے۔

غمہائے مردہ را در دلم زندہ کرد ہجر گویا شبِ فراق تو روز قیامت است

تیرے ہجر نے مرے ہوئے اور بھولے ہوئے غموں کو دلمیں زندہ کر دیا گویا شب فراق بھی قیامت ہے جس میں مردے زندہ ہو جائیں گے۔

ترا چہ جرم کہ حکم غرور حسن این است کہ وعدہائے تو از صد یکے وفا نشود

اگر تونے وعدہ پورا نہیں کیا تو اس میں تیرا قصور نہیں، غرور حسن کا تو یہ حکم ہی ہے کہ سیکڑوں وعدوں میں ایک وعدہ بھی پورا نہ ہو، اس میں تیرا کیا قصور ہے۔

نالہائے تو گرفتارانِ غم را لذتیست ورنہ این یک مشت پر مقصود صیادم نبود

درحقیقت نئے غم زدہ اسیروں کے نالہ وفغاں میں ایک لذت ہے، ورنہ صیاد کے گرفتار کرنے کا مقصد محض ایک مشتِ پر نہیں ہے، ہمیں کیا رکھا ہے، نالہ کی لذت نے گرفتار کرایا۔

اردو کا شعر ہے،

شکوہ صیاد کا اے بلبل شوریدہ نکر تو گرفتار ہوئی اپنی صدا کے باعث

میدرد ہر دم گریبان فیضی این زمان سالہا دستے کہ در داماں ننگ و نام بود

فیضی جو ہاتھ برسوں ننگ و نام کا دامن سنبھالے ہوئے تھا اب وہ ہر وقت گریبان کو پھاڑ کر ننگ و نام کو خیرباد کہہ رہا ہے۔

شہید رسم دیارے شدم کہ بعد از مرگ طبیب بر سر بالین خستہ می آید

میں اس دیار کے اس دستور پر قربان جہاں مرنے کے بعد طبیب بیمار کے سرہانے آتا ہے یعنی محبوب کے دیار کا دستور ہے کہ وہ اپنے بیمار عشق کے پاس مرنے کے بعد آتا ہے۔

بہ حرمت اشک غیرم کشت دنتوانم کہ برخیزم پس از عمرے من غم دیدہ را روز وصال این است

تیری بزم میں رقیب کے رشک نے مار ڈالا مجھ میں اٹھنے کی طاقت نہیں رہی ایک عمر کے بعد مجھ غم زدہ کو روز وصال ملا بھی تو یہ ملا کہ رقیب کی موجودگی نے اور زیادہ جان پر بنا دی۔

مولانا فہمی کاشانی

بہ ہیچو منے جلوہ گریہائے تو حیف است بگذار مرا تا بہ تمنائے تو میرم

مجھ جیسے شخص کیلئے تیری جلوہ آرائی تاسف انگیز ہے، مجھکو تو اپنی تمنا میں مرنے کے لئے چھوڑ دے، یعنی میں اسقدر حقیر ہوں کہ تیرے جلوے کے شایان شان نہیں یا تیرے عشق میں اتنا صادق ہوں کہ مجھکو تیرے جلوے کی ضرورت نہیں میرا کام تو تیری تمنا میں جان دیدینا ہے،

فیضی نشاید مردہ مجنون را تا چو من خانماں خرابے ہست

جبتک مجھ جیسا خانہ خراب موجود ہے اسوقت تک مجنوں کو مردہ نہ سمجھو کہ مجھ سے اسکا نام زندہ ہے۔

در میکدہ امروز نہ جام و نہ شراب است اینہا ہمہ از محتسب خانہ خراب است

آج میکدہ میں نہ جام ہی نظر آتا ہے نہ شراب، یہ ویرانی محتسب خانہ خراب کی لائی ہوئی ہے۔ اس شعر میں "خانہ خراب" نے جان ڈال دی ہے میخانہ کی ویرانی یہی ہے کہ وہ جام و شراب سے خالی ہے۔

ہمیشہ دست بہ سر می زنی چہ شد فیضی مگر ز دست تو کار دگر نمی آید

فیضی تجھکو یہ کیا ہوگیا ہے کہ ہمیشہ سر پیٹتا رہتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ تیرے ہاتھوں کو اسکے سوا کوئی کام نہیں آتا۔

بنالہ شہرت عشق است عندلیب و رنہ نفس گداختہ مرغان دریں چمن ہستند

دل سے کہتا ہے کہ میں اس تقصیر کی کیا معذرت کروں کہ اس محنت سرا یعنی دنیا میں صرف دو دن تو میرا مہمان رہا اور میں اس میں بھی تیری آرزوں کو پورا نہ کر سکا۔

حکیم فغفوری

ملاحت تو گواہ است و شورہ بختی من — کہ با نمک سرشتند خاک آدم را

تیری ملاحت اور میری شورہ بختی اسکی گواہ ہے کہ کارکنانِ قضا و قدر نے آدم کی مٹی کو نمک سے گوندھا ہے، تیری ملاحت میری شورہ بختی اسی کا نتیجہ ہے۔

روز محشر چوں برآرم بانگ اینک قاتلم — شور برخیزد کہ تہمت بر مسیحا بستۂ

اگر میں حشر کے دن آواز دیکر بتاؤں کہ میرا قاتل یہی ہے تو ایک شور بپا ہو جائیگا کہ تو مسیحا پر تہمت لگا رہا ہے، یعنی اس کو دیکھ کر الٹے سب بھی کو مجرم بنائینگے۔

قاضی احمد نگاری

اے فدایت جانِ من اکنوں غم من میخوری — کز غم عشق تو کار من ز غمخواری گذشت

میری جان تجھ سے قربان۔ اب تو میری غمخواری کر رہا ہے، جب تیرے غم عشق نے میرا کام تمام کر دیا اور میری حالت غمخواری کی حد سے گذر چکی۔

او ز من از بیم بدنامی گریزان و کسے — زو نمی پرسد کہ ایں بیچارہ بدنام از چہ شد

وہ مجھ سے بدنامی کے خوف سے گریز کرتا ہے اور کوئی اس سے یہ نہیں پوچھتا کہ یہ بیچارہ بدنام کس کے لئے ہوا ہے، یعنی جو بدنامی کا سبب ہے وہ ہی بدنامی کا خوف کرتا ہے۔

نمیدانم چہ بد کردم کہ بر خود کردہ ام لازم — کہ من از بزم تو ہر بار ناخوشنود برخیزم

مجھے خود نہیں معلوم کہ میں نے یہ کونسی عادت بد اختیار کی ہے کہ اپنے پر یہ فرض بنا لیا ہے کہ جب بھی تیری بزم سے اٹھوں تو ناخوش ہی اٹھوں، یعنی ہمیشہ ناخوش اٹھتا ہوں۔

عشق کے اس مذہب و آئین پر فدا ہوں کہ محشرِ محبت میں نہ کوئی گناہ پوچھتا ہے اور نہ
کوئی گناہگار ہوتا ہے یعنی محبت کے آئین میں عشق کوئی گناہ نہیں۔

دیدہ ام راکہ غنی بود بصد گنج گہر — این زماں کار بافشردن مژگان افتاد

میری آنکھیں جنکے پاس جواہرات کے سیکڑوں خزانے تھے اب ان کو مژگان نچوڑنے کی
نوبت آگئی ہے یعنی ایک زمانہ میں آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہتا تھا اب وہ روتے روتے خشک ہوگئے ہیں

اے دل بخوردن مے وصلش مکن شتاب — این زہر نیست آنکہ بآسان فرو برم

دل سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ محبوب کے شربتِ وصل پینے کی جلدی نہ کر یہ زہر نہیں ہے کہ
آسانی سے حلق سے اتر جائے، اسکا پینا زہر سے زیادہ سخت ہے۔

آن بلبلم کہ شد دلم از اضطراب خون — از بسکہ سینہ سخت بچوب قفس زدم

میں وہ بلبل ہوں کہ بیقراری کیوجہ سے دل خون ہوگیا کیونکہ میں نے شدتِ اضطراب میں
قفس کی تیلیوں پر سینہ کو زور زور سے ٹپکا ہے،

شدم بباغ کہ تسکین دل وہم دیدم — میان بلبل وگل گرمی کہ داغ شدم

میں دل کو تسلی دینے کیلئے باغ کی سیر کو گیا تھا، وہاں بلبل وگل میں اختلاط کی گرمی دیکھکر تسلی
کے بجائے دل اور رنجیدہ ہوگیا۔ کہ کاش محبوب کے ساتھ بھی گرمی مجھے حاصل ہوتی

مرزا انوری: زشرم وعدہ خلافی مکن کنار از من — نیامدن ز تو و ذوق انتظار از من

وعدہ خلافی کی شرم سے مجھسے کنارہ کشی اختیار نہ کر تیرا نہ آنا اور میرا انتظار کرنا تو معمول بن
گیا ہے اسلئے شرم کی ضرورت نہیں۔

وفائے وعدہ همیں بس کہ در دلت گذرد — کہ آن اسیر کشاکش در انتظار من است

میرے لئے اشتیاق بخشنے وعدہ کافی ہے کہ تیرے دل میں یہ خیال آجائے کہ یہ کشمکش اسیر میرے انتظار میں ہے۔

بلبل کے عشق کی شہرت اس کے نالہ کی وجہ سے ہے ورنہ اس چمن میں اور بھی دل گداختہ طیور ہیں مگر وہ نالہ نہیں کرتے اس لئے ان کی شہرت نہیں۔

از جلوہ بیارام دمے کایں ہمہ خوبی در حوصلۂ دیدہ، بہ یکبار نہ گنجد

ذرا دم لے لے کر اور ٹھہر ٹھہر کر جلوہ دکھا اس لئے کہ تیرا سارا حسن میری کم حوصلہ آنکھوں میں اکبارگی نہیں سما سکتا۔

ابو تراب بیگ فرقتی

ناحقم گر کشتۂ از قتل من منکر مشو خون چوں من بیکسے خود قابل انکار نیست

اگر تو نے مجھے ناحق قتل کیا ہے تو میرے قتل سے انکار کرنے کی ضرورت نہیں میرے جیسے بیکس، بینوا کے خون کی قیمت ہی کیا ہے کہ اس سے انکار کیا جائے۔

نیست ما را بچمن رغبتے اے مرغ سحر تعزیت خانہ مرغانِ گرفتار کجا ست

مرغ سحر سے کہتا ہے کہ مجھکو چمن کی کوئی رغبت نہیں ہے مجھے تو مرغان گرفتار کا تعزیت خانہ بتاؤ جہاں انکی دلداری کیجاتی ہو۔

یار مستغنی فلک نامہرباں طالع زبوں اے اجل رحمے بحالم کن کہ وقتِ مردن است

محبوب میری طرف سے بے پروا، آسمان نامہرباں اور قسمت بری ہے ایسی حالت میں اے اجل تیرے رحم کی ضرورت ہے کہ موت کا وقت قریب آگیا ہے تیری ہی مہربانی سے یہ مشکل آسان ہو سکتی ہے۔

ز بحرے دارم امید خلاصی کہ ہر موجے مزار ناخدا است

مجھے ایسے متلاطم سمندر سے رہائی کی امید ہے، کہ جسکی ہر موج کسی نہ کسی ناخدا کا مزار ہے یعنی جس بحر پایاں میں بڑے بڑے ڈوب گئے اس سے رہائی کی امید کیسی سادہ لوحی ہے۔

سر کیش عشق گردم کہ بہ محشر محبت نہ کسے گناہ پرسد نہ کسے گناہ دارد

عاشق کی نظر معشوق کی زلف، رخ اور خال، یعنی ظاہری حسن پر نہیں اس سے بلند اور ماورا رہے تو اس راز سے واقف ہے کہ اس کے عشق کا سر رشتہ کہاں ہے،

مرزا معز فطرت

میکنی بدنام اے قاصد چرا خوب مرا صد جواب از پارہ کردن داد مکتوب مرا

قاصد سے کہتا ہے کہ تو میرے پیارے کو کیوں بدنام کرتا ہے میرے خط کو پھاڑ کر اس نے اس کے سینکڑوں جواب دیدیے،

ستم لطفیست گر پائے محبت درمیاں باشد دل از دست تو زخمے خورد گفتم نوش جاں بادا

اگر محبت ہو تو ستم میں بھی لطف ہے، چنانچہ جب میرے دل نے تیرے ہاتھوں سے زخم کھایا تو میں نے کہا "نوش جان ہو" یہ دعائیہ فقرہ کھانے کے موقع پر بولا جاتا ہے۔

فطرت نامہربانیہائے یارم باک نیست گر دل ایں بیوفا سنگ است من دیوانہ ام

فطرت میں محبوب کی بے مہری سے نہیں ڈرتا اگر اس بیوفا کا دل پتھر ہے تو میں بھی دیوانہ ہوں جو پتھر سے نہیں ڈرتا اس پر تو پتھر برسائے جاتے ہیں،

میر شمس الدین فقیر

خوش دست یابکہ شود صرف یار جانی ما دگر برائے چہ کار است زندگانی ما

یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے کہ میری زندگی محبوب کی راہ میں صرف ہو اس کے سوا وہ ہے کس کام کے لئے۔

فقیر از سعادت ہمیں قدر کافیست کہ منتے بسرش سایہ ہماں نگذاشت

فقیر کی خوش بختی کے لئے اتنا کافی ہے کہ اس کے سر پر ہما کے سایہ کا احسان نہیں ہے ہما کا سایہ خوش نصیبی کی علامت سمجھتا ہے، جو حاصل نہیں ہے، اس لئے اس کا احسان بھی نہیں ہے،

حقیقانی فوجی نیشاپوری

سر کوے تو نباشد سر کوے دگرے بہر این بلبل شوریدہ چمن بسیاست

اس بلبل شوریدہ سر (یعنی میرے) لئے بہتیرے چمن ہیں مگر تیری گلی کا کوئی گلی بدل نہیں ہے اس لئے میں کسی دوسرے چمن اور گلی میں نہیں جا سکتا، ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بلبل کے لئے تو بہت چمن ہیں لیکن میرے لئے تیری گلی کے سوا اور کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔

بخاطر نگذارم آرزوے وصل میتر سم زبہر کینہ ام کارے بدست روزگار افتد

میں اس خوف سے تیرے وصل کی آرزو دل میں نہیں لاتا کہ مجھ سے کینہ رکھنے کے لئے زمانہ کو جو میری آرزو کا دشمن ہے، میرے ستانے کا ایک بہانہ ملجائے گا،

آبے زدہ بر آتش او گریۂ معشوق خاکستر پر سوختہ پروانہ بہ از من

پروانہ کے جلے ہوئے پر کی خاکستر بھی مجھ سے بہتر ہے اس پر اس کے معشوق (شمع) کے آنسو پانی تو چھڑک دیتے ہیں، میری قسمت میں یہ بھی نہیں،

فوجی نمی خواہم کہ بوئے پیرہن از نزد یار آید گرفتم دیدہ روشن کرد بے رویش چہ کار آید

میں نہیں چاہتا کہ محبوب کے پیرہن کی خوشبو میرے پاس آئے، میں نے مانا کہ وہ آنکھوں کو روشن کردے گی مگر اس کے رخ روشن کے بغیر کس کام کی،

کرا دماغ کہ از کوئے یار برخیزد نشستہ ایم کہ از ما غبار برخیزد

محبوب کی گلی سے اٹھنے کا ہوش کس کو ہے میں تو اس عزم سے بیٹھا ہوں کہ میرا غبار ہی اس گلی سے اٹھے گا۔

زرکش فریجی

نظر بہ زلف و رخ و خال نیست عاشق را تو واقفی کہ سر رشتہ در کجا بند است

چھوڑ کر چلا جائے اور کام تمام نہ ہو سکے،

قیدی شیرازی

بنا حق کشتگان چوں من بسے داری مترسم کہ نگذارد کسے با من ترا روز قیامت ہم

میرے جیسے بہتوں کا خون ناحق تیری گردن پر ہے مجھے ڈر ہے وہ سب خون کے مدعی ہوں گے اور قیامت میں بھی کوئی شخص تجھکو میرے لئے تنہا نہ چھوڑے گا، وہاں بھی رقیب پیدا ہو جائیں گے،

قوسی تبریزی:۔

داغ فرزندے کند فرزند دیگر را عزیز تنگ تر گیرد ز مجنوں در بغل صحرا مرا

ایک اولاد کی موت کا داغ دوسری اولاد کو اور عزیز بنا دیتا ہے اس لئے مجنوں کے بعد صحرا مجھکو مجنوں سے زیادہ محبوب رکھتا ہے،

قیلان بیگ

خوں گشت مرا از ہجر یاراں دیدہ زیں غم شدہ چوں سیل بہاراں دیدہ

گر دست بمن زنند میریزد اشک مانند درختہائے باراں دیدہ

دوستوں کی جدائی سے آنکھیں خون اور انکے غم میں موسم بہار کا سیلاب بن گئی ہیں، (بہار کا سیلاب زیادہ شدید ہوتا ہے) اگر کوئی مجھ پر ہاتھ مارے تو آنسو بہنے لگتے ہیں جسطرح اس درخت پر ہاتھ مارنے سے جس پر پانی برسا ہو پانی کے قطرے ٹپکنے لگتے ہیں،

ملا محمد جان قدسی

قدسی از چاک پیرہن گل حسد بریم کاں ہم چرا نصیب گریبان ما نشد

قدسی پیراہن گل کے چاک پر مجھکو حسد آتا ہے کہ اسکا چاک بھی میرے گریبان کے حصہ میں کیوں نہ آیا۔

قاسم اردستانی

از راہ دیدہ می گذرد پارہاے دل		مانند برگ گل کہ بر آب روان دہند

آنکھوں کی راہ دل کے ٹکڑے اس طرح بہتے ہیں جیسطرح پھول کی پنکھڑی کو پانی میں بہا دیتے ہیں،

ملا قدری شیرازی

بہر نگاہ تو قصد خون اگر کنم دعوی		زمانہ با ہمہ خصمی گواہ من باشد

اگر میں تیری ہر ایک نگاہ پر سیکڑوں خون کا دعوی کردوں تو زمانہ اپنی دشمنی کے باوجود میری گواہی دے گا، یعنی تیری نگاہوں کی خونریزی اسقدر مسلم ہے کہ دشمن بھی انکار نہیں کرسکتا،

نور الدین محمد قیرازی

بمجلس تو چو آہے کشیدم از حسرت		بر آن شدی کہ نگاہی کنی مگر حیا نگذاشت

میں نے جب تیری مجلس میں بڑی حسرت سے آہ کھینچی اور اس کے اثر سے تو نے مجھ پر نگاہ ڈالنا چاہا مگر پھر حیا نے اجازت نہیں دی،

مگر زخانہ بروں بود کہ شب در کویش		ہیچ ذوقے زنگاہے در و دیوار نبود

معلوم ہوتا ہے کہ محبوب رات گھر سے باہر تھا، کیونکہ اس گلی کے در و دیوار کو دیکھنے میں نگاہوں کو کوئی لذت نہیں مل رہی تھی،

قاسم بیگ قمی

باکم از کشتہ شدن نیست ازاں می ترسم		کہ ہنوز م نفسے باشد و قاتل برود

مجھکو قتل ہونے میں باک نہیں ہے مگر یہ ڈر ہے کہ ابھی کچھ جان باقی ہو اور قاتل

میں نے کون قصور کیا ہے،

دلہائے برشتہ شدہ فرش حرم او　　　اے اشک رواں شو کہ نسوزد قدمِ او

آنسوؤں سے کہتا ہے کہ بہت سے دل بریاں اس کے حرم کا فرش بن گئے ہیں" جہاں معشوق چلتا پھرتا ہے" اس لئے تم بہ کر اس کی سوزش کو ٹھنڈا کر دو کہ اس کے قدم نہ جل جائیں،

کمالی نیشاپوری

خوش آں مردن کہ چوں می مردم از جور ت ببالینم
بنوئے منفعل بودے کہ سر بالا نمی کردے

وہ موت بھی کیسی خوش آیند ہے کہ جب میں تیرے ظلم سے مرنے لگوں تو میرے سرہانے تو اگر اس قدر شرمندہ ہو کہ سر اوپر نہ اٹھا سکے

(باقی)

تابعینؒ

علم وعمل اور مذہب واخلاق میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین، اور ان کے تربیت یافتہ تابعین کرام رضی اللہ عنہم تھے، اور صحابہ کرام کے بعد انہی کی زندگی مسلمانوں کے لئے نمونۂ عمل ہے اس لئے سیر الصحابہؓ کی تکمیل کے بعد دارالمصنفین نے اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ تازہ مرقع مرتب کرایا ہے۔ اس میں چھیانوے ۹۶ اکابر تابعین کے سوانح، ان کے علمی، مذہبی، اخلاق اور عملی مجاہدات وکارناموں کی تفصیل ہے۔

(مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی) ۵۶۷ صفحے، قیمت ۵۰-۱۰

"منیجر"

محمد قاسم دیوانہ

نمیدانم کہ از ذوق کدامی داغ او سوزم ۔۔۔ بآن پروانہ می مانم کہ افتد در چراغانے

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ محبوب کے دئے ہوئے داغوں میں سے کس داغ کے ذوق میں جلوں، میری حالت اس پروانہ جیسی ہے جو چراغان میں آجاتا ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس چراغ پر جان نثار کرے،

مشتاق رائی قدرت

نشد در زندگی چوں از تو قطع خار خار من ۔۔۔ چہ حاصل بعد مرگم گر بگل گیری مزار من

جب زندگی میں کانٹے کی تمنا میں کانٹا بھی میرا نہ بن سکا تو اس سے کیا حاصل کہ میری موت کے بعد میری قبر پھولوں سے ڈھک دی جائے،

کمال اسمٰعیل

ز خضر عمر فزون است عشق بازان را ۔۔۔ اگر ز عمر شمارند روز ہجران را

اگر ہجر کے ایام کو بھی عمر میں شمار کر لیا جائے تو عاشقوں کی عمر خضر کی عمر سے بھی زیادہ ہو جائیگی اس کے قریب قریب غالب کا یہ شعر ہے،

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہان خراب میں ۔۔۔ شبہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

چوں باد خواہم از سر ایں خاکدان گذشت ۔۔۔ ایں کوئے دوست نیست کہ نتواں ازاں گذشت

اس خاکدان دنیا سے میں ہوا کی طرح گذر جاؤں گا یہ محبوب کی گلی نہیں ہے جس کو چھوڑا نہیں جاسکتا،

بود ہمیشہ جان من رسم تو بے گنہ کشی ۔۔۔ ہیچ نمی کشی مرا من چہ گناہ کردہ ام

میری جان بے گناہوں کا قتل تو تیری عادت ہے پھر تو مجھے کیوں قتل نہیں کرتا آخر

تصویروں اور بری عادتوں کیلئے وقف ہوتے ہیں، سیاسی مسائل و مباحث کے علاوہ مختلف ذوق کے دلچسپ و رلائق مطالعہ مضامین اور مفید معلومات بھی ہوتے ہیں، مجموعی حیثیت سے سب ساتھ کے اجراء سے اردو کے اخبارات میں ایک اچھے اخبار کا اضافہ ہوا ہے ظاہری حسن و نفاست میں تو اردو کا کوئی اخبار اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا، لیکن اس حسن نفاست کے ساتھ سب ساتھ نام کچھ بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے، شاید یہ بھی سوشلزم کی کوئی قسم ہو۔ "ض م"

صوت الجامعہ، مرتبین شیخ عبد الصمد شرف الدین، استاذ مقتدی حسن الاعظمی، استاذ عبد الوحید رحمانی، رسالہ سائز، کاغذ عمدہ خوبصورت ٹائپ، سالانہ قیمت ہندوستان [illegible]، پتہ مرکزی دار العلوم وارانسی۔

جمعیۃ اہل حدیث کے مرکزی دار العلوم بنارس کے شعبۂ تالیف و تصنیف کی طرف سے چند مفید عربی مطبوعات کے علاوہ یہ عربی ماہنامہ بھی چند سال سے شائع ہو رہا ہے، یہ ماہنامہ فقہی و جماعتی عصبیت سے علیحدہ رہ کر جدید علمی انداز میں اسلام اور اسلامی علوم کی خدمت، دینی روح اور اسلامی شعور اور عربی زبان و ادب کا ذوق پیدا کرنے کے لئے جاری کیا گیا ہے، ہمارے پیش نظر چوتھی جلد کا دوسرا شمارہ ہے، اس میں ڈاکٹر فضل الرحمن ندوی کا محققانہ مقالہ خصوصیت سے اہم اور قابل ذکر ہے، اس میں آزاد بلگرامی کی صوفیانہ عربی مثنوی مظہر البرکات کی خصوصیات تحریر کی گئی ہیں، اور شروع میں عربی و فارسی زبانوں کے ایک دوسرے پر اثرات اور عربی شعراء کے فارسی شاعری کی اس مقبول ترین صنف کی جانب کم اعتناء کرنے کا ذکر ہے، مدینہ یونیورسٹی کے دو فاضل اساتذہ کے مضامین بھی اس میں شامل ہیں، مولانا مقتدی الاعظمی کے مضمون کا اسلوب تحریر دلکش اور

مطبوعات جدیدہ

نئے رسائل و اخبار

سب ساتھ (ہفتہ وار) اڈیٹر حیات اللہ صاحب انصاری، تقطیع بڑی ضخامت ۱۶ صفحات کاغذ، کتابت، طباعت اعلیٰ قیمت سالانہ عـــہ فی پرچہ ۳۵ پیسے، پتہ راجندر پرشاد روڈ نئی دہلی،

سب ساتھ کانگریس کا ترجمان ہے، جو چند مہینوں سے حیات اللہ صاحب انصاری کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا ہے، اس کی پالیسی وہی ہے، جو قومی آواز کی ہے، لیکن مسلمانوں کے غیر سیاسی مسائل میں انصاری صاحب کے خیالات ہمیشہ سے بڑی حد تک متوازن رہے ہیں، چنانچہ مسلم پرسنل لا کے مسئلہ میں انھوں نے مسلمانوں کی پوری ترجمانی کی تھی، شروع میں جب مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کا مسئلہ اٹھا تھا تو انھوں نے اس کی پوری حمایت کی تھی، لیکن پھر کسی سبب سے ان کا قلم محتاط ہوگیا تھا اور یہ احتیاط اب تک قائم ہے، چنانچہ یونیورسٹی کی موجودہ صورت حال پر انھوں نے بہت دیر میں اور بہت محتاط لکھا ہے، پھر بھی قومی آواز کے مقابلہ میں بہت غنیمت ہے، جس نے سارا الزام یونیورسٹی پر ڈال دیا ہے، پاکستان کے ساتھ حکومت ہند کی مفاہمت اور خیر سگالی کی پالیسی سے شاید سب ساتھ کو اتفاق نہیں ہے، چنانچہ دو صفحے اس کی بڑ

رجسٹرڈ نمبر ال (۵۲۰)

جون ۱۹۷۳ء

June 1973

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کتبہ سید اقبال احمد)

پیرایۂ بیان دلآویز ہے، ہندو یونیورسٹی کے استاذ ڈاکٹر مسعود الرحمٰن ازہری کے مضمون میں حافظ ابن کثیر کی مخطوطہ کتابوں کے متعلق اگر یہ تصریح بھی کر دی گئی ہوتی کہ وہ کن کتبخانوں میں موجود ہیں تو مقالہ زیادہ مفید اور بلند پایہ ہو جاتا، یہ رسالہ دینی علمی، اور تحقیقی مختلف النوع سنجیدہ و باوقار مضامین پر مشتمل، زبان و بیان، اسلوب تحریر اور طرز استدلال وغیرہ کی حیثیت سے خاصا دلکش اور بعض حیثیتوں سے ہندوستان سے شائع ہونے والے گنے چنے عربی رسائل میں ممتاز ہے، ہم اس کا پرتپاک خیر مقدم کرتے اور عربی زبان و ادب سے دلچسپی رکھنے والے حلقہ سے اسکی پذیرائی کی پرزور سفارش کرتے ہیں،

تعمیر فکر، ایڈیٹر مولوی محمد شہاب الدین صاحب ندوی، متوسط سائز، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۳۲ قیمت فی پرچہ ۵۰ پیسے، سالانہ صہ پتہ ماہنامہ تعمیر فکر ۱۶۴، پولیس روڈ، بنگلور ۲،

مولوی محمد شہاب الدین ندوی اپنے قرآنی و سائنسی مضامین و تصنیفات سے علمی حلقہ میں متعارف ہو چکے ہیں، انھوں نے جنوبی ہند میں تصنیف و تالیف کا ذوق پیدا کرنے کے لئے یہ رسالہ جاری کیا ہے، جو مئی ۱۹۷۲ء سے پابندی سے شائع ہو رہا ہے، مضامین متنوع، اصلاحی و دینی، معلوماتی، عام فہم اور مختصر ہوتے ہیں، مارچ و اپریل ۱۹۷۳ء میں مسلم پرسنل لا نمبر مع بمبئی کنونشن کے نام سے اس کا خاص نمبر شائع کیا گیا ہے، جو بمبئی کنونشن کی روداد، اور خطبوں کے علاوہ مسلم پرسنل لا پر مفید مضامین پر مشتمل ہے، ہم رسالہ کی بقا اور اس کے مقاصد کی کامیابی کے لئے دعا کرتے ہیں،

"ض"

جلد ۱۱۱ ماہ جمادی الاولی ۱۳۹۳ھ مطابق ماہ جون ۱۹۷۳ء عدد ۶

مضامین

شذرات | شاہ معین الدین احمد ندوی | ۴۰۲-۴۰۴

مقالات

کیا موجودہ دنیا کو مذہب کی ضرورت نہیں رہی؟ | شاہ معین الدین احمد ندوی | ۴۰۵-۴۲۳

ملا محمود جونپوری، | جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارک پوری، اڈیٹر البلاغ بمبئی | ۴۲۴-۴۴۳

فن توشیح | جناب ڈاکٹر حافظ غلام محمد مصطفےٰ صاحب ریڈر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ | ۴۴۴-۴۶۰

خریطۂ جواہر | شاہ معین الدین احمد ندوی | ۴۶۱-۴۷۲

وفیات

چودھری خلیق الزماں مرحوم | "م" | ۴۷۳-۴۷۴

مولانا عبدالصمد رحمانی مرحوم | " | ۴۷۴

باب التقریظ والانتقاد

سترہویں صدی عیسوی میں ہندوستان کی بعض اہم نثری تصنیفات | سید صباح الدین عبدالرحمن | ۴۷۵-۴۷۸

مطبوعات جدیدہ | "ض" | ۴۷۹-۴۸۰

خلاف ستیہ گرہ کی، جن میں ہندو مسلمان دونوں شامل ہیں، اُن کو قید کر دیا گیا (اس تحریر کے وقت وہ لوگ چھوڑ دیئے گئے) یہ ہے ایک سیکولر حکومت کا کارنامہ جو سارے فرقوں کے ساتھ یکساں سلوک کی مدعی ہے، وزیر تعلیم بھی جو مسلم یونیورسٹی میں اپنے جلال و جبروت کا پورا مظاہرہ کر چکے تھے، خاموش ہیں،

......٥>>٠<<٥......

اس سلسلہ میں اصل غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ طلبہ کی اس شورش اور خیرہ سری کے اسباب کیا ہیں، یہ وہی طلبہ ہیں، تہذیب و شائستگی اور استاد کی اطاعت و احترام جن کا شعار تھا، اب بغاوت و سرکشی اُن کا شعار بن گیا ہے، درحقیقت اس میں ہمارا خود تصور ہے، ہم نے آزادی سے غلط فائدہ اٹھایا، اس کی ذمہ داریوں کو تو بھلا دیا صرف اس کے فوائد کی فکر میں لگ گئے، اور اس کے لئے اخلاق و سیرت، ضبط و نظم سب کو پس پشت ڈال دیا، بلکہ اس کو بھی دور غلامی کی یادگار سمجھ کر ترک کر دیا، آزادی حاصل کر لی، اس میں جو کسر رہ گئی تھی وہ کمیونزم نے پوری کر دی جس کا مقصد تخریب، ہر جائز و ناجائز وسیلہ سے اقتدار کا حصول ہے، سیاسی پارٹیوں خصوصاً کمیونسٹوں نے یہی سبق طلبہ کو سکھایا اور ان کو اپنے اغراض کے لئے استعمال کیا، اور اب وہ اس سبق کو یونیورسٹی میں دہرا رہے ہیں،

......٥<٥>......

دوسرا سبب یہ ہے کہ ملک کی مادی ترقی کے لئے تو ہم نے بڑے بڑے منصوبے بنائے لیکن قوم کے اخلاق اور سیرت کی تعمیر کی طرف کوئی توجہ نہ کی، بلکہ اُس کی جو پرانی روایت چلی آرہی تھی اس کو بھی آزادی اور سیکولرازم کے غلط تصور نے ختم کر دیا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پورا ملک اخلاقی بحران کا شکار ہے، دولت اور جاہ و اقتدار کا حصول زندگی کا نصب العین

شذرات

مشرقی نظامِ تعلیم میں تربیت بھی تعلیم کا ایک ضروری جزو تھی، ہماری درسگاہیں تعلیم کے ساتھ تہذیب و شائستگی اور سیرت و کردار کی بھی تربیت گاہیں تھیں، طلبہ اس کا نمونہ ہوتے تھے، مگر ہندوستان کی آزادی نے دوسرے طبقوں کی طرح طلبہ کو بھی ہر قید سے آزاد کر دیا، کالج اور یونیورسٹیاں تعلیم و تربیت کے بجائے شورش اور ہنگامہ آرائی کا اکھاڑہ بن گئیں، ان میں آئے دن ہنگامے ہوتے رہتے ہیں، جن میں اساتذہ، پرنسپل اور وائس چانسلر کی کوئی درگت باقی نہیں رہتی، گذشتہ مہینہ لکھنؤ یونیورسٹی میں جو ہنگامہ ہوا وہ سب پر بازی لے گیا، یونیورسٹی کا بہت سا قیمتی سامان اور پرانے ریکارڈ طلبہ نے نذرِ آتش کر دیئے، جس سے لاکھوں روپئے کا نقصان ہوا، دیکھنا یہ ہے کہ حکومت لکھنؤ یونیورسٹی کے ساتھ کیا معاملہ کرتی ہے،

.......✻.......

اس صوبہ میں ایک دوسری یونیورسٹی بھی ہے جس کے طلبہ کا ضبط و نظم آج بھی مسلّم ہے، انھوں نے کبھی کسی قسم کی شورش و ہنگامہ آرائی کی، نہ اساتذہ اور وائس چانسلر سے کوئی گستاخی کی، نہ یونیورسٹی کے سامان کو نقصان پہنچایا، صرف مسلم یونیورسٹی کے جابرانہ اور غیر جمہوری ایکٹ کے خلاف پُرامن احتجاج کیا، اس کی ان کو سزا دی گئی کہ عین امتحان کے زمانہ میں یونیورسٹی بند کر دی گئی، امتحانات ملتوی کر دیئے گئے، پی۔ اے۔ سی کی نگرانی میں ہوسٹل خالی کرائے گئے، جس سے ان کا ایک سال برباد ہوا، بہت سے طلبہ کا یونیورسٹی سے اخراج کر دیا گیا، یونیورسٹی کے باہر جن لوگوں نے ایکٹ کے

مقالات

کیا موجودہ دنیا کو مذہب کی ضرورت نہیں رہی؟

از شاہ معین الدین احمد ندوی

مادہ پرستوں کا دعویٰ ہے کہ خدا اور مذہب کا تصور اس دور کی پیداوار ہے جب انسانی عقل و شعور ناقص تھا، کائنات اسکے لئے معمہ تھی، اسکی عقل اسکی پیدائش کے طبعی علل و اسباب اور اسکی ترتیب و نظام کے ادراک سے قاصر تھی، اس لئے اس نے اس کے پیچھے ایک مافوق الادراک ہستی کار فرما مان لی، جس نے پہلے دیوی دیوتا پھر ترقی کر کے خدا کی شکل اختیار کر لی، اور بعد کے ذہین انسانوں نے انسانی معاشرہ میں عدل اور نظم قائم رکھنے کے لئے مذہب ایجاد کیا، مگر اب اس زمانہ میں جب انسانی عقل و شعور کمال کو پہنچ گئے ہیں سائنس نے کائنات کا معمہ حل کر دیا ہے، اس کے اسرار منکشف ہو گئے ہیں، اور انسان آپ اپنی قسمت کا مالک بن گیا ہے، اسکو خدا اور مذہب کی ضرورت باقی نہیں رہی، اسکے علاوہ مذہب نے انسانوں میں اختلاف و تفریق پیدا کی، اس کے نام سے بڑی خونریزیاں ہوئیں اس لئے مروجہ مذاہب کے بجائے ایک عالمگیر بین الاقوامی مذہب کی ضرورت ہے جس کی بنیاد خدا کے بجائے انسان دوستی پر ہو، اس کا نام انھوں نے مذہب انسانیت رکھا ہے،

بن گیا ہے، ہر طبقہ زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹنے کی فکر میں ہے، نیچے سے اوپر تک بے عنوانی اور بد دیانتی کا بازار گرم ہے، جس سے نہ صرف عوام مصیبت میں مبتلا ہیں بلکہ حکومت کا پورا نظام بگڑ کر رہ گیا ہے، اور اب یہ وبا اتنی عام ہو چکی ہے کہ اگر حکومت اس کی اصلاح کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتی۔ جب پاسبان خود رہزن بن گئے ہوں تو حکومت کس کے ذریعہ اصلاح کرے گی۔ چنانچہ ان حالات کی اصلاح کے لئے وہ جو تدابیر بھی اختیار کرتی ہے اس میں کامیاب نہیں ہوتی۔

......٥<><>٥......

قومیں محض مادی ترقی کے سہارے زندہ نہیں رہتیں، قومی اور ملکی عمارت کا سب سے بڑا ستون کیرکٹر اور سیرت و کردار ہے، جو قوم اس سے محروم ہو گئی وہ زندگی کی طاقت سے محروم ہو گئی، مغربی قوموں کے عروج و ترقی میں جن کے ہم اندھے مقلد ہیں، اُن کے مادی وسائل کے ساتھ اُن کے کریکٹر کی پختگی کو بھی دخل ہے، ان میں اور جو برائیاں بھی ہوں، مگر اپنے قومی و ملکی معاملات میں اُن کے ایثار و قربانی، دیانت و راستی، نظم، عدل و مساوات، جانفشانی و جفاکشی وغیرہ سے کون انکار کر سکتا ہے، درحقیقت اُن کے انہی اوصاف نے اُن کو بام عروج تک پہنچایا ہے، اور اُن کی مادی ترقی بھی اسی کا نتیجہ ہے جس کا ہمارے یہاں فقدان ہے۔ گاندھی جی کا تصور آزادی یہی تھا، اور وہ اسی قسم کے اوصاف ہندوستانیوں میں پیدا کرنا چاہتے تھے، جن کی عمر بھر تلقین کرتے رہے، اگر وہ زندہ رہتے، تو مادی منصوبوں سے زیادہ اخلاقی منصوبوں پر زور دیتے، جب تک گاڑی کے یہ دونوں پہئے برابر نہ ہوں گے، ملک صحیح معنوں میں ترقی نہیں کر سکتا۔

......٥<><>٥......

تہذیبیں عروج پر تھیں بلکہ بعض تہذیبیں اپنا دور پورا کرکے مٹ چکی تھیں، اسلئے یہ کہنا کہ مذہب انسان کی بے شعوری اور کم عقلی کے دور کی پیداوار ہے، سراسر غلط ہے، خود ان مذاہب کے لانے والے اپنے اپنے دور کے عاقل ترین انسان تھے،

یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں کہ سائنس نے کائنات کا معمہ حل کرلیا ہے، البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے کرہ ارضی کے کچھ حقائق معلوم کرلئے ہیں اور ان کی تحقیق کا سلسلہ برابر جاری ہے، آئے دن نئے نئے انکشافات ہوتے رہتے، اور پرانے نظریات بدلتے رہتے ہیں، اسلئے کسی انکشاف اور تحقیق کو آخری نہیں کہا جاسکتا اور جو انکشافات اب تک ہوچکے ہیں، نامعلوم اسرار کے مقابلہ میں ان کی حیثیت سمندر کے ایک قطرہ کی ہے،

یہ بھی ہماری کم نظری ہے کہ ہم نے کائنات کو کرۂ ارضی میں محدود کردیا ہے، جن کی حیثیت پوری کائنات کے مقابلہ میں ایک ذرہ سے زیادہ نہیں ہے، پوری کائنات یعنی ان بیشمار دنیاؤں اور اربوں کھربوں نجوم و کواکب اور ان کے نظام شمسی کا پورا علم بھی انسان کو حاصل نہیں، وہ اسکی بے کراں وسعت و عظمت کا تصور بھی نہیں کرسکتا اور سائنس اپنی بے پناہ ترقیوں اور طاقتور دوربین اور خوردبین آلات کے باوجود ان کے احاطہ سے قاصر ہے،

یہ بھی واضح رہے کہ ان دنیاؤں اور نجوم وکواکب کے قوانین فطرت کرۂ ارض کے قوانین سے بالکل جدا ہیں، جو زمین سے چند ہی میل کی بلندی پر بدل جاتے ہیں، اسلئے زمین کے قوانین پر ان کا قیاس نہیں کیا جاسکتا، اور کرہ ارض کے نظام کی طرح ان کا کوئی نظام ہے، اسلئے محض کرۂ ارض کے بارہ میں محدود علم پر یہ دعویٰ کہاں تک صحیح ہے، کہ سائنس نے کائنات کا معمہ حل کرلیا،

لیکن یہ سارے مقدمات محض مفروضات ہیں جن کی کوئی حقیقت نہیں، خدا کی طلب انسانی فطرت میں ہے، اور مذہب کی ضرورت اسی وقت سے ہے، جب انسان نے پہلی مرتبہ زمین پر قدم رکھا تھا، یا نظریۂ ارتقا کی زبان میں جب حیوانیت نے انسان کی شکل اختیار کی تھی، لیکن ابتدا میں اسکی محدود عقل خدا کا صحیح تصور قائم نہیں کر سکی تھی، اس لئے اس نے کائنات کی ہر اس مخلوق کو جس سے اسکے گمان میں فائدہ پہنچنے کی امید یا نقصان پہنچنے کا خطرہ تھا، اسکی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اسکو خدا مان لیا تھا، پھر جس قدر اس کی عقل ترقی کرتی گئی، خدا کا صحیح تصور پیدا ہوتا گیا، اور خدا کے خاص بندوں کو اس کا عرفان حاصل ہوگیا، اور اس نے ان کو انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے مامور فرمایا جنھوں نے خدا کا صحیح تصور پیدا کیا، اور انسانی عقل و شعور اور اس کے حالات و ضروریات کے مطابق خدا کا پیام لاتے رہے، اس کے لئے تنہا ذہانت و طباعی کافی نہیں، بلکہ مامور من اللہ ہونا ضروری ہے، اس کے بغیر کوئی بڑا روحانی اور اخلاقی انقلاب پیدا نہیں پیدا کیا جا سکتا، چنانچہ ذہین انسانوں نے جو مذاہب و فلسفے ایجاد کئے اور اخلاقی مصلحین نے جو اصلاحیں کیں اس کا اثر وقتی تھا، وہ کوئی دیرپا اخلاقی انقلاب نہ پیدا کر سکے، اور نہ اپنی تعلیمات کا عملی نمونہ کوئی جماعت بنا سکے، ان کے بعد ان کے مذاہب و اصلاحات ختم ہوگئیں اور ان کا درس اخلاق محض کتابوں میں باقی رہ گیا، چنانچہ آج کسی اخلاقی مصلح کی پیدا کردہ کوئی جماعت دنیا میں موجود نہیں ہے، اخلاق اور روحانیت کی جو روشنی بھی نظر آتی ہے وہ صرف انبیا علیہم السلام کا فیض ہے، یہ بھی صحیح نہیں، کہ مذہب انسان کی بے شعوری کے دور کی پیداوار ہے، زردشتیت، ہندویت، بدھ ازم، یہودیت، عیسائیت اور اسلام وغیرہ دنیا کے تمام بڑے بڑے مذاہب اس زمانہ پیدا ہوئے، جب یونان کا فلسفہ اور ایران و روم کی

آپ مالک بن گیا ہے، یہ صحیح ہے کہ پہلے کے مقابلہ میں اب جلب منفعت اور دفع مضرت کے بہت سے وسائل پیدا ہوگئے ہیں، اور جو چیزیں پہلے انسانی دسترس سے باہر سمجھی جاتی تھیں اب ان پر قابو حاصل ہوگیا ہے، اس کے باوجود انسان بہت سے معاملات میں مجبور محض ہے اور اب بھی انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے آئے دن ایسے حوادث پیش آتے رہتے ہیں جن کا روکنا انسانی بس سے باہر ہے، اسکی مثالیں بھی نادر نہیں کہ بڑے عاقل و فرزانہ اور اسباب و وسائل رکھنے والے زندگی کی دوڑ میں ناکام رہتے ہیں، اور ان سے کم عقل اور بے وسیلہ آگے بڑھ جاتے ہیں، کمزور تنومند اور مفلس دولتمند ہو جاتے ہیں اور محتاج کرور پتی بن جاتے ہیں، اس لئے یہ کہنا صحیح نہیں کہ انسان اپنی قسمت کا آپ مالک بن گیا ہے، اس کی کنجی آج بھی کسی دوسری طاقت کے ہاتھ میں ہے،

(بقیہ حاشیہ ص ۴۰۸) مر جائے گا، سارے حیوانات خصوصاً انسانی جسم کی ساخت قدرت کا شاہکار ہے، جس کو قرآن مجید نے وَفِيْ أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُوْنَ سے تعبیر کیا ہے، ایک ایک عضو کے عمل اور اس سے متعلقہ فائدہ کے حصول کے لئے ہزاروں عضلات اور رگ پٹھے کام کرتے ہیں، اگر ایک عضلہ بھی بیکار ہو جائے تو وہ عضو معطل ہو جائے گا، یہی حال ساری کائنات کے نظام کا ہے، کیا یہ سارا کارخانہ اور اس کا محیر نظام ایک بے حس مادہ کا نتیجہ ہے، اور بغیر کسی صانع کے خود بخود پیدا ہوگیا اور چل رہا ہے، اس کو کون عقل باور کر سکتی ہے، اسی لئے انسان کی عبرت و بصیرت اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کے مطالعہ کے لئے قرآن مجید نے کائنات کے نظام پر غور و فکر پر بڑا زور دیا ہے،

کائنات کی وسعت و پہنائی اتنی بے کراں اور اس کے عجائبات اتنے بے حد ونہایت ہیں کہ ظن و تخمین کے سوا اس کا ادراک کیا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، اور اس کی ایک جھلک دیکھ کر صاحب بصیرت سائنسٹ بھی "ربنا ما خلقت هذا باطلا سبحٰنك فقنا عذاب النار" کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، یہ بھی علی الاطلاق صحیح نہیں ہے کہ انسان سو فیصدی اپنی قسمت کا

لے اس بے پایاں کائنات کا نظام اتنا مکمل اور حیرت انگیز ہے کہ کوئی مخلوق قدرت کے مقرر کردہ نظام سے باہر نہیں نکل سکتی، درخت کی پتی اور پانی کے ایک قطرہ سے لیکر بڑے بڑے ہیبتناک سیاروں تک ان ضابطوں کے پابند ہیں، اگر اس نظام میں ادنیٰ فرق آ جائے تو سارا کارخانۂ عالم درہم برہم ہو جائے بے شمار اجرام فلکی اپنے اپنے دائرہ میں حرکت کرتے رہتے ہیں، اگر ذرا بھی اس سے ہٹ جائیں تو آپس میں ٹکرا کر تباہ ہو جائیں، کرۂ ارض کی ساخت میں اگر ذرا بھی فرق آ جائے تو سمندر میں غرق ہو جائے اگر اس کی کشش میں فرق آ جائے تو کوئی چیز اپنی جگہ قائم نہ رہے، زمین کی اندرونی سطح میں ذرا بھی تغیر آ کر تو ہلاکت خیز زلزلے آ جاتے ہیں، اگر آفتاب کی حرارت مقررہ مقدار سے بڑھ جائے تو ساری مخلوق جل کر خاکستر ہو جائے، اگر گھٹ جائے تو ٹھنڈک سے ٹھٹھر کر رہ جائے، اگر ہوا پانی کی ترکیب میں تغیر آ جائے تو ایک متنفس بھی زندہ نہ رہے، اسی طرح ایک حقیر دانہ سے لیکر بڑی سی بڑی مخلوق کی زندگی اور نشو و نما کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے، سب موجود ہیں اور جن پر انسانی زندگی کا مدار ہے مثلاً پانی ہوا آفتاب کی گرمی ہر جگہ موجود ہے اور اسکی بخشش عام ہے،

حیوانی جسم کی مشنری قدرت نے اتنی پیچیدہ بنائی ہے کہ دنیا کی کوئی مشین اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور اس کی ساخت ایسی رکھی کہ اسکے پرزے خود بخود حرکت اور اپنا عمل کرتے رہتے ہیں اگر انسان اس کو روکنا بھی چاہے تو اس پر قادر نہیں مثلاً قلب کی حرکت اور پھیپھڑوں سے تنفس جس پر زندگی کا مدار ہے، انسان مجبور و مضطر ہے، اگر اسکو روکنے کی کوشش کریگا، تو دم گھٹ کر

نعبد الا اللہ ولا نشرک به شیئاً ولا یتخذ بعضنا بعضاً اربابا من دون اللہ

یکساں ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں اور نہ کسی کو اس کا شریک ٹھہرائیں اور نہ اللہ کے سوا ایک دوسرے کو (آل عمران)

اس لئے اگر اصل بنیاد میں اتفاق ہو تو منہاج و شریعت کے اختلاف کی جس کو انسانوں میں تفریق و اختلاف سے تعبیر کیا جاتا ہے، کوئی اہمیت نہیں، وہ بالکل فطری اور ناگزیر ہے، جب سے مذہب کی تاریخ شروع ہوتی ہے مختلف زمانوں کے انسانوں کی عقل و شعور، تہذیب و تمدن میں اختلاف رہا ہے، ان میں پیدا شدہ خرابیاں، اصلاح طلب باتیں اور دوسری ضروریات بھی جدا جدا رہی ہیں، انکے اعتبار سے منہاج و شریعت کی شکلیں بھی بدلتی رہی ہیں، انہی اصول پر بنیادی قوانین بھی بنتے ہیں، اسی لئے مختلف قوموں کے قوانین میں فرق ہوتا ہے، مگر ان سب کا بنیادی مقصد یعنی معاشرہ میں نظم و عدل کا قیام مشترک ہوتا ہے، یہی شکل توحید اور منہاج و شریعت کی ہے، اصل الاصول توحید ہے جس کی تعلیم سارے انبیاء علیہم السلام دیتے چلے آئے ہیں، اور منہاج و شریعت ہر قوم کے حالات و ضروریات کے مطابق زندگی بسر کرنے کا دستور ہے، کلام مجید کا ارشاد ہے،

ولکلٍ جعلنا منکم شرعۃ ومنهاجاً

اور ہم نے تم میں سے ہر ایک (قوم) کے لئے (زندگی) کا ایک دستور بنایا،

اس کے مطابق عبادت کے طریقے بھی مختلف ہیں، اسلئے وہ کوئی جھگڑے کی چیز نہیں،

ولکل جعلنا منسکا هم ناسکوه فلا ینازعنک فی الامر وادع الی سبیل ربک انک لعلی

ہم نے ہر قوم و قبیلہ کے لئے عبادت کا ایک طریقہ مقرر کیا، جس کی وہ پابندی کرتے ہیں، اس لئے اس معاملہ میں لوگ تم

یہ بھی صحیح نہیں کہ مذہب نے انسانوں میں تفریق و اختلاف پیدا کیا، اسلام جو سارے مذاہب کی اچھی تعلیمات کا جامع ہے، انسانی وحدت و اخوت اور مساوات کا سب سے بڑا داعی ہے، اسکی تعلیم ہے کہ الخلق کلھم عیال اللہ ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے، اسلئے اسکی نگاہ میں انسان کی حیثیت سے سب برابر ہیں، اسکے نزدیک انسانی فضیلت کا معیار نسب و خاندان نہیں بلکہ تقویٰ و پرہیزگاری ہے ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم اسی نے اسکے سر عظمت و شرف کا تاج رکھا اور اسکی بنیاد توحید پر ہے، وہ جس طرح خدا کی عظمت و کبریائی کا اعتراف ہے، اسی طرح انسانی عظمت و شرف کا بھی سنگ اساس ہے، اسی نے انسانوں کو اپنے ہم جنسوں اور معبودان باطل کی غلامی سے آزاد کر کے مخلوق میں اس کا مرتبہ بلند کیا اور یہ تصور بھی پیدا کیا کہ سارے انسانوں کا خالق خدا ہے، اس رشتہ سے وہ سب بھائی بھائی ہیں، اور یہ حکم دیا کونوا عباد اللہ اخوانا سب خدا کے بندے بھائی بھائی بن جاؤ، اسکی مزید تفصیل آگے آئیگی، اسلئے سارے الہامی مذاہب کی بنیادی تعلیم توحید ہے، خدا کے تمام پیغمبر اسی کی تعلیم دیتے چلے آئے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے

وما ارسلنا من قبلک من	اور ہم نے تم سے پہلے جتنے رسول بھی بھیجے
رسول الا یوحی الیہ انہ	سب کو یہی وحی کی کہ میرے سوا
لا الٰہ الا انا فاعبدون.	کوئی معبود نہیں اسلئے میری ہی پرستش کرو

اسلام کا مقصد اسی کا احیاء کا تھا چنانچہ ان مذاہب کو جن سے توحید مٹ چکی تھی، اس کی دعوت دی

یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ	اے اہل کتاب آؤ ہم تم ایک بات پر
سواء بیننا وبینکم ان لا	متفق ہو جائیں جو ہمارے اور تمہارے درمیان

الّذین یکفرون باللّٰہ ورسلہ	بیشک جو اللہ اور اس کے رسولوں کا
ویریدون ان یفرقوا بین اللّٰہ	انکار کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے
ورسلہ ویقولون نومن ببعض	رسولوں کے درمیان تفریق کرنا چاہتے ہیں
ونکفر ببعض ویریدون ان	اور کہتے ہیں، کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور
ان یتخذوا بین ذالک سبیلا	بعض کو نہیں مانتے اور اس کے درمیان
اولٰئک ھم الکافرون حقا،	ایک راہ نکالنا چاہتے ہیں وہ یقیناً کافر ہیں
قل کل آمنا باللّٰہ وملٰئکتہ وکتبہ	آپ کہدیجئے کہ ہم سب ایمان لائے اللہ پر
ورسلہ ولا نفرق بین احد	اور اسکے فرشتوں پر اور اسکی کتابوں پر اور
من رسلہ،	اسکے رسولوں پر اور ہم اسکے رسولوں کے

[illegible]

اسی تفریق کو مٹانے کے لئے اسلام اور مسلمانوں کو یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح کسی پیغمبر کی طرف منسوب نہیں کیا گیا، بلکہ خدا نے اس کا نام اسلام اور اس کے ماننے والوں کا نام مسلم رکھا" ھو الّذی سمّاکم المسلمین" جس کے معنی خدا کی اطاعت وبندگی اور اس کے سامنے سرافگندگی ہیں جو مذہب کا اصل مقصود ہے، اس طرح اسلام نے مذہبی اختلاف کی جڑ کاٹ دی، اس کی نگاہ میں مسلمان یہودی نصاریٰ اور صابی وغیرہ جنھوں نے اپنے اپنے انبیار کے زمانہ میں ان کی سچی تعلیمات پر عمل کیا یعنی توحید اور یوم آخرت پر ایمان لائے اور اچھے عمل کیے وہ سب صحیح راستہ پر ہیں اور ان کو ان کا اجر ملے گا،

ان الّذین آمنوا والّذین	بیشک جو ایمان لائے (مسلمان)
ھادوا والنصاریٰ والصابئین	جو یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابی

ھدیٰ مستقیم،	جھگڑا نہ کریں تم اپنے رب کی طرف بلاتے رہو، بیشک تم ہدایت کی سیدھی

جھگڑا اور اختلاف لوگوں نے محض ضد اور تعصب کی وجہ سے پیدا کیا،

وما تفرقوا الا من بعد ما	لوگوں نے اختلاف اور تفرقہ وحی کا علم حاصل
جاء ھم العلم بغیا بینھم	ہونے کے بعد محض ضد اور تعصب سے پیدا کیا ہے

اور ہر فرقہ اس کا مدعی بن گیا کہ وہی صحیح راہ پر ہے، دوسرے گمراہ ہیں،

قالت الیھود لیست النصٰرٰی	یہودیوں نے کہا کہ نصاریٰ کسی راہ پر نہیں
علیٰ شیٔ وقالت النصاریٰ	ہیں اور نصاریٰ نے دعویٰ کیا کہ یہود
لیست الیھود علیٰ شیٔ وھم	کسی راہ پر نہیں ہیں، حالانکہ دونوں
یتلون الکتاب،	اللہ کی کتاب پڑھتے ہیں،

اسلام نے ان سب تفرقوں کو مٹا دیا، اور سارے انبیاء علیہم السلام اور ان کی کتابوں پر ایمان لانا ضروری قرار دیا، مسلمانوں کو حکم ہوا،

قولوا آمنا باللہ وما انزل	اے مسلمانو! تم کہو کہ ہم ایمان لائے ہیں
الینا وما انزل الیٰ ابراھیم	جو ہمارے لئے اتارا گیا (قرآن مجید) اور
واسمٰعیل واسحٰق ویعقوب،	جو ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق اور یعقوب پر
والاسباط وما اوتی موسیٰ وعیسیٰ	اتارا گیا، اور جو موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا
وما اوتی النبیون من	اور جو ان کے بعد کے نبیوں کو دیا گیا،
بعدھم،	

جو لوگ سارے انبیاء اور ان کی کتابوں کو نہیں مانتے وہ کافر ہیں،

نام سے جو خونریزیاں ہوئیں اس کی ذمہ داری مذہب پر نہیں بلکہ ان لوگوں پر ہے جنھوں نے اپنے اغراض کے لئے مذہب کو استعمال کیا،

جن لڑائیوں کو صحیح معنوں میں مذہبی لڑائیاں کہا جا سکتا ہے، ان کی تعداد بہت تھوڑی ہے، اور ان کا مقصد ملک گیری یا دوسروں کے ملک پر قبضہ کرنا نہیں تھا، مذہب نے انہی لوگوں کے مقابلہ میں تلوار اٹھائی جو کسی قانون و اخلاقی ضابطے کے پابند نہ تھے، بلکہ اخلاقی قدروں کے دشمن تھے، ان کی زندگی کا مقصد محض نفس پرستی تھا، جو زور قوت سے حق و صداقت کی آواز کو دبانا چاہتے تھے، جن کے ظلم و ستم نے پورے معاشرہ کا نظام درہم برہم کر رکھا تھا اسلئے ان لڑائیوں کا مقصد خدا شناسی، حق و صداقت اور اخلاق و روحانیت کا احیاء ظلم و جور اور شر و فساد کا استیصال اور عدل و مساوات کا قیام تھا اس کی کوئی مثال نہیں پیش کیجا سکتی کہ کسی مذہب نے دنیاوی مقصد کے لئے جنگ کی ہو پھر اس نے یکبارگی تلوار نہیں اٹھائی، بلکہ پہلے حق کی دعوت دی افہام و تفہیم سے کام لیا، اس کے لئے ظلم و ستم بھی سہے، مگر اس کا جواب تشدد سے ملا، اور جب اس کا یقین ہو گیا کہ اگر قوت سے کام نہ لیا گیا تو حق کی آواز ہمیشہ کے لئے دب جائیگی، اس وقت اس نے مجبور ہو کر تلوار اٹھائی اگر اس وقت بھی وہ نرمی سے کام لیتا تو حق کی آواز ہمیشہ کے لئے دب جاتی اور اخلاق و روحانیت اور نیکی و بھلائی کا خاتمہ اور شر و فساد کا دور دورہ ہو جاتا، اس لئے اس قسم کی لڑائیاں درحقیقت خونریزی نہیں بلکہ انسانیت کی بہت بڑی خدمت تھی، ؏ کار حق گاہ بہ شمشیر و سناں نیز کنند،

اس قسم کے حالات میں آج بھی قوت کے استعمال کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہے، پھر ان لڑائیوں کو ان خونریزیوں سے کوئی نسبت نہیں جو ملک گیری اپنی قوم کی

من آمن بالله واليوم الآخر	جو بھی خدا پر اور یوم آخرت پر ایمان
وعمل عملاً صالحاً فلهم اجرهم	لایا اور اچھے عمل کئے تو ان کا اجر ان کے
عند ربهم ولا خوفٌ عليهم	پروردگار کے پاس ہے نہ ان پر کوئی
ولا هم يحزنون،	خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہونگے،

اس سے بڑھکر مذہبی اختلاف کو مٹانے کی تعلیم اور کیا ہو سکتی ہے، لیکن اسلام سے پہلے سارے مذاہب سے خالص توحید مٹ چکی تھی، جو قومیں توحید کی مدعی تھیں ان میں بھی کسی نہ کسی راہ سے شرک داخل ہوگیا تھا جسکا مشاہدہ آج بھی کیا جا سکتا ہے، اسلام نے اسکو دوبارہ زندہ کیا اسلئے توحید خالص کی تعلیم اب بھی اسی سے مل سکتی ہے اور طالب توحید کیلئے اسکے سوا کوئی راستہ نہیں،

مذہب کے نام پر بلاشبہہ خونریزیاں ہوئیں، لیکن اس کا ذمہ دار مذہب نہیں ہے، سارے مذاہب میں انسانی جان کا بڑا احترام ہے، کوئی مذہب بھی ناحق کسی کی جان لینے کی اجازت نہیں دیتا بلکہ جانوروں تک کو ایذا دینا، اور بلا ضرورت ان کی جان لینا جائز نہیں ہے، اسلام میں انسانی جان کا اتنا احترام ہے کہ اس نے ایک انسانی جان کو ساری دنیا کی جان کے برابر قرار دیا ہے،

من قتل نفسًا بغير نفس او فساد	جس نے خون ناحق کے بدلہ میں نہیں اور
في الارض فكانما قتل	نہ ملک میں فساد پھیلانے کی سزا میں
الناس جميعا ومن احياها	کسی کو قتل کیا، اس نے گویا تمام آدمیوں
فكانما احياء الناس جميعا،	کو قتل کیا، اور جس نے کسی ایک کی جان

یعنی مذہب میں کسی مقتول کے خون کے بدلے یا ملک بدامنی پھیلانے والوں کے علاوہ اور کسی کو قتل کرنا جائز نہیں، اسی قانون پر ساری دنیا کا عمل ہے، اس لئے مذہب کے

اس وقت دنیا دو بلاکوں میں تقسیم ہے، جمہوری اور کمیونسٹ، جمہوریت نواز امریکہ میں آج تک ریڈ انڈین کو عملاً مساویانہ حقوق حاصل نہیں ہیں، ویٹ نام میں اس نے جو کچھ کیا وہ سب کے سامنے ہے، اسرائیل کو عربوں پر مسلط کر رکھا ہے، جو اسکی شہ پر علانیہ بین الاقوامی قوانین کو پامال کرتا رہتا ہے، لاکھوں عرب غریب الوطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور مذہب انسانیت کے مبلغ خاموش تماشائی بنے ہوئے ہیں، روس کا حال جو عدل و مساوات کا سب سے بڑا مبلغ ہے اس سے بھی برا ہے، جمہوری ملکوں میں کم از کم اپنے ملک والوں کو آزادی حاصل ہے، کمیونسٹ ملکوں میں یہ بھی نہیں، اس میں تو دل و دماغ تک پر پابندی ہے، اہل ملک اسکے علاوہ کچھ سوچ ہی نہیں سکتے، نیک نیتی سے بھی کمیونزم پر تنقید کی سزا قتل یا جلا وطنی ہے، دوسری قوموں کے ساتھ اسکا طرز عمل یہ ہے کہ اس نے سویٹ یونین کی مسلم آبادی کے مذہب اور تہذیب کو اس طرح مٹایا ہے، کہ اس سرزمین میں جو صدیوں اسلامی علوم و فنون اور اسلامی تہذیب و ثقافت کا گہوارہ رہ چکی ہے، اور جس میں بڑے بڑے ائمۂ اسلام پیدا ہوئے، چند نمائشی آثار قدیمہ کے سوا اسلام اور اسلامی تہذیب تقریباً ختم ہو چکی ہے، ان دونوں نظاموں نے پوری انسانیت کو خطرہ میں ڈال دیا ہے، ان کو تو صرف مثال کے لئے پیش کیا گیا ہے، دوسروں کے ہاتھ میں بھی قوت آ تی ہے، اس کا یہی حال ہوتا ہے، کمزور قوموں کا قسمت بی بی از بے چادری کا ہے،

اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ ایک طرف مسلک انسانیت کی دعوت ہے، دوسری طرف مغربی تہذیب کے پیدا کردہ قومیت اور وطنیت کے محدود تصور نے انسانوں میں

سیاسی و اقتصادی برتری اور اپنے نظریوں کی جبری اشاعت کے لئے کی جاتی ہیں، آج ایک ایک جنگ میں جتنی انسانی جانیں تلف ہوتی ہیں، اتنی مذہبی لڑائیوں کی پوری تاریخ میں نہ ہوئی ہونگی، اور اُن کی ہیبت اور درندگی کی مثال وحشی انسانوں کی تاریخ بھی نہیں مل سکتی، ان کے سامنے چنگیز و ہلاکو کے افسانے گرد ہیں ان کے پاس ایسے ہلاکت خیز آلات و اسلحہ کہاں تھے، جو پُرامن آبادیوں اور بڑے بڑے شہروں کو چشم زدن میں خاک کا ڈھیر بنا دیں جس سے ہر شخص واقف ہے اسلئے غریب مذہب تو خونریزی کے لئے مفت بدنام ہے،

"مذہب انسانیت" بڑی خوبصورت مگر ظاہر فریب اصطلاح ہے، جس کے معنی کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہونگے ممکن ہے اس کے مبلغوں کی نیت نیک ہو لیکن جب تک زندگی کے بارہ میں ان کا نقطۂ نظر نہ بدلے گا، اس قسم کی کوئی تحریک اجتماعی حیثیت سے کامیاب نہیں ہو سکتی، اور مادی نقطۂ نظر کے ساتھ اخلاق کا درس کبھی نتیجہ خیز نہیں ہو جن قوموں کا تصور حیات خالص مادی اور جن کا مقصد اپنی قوم کی سربلندی اور بغیر کسی قید کے مادی تعیشات سے لطف اندوزی ہو وہ دوسروں کے ساتھ انصاف کر ہی نہیں سکتیں، اس پر ان قوموں کے حالات شاہد ہیں،

اسی لئے مختلف قوموں کے درمیان عدل و مساوات اور دنیا میں قیام امن کی کوئی تدبیر کامیاب نہیں ہو پاتی، بین الاقوامی مجالس انسانی حقوق کے چارٹر اور عدل و مساوات کے قوانین بناتی ہیں لیکن اس کا بہت کم نتیجہ نکلتا ہے، اور خود عدل و مساوات اور قیام امن کے داعی ان قوانین کو پامال کرتے رہتے ہیں، ایک طرف قیام امن کا وعظ کہتے ہیں، دوسری طرف انسانوں کی ہلاکت و بربادی کے اسلحہ کی تیاری بھی زور شور سے جاری رہتی ہے، کمزور قومیں صرف ان کا ضمیمہ بنکر زندہ رہ سکتی ہیں

جو شخص انسانوں پر رحم نہیں کرتا، خدا اس پر رحم نہیں کرتا" کوئی مسلمان اس وقت تک صحیح معنوں میں مسلمان نہیں کہلا سکتا، جب تک وہ دوسروں کے ساتھ وہی چیز نہ پسند کرے جو اپنے لئے کرتا ہے،، کلام مجید کی آیات بلا تفریق سارے انسانوں کے ساتھ عدل وانصاف اور حسن سلوک کی تاکید سے معمور ہیں" احسن کما احسن اللہ الیک" "ان اللہ یحب المحسنین،، ان ساری تعلیمات کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے سچے پیرو وں نے عملاً برت کر دکھایا، اور آج بھی ایک مومن کی پہچان یہی ہے، ان تعلیمات سے بڑھکر مسلک انسانیت اور کیا ہو سکتا ہے،

درحقیقت انسانوں میں وہ اخلاقی جوہر جس پر مذہب انسانیت کی بنیاد ہے مذہب ہی پیدا کر سکتا ہے، اس کے لئے محض اخلاقیات کی زبانی تعلیم کافی نہیں، فلسفۂ اخلاق صرف دماغ سے اپیل کرتا ہے، اور مذہب دل سے، حدیث نبوی میں ہے کہ "انسان کے جسم میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے، جب وہ درست رہتا ہے، تو سارا وجود درست رہتا ہے، اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو سارا وجود بگڑ جاتا ہے، اور یہ قلب ہے" اس لئے مذہب دل کو بدلتا ہے، اس کو ایک دوسرے پہلو سے دیکھئے، ایک طرف مذہب ہے جسکی تعلیم یہ ہے کہ ایک قادر مطلق دانا و بینا ذات ہے، انسان اس دنیا میں جو کچھ بھی کرتا ہے وہ سب کو جانتی اور دیکھتی ہے، اس نے نیکیوں کا حکم دیا ہے، اور برائیوں سے روکا ہے، اس دنیا کے علاوہ ایک اور عالم بھی ہے، جہاں ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق جزا و سزا ملے گی،

دوسری طرف یہ عقیدہ ہے کہ جو کچھ ہے، بس یہی دنیا اور اسکی لذتیں ہیں اسکے بعد کچھ نہیں،، ان دونوں میں کون سا عقیدہ انسان کا تزکیہ اور اس میں اخلاقی

اتنی تفریق و تخریب پیدا کر دی ہے کہ تاریخ کے کسی دور میں اس کی مثال نہیں ملتی کوئی چھوٹے سے چھوٹا انسانی گروہ بھی دوسرے کے ساتھ مل کر زندگی بسر کرنے کے لئے تیار نہیں، جن قوموں کی نسل ایک ہے، مذہب ایک ہے، زبان ایک ہے، تہذیب ایک ہے، ان میں بھی جغرافی حدبندیوں نے اتنی تفریق پیدا کر دی ہے کہ اتحاد کے یہ سارے رشتے بیکار ہو گئے ہیں، جس کا نمونہ عرب ہیں، بڑے ملکوں میں ہر جغرافی و لسانی خطہ آزادی کا مدعی ہے اور ایک دوسرے کو غاصب سمجھتا ہے، اور وہ دن دور نہیں کہ یہ ملک چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ کر آپس میں رقیب بنجائیں گے،

درحقیقت احترام انسانیت کا سب سے بڑا معلم بھی مذہب ہی ہے، ہندوستان کے سارے مذاہب کی تعلیم اہنسا ہے، جس میں انسان کیا کسی جاندار کو بھی ایذا پہنچانا جائز نہیں[1] بدھ ازم کی بنیاد ہی انسان دوستی اور انسانی مساوات پر ہے، عیسائیت سراسر رحم و محبت کا مذہب ہے، اسلام کی نگاہ میں انسانوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں بحیثیت انسان کے سب برابر ہیں، اس نے انسانی مساوات کا یہ جامع منشور دنیا کے سامنے پیش کیا

"تم سب کا رب ایک ہے، باپ ایک ہے، تم سب اولاد آدم ہو، جو مٹی سے بنے تھے (یعنی بحیثیت انسان کے سب برابر ہیں،) خدا کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ پاکباز ہے، کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر فضیلت نہیں، تم سب اولاد آدم ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے،، ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے، خدا کے نزدیک سب سے پسندیدہ شخص وہ ہے، جس کا سلوک اسکے کنبے کے ساتھ اچھا ہے"

"تم لوگ زمین والوں (انسان) پر رحم کرو تو آسمان والا (خدا) تم پر رحم کریگا"

---

[1] اگرچہ اب جدید انڈرانیئے اہنسا کو ہنسا سے بدل دیا ہے،

کے خلاف ہے، خواہ اس کا اثر اس کی ذات تک محدود ہو، دوسرے الفاظ میں قانون کا مقصد انسان کی ذہنی و نفسی کیفیت کا بدلنا نہیں بلکہ صرف اسکی ظاہری پابندی ہے اور مذہب کا مقصد اسی ذہنی و نفسی کیفیت کا پیدا کر دینا ہے جس سے انسان کو طبعاً نیکیوں اور اچھے کاموں کی طرف رغبت اور بدی اور شر سے نفرت پیدا ہو جائے، اگر ایک شخص مذہب کے ظاہری احکام کا تو پابند ہے، لیکن باطنی اخلاق کی پاکیزگی نہیں رکھتا تو اسکو صحیح معنوں میں مذہبی نہیں کہا جا سکتا، اسی لئے سارے مذاہب نے ظاہری احکام کی پابندی کے ساتھ اور اس سے زیادہ باطنی اخلاق کی پاکیزگی پر زور دیا ہے اور یہ چیز مذہب ہی پیدا کر سکتا ہے؛

اس سے کسی کو بھی انکار نہیں کہ جدید علوم اور سائنس کی ایجادات نے انسانیت کی بڑی خدمت کی ہے، اس نے انسانی راحت و آسایش کے ایسے ایسے سامان فراہم کر دیئے ہیں جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، اسکی ایجادات سے انسانیت کو بڑے فوائد پہنچے اور آج کوئی قوم بھی سائنسی علوم کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی، مغربی قوموں میں انسانی ہمدردی کا جذبہ بھی ہے اور وہ اس کا عملی ثبوت بھی دیتی رہتی ہیں، ان میں بہت سے قابل تقلید اوصاف ہیں لیکن مغربی تہذیب کی لادینیت اور مادی تصورِ حیات نے روحانی اور بہت سے اخلاقی پہلوؤں کو بالکل نظرانداز کر دیا ہے، صرف مادی ترقی ہی زندگی کا نصب العین بن گئی ہے، ہر قوم اسی جنون میں مبتلا ہے، بڑی قومیں دنیا کے بڑے سے بڑے حصہ کو اپنے حلقۂ اثر میں لاکر اپنا نظریۂ حیات اس پر مسلط کرنا چاہتی ہیں، اس کے لئے ان میں مسابقت کا ایک حشر برپا ہے، اس میدان میں ہر قوم آگے نکل جانا چاہتی ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ انسانی ذہن و دماغ کی ساری صلاحیتیں اور سائنس کی ساری قوت ایسے ہلاکت خیز اسلحہ کی ایجادات میں صرف ہو رہی ہے جس سے حریفوں کو زیر کرکے اپنی برتری

اوصاف پیدا کرسکتا اور اس کے ضوابط کا پابند بنا سکتا ہے، نفس کے مطالبات کی تسکین کا سامان آزادی میں ہے اسلئے انسانی فطرت اسکو اختیار کریگی یا اخلاقیات کو جس میں ہر قدم پر پابندی ہے، نفس کے تقاضوں کا دائرہ بہت وسیع ہے، اسمیں مادی تعیشات سے لیکر جاہ و اقتدار اور حکومت و سیاست سب شامل ہیں، بلکہ سب سے زیادہ لذت تو جاہ و اقتدار ہی میں ہے، اس مادی تصور میں انسانی حقوق کے تحفظ اور ان میں عدل و مساوات کی گنجایش کہاں ہے، چنانچہ آج دنیا میں جو فساد بھی برپا ہے، وہ اسی مادی نقطۂ نظر کا نتیجہ ہے،

یہ دعویٰ نہیں کیا جاتا کہ مذہب کے بغیر کسی انسان کی اصلاح ہو ہی نہیں سکتی، انفرادی حیثیت سے اس کی مثالیں مل جائیں گی لیکن مذہب کے بغیر کوئی بڑا اور دیرپا اخلاقی انقلاب نہیں ہو سکتا، جن انسانوں کی فطرت سلیم ہوتی ہے، ان میں تعلیم و تربیت قبول کرنے کی قدرتی صلاحیت ہوتی ہے، ان کے لئے اخلاقی تعلیم کافی ہے، لیکن اکثریت کی فطرت سرکش اور آزاد ہوتی ہے، وہ قید و بند کو نہیں پسند کرتی، جن طبیعتوں میں فطری شر ہوتا ہے، ان کو مواخذہ کا خوف ہی قوانین کا پابند بنا سکتا ہے، اسی غرض سے دنیاوی قوانین بنائے جاتے ہیں، اگر محض درس اخلاق کافی ہوتا تو قوانین کی ضرورت ہی نہ پڑتی،

دنیاوی قوانین اور مذہب میں یہ فرق ہے کہ دنیاوی قوانین کا مقصد صرف معاشرہ میں عدل و نظم کا قیام ہے، انسانی اخلاق کا تزکیہ نہیں، اسکو اخلاقیات سے صرف اسی حد تک بحث ہوتی ہے جبکا برا اثر سوسائٹی پر نہ پڑے، چنانچہ اگر ایک شخص قانون کا پابند ہے تو پھر قانون کو اس سے بحث نہیں، کہ اسکی اخلاقی زندگی کیسی ہے، اور مذہب کا مقصد انسان کے باطن کی اصلاح ہے، اس کی نگاہ میں ہر وہ فعل جرم ہے، جو اخلاقی پاکیزگی

ملکوں میں بھی ہوتے ہیں، لیکن انکو سوسائٹی نے ہمیشہ برا سمجھا اور اس کے مرتکبین بھی انکو برائی ہی سمجھتے ہیں، مغربی ممالک کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اس کو ہنر اور آرٹ بنا دیا، مگر بدمستی کے اس سیلاب میں کچھ ہوش والے بھی ہیں، اور یورپ کا سنجیدہ اور صاحب فکر طبقہ اس اخلاقی نارکی سے پریشان ہے، اور اس کے خلاف آواز بلند کرتا رہتا ہے، لیکن جس تہذیب اور تصور حیات کی بنیاد ہی خالص مادیت پر ہو اسکی اصلاح محض وعظ و پند سے نہیں ہو سکتی

خشت اول چوں نہد معمار کج　　تا ثریا می رود دیوار کج

اس کی اصلاح مذہب، خدا اور آخرت کا خوف ہی کر سکتا ہے، دنیا جتنی بھی ترقی کر جائے لیکن روحانیت اور اخلاقی پاکیزگی کے لئے مذہب ہی کی محتاج رہے گی، یا تو ایک دن اس کے ماننے پر مجبور ہو گی یا مادہ پرستی اس کا خاتمہ کر دیگی، یہ خوش عقیدگی نہیں بلکہ واقعہ ہے، اگر بغیر کسی اخلاقی قید کے مہلک اسلحہ کی دوڑ اسی طرح جاری ہے تو اس کا انجام دنیا کی تباہی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے،

معارف سلیمان نمبر

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات و سوانح، اخلاق و شمائل، فضائل و کمالات اور ان کے علمی، دینی، قومی، ملی، اصلاحی، اور تعلیمی کارناموں اور خدمات کا ایک دلآویز مرقع، جس میں وقت کے بہت سے ارباب کمال نے مضمون لکھ کر سید صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے، یہ درحقیقت زیر ترتیب حیات سلیمان کا پیش خیمہ ہے، جو عنقریب شائع ہونے والی ہے،

مرتبہ:- شاہ معین الدین احمد ندوی،　　۳۱۲ صفحے　　۴-۳۷

کا سکہ بٹھایا جا سکے، اس مسابقت نے دنیا کو ہلاکت کے دہانہ پر پہنچا دیا ہے،

جن چیزوں کو سائنس کا بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے اور جس پر ایک دنیا جھومتی ہے وہ بھی اسی جذبہ کا نتیجہ ہیں، فلک پیما راکٹوں کا مقصد یہ ہے کہ دشمن کا کوئی ملک اسکی زد سے باہر نہ رہے، چاند پر انسانی قدم کا پہنچنا بلاشبہ انسانی عزم و حوصلہ کی بہت بڑی فتح اور سائنس کا بہت بڑا کارنامہ ہے، لیکن وہ بھی جذبہ مسابقت سے خالی نہیں اس سے انسانیت کو کیا فائدہ پہنچا اور اس کے درد دکھ کا کیا مداوا ہوا، جو بے کراں دولت فلک پیمائی پر صرف ہو رہی ہے، اگر پس ماندہ ملکوں اور مصیبت زدہ انسانوں پر صرف ہوتی تو انسانیت کی کتنی بڑی خدمت ہوتی آج کتنے انسان ایسے ہیں جن کو زندگی کی بنیادی ضروریات بھی میسر نہیں، کروڑوں انسان آلام و مصائب کا شکار ہیں، اگر بڑی قوموں نے فلک الافلاک پر بھی اپنی فتحمندی کا جھنڈا گاڑ دیا اور غریب انسانیت کراہتی رہی تو اس سے کیا حاصل اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس قسم کی ایجادات و تجربات ترقی کا معیار بن گئے ہیں، اور ملک کے دفاع کے لئے ان کو ضروری سمجھا جاتا ہے، اس سے وہ قومیں بھی جن کو پیٹ بھر کھانا اور ستر پوشی کے لئے کپڑا تک میسر نہیں اس کا خواب دیکھتی ہیں،

اس مادی تصور حیات کا دوسرا تاریک پہلو یہ ہے کہ نفس پرستی کا ایک سیلاب امنڈ پڑا ہے، جس نے عفت و پاکیزگی کے تصور کو بالکل ختم کر دیا ہے اور لذت پرستی اس حد تک پہنچ گئی جہاں انسانیت اور حیوانیت میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا، اس پر مغربی ملکوں کی جنسی تحریکیں شاہد ہیں، اور اس میں انھوں نے ایسی جدتیں پیدا کی ہیں جن سے حیوانی فطرت بھی ابا کرتی ہے، اس قسم کے واقعات آئے دن اخبارات میں چھپتے رہتے ہیں، جن سے ہر شخص واقف ہے، اس قسم کے انفرادی واقعات مشرقی

مگر یہ واقعہ ہے کہ ان کی ولادت جونپور میں ہوئی، اور اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے کہ وہ ولید پور میں پیدا ہوئے، جیسا کہ ہندوستان کی قدیم درسگاہیں اور بعض دوسری کتابوں میں مذکور ہے، ملا صاحب اپنے نانا کے یہاں جونپور میں پیدا ہوئے اور وہیں ان کی نشو و نما ہوئی، ان کے والد شیخ محمد ۲ ربیع الاول ۱۰۲۷ھ میں فوت ہوئے، اس وقت ملا صاحب کی عمر بارہ سال سے بھی کم تھی، اور نانا شیخ شاہ محمد زندہ تھے، انھوں نے اپنے نواسے کو اپنی تعلیم و تربیت میں پروان چڑھایا،

تعلیم

ملا صاحب کی تعلیم کے سلسلے میں ان کے صرف دو تین استادوں کے نام ملتے ہیں ایک ان کے نانا شیخ شاہ محمد، دوسرے نانا کے بڑے والد استاذ الملک ملا محمد افضل اور تیسرے ملا شمس نور بیرونوی: ملا صاحب نے ننہال میں قرآن شریف ختم کرنے کے بعد نانا سے علوم آلیہ نحو صرف اور ادب وغیرہ کی تعلیم حاصل کی، مولانا ابو الخیر نے تصریح کی ہے کہ "بعد ختم قرآن در تحصیل علوم ادبیہ در خدمت جد مادری آغاز کردند، و جد مایہ او بود ہم پدر بزرگوار ایشان" شیخ شاہ محمد علوم و فنون میں یگانۂ وقت اور شرافت و مکارم اخلاق میں ممتاز تھے، مولانا ابو الخیر بھی ان سے اکتساب علم و فن کرتے تھے، اور انھوں نے ان کو شیخ العصر، البحر المدقق، العلامۃ المحقق کے القاب سے یاد کیا ہے، نزہۃ الخواطر میں ملا صاحب کی پیدائش جونپور میں بتائی گئی ہے، اور یہ بھی لکھا۔

ونشأ فی مهد جده شاه محمد وقرأ علیه کتب الدرسیة[1]	ملا صاحب اپنے نانا شاہ محمد کے یہاں پروان چڑھے اور ان سے کتب درسیہ کی تعلیم پائی،

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۹۷،

ملا محمود جونپوری

از مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی

(۲)

ولادت اور مولد و منشاء

ملا صاحب اپنے گھر کی روایت کے مطابق سلطان نور الدین جہانگیر کی سلطنت کے دوسرے سال رمضان ۱۰۱۵ھ میں پیدا ہوئے، مولانا ابو الخیر نے شیر و شکر میں تصریح کی ہے "ولادت باسعادتش در ماہ مبارک سنہ ہزار و پانزدہ واقع شد" مگر تجلی نور اور نزہۃ الخواطر میں ملا صاحب کی پیدائش ۹۹۳ھ درج ہے[1] جو صحیح نہیں ہے، ملا صاحب کی جائے پیدائش جونپور ہے، جیسا کہ انھوں نے خود الفرائد کے شروع میں تحریر فرمایا ہے، اما بعد فیقول العبد الملتجی الی ربہ الصمد محمود بن محمد الفاروقی الجونفوری مولداً و محتداً[2]، یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ملا صاحب کے پردادا شیخ جھجن جونپور کے قاضی تھے، اور زیادہ تر وہیں رہتے تھے، جونپور انکا قدیم آبائی وطن تھا، اور ملا صاحب کی نانہال بھی جونپور ہی میں تھی، پھر جونپور اور ولید پور بھیرا کے درمیان اسی پچاسی میل کی مسافت ایسی نہیں تھی کہ آمد و رفت میں دقت و دشواری ہو، یہ درست ہے کہ ملا صاحب کے دادا شیخ بڑے اور ان کے والد شیخ محمد اپنے وطن میں رہتے،

۱؎ تجلی نور ج ۲ ص ۸۴، و نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۹۰، ۲؎ الفرائد ص ۳،

میں تھے، اور ان ہی کی خدمت میں رہکر مسائل کے استنباط و تحقیق میں مہارت حاصل کی، اسطرح ملا محمد افضل نے بیس[۲] سال کی عمر میں تمام مروجہ علوم وفنون کی تحصیل و تکمیل سے فراغت پائی،

اس وقت جونپور شیراز ہند بنا ہوا تھا، ہر طرف علماء و فضلاء کا مجمع تھا، ملا محمد افضل فراغت کے بعد اپنے چھوٹے بھائی شیخ سلطان محمود (ملا محمود کے نانا کے والد) کے ساتھ جونپور آئے اور محلہ سپاہ میں قیام کرکے درس و تدریس میں مشغول ہوگئے، ملا محمد افضل ظاہری علوم میں یگانۂ روزگار ہونے کے ساتھ روشن ضمیر صوفی بھی تھے، شیخ عبدالقدوس قلندر شطاری نظام آبادی متوفی ۱۰۵۳ھ سے بیعت و نسبت رکھتے تھے، جو شیخ قدن اور قطب صدیق کے لقب سے مشہور تھے، اور میر علی عاشقاں سرائمیری متوفی ۱۰۵۰ھ اور شیخ دیوان عبدالرشید متوفی ۱۰۴۲ھ کے شیخ و مرشد تھے، انھوں نے طریقۂ شطاریہ کو براہ راست اس کے بانی شیخ عبداللہ بن حسام الدین خراسانی سے حاصل کیا تھا، ملا محمد افضل زندگی بھر درس و تدریس میں مشغول رہے، ان کے فضل و کمال کا شہرہ دور دور تک پھونچا، علمائے جونپور نے خاص طور سے ان سے استفادہ کیا، یہ جہانگیر کا دور سلطنت تھا، جونپور کے وقائع نگار نے ملا محمد افضل کی مرجعیت اور ان کے علم و فضل کے بارے میں جہانگیر کو اطلاع دی، اس نے انکو استاذ الملک کا لقب دیا اور جونپور کے شاہی مدرسہ کی مدرسی اور جاگیر کا پروانہ روانہ کیا مگر ملا محمد افضل نے اس کے قبول کرنے سے معذرت کی اور پوری زندگی توکل و تدریس میں گذاردی، یوں تو ان کے تلامذہ میں بڑے بڑے علماء و فضلاء اور اہل اللہ تھے مگر ان میں انکو اپنے دو شاگردوں پر ناز تھا، اور ان دونوں کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ علامہ تفتازانی اور علامہ جرجانی کے بعد ایک وقت اور ایک شہر میں ان کے جیسے دو

تذکرہ علمائے ہند میں بھی یہی ہے کہ ملا ابتداءً از جد خود مولانا شاہ محمد اخذ علوم کردہ[1] مولانا آزاد بلگرامی نے سبحۃ المرجان میں اور مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے شمس بازغہ کے آخر میں شیخ شاہ محمد سے ملا صاحب کے ابتدائی تلمذ کی تصریح کی ہے، مگر ان دونوں بزرگوں نے تلمذ علی جدہ القریب لکھا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ شیخ شاہ محمد ملا صاحب کے نانا نہیں بلکہ دادا تھے، کیونکہ اصطلاحاً جد قریب دادا کو کہتے ہیں، نانا کے لئے جد بعید یا جد فاسد یا جد الام کہا جاتا ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ ملا صاحب جونپور میں اپنے نانا کے یہاں پیدا ہوئے وہیں سن شعور کو پہونچے اور عربی کی ابتدائی تعلیم ان ہی سے حاصل کی۔

استاذ الملک ملا محمد افضل جونپوری | اس کے بعد تمام تذکرہ نگاروں کی تصریح کے مطابق ملا صاحب نے اپنے نانا کے بڑے بابا استاذ الملک ملا محمد افضل سے اپنی خداداد ذہانت فطانت اور کوشش سے قلیل مدت میں جملہ مروجہ علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل کر لی، ملا محمد افضل کے والد مفتی حمزہ عثمانی علاقہ ماژندران سے آکر قصبہ ردولی میں آباد ہوئے[2] اور وہیں ۱۶ رمضان ۹۸۴ھ میں ملا محمد افضل پیدا ہوئے، سن شعور کو پہونچکر اپنے والد مفتی حمزہ سے علوم عقلیہ و نقلیہ کی تعلیم حاصل کی، پھر جونپور آئے اور یہاں سے لاہور جاکر ملا عبدالحکیم سیالکوٹی متوفی ۱۰۶۷ھ سے پڑھا، پھر دہلی میں ملا شیخ حسین کے حلقۂ درس سے استفادہ کیا، ملا شیخ حسین جملہ مروجہ علوم و فنون میں یکتائے روزگار تھے، ملا طاہر لاہوری اور حکیم اسمٰعیل سے بھی شرف تلمذ رکھتے تھے، دہلی ہی میں صحاح ستہ اور دیگر کتب حدیث ملا ابو حنیفہ سے پڑھیں، جو مخدوم الملک اور حکیم گیلانی کے شاگرد دوں

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۲۱، [2] ان کی نسل اب بھی ردولی میں آباد ہے، ملا افضل جونپوری خواجہ عثمان ہارونی کی اولاد تھے، اس لئے ان کی نسل کے لوگ اپنے کو ہارونی لکھتے ہیں،

قرء علیه محمود بن محمد الجونپوری صاحب الشمس البازغة لبعض الکتب وقرء علیه ابن اخته محمد رشید بن مصطفی الجونپوری صاحب الرشیدیہ انح	ملا محمود نے ان سے بعض کتابیں پڑھی ہیں، اور ان کے بھانجے دیوان محمد رشید جونپوری نے بھی پڑھا ہے،

ان کے علم و فضل کی شہرت سن کر اکبر نے شاہزادہ پرویز کی تعلیم ان کے سپرد کی؛ انھوں نے الہ آباد جاکر یہ خدمت انجام دی، اکبر نے ان کو جونپور --- کا قاضی بھی بنایا، بعد میں انھوں نے افتا اور درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کر لیا، ایک بہت بڑا مدرسہ اور ایک عظیم لشان خانقاہ تعمیر کی، اکثر فضلاے جونپور نے ان سے استفادہ کیا، ۱۰۴۷ھ میں جونپور میں انتقال فرمایا اور اپنے مدرسہ میں دفن کئے گئے، مدرسہ اور خانقاہ کا کوئی نشان اب باقی نہیں ہے، ان کی اولاد میں شاہ محمد طفیل ایک بزرگ تھے، ان کے دروازہ کے سامنے ملا شمس نور کا مزار تھا، ان کے تلامذہ میں ملا رکن الدین ہریا بادی بھی ہیں[۱]،

زمانہ طالب علمی اور ذکاوت و ذہانت | ملا محمود میں بچپن ہی سے خداداد ذہانت و ذکاوت تھی، اور گھر ہی میں اپنے نانا اور ان کے بڑے بابا سے پوری تعلیم حاصل کی تھی، ان دونوں بزرگوں کی خصوصی توجہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ طالب علمی کے ہی زمانہ میں ملا صاحب کو ایسی شہرت و ناموری حاصل ہوگئی کہ ان کے سامنے بڑے بڑے علماء علمی مسائل میں گفتگو کرنے میں احتیاط برتتے تھے، نزہۃ الخواطر میں ہے

کان یحضر المجالس والمحافل فی صغرہ فیتکلم ویناظر ویفحم الکبار ویاتی بما یتحیر منه اعیان البلد فی العلم	ملا صاحب بچپن میں علمی مجلسوں میں شریک ہوکر علمی مباحث میں گفتگو اور مناظرہ کرتے اور بڑے بڑے اہل علم کو خاموش کر دیتے اور

[۱] تجلی نور و نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۱۶۸

فضلاء کا اجتماع نہیں ہوا، یہ دونوں ملا محمود اور شیخ عبدالرشید تھے، ملا محمود کا انتقال استاد کی زندگی میں ہوگیا ان کو انکی وفات کا اتنا صدمہ ہوا کہ اس کے اثر سے ۱۳ ربیع الثانی ۱۰۸۳ھ میں انتقال کر گئے، ان کے کوئی اولاد باقی نہیں رہی البتہ ان کے چھوٹے بھائی سلطان محمود کی نسل چلی جو ماضی قریب تک ملا محمد افضل کے مکان اور خانقاہ واقع محلہ سپاہ میں آباد تھی، [1] ملا محمد افضل کے تذکرہ میں صاحب تجلی نور نے لکھا ہے کہ جس وقت ملک العلما قاضی شہاب الدین دولت آبادی کا وصال ہوا اہل جونپور نے علم کا اور داعی ماتم کیا ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ ملک العلماء خود تو دنیا سے تشریف لے گئے مگر علم کی خلعت فاخرہ استاذ الملک ملا محمد افضل کے لئے چھوڑ گئے،

گماں مبر کہ تو چوں بگزری جہاں بگذشت ہزار شمع بکشتند و انجمن باقی است

مولانا شمس نور بردنوی جونپوری ملا صاحب کے ایک اور استاذ مولانا شمس نور (شمس الدین ابن نورالدین) بردنوی جونپوری تھے، وہ بردنہ میں پیدا ہوئے، اور مروجہ تعلیم و تربیت سے آراستہ ہوکر مسند تدریس کو رونق بخشی اور اپنے زمانہ کے مشہور علماء میں شمار کئے گئے، ان کی درسگاہ سے علماء فضلاء کی ایک بڑی جماعت نکلی جس میں ان کے بھانجے دیوان محمد رشید اور ملا محمود قابل ذکر ہیں، صاحب تجلی نور نے لکھا ہے،

مولانا دیوان عبدالرشید در اوائل حال کتب متداولہ در خدمتش خواندہ بود و علامہ ملا محمود ہم سبق آموختہ اوست،	مولانا دیوان عبدالرشید نے ابتدائی کتابیں انسے پڑھیں اور ملا محمود نے بھی ان سے درس لیا ہے،

نزہتہ الخواطر میں ہے:۔

[1] تذکرۃ العلماء ص ۴۹ و ۵۴ و تجلی نور ج ۲ ص ۳۳ و ۷۲ نزہتہ الخواطر ج ۵ ص ۱۶۸،

بعد ملا صاحب فارغ ہوئے، اس وقت سلطان جہانگیر کا آخری دور سلطنت تھا،
ملا صاحب کے دادہال اور نانہال دونوں میں قدیم زمانہ سے ظاہری علوم کے ساتھ،
روحانیت اور مشیخت کا بھی ذوق تھا، ان کے جد اعلیٰ سلسلۂ سہروردیہ کی خلافت
سے بہرہ ور تھے، خاندان میں سجادہ نشینی کا سلسلہ جاری تھا، ان کے دادا شیخ بڑے
مخدوم ابراہیم سے بیعت تھے، اور ان کے خسر سید گھورن قاضی محمد آباد مشہور سادات
میں سے تھے، اور والد شیخ محمد نے بھی سلوک و معرفت کی راہ اختیار کر لی تھی اور آخر
میں گوشہ نشین ہوگئے تھے، پرنانا شیخ المشائخ قطب الآفاق سلطان محمود شیخ مبارک
چیری مالی جونپوری متوفی ۹۰۳ھ اور شیخ میر علی عاشقاں سرائمیری متوفی ۹۵۰ھ کے مرید
و خلیفہ اور نانا شیخ شاہ محمد شیخ العصر والبحر المدقق والعلامۃ المحقق تھے، ملا محمد افضل علوم
و فنون میں یگانہ ہونے کیساتھ روشن ضمیر صوفی اور صاحب دل بزرگ تھے، میر علی عاشقاں کے پیر و مرشد شیخ عبد القدوس
شطاری نظام آبادی متوفی ۱۰۵۳ھ سے بیعت کی نسبت رکھتے تھے، ایسے ماحول اور گھرانے میں ملا صاحب نے
پرورش پائی اور سترہ سال کی عمر میں جبکہ ان کا عنفوان شباب تھا، مروجہ علوم و
فنون خاص طور سے حکمت و ادب میں یگانۂ عصر ہوئے، خاندان کے روحانی ماحول
سے ان کو روحانی فیض پہونچا، ابتدا میں رسمی طور سے نہ سہی مگر طبعی طور سے روحانیت
اور سلوک کا ذوق رکھتے تھے اور یہی دبی ہوئی چنگاری آگے چل کر حضرت میاں
میر لاہوری کے فیض صحبت سے ایسی بھڑکی کہ ملا صاحب کی دنیا ہی بدل گئی اور
انھوں نے ۱۰۵۲ھ میں شیخ نعمت اللہ فیروزپوریؒ سے بیعت کر لی، اس کی تفصیل
اپنی جگہ آئے گی، بعض اقوال کے مطابق ملا صاحب حافظ قرآن بھی تھے، مگر اسکی
تصریح ان کے حالات میں نہ مل سکی،

ایسی ایسی علمی باتیں کہتے جن سے علمائے
جونپور متحیر رہتے تھے،

(نزہتہ الخواطر ج ۵ ص ۳۵۸)

دیوان محمد رشید عثمانی جونپوری (ولادت ۱۰۰۰ھ وفات ۱۰۸۳ھ) اور ملا محمود جونپوری (ولادت ۱۰۱۰ھ وفات ۱۰۶۲ھ) دونوں استاذ الملک محمد افضل کے عزیز ترین تلامذہ میں سے تھے، استاذ ان دونوں پر فخر کرتے تھے، اثنائے درس میں کبھی کبھی ان دونوں میں علمی نوک جھونک بھی ہو جاتی تھی، خاص طور سے حاشیہ چلپی کے درس میں ملا محمود اور دیوان محمد رشید کے درمیان مسابقت رہا کرتی تھی، تجلی نور میں ان کی طالب علمی کے تذکرہ میں ہے

چناں طبع اخاذ، ذہن رسا، حافظہ درست، چند محنت کش بود کہ بہ اندک زمانہ بر سائر طلبا گوئے سبقت ربود، ودر ہفتدہ سالگی فاتحہ الفراغ خواندہ نقاوہ علمائے اشراقیین، وسلالۂ حکمائے مشائین گشت، ۱ ؎	ملا صاحب کی طبیعت اخاذ، ذہن تیز اور حافظہ قوی تھا، اور اس قدر محنتی تھے کہ تھوڑی مدت میں تمام طالب علموں سے سبقت لے گئے، اور سترہ سال کی عمر میں مروجہ علوم سے فارغ ہو کر اشراقی علماء اور مشائی حکماء کے سرخیل بن گئے،

ملا صاحب کے تقریباً تمام سوانح نگاروں نے سترہ سال کی عمر میں تحصیل و تکمیل سے فراغت کی تصریح کی ہے، اس حساب سے ۱۰۳۲ھ میں سلسلۂ تعلیم ختم ہوا، اور اسی سال ان کے نانا شیخ شاہ محمد کا وصال ہوا، والد کا انتقال زمانہ طالب علمی میں جب ملا صاحب صرف بارہ سال کے تھے ۱۰۲۷ھ میں ہو گیا تھا، اس حادثہ کے پانچ سال

---

۱ ؎ تجلی نور ج ۲ ص ۴۹

لگ گئے[۱]، ملا صاحب کے شاہجہانی دربار سے متعلق ہونے کے سلسلے کی اس کڑی کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ ان کے ہم خاندان، معاصر اور بہنوئی مولانا شاہ ابو الخیر بن شاہ ابو سعید بھیروی متوفی ۱۰۹۵ھ (مدفون بھیرا) اس سے پہلے شاہجہانی دربار سے منسلک ہو چکے تھے، مناقب غوثی میں ہے کہ مولانا حاجی ابو الخیر سلطان شاہجہاں کی سلطنت کے ابتدائی ایام میں دہلی گئے، ان کی علمی شہرت و صلاحیت کے پیش نظر امیر الامراء نواب شایستہ خاں نے ان کی آمد کو غنیمت جانا اور بڑے ادب و احترام سے اپنے یہاں رکھکر ان سے حدیث، تفسیر اور تصوف کی تعلیم حاصل کی، شاہجہاں ان سے مل کر بہت متاثر ہوا اور شایستہ خاں کے توسط سے خواہش کی کہ وہ کوئی شاہی منصب یا جاگیر قبول کر لیں، ایک مرتبہ مولانا ابو الخیر شاہجہاں کی مصاحبت میں سیالکوٹ گئے اور شاہ میر کی خدمت میں حاضر ہوئے ۱۰۵۰ھ میں جب حج و زیارت کا ارادہ کیا تو نواب شایستہ خاں نے خدمت کرنا چاہی مگر انھوں نے قبول نہیں کیا[۲]، اس لئے عجب کیا ہے کہ ملا صاحب کے شاہجہانی دربار سے منسلک ہونے میں مولانا ابو الخیر کی ذات وسیلہ بنی ہو، ورنہ خود ملا صاحب بھی اس درجہ کے تھے کہ ان کے سامنے امراء و سلاطین سر عقیدت جھکائیں،

منصب سہ صدی میں بادشاہ کی طرف سے ملا صاحب کو پندرہ گھوڑے، سات ہاتھی، چار رکاب دار، گیارہ گاڑیاں اور ۴۵۰۰ روپئے سالانہ ملتے تھے[۳]، کچھ جاگیر بھی وجہ معاش کے لئے عطا ہوئی تھی، اس کے بعد ملا صاحب جونپور کے شاہی مدرسہ میں تدریس کی خدمت انجام دینے لگے، تذکرۃ العلماء..... میں ہے:-

---

[۱] تجلی نور ج ۲ ص ۵۰۔ [۲] مناقب غوثی باب ہشتم قلمی، [۳] اس منصب کی تفصیل الہند فی العہد الاسلامی سے ماخوذ ہے،

فراغت کے بعد ملا صاحب سترہ سال کی عمر میں ۱۰۳۲ھ میں تحصیل علم سے فارغ ہوئے، اس کے چار سال کے بعد ۱۰۳۶ھ میں شاہجہاں کا دور سلطنت شروع ہوا، سبحۃ المرجان ص۵۳، تذکرہ علمائے ہند ص۲۲۱ اور نزہتہ الخواطر ج ۵ ص ۳۹۸، میں ہے کہ ملا محمود نے فراغت کے بعد مستقر خلافت آگرہ جاکر آصف خاں وزیر سے ملاقات کی، اس کے بعد جونپور واپس آکر درس و تدریس میں مشغول ہوگئے، سبحۃ المرجان اور نزہتہ الخواطر میں صبح صادق کے حوالہ سے یہ بیان نقل کیا گیا ہے، جو ملا صاحب کے ایک شاگرد کی تصنیف ہے، مگر یہ واقعہ فراغت کے فوراً بعد کا نہیں ہے کیونکہ اس کے چار سال بعد شاہجہاں کا دور سلطنت شروع ہوا، بلکہ یہ جہانگیر کا آخری دور تھا، اس لئے ملا صاحب کا جونپور سے اکبرآباد جانا اور شاہجہاں کے وزیر آصف خاں سے ملنا ۱۰۳۶ھ کے بعد کا واقعہ ہے، ملا صاحب نے یہ مدت جونپور میں درس و تدریس میں گذاری، جہاں ان کے استاذ ملا محمد افضل اور ان کے ہم سبق دیوان محمد رشید وغیرہ موجود تھے،

شاہجہاں کے دربار میں قدردانی تجلی نور میں ہے کہ ملا صاحب فراغت کے بعد جونپور ہی میں درس و تدریس میں مشغول ہوگئے، اور چند ہی دنوں میں ان کے علم و قابلیت کا شہرہ جونپور کے مدرسہ کی چار دیواری سے نکل کر دارالخلافتہ آگرہ کے ایوان تک پہونچا، اور شاہجہاں نے ملا صاحب کو کمال ارادت و عقیدت سے دہلی طلب کرکے فضلائے شاہی کے زمرہ میں شامل کیا، اور منصب سہ صدی ذات سے نوازا، اس سفر میں جب ملا صاحب دہلی کے قریب پہونچے تو بادشاہ کے حکم سے وزیر سعد اللہ خاں نے استقبال اور پیشوائی کی خدمت انجام دی، اور دربار میں شاہجہاں نے ملا صاحب کو اپنے پہلو میں جگہ دی، اس وقت سے ملا صاحب کی عزت و شہرت میں چار چاند

استفادہ اور ان سے شرف تلمذ حاصل کرنے میں عزت محسوس کی، ملا صاحب کی درباری زندگی سے متعلق کچھ واقعات کتابوں میں ملتے ہیں جن سے ان کے مقام و مرتبہ کا پتہ چلتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ شاہجہاں کے درباری علماء و فضلاء میں ملا صاحب ممتاز حیثیت کے مالک تھے، چند واقعات ملاحظہ ہوں،

شاہی دربار میں ملا صاحب کے مقابلہ میں ایک ایرانی فاضل کی شکست

صبح صادق کے حوالہ سے تذکرۃ العلماء نے لکھا ہے کہ شاہ ایران کی طرف سے ایک ایلچی اکبج نامی شاہجہاں کے دربار میں آیا، وہ مادرزاد اندھا تھا، اس کے بدلہ میں مگر اللہ تعالیٰ نے اس کی چشم باطن کو زبردست بصیرت بخشی تھی، عقلی و نقلی علوم و فنون کے اہم اوق مسائل اس کو ازبر تھے، اس نے ہندوستان کے علماء سے بحث و مناظرہ کی خواہش کی، چنانچہ اکبرآباد وغیرہ کے علماء بلائے گئے مگر مجلس مناظرہ میں اکبج کے مقابلہ میں وہ ٹھہر نہ سکے، شاہجہاں کو اس کے مقابلہ میں اپنے علماء کی بے ایگی پر بڑا تعجب ہوا، اس نے ارکان دولت سے کہا کہ ہماری قلم رو میں بڑے بڑے علماء و فضلاء موجود ہیں ان میں کسی ایسے عالم کو بلایا جائے جو اکبج سے مناظرہ کر سکے، وزیر سعد اللہ خاں نے جو ملا محمود کے سامنے زانوے تلمذ تہ کر چکا تھا، اور ان کی ذہانت و ذکاوت سے اچھی طرح واقف تھا، ناظم جونپور کے نام شاہی فرمان لکھا کہ علامہ کی خدمت میں خود حاضر ہو کر شاہی فرمان پیش کر کے کسیطرح انکو دارالخلافہ آنے پر راضی کرو، چنانچہ ملا صاحب بوڑھے گھر و فقر کے ساتھ دہلی روانہ ہوئے، جب دہلی کے قریب پہونچے تو وزیر سعد اللہ خاں، آصف خاں اور دوسرے ارکان دولت نے بڑھ کر استقبال کیا، اور کمال تعظیم و توقیر کے ساتھ ان کو شاہی دربار میں پہنچایا، ... شاہجہاں کے حکم سے مجلس مناظرہ منعقد ہوئی جس میں اثبات ہیولیٰ کی بحث چھڑ گئی، اکبج نے اثبات ہیولیٰ پر بلا

بادشاہ خدمت تدریس مدرسہ سلطانی مع جاگیرات سیر حاصل بوے گذارنید مولانا در جونپور رسیدہ مشغولِ تدریس گردید[1]

بادشاہ شاہجہاں نے مدرسہ سلطانی میں تدریس کی خدمت مع اچھی خاصی جاگیر کے ملا صاحب کو پیش کی اور وہ جونپور آکر تدریس و تعلیم میں مشغول ہو گئے،

اگرچہ ملا صاحب مستقل طور سے جونپور میں رہتے تھے، مگر بوقت ضرورت شاہی دربار میں آنا جانا رہتا تھا، خاص خاص مواقع پر ان کی طلبی بھی ہوتی تھی اور شاہجہاں کے ساتھ امرائے دربار بھی ان سے استفادہ کرتے تھے، تذکرہ العلماء..... اور دوسری کتابوں میں ہے،

سلطان نیز اکثر مسائل علمی از وے استفادہ کرد، حسب الحکم سلطان شاہزادہ محمد شجاع نزد علامہ تلمذ نمود........ و امیر الامراء شایستہ خاں کتاب فرائد تمام گذرانید

خود سلطان شاہجہاں بھی ان سے علمی مسائل میں اکثر استفادہ کرتا تھا اور شاہی حکم سے شاہزادہ محمد شجاع نے ملا صاحب کی شاگردی کی اور امیر الامراء شایستہ خاں نے ان سے پوری الفرائد پڑھی،

ایک واقعہ کے سلسلے میں لکھا ہے کہ:-

سعد اللہ خاں وزیر کہ تلمیذ علامہ محمود بود کوائف فہم و فراست علامہ بیاں نمود،[2]

وزیر سعد اللہ خاں ملا محمود کے تلمیذ تھے، اور انھوں نے بادشاہ سے ان کے علمی کمالات بیان کئے،

غرض بادشاہ اور شاہزادہ سے لے کر امراء و اعیان دولت تک نے ملا صاحب سے

---

[1] تذکرۃ العلماء ص ۸۸، [2] تذکرۃ العلماء ص ۱۳۶، ۱۴۷، ۱۴۸،

تیسری منزل پر فوت ہو گیا[۱]

رصدگاہ بنانے کی پیش کش ایک مرتبہ ملا صاحب نے شاہجہاں سے رصدگاہ بنانے کی خواہش ظاہر کی اور اس کے لئے ایک ایسی جگہ تجویز کی جہاں قدیم زمانہ میں کسی بادشاہ نے رصدگاہ بنوائی تھی مگر اس کے لئے کثیر رقم کی ضرورت تھی اس لئے یہ تجویز بروئے کار نہ آسکی، وخیات الاعلام کے حوالہ سے نزہتہ الخواطر نے لکھا ہے کہ ملا صاحب نے ایک رصدگاہ بنانے کا ارادہ کیا اور اکبرآباد جاکر بادشاہ کو آمادہ کرلیا، مگر وزیر نے اس رائے سے اتفاق نہیں کیا، اور بادشاہ سے کہا کہ اس وقت بلخ کی مہم درپیش ہو جس کے لئے بہت زیادہ روپیہ کی ضرورت ہو، الغ بیگ کی رصد کے بعد اس کی ضرورت نہیں ہے[۲] مآثر الکرام میں بھی اختصار کے ساتھ یہی درج ہے[۳] تجلی نور میں ہے کہ زر کثیر کے خرچ کا خیال رصد کی تعمیر میں مانع ہوا[۴] تذکرۃ العلماء میں اس وزیر کا نام سعداللہ خاں ہے اور یہ لکھا ہو کہ وہ ملا صاحب کی حداثت سن اور علمی تبحر سے حسد کرتا تھا، اس لئے اس نے بلخ کی مہم کا بہانہ کرکے بادشاہ کو رصد بنانے سے روک دیا[۵] ملا صاحب سے سعداللہ خاں کا حسد بظاہر سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ اسی کتاب میں تصریح ہے کہ سعداللہ خاں وزیر کہ تلمیذ علامہ محمود بود، کوائف فہم وفراست علامہ بیان نمود (ص ۴۶) ایسا شاگرد اپنے استاد سے کس طرح حسد کرسکتا ہے پھر یہ وہی ملا سعداللہ لاہوری ہو جس نے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی سے علم کی تحصیل وتکمیل کی، اور مدرسۂ وزیر خاں لاہور میں درس دیا، ۱۰۴۹ھ میں جب شاہجہاں لاہور گیا اور اس کے علم وفضل کا شہرہ سنا تو خلعت شاہی سے سرفراز کیا پھر اس کے بعد سعداللہ خاں کا لقب دیکر وزارت کا منصب عطا کیا اور ۱۰۵۶ھ

۱؎ تذکرۃ العلماء ص ۴۵، ۴۶، ۲؎ نزہتہ الخواطر ج ۵ ص ۳۹۸، ۳؎ مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۰۲، ۴؎ تجلی نور ج ۲ ص ۵
۵؎ " " " ۴۸،

باری سے وہ تمام دلائل پیش کئے جو اسے یاد تھے، ملا صاحب نے اس کی ہر دلیل کا ایسا کافی وشافی جواب دیا کہ تمام حاضرین ان کی تعریف وتحسین کرنے لگے، آخر میں ایلچی نے ملا صاحب سے کہا کہ اچھا اگر آپکے پاس اثبات ہیولی کی کوئی دلیل ہو تو بیان کیجئے، ملا صاحب نے اثبات ہیولی پر اپنا ایک رسالہ الدوحة المیادة فی حدیقة الصورة والمادة پیش کیا اس کے علاوہ اثبات ہیولی پر چند خاص دلائل بیان کئے، ان کو سن کر ایلچی نے بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کر ملا صاحب کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور اپنی کمر کا خنجر انکی کمر میں باندھ دیا، اور ان الفاظ میں ملا صاحب کے علم وفضل کا بھری مجلس میں اعتراف کیا،

جوانے بایں فہم وفراست از دلایت ایران تا ہندوستان کمتر یافتہ،	اس فہم وفراست کے جوان عالم ایران سے لیکر ہندوستان تک بہت کم نظر آئے ہیں،

شاہجہاں نے ملا صاحب کی کامیابی پر زر وجواہر سے بھرے ہوئے طبق ان کی خدمت میں پیش کئے، کچھ دنوں کے بعد جب ایلچی ایران واپس جانے لگا تو اس نے درخواست کی کہ ملا صاحب کی تصانیف بھی شاہی تحائف میں شامل کیجائیں اور شاہ ایران کی خدمت میں یہ قیمتی تحفہ بھی بھیجا جائے،

ملا صاحب خود بھی بڑے غیور وحساس تھے اور علماء وفضلاء کی غیرت وحمیت سے واقف تھے، انھوں نے شاہجہاں سے کہا کہ یہ عالم حد درجہ غیور ہے اور معقولات میں کسی کو اپنا ہمسر نہیں سمجھتا، اس مناظرہ میں خفت وشکست سے غالباً زندہ نہ رہ سکے گا، ملا صاحب کا یہ اندازہ صحیح نکلا، اور ایلچی دارالخلافہ اکبرآباد سے ایران جاتے ہوئے

سلسلوں میں احسان و تصوف، سلوک و معرفت اور زہد و تقویٰ موروثی ملے،
مگر ملا صاحب کو ان کے ظاہری علوم نے سجادہ و خانقاہ سے ہٹا کر مدرسہ و دربار میں
پہونچا دیا تھا، مگر جب ایک صاحب دل کی نگاہ کیمیا اثر نے کام کیا تو تمام باطنی
کیفیات ظہور میں آگئیں، اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ شاہجہاں لاہور گیا، جلو میں
ملا محمود اور ملا عبد الحکیم سیالکوٹی متوفی ۱۰۶۷ھ بھی تھے تینوں میاں میر لاہوری کی
خدمت میں حاضر ہوئے، مگر اقلیم فقر و استغناء کے شہنشاہ نے ان کیطرف کوئی توجہ نہیں
کی اقلیم دنیا کے شہنشاہ کو اس سے بہت رنج ہوا، اور اقلیم علم کے دونوں شہنشاہوں
نے عالمانہ شان میں میاں میر سے کہا، "توجہ بہ علماء نہ کردن چہ معنی دارد"؟ میر صاحب نے
اسکا کوئی جواب نہیں دیا اور اندر سے اپنا کمبل لاکر بچھایا اس پر خود مودب ہوکر بیٹھے
اور ان دونوں فاضلوں کو بیٹھا کر فرمایا، "میں جاہل ہوں، ماشاء اللہ آپ حضرات
عالم ہیں، اس شعر کا مطلب مجھے سمجھا دیجئے،

مبادا دل آں فرومایہ شاد   کہ از بہر دنیا دہد دیں بباد

یہ شعر سنتے ہی ملا عبد الحکیم پر گریہ کی کیفیت طاری ہوگئی اور ملا محمود اتنے متاثر
ہوئے کہ اسی وقت درباری زندگی ترک کرکے جونپور آگئے، اور باقی زندگی تدریس
و تصنیف میں بسر کی لیکن ان کے ساتھ شاہی نوازش بدستور جاری رہی[1]،

احسان و تصوف جن دنوں ملا صاحب درباری علائق سے قطع تعلق کرکے سکون
و اطمینان سے جونپور میں علمی زندگی گذار رہے تھے اور حضرت میاں میر کی تنبیہ
نے ان میں یکسوئی پیدا کردی تھی، بادشاہ کے حکم سے ملا صاحب کو شاہزادہ محمد شجاع

---

[1] تجلی نور ج ۲ ص ۵۰، ۵۱،

میں اپنا سفیر بنا کر بلخ بھیجا، ایسے عالم و فاضل اور امیر و وزیر کا حسد کرنا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے،

حوض میں کتنا پانی ہے؟ ملا صاحب حکمت و فلسفہ کے جملہ اقسام میں مہارت تامہ رکھتے تھے، جن میں ریاضی، حساب، اور ہندسہ بھی شامل ہے، ایک مرتبہ دہلی میں شمسی حوض سے گذر ہوا تو اس پر ایک نظر ڈالکر ساتھیوں کو بتایا کہ اس حوض میں اتنی مقدار میں پانی ہے، یہ سن کر لوگوں کو تعجب ہوا، اور دل میں سوچا کہ اس کی آزمائش کرنی چاہئے، تھوڑے دنوں کے بعد حوض کا کچھ پانی نکال دیا اور کسی بہانے سے ملا صاحب کو وہاں لیجا کر دریافت کیا کہ آج اس میں کتنا پانی ہے؟ ملا صاحب نے حوض پر نظر ڈالی اور فرمایا کہ اتنی مقدار میں اس کا پانی نکال دیا گیا ہے جس سے حاضرین کو سخت تعجب ہوا[1]

ملا صاحب کی فنی مہارت کا یہ بہت معمولی مظاہرہ تھا ورنہ ریاضی اور ہندسہ جاننے والے کے لئے یہ معمولی بات ہے، راقم کے ماموں مولانا محمد یحییٰ رسول پوری متوفی اور حضر ۱۳۸۰ھ فلکیات اور ریاضیات کے اچھے عالم تھے، وہ ریاضی کے رو سے درختوں اور مکانوں کی بلندی اور کنویں وغیرہ کی گہرائی بتایا کرتے تھے اور بادل کی چمک گرج ہو تو بتادیتے تھے کہ بادل کتنی اوپر ہے، حوض یا تالاب وغیرہ کے حدود و اربعہ اور قطر وغیرہ کی پیمائش کرکے اس کے پانی کی مقدار بتائی جاسکتی ہے،

ملا صاحب کی حضرت میاں میر لاہوری کی خدمت میں حاضری اگرچہ ملا صاحب کے فضل و کمال میں حکمت و فلسفہ اور ادب و عربیت کا رنگ نمایاں تھا، مگر وہ خاندانی دولت روحانیت و مشیخت میں بھی حصہ وافر رکھتے تھے، مادری اور پدری دونوں

---

[1] تجلی نور ج ۲ ص ۵۰،

بارض بنگاله فبایعه، واخذ عنه الطریقة سنة اثنتین وخمسین والف، وانی رأیت رسالة له فی الاذکار التی اخذها عن الشیخ المذکور،

(نزہۃ الخواطر جلد ۵ ص ۳۹۸)

فیروز پوری سے ملے، وہاں ان سے بیعت کرکے ۱۰۵۲ھ میں طریقت حاصل کی، اور میں نے (مصنف وفیات الاعلام) ملا صاحب کا ایک رسالہ دیکھا ہے جس میں وہ اذکار و اوراد درج ہیں جو انھوں نے شیخ نعمت اللہ سے حاصل کئے تھے،

شیخ خوب اللہ محمد یحیٰی الہ آبادی نے یہ رسالہ وفیات الاعلام میں نقل کردیا ہے، شیخ نعمت اللہ فیروز پوری ملا محمد افضل کے تلامذہ میں سلسلۂ قادریہ کے مشائخ میں سے تھے شاہزادہ محمد شجاع جس زمانہ میں اپنے والد کی طرف سے بنگال کا حاکم تھا شیخ نعمت اللہ سے بیعت ہوا، اس کے بعد ان کو عوام و خواص میں بڑا قبول ہوا، وہ نارنول میں پیدا ہوئے طلب علم میں مختلف شہروں کا چکر لگایا، فراغت کے بعد متاہل ہوکر فیروز پور میں مستقل سکونت اختیار کرلی، سیف خاں کی طرف سے فیروز پور میں ان کو جاگیر عطا ہوئی، وہ قادریہ و چشتیہ و نقشبندیہ سلسلوں کے جامع تھے، انھوں نے جہانگیری عہد میں ۱۰۳۰ھ میں تفسیر جہانگیری اور ترجمۂ قرآن لکھا، ۱۰۷۲ھ میں فوت ہوئے[۱]، ملا صاحب کی زندگی میں روحانی و احسانی انقلاب ان کی وفات سے دس سال پہلے رونما ہوا، اس کے بعد ان کی حکمت و دانش نے فراستِ مومن کا رنگ اختیار کرلیا، اور تدریس و تصنیف کے ساتھ اوراد و وظائف کا سلسلہ آخری عمر تک جاری رہا، اب ان کی نظر میں اپنے علم و فن کی متاع ہیچ معلوم ہونے لگی اور وہ اپنے تلامذہ میں "عالم باعمل اور مرد زاہد" پر اطمینان و مسرت

---

[۱] نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۴۲۳، ۴۲۴،

کی تعلیم کے لئے بنگال جانا پڑا، مگر یہ اللہ کی شان ہے کہ اس بار بھی دنیا کی راہ سے ملا صاحب کو زہد و تقویٰ کی دولت ملی اور وفات سے دس سال پہلے ۱۰۵۲ھ میں سرزمین بنگال میں شیخ نعمت اللہ بن عطاء اللہ فیروز پوری متوفی ۱۰۶۲ھ سے سلوک و طریقت کی تعلیم و تربیت حاصل کی، اس کے بعد ملا صاحب اپنے دونوں خانوادوں کے اصلی رنگ میں نمایاں ہوگئے اور تدریس و تصنیف کے ساتھ ذکر و شغل اور اوراد و وظائف اور عبادت و ریاضت میں بھی مشغول رہنے لگے، مآثر الکرام میں صرف شاہزادہ شجاع کی شاگردی کا ذکر اس طرح ہے،

شاہ شجاع بن صاحب قران شاہجہاں نزد علامہ تلمذ کرد، [1]	شاہ شجاع بن شاہجہاں نے علامہ محمود کی شاگردی کی،

تذکرۃ العلماء میں بھی اتنا ہی ہے،

حسب الحکم سلطان شاہجہاں محمد شجاع نزد علامہ تلمذ نمود، [2]	سلطان شاہجہاں کے حکم سے محمد شجاع نے علامہ سے تلمذ کیا،

مگر نزہۃ الخواطر میں وفیات الاعلام کے حوالہ سے محمد شجاع کے تلمذ کے ساتھ ملا صاحب کی بیعت و ارادت کی تفصیل بھی درج ہے،

ثم استقدمہ شجاع بن شاہجہاں الی بنگالہ فسافر الیہ، وقرأ علیہ الشجاع کتبا فی العلوم الحکمیۃ، وادرک محمود نعمۃ اللہ بن عطاء اللہ الفیروزپوری	شاہزادہ شجاع بن شاہجہاں نے ملا محمود کو بنگال بلایا، وہ وہاں گئے، اور شجاع نے ان سے حکمت و فلسفہ کی کتابیں پڑھیں، بنگال میں ملا صاحب نے شیخ نعمت اللہ بن شیخ عطاء اللہ

---

[1] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۰۳، [2] تذکرۃ العلماء ص ۴۷،

اس درمیان میں شاہزادہ محمد شجاع کی تعلیم کے لئے بنگال کا سفر کیا، اور شاہجہاں کے ساتھ سفر لاہور میں جس منزل کی طرف رہنمائی کی گئی تھی، سفر بنگال میں اس منزل پر پہنچ گئے، اس کے بعد ملا صاحب جونپور سے نہیں نکلے، غالباً ملا محمد صادق نے شمس بازغہ میں حدوث دہری کی بحث دیکھی ہوگی جس میں ملا صاحب نے اپنے پیش رو فلاسفہ سے اختلاف کیا ہے اگر بیعت و ارادت کے بعد عقل کی پرخار وادی سے نکل کر قلب کے مصفیٰ میدان میں آگئے تھے،

بحث کلامی ملا صاحب کے تقریباً سب ہی سوانح نگار اس پر متفق ہیں کہ زندگی بھر ان کی زبان سے کوئی ایسی بات نہیں نکلی جس سے بعد میں رجوع کرنا پڑا ہو، ہر بات [illegible] تحقیق کی روشنی میں آپ قول کر منہ سے نکالتے تھے، اس سلسلہ میں ان کا اصول تھا کہ اگر کوئی آدمی کسی قسم کا علمی سوال کرتا اور اس وقت طبیعت حاضر ہوتی تو جواب دیتے تھے ورنہ صاف کہدیتے تھے کہ اس وقت دماغ جواب کے لئے تیار نہیں ہے اس معاملہ میں علمیت و قابلیت کی شان رکھتے تھے[1]

(باقی)

---

[1] سبحۃ المرجان ص ۵۳، مآثر الکرام ج ۲ ص ۲۰۲، تذکرۃ العلماء ص ۵۴، نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۳۹۸

کا اظہار کرنے لگے، چنانچہ ملا صاحب کے شاگرد رشید ملا محمد صادق بن ملا شمس نور جونپوری متوفی ۱۱۶۴ھ نے جو بہت عابد وزاہد اور بڑے پایہ کے بزرگ تھے ایک مرتبہ اپنے یہاں استاد کی موجودگی میں خود نماز کی امامت کی، حالانکہ عام طور سے وہ امامت نہیں کرتے تھے، اور اس کی توجیہ میں کہا

در کلام حکما رشبہہ ایمان می دارم بہر	میرے نزدیک فلاسفہ وحکماء کے کلام
این نماز خود را ضائع نہ نمودم	میں ایمان مشتبہ ہے اس لئے میں نے اپنی نماز ضائع نہیں کی،

ملا صاحب اپنے عزیز شاگرد کی یہ بات سن کر بے انتہا خوش ہوئے اور فرمایا،

الحمد للہ از شاگرداں خودیک عالم باعمل ومرد زاہد یافتم [۱]	اللہ کا شکر ہے کہ میں نے اپنے شاگردوں میں ایک عالم باعمل اور عابد وزاہد پایا،

ملا صاحب کے مرشد شیخ نعمت اللہ فیروزپوری نے ان کو جواذکار و اوراد تلقین کئے تھے ان کو انھوں نے ایک رسالہ کی شکل میں جمع کرایا ہے جو وفیات الاعلام میں ہے، ویسے ملا صاحب کی علمی زندگی میں روحانی انقلاب اسی وقت سے شروع ہوگیا تھا جب حضرت میاں میر نے ایک شعر کے ذریعہ ان کی عنان عقل کو میدان قلب کی طرف موڑا تھا، اس واقعہ کے بعد سے ان کا رنگ ہی کچھ اور ہو گیا تھا، تجلی نور میں ہے،

وملا محمود کہ نہاں از خویش ربود کہ ہیچ	یہ شعر سن کر ملا محمود اپنے سے بے خبر ہوگئے
سکالش ترک چاکری نمودہ در جونپور آمد	کہ اسی وقت سے نوکری چھوڑ کر جونپور
وتا ذیست بدرس مشغول ماند [۲]	آئے اور آخر تک درس و تدریس میں مشغول رہا

---

[۱] تجلی نور ج ۲ ص ۱۰۸، [۲] ایضاً ص ۱۰۵

خود اندلسی موشحات سے ایسے عام اور بنیادی اصول مستنبط کیے جن کی پابندی ہر اس شخص کے لئے ضروری ہے جو اس میدان میں قدم رکھنا چاہتا ہے، اس کے بعد اس موضوع پر اس نے اپنی مشہور کتاب "دار الطراز فی عمل الموشحات" تالیف کی جس کے مقدمہ میں موشح کے نظم کرنے کا طریقہ اور اس کے اصول وغیرہ بیان کیے ہیں، اور اس کی مثال کے لئے موشحات نقل کیے، اس کے بعد ابن خلدون (م: ۱۴۰۶ء) نے اپنے مقدمہ میں موشح پر ایک فصل لکھی[1]، پھر ابشیہی (م: ۱۴۴۶ء) نے بھی اپنی کتاب "المستطرف" میں ایک علیحدہ فصل اس کے لئے وقف کی[2]، اسطرح یہ سلسلہ چل پڑا۔

لیکن متقدمین کی تشریحات کچھ مبہم اور گنجلک ہیں، اسماء و مصطلحات بھی مختلف مصنفین کے یہاں مختلف ملتے ہیں، متاخرین کی کتابوں میں رفتہ رفتہ یکسانیت اور وضاحت آتی گئی ہے، اس سلسلے میں راقم الحروف کے نزدیک ڈاکٹر مصطفیٰ عوض الکریم کا بیان زیادہ معقول اور واضح ہے[3]، اس مضمون میں اسی کا تتبع کیا گیا ہے۔

توشیح کی ہیئت کو سمجھنے کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ایک موشحہ پورا نقل کر دیا جائے پھر اس کے مختلف اجزاء کی تشریح کی جائے، ذیل میں ابن زہر کا ایک مختصر اور سادہ موشحہ درج کیا جاتا ہے جس کے اجزاء میں کچھ زیادہ پیچیدگی اور تنوع نہیں ہے[4]

---

[1] مقدمہ کی آخری فصل، ص: ۵۸۷، ۱۹۰۷ء

[2] المستطرف، مصر ۱۳۹۲ھ، ج: ۲، ص: ۲۵۸ وما بعد [3] فن التوشیح، ص: ۱۹ وما بعد

[4] صلاح الدین الصفدی: الوافی بالوفیات، دمشق ۱۹۵۳ء، ج: ۴، ص: ۴۱، ۴۲،

فن توشیح

از جناب ڈاکٹر غلام مصطفےٰ صاحب ریڈر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۲)

اجزائے ترکیبی اس میں شک نہیں کہ موشح کا غنا و موسیقی سے بہت گہرا تعلق ہے، لیکن لحن و موسیقیت کا ادراک ہر شخص نہیں کر سکتا، موشح کی جو خوبی عام طور پر جاذب توجہ ہے وہ اس کی ترکیب اور ہیئت سے متعلق ہے جیسا کہ اس سے قبل ذکر کیا جا چکا ہے، ابتدا میں مورخین نے موشحات کی تدوین کی طرف توجہ نہیں کی، بعد کے کچھ تذکرہ نویسوں نے توجہ کی بھی تو صرف اس قدر کہ موشح نگار کا تذکرہ کر کے اس کے چند موشحات نقل کر دیے جہاں تک موشح کی تعریف، اس کی ہیئت ترکیبی کی تشریح اور اس کے مختلف اجزاء کے لئے وضع اصطلاحات وغیرہ کا تعلق ہے اس کی طرف اب تک کی تحقیقات کے مطابق سب سے پہلے ابن سناء الملک مصری (م: ۱۲۱۱ء) نے قدم اٹھایا[1] وہ خود کہتا ہے کہ عنفوان شباب ہی سے اس کو موشح سے بڑی دلچسپی تھی، چنانچہ اس نے بہت سے موشحات حفظ کر ڈالے اور عرصہ تک وہ اس فن کے نکات پر غور کرتا رہا، پھر جب اس نے دیکھا کہ کسی نے ایسی کوئی کتاب نہیں لکھی جس میں اس کے نظم کرنے کا طریقہ بیان کیا گیا ہو تو اس نے

---

[1] البستانی: دائرۃ المعارف، بیروت، ۱۹۶۰ء، ج: ۳، ص ۲۰۳، ۲۰۴،

پستشیر لہٰذا { سمط . شبّت فیه نیران

قفل . فمن ابصر الجمرا ۔ فی الجّ یعوم

(غصن) (غصن)

بیت ۵ { ... { سمط : إذا لامنی فیہ

سمط : من رأی تحنقہ

سمط : شدوت أغنیہ

خارجہ . لعلّ لہ عذرا ۔ وأنت تلوم

(غصن) (غصن)

مطلع ایک آفتاب ایک بدر کا مصاحب ہے، شراب اور ندیم۔

بیت ۱ شراب کے پیالوں کا دور چلا، جو عنبری خوشبو سے معطر ہے، باغ پُر رونق ہے، خرام نسیم نے نہر کو زرہ پہنا دی ہے۔

بیت ۲ شرق وغرب ہاتھ افق پر بجلی کی تلوار کھینچ لی ہے، اور گریہ ابر نے پھولوں کو ہنسا دیا ہے،

بیت ۳ سنو! میرا ایک دوست ہے جو مجھ پر حاکم اور غالب ہے، سنو! اگر وہ آنسو نہ ہوتے جو راز کو ظاہر کر دیتے ہیں تو میں ضرور راز کو چھپانے والا ہوتا۔

بیت ۴ میرے لئے کتمان راز کیسے ممکن ہے۔ جبکہ میرے آنسو سیلاب کی طرح جاری ہیں جس میں آگ بھڑک رہی ہے، پس کس نے ایسی چنگاری دیکھی ہے جو گرداب میں تیر رہی ہو۔

بیت ۵ جب اس بارے میں مجھے اس شخص نے ملامت کی جس نے ناکردہ گناہ کا

مطلع — شمس قارنت بدرا — راح ونديم

(غصن) (غصن)

بیت ۱ —
دور:
سمط : أدر أكؤس الخمر
سمط : عنبرية النشر
سمط : إنّ الروض ذو بشر
قفل : وقد درّع النهرا — هبوب النسيم
(غصن) (غصن)

بیت ۲ —
دور:
سمط : وسلّت على الأفق
سمط : يد الغرب والشرق
سمط : سيوفا من البرق
قفل : وقد أضحك الزهرا — بكاء الغيوم
(غصن) (غصن)

بیت ۳ —
دور:
سمط : ألا إنّ لي مولى
سمط : تحكم واستولى
سمط : أما إنّه لولا
قفل : دمع يفضح السرا — لكنت كتوم
(غصن) (غصن)

بیت ۴ —
سمط : أنّى لي كتمان
سمط : ودمعي طوفان

ایک قفل ہی ہوتا ہے،

خرجہ| موشح کا آخری قفل خرجہ کہلاتا ہے، اسی لئے ہیئت میں یہ پوری طرح مطلع اور اقفال ہی کے مشابہ ہوتا ہے، لیکن موشح کے اندر سب سے زیادہ اہمیت خرجہ ہی کی ہوتی ہے، ابن سناء الملک نے اس کی تعریف اس طرح کی ہے کہ موشح میں خرجہ ایسا ہی ہے جیسے کھانے میں مسالہ، نمک شکر امتک اور عنبر[1]۔ ابن بسام کے نزدیک خرجہ کو موشح کے اندر مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے[2]۔ موشح درحقیقت اپنے خرجہ یعنی خرجہ سے شروع ہوتا ہے، وشاح سب سے پہلے خرجہ ہی تلاش کرتا ہے پھر اسی کو مرکز بناکر موشح تیار کرتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس طرح اردو رباعی میں عام طور پر سب سے پہلے چوتھا مصرعہ شاعر کے ذہن میں آتا ہے، پھر اسی کی مناسبت سے وہ اس سے پہلے تین مصرعے اور لگاکر ایک رباعی تیار کر لیتا ہے، اسی طرح موشح نگار سب سے پہلے خرجہ کا انتخاب کرتا ہے، پھر اسی پر ادوار و اقفال کی تضمین کرکے موشح کی تکمیل کرتا ہے، چنانچہ ایسے موشحات بھی ملتے ہیں جن میں کسی مشہور شاعر کے کسی شعر کو خرجہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وشاح نے پہلے اس شعر کو منتخب کیا، اس کے بعد اسی پر ادوار و اقفال کی تضمین کرکے موشح مرتب کیا، اسی لئے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ اندلسی موشحات درحقیقت چھوٹے چھوٹے مشہور عوامی گیت تھے جن کو لے کر موشح نگاروں نے اپنے موشحات تیار کئے ہیں۔

خرجہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عوامی زبان کا استعمال صرف جائز

[1] فن التوشیح، ص: ۱۲۲، [2] الذخیرہ، قسم اول، ج: ۲، ص: ۱

الزام لگایا، تو میں نے اسے گا کر یہ سنایا "ہو سکتا ہے کہ اس کے لئے کوئی عذر ہو اور تو اسے ملامت کر رہا ہے"۔

اس موشحہ پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ یہ ایک مطلع اور پانچ ابیات پر مشتمل ہے، بیت کو اردو زبان میں بند کہہ سکتے ہیں، ہر بیت کے دو حصے ہیں، پہلا حصہ دور اور دوسرا قفل ہے، پھر ہر دور تین اجزاء سے مرکب ہے اور اس کے ہر جز کو سمط یعنی لڑی کہتے ہیں، اسی طرح ہر قفل میں دو جز ہیں اور اس کے ہر جز کو غصن یعنی شاخ کہا جاتا ہے اور آخری قفل کو خرجہ کہتے ہیں جس طرح پہلا قفل مطلع کہلاتا ہے۔

عام طور پر ہر موشحہ کی یہی ہیئت ہوتی ہے اور اس کے اجزا کو اسی طرح تقسیم کیا جا سکتا ہے، البتہ اجزا کی تعداد و ترکیب اور قوافی کی ترتیب مختلف ہو سکتی ہے جس کی وجہ سے موشح کی بہت سی صورتیں بن جاتی ہیں۔

مطلع۔ موشح کے مطلع کو مذہب بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن ہر موشح میں مطلع کا ہونا ضروری نہیں اگر مطلع ہوگا تو اسے موشح تام کہا جائے گا اور اگر مطلع نہ ہو بلکہ موشح کی ابتدا دور سے ہو رہی ہو تو اسے موشح اقرع کہیں گے، اس سے معلوم ہوا کہ مطلع موشح کا لازمی جز نہیں ہے جبکہ دور، قفل اور خرجہ اس کے لازمی عناصر ہیں۔

قفل۔ ہر بیت قفل پر ختم ہوتی ہے اور ابیات کی کوئی تعداد معین نہیں ہے، اکثر اندلسی موشحات میں پانچ ابیات پائے جاتے ہیں اور بعض میں ابیات کی تعداد دس اور گیارہ تک بھی ملتی ہے بہر حال اس کی کوئی حد نہیں ہے۔ لیکن جتنے ابیات ہونگے اتنے ہی اقفال بھی ہوں گے اور مطلع میں جتنے اجزا و قوافی ہوں گے وہی سب اسی ترتیب کے ساتھ اقفال میں بھی آئیں گے، کیونکہ مطلع خود بھی ہیئت کے لحاظ سے

رکھ کر حساب لگایا جائے تو اس کی صورتیں بکثرت نکلتی ہیں، امثال کے طور پر چند صورتیں درج کی جا رہی ہیں:۔

(۱) لسان الدین بن الخطیب کا ایک موشحہ جس میں دو غصن ہیں اور دونوں ہم وزن اور ہم قافیہ ہیں:۔[1]

مطلع ؎ رب لیل ظفرت بالبدر ۔ ونجوم السماء لم تدر

قفل ہذا لیت نهر النهار لم یجر ۔ حکم الله لی علی الفجر

(میں اکثر راتوں میں ماہ کامل تک پہنچ گیا اور آسمان کے تاروں کو اس کی خبر تک نہ ہوئی۔ کاش دن کی نہر نہ بہتی اور فجر کے خلاف اللہ میرے حق میں فیصلہ فرما دیتا۔)

(۲) ابن زہر کا دو غصنی موشحہ جس میں دونوں غصن ہم وزن لیکن مختلف القافیہ ہیں:۔[2]

مطلع ؎ سلّم الامر للقضا ۔ فهو للنفس انفع

قفل ؎ كلّ ما فات وانقضیٰ ۔ لیس بالحزن یرجع

(معاملہ قضائے الٰہی کے سپرد کر دے کیونکہ نفس کے لئے یہی زیادہ مفید ہے، جو چیز بھی فوت ہو گئی اور گذر چکی وہ حزن و ملال سے واپس نہیں آسکتی۔)

(۳) ابن سہل کا سہ غصنی موشحہ جس میں درمیانی غصن چھوٹا ہے لیکن تمام اغصان متحد القافیہ ہیں:۔[3]

---

[1] نفح الطیب، ج:۹، ص:۲۷۵، [2] ایضاً، ج:۳، ص: ۱۹

[3] ابن تغری بردی: المنهل الصافی، قاہرہ، ۱۹۵۶ء، ج:۱، ص: ۵۵،

ہی نہیں بلکہ مستحسن ہے، عام طور پر خرجہ غیر معرب عجمی یا عوامی ہوتا ہے، ابن سنا الملک کے نزدیک خرجہ کے لئے غیر معرب ہونا ضروری ہے، البتہ اگر موشحہ مدحیہ ہو اور اس میں ممدوح کا نام بھی آرہا ہو تو خرجہ معرب ہو سکتا ہے۔

خرجہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس سے عام طور پر مقولہ کی حیثیت سے لایا جاتا ہے، موشح نگار خود اپنی زبان سے اسے کہتا ہے یا کسی لڑکے، عورت، میخوار، رقاصہ، جانور یا پرندہ وغیرہ کی زبان سے کہلواتا ہے۔ اسی لئے خرجہ سے پہلے اکثر اس قسم کے الفاظ ہوتے ہیں جیسے قلت (میں نے کہا)، قال (اس نے کہا) تغنی (وہ گاتا ہے) اور أنشد (میں گاتا ہوں) وغیرہ۔ اس سے سامعین کو معلوم ہو جاتا تھا کہ موشحہ اب ختم ہونے جا رہا ہے لہذا وہ پوری طرح متوجہ ہو جاتے تھے۔ یوں بھی سامعین شروع ہی سے بڑے شوق سے خرجہ کے انتظار میں رہتے تھے۔

غصن مطلع، قفل اور خرجہ تینوں اجزاء قوافی اور ان کی تعداد و ترتیب کے لحاظ سے یکساں ہوتے ہیں۔ ان ہی کے اجزا کو اغصان کہا جاتا ہے۔ ان کی کوئی تعداد مقرر نہیں ہے، کم سے کم دو غصن ضروری ہیں۔ اکثر موشحات میں چار اغصان پائے جاتے ہیں اور بعض میں دس اور گیارہ تک ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ تمام اغصان باہم مساوی اور غیر مساوی دونوں قسم کے ہو سکتے ہیں۔ پھر ان کی ترتیب میں بھی بڑی وسعت ہے۔ چھوٹا غصن کبھی شروع میں، کبھی درمیان میں اور کبھی آخر میں ہوتا ہے۔ اسی طرح قوافی کی ترتیب میں بھی وشاح کو پورا اختیار ہوتا ہے جس طرح چاہے انکو مرتب کر لے۔ خواہ تمام غصان کو قافیہ میں متحد رکھے یا مختلف، پس اغصان کی تعداد مساوی و غیر مساوی اغصان کی ترتیب اور قوافی کے اتحاد و اختلاف کو سامنے

(روشن ستارہ کی چمک لبریز پیالوں کو اسی طرح ہم نشینوں تک پہنچا دیتی ہے۔
ایک ہرن نے لوگوں کے گھروں کے درمیان چھپنے والی نظر سے بڑے بڑے شیروں کا شکار کر لیا۔)

(۶) ابن سناء الملک کا ایک موشحہ جو چھ اغصان پر مشتمل ہے، پہلے دونوں غصن ایک قافیہ میں، پھر تیسرے اور چھٹے دوسرے قافیہ میں اور چوتھے اور پانچویں غصن تیسرے قافیہ میں ہیں[۱]

مطلع = لی قاتل فاتک ۔ بحسنہ ھاتک ۔ سنرا لحلی ۔

فکیف بالھائم ۔ باللہ یا لائم لا تعذل

فقل نہرا و انما ذلک ۔ بیاترباتک ۔ للأجل ۔

من ناظر عارم ۔ یسل کالصارم ۔ من کحل

(میرا قاتل ایک دلیر فتنہ خو ہے جو اپنے حسن و جمال سے فارغ البال شخص کی بھی پردہ دری کرنے والا ہے، تو پھر عاشق سرگشتہ کا کیا حال ہوگا، خدا کے واسطے اے ملامت گر تو اسے ملامت نہ کر۔ اور یہ (میرا قاتل) ایک شوخ نگاہ کی تلوار سے ہوا جو موت کی قاطع ہے اور سرمگیں آنکھوں سے شمشیر براں کی طرح کھینچی جاتی ہے۔)

(۷) ابوبکر الابیض کا موشحہ جو آٹھ اغصان سے مرکب ہے، پہلے تینوں غصن کا ایک قافیہ ہے، پھر چوتھے اور آٹھویں غصن دوسرے قافیہ میں اور باقی تین تیسرے قافیہ میں ہیں[۲]

---

[۱] فن التوشیح، ص: ۲۲۔

[۲] ایضاً، ص: ۱۳۲، ۱۳۳۔

مطلع ۔ باکر إلى اللذة والاصطباح ۔ بشرب راح ۔ فما على أهل الهوى من جناح

قفل نمبر ا ورد ونسرين ونعم الاقاح ۔ کالمسك فاح ۔ والطير تشدو باختلاف النواح

(علی الصباح مے نوشی اور لطف اندوزی کی طرف سبقت کر کیونکہ اہل محبت پر کوئی گناہ نہیں ہے، گلاب، نسرین اور اقحوان (گل بابونہ) کے پھولوں کی خوشبو مشک کی طرح اڑ رہی ہے اور پرندے مختلف آوازوں میں گا رہے ہیں۔)

(۴) عبادۃ بن ماء السماء کا موشحہ جو چار ہم قافیہ اغصان سے مرکب ہے مگر پہلے اور تیسرے غصن چھوٹے ہیں:[ل]

مطلع ۔ من ولی ۔ فی أمة أمرا ولم يعدل ۔ يعزل ۔ إلا لحاظ الرشأ الأكحل

قفل نمبر ا جل ۔ فلبی بنت الباس والسلسل ۔ ينجلی ۔ ما بفؤادی من جوی مشتعل

(جو کسی قوم کے امر کا والی ہوتا ہے اور عدل نہیں کرتا تو اسے معزول کر دیا جاتا ہے مگر سرمگیں آنکھوں والے ہرن کی نگاہیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔

میرے دل کو اس لطیف و خنک شراب سے بہلا دے جو بھڑکتی ہوئی سوزش دل میں ہے وہ دور ہو جائے گی۔)

(۵) ابن اللبانہ کا چار غصن والا موشحہ جس میں پہلے دونوں غصن ایک قافیہ میں اور آخری دونوں غصن دوسرے قافیہ میں ہیں:[ت]

مطلع ۔ کذ ایقاد ۔ سنا الکوکب الوقاد ۔ إلى الجلاس مشعشعة الأكواس

قفل نمبر غزال صاد ضراغمة الآساد ۔ بلحظ جاس ۔ خلال دیار الناس

[ل] فوات الوفيات، ج: ۱، ص: ۴۲۶، [ت] فن التوشیح، ص: ۱۲۹،

کے فقروں میں قوافی کی جو ترتیب ہوگی وہی تمام ادوار کے سارے سموط میں لازمی ہوگی،
اس طرح ان تمام باتوں کی بنیاد پر اگر دور کی تقسیم کی جائے تو بہت کثیر تعداد میں اس
کی صورتیں نکلتی ہیں، چند صورتیں مثال کے طور پر پیش کی جارہی ہیں:-

(۱) ابن زہر کے موشحہ کا ایک دور جو تین مفرد سمطوں پر مشتمل ہے[۱]:-

من لی به بدر انجلی فی الظلام

علقت من وجناته بدر التمام

وعلقت من أعطافه لدن القوام

(کون میری مدد کریگا اس بدر کے بارے میں جو تاریکی میں جلوہ افروز ہو
میں اس کے رخساروں کے ماہ کامل کا دلدادہ اور اس کے نرم و نازک
پہلوؤں کی لچک پر فریفتہ ہوں۔)

(۲) ابن اللبانہ کے موشحہ کا ایک دور جس میں چار سمط ہیں اور ہر سمط دو مساوی
فقروں سے مرکب ہے[۲]:-

كواعب أتراب ۔ تشابهت قدا

عضضن على العناب ۔ بالبرد الاندى

اوصت بى الاوصاب ۔ واغرت الوجدا

واكثر الاحباب ۔ اعدى من الاعدا

(چند نوجوان ہمسن لڑکیاں ہیں جو قد و قامت میں باہم متشابہ ہیں، وہ
تر و تازہ اولے جیسے دانتوں سے عناب جیسے لبوں کو کاٹتی ہیں انھوں نے

---

[۱] المغرب، ج ۱، ص: ۲۶۹، [۲] فوت الوفیات، ج: ۲، ص: ۵۱۵،

قفل ۱ ۔ اُوفی الاصیل ۔ اضحی یقول ۔ ما للشمول ۔ لطمت خدّی
او للشمال ۔ ھبت فمال ۔ غصن اعتدال ۔ ضمّہ بردی

قفل ۲ ۔ برد غلیل ۔ صب علیل ۔ لا یستحیل ۔ فیہ عن عھدی
ولا یزال ۔ فی کل حال ۔ یرجو الوصال ۔ وھو فی الصدّ

(یا جب شام کو مخمور ہو کر وہ لچکتے ہوئے چلتا ہے تو کہتا ہے کہ شراب کو کیا ہو گیا ہے کہ اس نے میرے رخسارہ کو سرخ کر دیا ہے، یا باد شمال کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ چلتی ہے تو وہ معتدل شاخ لچک جاتی ہے جس کو میری چادر لپیٹے ہوئے ہو۔ اس عاشق بیمار کی پیاس کو بجھا دے جو کبھی عہد سے پلٹ نہیں سکتا اور ہر حال میں وصل کی امید رکھتا ہے حالانکہ وہ ہجر زدہ ہے۔)

دور و سمط ہر قفل سے پہلے ایک دور ہوتا ہے جس میں چند اجزا ہوتے ہیں ان کو سموط (جمع سمط = لڑی) کہا جاتا ہے۔ ایک دور میں سموط کی تعداد کم سے کم تین ہوتی ہے اور چار یا پانچ بھی ہو سکتی ہے، اس سے زائد عام طور پر نہیں ہوتی۔ یہ سموط قافیہ میں مطالع قفل اور خرجہ سے مختلف ہوتے ہیں اور کبھی کبھی ان کا وزن بھی ان سے مختلف ہوتا ہے، ایک دور کے تمام سموط ہم قافیہ ہوتے ہیں لیکن ہر دور میں نیا قافیہ استعمال کیا جاتا ہے، اور تمام ادوار کے سارے سموط ایک ہی وزن پر ہوتے ہیں، اسکے علاوہ سمط مفرد بھی ہوتا ہے اور مرکب بھی۔ مرکب ہونے کی صورت میں اس کے اندر دو تین یا چار فقرے ہو سکتے ہیں۔ اس سے زائد شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں، پھر یہ فقرے مساوی اور غیر مساوی دونوں قسم کے ہو سکتے ہیں، اور ان کی ترتیب بھی مختلف ہو سکتی ہے، مزید برآں ان فقروں کے قوافی متحد بھی ہو سکتے ہیں اور مختلف بھی، لیکن ایک سمط

پہلے دونوں فقرے باہم مساوی ہیں لیکن تیسرا فقرہ چھوٹا ہے[1]۔

ایاک عن لومی۔ رضیت بالوجب۔ مع الضنیٰ

واعتضت عن نومی۔ وراحتی سہدی۔ مع العنا

قتلت یاقومی۔ لا بظبا الھند۔ ولا القنا

(میری ملامت سے پرہیز کر۔ میں لاغری کے باوجود غم عشق پر راضی ہوں اور میں نے اپنی نیند اور راحت کے بدلے میں بیداری کو اختیار کر لیا ہے۔
اے میری قوم! مجھے نہ ہند کی تلواروں سے قتل کیا گیا ہے اور نہ نیزوں سے)

(۲) ابن القزاز کے موشحہ کا ایک دور جس کے ہر سمط میں چار فقرے ہیں[2]۔

بدرتم۔ شمس ضحیٰ۔ غصن نقا۔ مسک شم

ما أتم۔ ما أوضحا۔ ما أورقا۔ ما أنم

لا جرم۔ من لمحا۔ قد عشقا۔ قد حرم

(پورا ماہتاب ہے، چاشت کا آفتاب ہے، ٹیلے پر ایک شاخ ہے، خوشبودار مسک ہے۔
کسقدر کامل ہے، کسقدر روشن ہے، کس قدر شاداب ہے، کس قدر معطر ہے۔
لامحالہ جس نے دیکھا۔ عاشق ہوگیا۔ محروم ہوا۔)

آخر میں ابن القزاز کا ایک مدحیہ موشحہ مکمل پیش کیا جا رہا ہے تاکہ موشح کی پوری ہیئت ایک نظر میں سامنے آجائے، اس میں چھ اغصان ہیں اور ہر دور تین مرکب سمطوں پر مشتمل ہے، قوافی کی ترتیب بھی بڑی دلچسپ اور نظر افروز ہے[3]۔

---

[1] فن التوشیح ص: ۱۲۱، [2] مقدمہ ابن خلدون، ص: ۵۸۸،

[3] فن التوشیح، ص: ۱۷۷،

میرے لئے بیماریوں کا حکم دیا ہے اور میرے جذبۂ شوق کو بھڑکا دیا ہے اور اکثر احباب دشمنوں سے بھی زیادہ ظالم ہوتے ہیں۔)

(۳) عبادۃ بن ماء السماء کے موشحہ کا ایک دور جس کا ہر سمط دو غیر مساوی فقروں کا مرکب ہے اور چھوٹا فقرہ شروع میں ہے:[1]

إنما - يبدو لكي يوقد نار الفتن

صنم - مصور من كل شيء حسن

إن رمى - لم يخط من دون القلوب الجنن

(وہ صرف اس لئے باہر نکلتا ہے تاکہ فتنوں کی آگ بھڑکائے ایک ایسے صنم کی طرح جس کی تصویر ہر چیز سے بہتر بنائی گئی ہے، اگر وہ تیر چلائے تو ڈھالوں کی وجہ سے وہ دلوں تک پہنچنے میں خطا نہ کرے۔)

(۴) ابن بقی کے موشحہ کا ایک دور جس کے ہر سمط کا پہلا فقرہ بڑا اور دوسرا چھوٹا ہے:[2]

بأرض غرناطة بدر - قد اكتملا

يطيعه النظم والنثر - إذا ارتجلا

وبعض حليته الفخر - وأي حلى

(سرزمین غرناطہ میں ایک بدر ہے جو کامل ہوگیا ہے، نظم اور نثر دونوں اس کے مطیع ہوتے ہیں جب فی البدیہ کہے جائیں اور اس کا ایک زیور فخر ہے اور وہ کیسا عمدہ زیور ہے۔)

(۵) ابن سناء الملک کے موشحہ کا ایک دور جس کا ہر سمط تین فقروں سے مرکب ہے،

---

[1] الوافی بالوافیات، ج: ۳، ص: ۱۸۹-۱۹۰، [2] فن التوشیح، ص: ۱۸۷

فالمشرب ۔ فذ لن للحائم

والمذهب ۔ قد ضاق بالظالم

بحر انعم ۔ لمن ورد ۔ ظمآن ۔ سیفا نقم ۔ لمن مرد ۔ أوخان

(ابویحیٰ نے ابوالقاسم سے دوستی کر لی ہے، پس چشمہ پیاسے کے لئے لذیذ اور راستہ ظالم پر تنگ ہو گیا ہے، وہ نعمتوں کے دو سمندر ہیں اس کے لئے جو پیاسا وارد ہو اور سزا و انتقام کی دو تلواریں ہیں اس کے لئے جو سرکشی یا خیانت کرے۔

هل أشلا ــــ سواهما المجدا

او سربلا ــــ حاشا هما الحمدا

بل سرا علا ــــ لم یخل اسعدا

حاز الحکم ۔ أبیت خلد ۔ لقمان ۔ ذی همم ۔ جازت أمد ۔ کیوان

(کیا ان دونوں کے سوا کسی اور نے بھی مجد و شرف کی بنیاد رکھی ہے یا ان کے علاوہ کسی اور کو بھی مدح و ستایش کی قمیص پہنائی گئی ہو، یہ علو شرف کے دو ماہتاب ہیں جن سے کوئی سعد فوت نہیں ہوا،

یہ دونوں ایسی حکمتوں کے جامع ہیں جنھوں نے لقمان کے قلب و ذہن کو بھی عاجز کر دیا ہے اور ایسے عزائم تک پہنچ گئے ہیں جو زحل ستارہ سے بھی زیادہ بلند ہیں۔)

علی الانام ــــ بذاک نعتقد

نفی الکرام ــــ کلاهما فرد

ان الحماة ــــ فی ایکها تشدو

دعی الشم ۔ بقاجد ۔ مرجان ۔ قد انتظم ۔ فیه البرد ۔ فان دان

(مجھے اس بجلی کو دیکھنے دو جس میں موتیاں جمی ہوئی ہیں، اس میں اولے پروئے ہوئے ہیں پس وہ مزین و آراستہ ہے۔)

یوم النوی ۔ فی موقف البین

اهدی الهوی ۔ الی ضدین

نار الجوی ۔ وادمع العینین

تضطرم ۔ وتتقد ۔ اشجان ۔ وتنسجم ۔ وتطرد ۔ اجفان

(فراق کے دن جدائی کے موقع پر محبت نے دو متضاد چیزیں مجھے تحفہ میں دیں، آتش غم اور اشک چشم، پس غم مشتعل ہے اور بھڑک رہا ہے اور آنکھیں جاری ہیں اور بہ رہی ہیں۔)

قل للعدی ۔ قد سل سیفیه

دین الهدی ۔ من عزم ملکیه

واکدا ۔ ود محبیه

شمل نظم ۔ حبل عقد ۔ بنیان ۔ لا ینهدم ۔ له الابد ۔ ارکان

(دشمنوں سے کہدو کہ دین ہدایت نے اپنے دونوں بادشاہوں کے عزم سے اپنی دونوں تلواریں کھینچ لی ہیں اور اپنے دونوں دوستوں کی دوستی کو مضبوط کر دیا ہے۔ افتراق اب اتحاد میں بدل گیا ہے اور رسی میں گرہ لگادی گئی ہے اسطرح ایک مستحکم عمارت قائم ہو گئی ہے جس کے ارکان کبھی منہدم نہ ہوں گے۔)

والی ابو ۔ یحیی ابا القاسم

خریطۂ جواہر

از شاہ معین الدین احمد ندوی

(۶)

ابوطالب کلیم۔ لالہ داغ است از فغانِ بلبل و گل بیخبر

آشنا رحمے نکرد اما دلِ بیگانہ سوخت

بلبل کی فغاں سے لالہ کے دل میں داغ پڑ گیا ہے مگر پھول بے خبر ہے، آشنا یعنی پھول کو تو رحم نہیں آیا لیکن بیگانے (لالہ) کا دل فغاں کے اثر سے جل گیا،

از ہماں بزم کہ جز من دگرے رہ نداشت　　بایدم رفت کہ بہر دگراں جا باشد

اب اس بزم سے جس میں میرے سوا کسی دوسرے کا گذر نہ تھا مجھے چلا جانا چاہیے تاکہ دوسروں کے لیے جگہ خالی ہو۔

ہمتم ہست رسا بختم اگر کوتاہ است　　پشتِ پایم بسر ار دست بمینا نرسد

گو میری قسمت کوتاہ ہے لیکن میری ہمت رسا اور بلند ہے، اگر میرا ہاتھ مینا تک نہیں پہنچ سکتا تو میرا تلوا تو پہنچ سکتا ہے، یعنی میں اپنی عالی ہمتی سے دنیا کو ٹھکرا سکتا ہوں۔

کلیم۔ یک نفس فرصت و صد حرف گرہ در خاطر　　وائے گر گریہ نہ گیرد [illegible] دل

داستانِ غم بیان کرنے کے لیے فرصت تو ایک دم کی ہے اور دل میں سیکڑوں خیالات بھرے ہیں، اس وقت گریہ ہی دل کی ترجمانی میں مدد دے سکتا ہے، اگر وہ بھی مدد نہ کرے تو کیسی [illegible]

قل هل علم . او هل عہد . او کان کالمعتصم . والمعتضد . ملکان

(ہر مخلوق کو اس بات پر اعتماد ہو پس تسر فار میں وہ دونوں یکتائے روزگار ہیں،

کبوتر درختوں پر گاتے ہیں:-

تو کہدو کیا کسی کو معلوم ہو یا کسی کے ذہن میں ہو یا کبھی ہوئے ہیں معتصم اور معتضد جیسے

دو بادشاہ۔)

مدرسہ سراج العلوم جھنڈا نگر نیپال

مدرسہ سراج العلوم جھنڈا نگر ۱۹۱۴ء سے دینی و عربی تعلیم کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ شروع ہی میں اس درسگاہ کے بانی حاجی نعمت اللہ صاحب مرحوم نے موضع سونپور میں ۱۲۷ بیگھہ زمین اس پر وقف کر دی تھی، اسی کی آمدنی اور کسی قدر ارباب خیر کے زر اعانت سے اس کا خرچ چلتا تھا، کچھ دن ہوئے کہ حکومت نیپال نے اپنے ایک ملکی قانون کے تحت اس کو اپنے قبضہ میں کر لیا تھا جس کے واگذاشت کرانے میں مدرسہ کا ہزاروں روپیہ خرچ ہو گیا، ابھی مدرسہ اس کے اخراجات سے سنبھلنے بھی نہ پایا تھا، کہ آتش زدگی کا حادثہ پیش آ گیا جس سے اس کا سارا اثاثہ جس میں ۵۰ طلبہ کا سال بھر کا راشن تھا مدرسہ سے متعلق بہت سے مکانات تھے جل کر خاکستر ہو گئے، امید ہے کہ اس مصیبت میں اہل خیر حضرات پہلے سے کہیں زیادہ اپنے پرجوش تعاون اور فیاضانہ امداد سے کارکنان مدرسہ کا ہاتھ بٹائیں گے،

عبد الرؤف رحمانی ناظم مدرسہ

(کیرآف خان کلاتھ ہاؤس بڑھنی بازار بستی)

ہر عیب چھپ جاتا ہے۔

مرزا گرامی۔ چو شمع شکوہ گرامی ز غیر نیست مرا ہر آنچہ دیدہ ام از چشم خویشتن دیدم

گرامی شمع کی طرح مجھے کسی دوسرے کا شکوہ نہیں ہے، جو کچھ میں نے دیکھا ہے اور جو مجھ پر گذری ہے وہ سب میری آنکھوں کا قصور ہے، اسی نے مصیبت میں مبتلا کیا ہے۔

لطفی شیرازی۔ شادی در دل زدہ ز درون درد ندا داد کایں خلوت عشق است کسی بار ندا د

خوشی نے دل کے دروازے پر دستک دی تو اندر سے درد نے آواز دی کہ یہ عشق کی خلوت ہے، یہاں کسی کو بار نہیں مل سکتا، اہل درد ہی یہاں آسکتے ہیں۔

مسعود قمی۔ گفتمش سالہا بخاک رہت سودہ ام روئے خویش گفت چہ سود

میں نے محبوب سے کہا کہ میں نے برسوں تیری راہ کی خاک پر منہ رگڑا ہے، اس نے جواب دیا اس سے کیا فائدہ ہوا، اس شعر میں سودہ اور سود کی تجنیس سے لطف پیدا کیا ہے۔

بد خو مکن از بخشش دشنام کساں را ایں تحفہ تعلق بدعا گوئے تو باشد

دشنام کی بخشش سے لوگوں کی عادت نہ بگاڑ، یہ تحفہ تو خاص تیرے دعاگو (یعنی میرا) کا حصہ ہے، اس شعر میں "بخشش دشنام"، "تحفہ" اور دعاگو نے بڑا لطف پیدا کر دیا ہے۔

میر مقبول قمی۔ بجز آنکہ جاں گدازی تو نیست ہیچ سودم برو اے غم از دل کہ ترا ہم آزمودم

غم سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تجھکو بھی آزما کر دیکھ لیا، جاں گدازی کے سوا تجھ سے کچھ حاصل نہیں تو بھی دل سے نکل جا۔

پر از خونناب حسرت شد دو چشم اشکبار من یکے بر روز من گرید یکے بر روزگار من

میری دونوں اشکبار آنکھیں حسرت کے خوناب سے بھری ہوئی ہیں، ایک میرے دن کی حالت پر روتی ہے دوسری روزگار کے حال پر، اس میں صرف روز اور روزگار کی تجنیس ہے۔

آنچہ من دیدم ز دشمن ہم جدائی مشکل است　　میخلد در دل گر از پا خار بیروں می کنم

دشمن (مراد محبوب) سے مجھ پر جو کچھ گذری ہے اس کو چھوڑنا بھی مشکل ہے، اگر پاؤں سے کانٹا نکالتا ہوں تو دل میں چبھنے لگتا ہے، یعنی محبوب کے ظلم کو چھوڑنا بھی دشوار ہے، اس کی علٰحدگی دل پر اور بھی بنجاتی ہے،

محمد کاظم قمی۔ یک نالۂ مستانہ ز جائے نشنیدیم　　ویران شود آں شہر کہ میخانہ ندارد

کسی جگہ سے ایک نالۂ مستانہ بھی سننے میں نہیں آیا، اس شہر کا ویران ہی ہو جانا ہی بہتر ہے، جہاں میخانہ ہو، یہ شعر حقیقت پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے کہ جہاں کوئی اہلِ دل نہ ہو اس کو ویران ہی ہو جانا چاہیے،

کاظمائی تبریزی۔ باکم ز ننگ نیست کہ مستم گرفتہ اند　　داغم ازیں کہ شیشہ ز دستم گرفتہ اند

مجھکو اس رسوائی کا خوف نہیں ہے کہ مجھے مستی کی حالت میں گرفتار کیا گیا، غم اس کا ہے کہ شراب کا شیشہ میرے ہاتھوں سے چھین لیا،

حسن بیگ گرامی۔ بوئے تو با نسیم بہار آشنا نشد　　گلہا شگفت و بند قبائے تو وا نشد

تیری خوشبو نسیم بہار سے آشنا نہیں ہوئی کیونکہ نسیم بہار کے اثر سے پھول تو کھل گئے مگر تیرا بند قبا نہیں کھلا،

رکنائی قزوینی۔ ہر کس ز محفل تو نصیبے برد بقدر　　من نیز بے نصیب نیم رشک می برم

ہر شخص کو تیری محفل سے اس کی قسمت کا حصہ ملتا ہے، میں بھی محروم نہیں ہوں، میری قسمت کے حصہ میں رشک آیا ہے،

شیخ سعد اللہ گلشن۔ سر دیوانگی سلامت باد　　راز ما را چہ پردہ پوشی کرد

خدا دیوانگی کو سلامت رکھے، اس نے میرے راز کی کیسی پردہ پوشی کی ہے، کیونکہ دیوانگی میں

در خواب نہ دیدہ بود میلی   آسودگی کہ در لحد دید

میلی کو خواب میں بھی وہ آسودگی حاصل نہیں ہوئی جو آسودگی لحد میں ملی،

دانستہ کہ عشق تو با جان نمیرود   کز خاک تشنگان گذری سرگران ہنوز

شاید تجھکو یقین ہے کہ عشق عاشق کے مرجانے سے نہیں چلا جاتا، اسی لیے تشنگان محبت کی خاک سے ابتک سرگراں گذرتا ہے،

تو بر در دل تمام میلی   کس با چو توئی چرا نشیند

میلی تو سراپا درد دل ہوا پھر کوئی تیرے جیسے شخص کے پاس کیوں بیٹھنے لگا،

پس از گلہ نشینم بصد تقرب در پیش   سر از ادب مدعا من کند تا زود بر خیزد

مدتوں کے بعد جب مجھے اس کی بزم میں بیٹھنے کا موقع ملتا ہے تو میرا مدعا پوچھنے لگتا ہے تا کہ جلد اٹھ جاؤں

ظاہر نکردہ ام بتو وارستگی خود   چون بر خود اعتماد تمامے نیافتم

میں نے تجھ سے اپنی وارستگی ابتک اس لیے نہیں بیان کی کہ مجھکو اپنے اوپر پورا اعتماد نہیں ہے، ایسا نہ ہو کہ تجھے یہ کہکر میری وارستگی قابو میں نہ رہے اور میری آزردگی کا سبب بنے

ترسم ز بیوفائی خود منفعل شوی   گر گویم امید واری خویشتن بیان کنم

میں اس ڈر سے اپنی آرزوئیں اور تمنائیں تجھ سے نہیں بیان کرتا کہ اس کو سنکر تجھے اپنی بیوفائی پر شرمندگی نہ ہو۔

میروم از سر کوئے تو و لے ہر گام   باز بحسرت بقفا میکنم و میگریم

میں تیری گلی سے تو جا رہا ہوں مگر ہر قدم پر حسرت سے مڑ مڑ کر دیکھتا اور روتا جاتا ہوں۔

اگر نا خواندہ می آیم بہ بزمت رو متاب از من   تو ہم دانستہ باشی از کمال اضطراب من

مرزا قلی میلی۔ دم آخر است دشمن بمنش گذار یکدم　　کہ بصد ہزار حسرت بتو می گذارم او را

رقیب سے کہتا ہے کہ میرا وقت آخر ہے، اس وقت تو محبوب کو ایک لمحہ کے لیے میرے لیے چھوڑ دے، کیونکہ میں ہزاروں حسرتوں کے ساتھ اس کو ہمیشہ کے لیے تیرے لیے چھوڑ رہا ہوں۔

سازد خموش تا من حسرت فزودہ را　　گوید شنیدہ ام سخن ناشنیدہ را

مجھ حسرت زدہ کو خاموش کرنے کیلیے محبوب کہہ دیتا ہے کہ میں نے بے سنی بات کو سن لیا ہے، وہ یا میری داستان سننا نہیں چاہتا یا بغیر کہے سمجھ جاتا ہے۔

تو با رقیبی و میلی تغافلے دارد　　تغافلے کہ کم از صد ہزار حسرت نیست

تو رقیب کے ساتھ ہے اور میلی یہاں ہے جبکہ اس سے تغافل اور چشم پوشی کر رہا ہے، اس لیے اس کے لیے یہ تغافل بھی سیکڑوں حسرتوں سے کم نہیں ہے، وہ بظاہر تو تغافل برت رہا ہے، لیکن اس کا دل اس منظر سے خون ہے،

از ہلاکم ہر دم اظہار پشیمانی کند　　این سخن از بہر تسکین دل ناشاد کیست

محبوب میری ہلاکت پر ہر دم پشیمانی ظاہر کرتا ہے، آخر اس سے کس کے دل ناشاد کی تسکین مقصود ہے، عاشق جس کی تسلی مقصود تھی وہ تو ختم ہو چکا،

میرم از شوق و بسوئے تو نیایم کہ مباد　　بیخودیہائے دلم پیش تو شرمندہ کند

میں تیرے شوق میں مرا جاتا ہوں مگر اس خوف سے تیرے پاس نہیں جاتا کہ میرے دل کی بیتابی تیرے سامنے مجھے شرمندہ نہ کر دے معلوم نہیں اضطراب میں کیا کر بیٹھے۔

بخت اگر در خواب یکدم ہمدم یارم کند　　دل طپد از ذوق چندانکہ بیدارم کند

اگر کبھی قسمت محبوب کو ایک لمحہ کے لیے خواب میں بھی دکھاتی ہے تو دل وفور ذوق میں اتنا تڑپتا ہے کہ بیدار کر دیتا ہے اور خواب میں بھی لطف ملاقات حاصل نہیں ہونے پاتا۔

وہ وقت بھی کیسا خوش آیند ہو کہ میں اس سیمتن کے سامنے ہنستا ہوا جان دوں
تو میرے سرہانے رو رہا ہو اور میں مر رہا ہوں۔

بمن چنداں گناہ از بدگمانی میکند نسبت — کہ من ہم در گماں افتادہ پندارم گنہگارم

محبوب نے بدگمانی سے میری جانب اتنے گناہ منسوب کر دیے ہیں کہ مجھے خود اپنے گنہگار ہونے کا گمان ہو گیا ہے۔

محمد حسین مخزون۔ چرا بیہودہ شادی در دل من خانہ می سازد
ہمیں دم سیل غم می آید و ویران می سازد

میرے دل میں خوشی بیکار گھر بناتی ہے، کیونکہ اسی وقت غم کا سیلاب آکر اسکو ویران کر دیتا ہے، یعنی اگر کبھی کوئی خوشی بھی حاصل ہوتی تو غم کا پہاڑ اس کو ملیامیٹ کر دیتا ہے۔

میر محمد مومن۔ ز صد لشکر ندیدم آں خرابی کز غمش دیدم — الٰہی کاروان عشق جائے بار نکشاید

سیکڑوں فوجوں کی تاخت سے بھی میں نے وہ ویرانی نہیں دیکھی جو اس کے غم سے دیکھی
خدایا عشق کا قافلہ کہیں نہ اترے، جہاں یہ اترا دہاں ویرانی آئی،

حافظ محمد۔ مریض عشق را نازم کہ گر بہر علاج او — مسیحا بر سر بالیں رود بیمار می آید

مریض عشق کی قسمت ناز کے قابل ہے کہ اگر مسیحا اس کے علاج کے لیے سرہانے جاتا ہے تو بیمار ہو کر لوٹتا ہے، یعنی اس کی حالت دیکھکر خود بیمار ہو جاتا ہے۔

ملا رشیدی ہروی۔ بسیار ز حد می گذرد گرمی مجلس — دل سوختۂ در پس دیوار نباشد

کیا بات ہے کہ آج گرمی مجلس حد سے زیادہ بڑھ رہی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ دیوار کے پیچھے کوئی دل جلا ہے، یہ گرمی مجلس اسی کا اثر ہے،

حکیم رکن الدین مسیح۔ آنقدر خاک کہ بادیں بسر از دست تو کرد — جیبم آہ کہ در دامن ایں صحرا نیست

اگر میں تیری بزم میں ناخواندہ چلا آتا ہوں تو مجھ سے منہ نہ پھیر کیونکہ تو میری بیقراری کی شدت سے واقف ہے جس سے مجبور ہو کر آنا پڑا۔

میل داری کہ بمیرند جہانے بہوس   از وفانیست کہ بر تربت من می گذری

میری تربت پر تیرا آنا وفا کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس لیے آتا ہے کہ ایک جہان اس کو دیکھکر رشک و ہوس میں مرجائے، یہ بد گمانی کی انتہا ہے۔

افگندہ ام ترا بزبانہا و خوش دلم   کز شرم آں نگاہ بہ مردم نمی کنی

میں نے لوگوں میں تیرا شہرہ کردیا ہے، اور اس سے خوش ہوں کہ اس شہرت کی شرم کی وجہ سے تو کسی دوسرے پر نگاہ نہ ڈالے گا۔

محتشم کاشی۔ بجرمے کاش بہ پیشش متہم گردم کہ ہر ساعت   بدست و پائیش افتم بہر در خواہ گناہ خود

کاش کسی جرم میں متہم ہو کر اس کے سامنے جاؤں تاکہ اس بہانہ سے ہر گھڑی گناہ کی عذر خواہی میں اس کے ہاتھ پاؤں پڑنے کا موقع ملے۔

چو غافل از اجل صیدے سوئے صیاد می آید   نخستیں رفتن خویشم بآں کو یاد می آید

جب موت سے غافل کسی شکار کو صیاد کی طرف جاتا دیکھتا ہوں تو اس کی گلی میں اپنا پہلی مرتبہ جانا یاد آتا ہے، کہ غریب یہ بھی میری طرح گرفتار ہوگا۔

ز رفتن تو من از عیش بے نصیب شدم   سفر تو کردی و من در وطن غریب شدم

تیرے جانے سے میں زندگی کے لطف سے محروم ہوگیا، تو نے کیا سفر لیکن میں اپنے وطن میں مسافر ہوگیا، غالباً یہ شعر بیوی کی موت پر شاعر نے کہا ہے۔

خوش آں ساعت کہ خنداں پیش آں سیمیں بدن میرم
تو باشی بر سر بالیں من گریان و من میرم

مجھے آشوب محشر کا ڈر نہیں ہے، ڈر اس کا ہے کہ بجھی ہوئی شمع کی طرح پھر نئے سرے زندگی کا درد سر برداشت کرنا پڑے گا۔

چوں زخم غنچہ زخم دلم بخیہ گیر نیست برگ گل است سینۂ عاشق حریر نیست

غنچہ کے زخم کی طرح میرے دل کے زخم میں بھی ٹانکا نہیں لگ سکتا، عاشق کا سینہ پھول کی پنکھڑی ہے، حریر نہیں جس میں ٹانکا لگایا جا سکے،

خزاں رسید و کسے آشنائے عیش نشد بہار ہمچو غریباں ازیں دیار گذشت

خزاں کا موسم آگیا اور کسی کو لطف زندگی حاصل نہ ہو سکا، بہار تو آئی لیکن اجنبی مسافر کی طرح اس دیار سے گذر گئی، کسی کو اس سے فائدہ نہیں پہنچا، یعنی دنیا کی بہار سے کسی کو بھی پورا لطف اٹھانے کا موقع نہ سکا،

گیرم کہ ز قید قفس آزاد کنندم کو قوت پرواز کہ تو انم بچمن رفت

میں نے مانا کہ مجھکو قید قفس سے آزاد کردیں گے لیکن اب وہ قوت پرواز کہاں کہ اڑ کر چمن تک پہنچ سکوں،

یارب آنکس کہ دم تیغ ترا آب داد زحمت تشنگی روز قیامت نکشد

خدایا جس نے قاتل کی تلوار کو آب دی ہے وہ قیامت کے دن پیاس کی زحمت سے محفوظ رہے، یعنی قاتل کو قیامت میں کوئی گزند نہ پہنچے، اس شعر میں آب اور تشنگی سے لطف پیدا کیا گیا ہے،

میا از خانہ بیروں گو جہاں بیت الحزن باشد نمیخواہم ترا بیند کسے گر چشم من باشد

محبوب سے کہتا ہے کہ خواہ ساری دنیا غم والم سے بھر جائے مگر تو اپنے گھر سے باہر قدم نہ نکال کیونکہ میں یہ پسند نہیں کرتا کہ تجھ پر کسی کی نگاہ پڑے خواہ وہ میری آنکھ کیوں نہ ہو۔

جتنی خاک مجھے ہاتھوں یا تیری یاد میں سر پر ڈالنا چاہیے، افسوس کہ وہ اس صحرا کے دامن میں نہیں ہے یعنی صحرا کی وسعت میری دیوانگی کے لیے تنگ ہے،

کس نمیداند کہ خواہد دیدکار مردن دلے　　　بندہ میدانم کہ خواہم در تہ پائے تو مُرد

کسی کو اس کی خبر نہیں کہ اس کی موت کہاں آئے گی لیکن مجھے معلوم ہے کہ تیرے قدموں کے نیچے جان دوں گا،

ہنوز از خاک کوئے او غبارے در کفن دارم　　　بہشت آں بہ کہ بر من جلوہ را بسیار نفروشد

ابتک اس کی گلی کی خاک کا اثر میرے کفن میں موجود ہے، میرے لیے وہاں بہشت بہتر ہے کہ مجھ پر زیادہ جلوہ فروشی نہ کرے۔ یعنی میرے لیے اس کے کوچہ کی خاک کافی ہے، بہشت کی ضرورت نہیں،

بکام دل ندیدم یک نفس در مدت عمرش　　　کنوں چشمیکہ دارم بر نگاہ واپسیں دارم

اپنی پوری زندگی میں ایک لمحہ کے لیے بھی دل کی آرزو پوری نہ ہوئی، اب جو کچھ امید ہے وہ نگاہ واپسیں سے ہے، اس کے بعد پھر کوئی آرزو ہی باقی نہ رہے گی،

مشفقی بخاری۔ ز کویش می گذشتم خار در پایم شکست آنجا　　　بحمد اللہ کہ تقریبے شد از بہر نشست آنجا

میں اس کی گلی سے گذر رہا تھا کہ پاؤں میں ایک کانٹا ٹوٹ گیا، خدا کا شکر ہے کہ اس سے اس گلی میں ٹھہرنے کی ایک تقریب پیدا ہو گئی۔

در غمت رشتۂ عمرے کہ بکف بود مرا　　　صرف در دوختن چاک گریباں شدہ است

غم میں عمر کا جو رشتہ (تاگا) میرے ہاتھ میں رہ گیا تھا وہ بھی چاک گریباں کے سینے میں صرف ہو گیا یعنی تیرے غم محبت میں جتنی اور جیسی عمر بھی بسر ہوئی وہ بھی دیوانگی کی نذر ہو گئی،

[illegible] یا کم از آشوب محشر زیست می ترسم کہ باز　　　ہمچو شمع کشتہ باید زندگی از سر گرفت

آزادی ملنے کے بعد بھی اس کو نہیں چھوڑتا۔

میر مومن۔ بگوش پنبہ نہم از صدائے خندۂ گل دماغ نالۂ بلبل دریں بہار کجاست

اب دماغ اتنا نازک ہو گیا ہے کہ موسم بہار میں خندۂ گل کی صدا سننے کی بھی تاب نہیں ہے، اس لیے کانوں میں روئی ٹھونس لیتا ہوں، ایسی حالت میں بلبل کا نالہ سننے کا دماغ کہاں سے آئے۔

چیزیکہ خاطرے بشگفاند جہاں نداشت مے زاں حرام شد کہ دلے شادمی کند

ایسی چیز جس سے دل شگفتہ ہو دنیا کے پاس نہیں تھی، شراب اس لیے حرام ہو گئی کہ اس سے دل شاد ہوتا تھا، تاکہ کسی قسم کی خوشی و شگفتگی کا سامان باقی نہ رہے۔

اے گل آں زر کہ تو داری اگر از من باشد میدہم کز قفسے بلبلے آزاد کنم

پھول سے کہتا ہے کہ تیرے پاس جو زر (زرگل) ہے اگر میرے پاس ہوتا تو میں اس کو کسی بلبل کو قفس سے آزاد کرانے میں صرف کرتا مگر تجھ سے یہ نہیں ہوتا۔

زلالی مشہودی۔ طے شد بہار عمر و غم دیرسالہ ماند چوں داغ لالہ درد میم در پیالہ ماند

عمر کی بہار آخر ہو گئی یعنی عمر تمام ہو گئی مگر دیرینہ غم باقی رہ گیا اور لالہ کے داغ کی طرح پیالہ میں صرف تلچھٹ رہ گئی یعنی زندگی کے لطف ختم ہو گئے صرف غم باقی رہ گیا۔

مارا دماغ گلشن و باغ زمانہ نیست اے گل برو کہ دماغ زمانہ نیست

پھولوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اب مجھ میں گلشن اور باغ کی ہوس باقی نہیں ہے اور تجھ سے لطف اندوزی کا دماغ ہی نہیں رہ گیا ہے، اس لیے تو چلا جا۔

انشاء کا شعر ہے:

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں۔

اس پر بوعلی قلندرؒ کا یہ شعر یاد آگیا،

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن نہ دہم گوش را نیز حدیث تو شنیدن نہ دہم

مرا بوقت گل از باغ در قفس کردند بگلشنم نفرستید تا بہار شود

مجھکو موسم گل میں قفس میں قید کیا ہے اس لیے جب تک پھر بہار نہ آجائے مجھے گلشن میں نہ لیجاؤ کہ خزاں کا منظر نہ دیکھوں۔

ز شوق سیر گلزار آنقدر فرصت نمی یابم کہ در پائے گلے بنشینم و خارے بروں آرم

گلزار کی سیر کے شوق سے اتنی فرصت بھی نہیں ملی کہ کسی پھول کے پاؤں کے پاس بیٹھکر کانٹا نکال سکوں، یعنی دنیا کی دلفریبیوں میں اتنا کھو گیا کہ دوسرے کاموں کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہیں ملی، یہ شعر لاجواب ہے،

زباندان نگاہم گفتگوئے نازمی دانم زیک جنبیدن مژگان بفکر صد ادا رفتم

میں نگاہوں کی زباں کا زباںداں اور ناز کی باتوں کا رمزشناس ہوں اسلیے محبوب کی مژگاں کی ایک جنبش سے سیکڑوں اداؤں کے خیال میں ڈوب جاتا ہوں۔

دلم در دام مرغان قیامت الفتے دارد ازاں ایام می ترسم کہ تنہا در قفس باشم

مجھے مرغان قیامت کے دام سے تو الفت ہے البتہ اس دن سے ڈرتا ہوں کہ قفس میں تنہا رہنا پڑے، یعنی قیامت کا ہنگامہ اور اس کی دار و گیر تو مرگ انبوہ جشنے دارد کی حیثیت رکھتی ہے، قبر کی تنہائی سے البتہ ڈرتا ہوں،

منم آں مرغ گرفتار کہ در صحن چمن اگر آزاد کنندم بقفس می آیم

میں وہ مرغ گرفتار ہوں کہ اگر چمن میں مجھے آزاد بھی کر دیتے ہیں تو میں قفس میں لوٹ آتا ہوں یعنی قید قفس کا اتنا عادی ہو گیا ہوں اور اس سے اتنی الفت ہو گئی ہے کہ

وفیات

چودھری خلیق الزماں مرحوم

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ چودھری خلیق الزماں مرحوم کا کراچی میں انتقال ہوگیا، مرحوم اُن لوگوں میں تھے جن کی پوری زندگی سیاسی اور قومی کاموں میں گذری، سیاست کا چسکا ان کو طالب علمی ہی کے زمانہ سے تھا، چنانچہ جنگ بلقان کے زمانہ میں ہندوستان سے جو طبی وفد ڈاکٹر انصاری مرحوم کی قیادت میں ٹرکی گیا اس میں جو نوجوان شامل ہوئے تھے اُن میں ایک چودھری صاحب بھی تھے، کئی مرتبہ لکھنؤ میونسپلٹی کے چیرمین ہوئے ان کی چیرمینی کا دور ایک یادگار دور تھا، اسی زمانہ میں خلافت اور ترک موالات کی تحریک شروع ہوئی اُس میں اس سرگرمی سے حصہ لیا کہ صوبے کے لیڈروں میں ان کا شمار ہونے لگا، ایک مدت تک کانگریس میں رہے، پنڈت موتی لال کے معتمد علیہ اور جواہر لال کے خاص رفقا میں تھے، کانگریس میں بھی نمایاں مقام حاصل کیا، چنانچہ ۲۹ء میں جب کانگریس کے لیڈروں کی گرفتاری کا سلسلہ شروع ہوا تو آخر میں ان کو کانگریس کا ڈکٹیٹر مقرر کیا گیا تھا۔

پھر مسلم لیگ میں شامل ہوگئے اور پاکستان کی تحریک میں چند دنوں میں آل انڈیا لیڈر کی حیثیت حاصل کرلی چنانچہ پاکستان کے بانیوں میں انکا شمار ہوتا ہے، قیام پاکستان کے بعد کراچی چلے گئے، یہاں بھی انکو بڑے بڑے عہدے حاصل ہوئے مختلف اوقات میں مسلم لیگ کے صدر، مشرقی پاکستان کے گورنر اور انڈونیشیا کے سفیر مقرر ہوئے مگر مسٹر جناح ان سے

ملک قمی ۔ ذرا یہ بدگمانی ملاحظہ ہو :-

از ین بوعدۂ وصلت امیدوار کند

کہ انچہ ہجر نہ کردہ است انتظار کند

معشوق مجھے اس لیے وصل کی امید دلاتا ہے کہ جو تکلیف و مصیبت مجھ پر ہجر میں نہیں گذری وہ انتظار میں گذر جائے ،

اسی سے ملتا جلتا ہوا یہ شعر ہے :-

غرض ایں بود کہ از ذوق بمیرم ورنہ

ایں ستم دیدہ سزاوار پیام تو نبود

یہ ستم دیدہ تیرے پیام کے لائق نہیں تھا، تیرے پیام بھیجنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ میں اس کے ذوق و لذت کے لطف میں مرجاؤں ۔

ندارم قوتِ رفتن درآں کوچہ آنم کو

کہ گوید ناتوانے داستم اورا چہ پیش آمد

مجھ میں محبوب کے کوچہ تک جانے کی طاقت نہیں ہے ، مگر یہ قسمت کہاں کہ وہ پوچھے میرا ایک ناتواں تھا، اس کو کیا واقعہ پیش آیا کہ نہیں آسکا ۔

بنوعے چشم او شد وقت کشتن عذر خواہ من

کہ ہجرمی بخوں غلطید از رشکِ گناہ من

مجھے قتل کرتے وقت اس کی نگاہوں نے کچھ اس طرح سے معذرت کی کہ بیگناہی میرے گناہ کے رشک میں خون میں لوٹنے لگی، یعنی اس کی معذرت پر بے گناہی کو رشک آگیا کہ اس نے گناہ کیوں نہیں کیا کہ معشوق کی معذرت کی لذت سے لطف اندوز ہوتی ۔

(باقی)

باب التقریظ والانتقاد

سترھویں صدی عیسوی میں ہندوستان
کی
بعض اہم نثری تصانیف

از سید صباح الدین عبد الرحمن

مذکورہ بالا کتاب در اصل پی۔ ایچ۔ ڈی کا وہ مقالہ ہے، جس کو جناب ممتاز علی خاں نے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں پیش کیا، یہ ڈاکٹر نذیر احمد صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی کی نگرانی میں لکھا گیا، جو اب تک معلوم نہیں کتنے پی۔ ایچ۔ ڈی بنا چکے ہیں، ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے اپنی رہنمائی میں جو مقالات تیار کرائے ہیں، اُن میں بڑا تنوع ہے۔ ہندوستان میں شروع سے جو ادیب و شاعر پیدا ہوتے گئے، ان کی طرف بھی ڈاکٹر نذیر احمد کی توجہ ہے، خوشی کی بات ہے کہ ان کی اس حسن توجہ کی وجہ سے ہندوستان کے بہت سے ایسے شاعر اور ادیب منظر عام پر آرہے ہیں جو نقش و نگار طاق نسیاں بن چکے تھے، اسی کے ساتھ ان کو سبک ہندی سے بھی لگاؤ ہے اور ہندوستان کے اندر جو ادبی، علمی اور شعری کارنامے انجام پاتے گئے، ان کی اہمیت بھی ان کی نگرانی میں ظاہر ہو رہی ہے۔

زیر نظر کتاب میں جناب ممتاز علی خاں صاحب نے سترھویں صدی عیسوی میں ہندوستان

غوش نہ تھے اس لئے وہ پاکستان کی سیاست کو اثر انداز نہ ہو سکے اور آخر میں گوشہ نشینی
کی زندگی اختیار کر لی تھی اور اسی پر انکا خاتمہ ہوا، چودھری صاحب کی زندگی قلندرانہ
تھی، وہ وکیل تھے انکے ماموں اور خسر مولوی محمد نسیم صاحب لکھنؤ کے چوٹی کے
وکیل اور ان کے صاحبزادے محمد وسیم صاحب نامور بیرسٹر تھے لیکن چودھری صاحب
کو ادب سے ایسا چسکا تھا کہ انکا سارا وقت اسی میں گذرتا تھا اسلئے وکالت کی طرف
توجہ کرنے کا موقع کم ملتا تھا، ان کی وکالت برائے نام تھی، اس سلسلہ میں ایک واقعہ یاد آگیا،
ایک مرتبہ وہ مسلم لیگ کے دورے کے سلسلہ میں اعظم گڈھ آئے تھے، ایک گفتگو میں سید صاحب
مرحوم سے کہنے لگے کہ مولانا میرے ساتھیوں نے وکالت سے لاکھوں پیدا کئے اور میں گھر تک
نہ بنوا سکا، ابھی چند سال ہوئے انھوں نے شاہراہ پاکستان کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس میں قیام پاکستان
کی سرگذشت تحریر کی تھی، اگلی صحبتوں کی ایک یادگار مٹ گئی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی مرحوم

دوسرا حادثہ مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی نائب امیر شریعت صوبہ بہار و
اڑیسہ کا ہے، وہ بھی پرانی یادگار، اس دور کے نامور عالم اور ملک و ملت کے پرانے
خدمت گذار تھے، ملکی و ملی تحریکات میں ان کا نمایاں حصہ رہا، خلافت اور
ترک موالات کی تحریک اور ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں مولانا
سجاد بہاری مرحوم کے رفیق کار تھے، ان کی وفات سے ایک قدیم یادگار اٹھ
گئی، اللہ تعالیٰ ان کے مدارج بلند فرمائے۔

آسکا، یہ طب کے موضوع پر ہے،

اس مقالہ کا وہ حصہ زیادہ پسند آیا جہاں مختلف تصانیف کی زبان کی خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی کی گئی ہے، مثلاً فخرمدبر کی تصنیف شجرۂ انساب میں سے ایسی مثالیں دی گئی ہیں کہ اس کے مصنف نے کہیں طویل اضافت مسلسل کا استعمال کیا ہے، کہیں است جیسے متوالی فعل، کہیں تجاوز کے ترکیبی الفاظ کو حذف کر دیا ہے، کہیں ماضی استمراری کے بجائے ماضی تمنائی استعمال کیا گیا ہے، کہیں ۔۔۔ کر صفت مرکب بنائی گئی ہے، کہیں دو صفت کے درمیان واو عطف چھوڑ دیا گیا ہے، کہیں مصدر کے بجائے فعل مرخم استعمال ہوا ہے، کہیں ماضی مطلق کے بجائے مضارع سے ماضی تمنائی بنایا گیا ہے، کہیں اسم اور ضمیر دونوں ساتھ استعمال ہوئے ہیں، جمع بنانے میں کبھی فارسی، کبھی عربی قاعدے سامنے رکھے گئے ہیں، اس زمانہ میں بعض الفاظ اور محاورے اس طرح استعمال ہوئے ہیں جو اب نہیں ہوتے، مثلاً برجیس کے لئے اورمزد، ناہید کے لئے بیدخت، نافرمانی کے لئے بے فرمانی، کامرانی کے لئے دوست کامی، کفار کے لئے اہل کفران، نوازش کے لئے نواختی استعمال ہوئے ہیں، اسی طرح طاعت کردن کے بجائے طاعت داشتن، نگہداشتن کے بجائے تیمار داشتن، آموختن کے بجائے، درس کردن، اضافہ شدن کے بجائے جملہ شدن، سوگند خوردن کے بجائے سوگند یاد کردن، اسلام قبول کردن کے لئے در مسلمانی افتادن وغیرہ وغیرہ استعمال ہوئے ہیں، اسی طرح اس زمانہ کی اور تصانیف میں صرف و نحو کی غرابت یا الفاظ اور محاورے کے عجیب معانی کی نشاندہی کی گئی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مقالہ نگار نے کافی محنت کی ہے، فارسی تصانیف کا اس قسم کا مطالعہ مفقود ہوتا جارہا ہے، لیکن اس مقالہ میں اسکا اعادہ کرکے ایک اچھی مثال پیش کی گئی ہے،

پہلے جو اچھے نثر نگار ہوتے تھے، وہ خود بخود اچھے شاعر بھی ہو جاتے تھے، مقالہ نگار نے اپنے

کی بعض اہم نثری تصانیف کا بڑا اچھا تجزیہ کیا ہے، پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالات لکھنے کے اب خاص خاص
آداب مرتب کر لئے گئے ہیں، جو عام تصانیف سے کچھ علیحدہ ہوتے ہیں، مثلاً جس عہد کی علمی و ادبی
تصانیف زیر بحث لائی جاتی ہیں، اس کے پچھلے سو برس یا اس سے زیادہ مدت کی تاریخی، سیاسی
علمی اور معاشرتی اور ثقافتی سرگرمیوں کا احاطہ بھی ضرور کیا جاتا ہے، اس سے اصل موضوع کو
کچھ مدد ضرور مل جاتی ہے، مگر مدد پہنچانے سے زیادہ مقالہ نگار کو تحریری، تحقیقی اور
ذہنی ورزش کرانا زیادہ مقصود ہوتا ہے، جو بعض اوقات اعتدال سے اتنا زیادہ تجاوز کر جاتا
ہے کہ اصل موضوع کے لئے محنت و کاوش میں کمی پیدا ہو جاتی ہے، زیر نظر کتاب میں بھی ایک تمہید کے
بعد پہلا باب غزنویوں کے عہد میں فارسی لٹریچر، اور دوسرا باب تیرھویں صدی کے سیاسی، معاشرتی، ثقافتی
اور علمی جائزہ پر ہے، اور دوسرے مقالہ نگاروں کی طرح یہ دونوں ابواب زیادہ طویل نہیں ہونے
پائے ہیں، اختصار اور جامعیت کے ساتھ تمام ضروری باتیں قلمبند کر دی گئی ہیں، بعض مقامات پر
نتائج کے استنباط کرنے میں مقالہ نگار کی پختگی رائے کا اظہار ہوتا ہے، جو اس لئے قابل تعریف ہے کہ یہ انکی
پہلی علمی اور تحقیقی کاوش ہے،

اصل موضوع پر تیسرے باب میں فخر مدبر، حسن نظامی نیشاپوری (بسطامی) محمد عوفی، منہاج الدین
الجوزجانی کے حالات زندگی کے ساتھ ان کی تصانیف کا تجزیاتی مطالعہ ہے، چوتھے باب میں اس
زمانہ میں عربی سے فارسی میں جو ترجمے ہوتے گئے، ان پر تبصرہ ہے، ان ترجموں میں چچ نامہ مترجمہ
علی بن حامد بن ابی بکر کوفی، احیاء العلوم مترجمہ مجد الدین ابو المعالی سعید بن محمد جرجانی، البیرونی کی
کتاب الصیدنہ مترجمہ ابوبکر کاسانی یا کاشانی کا ذکر ہے، موخر الذکر کتاب کا نام البیرونی کی تصانیف کی فہرست
میں نظر سے نہیں گذرا، لیکن مقالہ نگار نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، کہ یہ البیرونی ہی کی تصنیف
ہے، جو اس نے بہت بعد میں لکھی، مگر خود اس کی تیار کی ہوئی تصانیف میں اس کا ذکر نہیں

مطبوعاتِ جدیدہ

ارمغانِ مالک (دو جلدیں): مرتبہ جناب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۱۳، مجلد مع گرد پوش، قیمت ... پتہ (۱) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، دہلی، (۲) علمی مجلس، چھتا نواب صاحب، فراشخانہ، دہلی۔

اردو کے مشہور مصنف اور غالبیات کے ماہر جناب مالک رام صاحب کو انکی پینسٹھویں ۶۵ سالگرہ کے موقع پر ان کے احباب نے اردو اور انگریزی مضامین کا یہ مجموعہ نذر کیا ہے، یہ مجموعہ دو جلدوں میں ہے پہلی جلد کے ابتدائی چار مضامین میں مالک رام صاحب کے حالات و سوانح اور علمی و تصنیفی کارناموں کا ذکر ہے، انکے علاوہ دس مضامین اور ہیں، دوسری جلد میں سترہ ۱۷ مضامین ہیں، ایک مضمون کابل کے آقای محمد اسماعیل مبلغ کا فارسی میں ہے، یہ مختلف النوع علمی، ادبی، تحقیقی اور لسانی مضامین مفید اور پر از معلومات ہیں، مسعود حسن رضوی ادیب، قاضی عبد الودود، امتیاز علی عرشی، ڈاکٹر نذیر احمد اور ڈاکٹر نصیر احمد کے مضامین تحقیقی حیثیت سے اہم اور بلند پایہ ہیں، اقبال اور کارل مارکس (جگن ناتھ آزاد) جامع اور پر مغز مضمون ہے، رادھا کرشنن اور اقبال (یوسف سلیم چشتی) بھی قابل ذکر ہے، ڈاکٹر سید عابد حسین، ڈاکٹر

موضوع کے نثر نگاروں کی شاعری پر بھی مختصر تبصرہ کیا ہے لیکن ان کی شاعری پر تبصرہ کرنا ان کے موضوع سے باہر تھا، اس لئے سرسری ذکر کرنے ہی پر اکتفا کیا ہے،

آخر میں ملفوظات خواجگان چشت پر بھی تبصرہ ہے جو اس لحاظ سے قابل قدر ہے کہ مقالہ نگار نے بڑی خوبی سے اس کا تجزیہ کیا ہے۔ کہ کچھ لوگ ان کو بالکل جعلی قرار دیتے ہیں، اور کچھ لوگ ان کو بالکل اصلی سمجھتے ہیں، ان دونوں کو وہ انتہا پسند قرار دیتے ہیں کچھ لوگ ایسے ہیں جو ان کو نہ جعلی اور نہ اصلی سمجھتے ہیں، بلکہ ان کے متعلق خاموشی اختیار کر لی ہے لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ان ملفوظات میں کچھ چیزیں بعد میں اضافہ کر دی گئی ہیں لیکن مجموعی حیثیت سے وہ جعلی نہیں ہیں، مقالہ نگار نے آخر الذکر لوگوں ہی کی رائے کو زیادہ ترجیح دی ہے، ان کا یہ تبصرہ اس لحاظ سے قابل تعریف ہے کہ علی گڈھ میں رہ کر انھوں نے علی گڈھ کے ان اہل الرائے کے خلاف آواز اٹھائی ہے، جو ان ملفوظات کو بالکل ہی فرضی اور جعلی قرار دیتے ہیں،

یہ مقالہ انگریزی میں ہے، اس کے لب ولہجہ میں بڑی متانت اور سنجیدگی ہے، مقالہ نگار نے اسکو اہل علم کے سامنے پیش کر کے اپنی تحقیقی اور علمی صلاحیت کا ثبوت دیا ہے، امید ہے کہ آئندہ وہ اس سے بہتر تحقیقی اور علمی کاوش کے نمونے پیش کر کے اپنی اندرونی صلاحیت کا صحیح مصرف لیں گے، کتاب علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کی طرف سے شائع ہوئی ہے قیمت کہیں درج نہیں،

تفسیر ماجدی کے خریداروں کیلئے غیر معمولی رعایت

تفسیر ماجدی کے خریداروں کی سہولت کے لئے صدق جدید بک ایجنسی اسکی خریداری پر ۲۵ فیصدی کمیشن دیگی، تاجروں کو خاص طور سے اس رعایت سے فائدہ اٹھانا چاہیے،

منیجر صدق جدید بک ایجنسی کچہری روڈ لکھنؤ

رجسٹرڈ نمبر ال (۵۲۰)

جولائی ۱۹۷۳ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

……ـــ……

قیمت دس روپے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کتبہ سید اقبال احمد)

محمد زبیر صدیقی، خواجہ غلام السیدین مرحوم، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، ڈاکٹر محمد حمید اللہ
مولانا عبد السلام خاں رامپوری، ڈاکٹر شوکت سبزواری، محمد عبد الرحمن
چغتائی، ڈاکٹر محمد عبد اللہ چغتائی، سید صباح الدین عبد الرحمن، مولانا سعید احمد
اکبرآبادی، علی جواد زیدی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وغیرہ مشاہیر ارباب علم و قلم اور خود فاضل
مرتب کے مضامین بھی اس یادگار مجموعہ میں شامل ہیں، یہ مجموعہ مالک رام صاحب جیسے
ادیب و محقق کے علمی و ادبی خدمات کے اعتراف کی مفید یادگار اور اصحاب علم و ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے۔

نغمہ و الہام مرتبہ جناب میر کاظم علی صاحب برق موسوی تقطیع خورد،
کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۴۰، مجلد قیمت ۳ رپتہ کاچی گوڑہ گڈر،
حیدرآباد، آندھرا پردیش،

جناب برؔق موسوی پُرگو شاعر ہیں، ان کو اردو فارسی دونوں زبانوں میں
دسترس حاصل ہے اور وہ دونوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ اردو میں انکے کئی منظوم
مجموعے چھپ چکے ہیں، زیر نظر مجموعہ بادۂ شیراز کی لطافتوں سے معمور نظموں، غزلوں،
رباعیات اور حضرت علیؓ کے قصائد منقبت پر مشتمل ہے، اس میں زیادہ تر اخلاقی اور
حکیمانہ مضامین سادہ اور موثر انداز میں بیان کئے گئے ہیں، کلام ابتذال و
رکاکت سے پاک اور فکر و خیال کی پاکیزگی و بلندی اور طرز ادا کی لطافت
و دلکشی سے معمور ہے، منقبت کے قصائد میں مفرط عقیدت کے علاوہ مصنف
کے مسلک و عقیدہ کی جھلک بھی ملتی ہے جس سے دوسرے مسلک کے لوگوں
کو اتفاق نہیں ہو سکتا، جناب برؔق کا یہ ذوق ادب قابل داد ہے کہ اس زمانہ
میں جب فارسی کا مذاق اٹھتا جارہا ہے انھوں نے یہ بھولا ہوا سبق یاد دلایا ہے۔
"ض"

جلد ۱۲ ماہ جمادی الثانی ۱۳۹۳ھ مطابق ماہ جون ۱۹۷۳ء عدد ۱

مضامین

شذرات — شاہ معین الدین احمد ندوی — ۲-۴

مقالات

ملا محمود جونپوری — جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی — ۵-۲۶

قرآن پاک اور مرزا غالب — جناب پروفیسر مسعود حسن صاحب صدر شعبۂ عربی، مولانا آزاد کالج، کلکتہ — ۲۷-۴۴

خریطۂ جواہر — شاہ معین الدین احمد ندوی — ۴۵-۵۰

تلخیص و تبصرہ

ایک عالمی طبی کانفرنس (بعض مسائل حاضرہ پر بحث) — مترجمہ مولوی محمد ایوب صاحب استاذ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر — ۵۷-۶۲

باب التقریظ والانتقاد

"دیوان سراجی خراسانی" — جناب ڈاکٹر معتصم عباسی آزاد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ — ۶۳-۶۶

مطبوعات جدیدہ:- "م- ض" — ۶۷-۸۰

اللہ۔۔۔۔۔ انھوں نے اُس کی طرف توجہ کی ہے، اتر پردیش کی حکومت، اس سے پہلے اردو اکیڈمی قائم کر چکی ہے، جو مختلف طریقوں سے اُردو کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے، اب اُس نے پرائمری اسکولوں سے لیکر ڈگری کالجوں تک میں اُردو کی تعلیم کا انتظام کیا ہے، اور بعض دوسرے محکموں میں بھی اُس کو کچھ حقوق دیئے ہیں جن کی تفصیل اخبارات میں شائع ہو چکی ہے، اس میں شبہ نہیں کہ اب اردو کو پہلے کے مقابلہ میں بہت سے حقوق مل گئے ہیں، اگر اُن پر پورا عمل ہوا تو اردو کو قدم جمانے کا موقع مل جائے گا،

مگر پچیس ۲۵ سال میں اردو اتنی پچھڑ چکی، بلکہ قریب قریب ختم ہو چکی ہے کہ اُس کی تلافی آسان نہیں ہے دوسرے حکومت کی نیت کتنی ہی نیک ہو لیکن اُس کے پورے عملہ کی ذہنیت اردو کے بارہ میں بہت خراب ہے، اس سے اندیشہ ہے کہ وہ اب بھی اس طرح کی رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوشش کرے گا کہ اس کی گرفت آسان نہ ہوگی، مگر اس وقت حکومت اُردو کی تعلیم چاہتی ہے اس لئے اگر اُردو والے مستعدی سے کام لیں تو یہ رکاوٹیں دور ہو سکتی ہیں، سب سے بڑی رکاوٹ معاشی ہے، جب تک کسی زبان سے معاشی فائدہ متعلق نہ ہو محض زبان کی خاطر اُس کے پڑھنے والے مشکل سے ملیں گے، اس لئے ان طول طویل انتظامات کے مقابلہ میں آسان شکل یہ ہے کہ اُردو کو اس صوبے کی دوسری سرکاری زبان بنا دیا جائے، جو اُردو والوں کا اصل مطالبہ ہے، ورنہ کم از کم اس کی متوسط تعلیم لازمی کر دی جائے، بڑی ملازمتوں کے لئے اُردو سے واقفیت ضروری قرار دی جائے، اور اُن کے امتحانات میں ایک پرچہ اردو کا بھی رکھا جائے، اس کے بغیر اردو کی تعلیم کا مسئلہ پوری طرح حل نہ ہوگا،

تاہم سردست حکومت نے اُردو کی تعلیم کا جو انتظام کیا ہے اور اس کو جو سہولتیں دی ہیں اُن سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے، اس سے اور راہیں بھی کھلیں گی، اس لئے اُردو کے تمام بہی خواہوں اور اُس کی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرکزی حکومت کے پرانے ارکان میں پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام اور ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم سے دارالمصنفین کے بزرگوں کے پرانے تعلقات تھے، اس لئے اُن کے زمانہ میں مختلف موقعوں پر حکومت ہند نے دارالمصنفین کی مدد کی، مگر اترپردیش کی حکومت سے ہمیشہ بیگانگی رہی، اُس نے صرف دارالمصنفین کی جوبلی کے موقع پر دس ہزار روپیے دیئے تھے، اترپردیش کے موجودہ گورنر عالیجناب اکبر علی خاں صاحب نہ صرف دارالمصنفین کے کاموں اور اسکی اہمیت سے پوری طرح واقف ہیں، بلکہ دارالمصنفین کے پرانے ارکان سے اُن کے تعلقات رہ چکے ہیں، اور وہ خود بھی علم دوست اور علم نواز ہیں، اب سے چند مہینے پہلے جب موصوف اعظم گڈھ کے دورے پر آئے تھے، تو خاص طور سے دارالمصنفین کو دیکھنے کے لئے تشریف لائے، اور اُس کے کاموں کو دیکھکر مسرور ہوئے اور بعض مفید مشورے بھی دیئے، اور اُس کی مالی حالت سُن کر حکومت اترپردیش سے اس کے لئے ایک لاکھ کی امداد کی سفارش کی، اور اپنے قلم سے اس کی منظوری دی، یہ امداد قلمی نسخوں کے تحفظ کے لئے ملی ہے جس میں تعمیر بھی شامل ہے، جو اسی مصرف میں صرف ہوگی۔ دارالمصنفین کے کارکن اور اس کی مجلس انتظامیہ کے ارکان اس گراں قدر عطیہ کے لئے عالیجناب اکبر علی خاں صاحب اور حکومت اترپردیش کے دل سے شکر گذار ہیں، اتنی بڑی رقم دارالمصنفین کو پہلی مرتبہ ملی ہے، جس سے اترپردیش کی حکومت کی بے توجہی کی پوری تلافی ہوگئی، اس کا جس قدر بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے،

ایک مدت کے بعد اب مرکزی اور اترپردیش کی حکومت کو اُردو کی حق تلفی کا احساس ہوا ہے

مقالات

ملا محمود جونپوری

از مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری ایڈیٹر البلاغ بمبئی

(۳)

علمی چشمک | ملا محمود فاروقی اور دیوان محمد رشید عثمانی استاذ الملک ملا محمد افضل عثمانی کی دو آنکھیں تھے، وہ فرمایا کرتے تھے کہ میرے دونوں شاگرد علم و کمال میں تفتازانی اور جرجانی کے درجہ کے ہیں، یہ دونوں طالب علم ملا محمد افضل کی درسگاہ کے آفتاب و ماہتاب تھے، اور اثنائے درس میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے، ذہین و طباع طالب علموں کی معاصرانہ چشمک ایک دوسرے کے لئے علمی مہمیز کا کام دیتی ہے، اور اس سے بڑے علمی فوائد حاصل ہوتے ہیں بشرطیکہ یہ معاصرت و مسابقت صرف علم و فن تک محدود ہو، ملا محمود اور دیوان محمد رشید میں اسی قسم کی معاصرت شروع سے تھی، اس سلسلہ میں ایک واقعہ کتابوں میں ملتا ہے کہ ایک دن ملا محمود اور دیوان محمد رشید دونوں اپنے استاد ملا محمد افضل کے مکان پر موجود تھے، ملا محمد افضل اندر سے نکلے تو ان کے ہاتھ میں فن مناظرہ کی مشہور کتاب "شریفیہ" کے دو نسخے تھے، انھوں نے ان دونوں کو ایک ایک نسخہ دیا اور کہا کہ بہت خوب متن ہے، دیوان

تنظیموں کا یہ فرض ہے کہ وہ اردو پڑھنے والے طلبہ فراہم کریں اور اردو مادری زبان کے جو طلبہ زیر تعلیم ہیں اُن کو اردو پڑھنے پر آمادہ کریں، ثانوی اسکولوں میں سہ لسانی فارمولے میں سنسکرت کے بجائے مادری زبان رکھی جائے، جو اس کا اصل مقصد ہے، اس سلسلہ میں ایک مسئلہ اردو میڈیم اسکولوں کا ہے اس کے بغیر مادری زبان میں تعلیم کا مقصد پورا نہیں ہوتا، ہر جگہ تو اس کی ضرورت نہیں ہے لیکن بڑے شہروں میں بقدر ضرورت اردو میڈیم اسکول قائم کئے جائیں، مسلمانوں کے جونیر اور ہائر سکنڈری اسکولوں کے پرائمری درجات کو آسانی سے اردو میڈیم بنایا جا سکتا ہے، جس کی پہلے سے اجازت موجود ہے، ہندی تو ان سب میں لازمی ہوگی، اس لئے آیندہ چل کر ہندی میڈیم کے درجوں میں کوئی زحمت نہ پیش آئے گی اور اگر کچھ ہوئی تو تھوڑی سی محنت سے دور ہو سکتی ہے، اردو کے لئے اتنا تو کرنا ہی پڑیگا، اگر اس وقت بھی اردو والوں نے بے توجہی سے کام لیا، تو حکومت کو یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ وہ تو اردو کی تعلیم چاہتی ہے اردو والے خود ہی پڑھانا نہیں چاہتے، اس سے موجودہ انتظام کو ختم کرنے کا جواز بھی نکل آئے گا، اور اُس کی تعلیم کی جو راہ نکلی ہے، وہ ختم ہو جائے گی، اور آیندہ اردو والوں کو کسی نئے مطالبہ کا حق نہ رہ جائے گا۔

ایک مدت کے انتظار کے بعد ہم ناظرین کو یہ خوشخبری سُنانے کے قابل ہو سکے ہیں کہ الحمد للہ **حیات سُلیمان** چھپ کر تیار ہو گئی ہے، جولائی کے آخر میں شائع ہو جائے گی، اس میں ہندوستان خصوصاً مسلمانوں کی اکیسویں صدی کے نصف اوّل کی پوری تاریخ آگئی ہے، حیاتِ سلیمان کے لئے شائقین کا بڑا تقاضا تھا، دیکھنا یہ ہے کہ وہ اس کا عملی ثبوت کہاں تک دیتے ہیں، مقدمہ فہرست اور انڈکس کو چھوڑ کر کتاب کی ضخامت ۷۳۰ صفحات ہے، قیمت: سترہ روپے۔

مکارم اخلاق اور جاہ و ثروت ملا محمود دیار پورب کے ان چند اعاظم رجال میں تھے جن کو شاہجہاں اور اس کے امراء و وزراء کی خصوصی توجہات حاصل تھیں، شاہجہاں، شاہزادہ محمد شجاع، آصف خاں، شائستہ خاں اور سعد اللہ خاں وغیرہ ان کے عقیدتمندوں میں تھے، مستقل جاگیروں اور وقتی نوازشوں کے علاوہ ملا صاحب کو بادشاہ کیطرف سے منصب سہ صدی ذات حاصل تھا، اور وہ نہایت فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے تھے مگر درس و تدریس کا سلسلہ برابر جاری رہا، جونپور کے مدرسۂ شاہی میں درس دیتے تھے اور امیرانہ انداز سے زندگی گذارتے تھے، حکمت و فلسفہ میں طوسی و دوانی کے حریف اور ادب و بلاغت میں جرجانی اور تفتازانی کے ہمقابل تھے، اس علمی مرتبہ اور دنیاوی وجاہت کے ساتھ اعلیٰ اخلاقی فضائل سے بھی آراستہ تھے، نخوت کا دل میں نام و نشان نہ تھا، مولانا ابوالخیر نے شیر و شکر میں ان کو مکارم اخلاق کا آفتاب بتایا ہے اور لکھا ہے "یگانۂ انفس و آفاق و آفتاب مکارم اخلاق است"

ملا صاحب کی کتاب الفرائد کے مقدمہ سے کچھ عبارتیں ہم نقل کرتے ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ ملا صاحب کے دل میں اپنے محسن شاہجہاں کے لئے امتنان و تشکر کا کتنا جذبہ ہے اور اپنے اساتذہ و خاص طور سے ملا محمد افضل کی کتنی عظمت تھی، اور وہ اپنے تلامذہ کی خیرخواہی و نفع رسانی کے کس قدر حریص تھے، الفرائد کے شروع میں شاہجہاں کی تعریف و توصیف کے بعد لکھا ہے،

وما هو الا الملك القرم الهمام البحر الخضم المقام مجدد الملة على رأس الالف، محتد المعدلة من غير قتر ولا سرف، السلطان بن السلطان بن السلطان الخاقان بن الخاقان بن الخاقان المنصور على العتاة، المظفر على الطغاة في المعارك والمغازي

محمد رشید نے شرنیفیہ کی تعریف اور متن کہنے سے سمجھا کہ استاد اس کی شرح لکھنے کا اشارہ کر رہے ہیں، چنانچہ وہ ایک ہفتہ کے بعد شریفیہ کی شرح رشیدیہ لکھ کر استاد کی خدمت میں حاضر ہوئے، اسے دیکھ کر وہ بہت زیادہ خوش ہوئے، ملا محمود کو اسکی خبر ہوئی، تو ان کے جذبہ معاصرت کو ٹھیس لگی، انھوں نے اپنے شاگرد ملا محمد باقی بن مفتی ابو البقار متوفی ۱۰۸۶ھ سے شریفیہ کی دوسری شرح لکھنے کی فرمائش کی، اور شرح رشیدیہ کے رد کا بھی اشارہ کیا، ملا محمد باقی بڑے عالم و فاضل تھے، انھوں نے قلیل مدت میں شریفیہ کی دو شرحیں لکھ دیں، ایک الآداب الباقیہ فی شرح الشریفیہ اس میں متن شریفیہ کی خالص شرح تھی، دوسری الاجاث البقیہ فی شرح الرشیدیہ، اس میں دیوان محمد رشید کی شرح پر اعتراضات تھے، ملا محمد باقی نے الآداب الباقیہ کے دیباچہ میں اپنے استاد ملا محمود کی دل کھول کر تعریف کی ہے، بعد میں دیوان محمد رشید کے ایک شاگرد نے ردّ الباقیہ کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس میں ملا محمد باقی کے اعتراضات کے جوابات دئے ہیں، اس کا قلمی نسخہ خانقاہ رشیدیہ جونپور میں موجود ہے[1] شیخ نور الدین جعفر بن عزیز اللہ جونپوری متوفی ۱۰۹۳ھ نے ملا محمد باقی کی کتاب الجاث باقیہ کے رد میں ایک کتاب "نور الانوار" کے نام سے لکھی جس میں اپنے استاد دیوان محمد رشید کی طرف سے دفاع کیا ہے، وہ سلسلۂ مداریہ کے مشائخ میں سے تھے، ان کے تلامذہ میں شیخ محمد افضل الہ آبادی، اور شیخ محمد ماہ دیوگامی مشہور ہیں[2]، ان دونوں استاد بھائیوں کی علمی نوک جھونک سے جونپور کے علماء فن مناظرہ کی طرف متوجہ ہوئے، ملا محمد صادق نے الآداب الصادقیہ کے نام سے فن مناظرہ میں ایک کتاب لکھی،

---

[1] تذکرۃ العلماء ص ۴۹، ۵۰، [2] نزہتہ الخواطر ج ۵ ص ۱۱۰، ۱۱۱،

زبان میں ہے اس لئے اس میں ہندی اشعار مثال میں نہیں آسکے ہیں[۱] اور انکی شاعری کے معلق تجلی نور میں ہے،

ملا محمود طبع سخنوری ہم نیکو داشت،	ملا محمود شاعرانہ طبیعت رکھتے تھے، وہ
شاعر ادا بند، وموجد انداز ہائے دل	نہایت اچھے شاعر اور دل پسند طریقوں
پسند بود، محمود تخلص کردی، دو دیوان	کے موجد تھے، کامیاب شاعر تھے، تخلص
فارسی دارد، یکے دیوان شعراء و	محمود تھا، ان کے فارسی اشعار کے دو
دویمیں مستند شعراء،	دیوان تھے، ایک دیوان شعراء اور
	دوسرا مستند شعراء،

ہمارا خیال ہے کہ ملا صاحب کے یہ دونوں دیوان صرف ان کے اشعار پر مشتمل نہیں تھے، بلکہ ان کے ناموں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک میں مختلف شعراء کے منتخب اشعار تھے جن میں ملا صاحب نے اپنے اشعار بھی درج کئے تھے اور دوسرے میں مستند شعراء کے حالات و اشعار تھے، ان کے چند اشعار یہ ہیں:-

ہر آں مے کہ ندارد خمار در لب تست	چہ اودر چشم تو پیوستہ در خمار بود
اشکے کہ راز عشق بگوید فسانہ نی ست	طفلے کہ خوش حکایت افتد نہ اندنی ست
خط کرد ظاہر آں دہن غنچہ رنگ را	در کار بود حاشیہ این متن تنگ را
بر صوفی بے وجد وبال است عبادت	بر تشنہ کہ خالی ست تنے سجدہ حرام است
ریخت کافر بچۂ خون مسلماں را	یاد آں روز کہ من نیز مسلمان بودم
سبب چاک گریبان من خستہ مپرس	کہ شب غم باجل دست و گریباں بودم[۲]

[۱] آثار الکرام ج ۱ ص ۲۰۳، وسبحۃ المرجان ص ۵۴؛ [۲] تجلی نور ج ۲ ص ۴۹؛

ابوالمظفر شہاب الدین محمد الصاحب القرآن الثانی، شاہجہاں بادشاہ الغازی، لازال نظام العالم منوطاً بحقوی سلطنۃ وصلاح بنی آدم مضبوطاً بیدی دولۃ ما دام تیسیر وسمر ابناسمیر فان نفقت بحضرتہ بضاعتی نیا لہا من سعادۃ وقد ما قیلت من الخطۃ سجل جرادۃ واللہ سبحانہ اسأل ان یصلح ناسدی وینفق کاسدی، ویکنفنی برحمتہ، ویبوء فی فی جنتہ ویجزی عنی افضل جزاء سائذتی الافضل منہم فالافضل وینفع بکتابی تلامذتی الامثل منہم فالامثل، انہ علی کل شیء قدیر، وباجابۃ دعاء السائلین جدیر، [1]

ملا صاحب نے الفرائد جوانی میں لکھی تھی، جب اس زمانے میں ان کے حسن اخلاق، خلوص نیت اور صفائی باطن کا یہ حال تھا تو آگے چل کر ان کا کیا مقام رہا ہوگا؟

زندہ دلی اور شاعری | ملا محمود بھی حکماء و فلاسفہ کی طرح نازک خیال مگر زندہ دل آدمی تھے، حکمت و فلسفہ اور شعر و ادب کا اجتماع بہت کم ہوتا ہے، مگر ملا صاحب جتنے بلند پایہ حکیم و فلسفی تھے، اس پایہ کے شاعر اور ادیب بھی تھے، انکی زندہ دلی کا ثبوت ان کا ایک چھ ورقہ رسالہ نایکا بھید فارسی زبان میں ہے اس میں بقول آزاد بلگرامی عورتوں کی قسمیں بیان کی ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ اہل ہند نے ناز و انداز عمر اور مراتب الفت و محبت کے اعتبار سے معشوق کی مختلف قسمیں کی ہیں اور انکا الگ الگ نام رکھا ہے اور اس کے مطابق اشعار کہے ہیں اور اس طرح معشوقہ کے ہر دور اور ہر حال کا سراپا بیان کیا ہے، چونکہ یہ رسالہ فارسی

---

[1] الفرائد فی شرح الفوائد ص ۶ و ۷،

کے ساتھ مخصوص ہیں، مولانا عبد الحئی فرنگی محلی نے شرح مواقف کے حواشی میں اس اعتراض کا جواب دیا ہے جس کا خلاصہ ان ہی کے الفاظ میں یہ ہے کہ ملا صاحب کا ماقبل الطبیعہ کو طبیعات میں شمار کرنا فلاسفہ اور حکماء کی عرف واصطلاح کی رو سے نہیں ہے بلکہ درحقیقت طبیعات کے مباحث فن الہیات ہی سے متعلق ہیں، مگر مرتبہ کے لحاظ سے طبیعات کی بحث الہیات کی بحث سے پہلے ہے اس اعتبار سے ماقبل الطبیعیات کی بحث فن طبیعات سے متعلق ہے، [1]

ملا صاحب کا دوسرا شاہکار الفرائد اور اس کا حاشیہ ہے جس سے ادب اور فصاحت و بلاغت میں تبحر کا اندازہ ہوتا ہے، مولانا غلام علی آزاد کی شہادت ہے،

وعلق علیه حاشیۃً احسن فیها کل الاحسان وهو شرح جلیل القدر یعرف منه تبحرہ فی علوم الفصاحة طالعته کثیراً ووجدته علی ریاض الادب سحاباً مطیراً [2]

ملا صاحب نے اپنی شرح الفرائد پر خود حاشیہ لکھا جس میں پورا حسن وجمال بھر دیا ہے، یہ حاشیہ جلیل القدر شرح ہے جس سے علم فصاحت و بلاغت میں ان کے تبحر کا پتہ چلتا ہے، میں نے متعدد بار اسکا مطالعہ کیا ہے اور اسے ادب کے چمن پر برستا ہوا بادل پایا ہے،

مولانا عبد الحئی فرنگی محلی لکھتے ہیں:۔

وعلق علیه حاشیۃ حجمها اکثر من حجم شرحه. واتی منه بعجائب

ملا صاحب نے فرائد پر حاشیہ لکھا ہے جس کا حجم فرائد سے زیادہ ہے اس میں

[1] ترجمہ ملا محمود در آخر شمس بازغہ، [2] سبحۃ المرجان ص ۵۳،

علمی کمالات اور جامعیت | ملا محمود کے علمی وفنی تبحر کے بارے میں ان کے تذکرہ نویسیوں اور دوسرے اہل علم وفن کے اقوال وتاثرات پہلے بیان ہو چکے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ملا صاحب جملہ علوم عقلیہ ونقلیہ میں عبقریت وامامت کا درجہ رکھتے تھے، اور عرب وعجم میں کوئی شخص علوم وفنون کی جامعیت خاص طور سے حکمت وادب میں انکا کوئی ہمسر نہ تھا، وہ ان دونوں علوم میں بیک وقت میر سید شریف جرجانی وشیخ عبد القاہر جرجانی رازی ودوانی اور سکاکی وتفتازانی تھے اور کہنے والوں نے تو یہاں تک کہدیا ہے کہ ہندوستان میں اسلام کی آمد کے بعد سے فلسفہ اور حکمت میں ملا محمود جیسا کوئی عالم پیدا ہی نہیں ہوا، ملا صاحب کے علمی کمالات کا اندازہ کرنے کے لئے اگر حکمت وفلسفہ کے ساتھ ادب وبلاغت کا ذوق بھی ہو تو ان کی دونوں کتابوں یعنی شمس بازغہ اور فرائد کا مطالعہ کرنا چاہئے ان کے اقران ومعاصرین میں سے کسی کو ان کی کسی کتاب پر اور اس کی عبارت پر انگلی اٹھانے کی جرارت نہ ہوئی، البتہ بعض اہل علم نے شمس بازغہ کے مقدمہ کی اس عبارت

سودت کثیراً من مباحث ما قبل الطبیعۃ وبقی اکثر واملیت من مطالب ما بعد الطبیعۃ الاقل الاندر	میں نے ما قبل الطبیعات کے بہت سے مباحث کا مسودہ تیار کر لیا، مگر اس کا اکثر حصہ رہ گیا تھا اور ما بعد الطبیعات کے چند مسائل کا املا کرایا تھا،

پر یہ اعتراض کیا ہے کہ ملا صاحب نے ما قبل الطبیعیات کے مباحث کو فن طبیعات میں شمار کیا ہے، حالانکہ ما قبل الطبیعات اور ما بعد الطبیعیات کے مسائل فن الٰہیات

خطرناک مرض کا حملہ ہوگیا جس نے کوچ کا طبل بجا دیا، اس وقت ماقبل الطبیعۃ کی بحث کا جو مسودہ تیار کیا تھا میرے مقررہ معیار کے تقریباً مطابق تھا اور مابعد الطبیعۃ کے جو مباحث لکھے تھے وہ بھی اس کتاب کے معیار کے قریب تھے، چنانچہ میں نے ان ہی پر ابواب قائم کئے، البتہ مابعد الطبیعۃ کے کچھ مسائل ایک دوسرے سے متعلق تھے اور ان کے نظم و ترتیب کے لئے وسعت درکار تھی، اس لئے جو مباحث مبادی اجسام سے تعلق رکھتے ہیں ان کو میں نے ایک علیحدہ رسالہ میں بیان کیا ہے جسکا نام "الدوحۃ المیادۃ فی حدیقۃ الصورۃ والمادۃ" ہے[1] اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ شمس بازغہ جیسی عظیم کتاب کی تصنیف کے وقت ملا صاحب کا حال یہ تھا کہ کنت ادبّ فی التالیف دبیباً۔ وان للدھر فی تقریب حامی ارقالاً و تقریباً، ورنوبت یہاں تک پہونچی کہ ھجم المرض الوبیل وضرب علی طبل الرحیل، معلوم نہیں مرض کا یہ ہجوم ذہنی تھا یا مزمن ثابت ہوا، البتہ ملا صاحب کے بیان سے اسکی شدت کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔

وفات ۱۰۶۲ھ ملا محمود کی وفات جونپور میں ۹ ربیع الاول ۱۰۶۲ھ میں ہوئی، مآثر الکرام میں ہے رحلت ملا محمود نہم ربیع الاول سنۃ اثنتین وستین والف (۱۰۶۲ھ) اتفاق افتاد (ص ۲۰۳) اور سبحۃ المرجان (ص ۵۳) تجلی نور (جلد ۲ صفحہ ۵۱) اور تذکرہ علمائے ہند (صفحہ ۲۲۱) میں بھی یہی ہے، البتہ تذکرۃ العلما صفحہ ۸۴ میں صرف ۱۰۶۲ھ ہے تاریخ و ماہ درج نہیں ہے، یہ بھی لکھا ہے کہ عین شباب میں وفات ہوئی جو خلاف واقعہ ہے، نزہۃ الخواطر جلد ۵ صفحہ ۳۹۹ میں بھی ۹ ربیع الاول ۱۰۶۲ھ ہے، ان تصریحات کے علی الرغم ہمارے استاذ الاستاذ مولانا محمد شریف مصطفےٰ آبادی نے الافاضۃ القدسیہ

---

[1] شمس بازغہ ص ۲

تنشط بها الاذهان، وتفرح بسماعها الاذان، ؎ | انھوں نے ایسی عجیب وغریب باتیں بیان کی ہیں جن سے ذہنوں کو نشاط اور کانوں کو فرحت حاصل ہوتی ہے،

امراض کا ہجوم ملا محمود کی پوری زندگی عیش وتنعم میں گذری تھی، ان کے پدری ومادری خانوادے پشتہا پشت سے شاہی نوازشوں سے بہرہ ور تھے، وہ اگرچہ بارہ سال کی عمر میں شفقت پدری سے محروم ہوگئے تھے مگر نانا کی شفقت ومحبت سے نہایت آرام سے یتیمی کے دن گذارے، سترہ سال کی عمر میں فراغت کے چند ہی سال بعد شاہجہاں اور امرائے دولت کی قدردانی نے ان کو دربار شاہی میں پہونچا دیا، مستقل منصب ووظیفہ اور جاگیر کے علاوہ مختلف تقریبات میں علحدہ انعامات ملتے تھے جس سے انکی زندگی بڑی فراغت اور عیش سے بسر ہوتی تھی، مگر آخر میں ان کو امراض واسقام کے ہجوم نے گھیر لیا جس سے ان کے تعلیمی وتصنیفی مشاغل میں خلل پیدا ہونے لگا، خاص طور سے شمس بازغہ کی تصنیف کے زمانہ میں شدید مرض میں مبتلا تھے جس کی وجہ سے کتاب کے بعض مباحث پر بعد میں مستقل کتاب لکھنی پڑی، شمس بازغہ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ میں نے ایک عمدہ متن اور اس کی نفیس شرح لکھنی شروع کی تھی متن کا نام الحکمۃ البالغہ اور شرح کا نام الشمس البازغہ رکھا، مگر تالیف وتصنیف میں چیونٹی کی چال چلتا تھا اور زمانہ میری موت کو قریب کرنے کے لئے دوڑ رہا تھا، اسی درمیان میں ماقبل الطبیعیہ کے بہت سے مباحث کا مسودہ تیار کر لیا، پھر بھی اکثر وبیشتر مباحث رہ گئے اور مابعد الطبیعۃ کے کچھ مسائل لکھے لکھائے کہ اچانک

؎ ترجمہ ملا محمود در آغاز شمس بازغہ،

یکے آمد و دیگرے می رود　　ہمیشہ ہنجارِ لیل و نہار
ترا شید روئے بقا بہر سال　　بیفزود دور ابد و چار چار

ملا صاحب اپنے مولد و منشا اور مدفن جونپور کے محلہ چاچک پور میں دفن کئے گئے، جہاں انکا پختہ مزار موجود ہے، اور ان کی اولاد بھی وہاں آباد ہے[۱]

ملا محمد دائم بن ملا محمود | ملا صاحب کی ایک صلبی اولاد کے علاوہ کسی کا تذکرہ ابتک نظر سے نہیں گذرا ملا محمد دائم قادری جونپوری کے بارے میں صاحب تجلی نور نے تصریح کی ہے کہ از اولاد ملا محمود جونپوری است، اور لکھا ہے کہ انھوں نے علوم متداولہ وفنون رسمیہ کی تحصیل اپنے دیار کے علماء سے کی تھی، اور اپنی ذہنی استعداد اور فکری قوت کی وجہ سے تھوڑی مدت میں علم وفضل میں کمال پیدا کرکے عقلی و نقلی علوم میں شہرت کے مالک ہوگئے، ابتدا میں تدریس و تدریس کا مشغلہ رکھتے تھے مگر آخر میں علائق دنیا سے الگ ہوکر گوشہ نشین ہوگئے تھے، رات دن میں ایک گھنٹہ سے زیادہ نہیں سوتے تھے، صائم الدہر اور قائم اللیل تھے، صرف ظہر کی نماز کے لئے حجرہ سے باہر آتے تھے، نماز کے بعد تھوڑی دیر لوگوں سے ملاقات کرتے تھے، سلسلۂ قادریہ کے مشائخ اور دوسرے سلاسل کے درویشوں کی نسبت کے آثار و برکات ان پر نمایاں تھے، جونپور میں وفات پائی، تاریخ وفات اور مدفن کی تحقیق نہیں ہوسکی[۲]۔ ملا صاحب کی اولاد میں بعد میں بھی علماء و فضلاء پیدا ہوئے،

تلامذہ | ملا محمود نے ۱۰۳۲ھ سے ۱۰۶۲ھ تک کی زندگی تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف میں بسر کی، اس تیس سالہ درس میں صدہا تلامذہ ان کی درسگاہ سے فارغ

---

[۱] تجلی نور ص ۵۱، [۲] ایضاً ج ۲ ص ۵۲،

فی المباحث الحکمیہ کے مقدمہ ص۱۶ میں ملا صاحب کی وفات ۱۰۳۲ھ میں درج کی ہے جو سراسر خلاف واقعہ ہے، ملا صاحب کی ولادت رمضان ۱۰۱۵ھ میں اور وفات ربیع الاول ۱۰۶۲ھ میں ہوئی، اس حساب سے ان کی عمر وفات کے وقت ۴۷ سال کی تھی، اس لئے نہ عین شباب تھا اور نہ شباب ہی تھا۔ اور اگر تجلی نور اور نزہتہ الخواطر کی روایت کے مطابق ان کی ولادت ۹۹۳ھ میں مان لی جاتے تو مدت عمر ۶۹ سال ہوگی، مگر پہلا تخمینہ صحیح ہے۔

ملا صاحب کی وفات علم وفن کی وفات تھی اس لئے ارباب علم وفن میں آپ کا بڑا ماتم ہوا، ان کے استاد ملا افضل کو اپنے شاگرد رشید کی وفات پر اسقدر رنج وغم ہوا کہ چالیس دن تک ان کے لب پر مسکراہٹ نہ آسکی اور اس غم میں وہ بھی انتقال فرما گئے، کہنے والے نے استاد وشاگرد کی موت پر یہ تاریخ وفات کہی،

"زمحمود وافضل بگو آہ آہ" [1]

۱۰۶۲

تجلی نور کے مصنف سید نور العین زیدی ظفرآبادی نے ملا صاحب کی وفات پر یہ تاریخی اشعار لکھے ہیں،

دریغا ز دنیائے ناپائدار	سفر کرد محمود عالی تبار
تہی شد زمانہ ز علم و ہنر	بجز جاہلے نیست کے غمگسار
زمیں گرد شد، آسمان نیلگوں	سیہ گشت گیتی جہاں سوگوار
رگ ابر را اشکباری ہنوز	دم برق در ماتمش بے قرار
بس اے زیدئ دل حزیں بس خموش	بقا ذات باری جہاں بے مدار

[1] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۰۳، تذکرۃ العلماء ص ۴۸، تذکرہ علمائے ہند ص ۲۲۱،

وافادہ کی خدمت انجام دی، جہانگیر نے ان کو ایک گاؤں جاگیر میں دیا تھا، جس سے ہر سال آٹھ نو روپیہ کی آمدنی ہوتی تھی، ۲۰ ربیع الثانی ۱۰۸۶ھ میں وفات پائی، ان کی قبر جونپور کے محلہ گنج میں منشی امام بخش کی مسجد کے شمال میں بلندی پر موجود ہے، نزہۃ الخواطر میں ان کا نام عبد الباقی بن غوث الاسلام صدیقی جونپوری ہے[1]

ملا شیخ محمد صادق بہ ونوی جونپوری | ملا محمد صادق بن شمس نور بہ ونوی جونپوری نے ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار مفتی شمس نور سے حاصل کی، باقی کتابیں ملا محمود سے پڑھ کر ان کی درسگاہ سے سند فراغ پائی، اور والد کے انتقال کے بعد ان کی جگہ مفتی اور ان کے مدرسہ کے مدرس ہوئے، عالم باعمل اور زہد وتقویٰ میں یکتا تھے، طبیعت میں توکل اور فقر واستغنا تھا، دنیا اور اہل دنیا سے دور رہتے تھے، ایک مرتبہ ملا رکن الدین بحریابادی غازی پوری امیر الامراء نواب شائستہ خاں کی ملازمت کے زمانہ میں وطن آئے تو نہایت قیمتی شال ملا محمد صادق کی خدمت میں پیش کرکے حق استادزادگی ادا کرنا چاہا، ملا صاحب نے یہ کہہ کر اسے واپس کر دیا، "من دلق رابہ اطلسِ شاہان نمی خرم" فقیر را گلیم بس است لائق شال خود را نمی انگارم"

ایک مرتبہ حاکم جونپور نواب اللہ وردی خاں نے کوئی بات لکھی جو از روئے شریعت غلط تھی، اور اس کو مفتی محمد صادق کی خدمت میں مہر تصدیق ثبت کرنے کے لئے بھیجا، ملا صاحب نے صاف انکار کر دیا، اس کے بعد

---

[1] تجلی نور ج ۲ ص ۲۶، نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۱۹۵۔

ان کی علمی شہرت سے دور دور سے طالبانِ علم ان کی خدمت میں آے ہوئے، اور ان کے خزانہ علم سے اپنا اپنا حصہ لے کر واپس ہوگئے، ان کے شاگردوں میں بادشاہ شاہجہان، شاہزادہ محمد شجاع اور وزرا و امرا میں آصف خاں، شائستہ خاں، سعد اللہ خاں جیسے ارباب جاہ وحشم بھی شامل ہیں، ان میں ایک بڑی تعداد ان سے فیضیاب ہوئی ہے، ان میں چند مشہور تلامذہ یہ ہیں۔

ملا محمد باقی جونپوری رح ملا محمد باقی بن مفتی ابو البقا بن ملا محمد درویش جونپوری ابتدائی دور میں زہد و تصوف کی طرف مائل تھے، مگر بعد میں ملا محمود کی خدمت میں آکر تحصیل علم کی اور سرتاج علمائے عظام اور سراج حکمائے اسلام بن گئے، ملا صاحب نے ان کی ذکاوت و ذہانت کی بنا پر خصوصی توجہ فرمائی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ،

بہ اندک زمانہ از ابتدا تا انتہا چناں رسانید کہ از مرتاضانِ شاگردانِ ملا محمود گشت،

ملا صاحب نے ان کو تھوڑے زمانہ میں ابتدا سے انتہا تک یوں تعلیم دیدی کہ وہ ان کے مخصوص و ممتاز تلامذہ میں شمار کئے گئے،

ملا محمد باقی تمام علوم عقلیہ و نقلیہ کے جامع تھے، مگر ریاضی اور حکمت میں امتیازی مقام رکھتے تھے، ان کی گفتگو اور خطابت میں بڑا زور تھا، اپنی شیریں بیانی اور طلاقت لسانی سے سامعین کو ہمہ تن گوش بنا دیتے تھے، ان کے کمالات کی وجہ سے ان کا لقب "فاضل جونپوری" پڑ گیا تھا، اور انھوں نے اپنے استاد کے اشارہ پر الآداب الباقیہ اور الابحاث البقیہ دو کتابیں دیوان محمد رشید کی شرح شریفیہ کے مقابلہ میں لکھی تھیں، اور استاد کے وصال کے بعد ان کی جگہ تدریس

ملا عبدالجلیل بردنوی جونپوری | ملا عبدالجلیل بن ملا شمس نور بردنوی جونپوری ملا محمد باقی کے بھائی ہیں، انھوں نے تمام کتب درسیہ من اولہ الی آخرہ اپنے والد ملا شمس الدین بن نور الدین سے پڑھیں اور بعض مشکل مسائل میں ملا محمود اور دیوان محمد رشید سے استفادہ کیا (بعض بعض مشکلاتِ مسائل را پیش ملا محمود راست نمود)، تمام علوم متداولہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے، اور نہایت محققانہ انداز میں درس دیتے تھے، زہد و تقویٰ میں ممتاز تھے، عام طور سے مسلسل روزہ رکھتے تھے، اور پوری رات عبادت و ریاضت میں گذارتے، ان کو شاہ عبدالجلیل لکھنوی اور شیخ عزیز الحق دہلوی سے ارادت و خلافت حاصل تھی، ۸ رشوال ۱۰۷۶ھ میں انتقال ہوا، ان کا مزار جونپور میں ملا محمد صادق کے مزار کے برابر ہے،[1]

مولانا عطاء اللہ اصفہانی گھوسوی | مولانا شیخ عطاء اللہ بن قاضی حبیب اللہ عثمانی اصفہانی گھوسوی ملا محمود کے آبائی وطن کے قریب گھوسی کے رہنے والے تھے، ان کے والد قاضی حبیب اللہ عثمانی گھوسوی میر علی عاشقان سرائمیری کے خلفاء میں تھے، مولانا عطاء اللہ گھوسی میں پیدا ہوئے اور وہیں پروان چڑھے، ملا محمود اور دوسرے علماء سے تعلیم حاصل کرکے شیخ عبدالقدوس بن عبدالسلام جونپوری سے طریقت حاصل کی، فقہ، اصول فقہ اور علم کلام کے مشاہیر علماء میں تھے، نہایت متقی اور دیندار عالم تھے، ۵ ربیع الثانی ۱۰۶۳ھ میں لکھنؤ میں انتقال کیا اور وہیں دفن کئے گئے،[2] ان کے صاحبزادے شیخ غلام نقشبندی گھوسی لکھنوی، متوفی ۱۱۲۶ھ مدفون لکھنؤ تھے جو اپنے زمانہ میں کبار علماء و اساتذہ میں سے تھے،

---

[1] تجلی نور ج ۲ ص ۶۵، [2] نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۲۷۴،

الاوردی خاں نے سیر دریا کے بہانے آپ کو کشتی پر سوار کیا، جب کشتی بیچ دریا میں پہونچی تو مفتی محمد صادق سے کہا کہ اگر میری تحریر پر مہر نہیں کریں گے تو ابھی آپ کو دریا میں پھینک دونگا، ملا صاحب نے ہنسکر کہا کہ اس جبر و کراہ کی صورت میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، اور انگوٹھی نکال کر الہ وردی خاں کو دے دی، اس نے بار بار مہر لگائی مگر اس کا نشان ظاہر نہ ہوا، آخر میں شرمندہ ہوکر معذرت خواہ ہوا،

ملا محمد صادق بھاری بھرکم جسم کے تھے اس لئے امامت سے حتی الامکان بچتے تھے، اور دوسرے کو آگے بڑھاتے تھے، ایک دن ان کے استاد ملا محمود نماز کے وقت تشریف لائے اور امامت کے لئے آگے بڑھے مگر استاد ہونے کے باوجود ملا محمد صادق نے ان کا ہاتھ پکڑ کر ہٹا دیا، اور خود امامت کی، فارغ ہونے کے بعد دست بستہ شفیق استاد کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا، کہ حضرت! میں حتی الامکان امامت نہیں کرتا ہوں مگر مجھے حکماء و فلاسفہ کے کلام میں ایمان مشتبہ معلوم ہوتا ہے، اس لئے میں نے نماز ضائع نہیں کی، بلکہ خود ہی امامت کر دی "در کلام حکما، شبہہ ایمان میداردم بہر ایں نماز خود را ضائع نہ نمودم" ملا محمود شاگرد رشید کے اس متقیانہ اقدام سے بیحد خوش ہوئے اور فرمایا، کہ الحمد للہ از شاگردان خود یک عالم باعمل و مرد زاہد یافتم"

ملا محمد صادق کی وفات ۱۴ر ذوالحجہ ۱۰۶۴ھ میں ہوئی، ان کی قبر جونپور کے محلہ مفتی میں املی کے درخت کے نیچے موجود ہے، شمالی چبوترہ پر پہلی بڑی پختہ قبر ان ہی کی ہے، پہلے اس علاقہ کو چند پور کہتے تھے، ان کی تاریخ وفات "عالم فاضل بود" ہے[1]

---

[1] تجلی نور ج ۲ ص ۱۸۴، ۱۸۵

ان میں دو کتابیں ان کے علم و قلم کا شاہکار ہیں، تجلی نور میں ہے :-

ونقادہ علمائے اشراقیین وسلالۂ	فن حکمت و فلسفہ میں شمس بازغہ اور
حکمائے مشائین گشت، کتاب شمس بازغہ	فن بلاغت میں فرائد، ان کی یہ
کہ در حکمت و فرائد کہ بفن بلاغت	دونوں کتابیں، انکی قابلیت پر دلالت
املا کردہ، دال برین منوال است[1]	کرتی ہیں۔

۱- الفرائد فی شرح الفوائد۔ ملا صاحب کی یہ کتاب اور اس کا حاشیہ دونوں ان کے ذوق ادب و بلاغت کا مظہر ہیں، انھوں نے یہ کتاب جوانی کے ایام میں لکھی اور اپنے جوان فکر وجوان علم وقلم سے پورا کام لیا، یہ کتاب الفوائد الغیاثیہ کی شرح ہے جو مشہور متکلم وامام قاضی عضد الدین ایجیؒ متوفی ۷۵۶ھ کی تصنیف ہے، قاضی عضد الدین ایجی سے وزیر غیاث الدین بن رشید الدین متوفی ۷۳۶ھ نے فن بلاغت کی مشہور کتاب المفتاح کی تلخیص وتحریر کی خواہش کی، وزیر غیاث الدین علم اور اہل علم کا بڑا قدر دان تھا، بہت سے علماء و مصنفین نے اس کے نیک نام سے اپنی کتابیں منسوب کی ہیں، چنانچہ قاضی عضد الدین ایجیؒ نے بھی اپنی اس کتاب کا نام اسی کے نام پر رکھا، ملا محمود ادب و بلاغت کے شیدائی تھے، ان کو اپنے ذوق کے لئے اس فن کی کسی معیاری کتاب کی تلاش تھی، آخر انکی نگاہ انتخاب فوائد الغیاثیہ پر پڑی، اور اسکی بہترین شرح الفرائد فی شرح [illegible] نام سے لکھی اور اپنے زمانہ کے سب سے بڑے بادشاہ اور علم و علماء کے قدردان شاہجہاں کی نذر کی، ملا صاحب نے

[1] تجلی نور، ج ۲ ص ۵۰،

قاضی عبدالرحمن کمال پوری مولانا قاضی عبدالرحمن بن ابراہیم بن یوسف کمال پوری اپنے دور کے علمائے کبار میں تھے، ان کے اساتذہ میں ملا محمود بھی شامل ہیں، علوم و فنون ملا صاحب وغیرہ سے حاصل کرکے شیخ فتح قلندر سے طریقت حاصل کی، مقام سکدی کے قاضی تھے، فارسی اور عربی زبان میں انکی متعدد تصانیف ہیں، عربی میں رموز المعارف، اور فارسی میں قصص الاسرار، تلقین، وجدانی، فارسی میں ان کے اشعار بھی ہیں،[1]

تصانیف ملا محمود ہندوستان کے ان علماء میں سے ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے تعلیم و تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کی استعداد سے بھی نوازا تھا، وہ صاحب تلامیذ کثیرہ کی طرح صاحب تصانیف کثیرہ بھی تھے، سترہ سال کی عمر میں فارغ ہونے کے بعد سے وفات تک پوری زندگی اسی جامعیت کے ساتھ بسر کی، مآثر الکرام میں ہے،

ودر عرض ہفدہ سالگی فاتحۂ فراغ	سترہ سال کی عمر میں فارغ ہوئے اور
خواند و کمیت قلم در میدانِ تصنیف	قلم کے شہسوار بنکر تصنیف کے میدان
جولان داد، و شمس بازغہ در حکمت و	میں جولانی دکھاتے رہے، حکمت میں
فرائد در فن بلاغت املا کرد[2]	شمس بازغہ اور بلاغت میں فرائد
	جیسی کتابیں لکھیں،

یہی سبحۃ المرجان صفحہ ۵۳ میں بھی ہے، مولانا عبدالحئی فرنگی محلی نے بھی یہی نقل کیا ہے، یوں تو ملا صاحب نے متعدد کتابیں لکھیں اور مختلف فنون میں خامہ فرسائی کی مگر

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۱۴۴، [2] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۰۲،

یہ کتاب گلستان ادب کے لئے ابر باران ہے[1] مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی نے لکھا ہے کہ ملا صاحب نے فرائد پر حاشیہ تحریر کیا جو اصل کتاب سے بہت زیادہ ہے، اس میں خوش کن عجائب بیان کئے ہیں جن سے ذہنوں کو نشاط اور کانوں کو فرحت ہوتی ہے،

۲- الشمس البازغۃ | ملا صاحب کی اہم ترین تصنیف شمس بازغہ ہے جو ان کے معقولاتی علوم وفنون کا شاہکار ہے، اس کو ایسے وقت میں لکھا تھا جب امراض واسقام کا بے پناہ ہجوم تھا، اور صحت وتندرستی تقریباً جواب دے چکی تھی، مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی نے لکھا ہے کہ ملا صاحب شمس بازغہ میں جملہ علوم طبیعیہ کو بیان نہیں کرسکے کیوں کہ ان کی عمر طبعی کے کوچ کا طبل بج گیا تھا، ملا صاحب نے خود اس کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ میں اس کتاب کی تصنیف میں چیونٹی کی چال چلتا تھا، اور زمانہ میری موت کے قریب لانے میں دوڑ رہا تھا، اقبل الطبیعیات کے بہت سے مباحث کا مسودہ تیار کرکے اور باقی مسائل کو چھوڑ کر مابعد الطبیعیات کے کچھ مطالب لکھے تھے کہ مرض کا حملہ ہوگیا اور ان مباحث کی تکمیل حسب منشاء نہیں ہوسکی، ان میں مبادی اجسام کے مباحث بھی تھے جن کے لئے "الدوحۃ المیادۃ فی حدیقۃ الصورۃ والمادۃ" کے نام سے ایک الگ رسالہ لکھا، اس کتاب میں ملا صاحب نے الحکمۃ البالغۃ کے نام سے متن لکھ کر الشمس البازغۃ کے نام سے اس کی شرح کی ہے، قلتُ کہکر متن کی عبارت لکھی ہے، اور اقول کہکر اس کی شرح کی ہے، الدوحۃ المیادۃ کے علاوہ متعدد مباحث جو شمس بازغہ میں نہیں آسکے تھے ملا صاحب نے ان کو الگ الگ رسالے کی شکل میں مرتب کیا تھا، یہ سب مطبوعہ شمس بازغہ کے آخر میں موجود ہیں،

---

[1] سبحۃ المرجان ص ۵۳،

مقدمہ میں لکھا ہے کہ اس کتاب کی تالیف شروع کرتے ہی سفر در پیش ہو گیا اور کام چھوٹ گیا، چند سال کے بعد وطن واپسی ہوئی تو پھر کام شروع کیا، مگر اختتام سے پہلے پھر سفر پیش آگیا نتیجہ یہ ہوا کہ اسی پر کتاب ختم کرنی پڑی (صفحہ ۵) یہ سفر دہلی لاہور اور آگرہ وغیرہ کے تھے، جو شاہی دربار کی علمی اور دینی ضرورت پر ہوتے تھے،

الفرائد کا ایک حاشیہ فارسی میں راقم کے نانا مولانا محمد حسین رسول پوری متوفی ۲۷ رجب ۱۳۵۹ھ نے قیام ڈھاکہ کے دوران میں القلائد من الفرائد کے نام سے لکھا ہے جو الفرائد کے ساتھ ۱۳۳۸ھ میں چھپا ہے، یہ حاشیہ پہلے عربی زبان میں شرح کے انداز میں لکھا گیا ہے، مگر بعد میں طلبہ کی آسانی کے خیال سے مختصر کر کے فارسی میں لکھا گیا، عربی شرح کا نام سمط الفرائد تھا اور اس کا خطبہ مولانا مرحوم نے اپنے استاذ مولانا محمد طیب عرب مکی متوفی ۱۳۳۵ھ کی خدمت میں جب وہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں عربی ادب کے مدرس تھے، بغرض اصلاح پیش کیا تھا، انھوں نے یہ لکھکر خطبہ واپس کر دیا تھا کہ واما الخطبۃ فلا تحتاج الی اصلاح یہ خطبہ جو نظم و نثر دونوں پر مشتمل ہے مولانا مرحوم کے عربی دیوان میں موجود ہے،

حاشیۃ الفرائد ملا صاحب نے الفرائد فی شرح الفوائد لکھنے کے بعد خود اس کا حاشیہ بھی تحریر فرمایا جس کے متعلق علماء نے شاندار توصیفی الفاظ لکھے ہیں، سبحۃ المرجان میں مولانا غلام علی بلگرامی نے لکھا ہے کہ ملا صاحب نے فرائد کے حاشیہ میں نہایت عمدگی اور سلیقہ مندی سے کام لیا ہے، یہ حاشیہ درحقیقت بڑی شرح ہے جس سے ملا صاحب کا علم فصاحت میں تبحر معلوم ہوتا ہے، میں نے اس کا مطالعہ بار بار کیا ہے،

۳- الدوحة المیادة فی حدیقة الصورة والمادة | ملا صاحب نے اپنی اس کتاب کا تعارف شمس بازغہ کے مقدمہ میں خود کرایا ہے،

الا ان جملة منها کانت متعانقة متسقة النظام، وھی المباحث المتعلقة بمبادی للاجسام جعلتھا رسالة مفردة موسومة بالدوحة المیادة فی حدیقة الصورة والمادة،،

مابعد الطبیعیات جو مباحث مبادی اجسام سے تسلسل کے ساتھ متعلق تھی انکو میں نے اس رسالہ میں بیان کرکے اسکا نام "الدوحة المیادة فی حدیقة الصورة والمادة،، رکھا ہو،

ملا صاحب نے شاہجہاں کے دربار میں ملا ایرانی سے مناظرہ اور کامیابی کے بعد اثبات ہیولی کے دلائل کے سلسلے میں اس رسالہ کو لکھ دیا تھا، یہ رسالہ شمس بازغہ کے آخر میں موجود ہے جو بسم اللہ کے بعد "فصل فی اثبات الہیولی" سے شروع ہوتا ہے، اور یہ بھی شمس بازغہ کی طرح متن اور شرح پر مشتمل ہو،

۴- رسالہ فی الکلی والجزئی | یہ رسالہ بھی درحقیقت شمس بازغہ کے مباحث کا تکملہ و تتمہ ہے، مطبوعہ شمس بازغہ کے آخر میں الدوحة المیادة کے بعد بسم اللہ سے یہ رسالہ شروع ہوتا ہے، اور اسمیں بھی قلت سے متن اور اقول سے شرح ہے،

۵- رسالہ ارتفاع النقیضین | شمس بازغہ کے آخر میں رسالہ کلی و جزئی کے بعد رسالہ ارتفاع النقیضین ہو، یہ بھی اسی طرح متن اور شرح پر مشتمل ہو، مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے اس کا نام رسالہ فی تحقیق اجتماع النقیضین وارتفاعہما لکھا ہے،

۶- رسالہ فی وحدت الوجود | اسکا تذکرہ مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے کیا ہے،

۷- رسالہ تحقیق قضا و قدر | یہ رسالہ قضا و قدر کی تحقیق میں فارسی زبان میں ہو جیسا

اسی لئے ان کے سوانح نگاروں نے ایسے رسائل کو الگ تصنیف نہیں شمار کیا ہے مگر بعض متاخرین نے ان کو مستقل کتاب قرار دیا ہے، چنانچہ مولانا عبدالحئ فرنگی محلی نے لکھا ہے کہ ملا صاحب کی تصانیف میں سے الدوحۃ المیادۃ، رسالہ کلی وجزئی، رسالہ تحقیق اجتماع نقیضین وارتفاع نقیضین بھی ہیں جن سے غلام علی آزاد بلگرامی ناواقف تھے، ہمارے نزدیک آزاد کے ان رسائل کو ذکر نہ کرنے کا سبب یہ ہے کہ وہ ان کو شمس بازغہ کے مباحث قرار دیتے تھے، شمس بازغہ صرف حکیمانہ وفلسفیانہ مباحث اور تحقیقات ہی کی بے مثل کتاب نہیں ہے بلکہ زبان وادب کے اعتبار سے بھی اس کا معیار بہت بلند ہے، حالانکہ عام طور سے حکماء وفلاسفہ کی عبارتیں ادبی ذوق سے عاری اور فنی معیار سے خالی ہوتی ہیں کیونکہ ان کے نزدیک اصل چیز مفہوم ومعنی ہیں، لفظ وعبارت کی حیثیت صرف ذریعہ اور وسیلہ کی ہے، اس لئے ان کے یہاں اسکا اہتمام نہیں ہوتا ہے، مگر ملا صاحب حکمت وادب اور لفظ ومعنی دونوں کے جامع تھے، آخری دور میں علمائے خیرآباد میں یہ وصف پایا جاتا تھا کہ وہ منطقی وفلسفی ہونے کے ساتھ ادب وعربیت کا بھی نہایت ستھرا ذوق رکھتے تھے، اس کا اندازہ ان کی تصانیف سے کیا جا سکتا ہے، ہمارے مدارس میں اب سے تیس چالیس سال پہلے تک صدرا اور شمس بازغہ کا رواج تھا، اور ہم نے بھی انکو پڑھا ہے مگر اب تو ان کتابوں کے نام بھی مدارس عربیہ میں زبانوں پر نہیں آتے، شمس بازغہ اور ملا محمود دونوں لازم وملزوم ہیں اور ایک کے ساتھ دوسرے کی دلالت التزامی ضروری ہے،

قرآن پاک اور مرزا غالب

از

جناب پروفیسر مسعود حسن صاحب صدر شعبہ عربی مولانا آزاد کالج کلکتہ

ڈاکٹر اصہانی فخرالزماں کا جو مضمون "غالب کا مذہبی رجحان ان کے کلام کی روشنی میں" کے عنوان سے مارچ اور اپریل کے معارف میں شائع ہوا تھا، اس پر پروفیسر مسعود حسن نے تعقب کیا ہے، راقم نے ڈاکٹر اصہانی کے مضمون پر حسب ذیل نوٹ لکھا تھا،

"مضمون نگار نے غالب کے مذہبی رجحان اور آیات قرآنی پر ان کی نظر کے ثبوت میں ان کے جو اشعار پیش کئے ہیں وہ ان کے ساتھ مخصوص نہیں آیات قرآنی کے متعلق اس قسم کی تلمیحات اسقدر عام ہیں کہ ان سے کم و بیش ہر پڑھا لکھا مسلمان واقف ہے اور ایسے کسی مسلمان شاعر کا کلام خالی نہیں نکل سکتا[1] اس لئے یہ مضمون غالب سے زیادہ آیات قرآنی پر خود مضمون نگار کی وسعتِ نظر کا ثبوت ہے اور اس حیثیت سے نئی چیز ہے کہ انھوں نے غالب کے کلام سے یہ اشارے ڈھونڈھ نکالے اور ان سے متعلق آیات پیش کر دیں، ابتک کسی نے اس حیثیت سے کلام کا مطالعہ نہیں

[1] بلکہ ہندو شعراء کے کلام میں بھی اس قسم کی تلمیحات ملتی ہیں۔

کہ مولانا عبدالحیؒ فرنگی محلی نے لکھا ہے، اس کا اردو میں ترجمہ سر شاہ سلیمان نے الہ آباد میں ایک عالم سے کرایا تھا جس پر مولانا محمد شریف صاحب مصطفےٰ آبادی صاحب الافاضۃ القدسیہ نے تعاقب لکھ کر دوسرے کے نام سے شائع کیا تھا مولانا اس زمانہ میں مدرسہ مصباح العلوم الہ آباد میں صدر مدرس تھے،

۸۔رسالہ اقسام نسواں | یہ چار ورق کا مختصر رسالہ فارسی زبان میں ہے جو بقول مولانا غلام علی آزاد فن نائکا بھید میں ہے، اور اس میں عورتوں کے اقسام بیان کئے گئے ہیں یعنی باعتبار سن وسال اور بلحاظ درجات عمر و مراتب الفت عورتوں کی مختلف قسمیں اور ان کے الگ الگ نام ہیں۔ ملا صاحب کے اکثر تذکرہ نویس ان کی اس مختصر سی کتاب کا تذکرہ کرتے ہیں،

(۹--۱۰) صاحب تجلی نور نے ملا صاحب کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہو کہ" دو دیوان فارسی و اردو کے دیوان شعرا دو ہیں مستند شعراء،، ہمارا خیال ہے کہ ان دونوں کتابوں میں شعرا کے مختلف اشعار اور انکے مستند حالات ہونگے جن میں ملا صاحب نے اپنے اشعار و حالات بھی درج کئے ہوں گے،

(۱۱) ملا صاحب نے اپنے مرشد شیخ نعمت اللہ فیروزپوریؒ کے بتائے ہوئے اوراد و وظائف کو ایک الگ رسالہ میں جمع کیا تھا جس کو مولانا خوب اللہ محدث الہ آبادی نے وفیات الاعلام میں نقل کر دیا ہے،،

حیاتِ شبلی:۔ مولانا شبلی کی بہت مفصل سوانح عمری جسکے مقدمہ میں دیار شرق کے علماء و فضلا کیساتھ شمس بازغہ کے مشہور مصنف ملا محمود کا ذکر بھی اجمال کے ساتھ آیا ہے۔ یہ فاضلانہ مضمون اس کی تفصیل ہے،

قیمت ۷/ روپیہ

جو محض شاعری نہیں بلکہ ان کے دلی جذبات کے صحیح ترجمان ہیں۔

غالب کی عبقریت، فارسی زبان پر ان کی قدرت، شاعری میں خیالات کی ندرت اور اردو نثر نگاری میں جدت مسلم ہے لیکن اس زمانہ کے ادیبوں نے انکے بارہ میں بڑے مبالغہ سے کام لیا ہے، ان کے کلام ..... اور ان کی زندگی سے وہ نکتے ڈھونڈھ نکالے ہیں اور ایسے ایسے پہلو پیدا کئے ہیں جو ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں تھے، چنانچہ اس کو بہت بڑا ترقی پسند، قوم پرور متحدہ قومیت کا حامی، آزادی کا علم بردار، کمیونسٹ اور خدا جانے کیا کیا بنا ڈالا جن کا اس زمانہ میں تصور تک نہ تھا، وہ غریب اپنی پنشن کے لئے "صاحبان والاشان" کی شان میں بڑے ... لمبے لمبے قصیدے لکھتے تھے اور ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں اپنی شرکت سے براءت کا اظہار کرتے پھرتے تھے، واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنے سارے کمالات کے باوجود اس دور کے مسلمان شرفاء اور امراء کی بگڑی ہوئی سوسائٹی کا نمونہ تھے جس کی خوبیاں اور خرابیاں دونوں ان میں جمع تھیں، اس تمہید کے بعد ناظرین پروفیسر مسعود حسن کا مضمون ملاحظہ فرمائیں"۔ (م)

معارف کی گذشتہ دو اشاعتوں[1] میں "غالب کا مذہبی رجحان ان کے کلام کی روشنی میں" کے عنوان سے جو مقالہ شائع ہوا ہے اُسے پڑھ کر بڑی حیرت ہوئی، گذشتہ چھ سات سال کی مدت میں غالب کے عقیدتمندوں نے کچھ اپنے جوش عقیدت میں اور کچھ کوئی چونکا دینے والی چیز کی تلاش میں "مضامین نو" کے اس قدر "انبار" لگادئے ہیں کہ ان کی بے سروپا باتوں کا جواب دینا تو درکنار، ان کی طرف توجہ کرنا بھی مشکل ہو گیا ہے، میں اس مضمون کو پڑھ کر بھی خاموش رہ جاتا۔ مگر مضمون نگار کا تعلق مسلم

---

[1] معارف مارچ اور اپریل ۱۹۶۳ء،

کیا تھا"

اس نوٹ سے غالب کی قرآن دانی کی حیثیت واضح ہو جاتی ہے مگر اس مضمون میں کلام غالب کے ایک ایسے پہلو کو دکھایا گیا تھا جس کی جانب کسی نے توجہ نہیں کی تھی، اس لئے اس کو شائع کر دیا گیا ہے۔

شاعری کی دنیا حقیقت سے بالکل الگ ہے، اس لئے کسی ایسے شاعر کے کلام سے جو صاحب پیام نہ ہو یعنی جسکا مقصد کسی نظریہ اور مشن کی تبلیغ نہ ہو اسکے ذاتی عقائد پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہے پھر اردو اور فارسی شاعری کی زبان ایسی ہے کہ اگر اس کو شاعر کے عقیدہ کی بنیاد قرار دید یا جائے تو بہت سے عارف باللہ شعراء رند شاہد باز اور رندمشرب و بیدار نظر آئیں گے، یہی غلطی ڈاکٹر اصفہانی کے مضمون میں بھی، غالب کے مذہبی رجحان کے ثبوت میں ان کا قلم جادۂ اعتدال سے ہٹ گیا تھا اور اس سلسلہ میں انھوں نے بعض اکابر شعراء کے متعلق ایسی باتیں ان کے قلم سے نکل گئی ہیں جو صحیح نہیں ہیں، اسی طریقہ سے بعض شعراء مذہب کے متعلق بعض ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جن سے مذہب کے استخفاف و استہزا کا پہلو نکلتا ہے حالانکہ اس کا مقصد استخفاف نہیں ہوتا بلکہ صرف شاعرانہ شوخی ہوتی ہے جس سے حافظ جیسے عارف کا کلام بھی خالی نہیں ہے اس لئے ایسے اشعار کو شاعر کی بدعقیدگی پر استدلال صحیح نہیں ہے، درحقیقت غالب ایک رندمشرب شاعر تھے اون کو دیندار یا بے دین کے لباس میں پیش کرنا ہی صحیح نہیں ہے وہ نہ مرد مومن تھے اور نہ خارج از اسلام، عقیدۃً وہ مسلمان تھے، اور عملاً رندمشرب، اونکی رندی پر ان کی پوری زندگی شاہد ہے اور ان کے عقائد کا ثبوت ان کے توحید و رسالت و حمد و نعت کے فارسی قصائد ہیں،

کا علم اور ان کا استعمال تو اردو اور فارسی کا کون شاعر ہے جس کے یہاں یہ چیزیں نہیں ملتی ہیں[1] حتی کہ شاید ہی کوئی پڑھا لکھا مسلمان ہوگا جو حسن یوسف، دم عیسیٰ، ید بیضا، خضر راہ، صبر ایوب، گلزار خلیل، دیدۂ یعقوب، عمر نوح، عصائے موسیٰ، جلوۂ طور، ماہ کنعاں اور وادی ایمن کے متعلق تھوڑی بہت واقفیت نہ رکھتا ہو، اسی طرح جو لوگ اردو اور فارسی شعر و ادب کا تھوڑا سا بھی ذوق رکھتے ہیں وہ قرآن کی آیتوں کے ان ٹکڑوں الم نشرح، انا ربکم الاعلیٰ، الست بربکم، قالوا بلیٰ، کلوا واشربوا، لن ترانی، ارنی، لبس کمثلہ شئی، اور لاریب فیہ کے مفہوم اور شان نزول سے آشنا ہوتے ہیں، اس کے لئے نہ کسی مذہبی رجحان کی ضرورت ہے، نہ عربی زباندانی کی صلاحیت کی، اور نہ قرآن کو سمجھنے اور اس کے لئے سخت محنت کی،

مضمون نگار نے اپنے طویل مقالے میں جو کچھ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اس کا خلاصہ خود ان کے الفاظ میں یہ ہے :۔

(۱) غالب کے اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے کلام میں خدا، محمد، جنت، دوزخ، حور، رضوان، یوسف، آدم، ابراہیم، ادریس، سلیمان، عیسیٰ، موسیٰ، ایوب، یعقوب، اوامر و نواہی اور آیات قرآنی کے اقتباسات عجمی حوالوں سے کہیں زیادہ پائے جاتے ہیں، ساتھ ہی یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ غالب کے یہاں محض یہی نہیں کہ یہ حوالے دوسرے فارسی اور اردو شاعروں سے زیادہ ملتے ہیں، بلکہ غالب کی تلمیحات قرآنی دوسرے شاعروں کی بہ نسبت متن قرآنی سے زیادہ قریب ہیں۔[2]

---

[1] مدیر "معارف" نے بھی اپنے نوٹ میں اسطرف اشارہ کیا ہے۔ [2] معارف ص ۲۰۷، (مارچ و اپریل ۱۹۷۳ء)

یونیورسٹی علی گڈھ جیسی مقتدر علمی و تعلیمی درسگاہ سے ہے، اور مضمون "معارف" جیسے موقر علمی اور مذہبی رسالے میں شائع ہوا ہے، اس لئے قلم اٹھانے پر مجبور ہوا، اسلئے بھی کہ مدیر "معارف" کے اس نوٹ کے ایک حصہ سے جو مضمون کے آغاز میں درج ہے بعض غلط فہمیوں کا احتمال رہ جاتا ہے، یہ چند سطریں تحریر کر رہا ہوں، پہلے نوٹ کا وہ حصہ پیش خدمت ہے:[1]

"یہ مضمون غالب سے زیادہ آیات قرآنی پر خود مضمون نگار کی نظر کا ثبوت ہے، اور اس حیثیت سے نئی چیز ہے کہ انھوں نے غالب کے کلام سے یہ اشارے ڈھونڈھ نکالے اور ان سے متعلق آیات پیش کر دیں، ابتک کسی نے اس نقطۂ نظر سے کلام غالب کا مطالعہ نہیں کیا تھا، اس میں ان لوگوں کا بھی جواب ہے جو غالب کو مذہب سے بالکل بیگانہ اور محض ایک آزاد مشرب رند لاابالی کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں"[2]

میں خود غالب کا عقیدتمند اور انکی عظمت کا قائل ہوں، انھیں اردو کا عظیم شاعر سمجھتا ہوں، وہ فارسی شاعری میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں، انھوں نے اردو نثر نگاری کو ایک طرز خاص عطا کیا، وہ فارسی زبان کے مسلّم الثبوت محقق اور دانشمند ہیں، لیکن اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہے کہ میں غالب کو مرشد کامل، شیخ طریقت اور عارف قرآن بھی تسلیم کر لوں، قرآن پاک کے رموز اور نکات کو سمجھنا تو دور کی بات ہے، ان کی عربی زبان سے واقفیت بس واجبی تھی معمولی عربی صرف و نحو پڑھ لینے کے بعد قرآن پاک کے حقائق اور مطالب کو سمجھ لینا ناممکن ہے، رہ گیا تلمیحات قرآنی

---

[1] معارف مارچ و اپریل ۱۹۷۳ء ص ۲۰۱ [2] "معارف" اس نوٹ کا اوپر کا حصہ اسکا جواب ہے جسکو اسی مضمون میں بھی نقل کیا گیا ہے اور اس کی مزید وضاحت بھی ہے،

هر شمیمے را مشامے در خور است   بوے پیراہن بکنعاں می رود

نشگفت گر یوسف بہ بیاں داشتہ باشد   دلو من ازیں چاہ گرانبار برآید

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر   لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

تجلی کہ ز موسیٰ ربود ہوش بطور   بشکل کالب علی خاں دگر نمود ظہور

رفت آنکہ ما ز حسن مدارا طلب کنیم   سر رشتہ در کف ارنی گوے طور بود

لن ترانی بجواب ارنی چون و چرا   من نہ اینم بشناسی و تو نہ آنی بشنو

گفتہ اے وادیم و با ما لن نمیگوئیم وانش   طالب دیدار باید تاب دیدار آورد

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب   آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

بدور تو شد لن ترانی کہن   فصاحت مکرر نسنجد سخن

ترا خواستگار است یزدان پاک   ہر آئینہ از لن ترانی چہ باک

ہیں عیسیٰ و سامان نوائش نفس گرم   ہاں موسیٰ و برہان کمالش ید بیضا

نسیمش چوں دم عیسیٰ رواں بخش   صباحش چوں کفِ موسیٰ منور

فیض حق است قبول سخن و شادی فتح   بقلم نازم اگر تکیۂ موسیٰ بعصاست

نظم را موجۂ حیواں فہمند   نثر را نسخۂ اعجاز مسیحا بینند

لبِ تو زندہ کن معجزۂ مسیحائی   رخِ تو جلوہ دہ شوکتِ سلیمانی

براہیم خوے سلیمان فرے   مسیحا دمے مصطفیٰ گوہرے

ہو تم مریضِ عشق کے تیماردار ہیں   اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

ایک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک   اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

ابن مریم ہوا کرے کوئی   مرے دکھ کی دوا کرے کوئی

(۲) جہاں تک شاعری میں قرآنی تلمیحات کا تعلق ہے فارسی کے بڑے بڑے شعراء غالب کی کمیت اور کیفیت کو نہیں پہنچتے۔ فارسی کے شاعروں نے اس ضمن میں بہت خطرناک حد تک غلطیاں کی ہیں۔ [۵]

(۳) ان (غالب) کو قرآن سے خاص شغف تھا، اور وہی ان کے شاعرانہ فکر و تخیل کا محور تھا۔ [۲]

پہلی بحث | مضمون نگار کا یہ دعویٰ کہ آیات قرآنی کے حوالے اور قرآن کے اقتباسات غالب کے یہاں دوسرے فارسی اور اردو شاعروں سے زیادہ ملتے ہیں، تحقیق طلب ہے، اس سلسلے میں انھوں نے چند شاعروں سے غالب کا موازنہ کیا ہے، مگر اردو کے کسی شاعر کو سرے سے درخور اعتنا نہیں سمجھا ہے، فارسی شعراء میں انھوں نے فردوسی، مولانا رومیؒ، خواجہ حافظ شیرازیؒ، شیخ سعدیؒ، مولانا جامیؒ اور جمالی دہلوی کے اشعار سے بحث کی ہے، تعجب ہے کہ فارسی کے "بڑے بڑے شعراء" کی فہرست میں انھیں سب سے پہلے جمالی دہلوی یاد آئے، اور خاقانی، سنائیؒ، عطارؒ، عراقیؒ اور اقبالؒ کا نام لینا بھی انھیں گوارا نہیں ہوا،

مضمون نگار نے غالب کے مندرجہ ذیل اشعار [۳] نقل کئے ہیں جنکی تلمیحات ان کی رائے میں متن قرآنی سے زیادہ قریب ہیں۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ ان میں ندرت بیان کے سوا کوئی ایسی بات ہے جو غالب کو دوسرے شعراء سے ممتاز کرتی ہو، قارئین "معارف" خود ملاحظہ فرمائیں :-

---

[۱] معارف ص ۳۰۹ ، [۲] ایضاً ص ۳۰۲ ،

[۳] افسوس ہو کہ اس قبیل کے بعض فارسی اشعار کتابت کی غلطیوں کی وجہ سے نیز حوالے نہ ہونے کی بناء پر نہیں پڑھے جا سکے، اور وہ یہاں نقل نہیں کئے جا سکے ہیں، بعض اشعار پر آئندہ صفحات میں بحث کی جائے گی،

مولانائے روم پر مضمون نگار کو اس کے سوا کوئی اعتراض نہیں مل سکا کہ ان کی زندگی میں لوگوں نے یہ کہہ کر ان پر اعتراض کیا تھا کہ وہ اپنے اشعار میں آیات قرآنی کی طرف اشارہ کرنے میں متن قرآنی کی پوری پوری اتباع نہیں کرتے ہیں[۱]، مولانا بالاتفاق عربی زبان میں کامل مہارت رکھتے تھے، مثنوی میں ان کے سینکڑوں عربی اشعار اس کی شہادت کے لئے موجود ہیں، معارف قرآنی اور رموز قرآنی پر ان کی جو گہری نگاہ تھی اس سے کون واقف نہیں ہے، اس لئے عوام کے اعتراض کا جو مقصد اور مفہوم ہے وہ ظاہر ہے، اس کی تشریح آگے آئے گی۔

شیخ سعدی کے مندرجۂ ذیل دو شعر پر جو اعتراض ہے وہ بھی سن لیجئے،

پسر نوح با بداں بنشست　　　خاندانِ نبوتش گم شد
سگِ اصحاب کہف روزے چند　　　پئے نیکاں گرفت مردم شد

مضمون نگار کے خیال میں "با بداں بنشست" اور "مردم شد" دونوں فقروں کے مفہوم متن قرآنی سے خارج ہیں[۲]، کوئی مضمون نگار کو بتائے کہ نوح علیہ السلام کے بیٹے کا "عمل غیر صالح" یہی تو تھا کہ وہ باپ پر ایمان نہیں لایا اور ایمان نہ لانے والوں کے ساتھ ہو گیا، "مردم شد" کا مفہوم اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ کتا اچھے لوگوں کی صحبت میں رہ کر وفادار بن گیا، اور وفاداری شرط آدمیت ہے۔

شیخ پر ایک اور اعتراض یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف گلستاں میں تلمیحات قرآنی کا شاذ و نادر ہی استعمال کیا ہے[۳]، حالانکہ گلستاں کے صفحات ان تلمیحات سے بھرے ہوئے ہیں، ملاحظہ فرمائیے:۔

[۱] معارف ماہ اپریل ۱۹۷۲ء ص ۲۱۱ ، [۲] ایضاً ، [۳] ایضاً۔

دلِ مایوس را تسکیں نمبر دن میتواں دانی — چہ امید است آخر خضر و ادریس و مسیحا را

شنیدہ ای کہ بآتش نسوخت ابراہیم — ببیں کہ بے شرر و شعلہ میتوانم سوخت

با من میاویز اے پدر فرزند آزر را نگر — ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نکرد

فرزند زیرِ تیغ پدر می نہد گلو — گر خود پدر در آتشِ نمرود می رود

زخونیکہ در کربلا شد سبیل — ادا کرد وام زمانِ خلیل

دوسری بحث | دوسری بحث کا تعلق فارسی کے بڑے بڑے شعراء کی بہت خطرناک غلطیوں سے ہے، یہ مضمون کا سب سے زیادہ قابلِ اعتراض حصہ ہے جسے پڑھ کر سب سے زیادہ افسوس ہوتا ہے۔

مولانا عبد الرحمن جامیؔ کی یوسف زلیخا پر یہ اعتراض ہے کہ "یہ مثنوی زلیخا کے خواب سے شروع ہوتی ہے اور قرآن مجید میں خواب کا کوئی ذکر نہیں ہے (ان کا دارومدار مسیحی کتابوں پر ہے)"[1] مضمون نگار کو یہ معلوم نہیں ہے کہ تلمیحات قرآنی کے استعمال کے لئے یہ بالکل ضروری نہیں ہے کہ اسے قرآن کے بیان کردہ مضامین تک محدود رکھا جائے، انھیں خواب زلیخا پر اعتراض ہے مگر خود زلیخا کے نام کا ذکر قرآن میں کب موجود ہے، وہاں اسے امرأۃ العزیز کے نام سے پکارا گیا ہے، بلکہ جہاں تک میری تحقیق کا تعلق ہے انجیل میں بھی یہ نام مذکور نہیں ہے، اسے وہاں Potiphar's wife کہا گیا ہے، اور کیا غالبؔ کا یہ شعر مضمون نگار کی نظر سے نہیں گذرا ہے؟

ابھی آتی ہے بو، بالش سے اسکی زلفِ مشکیں کی
ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے

---

[1] معارف ص ۲۱۱، (مارچ واپریل ۱۹۷۳ء)

یہ صرف تلمیحات قرآنی کی مثالیں ہیں۔ گلستاں میں قرآن کے اقتباسات اور قرآنی آیات کی تضمینیں اس قدر کثیر تعداد میں ہیں کہ ان سب کو یہاں نقل کرنا ناممکن ہے۔ شیخ سعدی کے متعلق کسے معلوم نہیں ہے کہ انھوں نے بغداد کے مدرسۂ نظامیہ میں اسلامیات کی تعلیم پائی تھی۔ وہ علامہ ابن جوزیؒ اور شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے خاص شاگردوں میں تھے۔ عربی زبان پر انھیں یہ قدرت تھی کہ وہ بے تکلف اس میں شعر کہتے تھے۔ چنانچہ ان کی تصنیفات میں عربی کے سینکڑوں اشعار محفوظ ہیں۔ خاص گلستاں سے تلمیحات قرآنی کے نمونے اوپر پیش کئے گئے۔ ان سب باتوں کے باوجود اگر یہ کہا جائے کہ انھوں نے قرآنی تلمیحات کے استعمال میں "خطرناک حد تک غلطیاں کی ہیں" یا گلستاں میں تلمیحات قرآنی کی طرف "شاذ و نادر" اشارے ہیں تو اس کا خاموشی کے سوا کیا جواب دیا جاسکتا ہے، شاید شیخ نے کسی ایسے ہی موقع پر اپنے کسی معترض کو کہا تھا،

که بر باں قوی باید و معنوی   نہ رگہائے گردن بہ حجت قوی

سعدی کے دو اور شعروں پر بھی مضمون نگار چیں بجبیں ہیں۔

یکے پرسید ازاں گم کردہ فرزند   کہ اے روشن گہر پیر خرد مند

زمصرش بوئے پیراہن شنیدی   چرا در چاہ کنعانش ندیدی

اعتراض یہ ہے کہ حضرت یعقوبؑ کا مصر سے یوسفؑ کے پیراہن کی خوشبو سونگھنا "کس قدر اصلیت کے خلاف ہے"۔ بات واضح نہیں ہوئی ہے، اگر مضمون نگار کا یہ خیال ہے کہ یہ قرآن کے بیان کے خلاف ہے جیسا کہ انھوں نے قرآن کی ایک آیت نقل کرکے اور اس کا ترجمہ پیش کرکے اس کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے تو مضمون نگار

(۱) قرصِ خورشید در سیاہی شد ، یونس اندر دہانِ ماہی شد

(۲) زکار بستہ میندیش و دل شکستہ مدار ، کہ آبِ چشمۂ حیوان درون تاریکیست

(۳) تو گوئی تا قیامت نہ شت روئی ، بر وختم است در یوسف نکوئی

(۴) دخست حیلی بچپاں در روئے تمکن تا بجائے رسید کہ نانے از دست بجانے نداد

وگربۂ ابو ہریرہ را بہ لقمۂ ننواختے و سگ اصحاب را استخوانے نینداختے۔

(۵) شنیدم کہ بدریائے مغرب اندر راہ مصر پیش گرفتہ بود و خیال فرعونے در سر

حتی اذا ادرکہ الغرق بادے مخالف بکشتی بر آمد۔

(۶) کاج کا نانکہ عیب می گفتند ، رویت اے دلستاں بدیدندے

تا بجائے ترنج در نظرت ، بے خبر دستہا برید ندے

تا حقیقت معنی برصورت دعوی گواہی دادے کہ فذلکن الذی لمتنی فیہ۔

(۷) چوں آزر بت تراش کہ بحجت با پسر برنیامد بجنگ برخاست آیۃ لئن لم

تنتہ لارجمنک ....

(۸) دین بدنیا فروشاں خرند یوسف را فروشند تا چہ خرند۔

(۹) یوسف صدیق علیہ السّلام در خشک سال سیر نخوردے تا گرسنگاں را

فراموش نکند۔

(۱۰) برادران یوسف علیہ السلام بدروغے کہ موسوم شدند بر راست گفتن

ایشاں اعتماد نماند قال بل سولت انفسکم امرا۔

(۱۱) چوں کنعاں را طبیعت بے ہنر بود ، پیمبر زادگی قدرش نیفزود

ہنر بنمائے اگر داری نہ گوہر ، گل از خار است ابراہیم از آزر

در ادب بودہ است۔

ان کے متعلق مضمون نگار کا تبصرہ ملاحظہ فرمائیے:۔

اشعار کی تعداد دیکھتے ہوئے ان کا دیوان زیادہ تلمیحاتِ قرآنی کا حامل نہیں اور جو تلمیحات شامل کی ہیں ان کا طریقہ دیانتداری کے خلاف ہے، اور حافظ علیہ الرحمہ کے شایان شان نہیں۔ [۱]

مضمون نگار کو ان کے مندرجہ ذیل تین اشعار پر سخت اعتراض ہے:۔

(۱) در عیش نقد کوش کہ چوں آبخور نماند آدم بہشت روضہ دار السلام را

ان کی رائے میں "دونوں مصرعے اصلیت سے خارج ہیں، کہتے ہیں "چول آبخور نماند" حالانکہ قرآن میں صاف ہے: وکلا منھا رغدا حیث شئتما۔ "آدم بہشت" یعنی آدم نے چھوڑ دیا، حالانکہ قرآن کہتا ہے: فاخرجھما مما کانا فیہ۔ یوں تو چھوڑ دینے اور نکالے جانے کا عملی نتیجہ ایک ہی ہوتا ہے، مگر جبر و قدر میں اس مسئلے کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ "دار السلام" بھی شاید وہ قافیے کی ضرورت سے لائے ہیں، حالانکہ قرآن میں کہیں اس کی صراحت نہیں ہے۔ قرآن میں صرف جنت کا لفظ ہے، یا آدم اسکن انت وزوجک الجنۃ، اور دار السلام اس کا ایک طبقہ ہے۔ [۲] اس کے جواب میں عرض ہے کہ "آبخور نماند" صاف ظاہر ہے یہ آدم علیہ السلام کے جنت سے نکالے جانے کے بعد کا نقشہ ہے، اور قرآن کی آیت اس سے پہلے کا نقشہ پیش کرتی ہے، لہٰذا ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ شاعر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جب آدم کو جنت کی نعمت حاصل نہیں ہے تو وہ نعمت اس کے لئے نعمت نہیں ہے،

---

[۱] معارف ص ۲۱۳ ؛ [۲] ایضاً ،

پر سخت حیرت ہوتی ہے. قرآن کی وہ آیت درج ذیل ہے :-

ولما فصلتِ العیر قال ابوھم انی لاجد ریح یوسف

اس کا ترجمہ انھوں نے یہاں یہ کیا ہے، (یعنی جب اونٹوں کا قافلہ مصر سے روانہ ہوگیا)[1]

مگر اسی مضمون میں دوسری جگہ خود ان کا ترجمہ یوں ہے :-

جب قافلہ چلا ہی تھا کہ ان کے باپ (حضرت یعقوبؑ) نے کہا[2]......

اگر مضمون نگار نے خود اپنے دوسرے ترجمے ہی پر ایک نظر ڈال لی ہوتی تو سعدی کے شعر پر اعتراض کرنے کی زحمت گوارا نہ کرنی پڑتی. مصر سے روانہ ہوتے ہی جو خوشبو حضرت یعقوبؑ کو ملی وہ مصر ہی سے تو گئی ہوگی، کیا اس آخری اعتراض پر شیخ سعدیؒ کی روح بے اختیار یہ نہیں پکار اٹھی ہوگی :-

گر تو قرآن بدیں نمط خوانی　　　ببری رونق مسلمانی

خواجہ حافظ بڑے پایہ کے عالم ہیں، ان کے علم و فضل کا سبھوں نے اعتراف کیا ہے، چنانچہ آقای دکتر رضا زادہ شفق ان کے تذکرے میں لکھتے ہیں :-[3]

حافظ تحصیل علوم و کمالات رزد رنزد اگاہ خود کرد و مجالس درس علماء و فضلای بزرگ زمان خود دراکہ یکے آنہا قوام الدین عبداللہ باشد درک نمودہ در علوم بمقامے رفیع رسید و بشہادت محمد گلندام شاعر بزرگ "بہ تحشیہ کشاف و مصباح و مطالعہ مطالع و مفتاح و تحصیل قوانین ادب و تحسین دواوین عرب" پیرداختہ کہ ظاہراً مقصود کشاف زمخشری در تفسیر و مفتاح مطرزی در نحو و طوالع الانوار من مطالع الانظار تالیف بیضاوی در حکمت و یا شرح مطالع قطب الدین رازی در منطق و مفتاح العلوم سکاکی

---

[1] معارف ص ۲۱۲، [2] معارف : یہ ترجمہ نہیں ہے بلکہ لما فصلت العیر کی وضاحت ہے اسی لئے آیت کے مقابل نہیں ہے بلکہ نیچے لکھی گئی ہے، [3] معارف ص ۲۸۳، [4] تاریخ ادبیات ایران ص ۳۳۶ -

(۱) زیدی اذی مھجتی اذدک ھویً فاجعل الناس عاشق حاقد

(۲) یفرق مابین الکماة وبینھا بضرب بیلی حر کل عاشق

(۳) ومن لم یعشق الدنیا قد یما ولکن لاسبیل الی الوصال

عربی زبان میں عشق یا انتہائی محبت کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے حُب، صبابۃ وُد، شوق اور غرام جیسے الفاظ آتے ہیں، دوسرے حافظ نے یہ دعویٰ کب کیا ہے کہ لفظ عشق قرآن میں موجود ہے، رہ گیا مضمون نگار کا یہ دعویٰ کہ قرآن میں زلیخا کی محبت کا کہیں ثبوت نہیں ملتا ہے، سراسر غلط ہے، مضمون نگار نے سورہ یوسف کی بہت سی آیتیں نقل کی ہیں، اسی سورہ یوسف میں یہ آیت موجود ہے:

وقال نسوۃ فی المدینۃ امرأۃ العزیز تراود فتٰھا عن نفسہ قد شغفھا حبا انا لنرٰھا فی ضلال مبین۔

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور (۳) کلبۂ احزاں شود روزے گلستاں غم مخور

اس شعر پر اعتراض یہ ہے کہ "یوسف گم گشتہ کی واپسی قرآن میں کہیں بھی مذکور نہیں، اور جب وہ واپس نہیں آئے تو ظاہر ہے کہ کلبۂ احزاں "کیسے" گلستاں" ہو سکتا تھا، برعکس اس کے حضرت یوسفؑ کے اعزہ خود مصر گئے تھے"[۱] مضمون نگار کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ "باز آید بکنعاں" سے صرف بچھڑے ہوئے باپ بیٹے کی دوبارہ ملاقات کا مفہوم ادا کرنا مقصود ہے، اس کے علاوہ یوں بھی مضارع کے صیغے "باز آید" اور "شود" استعمال کر کے صرف ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا گیا ہے، یہ کسی گذرے ہوئے واقعہ کا بیان نہیں ہے اس لئے بیچارے حافظ نے کیا گناہ کیا ہے؟

---

[۱] معارف ص ۲۱۴،

اس لئے "آدم بہشت" یعنی آدم نے اسے "خود چھوڑ دیا" کہنا پڑا۔ اگر یہ کہا جاتا کہ آدمؑ نکالے گئے تو بات نہیں بنتی، یہ صحیح ہے کہ قرآن میں جنت کے لئے دارالسلام نہیں استعمال کیا گیا ہے، مگر اسے دارالسلام کہنے میں کیا حرج ہے؟ یہ سلامتی اور عافیت کی جگہ تو ہے ہی، چنانچہ قرآن میں یہ موجود ہے کہ جنتیوں کو سلام علیکم طبتم فادخلوھا خالدین (۲۴۔زمر) کہہ کر خوش آمدید کہا جائیگا، قرآن میں بہشت کے لئے صرف جنت کا لفظ استعمال ہوا ہے یہ بھی محلِ نظر ہے۔ ان باتوں کے علاوہ خود غالب نے جنت کے لئے دارالسلام استعمال کیا ہے:۔

باد دست ہر کہ بادہ بخلوت خورد مدام ۔۔۔ داند کہ حور و کوثر و دارالسلام چیست[1]

من از آں حسن روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم

کہ عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخا را

اس شعر پر اعتراض سنئے: قرآن کو سرتاسر دیکھ جائیے، اس میں کہیں لفظ عشق موجود نہیں ہے، اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ یہ انتہائی محبت کا نام ہے تو زلیخا کا جو کیرکٹر قرآن نے پیش کیا ہے اس سے زلیخا کی محبت کا کہیں ثبوت نہیں ملتا۔[2] پہلی بات تو یہ ہے کہ "عشق" عربی لفظ ہونے کے باوجود نہ صرف قرآن میں نہیں آیا ہے، بلکہ عربی ادب میں بہت کم مستعمل ہوا ہے، راقم الحروف عربی ادب کا ایک ادنی طالب علم ہے، اسے یاد نہیں آتا ہے کہ کسی جاہلی شاعر نے اسے یا اس کے مشتقات کو استعمال کیا ہے عباسی عہد میں جب عربی زبان عجمی تہذیب سے متاثر ہوئی تو یہ لفظ خاص خاص شعرا کے یہاں استعمال ہونے لگا،[3] چنانچہ متبنی کہتا ہے:۔

---

[1] یادگار غالب، شانتی پریس الہ آباد ص ۲۱۲۔ [2] معارف ص ۲۱۴، [3] میری رائے مزید تحقیق کی محتاج ہے لیکن موجودہ بحث پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا ہے اسلئے اس تحقیق کو کسی اور موقع کے لئے اٹھا رکھنا مناسب ہوگا۔

اور اس پر اصرار کرنا، یا مذہبی احکام سے تمسخر کرنا اور چیز. غالب کے متعلق پوری صراحت کے ساتھ یہ معلوم ہے کہ اچھی خاصی عمر ہو جانے تک انھوں نے عربی میں نحو میر سے زیادہ نہیں پڑھی تھی. ایسی صورت میں کسی کا یہ کہنا کہ غالب نے مطالب قرآنی کے سمجھنے کے لئے جو کمال حاصل کیا تھا اور اس کے لئے جو محنت و کاوش کی تھی اس کا سراغ لگانا مشکل ہے کیونکہ ان کی وفات کو سو سال سے زیادہ گذر چکے ہیں اور معاصرین میں کوئی موجود نہیں ہے[1] نہ صرف حقائق سے انکار کرنا ہے بلکہ دوسروں کو شدید گمراہی میں ڈال دینا ہے،

غالب کے اعمال، اور عربی میں ان کے مبلغِ علم کا حال آپ سن چکے، اب ان کے اقوال بھی آپ کے سامنے ہیں، یوں تو وہ قرآن اور مذہب کا جب بھی نام لیتے ہیں تو زیادہ تر انکا مقصد استہزا اور استخفاف ہوتا ہے، چنانچہ گذشتہ صفحات میں ان کے جو اشعار نقل کئے گئے ہیں وہ تقریباً سب کے سب یہاں نمونے کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں، مگر کچھ نئے اشعار سنئے:-

کیا ہی رضوان سے لڑائی ہوگی	گھر ترا خلد میں گر یاد آیا
نہیں کہ مجھکو قیامت کا اعتقاد نہیں	شب فراق سے روز جزا زیاد نہیں
وہ چیز جسکے لئے ہمکو ہو بہشت عزیز	سوائے بادۂ گلفامِ مشکبو کیا ہے؟
جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید.	مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو
واعظ نہ تم پیو، نہ کسی کو پلا سکو	کیا بات ہے تمھاری شراب طہور کی
زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوف حرم سے	آلودہ بمے جامۂ احرام بہت ہے

---

[1] معارف مارچ و اپریل ۱۹۷۲ء ص ۲۷۲،

تیسری بحث | غالب کے متعلق فاضل مضمون نگار کا تیسرا نظریہ کہ

"ان کو قرآن سے خاص شغف تھا، اور وہی ان کے شاعرانہ فکر و تخیل کا محور تھا"

حاصل مضمون کی حیثیت رکھتا ہے اور سب سے زیادہ مضحکہ خیز ہے۔ مضمون نگار کو غالب کی دنیاداری، ان کے عیش امروز، انکی شراب خوری، قماربازی اور بازاری عورتوں پر ان کی گرویدگی کا اعتراف ہے[1]، غالب کو عربی زیادہ نہیں آتی تھی اس کا بھی اقرار ہے[2]، یہ بھی تسلیم ہے کہ غالب نے مطالب قرآنی میں کچھ تحریف بھی کی ہے[3]، اور بعض مقامات پر متن قرآنی سے واقفیت کے باوجود انھوں نے معنی پر غور نہیں کیا اور عربی اور فارسی میں فرق نہیں کر سکے[4]، مضمون نگار نے ان کے کلام سے چند مثالیں بھی پیش کی ہیں لیکن اس پر بھی انھیں قرآن پاک کو غالب کے فکر و تخیل کا سرچشمہ قرار دینے پر اصرار ہے،

غالب کی زندگی کے اہم اور غیر اہم واقعات پوری تفصیل اور صحت کیساتھ محفوظ ہیں، ایسے ذمہ دار لوگوں کی تحریریں اور بیانات موجود ہیں جنھوں نے ان کو خلوت اور جلوت میں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، غالب کے خود نوشتہ حالات کے دفتر کے دفتر ہمارے سامنے ہیں، ان کے مذہبی رجحانات اور مذہبی عقائد کے متعلق خود ان کے اپنے بیانات کثیر تعداد میں موجود ہیں، اور ایسے بیانات موجود ہیں جنکو روایتی مشرقی انکسار پر محمول کر کے یا شاعرانہ سخن گستری کی چھاپ لگا کر، یا صوفیہ کی شطحیات اور طامات کی آڑ لے کر رد نہیں کیا جا سکتا ہے، دوسری طرف خشیت الہٰی سے یا طلب مغفرت کیلئے اقرار گناہ اور چیز ہے، اور عملاً فسق و فجور میں مبتلا رہنا

---

[1] معارف ص ۲۰۴ و ۲۰۵، [2] ایضاً ص ۲۰۷، [3] ایضاً ص ۲۰۰، [4] ایضاً ص ۲۰۱،

خریطۂ جواہر

از

شاہ معین الدین احمد ندوی

(۷)

آغا ملک معروف ۔ ہرزہ گرد باغ چوں بلبل نیم پروانہ ام　　　می توانم کرد پروازے کہ بس باشد مرا

میں بلبل کی طرح باغ کا آوارہ گرد نہیں ہوں (جس کا کوئی نتیجہ نہیں) بلکہ پروانہ ہوں کہ ایک ہی پرواز میرے لیے کافی ہے، یعنی ایک ہی پرواز میں جل کر جان دیدیتا ہوں ؛

امروز صبا گرد رہ یار ندارد　　　گویا کہ بر آں راہگذر چشم ترے ہست

آج باد صبا میں محبوب کی راہ کی گرد نہیں ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس گلی میں کوئی اشکبار آنکھ ہے جس کے آنسوؤں سے گرد بیٹھ گئی ہے۔

مدتے شد کہ دل از غیر تو پرداختہ ام　　　گر قدم رنجہ کنی گوشۂ تنہائی است

ایک مدت سے میں نے دل کو غیر کے خیال سے بالکل خالی کردیا ہے، اگر آپ قدم رنجہ فرمائیں تو بالکل تنہائی ہے،

خواجہ عزیز الحسن مجذوب کا شعر ہے :

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی　　　اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی،

ملک قمی ۔ چنانکہ سایہ شود خود میانِ شمع　　　زجا بہ دم چوں آئینہ رو برگردد

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر ۔ نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

جوئے از بادہ و جوئے ز عسل دار د خلد ۔ لب لعل تو ہم اینست وہم آنست مرا

بادۂ مشکبوئی ما بید و کنار کشت ما ۔ کوثر و سلسبیل ما طوبی ما بہشت ما

گفتم حدیث دوست بقرآں برابر است ۔ نازم بکفر خود کہ با یماں برابر است

چوں نیست تاب برق تجلی کلیم را ۔ کے در سخن بہ غالب آتش بیاں رسد

اگر کلیم شود ہم زباں سخن نکنیم ۔ وگر خلیل شود میہماں بگر دانیم

خود را ز سر د مہری اسلامیان شہر ۔ در حلقۂ پرستش آزر گرفتہ ایم

اپنی مشہور نظم "چراغ دیر" میں بنارس کو "کعبۂ ہندوستاں" اور "بہشت خرم و فردوس معمور" کہکر بھی سیر نہیں ہوتے ہیں اور فرمائے ہیں :-

شبے پرسیدم از روشن بیانے ۔ زگردش ہائے گردوں راز دانے

کہ بیں نیکو ئیہا از جہاں رفت ۔ وفا و مہر و آزرم از میاں رفت

بدیں بے پر دگیہائی علامت ۔ چرا پیدا نمی گرود قیامت

سوئے کاشی باندازِ اشارت ۔ تبسم کرد و گفتا ایں عمارت

کہ حقا نیست صانع را گوارا ۔ کہ از ہم ریزد ایں رنگیں بنا را

اللہ اللہ! ایک مسلمان کے دل میں کاشی کی یہ عظمت ہے ۔ مگر اس کے نزدیک قرآن مجید کی قیمت شراب کے ایک پیالے کے برابر بھی نہیں ہے ، وہ نعوذ باللہ مئے سرخ کے بدلے قرآن اور خرقہ دونوں بیچ دینے کے لئے تیار ہے ۔

غالب اگر نہ خرقہ و مصحف بہم فروخت ۔ پرسد چرا کہ نرخ مئے لعل فام چیست؟

(باقی)

تجلی ایمان نمبر :- قیمت ۸ ۔ (تجلی آفس ، دیوبند ، یوپی)

میرے لیے بھی قفس کا دروازہ کھولنا چاہیے کیونکہ میں بھی کسی امید ہی میں آشیانہ سے اڑا ہوں اس لیے اس فیض کا مستحق ہوں،

منعم حکاک۔ درخمارم روز و شب باآنکہ صہبا می کشم خشک لب چوں ساحلم ہرچند دریا می کشم

باوجودیکہ شراب پیتا ہوں لیکن رات دن خمار ہی میں رہتا ہوں (مستی نہیں پیدا ہوتی) میری مثال ساحل کی ہے کہ ہرچند سمندر کی موجیں اسے سیراب کرتی رہتی ہیں، لیکن اس کے لب خشک ہی رہتے ہیں،

آنزا کہ زور بازوئے کسب ہنر بود دستِ پُر آبلہ صدفِ پر گہر بود

جس کے بازوؤں میں کمانے اور ہنر کی طاقت ہوتی ہے، اس کے آبلہ بھرے ہوئے ہاتھ گویا موتی سے معمور صدف ہوتے ہیں، یعنی دولت و ثروت اور عروج، ترقی، محنت اور ہنر ہی سے حاصل ہوتی ہے،

مخلص کاشی۔ زمانہ حالت بیماریِ اجل دارد کدام روز کہ بدتر ز روزِ اول نیست

زمانہ کی حالت موت کی بیماری جیسی ہے جس میں روز بروز مریض کی حالت بدتر ہی ہوتی جاتی ہے، اس طرح زمانہ کی حالت سدھرنے کے بجائے برابر خراب ہی ہوتی جاتی ہے،

بیگانہ وار می گذر د از سوادِ چشم اے نورِ دیدہ حبِّ وطن در دلِ تو نیست

محبوب کی جگہ سوادِ چشم ہے اور سواد آبادی کے آس پاس کے حصہ کو بھی کہتے ہیں، اس سے فائدہ اٹھا کر کہتا ہے کہ تو سوادِ چشم سے بیگانہ وار گذر جاتا ہے، اے نورِ دیدہ تیرے دل میں وطن کی محبت نہیں ہے کہ سوادِ چشم پر بھی نظر نہیں ڈالتا۔

درکشادِ گرہ خلق مکن کوتاہی ہمچو ناخن اگر از دستِ تو برمی آید

اگر ناخن کی طرح تیرے ہاتھ سے گرہ کھل سکتی ہے تو مخلوق کی گرہ کھولنے میں کوتاہی

جس طرح دو شمعوں کے درمیان سایہ کافور ہو جاتا ہے، اسی طرح جب محبوب آئینہ کے روبرو ہوتا ہے تو (گویا دو شمعیں آمنے سامنے ہوتی ہیں، ایک محبوب دوسرا اس کا عکس) اس منظر کو دیکھ کر میرے ہوش وحواس باقی نہیں رہتے اور اپنے سے بیخبر ہو جاتا ہوں،

در سینہ دلم گم شد، تہمت بہ کہ بندم　　غیر تو دریں خانہ کسے راہ ندارد

میرے سینہ میں دل گم ہو گیا ہے مگر (چوری کی) تہمت کس پر لگاؤں، اس گھر میں تیرے سوا کسی کا گذر نہیں ہے، اس شعر کی خوبی چوری کی حسن تعبیر ہے، ظاہر ہے کہ دل کا چور محبوب ہے لیکن تصریح کے ساتھ اس کو نہیں کہتا،

بدگمانی ملاحظہ ہو :

گوید مرو ز خانہ کہ من خواہم آمدن　　تا من بریں بہانہ نیایم بکوئے تو

محبوب مجھ سے کہتا ہے کہ گھر سے کہیں نہ جا، میں آؤں گا تاکہ میں اس کے انتظار میں اسکی گلی میں نہ جاؤں،

من کیستم کز ستم ہمچو توئی داد کنم　　کہ کند حرف مرا گوش کہ فریاد کنم

میری کیا ہستی ہے کہ تیرے جیسے شخص کے ظلم کی دادخواہی کروں، اگر میں فریاد بھی کروں تو کون سنے گا یعنی تیرے مقابلہ میں کوئی میری فریاد بھی سننے والا نہیں ہے،

مجدائی منصف۔ بیخود از زمزمۂ مرغ گرفتار شدم　　دیگرے یاد تو میکرد من از کار شدم

میں مرغ گرفتار کا زمزمہ سنکر بیخود ہو گیا، یاد تو تجھکو دوسرا شخص کر رہا تھا، اور میں آپے میں نہیں رہا،

ع　　ساغر کو میرے ہاتھ سے لیجیو کہ چلا میں

مشہدی قمی۔ بر رویم از قفس در فیضے تواں کشود　　من ہم ز آشیاں بامید سے پریدہ ام

تم اپنے معمار آپ نہ بنو ورنہ آباد گھروں کو ویران کر دو گے، بلکہ ویرانہ بنو کہ تمہاری بنیاد پر عمارت تعمیر ہو، اس کا صوفیانہ مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسان اپنی اصلاح آپ نہیں کر سکتا، اس سے اور خرابی پیدا ہوتی ہے بلکہ اپنے کو ناقص اور ہیچ سمجھ کر ہی بڑا مرتبہ حاصل ہو سکتا ہے،

محمد رضا مشتاق۔ گلشن اگرچہ صیقل آئینۂ دل است   اما بگرد دامنِ صحرا نمی رسد

گلشن اگرچہ آئینۂ دل کے لیے صیقل ہے، جس سے اس کی کدورت اور افسردگی دور ہوتی ہے لیکن وہ دامنِ صحرا کی گرد کو بھی نہیں پہنچتا، اسکی بات ہی اور ہے یعنی دیوانگانِ محبت کے لیے گلشن کی سیر سے صحرا نوردی زیادہ خوش آیند ہے،

مبارک اللہ ہوس۔ آنکہ با وصل ہم نمی سازد   دل بے صبر و بیقرار من است

جس کو وصل سے بھی سکون و اطمینان نہیں حاصل ہوتا وہ میرا بے صبر و بیقرار دل ہے۔

حکیم مرزا محمد۔ بلبل بہ فغان من بخموشی غم خود را   ہر کس بزبانیکہ توانست ادا کرد

بلبل نے فغاں کے ذریعہ اور میں نے خموشی کے ذریعہ اپنا غم دل بیان کیا، جس سے جس زبان میں ہو سکا، اس کو ادا کیا، یعنی بلبل کی فغاں اور عاشق کی خموشی دونوں کا مقصد ایک ہے، صرف زبان جدا ہے،

انند رام مخلص۔ در جہاں از اصل کار ما کسی آگاہ نیست   ایں مرقع را مگر تصویر عنقائیم ما

دنیا میں ہمارے اصل مقصد سے کوئی بھی واقف نہیں اور اس مرقع میں ہماری حیثیت عنقا کی تصویر کی ہے جس کے وجود کا پتہ نہیں۔

میفروشد بدو عالم نگہے   بچشم بد دور ہنوز ارزان است

محبوب ایک نگاہ دو عالم میں بیچتا ہے یعنی اس کی ایک نگاہ کی قیمت دونوں عالم

نہ کر، یعنی اگر تجھ سے کسی انسان کا کام نکل سکتا ہے تو اسے کرنا چاہیے،

باآں منت پئے قتلِ من آں مغرور می آید — کہ پنداری طبیبے بر سر رنجور می آید

وہ بہت مغرور اس طرح احسان رکھتے ہوئے میرے قتل کے لیے آتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کوئی طبیب کسی بیمار کے علاج کے لیے آتا ہے، یعنی قتل کو بھی احسان سمجھتا ہے،

شنیدم گفتۂ کز جان ما مخلص چہ می خواہد — بقربانت شوم ایں حرف باید از تو پرسیدن

اس شعر کی خوبی اس کا طرز ادا ہے، کہتا ہے، میں نے سنا ہے کہ تو کہتا ہے کہ آخر مخلص مجھ سے کس چیز کا خواہشمند ہے "اے تیرے قربان اس بات کو تو تجھ سے پوچھنا چاہیے" کہ تو ہی اس کا جواب دے سکتا ہے،

میر معنی۔ آں مہ کہ از بے طاقتیِ من گلہ دارد — گو آئینہ برگیرد جواب گلہ بشنو

وہ ماہ رو جس کو میرے ضعف اور ناتوانی کی شکایت ہے کہ میں اتنا کمزور کیوں ہو گیا، اس سے کہو کہ وہ آئینہ دیکھ لے، اس شکایت کا جواب مل جائے گا، یعنی اس ناتوانی کا سبب اس کا حسن ہے،

محمد مقیم طہرانی۔ بے جام بادہ سیر گلستاں تمام نیست — دستے کہ بے پیالہ بود شاخ بے گل است

بغیر جام شراب کے گلستاں کی سیر کا پورا لطف حاصل نہیں ہوتا جس ہاتھ میں شراب کا پیالہ نہیں وہ بے پھول کی شاخ ہے،

تا گشتہ است گوشۂ میخانہ منزلم — آبے نمی خورد دگر از ہیچ جا دلم

جب سے میخانہ کا گوشہ میری منزل مقصود بنا ہے، کسی دوسری جگہ میرا دل پانی بھی نہیں پیتا یعنی اسکی پیاس میخانہ کے سوا کہیں نہیں بجھتی،

معمار خود مشو کہ کنی خانہا خراب — ویرانہ باش کز تو بنائے شود بلند

اس کے ظلم وستم سے ڈرتے ہیں اور میں اس کے لطف وکرم سے ڈرتا ہوں کہ اس کا نتیجہ ظلم سے بھی زیادہ خراب نکلتا ہے،

نسبتی مشہدی۔ میرفت و عالمے نگراں نش زبیکسی
رشکم بدل فزود کہ تاب نظر نداشت

محبوب گذر رہا تھا اور ایک مخلوق اس کو بیکسی کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی، اس سے میرا رشک اور بڑھ گیا کہ اس میں دیکھنے کی بھی تاب وتواں نہ تھی،

نطقی نیشاپوری۔ چہ لازم است کہ بدنام قتل من باشی زمانہ وسپہرے و روزگارے ہست

یہ ضروری نہیں ہے کہ تو میرے قتل میں بدنام ہو، اس کیلئے زمانہ آسمان اور روزگار موجود ہیں، ان کے سر الزام رکھ دیا جائے گا،

پس از گل گر رود بلبل زگلشن جائے انداز د باں چشمیکہ گل دیداست نتواند خزاں دیدن

اگر موسم گل کے بعد بلبل گلشن سے چلی جائے (تو لائق عفو ہے) کیونکہ جن آنکھوں سے پھولوں کو دیکھا ہے، اس سے خزاں کا منظر نہیں دیکھ سکتی،

میر نظام دست غیب۔ نہا د بر لب من دست بہر خاموشی دگر بروئے خود آں دست از حیا نگذاشت

محبوب نے مجھکو خاموش کرنے کے لیے میرے لبوں پر جو ہاتھ رکھا تھا، اس کو شرم کی وجہ سے پھر اپنے منہ سے نہیں لگا ما کہ اس سے بالواسطہ اس کے چہرہ کا لمس ہو جاتا،

نے زبہر آمدن پرسی رہ ویرانہ ام بہر آں پرسی کہ دیگر بار ازاں رہ نگذری

میرے ویرانہ کا راستہ تونے آنے کے خیال سے نہیں پوچھا، بلکہ اس لیے پوچھا ہے کہ دوبارہ اس راہ سے نہ گذرے،

من نمی گویم نصیب مدعی ہجراں شود آنچہ با ما در دلش باشد نصیبش آں شود

ہے، چشم بد دور، اس قیمت میں بہت ارزاں ہے۔

بدست غیر چو داماں او نظارہ کنم　　بغیر ازیں کہ گریباں درم چہ چارہ کنم

جب میں محبوب کا دامن رقیب کے ہاتھ میں دیکھتا ہوں تو اپنا گریباں پھاڑنے کے سوا

اور کیا چارہ کار رہ جاتا ہے، اس شعر میں داماں اور گریبان سے لطف پیدا کیا گیا ہے،

ازاں ہر لحظہ در بر می کنم سرو گلستاں را　　کہ ایں رعنا جواں بسیار می ماند بیار من

میں باغ کے سرو سے بار بار اس لیے لپٹتا ہوں کہ یہ جوان رعنا میرے محبوب سے بہت مشابہ ہے،

حضرت نظام الدین اولیاء نرگسی۔　　از تو نتواند بریدن کس بآسانی مرا

گرنمی دانم کسم آخر تو میدانی مرا

کوئی شخص مجھکو آسانی سے تجھ سے جدا نہیں کرسکتا، اگر میں خود اپنے کو نہیں جانتا لیکن

تو تو مجھکو جانتا ہے،

تا کے اے دل فکر در دِ بے دوائے میکنی　　از برائے خود چہ کردی کز برائے من کنی

دل سے کہتا ہے کہ تو میرے درد لا دوا کی فکر کب تک کرتا رہے گا تونے اپنے لیے کیا کیا ہے کہ

میرے لیے کرے گا، یعنی اس بیماری کا اصل سبب تو تو ہی ہے، جب تو اپنا علاج نہ کرسکا

تو میرا کیا کرے گا۔

بابا نصیر گیلانی۔ قدر وفائے من چو ندانذ گذاشتیم　　چنداں جفا کند کہ خود از خود خجل شود

اگر محبوب میری وفا کی قدر و قیمت نہیں جانتا تو میں نے بھی اس کو اس کے لیے آزاد چھوڑ دیا

ہے کہ اتنی جفائیں کرے کہ آخر میں خود اپنے آپ سے شرمندہ ہو،

دلے دارم خراب از التفات چشم پرکارش　　ہمہ از جور می ترسند و من از لطف بسیارش

میرا دل اس کی پرکار اور فسوں ساز آنکھوں کی توجہ کا مارا ہوا ہے، اس لیے سب لوگ تو

خود اپنے دل میں اپنے کو سیکڑوں خطاؤں کا مجرم بنا لیا ہے،

دعا کنید بوقت شہادتم اورا کہ ایں دمیست کہ در ہائے آسماں باز است

میری شہادت کے وقت قاتل (محبوب) کو دعا دو کیونکہ اس وقت (قبولیت دعا کیلیے) آسمان کا دروازہ کھلا ہوا ہے، اس لیے دعا ضرور قبول ہوگی،

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست

محبوب کا پورا سراپا اتنا حسین ہے کہ اس کے جس حصہ کو دیکھتا ہوں اس کا کرشمہ دل کا دامن کھینچتا ہے کہ اصل دل لگانے کی جگہ یہی ہے،

نیست لذت ز نظر بازی بزمیکہ درو خندہ زیر لب و گریۂ پنہانی نیست

اس بزم کی نظر بازی میں کوئی لذت نہیں ہے، جس میں خندہ زیر لب کے ساتھ باطن کی آنکھوں میں گریہ نہ ہو کہ اصل لذت و حلاوت اسی سے حاصل ہوتی ہے،

خونِ ترا چہ قدر نظیریؔ خموش باش ایں بس کہ دعویٰ از طرفِ قاتلِ تو نیست

نظیری (اپنے قتل پر) خاموش رہو، تمھارے خون کی قیمت ہی کیا ہے کہ اس کا گلہ کیا جائے، یہی غنیمت سمجھو کہ قاتل کی طرف سے کوئی دعویٰ تم پر نہیں ہے،

پایم بہ پیش از سر ایں کو نمی رود یاراں خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہ کیست

اس گلی سے میرے قدم آگے نہیں بڑھتے، دوستو بتاؤ کہ یہ کس کی جلوہ گاہ ہے، جس کی کشش آگے نہیں بڑھنے دیتی،

رسوا منم وگرنہ تو صد بار در دلم رفتی و آمدی و کسے را خبر نشد

میں خود اپنی رسوائی کا سبب ہوں، ورنہ تو سیکڑوں بار میرے دل میں آتا جاتا رہا، اور کسی کو خبر نہ ہونے پائی،

میں یہ نہیں کہتا کہ رقیب ہجر میں مبتلا ہو بلکہ یہ چاہتا ہوں کہ اس کے دل میں میرے متعلق جو خیال ہو وہی اس کو پیش آئے، یہ شعر حسن تعبیر کی اچھی مثال ہے،

غبارے گر نشیند از رہِ آں نازنیں بر من بود باد صبا را منتِ روئے زمیں از من

اگر اس نازنین کے کوچہ کی خاک مجھ پر پڑ جائے تو یہ باد صبا کا اتنا بڑا احسان ہوگا کہ گویا پورے زمین کا احسان مجھ پر ہوگیا۔

گر درد کند پائے تو اے حور نژاد از درد مداں کہ ہرگزت درد مباد

ایں دردِ من است بر منش رحم آمد از بہر شفاعتم بپائے تو فتاد

اے حور نژاد اگر تیرے پاؤں میں درد ہوتا ہی تو اس کو درد نہ سمجھ، خدا تجھے درد سے محفوظ رکھے، درحقیقت یہ میرا درد ہے، اس کو میری حالت پر رحم آیا ہے، اس لیے میری سفارش میں تیرے پاؤں پڑا ہے،

نظیری نیشاپوری ۔ جرمِ من است پیش تو گر قدر من کم است
خود کردہ ام پسند خریدار خویش را

اگر تیری نگاہ میں میری قدر و قیمت کم ہے تو اس میں تیرا قصور نہیں ہی، اسلیے کہ میں نے اپنا خریدار خود پسند کیا ہی اس لیے اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے،

شرم می آید ز قاصد طفل محجوب مرا بر سر راہش بیندازید مکتوب مرا

میرے کمسن شرمیلے محجوب کو قاصد سے (خط لینے میں) شرم آتی ہے، اس لیے میرے خط کو اسے دینے کے بجائے اس کی رہگذر میں ڈالدو کہ وہ آنکھ بچا کر اٹھالے،

بے سبب گر دادی آزارم خجل از من مباش کردہ ام خاطر نشانِ خویش صد تقصیر را

اگر تو نے بے سبب مجھکو تکلیف پہنچائی ہے تو تجھکو شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں، میں نے

میں صیاد کی مہربانیوں سے شرمندہ رہتا ہوں کہ اگر سیکڑوں مرتبہ اس کے دام سے نکل بھاگتا ہوں تو وہ پھر پکڑ لیتا ہے، گرفتاری کو صیاد کی مہربانی سے تعبیر کرنا حسن شاعرانہ ہے،

اقبال بہ بینید کہ آں دشمن جانہا نیکی نہ کند باکس و بدخواہ ندارد

اس دشمن جاں کی یہ خوش نصیبی بھی دیکھنے کے قابل ہے کہ وہ کسی کے ساتھ نیکی نہیں کرتا پھر بھی اس کا کوئی بدخواہ نہیں ہے، (ہر شخص محبت ہی کرتا ہے)

وزا عزت ناصح۔ بُرد ما را ہوسِ خام ز رہ در پیری راہ گم گشت بہ نزدیکیٔ منزل ما را

پیری میں ہوس خام نے مجھے صحیح راستہ سے بھٹکا دیا اور منزل کے قریب پہنچکر میں راستہ بھول گیا یعنی زندگی کا اصل مقصد تو ترک ہوتی تھا لیکن پیری میں ہوا و ہوس نے اس راستہ سے ہٹا دیا، اس طرح جب موت کی منزل قریب آگئی تو اصل راستہ بھول گیا،

رہے از کوچہ شمع است تا کوئے فنا روشن کہ قطع آں رہ از بال و پر پروانہ می آید

جو راہ شمع کے کوچہ سے فنا کے راستہ تک روشن ہے، وہ پروانہ کے بال و پر کے ذریعہ طے ہوتی ہے۔ یعنی جان دے کر ہی اس کو طے کیا جاسکتا ہے،

نسبتی تھانیسری۔ سخت می ترسم کہ من بسیار میخواہم ترا آرزو خوب است لیکن ایں قدرہا خوب نیست

میں اس سے بہت ڈرتا ہوں کہ تجھے بے اندازہ محبت کرتا ہوں، یہ آرزو تو بہت اچھی ہے لیکن اتنی شدت اچھی نہیں ہے (کہ اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلتا)

شب ہجرت شب دگرگون است یک شب ہجر صد شب خون است

ترے ہجر کی رات اور دوسری راتوں کا مقابلہ نہیں ہے، تیری شب ہجر کا معاملہ بھی دوسرا ہے، ایک شب ہجر سیکڑوں شبخونوں کے برابر ہے۔

آنقدر جور کن کہ گر جائے گفتہ آید کس اعتبار کند

قاصد جگرم سوخت چہ پیغام و چہ نامہ   دل بود بہاں خوش کہ بامید خبر بود

یار سے نامہ و پیام کا کیا ذکر قاصد نے تو (سماں بتاکر) دل ہی جلا دیا۔ اس کے نہ آنے تک دل خوشخبری کی امید میں خوش تھا، قاصد نے بالکل مایوس کر دیا۔

قاضی نور۔ بیند چو کسے روئے تو گیرم سر راہش   تا ذوقِ تماشائے تو دزدم ز نگاہش

جو شخص تیرا رخِ زیبا دیکھکر آتا ہے، اس کو میں راستہ ہی میں پکڑ لیتا ہوں کہ اسکی نگاہوں سے ذوق تماشا یعنی تجھے دیکھنے کا لطف چرا لوں،

اردو کا اسی سے ملتا جلتا [illegible]

ان کے جلوے کا تو کیا کہنا مگر   دیکھنے والے کو دیکھا چاہیے

ناظم ہروی۔ ناظم زیاں نکرد اگر بندۂ تو شد   خود را فروختن بتو یوسف خریدن است

اگر ناظم تیرا غلام بن گیا تو گھاٹے میں نہیں رہا، تیرے ہاتھ اپنے کو بیچنا یوسف کو خریدنا ہے، یعنی اپنے کو بیچکر تیرا جیسا یوسف مل گیا،

جائے خوب است جہاں اہل جہاں خوب نیند   آہ ازیں خانۂ آباد کہ پُر ویران است

دنیا تو بہت اچھی جگہ ہے لیکن دنیا والے اچھے نہیں ہیں۔ وہ آباد گھر بھی کس قدر افسوس کے قابل ہے جو ویرانی سے معمور ہے یعنی دنیا اپنی ذات سے اچھی اور آباد ہے لیکن دنیا والوں کی برائی سے بالکل ویران ہے،

در خانقاہ وحدت ذکر خفی [illegible]   چوں دانہ سبحہ یکحرف از صد دہن بر آید

وحدت کی خانقاہ میں مخفی لطف ہے کوئی ذکر نہیں ہے تسبیح کے تاگے کی طرح سیکڑوں منہ سے ایک بات نکلتی ہے یعنی سب دانے الگ الگ ہیں لیکن سب ایک تاگے میں پروئے ہیں،

مرا شرمندہ دارد مہربانیہائے صیادے   کہ از دامش اگر صد بار بگریزم دگر گیرد

تلخیص و ترجمہ

ایک عالمی طبی کانفرنس

بعض مسائل حاضرہ پر بحث

از ڈاکٹر محمد حسن محمود سعید

ترجمہ مولوی محمد ایوب صاحب اصلاحی استاذ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر

دنیا چاند تک پہونچ جانے کے خواب کی تکمیل پر ہمیشہ ناز کرتی رہے گی اور اپنی اس عظیم فتح کے نشہ میں مستقل سرشار رہے گی۔ دل کے مشہور سرجن ڈاکٹر دانے ایک اخبار میں لکھا کہ "اس صدی میں انسان کی سب سے بڑی کامیاب علمی تحقیقات دو ہیں، (۱) چاند تک پہونچنا (۲) ایک شخص کا دل دوسرے شخص کے سینے میں لگا دینا" میں یہاں چاند تک پہونچنے کے بارے میں کوئی گفتگو نہ کرونگا کیونکہ دنیا اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہے اور اس کے اسپشلسٹ مجھ سے بہتر اس موضوع پر روشنی ڈال سکتے ہیں، البتہ میں دوسرے جز یعنی "دل کی قلم کاری" کو اپنی گفتگو کا موضوع بنانا چاہتا ہوں۔

اولاً تو ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے جس نے اسے بہت قریب سے دیکھا، بلکہ بہت سے

تو اس قدر ظلم و ستم کر کہ جہاں بھی بیان کیا جائے کسی کو اعتبار نہ آئے،

زلف است و چشم و ابرو و رخسار نسبتی ایں چند فتنہ اند کہ در یک زمانہ اند

نسبتی محبوب کی آنکھیں، اسکے ابرو اور رخسار اتنے فتنے ایک زمانہ میں جمع ہوگئے ہیں،

بعد مردن ایں قدر دانم کہ خواہی گفت حیف تا کنم با او وفا عمرش وفا داری نکرد

اتنا مجھکو معلوم ہے کہ میرے مرنے کے بعد تو کہے گا کہ افسوس جب تک میں وفا کروں اسکی

عمر نے وفا نہ کی،

باور نمی شود کہ گہے ایں دلِ خراب معمور بودہ است کہ ویرانہ کردہ اند

دل کی دنیا اتنی ویران ہے کہ اس کو دیکھکر یقین نہیں آتا کہ یہ کبھی آباد بھی تھا جس کو بعد میں

ویران کر دیا گیا۔ میر کا یہ شعر اسی سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے،

خرابی دل کی اس حد ہے کہ یہ سمجھا نہیں جاتا کہ آبادی بھی یاں تھی یا کہ ویرانہ تھا مدت کا

نصیبی بانور بخشی۔ تو خود بگو کہ دگر دامن کرا گیرم مرا کہ چاک ز دست تو در گریبان است

میرا گریباں تیرے ہاتھوں چاک ہوا ہے یعنی میری دیوانگی کا سبب تو ہی ہے، ایسی حالت میں تو

خود بتا کہ تیرے علاوہ کس کا دامن تھاموں۔

ز ہجرم بر لب آمد جان بوصلم می دہی وعدہ کسے را وعدہ دہ کو را امید زیستن باشد

ہجر سے میری جان لبوں پر آگئی ہے اور تو وصل کا وعدہ کر رہا ہے، یہ وعدہ ایسے شخص سے کرنا چاہیے

جس کو زندگی کی امید ہو۔ میں تو مرنے کے قریب آگیا ہوں، اس لیے اس وعدہ سے کیا حاصل؛

ذہنی۔ کس را نہ بینم ز غم جز سایہ در پہلوے خود آں ہم چو بینم روئے او گرداند از من روئے خود

غم کے زمانہ میں میرے سایہ کے علاوہ اور کوئی میرے پاس نہیں ہے، اسکا حال بھی یہ ہے کہ جب میں اسکی

طرف دیکھتا ہوں تو مجھ سے منہ پھیر لیتا ہے، منہ پھیر کر سایہ کی طرف دیکھنے سے لازمی طور پر اسکا منہ بھی پھر جاتا ہے،

بیرسٹر تھے، جو وزارتِ انصاف کی طرف سے اس لئے مقرر کئے گئے تھے کہ وہ
اعضا کی قلم کاری کے مسئلہ پر قانونی حیثیت سے غور کریں اور ارباب مذاہب
کی رایوں کی روشنی میں اس کے مسائل کا استنباط کریں، چنانچہ اس غرض کے لئے
مختلف مذاہب کے نمایندوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا، کیتھولک فرقہ کی طرف
سے علماء کی ایک تعداد آئی تھی جس کے سربراہ روم کے Fuchs اور فرانس
کا وہ راہب تھا جس کے دل کی پیوندکاری کی گئی تھی۔ اسی طرح آرتھوڈکس
اور پروٹسٹنٹ کے بھی بہت سے نمایندے آئے تھے، یہودی مذہب کی طرف
سے حاخام میڈرڈ اور تل ابیب کے حاخام اکبر بھی تھے، حکومت اسپین نے
مسلمانوں کی نمایندگی کے لئے مراکش دعوت نامہ بھیجا کہ وہاں سے اسلام کے
نقطۂ نظر کی نمایندگی کرنے والے علماء بھیجے جائیں، چنانچہ وہاں سے شریعت کالج
کے دو پروفیسر آئے، اس کانفرنس میں نگاہیں مذہبی شخصیات اور ان عام
مشاہدین کی طرف لگی ہوئی تھیں جو دل کی پیوندکاری جیسے پیچیدہ مسائل کو تو
نہیں سمجھ سکتے تھے لیکن اس بارے میں مذہب کی رائے جاننا چاہتے تھے اس
سے اسپین کے عوام کی مذہبی عقیدت اور کلیسا کی تعلیمات کی پابندی کا
اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے یہ مثال کافی ہوگی کہ جیسے ہی پوپ نے
مانع حمل گولیوں کے خلاف اپنی رائے شائع کی تو بازاروں اور
کارخانوں سے اس کی گولیاں اس طرح غائب ہوگئیں کہ تلاش کرنے پر
بھی نہ مل سکتی تھیں، حالانکہ اس سے پہلے وہ بہت عام تھیں، عوام کی طرح
ڈاکٹروں کو بھی مذاہب کے فیصلے معلوم کرنے سے بڑی دلچسپی تھی تاکہ وہ

کامیاب آپریشنوں میں جن کا تجربہ (میڈریڈ) کے Concepcion اسپتال میں کتوں پر کیا گیا، شریک رہا ہوں، دوسرے یہ کہ مجھے اس اولین عالمی کانفرنس میں شرکت کا موقع ملا ہے جس میں ستر۷۰ ملکوں کے نمائندے شریک تھے۔ اور جس کا موضوع بحث صرف دل کا بدلنا نہ تھا بلکہ دیگر اعضا مثلاً پھیپھڑے، گردے، آلات ہضم، نظام اعصاب وغیرہ کا بدلنا بھی زیر بحث تھا، اس کانفرنس میں دنیا کے ممتاز ماہرین کے ساتھ علمائے شریعت، ماہرین قانون اور شریعت کے مزاج آشنا ڈاکٹر اور مذہبی لوگ بھی موجود تھے،

یہ کانفرنس اسپین کی حکومت کی طرف سے طلب کی گئی تھی اور اس کے منتظم صدر مملکت فرانکو کے عزیز ڈاکٹر مارٹینز (Martinez) تھے جنھوں نے اسپین میں سب سے پہلے دل بدلنے کی خدمت انجام دی، کانفرنس کا آغاز حکومت اسپین کے صدر، وزرار، افسران اور سربراہان کلیسا کی موجودگی میں ہوا، اس کانفرنس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس میں دو سو سرکاری نمایندوں کے علاوہ اس سے کئی گنا زیادہ سامعین و مشاہدین تھے اور اسپین کی پوری صحافت کانفرنس کی تجاویز اور اس کی کارروائیوں کی رپورٹ لینے میں مشغول رہی ہیں اس سادہ سی رپورٹ میں وہاں جو کچھ ہوا اسکا خلاصہ پیش کرونگا اور ان باتوں کا ذکر کرونگا جنھوں نے مجھے ایک عرب مسلمان ہونے کی حیثیت سے آمادہ کیا کہ میں اس معاملہ کو اہمیت دوں اور اس کانفرنس کی روداد لکھوں،

کانفرنس کو آٹھ گروپوں میں تقسیم کیا گیا تھا، ان میں ایک گروپ قانونی تشریع کا بھی تھا اس کے نمایندوں کی تعداد ۱۲ بارہ تھی ان میں زیادہ ترجج اور

(۲) کسی مردہ آدمی کے اکہرے اعضا (مثلاً دل اور جگر) کو کسی دوسرے زندہ آدمی کے حوالہ کرنا شرعاً کیسا ہے؟

(۳) اگر مرنے والے نے اپنی لاش کے متعلق کوئی وصیت کی ہو تو اس کی حیثیت کیا ہوگی؟

(۴) ڈاکٹروں کی طرف سے موت کے اعلان پر اتفاق یا عدم اتفاق؟

(۵) (۵) مذہبی رایوں کا احترام جو اعضا کی پیوندکاری کے خلاف ہیں۔

(۶) تجربہ کے لئے زندہ آدمیوں کے اندر جزئی یا کلی طور پر اعضا کی پیوند کاری ممکن ہے یا نہیں؟

(۷) ایسے اشخاص سے معاملہ کی نوعیت کیا ہوگی جو Descerbrodos ہیں یعنی انکا دماغی مرکز اعصاب بے جان ہوچکا ہے، اور دوسرے اعضا مثلاً دل، پھیپھڑے وغیرہ زندہ ہیں، طبی طور پر ایسے لوگوں کے اچھے ہونے کی کوئی توقع نہیں ہوتی اسلئے کہ انکا مرکزی نظام اعصاب بے جان ہوچکا ہوتا ہے،

(۸) دماغ کو جزئی یا کلی طور سے انسانوں کے اندر لگانے کے امکان پر غور و خوض، عورت کے خصیۃ الرحم اور مردوں کے خصیتین کی پیوندکاری کے عنوانات پر بحث،

مختلف مذاہب کے نمائندوں نے مذکورہ بالا مسائل کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا انکا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ مسیحی اور یہودی علما نے زندہ اشخاص کے دوسرے اعضا میں سے ایک عضو کو کسی دوسرے زندہ شخص کو بلا قید و شرط ہدیہ کر دینے کی اجازت دیدی اور بیع کے متعلق یہود نے کہا کہ وہ ہوسکتی ہے کیونکہ بائع کا شخصی معاملہ ہے البتہ عیسائیوں

آزادی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے سکیں،

اس مسئلہ میں ارباب مذاہب کے فیصلوں کی بڑی اہمیت تھی، اسلئے ضروری تھا کہ میں کانفرنس سے پہلے بحیثیت ایک مسلمان کے مسلم مندوبین سے ملاقات کر کے کانفرنس میں زیر بحث موضوعات کے بارے میں ان کی رائے معلوم کروں، کیونکہ یہ جو کچھ کہیں گے اخبارات میں شائع ہوگا، کانفرنس میں پیش ہوگا مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے ہوں گے۔ لیکن مجھے یہ معلوم کرکے سخت تعجب ہوا کہ ایک صاحب نے کانفرنس شروع ہونے سے دو تین روز پہلے اپنی آمد کی اطلاع دی ہے اور دوسرے صاحب کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہوسکا حالانکہ دعوت نامے کانفرنس شروع ہونے سے دو مہینے پہلے بھیج دیے گئے تھے، یہ لوگ اگرچہ اسلامی شریعت کے متعلق کافی معلومات رکھتے تھے، مگر کچھ ایسے دقیق طبی مسائل بھی درپیش تھے جن سے واقف ہونا ضروری تھا تاکہ ایک مسلمان عالم ان کے بارے میں اپنے مذہب کا صحیح فیصلہ بتا سکے،

ملیشیا کی حالیہ کانفرنس میں دل کی پیوندکاری کے متعلق مجمل طریقہ سے بحث ہوئی تھی لیکن اس کانفرنس میں نمایندگان مذاہب کو زیر بحث سوالات کا معقول اور مفصل جواب دینا تھا، حسن اتفاق سے اس وفد میں مجھے بھی شرکت کرنے کا موقع ملا، چنانچہ میں نے تفصیل کے ساتھ ان کے سامنے اپنے خیالات رکھے اور طبی امور کی وضاحت کی، اور کل مباحثوں میں حصہ لیا،

سوالات یہ تھے،

(۱) زندہ آدمی کے دوہرے اعضا مثلاً گردے اور پھیپھڑے میں سے کسی ایک عضو کو کسی دوسرے شخص کے ہاتھ بیچنا یا ہدیہ کرنا شرعاً کیسا ہے؟

وہ فرانس میں ممنوع ہے، البتہ خون کا ہدیہ کرنا صحت مند لوگوں کے لئے اختیاری بات ہے بیع کی ممانعت اس احتیاط کی وجہ سے ہے کہ لوگ مادی منفعت کی خاطر اپنے آپ کو ہلاک نہ کریں، کچھ لوگوں نے ان کی رائے مسترد کردی، اس پر وہ اس قدر ناخوش ہوگئے کہ کانفرنس چھوڑ کر چلا جانا چاہتے تھے، انھوں نے مجھے تاکید کی کہ میں عدم بیع کی پوری قوت کے حمایت کروں، بیع کی اجازت کی قرارداد ایک المیہ ہوگی جس سے نتائج بڑے خطرناک ہونگے،

(۲) دوسرے سوال پر کہ مردہ شخص کے اکہرے عضو کو کسی زندہ شخص میں منتقل کیا جائے یا نہیں تو ہر نقطۂ نظر کے لوگ متفق تھے، بشرطیکہ یہ بات قطعی طور پر طے ہوچکی ہو کہ وہ شخص مرچکا ہے، ہم لوگوں نے یہ ترمیم پیش کی کہ اس کے لئے کسی شخص کا مرجانا ہی کافی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضروری قرار دیا جائے کہ بیمار کے لئے اس عضو کاری کے سوا علاج کی کوئی اور صورت نہ رہ گئی ہو اور اس سلسلہ میں اس مریض کی رائے بھی ضرور لی جائے اور جو ڈاکٹر اس عضو کاری کا ذمہ دار ہو وہ اس کا اسپیشلسٹ اور پورا تجربہ کار ہو، تمام آلات و وسائل بھی مہیا ہوں۔

(۳) لاش کے بارے میں یہود کی رائے تھی کہ وہ مقدس ہے، اس لئے کسی کی ملکیت نہیں ہوسکتی، مگر ان کے بعض اکابر نے خاص حالات میں اس کے خلاف رائے دی مگر یہ شرط قرار دی کہ لاش متوفی کے ورثا، اور اقربا سے حاصل کی جائے، عیسائی علماء کا فیصلہ بھی یہی تھا کہ لاش کسی کی ملکیت نہیں ہے لیکن اگر میت کی کوئی وصیت ہو تو اس کا احترام کرنا ضروری ہے اور وصیت نہ ہو تو خاندان اور قرابت داروں کی رائے لینا ضروری ہے، اس سلسلے میں ہم ان سے متفق تھے، مگر اس کی یہ قانونی وضاحت

میں اختلاف ہو گیا مگر بیع کو جائز ٹھہرانے والی رائے بعض تحفظات کے ساتھ غالب رہی، ان کے اکابر علماء میں سے کسی نے کہا کہ جو چیز دی جا سکتی ہے وہ بیچی بھی جا سکتی ہے، ایک صاحب نے فرمایا کہ اعلانیہ بیع کی اجازت نہ ہوگی تو خفیہ خرید و فروخت ہونے لگے گی، اس کی انھوں نے یہ مثال دی کہ جہاں فحاشی کے گھروں کے قیام کی اجازت نہیں ہے، وہاں خفیہ طور سے کاروبار جاری ہے،

اس مسئلہ میں ہم لوگوں کی رائے بالکل واضح اور کھلی ہوئی تھی کہ انسان کی زندگی تنہا اس کی ملکیت نہیں بلکہ وہ خدا اور سماج کی ملک ہے اس لئے کسی شخص کو اپنی خواہش کے مطابق اپنے جسم پر کوئی تصرف کرنا جائز نہیں ہے ایسا کرنے میں ضرر عظیم بھی ہے، ہم نے اس سلسلہ میں خودکشی کی مثال دی کہ خودکشی کرنے والا اسلام کی نگاہ میں مجرم ہے، اسے دنیا میں بھی سزا ملی، اور آخرت میں بھی وہ جہنم میں جائے گا۔

بیع کے متعلق ہمارا جواب یہ تھا کہ اسلام کی نگاہ میں انسان کے جسم کی کوئی قیمت نہیں لگائی جا سکتی، اسلامی شریعت اسے قطعی ناپسند کرتی ہے اور ہم نے اس پادری کی تردید کی جس نے خفیہ کاروبار کے اندیشے سے بیع کی اجازت کا مطالبہ کیا تھا، ہم نے کہا اسلام شر کا مقابلہ شر سے نہیں کرتا، وہ زنا کی خفیہ اشاعت کے ڈر سے فسق و فجور کے گھروں کی اجازت نہیں دے سکتا جو صریحاً حرام ہے،

عدم جواز بیع کے متعلق ہماری اس رائے پر بڑا ہنگامہ ہوا، کانفرنس کے اکثر لوگوں نے ہماری تائید کی جن میں عالمی شہرت کے مالک ڈاکٹر Dausez فرانسیسی اور ان کی بیگم تھیں، انھوں نے تو خون کے بیع کی ممانعت کا بھی مطالبہ کیا اور بتایا کہ

(۴) اعلان مرگ کے بارے میں ہمارا اور دیگر مذاہب کا نقطۂ نظر ایک تھا کہ اس کا تعلق ڈاکٹروں سے ہے، البتہ یہود، اطباء کی رائے کے ساتھ ساتھ ذاتی حیثیت سے انقطاعِ تنفس کو ایک دینی و روحانی حیثیت دیتے ہے جیسا کہ ان کے لاہوت میں مذکور ہے،

(۵) پانچویں مسئلہ میں سب متفق الرائے تھے کہ ان مذہبی رایوں کا پورا احترام کیا جائے جو اعضا کی قلم کاری کے خلاف ہیں،

(۶) چھٹا مسئلہ دیگر مذاہب کے درمیان مختلف فیہ رہا، مگر ہماری رائے طے شدہ تھی کہ اسلام میں علاج کے سوا کسی اور غرض سے اعضا کی قلم کاری حرام ہے، قلم کاری کا مقصد وحید علاج ہے اور اس کا تعلق تمام تر اس ڈاکٹر کے ضمیر پر ہے جو اس کام کا ذمہ دار ہے،

(۷) ساتویں مسئلہ یعنی ایسے گم صم لوگوں کو جن کی شفایابی کی کوئی امید نہیں، دو گروہوں میں تقسیم کیا گیا، ایک وہ جنھیں مخصوص آلات کی ضرورت نہیں، وہ سانس لے سکتے ہیں، کھانا کھا سکتے ہیں، اور اکیلے اپنے حوائج ضروریہ سے فارغ ہو سکتے ہیں ایسے لوگوں کو آدمی سمجھا جائے گا جنھیں زندہ رہنے کا حق ہے، دوسرے وہ ہیں جو کھانے اور سانس لینے کے لئے آلات کے محتاج ہیں، ان کے بغیر وہ زندہ ہی نہیں رہ سکتے اس لئے ان کا شمار زندہ آدمیوں میں نہیں ہوگا، کیتھولک فرقہ کے لوگ اس کی زندگی کی حفاظت کو ضروری نہیں سمجھتے، یہود نے بتایا کہ ایسے شخص کو جس سے کوئی فائدہ ہی نہ ہو تلمود زندہ رہنے کی اجازت نہیں دیتا، ہم لوگوں نے کہا کہ ایسا معذور شخص اگرچہ اعصابی حیثیت سے مردہ ہے لیکن دوسرے اعتبارات سے زندہ ہے اور یہ تقسیم ایک کی حفاظت

بھی کردی کہ اسلام میں قرآن، سنت، اجماع، قیاس اور اجتہاد کے ساتھ ایک اور چیز ہے جسے مصالح مرسلہ یا استحسان کہتے ہیں، اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر کوئی ایسا معاملہ ہو جس میں کوئی عمومی فائدہ ہو، اور اس کا قرآن و سنت کے ساتھ کوئی تعارض نہ ہو تو اسے بھی قانونی حیثیت حاصل ہوگی اس بنیاد پر مسلمانوں کے امیر اور خلیفہ کو یہ حق ہے کہ وہ علمی ریسرچ کے لئے ناگزیر لاشوں کو تصرف میں لانے کی اجازت دے سکتا ہے، اسی طرح ضروری اعضا کو کاٹ کر محفوظ کر لینے اور بوقت ضرورت انسانی فائدہ کے لئے ان کو استعمال کرنے کی بھی اجازت دے سکتا ہے۔ اس سے مستقبل میں اعضا کی قلم کاری عام ہو سکتی ہے، جس سے صرف دولت مند ہی نہیں بلکہ غریب طبقہ بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے، اسی طرح زندہ شخص کے دوسرے اعضا میں سے ایک عضو کو دوسرے زندہ شخص کو دیدینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے،

ہماری اس رائے کو بڑی اہمیت حاصل ہوئی اور علمی دنیا میں فی الواقع یہ ایک انقلابی نظریہ تھا، کیوں کہ دوسرے مذاہب اس کی اجازت نہیں دیتے ہم نے ثابت کیا کہ اسلام میں مفاد عام کو اولین اہمیت حاصل ہے، مغربی دوستوں نے اس پر احتجاج کیا مگر جب میں نے اس کے جواز کے بارے میں وضاحت کی تو وہ لوگ مطمئن ہو گئے، مگر انھوں نے کہا کہ اس معاملہ کو فلاں حاکم یا فلاں بادشاہ کے حوالہ کرنا ممکن نہیں ہے، میں نے عرض کیا کہ ہم لوگ یہاں سب سے پہلے ایک خالص مذہبی معاملہ پر باہم گفتگو و مذاکرہ کر رہے ہیں، رہا فلاں یا فلاں تو وہ ہمارے سوچنے اور طے کرنے کی چیز ہے، بہت سے خصوصی ڈاکٹروں نے اس قرارداد کو پاس کرنے کی اہمیت محسوس کی،

باب التقریظ والانتقاد

دیوان سراجی خراسانی

از جناب ڈاکٹر معتصم عباسی آزاد، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

سراجی خراسانی کا تعلق شعراء و ادبا کی اس ابتدائی نسل سے ہے جو قطب الدین ایبک (م ۱۲۱۰ء) اور ان کے جانشین شمس الدین التتمش (م ۱۲۳۶ء) کے عہد میں ہندوستان آئے اور شعر و ادب میں فضیلت و بزرگی کے باعث سلاطین و امراء کے درباروں سے وابستہ رہے مگر امتداد زمانہ کے ہاتھوں اس دور کے بیشتر آثار خصوصاً شعراء و ادبا کی شعری و ادبی یادگاریں ناپید ہو چکی ہیں اور جو محنت و کاوش سے دستیاب ہو سکتی ہیں وہ بھی ہماری علمی سہل انگاری کے باعث گوشۂ گمنامی میں ہیں اس لئے ان ارباب کمال کے حالات و کارناموں پر بھی پردہ پڑا ہوا ہے، خوشی کی بات ہے کہ ملک کے نامور محقق و ادیب پروفیسر نذیر احمد صاحب رئیس قسمت فارسی دانشگاہ اسلامی علی گڑھ نے اسکی طرف توجہ کی ہے، اور اس دور کے متعدد گمنام شعراء و ادبا اور ان کی تخلیقات کو علمی حلقوں میں روشناس کرایا جو ان کے مطالعہ کی وسعت اور محققانہ ژرف بینی کی دلیل ہے۔ حال ہی میں انھوں نے اس دور کے ایک شاعر سراجی خراسانی کے دیوان کا ایک نادر و نایاب نسخہ دریافت کیا ہے، جسے بڑی تصحیح و تحشیہ کے ساتھ دانشگاہ اسلامی علی گڑھ نے شائع کیا ہے، یہاں اسی دیوان کا تعارف مقصود ہے۔

کرتی ہے اور دوسرے کی حفاظت کو ضروری نہیں سمجھتی اس لئے ہم لوگوں نے کہا کہ اسلام بقدر استطاعت تمام وسائل کے ساتھ انسانی زندگی کا تحفظ چاہتا ہے۔ نطفہ قرار پانے سے کر زمین پر زندگی کے خاتمے یعنی اس کے تمام اعضاء کے مردہ ہو جانے تک اس لئے ہمارے نزدیک یہ اپاہج بھی ایک زندہ انسان ہے، اس کی دو قسمیں نہیں کی جا سکتیں اگر افراد اس کی سرپرستی نہ کر سکیں تو اسلامی حکومت کفالت کرے گی اور اس کی زندگی کے تحفظ کی ذمہ دار ہو گی، ہماری اس رائے پر اچھا خاصا ہنگامہ رہا مگر عوام کے سامنے یہ بات عیاں ہو گئی کہ اسلام انسانیت سے محبت کرنے والا مذہب ہے۔

میں بڑی صفائی سے عرض کرتا ہوں کہ میں اس بارہ میں برابر متردد رہا کیونکہ ایسا مریض نئی تعریف کی رو سے مردہ ہے، کیونکہ اس کے مرکزی اعصابی نظام میں کوئی زندگی باقی نہیں ایسی حالت میں ہمارے علمائے کرام کے نزدیک ہماری یہ رائے اسلام کے مطابق تھی،

آخر میں اعضائے تناسل، آلۂ عصبی اور خصوصاً دماغ کی قلم کاری کے امکان پہ بحث ہوئی، بعض عیسائیوں نے اسکی اجازت دیدی اور کہا کہ اس پیوند کاری کا اور دیگر اعضا کی پیوند کاری میں کوئی فرق نہیں لیکن یہود نے کہا کہ یہ مسئلہ نیا ہے اور ہم اس بارے میں کوئی قطعی رائے نہیں دے سکتے، ہماری رائے نہایت واضح تھی کہ یہ عمل قطعاً ممنوع ہے اسوقت جبکہ اس کارروائی کے نتیجے میں آدمی کی شخصیت تبدیل ہو جاتی ہو جیسا کہ دماغ کی قلم کاری میں ہوا کرتا ہو اسیطرح اعضائے تناسل اور خصیتین کی قلمکاری اس شخص کو جس پر اس قلم کاری کا عمل ہوا ہے ایسا کر دیگی کہ اس سے جو نسل وجود میں آئے گی اسکی جانب منسوب نہ ہو گی بلکہ اسکی طرف منسوب ہو گی جس کے یہ اعضا لئے گئے ہیں اسلئے ہمارے نزدیک یہ عمل مصنوعی تلقیح کے مشابہ ہے اور وہ اسلام میں حرام ہے۔ (الوعی الاسلامی کویت)

کی مدح میں ہیں، جن میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں، جو ساتویں صدی ہجری میں قصیدہ گوئی کا کمال سمجھی جاتی تھیں۔

سراجی کی شہرت زیادہ تر ایک قصیدہ گو شاعر کی حیثیت سے ہے، دیگر اصنافِ سخن اس کے دیوان میں نہیں ہیں، قصیدہ گوئی میں اس نے متقدمین میں ایرانی شعراء قطران (م ۴۶۵ھ) عمعق (م ۵۴۲ھ) حسن (م ۵۵۶ھ) سوزنی (م ۵۶۹ھ) انوری (م ۵۸۰ھ) مجیر (م ۵۸۶ھ) اور خاقانی (م ۵۹۵ھ) کی پیروی کی ہے، اور معاصرین میں ہندوستانی شعراء بخاری عمرہ اور سنامی سے خاصا فیض اٹھایا ہے۔ اس کے دیوان میں ایک سو دو (۱۰۲) قصائد، ایک مسمط اور چھ (۶) ترجیع و ترکیب بند ہیں، قصیدوں میں آٹھ (۸) قصیدے مرصع یا مصنوع ہیں، بقیہ غیر مرصع، مرصع قصائد کو دو (۲) اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک قسم تو ان قصیدوں کی ہے، جن میں "لزوم مالایلزم" کی صنعت کا استعمال ہے، مثلاً تین قصیدوں میں "چشم" اور "روی" کا التزام ہے اسی طرح ایک قصیدے میں "موز" اور "مو"، ایک میں "بر" اور "دست"، ایک میں "لعل" "سیم" اور "زر" اور ایک میں "خاک" "باد" اور "آتش" کا التزام ہے، مثال کے طور پر دو (۲) قصیدوں کے چند اشعار درج ہیں:

وی مہ خورشید روی دلبر بادام چشم	ہست بر رویت ز ابروی نجم بادام چشم
خون چشم روی من بر گونۂ عناب کرد	در غم روی تو ای شکر لب و بادام چشم
با جفای چشم تو گلروی سیم اندام کیست	کو وفا دارد ز تو گلروی سیم اندام چشم
تا نہ بیند چشم من روی ترا در کوی تو	گہ بسوی در نہم روی دگہ بر بام چشم
در فراق چشم در روی تو با مید وصال	روی آنم کو کہ دارم از تو یک پیغام چشم
چشم من بے روی تو آب نیا آرام شد	کی بود در روی خود بی آب بی آرام چشم
تا بہ روی ترا با چشم خوش در بزم عشق	چرہ دان روی مست باشد از اشک جام چشم

دیوان کی کمیابی کے سبب سے تذکرہ نگاروں میں سراجی کی شخصیت متنازعہ فیہ تھی، اس کے دیوان کی اشاعت کے بعد اس کی شخصیت سے پردہ اٹھ گیا ہے، سراجی کا پورا نام سید سراج الدین اور سراجی تخلص تھا، خراسان کا رہنے والا تھا،

من ثنائے تو بالفاظ خراساں گویم	کہ مرا آب و گل از خاکِ خراساں برخاست

اس نے ابتدائی تعلیم خراسان اور ہرات میں حاصل کی، اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ اسے شعر و ادب کے علاوہ علم نجوم، حکمت اور طب میں بھی عبور حاصل تھا،

ہم منجم، ہم حکیم و ہم مرسل ہم ادیب	وانگہی از خاندان مذکور اقران و جہان

شاعری کے ساتھ اسے نثر پر بھی پوری قدرت تھی، اور اس میں اس کا اپنا منفرد اسلوب تھا،

در نظم و نثر شاہا امروز بینظیرم	با نثر جانفزا ام با نظم دلپذیرم

مدت تک مکران کے حکمران تاج الدین ابو المکارم کے دربار میں ملک الشعرائی کے منصب پر فائز رہا، وہاں سے سلطان جلال الدین ابو الفتح سالار کی خدمت میں سیستان پہنچا، یہاں کچھ عرصہ قیام کے بعد ہندوستان چلا آیا، اس وقت سلطان شمس الدین التمش دلی کے تخت پر متمکن تھا، سلطان اور اس کے شہزادوں اور امراء کی فیاضانہ سرپرستی اور قدردانی سے دلی میں شعراء و ادبا کا اجتماع تھا، تاج الدین بخاری، شہاب الدین مہمرہ، عمید الدین سنامی جیسے نامی گرامی قصیدہ گو شاعر دربار میں موجود تھے، سراجی نے ولیعہد شاہزادہ ناصر الدین محمود کی خدمت اختیار کی، اور التمش کے وزیر نظام الملک جنیدی اور اس کے خاندان کے بعض افراد سے بھی اسکے تعلقات پیدا ہو گئے، انھوں نے بھی سراجی کی بڑی قدردانی اور ہمت افزائی کی، سراجی کے بیشتر قصائد انھیں سلاطین و امراء کی

باغ عیدی بردہد ہر گہہ کہ یاری بر بری ساغرے در دست تو با بچہ بر بردہد
بچۂ بربر خوش آمد خاصہ در ایام عید ہر قدح کاندر کفت آں بچۂ بربردہد

(رد العجز علی الصدر)

بزلف و چشم و برخ ہست آں نجستہ نگار یکی بنفشہ دوم شکر و سوم گلنار
عقیق و نرگس دلبر جمال و قامت جاناں یعنی چار در چار ندمن بید انجم آساں
یکی نوش است و شکر و دوم زہر ہستی بہر سوم ماہست درجونہ چہارم شرر تاب

(جمع و تقسیم)

ماہست شہرہ و شہرہ ز خورشید شہر تر رخسار طرفہ طرفہ آں سرو سیم بر
زاں شہرہ شہرہ شہرہ بلوار بی شرت زاں طرفہ طرفہ طرفہ نوشاد بی خطر

(تجنیس مکرر)

ان قصیدوں میں سراجی نے پوری استادی اور مہارت کا ثبوت دیا ہے، جس سے اس کی زبان دانی اور اظہار بیان پر قدرت کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے غیر مرصع قصائد میں جو تعداد میں بھی زیادہ ہیں الفاظ کی شوکت، ترکیبوں کے حسن، زبان و بیان کی صفائی، رفعت خیال، جدت ادا، مضمون آفرینی اور مبالغہ آرائی کے ساتھ ساتھ بے ساختگی، برجستگی اور روانی بھی پائی جاتی ہے۔ اس نے خطابیہ اور تمہیدیہ دونوں طرح کے قصیدے لکھے ہیں اور دونوں میں کامیاب ہے۔ خصوصاً تمہیدیہ قصیدوں کی تشبیب میں تغزل اور بڑی شیرینی ہے، ان میں کبھی وہ مناظر فطرت کی عکاسی کرتا ہے، اور کبھی محبوب سے خطاب اور اس کی تعریف کرتا ہے، ان کو اگر قصیدوں سے الگ ہو کر دیکھا جائے تو غزل مسلسل کا لطف دیتے ہیں، ان قصیدوں کی گریز میں اس نے بڑی استادی اور مہارت دکھائی ہے، جو نہایت موزوں اور برجستہ ہیں، تشبیب اور مدح کے درمیان

بر متاب از چشم من روی عظیم کیم لطف | تا شود از روی تو ہمچو زباں در کام چشم
جان و دل از چشم دو رویت با نصیب وافرند | چوں ز روی خاک پای صف ایام چشم
روی ملک شہ نظام الدین محمد چشم شرع | آنکہ ہرگز نفگند در دیش نا فرجام چشم

تا پدید آمد خط چوں مور بر گلنار یار | ہمچو موی گشتم اندر عشق آں زیبا نگار
مور اگر گوید سخن نیس آں منم در ہجر دوست | موی اگر دارد رواں پس آں منم در عشق یار
مور دیدی کش بود بر دل زہجراں کوہ غم | موی دید کش بود دامن زخوں دریا کنار
آں منم چوں مور بر دل از غم او کوہ کوہ | آں منم چوں موی دا شکم موج موج اندر کنار
گرچہ بر من عشق او دارد جہاں چوں چشم مور | کم مباد ایک سر مو از سر آں گلعذار
شد تنم تا دیدم آں خطی چو پای مور چو | ہمچو موی اندر آب عذاں زرد و نزار
موی مشکیں خط او در گرد رخسارش نگر | بر گل سوریست گفتی خیل مور اندر قطار
ای ز زلف دل بموی آویختہ بس خوں شدہ | در ہوای شکرت با حرص مور از انتظار
عنبر خالت نہاں شد زیر آں خط چوں مور | تا شد از روی چو ماہت موی مشکیں آشکار
بنگر اندر اشک من کز عشق موییست شد رواں | گر ندیدی تو رواں از چشم موری چشمہ سار
گرچہ اک موی نہ دست کمترم ہستم عزیز | ہمچو آں مور سلیماں پیش صدر کامگار
صاحب اعظم قوام الدین کہ مور درگہش | ہست نزد خسرواں چوں موی جاناں بردبار

دوسری قسم میں دوسری صنعتوں خصوصاً "رد العجز علی الصدور" جمع و تقسیم اور تجنیس مکرر کی صنعتیں ہیں، مثلاً

می بعیدی گر ترا ساقی ہمیں بردہد | شاخ عشرت مر ترا در باغ عید بر دہد

شہ معزالدین کہ کمتر قطرہ از ابر کفش — ربع مسکوں را فرات و دجلہ و آموں بید

کسی را در ہمہ عالم چو یارم یار کی باشد — برنگ لالۂ رویش گل و گلنار کی باشد

دہان یار تنگ آمد مرا اندر ہوای او — دلی تنگست لیکن چو دہان یار کی باشد

سخن گویند یارانم ز کشمیری و تاتاری — چو یارم یار در کشمیر و در تاتار کی باشد

ہزاران جان و دل در پیش بازار خش لیکن — بجز جان و دلم کاسد دران بازار کی باشد

بسوی عاشقان او ز قوس ابروان چشمش — اگر صد ناوک اندازد یکی بیکار کی باشد

دو عابست آن لب او زو شکر ہی بارم — بجز آن ماہ را عناب شکر بار کی باشد

چو طاؤس خرامانست فی فی من غلط کردم — کہ طاؤس خرامان را چنین رفتار کی باشد

بمہر و ماہ می مانند چہ میگویم خطا گفتم — کہ مہر و ماہ را لعل شکر گفتار کی باشد

رخش بغداد حسنست و در و طرار زلف او — ببغداد اندرون ہرگز چنان طرار کی باشد

دلم زنہار جویان شد سوی زلفین طرار ش — وزان زلفین طرارش در از نہار کی باشد

دو چشمم چار شد از غم کہ از بہر سہ بوس او — لبم را بر لبش یکدم رہ دو چار کی باشد

بعیاری یار ابروان عیار یار من — بجز عیار یار من بت عیار کی باشد

دو چز غم گہر ہا ریز و ز عشق لعل نوشینش — ولیکن چو دو دست شاہ گوہر کی باشد

خداوند خداوندان گیتی داد تاج الدین — کہ چون او در جہان بخت گیتی دار کی باشد

کار دلم بعشق تو دشوار می رود — کز حسن در زمانہ ترا کار میرود

بازار مہر روی چو ماہت برونق ست — کز چرخ مشتریش خریدار میرود

ایک ناگزیر کڑی معلوم ہوتے ہیں۔ اسکی چند مثالیں خالی از لطف نہ ہوں گی،

دوش گفتم طبع را ای گوہر کانِ ہنر　　　کیست آن آصف دلی کو شد سلیمانِ ہنر
مشتری فن و عطارد فر کہ در جوزای فضل　　　ہست طبع روشنش خورشید رخشانِ ہنر
از معانی و عبارت با حلی و با حلل　　　نو عروس خاطرش اندر شبستانِ ہنر
تا بہشت کامرانی از ہنر زینت گرفت　　　در بہشت کامرانی اوست رضوانِ ہنر
مقتدای اہلِ معانی شد از آن معنی کہ او　　　شافعی عالم علمست و نعمانِ ہنر
پیشوای عالم بالا عطارد کان فضل　　　بسپرد شاگرد داد زبید ببرہانِ ہنر
ذہن او کز طبع او جزویست علم کائنات　　　گوش عقل کل بمالد در دبستانِ ہنر
با خرد گفتم بگو کین وصف را موصوف کیست　　　گفت مخدوم تو شمع جمع اعیانِ ہنر
صدر دریا دل عزیز الدین عزیز مصر فضل　　　یوسف صدر جلال و پیر کنعانِ ہنر

صبحدم چون لباس سندس بزیون رسید　　　از شعاعِ مہر گردون را لباس اکنون رسید
گرد طاس آسمان از زیبق انجم تہی　　　ترک چین صبح چون با طشت پر الوان رسید
نو عروس حجرۂ تقدیر یعنی آفتاب　　　از شبستان قضا بر طارم گردون رسید
در چنین وقتی من اندر کنج خانہ می بدست　　　ہر زمان از گنج طبعم نو نوی مکنون رسید
ناگہ آمد از درم چون آفتاب اندر شتر　　　ترک سیمین ساق من در ساحل جیحون رسید
گفت خیز ای بی خبر از کارہای روزگار　　　روزگار دیگر آمد عیش دیگرگون رسید
ہر کسی در کار استقبال و تو در کار آب　　　کار آب از کف بنہ کت آب کار اکنون رسید
تہنیت را خدمتی ترتیب کن در راہ کہ　　　رایت سنجر شہی بر طالع میمون رسید

چو هفت مهرهٔ سیمیں دهانِ حقهٔ چرخ — نمود پیش دو پیکر ز خوشهٔ پروین

مجره هیچو طریقی بگلستان اندر — بر آں طریق کواکب چو سوسن ونسرین

شب چنیں و من اندر نشاط ماهِ نو — نهاده تیرِ گماں جست بر کمان یقین

خبر شنید نگارِ من و ترحل من — که اسپ عزم مصمم کشیده ام در زین

چو مشتری بکمال و چو ماه در سرطان — درآمد از درم آں آفتابِ زهره جبیں

مشکل اور سنگلاخ قافیوں میں بھی اس نے خوب شعر نکالے ہیں، اس کے یہاں قدیم اور متروک الفاظ و اصطلاحات کی فراوانی ہے، اس کے باوجود شگفتگی و دلکشی میں کوئی فرق نہیں آیا ہے، سراجی کو اس کے عہد کے اعتبار سے صفِ اول کے اور بحیثیت مجموعی صفِ دوم کے قصیدہ نگاروں میں شمار کیا جا سکتا ہے،

دیوان اپنی شعری و ادبی خصوصیات کے علاوہ تاریخی و ثقافتی اعتبار سے بھی اہم ہے، اس کے قصیدوں سے ازمنۂ وسطیٰ کی بعض اہم شخصیتوں کے حالات اور اس دور کے بعض تاریخی واقعات کے بارے میں خاصی معلومات فراہم ہوتی ہیں جو اب تک مورخین پر وا نہیں تھیں، خصوصاً مکران کے حکمراں، شہزادوں، امرا اور دوسری سربرآوردہ شخصیتوں پر خاصی روشنی پڑتی ہے، مکران کی سلطنت بارہویں و تیرہویں صدی عیسوی میں قائم تھی، اس کا بانی سلطان تاج الدین ابوالمکارم تھا، جسے منہاج سراج صاحبِ طبقاتِ ناصری (صنف ۱۲۶۰ء) سلطان غیاث الدین محمد بن سام اور اس کے بھائی سلطان معز الدین محمد بن سام غوری کے امرا میں شمار کرتا ہے، لیکن تفصیل نہیں دی، سراجی کے قصیدوں سے واضح ہوتا ہے کہ تاج الدین مکران کا حکمراں اور اس کا بھائی نصرت الدین اقتدار میں برابر کے شریک تھے گویا حکومتی معاملات میں وہ ہندؤوں کے "مشترکہ خاندانی نظام" (Joint family - system)

در جیب و کیسۂ دل کس نقد صبر نیست — تا کار آں دو طرۂ طرار میرود
جانرا بمن رسید بلا می برد ز عشق — هر دل که با غم تو به بازار میرود
رنگ رخت بگونۂ گلنار شد پدید — اشکم از آں بگونۂ گلنار میرود
در باغ عارض تو دلم شد چو عندلیب — نالاں ز بس که بر گل گلزار میرود
گر دل نمیرسد بوصال تو دیده را — از دور با جمال تو دیدار میرود
اشکم چو لعل و تن چو شکر اندر آب چشم — زاں آبدار لعل شکر بار میرود
جور و جفای شحنۂ غم بر دلم مدام — وز غمزۂ آں دو غمزۂ خونخوار میرود
چندیں جفا و جور مکن زانکه راز ما — در بارگاه شاه جهاندار میرود
سلطان ملک مشرق شهزادۂ جهاں — کز هیبتش سپهر نگوں سار میرود

اس کی تشبیہات واستعاروں کی لطافت ودلکش ہے، سراجی کی فنکارانہ بصیرت کا ثبوت ملتا ہے، جنھیں اس نے زیادہ تر تشبیب یا مدح میں استعمال کیا ہے اسکی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

شکل شب ہلال نو بود چنانکه دلمی — در صف جنگ برکشد تیغ روشن از میاں
چرخ چوں بحر مجمد شکل ہلال نو در — راست بشبه ماہی گاه ستاده که دواں
دیدم و رفت ماه نو سوی غروب من شدم — سوی مه تمام خود از پی تهنیت رواں
ماه تمام خویش را دیدم و چیزی شدم — در افق کناره چه نو در آسماں
روی چو ماه او ز زیر نقاب عنبری — قد چو سرو سرو او ز زیر وطای پرنیاں
لعل چو نوش نوش او دارو ی درد عاشقی — زلف چو مشک مشک او دام بلای عاشقاں

چو لعبتان حصاری ز عزفه های حصار — برآمدند کواکب ز دور چرخ برین
نبات الغش تو گفتی که ناقه صالح — برآمد از دل خارا بمعجزات مبین

مطبوعات جدیدہ

مکاتیب گیلانی: مرتبہ مولانا منت اللہ صاحب رحمانی تقطیع چھوٹی ضخامت ۳۹۹ صفحات کاغذ کتابت و طباعت اعلیٰ مجلد قیمت آٹھ روپے پلاسٹک کور دس روپے۔ پتہ دارالاشاعت رحمانی خانقاہ مونگیر

مولانا مناظر احسن گیلانی میں علم و عمل ذہانت و ذکاوت وسعت معلومات و دقت نظر نکتہ آفرینی و دقیقہ سنجی اور جذب و سلوک کی جو جامعیت تھی، اس کی مثالیں شاذ ہی ملتی ہیں، ان کی تحریروں میں یہ ساری خصوصیات نظر آتی ہیں، جن سے ان کے مکاتیب بھی خالی نہیں ہیں، خصوصاً وہ خطوط جو انھوں نے اپنے معاصر اہل علم کو لکھے ہیں، مختلف النوع معلومات کا خزانہ ہیں، ضرورت تھی کہ افادۂ عام کے لیے ان خطوط کو مرتب کرکے شایع کیا جائے، مولانا منت اللہ صاحب رحمانی اہل علم کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے بڑی تلاش و جستجو سے یہ خطوط فراہم کرکے ان کی پہلی جلد شایع کی ہے، اس میں چند خطوط کو چھوڑ کر جو ان کے ابتدائی دور کے ہیں باقی کل خطوط ان کے رفیق خاص مولانا عبدالباری صاحب ندوی اور حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام ہیں، ان خطوط میں ان کے سارے رنگ نمایاں ہیں، اور وہ اپنے گوناگوں معلومات کے لحاظ سے اہل ذوق کے مطالعہ کے لائق ہیں، کتاب کے شروع میں مولانا عبدالباری صاحب کے قلم سے ایک مبسوط مقدمہ ہے جس میں مولانا کی سیرت و کردار کے ساتھ بہت سے مفید دینی و علمی معلومات اور مسائل آگئے ہیں اسلئے یہ مقدمہ ایک مستقل مضمون کی حیثیت رکھتا ہے، فاضل مرتب نے جس محنت و کاوش سے ان مکاتیب کو مرتب کیا ہے اس کا اندازہ ان کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، مکاتیب میں جن اشخاص اور مقامات کا

پر کاربند تھے، سراجی کہتا ہے،

تاجہاں باشد بکام دین وشہ باد اجہاں تاج دین برتخت ملک شاہ نصرت ہمبرش

اسی طرح سلطان التتمش کے لائق وزیر نظام الملک جنیدی، اس کے لڑکے اور خاندان کے دوسرے افراد کے مدحیہ قصیدوں سے اس خاندان کی بلند پایگی اثر ورسوخ اور علمی و ادبی سرپرستی کا صحیح اندازہ ہوتا ہے، جنیدی خاندان کے متعدد افراد سلطنت کے کلیدی عہدوں پر فائز تھے اور اپنی غیر معمولی فیاضیوں کے لئے مشہور تھے، انھوں نے شعرا، وادبا کی بڑی قدردانی اور سرپرستی کی، جو ابتدائی عہد سلطنت میں ہندوستان میں فارسی زبان وادب کی ترقی میں بہت مفید ثابت ہوئی،

یہ دیوان ذخیرہ حبیب گنج مولانا آزاد لائبریری علی گڈھ اور پروفیسر سعید نفیسی (ایران) کے نسخوں کی مدد سے مرتب کیا گیا ہے، فاضل مرتب نے معلوماتی مقدمہ کے ساتھ، تعلیقات اور مشکل الفاظ و اصطلاحات کے معانی کی وضاحت کی فہرست بھی دیدی ہے، جس سے اسکی افادیت میں اضافہ ہو گیا ہے، خوبصورت اور دیدہ زیب ٹائپ میں چھپا ہے، قیمت چالیس روپیے ہے، جو اس کی افادیت اور ظاہری خوبصورتی کے مقابلہ میں زیادہ نہیں ہے،

یہ فاضل مصنف کے دینی علمی و مذہبی مضامین کا مجموعہ ہے، پہلے مضمون میں سورۂ اخلاص کی تفسیر کے ضمن میں عقیدۂ توحید پر بعض پہلوؤں سے مفید بحث کیگئی ہے اس کے بعد تین مضامین میں عقیدۂ رسالت کی اہمیت و ضرورت، انبیاء کی عصمت احادیث کی عظمت اور محدثین کے اہتمام اور روایت و درایت کے اصولوں کا ذکر ہے، آخری چھ مضامین بعض کتابوں اور مضامین کے جواب میں تحریر کئے گئے، اور مناظرانہ رنگ کے ہیں ان میں حضرت علیؓ حسینؓ کے مناقب اور سانحۂ کربلا اور اس سلسلہ کے دوسرے مباحث ہیں گذشتہ کئی سال سے یہ موضوع زیر بحث ہے، اور اس پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں عمداً افراط و تفریط سے کام لیا گیا ہے، زیر نظر مضامین گو سنجیدہ اور محققانہ ہیں لیکن وہ بھی اس سے خالی نہیں ہیں حضرت امیر معاویہؓ و عمرؓ و بن عاص کے لیے ترضیہ و ترحیم کے وہ قائل نہیں، حالانکہ صحابہ تو درکنار عام علماء و اخیار کے لیے بھی یہ مستحب ہیں، جابجا حضرت عثمانؓ پر کنبہ پروری کا الزام عائد کیا گیا ہے مگر کیا اسکی وہی توجیہ نہیں ہو سکتی تھی جو خود مصنف نے صفحہ ۳۴۳ و ۴۴۴ پر جناب امیر کے طرز عمل کے بارے میں کی ہے، بعض صحابہ کے متعلق بھی انداز بیان نامناسب ہے، بعض اقوال بلا حوالہ نقل کئے گئے ہیں، اور بعض میں قدیم مستند کتابوں کے بجائے مصر کی جدید کتابوں کے حوالے دیے گئے ہیں، اس لیے ان سے اخذ کردہ نتائج خود قابل بحث ہیں، ان خامیوں سے قطع نظر کتاب لائق مطالعہ ہے، خصوصاً ابتدا کے چاروں مضامین جامع اور مفید ہیں۔

اردو غزل ولی تک: - مرتبہ ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی صاحب تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۵۵۰، مجلد مع گردپوش قیمت للعہ پتہ: - جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ہے، پہلے ایڈیشنوں کا ان صفحات میں ذکر ہو چکا ہے، اس میں اردو زبان کے ابتدائی دور کے ریختہ اور غزل کا تاریخی و تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے، یہ تین ادوار میں منقسم ہے، پہلے میں لفظ غزل اور اس کی لغوی و اصطلاحی تحقیق، دوسرے میں تاجداران دکن کی اردو نوازی اور غزل کی سرپرستی اور

ذکر آیا ہے حاشیہ میں اس کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے، اور مکاتیب کے مسائل و مباحث کی فہرست دیدی گئی ہے، جو اردو مجموعہ مکاتیب کے لیے نئی چیز ہے، اس سے مکاتیب سے استفادہ میں سہولت ہوگی لیکن فاضل مرتب نے جماعت اسلامی کے متعلق جو خیالات ظاہر کئے ہیں ان میں شدت زیادہ ہے، ممکن ہے جماعت اسلامی میں کچھ خامیاں ہوں لیکن وہ اتنی سخت رائے کی مستحق نہیں ہے۔

مختصر حیات حمید:۔ مرتبہ مولوی عبدالرحمن صاحب ناصر اصلاحی، متوسط تقطیع ضخامت ۴۷ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت اچھی قیمت ۱۲؎ پیسے، پتہ:۔ دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح سرائمیر، اعظم گڈھ۔ یو۔پی،

ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ کی سوانحعمری کا شائقین اور قدردانوں کو عرصہ سے انتظار تھا، ان کے طلب و تقاضے سے زیر نظر کتابچہ شائع کیا گیا ہے، یہ دو مضامین پر مشتمل ہے، پہلا مولانا کے خاص واقف کار اور متعدد علمی و تعلیمی کاموں میں شریک و مشیر حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ کے قلم سے ہے، جو مولانا کی وفات کے بعد ہی معارف کے دو نمبروں میں چھپا تھا، اور دوسرا ان کے لائق شاگرد مولانا امین احسن اصلاحی کا لکھا ہوا ہے، یہ دونوں مضامین اپنے معلومات کے اعتبار سے قابل مطالعہ ہیں اُن سے مولانا کے حالات و واقعات زندگی کے علاوہ ان کے بعض اہم خصوصیات و کمالات کا بھی اندازہ ہوتا ہے مگر ان کا اصل کارنامہ اور عمر بھر کا سرمایہ ان کے علوم و افکار اور قرآنی تحقیقات و نظریات ہیں، ان کے مفصل تعارف کے بغیر ان کی کوئی سوانحعمری مکمل نہیں کہی جا سکتی، لیکن مفصل کے لیے مختصر کی تعویق و تاخیر مناسب نہ تھی، اس لیے دائرہ حمیدیہ کے انچارج مولوی عبدالرحمن ناصر اصلاحی نے ان مضامین کو یکجا کر کے شائع کر دیا ہے، تاہم مولانا کی مفصل سوانحعمری کا دین اب بھی ان کے تلامذہ و متوسلین کے ذمہ باقی ہے،

"م"

جلوۂ حقیقت:۔ مرتبہ مولانا ضیاء احمد صاحب بدایونی، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۲۵۲ قیمت ۴؎ روپیہ پتہ:۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڈھ ۲

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپے سالانہ

دفتر دارالمصنفین اعظم گڈھ

(کتبہ اقبال احمد)

تیسرے میں دکنی اردو زبان خصوصاً غزل میں اصلاح و اضافہ وغیرہ کا ذکر ہے، آخر میں ہر ہر دور کے کلام کا نمونہ دیا گیا ہے، اس ایڈیشن میں بعض ترمیم و اضافہ بھی کیا گیا ہے، اسلئے یہ پہلے ایڈیشنوں کے مقابلہ میں زیادہ مفید اور بہتر ہے۔

ایک بہتر ہندوستانی سماج کی تشکیل میں اسلام کیا حصہ لے سکتا ہے، اسلام مکمل دین، مستقل تہذیب، انسانی و تہذیبی جاہلیت کا المیہ اور اس سے سبق، خواص، | از - مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۴۶، ۴۰، ۴۸، ۳۲، ۲۲، قیمت ۶۵، ۵۰، ۵۰، ۴۰ پیسے، پتہ: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ

یہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی چار اصلاحی و دعوتی تقریریں ہیں جنکو اصلاح و حذف کے بعد انھوں نے افادۂ عام کے لیے کتابچوں کی صورت میں شائع کیا ہے، پہلی تقریر میں ہندوستان کے زبوں و ابتر حالات اور ان کو درپیش متعدد خطرات کا تذکرہ کرنے کے بعد بتایا ہے کہ اسلام انکا سد باب کر کے ملک کو صالح اور صحتمند بنا سکتا ہے، دوسری میں ملت ابراہیمی و امت محمدی کے امتیازات و خصوصیات، اسلام کے ایک مکمل دین اور مستقل تہذیب ہونے اور اس امر کا ذکر ہے کہ مسلمان ان اوصاف و خصوصیات اور اپنے قومی امتیازات اور ملی تشخص کو برقرار رکھکر بھی ملک و وطن کی مفید خدمت کر سکتے ہیں، تیسری تقریر میں موجودہ زمانہ کے سنگین فتنہ لسانی عصبیت کی تباہ کاریاں بیان کر کے اسکو اسلام کی تعلیم کے منافی بتایا ہے اور دور حاضر کے مسلمانوں کو اس سے بچنے اور اس طرح کے بعض تازہ عبرتناک واقعات سے سبق حاصل کرنے کی دعوت دی ہے، چوتھی تقریر میں مسلمانوں کے طبقہ خواص سے خطاب کیا گیا ہے، اور خواص کے جاہلی تصور اور اسلامی مفہوم کے فرق کو واضح کر کے تاریخ اسلام کی روشنی میں خواص کی خصوصیات ان کے فرائض اور ذمہ داریاں بیان کی گئی ہیں، اس ضمن میں رائج الوقت خواص کی تصویر بھی آگئی ہے، اس لحاظ سے یہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ان کے خط و خال پوری طرح نظر آجاتے ہیں، اور بہتوں کو اپنی تصویر نظر آجائے گی۔

ض

جلد ۱۲ ماہ رجب المرجب ۱۳۹۳ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۷۳ء عدد ۲

مضامین

شذرات — شاہ معین الدین احمد ندوی — ۸۲-۸۴

مقالات

مولانا محمد علی کی یاد میں — سید صباح الدین عبدالرحمن — ۸۵-۱۰۸

ایک ہندوستانی صحابی (بابا رتن) — جناب سید وحید اشرف صاحب لکچرر شعبۂ فارسی و اردو مہاراجہ سیاجی راؤ یونیورسٹی (بڑودہ) — ۱۰۹-۱۲۴

اقبال اور اسلامی فکر کی تشکیل جدید — جناب پروفیسر عبدالمغنی صاحب پٹنہ — ۱۲۵-۱۴۲

قرآن پاک اور مرزا غالب — جناب پروفیسر مسعود حسن صاحب صدر شعبۂ عربی مولانا آزاد کالج کلکتہ — ۱۴۳-۱۵۰

ادبیات

رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم — جناب عثمان احمد صاحب قاسمی بنوری — ۱۵۱-۱۵۲

تضمین بر غزل اقبال — جناب محمد شرف الدین صاحب ساحلؔ — ۱۵۲-۱۵۳

غزل — جناب اسلم صاحب سندیلوی — ۱۵۴

غزل — جناب توقیر جمال لکھنوی — ″

مطبوعات جدیدہ — ۱۵۵-۱۶۰

پہلی جلد چھپ بھی گئی تھی، مگر بعض خامیوں کی وجہ سے اسکی اشاعت روک دی گئی تھی، پھر معلوم نہیں
ان دونوں کاموں کا انجام کیا ہوا، سنا ہے کہ اردو بورڈ بھی ایک لغت مرتب کررہا ہے، اس کیلئے مستند
ادیبوں اور وسیع النظر محققوں کی ضرورت ہے، معلوم نہیں کون اصحاب اس کام کو انجام دے رہے ہیں، پاکستان
کا اردو بورڈ بھی ایک لغت مرتب کررہا ہے، اس کی طرف سے اردو نامہ کے نام سے ایک رسالہ بھی نکلتا تھا
جواب بھی نکل رہا ہوگا، اس میں بورڈ کی کارگذاری کے ساتھ اردو کے ادیبوں کی رائے لینے کے لئے
زیر ترتیب لغت کے الفاظ اور محاورات مع تشریح کے شائع ہوتے تھے، ہندوستان کے ادیب بھی
اپنی رائے لکھکر بھیجتے تھے اس طرح کا ایک رسالہ یا ہماری زبان کی طرح پندرہ روزہ اخبار بورڈ کی طرف
سے نکلنے کی ضرورت ہے، تاکہ اس کے کاموں کا علم ہوتا رہے، اور اردو کے ادیبوں کو بھی اظہار رائے کا
موقع مل سکے، اسکے بغیر اسکا علم نہیں ہوتا کہ بورڈ کیا کام انجام دے رہا ہے،

تراجم کے سلسلہ میں ایک اہم کام وضع اصطلاحات کا ہے، دارالترجمہ حیدرآباد نے جدید اردو اصطلاحات
کی کئی کتابیں شائع کی تھیں، مگر اس کی وضع کی ہوئی بہت سی اصطلاحات ایسی ثقیل اور نامانوس تھیں جن
کا سمجھنا عربی اور فارسی دانوں کے لئے بھی دشوار تھا، پھر ان کتابوں کی اشاعت پر اتنا زمانہ گذرچکا ہے
کہ بہت سی نئی اصطلاحیں پیدا ہوگئی ہیں، اردو کی اصطلاحیں بنانے کے لئے عربی فارسی سے استفادہ
ناگزیر ہے، عربی کی اشتقاقی خصوصیت کی وجہ سے اس میں بڑی سہولت ہوتی ہے، اور طول طویل اصطلاحوں
کے بجائے مختصر اصطلاحیں بن سکتی ہیں مگر اس سلسلہ میں چند باتوں کا لحاظ ضروری ہے، جہاں تک ممکن ہو اردو
میں رائج عربی فارسی اور ہندی کے الفاظ سے اصطلاحیں بنائی جائیں، ورنہ کم سے کم ایسے الفاظ
لئے جائیں جو اردو دانوں کے لئے مانوس اور اردو زبان سے ہم آہنگ ہوں، عربی کا فقرہ نہ معلوم ہوں
دارالترجمہ کی وضع کردہ جو اصطلاحیں قابل قبول ہوں ان کو لے لیا جائے، انگریزی کی جو اصطلاحیں

اردو اگرچہ ہندوستان کی ترقی یافتہ زبانوں میں ہے، علمی و ادبی ذخیرہ میں کم زبانیں اس کا مقابلہ کر سکتی ہیں، لیکن ابھی اسکو معیاری علمی زبان بنانے کے لئے بہت کچھ کرنا ہے، جامعہ عثمانیہ اور اس کے دار الترجمہ کے خاتمہ نے اس کی ترقی روک دی، ورنہ اس کا قدم بہت آگے بڑھ چکا ہوتا، اور وہ جملہ علمی و تعلیمی ضروریات کی کفیل ہو چکی ہوتی، ہندوستان کی آزادی کے بعد اردو دشمنی کی لہر نے اس کا وجود ہی خطرہ میں ڈال دیا تھا، مگر رفتہ رفتہ یہ فضا ختم ہو رہی ہے، اور مرکزی حکومت نے ہندوستان کی دوسری زبانوں کی طرح اردو کی ترقی کی طرف بھی توجہ اور اسکے لئے ایک کروڑ کی رقم منظور کی ہے اور اردو بورڈ قائم کیا ہے، اگر صحیح طریقہ سے کام کیا جائے تو اس سے گذشتہ نقصان کی پوری تلافی ہو سکتی ہے،

اردو کو علمی و تعلیمی زبان بنانے کیلئے نصابی کتابوں کے تراجم کے علاوہ مختلف علوم و فنون کی اہم کتابوں کا ترجمہ، ان پر اہم تصانیف، ایک جامع اور مبسوط لغت کی تدوین، اردو زبان کی مفصل محققانہ تاریخ اور اردو انسائیکلوپیڈیا کی بڑی ضرورت ہے، معلوم نہیں یہ کام بورڈ کے دائرے میں کہاں تک آتے ہیں، مگر یہ سب کام اردو کی ترقی کے ہیں، ان کے بغیر وہ معیاری زبان نہیں بن سکتی، اسلئے کوئی وجہ نہیں کہ یہ کام بورڈ کے دائرے میں داخل نہ ہوں،

اردو کی تاریخ اور لغت کی تدوین کا کام انجمن ترقی اردو ہند نے عرصہ ہوا شروع کیا تھا، تاریخ کی

مقالات

مولانا محمد علیؒ کی یاد میں

از سید صباح الدین عبد الرحمن

(۹)

مولانا محمد علی خلافت کے وفد کے ساتھ ابھی یورپ ہی میں تھے کہ ہندوستان میں اسکی تحریک اور بھی زیادہ تیز ہوگئی، گاندھی جی کی تائید سے اس میں اور ہلچل مچ گئی، انھوں نے لارڈ چیمسفورڈ کو جو خط لکھا وہ ناظرین کی نظر سے گذر چکا ہے، اخباروں میں اسکی اشاعت ہوئی تو پھر یہ تحریک کل ہند بن گئی، اور یہ کچھ ایسی مقبول ہوئی کہ پنڈت مدن موہن مالویہ نے بھی اسکی حمایت میں یہ بیان دیا "جہانتک خلافت کا تعلق ہے ہملوگ برابر یہ سنا کرتے تھے کہ انگلستان ٹرکی کو اپنا بڑا دوست سمجھتا ہے، انگریز مدبرین نے ان دوستانہ خدمات کا اکثر اعتراف کیا ہے، جو ترکی نے گذشتہ دور میں انکے ساتھ انجام دی ہیں، اور وہ روس کے حملے سے ترکی کو برابر بچانے کے خواہاں رہے لیکن زمانہ بدلا تو حکمت عملی بھی بدل گئی، بلقان کی جنگ ہوئی، اسکے بعد یورپ کی بڑی لڑائی لڑی گئی، حالات کا دباؤ کچھ ایسا پڑا کہ ترکی نے اتحادیوں کا ساتھ دیا، میں اسکی تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا ہوں، اتحادیوں کو فتح [illegible] اور اب وہ ترکی سے صلح کے لئے اپنی شرائط خود طے کرتے ہیں، اگر اتحادی ان وعدوں کو یاد رکھتے جو انھوں نے جنگ کے دوران میں کئے تھے، اور ان معاہدوں کی پابندی کرتے جو انھوں نے اپنی مسلمان رعایا کے ساتھ کئے تھے اور جن پر یقین کرکے مسلمان سپاہی انگلستان کی حمایت میں ترکی کے خلاف لڑے تھے، تو خلافت کا مسئلہ آج نہ اٹھتا لیکن یہ مسئلہ انگلستان کے رویہ سے اٹھ کھڑا

عام طور پر رائج ہو چکی ہیں اُن کو برقرار رکھا جائے، دمشق کے علمی ادارے المجمع العلمی العربی نے جدید علوم کی بہت سی اصطلاحیں بنائی ہیں، گو یہ خالص عربی کی ہیں، لیکن اُن سے اردو کی اصطلاحیں بنانے میں مدد مل سکتی ہے، ان سب کاموں کے لئے بورڈ کی جانب سے ایک رسالہ نکالنا ضروری ہے، جس میں بورڈ کی کارگذاری اور زیر بحث مسائل اور مباحث درج ہوا کریں تاکہ اُردو کے ادیبوں کو بھی اظہار رائے کا موقع ملے، اس سے بورڈ کے کاموں میں بڑی مدد ملے گی،

....

مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ برسوں سے معلق چلا آرہا ہے، اور نئے یونیورسٹی ایکٹ سے مسلمانوں میں بڑی بے چینی ہے، مگر اب اس کے حل کے آثار نظر آرہے ہیں، مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کی بڑی عزیز متاع ہے، اس سے اُن کی تقریباً ایک صدی کی تاریخ اور ملی روایات وابستہ ہیں، اس لئے اُن کو اس سے بڑا جذباتی لگاؤ ہے، اور ان نام نہاد مسلمانوں کے علاوہ جن کو ذاتی جاہ و اقتدار اور حکومت کی رضاجوئی کے سوا ملت اسلامیہ کے مفاد سے کوئی بحث نہیں، ہندوستان کے سارے مسلمان جن میں پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کے مسلمان ممبر اور بعض وزرار بھی شامل ہیں، موجودہ ایکٹ میں تبدیلی چاہتے ہیں، اور بہت سے غیر مسلم بھی اس مسئلہ میں مسلمانوں کے ساتھ ہیں، تازہ خبر یہ ہے کہ مسلمان ممبران پارلیمنٹ کے مشورے سے حکومت نے اس ایکٹ پر غور کرنے کیلئے ایک کمیٹی بنائی ہے جو تبدیلی کے متعلق تجویز پیش کرے گی، غنیمت ہے کہ حکومت کو مسلمانوں کے جذبات کا احساس ہو گیا، اب اُس نے صحیح قدم اٹھایا ہے، خدا کرے اس کمیٹی کا حشر پچھلی کمیٹی کی طرح نہ ہو اور مسئلہ کے حل کی کوئی شکل نکل آئے، مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ ایسا نہیں ہے، کہ حکومت اسکو اپنے وقار کا سوال بنائے، اتنے سے معاملہ کے لئے مسلمانوں کی مخالفت مول لینا کوئی دانشمندی نہیں ہے، رائے عامہ کا لحاظ اور غلطی کی تلافی تو جمہوریت کی جان ہے، لیکن یہ تبدیلی ایسی ہونی چاہئے جو مسلمانوں کے لئے قابل قبول ہو، ورنہ ان میں اور حکومت میں ایک مستقل کشمکش اور محاذ آرائی قائم رہے گی، جو دونوں کیلئے مضر ہے،

خوشی ہے کہ جو کچھ میں نے خیال کیا تھا، وہ اب بالکل صحیح ثابت ہو رہا ہے"۔

گاندھی جی نے مسئلہ خلافت کی تائید میں ینگ انڈیا میں بہت سے مضامین لکھے، اور بار بار دہرایا کہ مسلمانوں کا مطالبہ صحیح ہے، ہندوؤں کا اس کی پوری پوری حمایت نہ کرنا برادری کی ایک بزدلانہ عہد شکنی ہوگی، پھر وہ مسلمانوں کی جانب سے کئی رعایتوں کے حق کو بالکل تلف کر دیں گے اسلئے پبلک کے ایک خدمت گذار ہونے کی حیثیت سے میں ہرگز اس پوزیشن کا مستحق نہ ہونگا جس کا میں دعویٰ کرتا ہوں، اگر میں نے خلافت کو برقرار رکھنے کی جنگ میں مسلمانوں کی حمایت نہ کی، (ینگ انڈیا۔ ۱۲ اپریل ۱۹۲۰ء) انھوں نے آگے چل کر یہ بھی لکھا کہ مسلمان ہموطنوں کی آزمائش کے موقع پر ان کے ساتھ وفاداری کا اظہار کرنا دو بڑی قوموں میں مستقل دوستی قائم کرنے کا سبب بن سکتا ہے، (ینگ انڈیا جون ۱۹۲۱ء) یہاں خلافت کی حمایت میں طرح طرح کے دلائل دیئے وہاں ہندوؤں کی رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے یہ بھی لکھا "میں دعوے سے کہتا ہوں کہ میرے اور مولانا محمد علی کے نزدیک مسئلہ خلافت مرکزی اہمیت رکھتا ہے، مولانا محمد علی کا تو یہ مذہب ہے، میرے نزدیک اسکی مرکزی حیثیت اس درجہ سے ہے کہ خلافت کی خاطر میں اپنی جان پیش کرکے گائے کو جو میرا دھرم ہے مسلمانوں کی چھری سے محفوظ کرسکوں گا، (ینگ انڈیا، ۱۱ مئی ۱۹۲۰ء) گاندھی جی کو اس مقصد میں کامیابی بھی ہوئی، انکا خود بیان ہے کہ ہمارے مسلمان ہموطن اس سلسلہ میں نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ کام لے رہے ہیں، میں مولانا عبد الباری فرنگی محلی کا وہ اعلان دہرانا چاہتا ہوں جس میں انھوں نے قائم کیا ہے کہ جب تک ان کے مقلدین گائے کی حفاظت کے لئے تیار نہ ہو جائیں گے، وہ مسئلہ خلافت میں برادران وطن کی کوئی پیش کردہ امداد کو قبول نہ کریں گے، انھوں نے اس بات کی پابندی کی ہے، وہ گائے کے متعلق ہمدردانہ اور رسو دمندانہ نوعیت کی تلقین کرکے ایک موافق فضا پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، حکیم اجمل خاں نے مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے ہر قسم کی

ہوا، ہم لوگوں کی وجہ سے یہ مسئلہ نہیں پیدا ہوا ہے، ہم ہندو سیاسی خیال سے ہٹ کر یہ محسوس کرتے
ہیں کہ جنگ نیک مقصد کی خاطر لڑی گئی لیکن انگلستان کی وجہ سے اس کا خاتمہ برے مقصد کیلئے
ہوا، ہم کو اس کا بھی احساس ہے کہ یہ فتح چھوٹی اور بڑی قوموں کے لئے آزادی کا مژدہ لانے کے
بجائے دنیا کی دوسری قوموں کو غلام بنانے کا باعث ہو رہی ہے، یہی وجہ ہے کہ ہندوؤں، پارسیوں
اور ہندوستانی عیسائیوں کو اپنے مسلمان ہموطنوں کے احساسات سے پوری ہمدردی ہے، ہم لوگوں
کو اس کا بھی احساس ہے کہ مسلمان ایک بڑی قوم ہے، اس کا ماضی شاندار رہا ہے، اس لئے ترکی کو
اس حیثیت پر نہیں لانا چاہیئے، جس کی کوشش اتحادی کر رہے ہیں، ہمارے ہموطنوں میں کروڑوں
مسلمان مردوں اور عورتوں کو ترکی کے معاملہ سے انتہائی دلی دکھ ہے، ہندوستانی مسلمانوں
کے جذبات کو بہت مجروح کیا گیا ہے، وہ ذہنی کوفت میں مبتلا ہیں، اور وہ جس تکلیف میں ہیں، وہ
اُس وقت تک دور نہیں ہو سکتی ہے، جب تک اس کا صحیح علاج نہیں کیا جائیگا۔"

خلافت کی تحریک کی ابتدا تو ترکی امپائر اور وہاں کی خلافت کو بچانے کی خاطر ہوئی،
لیکن اس کا رُخ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے خلاف مڑ گیا، اور اس میں اتنی شدت
پیدا ہو گئی کہ برطانوی سامراج کی عمارت اس وقت تو منہدم نہ ہو سکی، لیکن اسکی بنیاد ضرور
ہل گئی، تحریک کی اس شدت کو گاندھی جی اور انکے رفقاء نظر انداز نہیں کر سکتے تھے،

مولانا محمد علی وفد خلافت کے ساتھ ہندوستان واپس آئے، تو اس کی ناکامی کے باوجود ہندو
اور مسلمان دونوں میں بہت مقبول ہو گئے، گاندھی جی نے بمبئی میں ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے
کہا کہ مجھکو مولانا محمد علی سے جو محبت ہے، اسکو بیان نہیں کر سکتا ہوں، دہلی میں ۱۹۱۵ء میں علی برادران
سے پہلی دفعہ ملا، پہلی نگاہ میں دونوں بھائیوں سے مل کر بہت متاثر ہوا، اسی وقت یہ خیال آیا کہ
کہ یہ دونوں بھائی مسلمانوں میں وہی درجہ حاصل کریں گے، جو مسٹر گوکھلے کو ہندوؤں میں ہے، مجھ کو

بیان کرتے رہے، جن میں سے کچھ ٹکڑے یہ ہیں،

"جامعہ نے تعلیم کے متعلق صحیح نظریہ قائم کیا، اور تلامذہ کے قوائے داخلی کو ترقی دینے کا کام اپنے ذمہ لیا، اور اس کو ہرگز پسند نہ کیا، خواہ تعلیم دنیوی ہو یا دینی، اس کی مثال مثل الحمار ہو جائے، اس کا پہلا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو حق دوست و خدا پرست مسلمان بنایا جائے، اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ ان کو وطن دوست و حریت پرور ہندوستانی بنایا جائے مسلمانوں کے مذہب کی مختصر اور جامع تعریف یہ ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس تعلیم کے دینے کی غرض سے مبعوث ہوئے تھے جنھوں نے ع

از کلید دیں در دنیا کشاد

اس لئے اسلام انسانوں کی اس تفریق کو کبھی گوارا نہیں کر سکتا کہ ان کا صرف ایک حصہ دیندار ہو، اور باقی د[illegible] ہو ایک حصہ تو سوائے مسجد کے پیش امام اور مدرسہ کے مولوی ہونے کے بجائے کوئی دوسرا کام نہ کر سکے اور دوسرا دنیا کے دھندھوں میں اس قدر مشغول ہو جائے کہ دین سے بے بہرہ رہے اور یہ سمجھنے لگے کہ دین کو اس دنیا سے کچھ واسطہ نہیں بلکہ وہ ایک دوسری دنیا سے علاقہ رکھتا ہے اور صرف اسی دنیا کے ماہرین کیلئے مخصوص ہے، اگر غور سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کی تباہی اسی تفریق کے باعث ہوتی ہے"

(ہمدرد ۳۰ر اکتوبر ۱۹۲۵ء)

اپنی ایک دوسری تحریر میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی خصوصیات اس طرح بتائیں،

دین اور دنیا کو اسی طرح ملا دینا جس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ملا یا ..... تھا، دینداری ہی کو صحیح دنیاداری سمجھنا، دنیا کو صحیح طریقہ پر برتنے ہی کو دین جاننا، کلید ..... کلید دین ہی سے در دنیا کو کھولنا، اور اس مقصد عظیم کے حاصل کرنے کے لئے

مخالفت کے باوجود یہ تجویز منظور کرائی ہے، کہ کسی تہوار کے موقع پر گائیں ذبح نہ کی جائیں، علی برادران نے اپنے گھر میں گائے کا گوشت منگوانا بند کر دیا ہے، ہمیں ان شریف دل مسلمانوں کا ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے کسی کے کہے سنے بغیر یہ طرز اختیار کیا، ہمیں چاہئے کہ اس اہم مسئلہ کو ان پر چھوڑ دیں تاکہ وہ اپنے طریقے پر اسکو حل کریں، ہندو بھائیوں کو میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ معاوضہ کا خیال کئے بغیر فیاضانہ طور پر مسلمانوں کی مدد کریں، نتیجہ میں گائے کی حفاظت خود بخود ہو جائے گی، اسلام ایک شریف مذہب ہے اس لئے اس پر اور اس کے پیرووں پر اعتبار کرو (ینگ انڈیا ۴ اگست ۱۹۲۰ء)

مولانا محمد علی کو برطانوی حکومت سے ایسی نفرت ہو گئی کہ وہ کسی معاملہ میں بھی اب اس سے تعاون کرنا پسند نہیں کرتے تھے، ایم۔ اے۔ او کالج علی گڈھ ان کی بڑی محبوب مادر درسگاہ تھی اس کے بڑے فدائی تھے، کیونکہ مغلیہ سلطنت کے خاتمہ کے بعد یہی کالج مسلمانوں کی آرزوؤں کا مظہر اور ان کی تمناؤں کا مرکز بنا ہوا تھا، لیکن اس کو اس برطانوی حکومت کی طرف سے مالی امداد ملتی تھی، جس نے ترکی امپائر اور خلافت پر ضرب کاری لگا کر اسلام کی اہانت کی تھی، اس لئے انھوں نے مولانا محمود الحسنؒ اور حکیم اجمل خاں کی تائید اور تعاون سے اس کے مقابلہ میں ایک ایسا کالج قائم کیا جس میں ان کے خیال کے مطابق مسلمان صحیح تعلیم پا کر صحیح معنوں میں مسلمان ہوں، اور ان میں اسلام کی ایسی روح ہو کہ وہ سلطین اسلام کی فوج بن کر اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں اور اسلام کے احکام پر کاربند ہو کر اپنی گم شدہ عظمت کا اعادہ اور اپنی ملت اور وطن کی خاطر خواہ خدمت کر سکیں، اس موقع پر ان کا یہ بھی اعلان تھا کہ ان کو تعلیم سے زیادہ مذہب عزیز ہے، تعلیم کو وہ چھوڑ سکتے ہیں، لیکن مذہب کو پس پشت نہیں ڈال سکتے، اسی جذبہ کے ساتھ انھوں نے ایم اے، او کالج کے مقابلہ میں علی گڈھ ہی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم کرائی، جس کی تاسیس اکتوبر ۱۹۲۰ء میں ہوئی، اپنے اخبار ہمدرد کی مختلف اشاعتوں میں اس کے اغراض و مقاصد کی تفصیل

ترک موالات کی تجویز منظور ہو چکی تھی، پنڈت جواہر لال نہرو لکھتے ہیں "۱۹۲۰ء میں سیاسی تحریک اور خلافت کی تحریک نے ساتھ ساتھ قوت پکڑی، دونوں ایک ہی راستہ پر چلنے لگیں، آخر جب کانگریس نے گاندھی جی کے پُرامن ترک موالات کا اصول تسلیم کر لیا، تو دونوں بالکل مل گئیں، خلافت کمیٹی پہلے ہی یہ اصول تسلیم کر چکی تھی، (میری کہانی جلد اوّل ص ۸۷)

مولانا محمد علی نے اپنی خلافت تحریک گاندھی جی کے سپرد کر دی، جس کے بعد گاندھی جی اب مسلمانوں کے بھی رہنما تھے، مولانا محمد علی اپنے بڑے بھائی مولانا شوکت علی کے ساتھ گاندھی جی کو لے کر پورے ہندوستان کا دورہ کرنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے، مسلمان برطانوی حکومت سے انتہائی طور پر بدظن تھے، اس لئے علی برادران اور گاندھی جی کی آواز پر ان کی بڑی تعداد انگریزوں کی ملازمت چھوڑ بیٹھی، وکلا نے وکالت چھوڑ دی، انگلستان کے بنے ہوئے کپڑے پہننا ترک کر دیا، علما نے برطانوی حکومت کے ماتحت رہنا حرام قرار دیا، مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ہندوستان چھوڑ کر افغانستان ہجرت کرنے کے لئے تیار ہو گئی، لیکن افغانستان کی حکومت انکو خوش آمدید کہنے کے لئے تیار نہیں ہوئی، مسلمانوں نے ہندوؤں کی خاطر ذبیحہ گاؤ بھی بند کر دیا، ہندو مسلم اتحاد کے بڑے پر کیف مناظر ہر جگہ دیکھنے میں آئے، خود مولانا محمد علی کا بیان ہے کہ دو سال تک ہندوستان نے جس سامان بے اتفاقی کا معاینہ کیا، وہ قرون اولیٰ کے انقلاب کی یاد تازہ کرتا تھا،

۱۹۲۱ء میں گاندھی جی علی برادران اور ابوالکلام آزاد تحریک کو آگے بڑھانے کے لئے پٹنہ بھی آئے، میں ان لوگوں کی زیارت کے لئے بے چین ہو گیا، پٹنہ سٹی کے مدرسہ کی مسجد میں جلسہ تھا، جمعہ کا دن تھا، اس لئے پہلے تو مولانا ابوالکلام آزاد نے آکر جمعہ کی نماز پڑھائی، ان کا پُرجوش استقبال ہوا، مولانا تمنا عمادی پھلواروی اس مسجد کی پیشوائی کے لئے آگے آگے تھے انکی

ہر طالب علم کو لازمی طور پر عربی سکھانا، اور قرآن کریم ہی کو عربی زبان کی نثر کا کورس بنانا اور مادری زبان ہی کو تحصیل علوم کا ذریعہ بنا کر ایک غیر زبان کو جس سے طلبہ اس وقت واقف نہیں ہو سکتے تحصیل علوم کا ذریعہ بنانا، ان کے راستہ میں رکاوٹیں ڈالنے سے اجتناب کرنا، اور اردو زبان میں درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے ذریعے سے ہندوستان کی اس سب سے زیادہ مقبول زبان کو ترقی دینا، طلبہ کے اخراجات کو اس قدر گھٹا دینا کہ طعام و قیام، ورزش اور صحت سب کی فیس پندرہ سولہ روپئے سے بڑھنے نہ پائے، اور اس طرح ان کو اسراف کی عالمگیر وبا کے جراثیم سے بچانا، پھر ان کے دستکاری سیکھنے پر اس قدر اصرار کرنا کہ انھیں اس قسم کی محنت سے عار نہ ہو، اور اگر دماغی قابلیت سے کسی وقت اکل حلال کی صورت نہ بھی نکل سکے تب بھی وہ قوت لایموت ہر طریقہ پر حاصل کرنے سے محروم نہ رہیں، (ہمدرد ۱۸ر جنوری ۱۹۲۸ء)

جامعہ ملیہ اسلامیہ کو قائم ہوئے اب نصف صدی سے زیادہ مدت گذر چکی ہے، اب اس کے احاطہ میں وہ تمام عمارتیں موجود ہیں جو ایک اچھی یونیورسٹی میں ہونی چاہئیں لیکن جامعہ ملیہ اسلامیہ کے موجودہ ارباب حل و عقد خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اس کے جو مقاصد تھے وہ کہاں تک پایۂ تکمیل کو پہونچے اور یہ جن خصوصیات کے ساتھ قائم کی گئی تھی وہ کہاں تک برقرار ہیں؟

مولانا محمد علی کا میدان عمل تعلیمی نہیں تھا، سیاسی تھا، اس لئے اس زمانہ کے سیاسی نمرود کے خلاف سیاست کی آگ میں کود کر اس کو گلزار بنانے کی کوشش میں لگے رہے، دسمبر ۱۹۲۰ء میں کانگرس کا خاص اجلاس ناگپور میں لالہ لاجپت رائے کی صدارت میں ہوا، اس میں ترک موالات کی تجویز منظور ہوئی، جس کا مقصد گاندھی جی نے مولانا شوکت علی کی فرمائش سے ریل میں مرتب کیا (تلاش حق حصہ دوم ص ۲۳۲) اس سے پہلے ہی خلافت کانفرنس میں

بلند ہو جاتی کبھی معلوم ہوتا کہ وہ آگ برسا رہے ہیں، کبھی ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتا ان کی تقریر کے درمیان ہندو مسلمان دونوں مل کر محمد علی کی جے ہو، گاندھی جی کی جے ہو، سوراج کی جے ہو کے نعرے لگاتے رہے، جب یہ تقریر سن کر میں گھر آیا تو بیحد خوش تھا کہ مولانا محمد علیؒ کی زیارت کی، گویا دنیا کی بہت بڑی دولت پائی ہے،

ان ہی دنوں بنارس کے بابا خلیل داس ہندو مسلمانوں کے میل ملاپ کے لئے ہر جگہ دورے کر رہے تھے، ان کے ساتھ سفوں اور جاروب کشوں کی ایک جماعت ہوتی، جو گلی کوچوں کی صفائی میں لگ جاتی، اس طرح وہ وطن کی خدمت کی تلقین کرتے، شہروں کے علاوہ گاؤں میں بھی ان کی جماعت پہونچی، میرے وطن دیسنہ کے تھانہ استھانواں میں بھی آئے، ان کی تقریر سننے کے لئے لوگ آس پاس کے گاؤں سے جمع ہوئے، تو میں بھی اپنے بزرگوں کے ساتھ جلسہ گاہ میں پہونچا، بابا خلیل داس کو قلندرانہ لباس میں دیکھا، داڑھی تھی، سر میں بڑے بڑے بال کی لٹیں تھیں، لمبا کرتا اور عبا پہنے ہوئے تھے، تقریر ہندو مسلمان اتحاد پر کی، ان کی تقریر کا یہ حصہ ابھی تک یاد ہے کہ لفظ "ہم" خالص ہندوستانی لفظ ہے، یہ ہندو مسلمانوں کے اتحاد کی نشانی ہے، ہم میں چھوٹی ہ پہلے اس لئے ہے، کہ یہاں ہندو پہلے سے تھے، بعد میں مسلمان آئے، اسلئے چھوٹی ہ کے بعد میم ہے، جس طرح ہم کے دونوں حرف ملے ہوئے ہیں، اسی طرح ہندو مسلمان بھی ملے رہیں، لفظ کی اس تشریح سے مجمع جھوم رہا تھا،

مولانا محمد علیؒ کو گاندھی جی سے بڑی محبت ہو گئی، وہ اور مولانا شوکت علی دونوں ان کو باپو کہتے تھے، علی برادران کے پرستاروں کا خیال ہے کہ ان ہی دونوں بھائیوں نے گاندھی جی کی کل ہند اہمیت بڑھادی، خلافت کمیٹی کے سربراہ سے علی برادران اور گاندھی جی نے سارے ہندوستان کا دورہ کیا، کانگریس کی تنظیم پرانی ضرور تھی لیکن علی برادران نے خلافت کمیٹی کی

شان میں ایک نظم بھی کہی تھی، جو چھاپ کر سب کو تقسیم کی جا رہی تھی، میں نے مولانا ابو الکلام آزاد کو پہلی دفعہ اسی موقع پر دیکھا، وہ منبر پر تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے، تو میں دور سے ان کو دیکھ رہا تھا، گورے چٹے بالکل جوان معلوم ہو رہے تھے، تقریر شروع کی تو مجمع بے حد متاثر تھا، میں دور بیٹھا تھا، اس زمانہ میں لاؤڈ اسپیکر نہ تھا، اس لئے آواز سنائی نہ دیتی تھی، لیکن یکایک ایک چیخ کی آواز سنی معلوم ہوا کہ ایک صاحب تقریر سنکر بے حال ہوگئے ہیں، سہ پہر کو گاندھی جی اور علی برادران کی تشریف آوری تھی، مجمع بڑی بے چینی سے انتظار کرنے لگا، یکایک مولانا شوکت علی دور سے نظر آئے، میں نے ان کو بھی پہلی دفعہ دیکھا تھا، ہاتھی کی طرح جھومتے ہوئے مجمع میں داخل ہوئے، سفید اون کی بالدار ٹوپی پہنے ہوئے تھے، اس پر ہلال لگا ہوا تھا، ان کے بعد گاندھی جی اور مولانا محمد علی آکر ڈائس پر بیٹھ گئے، کسی صاحب نے تقریر شروع کر دی، تو میں نے دیکھا کہ مولانا محمد علیؒ ایک پیالہ میں چمچہ سے کچھ کھا رہے ہیں، اور پھر یہی پیالہ اور چمچہ گاندھی جی کی طرف بڑھا دیا، جنھوں نے اسی چمچہ سے کھایا، میرے بزرگوں نے بتایا کہ دونوں نے ایک ہی پیالہ میں سے کچھ کھا کر ہندو مسلمان اتحاد کی عملی تلقین کی تھی مجمع بڑا تھا، اس لئے میں دور بیٹھا تھا، تقریر کیا ہوئی یہ نہ سن سکا، لیکن میں خوش تھا کہ ان رہنماؤں کی زیارت کر لی، اس کے دوسرے دن پھر مولانا محمد علیؒ کی تقریر رکھی گئی، میں جلسہ سے بہت پہلے جلسہ گاہ پہونچ گیا تھا کہ مولانا محمد علیؒ کو قریب سے بیٹھکر دیکھوں، جلسہ مدرسہ کی مسجد کے صحن میں رکھا گیا، جہاں ہندوؤں کو بلا روک ٹوک آنے کی اجازت تھی، ہندو مسلمانوں کی جذباتی ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کا بڑا حوصلہ افزا منظر دیکھنے میں آیا، دونوں ایک دوسرے سے اس طرح مل رہے تھے، جیسے بھائی بھائی ہیں، مولانا محمد علی آئے تو مسجد کے صحن میں ایک تخت پر کھڑے ہوکر تقریر کرنے لگے، ان کے ارد گرد ہندو بیٹھے تھے، تقریر کا کیا موضوع تھا یہ یاد نہیں، لیکن تخت پر وہ گھوم گھوم کر بول رہے تھے، جوش و خروش میں کبھی ان کا چہرہ سرخ ہوجاتا کبھی آواز

کی انکی کوشش سے اس اجلاس میں ہندو مسلمان لیڈروں کے علاوہ تمام اکابر علماء بھی شریک ہوئے، ان ہی کے اثر سے علماء نے اس اجلاس میں قرآنی آیات اور احادیث سے یہ ثابت کیا کہ برطانوی حکومت کی فوج میں ملازمت کرنا بدترین گناہ ہے، چند روپیوں کی خاطر ہمیشہ کے لئے دوزخ میں اپنا گھر بنانا ہے، ظاہر ہے کہ یہ فوج میں بغاوت پھیلانے کا مترادف تھا، اس لئے کراچی کے اجلاس کے بعد مولانا محمد علیؒ ۱۴ ستمبر ۱۹۲۱ء کو مدراس میں بمقام والٹیر گرفتار کر لئے گئے، ان کے ساتھ مولانا شوکت علی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا حسین احمد، مولانا نثار احمد، پیر غلام مجدد اور سوامی شنکر آچاریہ بھی گرفتار کر کے کراچی لائے گئے، کیونکہ ان سب رہنماؤں نے کراچی کی خلافت کانفرنس میں تقریریں کی تھیں، ان پر تشدد اور فوج میں بغاوت کرانے کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا، مولانا محمد علیؒ اور ان کے ساتھیوں نے اس مقدمہ میں جس جرأت، بے باکی، مردانگی، وطنی محبت، مذہبی حمیت اور ایمانی غیرت و حرارت کا ثبوت دیا، وہ جنگ آزادی کی تاریخ کی بڑی سنہری سرخیاں ہیں،

مقدمہ شروع ہوا تو مولانا محمد علی نے اعتراف کیا کہ انھوں نے مسلمانوں کو برطانوی حکومت کی فوج کی ملازمت کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کی اور اس کو ایک مذہبی فریضہ قرار دیا، اس کے لئے قرآن کی آیتیں اور حدیثیں پیش کیں، اپنی صفائی میں عدالت میں جو طویل بیان دیا اس کو پڑھ کر آج بھی ایمان کی گرمی اور وطن کی محبت پیدا ہو سکتی ہے، جج انگریز تھا، اس کی مدد کیلئے جوری مقرر ہوئے تھے، جو ہندو اور عیسائی تھے، جج گیا تھا، برطانوی سامراجیت کا نمائندہ تھا، انصاف کے لئے نہیں بلکہ برطانوی سامراجیت کی حفاظت کے لئے کرسی نشین ہوا تھا، برطانوی حکومت کو اپنی حاکمانہ سطوت، حشمت اور وقار پر بڑا غرور تھا، اسی غرور کی عمارت کو مولانا محمد علی نے منہدم کیا، انھوں نے عدالت میں اپنے مقدمہ کی جو بحث کی، اس سے شاید پہلی دفعہ انگریزوں کی حکومت کے رعب اور دبدبہ پر ضرب کاری لگی، انھوں نے جج سے مخاطب ہو کر کہا اگر خدا

تنظیم عوامی پیمانہ پر اس زبردست طریقہ سے کی کہ کانگریس کی تنظیم اس وقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی، ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی گھر ایسا نہیں تھا جس کا کوئی نہ کوئی فرد خلافت کمیٹی کا رکن نہ ہو، خلافت کمیٹی کے لئے امیر و غریب دونوں دل کھول کر چندے دے رہے تھے، اس زمانہ میں غالباً ۵۰ لاکھ کی رقم جمع ہو گئی تھی، میری والدہ مرحومہ کے زیورات کا ایک بکس میری نانی کے پاس امانتہً رکھا تھا، وہ خلافت تحریک سے ایسی متاثر ہوئیں کہ گاؤں کے ایک جلسہ کی اپیل میں پورا بکس خلافت کمیٹی کے کارکنوں کے حوالہ کر دینا چاہتی تھیں، لیکن ان کو یہ کہہ کر روکا گیا کہ یہ مال ایک نابالغ یتیم کا ہے ان کو راہ خدا میں دینے کا حق نہیں،

علی برادران کو اس وقت مسلمانوں میں جو مقبولیت حاصل ہوئی، وہ گاندھی جی یا کسی اور ہندو لیڈر کو ہندوؤں میں نہ تھی گاندھی جی جلسوں میں کہا کرتے کہ مولانا شوکت علی کی لمبی چوڑی جیب میرا مسکن ہے، اور یہ بھی تسلیم کرنا پڑیگا کہ علی برادران نے برطانوی حکومت کے خلاف جو بیزاری بلکہ نفرت مسلمانوں میں پیدا کر دی تھی، وہ اس وقت تک ہندوستان کے اور باشندوں میں پیدا نہ کی جا سکی تھی، اس زمانہ میں ہندوستان کے پانچسو علماء کے دستخط سے یہ فتویٰ شایع ہوا کہ کہ برطانوی حکومت کا تعاون اور موالات حرام ہے، سرکاری خطابات و اعزاز کے قبول کرنے والوں کو کافر قرار دیا گیا، برطانوی حکومت کے خلاف جان و مال کی قربانی اسلام کی نشانی بتائی گئی، کچھ ایسے جانباز اور سرفروش مسلمان رہنما بھی پیدا ہو گئے، جو دوسرے ممالک سے فوجی امداد کے خواہاں ہو کر ہندوستان کی برطانوی حکومت پر حملہ کرانا چاہتے تھے اس سازش کے الزام میں مولانا محمود الحسن دیوبندی اور مولانا حسین احمد مدنی کو گرفتار کر کے مالٹا میں نظر بند کر دیا گیا، اور مولانا عبید اللہ سندھی کو ایک عرصۂ دراز تک روس میں جلا وطن ہو کر رہنا پڑا،

۱۹۲۱ء میں خلافت کانفرنس کا اجلاس کراچی میں ہوا، جس کی صدارت مولانا محمد علی نے

بولنے کا حق ہے، اور اگر آپ میرا حق چھین لینا چاہتے ہیں تو یہ مقدمہ کا تماشا ختم کر دیں، یہ تماشا دکھانے سے کیا فائدہ ہے؟ آپ بندوق چلانے والوں کو طلب کریں اور ہم سب کو گولیوں کا نشانہ بنا دیں اور اگر آپ اس تماشا کو کھڑا کرنا ہی ضروری سمجھتے ہیں تو پھر ہلوگوں کی موت کے بعد اس مقدمہ کی کارروائی کو جاری رکھیں جس کی مثال لارڈ نلسن پیش کر چکے ہیں میں کہتا ہوں کہ کوئی شخص اپنے مذہب کی خلاف ورزی کرنے کا حق نہیں رکھتا ہے، برطانوی فوجی ملازمت سے مذہب کی خلاف ورزی ہوتی ہے،

عدالت:۔ یہ سب غیر متعلق باتیں ہیں،

مولانا محمد علی:۔ میں تو دفعہ ۵۰۵ کے متعلق اب تک کچھ نہیں کہہ سکا ہوں میرے خلاف دفعہ ۱۲۰ بھی لگائی گئی ہے، مجھکو تو ابھی اس کے متعلق کچھ کہنے کا موقع نہیں ملا ہے، کیا مجھ کو اسکے بارہ میں کچھ کہے بغیر سزا دیدی جائے گی،

عدالت:۔ میں آپ کو بولنے کا حق نہیں دونگا،

مولانا محمد علی:۔ میرا مذہب جو کچھ تلقین کرتا ہے، اس کی تصریح کر رہا ہوں، میں یہی بیان پہلے کی عدالت میں دے چکا ہوں یہ بالکل متعلق باتیں ہیں،

عدالت:۔ آپ بیٹھ جائیں،

مولانا محمد علی:۔ کیا آپ اپنے قانون کی کتاب میں سے کوئی ایسا جملہ دکھا سکتے ہیں کہ جج کو یہ حق سلب کرنے کا اختیار ہے، آپ نے پہلے بھی میرا وہ حق سلب کر لیا ہے جس سے میں مستغیث کے سامنے جوری کو مخاطب کر سکتا تھا آپ کے بمبئی کے کورٹ نے تو کہہ دیا تھا کہ استغاثہ کا وکیل سننے کے لئے بیٹا ہے، اب مجھ کو یہ نہیں معلوم کہ سندھ کے جوڈیشل کمشنر نے کوئی نیا قانون بنایا ہے آپ مجھ کو جوری کو مخاطب کرنے سے پھر روک رہے ہیں، آپ میری کسی ایک بات پر تو

کا قانون برطانوی حکومت کے قانون سے متصادم ہوگا تو میں خدا کے قانون کا فرمان بردار رہونگا، برطانوی قانون کو نظر انداز کروں گا۔ جو شخص اپنے کو مسلمان کہتا ہے، اس کو قرآن کے حکم کا پابند ہونا چاہئے، اگر وہ قرآن کی کسی ایک آیت کی بھی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ مسلمان نہیں ہے، اس سلسلہ میں انگریز جج سے ان کی جو نوک جھونک ہوئی، وہ پڑھنے کے لائق ہے، بیان دیتے ہوئے مولانا محمد علیؒ نے فرمایا کہ میرا فرض ہے کہ خداوند تعالیٰ نے جو بات کہی ہے اسکو علی الاعلان بیان کر دوں، مذہب کے رو سے برطانوی فوج کی ملازمت کرنا حرام ہے، اور یہ عدل و انصاف کے خلاف ہے، کہ برطانوی حکومت میں ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو ہلاک کرے، خصوصاً جب یہ حکومت کفار کی حکومت کے برابر ہو، ہمارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حج کے موقع پر اپنے آخری خطبہ میں منیٰ میں پونے دو لاکھ مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا ....

عدالت :۔ میں آپ سے اپنا بیان روکنے کے لئے کہتا ہوں، پیغمبر کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں

مولانا محمد علی :۔ (غصہ میں) میں اپنے پیغمبر کا ذکر کرونگا، آپ نے جو کچھ کہا اسکو واپس لے لیں

مولانا شوکت علی :۔ (عدالت کو) یہ اہانت آمیز، کفر ہے، گستاخی ہے،

مولانا محمد علی :۔ آپ نے جو کچھ کہا ہے، واپس لیں، آپ معذرت کریں میں اپنے پیغمبر کے متعلق ضرور کچھ کہونگا، میں تو اس کی جان لے لونگا جو میرے پیغمبر کی تذلیل کریگا،

عدالت : آپ چپ چاپ رہیں، آپ کچھ نہیں کہہ سکتے،

مولانا محمد علی :۔ میں تو وہی کچھ کہہ رہا ہوں، جو مجھکو قانون کہنے کی اجازت دیتا ہے میں فوج کو اپنے فرائض انجام دینے میں نہیں ورغلاتا ہوں، میں تو یہ کہتا ہوں کہ ایک مسلمان فوجی کو کسی مسلمان کو ہلاک کرنا نہ درست ہے نہ اس کے فرائض میں ہے، مجھ کو حق ہے کہ کہ میں آخر آخر تک اس کی تلقین کروں، جب تک میں اس کی وضاحت نہ کر لوں، مجھ کو

(قہقہہ) ہاں اے جوری حضرات! ....

عدالت: میں آپ کی بات سننا نہیں چاہتا ہوں،

مولانا محمد علی: آپ میری باتیں نہ سنیں، آپ اسی طرح پہلے بھی نہیں سنتے رہے ہیں جب شہادت پڑھ کر سنائی جا رہی تھی تو آپ زیادہ تر سوتے ہی رہے ہیں، اب پھر سو سکتے ہیں، مجھکو جوری سے سب کچھ کہنا ہے،

عدالت: (غصہ میں) کیا آپ بیٹھ نہیں جائیں گے؟

مولانا محمد علی: اگر میں نہ بیٹھوں؟

عدالت: میں آپ کو حراست میں ڈال دوں گا،

پولیس کے سپرنٹنڈنٹ کو طلب کیا گیا کہ وہ ملزم کو زبردستی بٹھا دے لیکن وہ کچھ کہے بغیر واپس ہو گیا مولانا محمد علی بدستور کھڑے رہے، عدالت نے سررشتہ دار سے ملزم نمبر ۲ مولانا حسین احمد کو طلب کرنے کو کہا، سررشتہ دار نے مولانا حسین احمد کا نام لیکر پکارا، لیکن اُنھوں نے نہ کوئی جواب دیا اور نہ اپنی جگہ سے حرکت کی مولانا محمد علی (اس دخل کا خیال کئے بغیر) تو ہاں حضرات جوری!

عدالت: آپ عدالت کی کارروائی میں رخنہ نہ ڈالیں،

مولانا محمد علی: میں تو عدالت کی کارروائی میں رخنہ نہیں ڈال رہا ہوں، البتہ آپ میرے سلسلۂ کلام میں رخنہ ڈال رہے ہیں، مجھ کو اپنی صفائی پیش کرنی ہے اگر آپ میرے خلاف ۵۰۵ اور ۱۲۰ کی دفعات کو واپس لے لیں تو میں خاموش ہو جاؤں گا، آپ کو تو اختیار ہے کہ میرے اوپر جو الزامات لگائے گئے ہیں، ان میں ترمیم کر سکیں،

عدالت: میں آپ کو یہاں پر مذہبی قانون کو زیر بحث لانے کی اجازت نہیں دیسکتا ہوں،

مولانا محمد علی: مذہبی قانون کا سوال نہیں ہے، میں تو اس سرزمین کے قانون کے

اعتراض کرسکتے ہیں، آپ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ بات نہ کہو، لیکن میں یہ نہیں سمجھ سکتا ہوں کہ آپ یہ مجھکو یہ کہہ کر بالکل روک سکتے ہیں، کہ تمکو کچھ کہنے کی اجازت نہیں،

عدالت :- آپ بیٹھ جائیں، بیٹھ جائیں، میں کچھ سننا نہیں چاہتا،

مولانا محمد علی :- میں اس کی تشریح کر رہا ہوں کہ یہ کوئی قانون نہیں، یہ ایک مسلمان کے فرض میں داخل نہیں کہ وہ اپنے مذہب کے خلاف عمل کرے، کیا مجھے یہ ثابت کرنے کا موقع نہیں دیا جائیگا کہ کراچی کی تجویز کے سلسلہ میں میرا یہ بیان سچائی پر مبنی ہے، اس میں جھوٹ نہیں ہے، یہ متعلق بات ہے،

عدالت :- یہ متعلق بات نہیں ہے،

مولانا محمد علی :- کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ آپ کو قانون نے حق دیا ہے کہ آپ مجھ سے یہ حق چھین لیں، قانون تو یہ کہتا ہے کہ اس قسم کی وضاحت سے کوئی جرم نہیں عائد ہوتا ہے،

عدالت :- .... اور

مولانا محمد علی :- اور کہنے کی ضرورت نہیں، میں تو یہ بحث کر رہا تھا کہ یہ سچا بیان ہے، میں تو ارادہ کو ابھی زیر بحث نہیں لا رہا ہوں،

عدالت :- میں آپ کی کوئی بات سننا نہیں چاہتا ہوں،

مولانا محمد علی :- جوری تو سماعت کریں گے، آپ جوری کے اس حق کو سلب نہیں کر سکتے ان کو تو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ میں مجرم ہوں یا نہیں، میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، وہ قانون کے مطابق ہے، قانون یہی کہتا ہے (قانون پڑھ کر سناتے ہیں)،.......

عدالت :- آپ اپنے مقدمہ پر بحث کریں،

مولانا محمد علی :- میں اپنے ہی مقدمہ پر بحث کر رہا ہوں، آپ کے مقدمہ پر نہیں،

مولانا محمد علی:۔ کل تو آپ نے کہلا بھیجا تھا کہ قبل اس کے کہ میں اپنے مقدمہ کے قانونی پہلو کا ذکر کروں آپ مجھکو آدھا گھنٹہ زیادہ وقت مذہبی قانون کی اہمیت کو ظاہر کرنے کیلئے دیں گے، میں یہ بیان کر چکا ہوں پھر کہتا ہوں کہ ہر مقدمہ میں مذہب کی مثال استثنائی ہوتی ہے، اور جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ہمارے مذہب میں برطانوی فوج کی ملازمت ممنوع ہے تو یہ سچا بیان سمجھا جائے، جس کے بعد دفعہ ۵۰۵ کی ضرورت نہیں،

عدالت:۔ آپ تصور کر لیں کہ یہ بیان سچا سمجھا گیا،

مولانا محمد علی:۔ اسیسر بھی اس کو سمجھ لیں، وہ مجھکو یہ لکھکر دیدیں کہ یہ سچا بیان ہے، کیا وہ مجھکو لکھکر دیں گے کہ یہ بیان سچا ثابت کر دیا گیا، وہ مجھ سے کہیں کہ یہ ثابت ہو گیا پھر تو میں اپنے مقدمہ کے متعلق کچھ بھی نہ کہونگا، استغاثہ سے پوچھیں کہ مجھکو اپنا حق مل گیا کہ نہیں

استغاثہ:۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ پہلے کی عدالت میں بیان کا جو اقتباس دیا گیا تھا وہ وہ قرآن میں ہے،

مولانا محمد علی:۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس سے بھی زیادہ اور کچھ تسلیم کریں، آپ یہ بھی تسلیم کریں کہ میں نے کراچی کی تجویز کے سلسلہ میں جو بیان دیا تھا، وہ قرآن اور حدیث کے مطابق تھا میرے اوپر دفعہ ۵۰۵ کا جو الزام لگایا گیا ہے، وہ صحیح نہیں ہے،

استغاثہ:۔ یہ ہم تسلیم نہیں کر سکتے،

مولانا محمد علی:۔ اگر آپ اسکو تسلیم نہیں کر سکتے تو میں اسکو تسلیم کراؤنگا، اگر کوئی عیسائی ایک ایسا بیان دے جس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ ایسے خدا پر یقین رکھتا ہے، جو باپ بھی ہے، بیٹا بھی ہے، اور پاک روح بھی ہے، اگر وہ کہتا ہے کہ یہ عیسائیوں کے عقائد میں سے ہے اور یہ سچا بیان ہے، وہ اسکو انجیل (دین عیسوی حواریوں اور مناجات کی کتابوں)

کے متعلق بحث کر رہا ہوں، میں تو اسپیسر پر یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ کراچی کی تجویز میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ سچ ہے، قرآن اور حدیث کے مطابق ہے،

عدالت:- یہ سب کہنے کی ضرورت نہیں،

مولانا محمد علی:- یہ تو میں فیصلہ کر سکتا ہوں کہ کیا چیز کہنے کی ہے، آپ یہ فیصلہ نہیں کر سکتے، آپ استغاثہ کے گواہوں کو روکنے کا حق نہیں رکھتے، آپ اُن کو اسی وقت روک سکتے ہیں جب کہ دیں کہ اُن کی شہادت درج کرنے کے لائق نہیں، آپ نے استغاثہ کے وکیل کو نہیں روکا، اسلئے کہ اس کو وہی سب کچھ ثابت کرنا تھا جس کو وہ ضروری سمجھتا ہے، لیکن میں جس چیز کو ضروری سمجھتا ہوں، اس کو آپ ثابت کرنے کی اجازت نہیں دیتے، میں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے کراچی کی تجویز کے سلسلہ میں جو کچھ کہا وہ مسلمانوں کا قانون ہے، جس کی رو سے برطانوی ورج میں ملازمت کرنا حرام ہے، میں یہی بات قرآن اور حدیث سے ثابت کرنا چاہتا ہوں، میں قرآن کے قانون کا پابند ہوں، اور خود بادشاہ نے اپنے اعلان میں اس کا ذمہ لیا تھا، کہ وہ قرآن کے قانون کی پابندی کرنے میں ہماری پوری حفاظت کریں گے، اس لحاظ سے میں بادشاہ کے قانون کی بھی پابندی کر رہا ہوں اور اگر آپ خود بادشاہ کے قانون کی پابندی نہیں کرتے تو آپ نے اپنے سامنے ان کی تصویر کیوں آویزاں کر رکھی ہے، میں اسی بادشاہ کے قانون کا سہارا لے رہا ہوں، میرا بیان اسی بادشاہ کے قانون کے مطابق ہے، میں یہاں کوئی جھگڑا کھڑا کرنا نہیں چاہتا ہوں، میں یہاں جھگڑا کرنے نہیں آیا ہوں، میں نے آپ کے احترام میں فرق نہیں آنے دیا ہے اگرچہ میں اس عدالت کا احترام کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں، جو ایسی حکومت کا حصہ ہے، جس کو میں پسند نہیں کرتا ہوں میں ضدی بننا نہیں چاہتا، لیکن آپ میرا حق چھین کر میری حق تلفی نہیں کر سکتے،

عدالت:- لیکن آپ اتنا وقت نہیں لے سکتے،

اور یہ کہوں کہ میرا مذہب اس کی اجازت دیتا ہے، تو آپ ضرور کہہ اٹھیں گے کہ مجھکو اپنا ایسا مذہبی قانون دکھاؤ، آپ اس وقت میری بات پر یقین نہ کریں گے، آپ مجھکو یہ ثابت کرنے کا موقع دینگے تو پھر اس وقت یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے، میں قتل کرنے کے بعد عدالت کی محافظت کا خواستگار نہیں ہو رہا ہوں، میں نے آتش زنی کا جرم نہیں کیا ہے، میں نے کہیں لوٹ مار نہیں کی ہے، لوٹ تو اس وقت ایک مقدس فریضہ ہو جاتا ہے، جب فوج کا سردار اس کے لئے حکم دیتا ہے، قتل پھر قتل نہیں باقی رہتا ہے، جب فوجی کمانڈر اس کے لئے حکم دیتا ہے، اسی طرح میرے لئے قرآن کا حکم ہے، اگر قرآن قتل کرنے کو کہتا ہے، تو یہ قتل کوئی جرم نہیں ہو جاتا ہے جب میں قرآن کا حوالہ دوں، تو پھر آپ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کا یہ قانون دکھاؤ،

عدالت :۔ بحث کرنے کی خاطر میں یہ تسلیم کر لیتا ہوں،

مولانا محمد علی :۔ بحث کی خاطر نہیں، بلکہ ہر کام کے لئے آپ یہ تسلیم کر لیں، حضرات! میں اپنی مدافعت میں نہیں بول رہا ہوں، بلکہ مجھکو یہ ثابت کرنا ہے کہ میرا بیان صحیح تھا جب میں مسٹر مانٹیگو سے ملا، تو انھوں نے بھی یہ کہا کہ مسٹر محمد علی مذہب سے دور رہیں، اس کو زیر بحث نہ لائیں، میں نے ان سے کہا مہربانی کر کے آپ اور ہم مذہب کو زیر بحث لائیں، میری آنکھوں میں آنسو آگیا، جب میں نے ان سے کہا کہ میرے لئے یہ خوشی کی بات نہیں، ہو کہ میں حکومت کا مخالف ہو جاؤں، لارڈ مانٹیگو نے میرے آنسوؤں کی قدر کی، میں نے ان کو خلافت اور جزیرۃ العرب سے متعلق مذہبی قانون بتایا، اور ان کو سننا پڑا، میں نے لائڈ جارج اور کیبنٹ کے اور دوسرے اراکین کے سامنے بھی اپنے مذہبی قانون کی تشریح کی، اور انھوں نے یہ نہیں کہا کہ وہ قرآن سے کچھ مطلب نہیں رکھتے، میں یہی ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ یہ صحیح بیان ہے، اور آپ مجھ کو یہ ثابت کرنے کا حق دیں گے، اس حق کو آپ چھین نہیں سکتے،

سے ثابت کر سکتا ہے، تو کیا اس کو یہ ثابت کرنے کا حق نہیں دیا جا سکتا ہے، اور اگر میں اس کو یہ حق نہ دوں تو کیا میں ایک انصاف پسند مسلمان جج کہلا سکتا ہوں؟ کیا یہ میرے لئے صحیح ہوگا کہ ایک تثلیث پسند عیسائی کو اس کے اس حق سے محروم کر دوں کہ وہ اپنے بیان کو سچا ثابت کرے،

عدالت:۔ آپ بیٹھ جائیں،

مولانا محمد علی:۔ میں اس وقت تک نہیں بیٹھ سکتا ہوں، جب تک آپ یہ نہ تسلیم کریں کہ میرا بیان صحیح ہے، میں ایک بات کہنا چاہوں گا کہ میں ضدی بننا نہیں چاہتا، میں بلا ضرورت اصرار کرکے اپنی ضد پر اڑنا نہیں چاہتا، میں عدالت کے خلاف کوئی بُری نیت بھی نہیں رکھتا، میں آپ کے احترام میں فرق بھی نہیں آنے دینا چاہتا ہوں، گرچہ میں ایک ملزم کی حیثیت رکھتا ہوں مگر ترک موالات کا حامی ہوں، اس حیثیت سے میرے کردار کا تقاضا کچھ اور ہونا چاہئے، لیکن اس سے قطع نظر میں تو اپنا حق بات پر اڑا ہوں،

عدالت:۔ آپ عدالت کا وقت برباد کر رہے ہیں،

مولانا محمد علی:۔ میں کسی کا وقت برباد نہیں کر رہا ہوں، میں تو صرف جوری حضرات پر ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ میرا بیان صحیح بیان تھا،

عدالت:۔ اس سے غرض نہیں،

مولانا محمد علی:۔ اسی سے تو مجھ کو غرض ہے، میری اصلی غرض تو یہی ہے کہ میں جوری حضرات کے سامنے یہ ثابت کرسکوں کہ میرا بیان قرآن اور حدیث کے مطابق تھا، من گھڑت نہ تھا، آپ تھوڑی دیر کے لئے یہ تسلیم کریں کہ میں نے زنا بالجبر کیا، اور جب میں عدالت کے سامنے آؤں

قابل بنا پسند نہیں کیا، تو اسے حضرات! ہم دونوں بھائیوں کے نام کا جزو علی ہے، اور میرے نام کے ساتھ ایسا نام بھی ملا ہوا ہے، جو حضرت علیؓ سے بھی عظیم تر ہے، میں اپنی ذات کی خاطر ایک مچھر کو مارنا پسند نہ کرونگا، لیکن اللہ تعالیٰ کی خاطر تمام لوگوں کو قتل کر دینا چاہوں گا، میں کسی کو نہ چھوڑونگا، میں اپنے بھائی، اپنی محبوب ماں، اپنی بیوی، اپنے بچوں، سب کو اللہ تعالیٰ کی خاطر قربان کر سکتا ہوں، اللہ تعالیٰ مجھکو اس کی توفیق عطا فرمائے ــــــ جب وہ یہ کہہ رہے تھے تو ان کی آواز بھرا گئی، ان کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا، اور وہ بیخود ہو کر بیٹھ گئے" (یہ تفصیل مولانا محمد علیؒ کی انگریزی تحریروں اور تقریروں کے مجموعہ مرتبہ افضل اقبال سے لی گئی ہے)

مقدمہ میں جج کا فیصلہ وہی ہوا جس کی توقع تھی، سوامی شنکر آچاریہ جی کے سوا مولانا محمد علی اور ان کے مجاہد ساتھیوں کو دو دو سال کی سزا دی گئی، مگر اس سزا سے وہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں اور بھی مقبول ہوئے، ہر شخص کی زبان پر تھا۔

کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو

اور یہ بھی

بولیں اماں محمد علی کی جان بیٹا خلافت پہ دے دو

ساتھ تیرے شوکت علی بھی جان بیٹا خلافت پہ دے دو

ہیں یہی دین احمدؐ کے رستے جان بیٹا خلافت پہ دے دو

مسلمانوں کے جذبات کی جو آگ بھڑک اٹھی تھی، اس پر ان رہنماؤں کی سزا سے اور تیل پڑ گیا، جمعیۃ العلماء اور خلافت کانفرنس کے اجلاس مختلف شہروں میں ہوئے، کراچی کے جس ریزولیوشن کی خاطر ان رہنماؤں کی سزا ہوئی تھی، وہ ملک کے گوشہ گوشہ میں دہرایا گیا، ہزاروں مسلمان ہنسی خوشی خلافت کا کلمہ پڑھتے ہوئے جیل بھرتے چلے گئے، جیل جانا ایک

مولانا محمد علیؒ نے جج کو زچ کر دیا، تو پھر وہ خاموش ہو گیا، جس کے بعد انھوں نے دل کھول کر اپنی صفائی میں اتنا طویل بیان دیا کہ عدالتی کارروائی کی اپنی مثال آپ بن گیا آخر میں مولانا نے کہا کہ خدا کی سلطنت اس دنیا میں اب تک باقی ہے، اور جب یہ باقی ہے تو بادشاہ جارج کی سلطنت کے قانون کے مطابق ہمارے مقدمہ کا فیصلہ نہیں ہونا چاہئے ہم بادشاہ جارج کے قانون کی پابندی اسی وقت تک کریں گے، جب یہ خدا کے قانون کی خلاف نہ ہوگا، میں بادشاہ یا جج یا حکومت کے خلاف کوئی ذاتی بغض نہیں رکھتا ہوں، میں نے عوام میں جو تقریریں کی ہیں، ان میں سے کسی میں بھی یہ بات نہیں پائی جاتی، حضرات! ہمکو عامۃ الناس کی فلاح نہ کہ ذاتی مفاد سامنے رکھنا چاہئے، ایک بار ہمارے رسول اکرمؐ کے داماد، چچازاد بھائی اور جانشین حضرت علیؓ ایک ایسے یہودی سے برافروختہ ہو گئے، جس نے اسلام، اسلام کے خدا اور اسلام کے مذہب کی اہانت کی، انھوں نے اس کو زمین پر دے مارا، اور اس کے سینہ پر سوار ہو گئے، وہ سمجھا کہ اب تو وہ ہلاک کر دیا جائیگا، اسلئے اپنی بے بسی میں حضرت علیؓ کے چہرۂ مبارک پر تھوک دیا، آپ نے دیکھا ہوگا کہ دودھ کا برتن جب آگ پر رکھا ہوتا ہے، اور وہ ابلنے لگتا ہے تو اس کے ابال کو ٹھنڈے پانی سے چھینٹے سے کم کر دیا جاتا ہے، یہودی کے تھوک نے یہی کام کیا، حضرت علیؓ کی برہمی جاتی رہی، وہ یہودی کو چھوڑ کر دور ہٹ گئے، یہودی کو تعجب ہوا، اس نے دوڑ کر حضرت علیؓ کا دامن پکڑ لیا، اور بولا تعجب کی بات تو یہ ہے کہ جب میں نے ایک بات کہی تو آپ مجھ کو زمین پر پٹک کر ہلاک کرنے کے لئے تیار ہو گئے، لیکن جب میں نے آپ پر تھوکا تو آپ نے مجھے چھوڑ دیا، حضرت علیؓ نے جواب دیا، تو نے اللہ تعالیٰ کی اہانت کی، اس وقت تو میں تجھ کو مار ڈالنے کے لئے تیار ہو گیا، لیکن جب تو نے مجھ پر تھوک پھینکا تو مجھ کو ذاتی طور پر غصہ آگیا، میں نے اپنے ذاتی عناد کی خاطر تجھکو ہلاک کرنا پسند نہیں کیا، میں اللہ تعالیٰ کی خاطر تو تجھ کو مار سکتا تھا، لیکن علیؓ کی خاطر

سے زیادہ میرے دل میں ان کی محبت کبھی نہیں ہوئی تھی، جب انھوں نے ان دشمنان ملک و ملت کے سامنے مجھ سے کہا کہ تم ہماری فکر نہ کرنا، خدا ہی پہلے بھی رزاق تھا، اور اب بھی وہی رزاق ہے تم صرف ایک واسطہ تھے، خدا بلا واسطہ بھی دے سکتا ہے، اور دوسرا واسطہ بھی پیدا کر سکتا ہے، رہا تمھارا کام سو اگر اجازت ہو تو میں اسے کرتی رہوں...... (سید ۔ یکم دسمبر ۱۹۲۶ء)

مولانا محمد علی کے جیل جانے کے بعد ان کی والدہ بی اماں اور ان کی بیگم نے خلافت اور ہندوستان کی آزادی کی تحریک کو جاری رکھا، پورے ہندوستان کا دورہ کیا، جس سے تحریک بڑی جاندار رہی، مسلمان عورتوں میں بڑی بیداری پیدا ہوئی،

مولانا محمد علی جیل میں رہے، تو وہاں ان کی شخصیت اور نکھر گئی کلام پاک برابر پڑھتے رہتے وہاں ان پر جو کیفیت طاری رہی اس کا اظہار جیل خانہ ہی میں رہ کر اس غزل میں کیا ہے،

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں ‏— اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں

ہر لحظہ تشفّی ہے ہر آن تسلّی ہے ‏— ہر وقت ہے دلجوئی ہر دم ہیں مداراتیں

کوثر کے تقاضے ہیں تسنیم کے وعدے ہیں ‏— ہر روز یہی چرچے ہر رات یہی باتیں

معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت ‏— اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

بے مایہ ہیں ہم لیکن شاید وہ بلا بھیجیں ‏— بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

وہ ابھی جیل ہی میں تھے کہ ان کو خبر ملی کہ مصطفےٰ کمال پاشا نے سمرنا پر قبضہ کر لیا ہے، یہ فتح ستمبر ۱۹۲۲ء میں ہوئی، اس سے اُن کو بڑی خوشی ہوئی، انھوں نے اس پر ایک غزل کہی جس کا مطلع یہ تھا،

عالم میں آج دھوم ہے فتح مبین کی ‏— سُن لی خدا نے قیدی گوشہ نشین کی

سمرنا کی فتح کے بعد جولائی ۱۹۲۳ء میں لوزان صلح کانفرنس ہوئی، اس میں عثمانیہ سلطنت تو

فخر کی بات ہو گئی،

کراچی کے قیدی کچھ روز بعد سب الگ کردیئے گئے، مولانا شوکت علی راج کوٹ بھیج دیئے گئے، مولانا محمد علی بیجاپور منتقل ہو گئے۔ ...ت جاتے ہوئے کسی نامہ نگار نے ان سے ترک موالات کی تحریک کے بارہ میں سوال کیا، تو فرمایا تحریک کا حال تو وہ لوگ جانیں جو باہر ہیں، میں تو اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں اپنے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد گاندھی جی کی متابعت ضروری سمجھتا ہوں، گاندھی جی اس وقت جیل سے باہر تھے، مولانا محمد علی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے مرید تھے، ان کے اس بیان پر بعض ناقدین نے مولانا عبدالباری فرنگی محلی کو توجہ دلائی کہ مولانا محمد علی کو رسول اللہ صلعم کے بعد اپنے مرشد کی متابعت کو ضروری سمجھنا چاہئے تھا، لیکن مولانا عبدالباری نے اپنے پرجوش مرید کی مدافعت یہ کہہ کر کی کہ رسول مقبول صلعم کی متابعت میں مرشد کی متابعت بھی شامل ہوتی ہے،

مولانا محمد علی جب تک جیل میں رہے، ان کا کام جیل سے باہر ان کی والدہ اور بیوی انجام دیتی رہیں، وہ خود لکھتے ہیں،

"ہمارے جیل میں داخل ہوتے ہی ہم پر باہر کی دنیا کا دروازہ بند ہو گیا تو میری ماں ..... ایک ہاتھ میں تسبیح اور دوسرے میں عصائے پیری کو لیا، نقاب الٹ کر وہی کام کرنا شروع کیا جو ہم کیا کرتے تھے، مگر جسے حکومت نے سخت خطرناک سمجھ کر ہمیں جیل میں ڈال کر ہم سے چھڑا دیا تھا، میری اہلیہ نے اس سے پہلے ہی عورتوں میں جن کا ذوق وشوق مردوں سے کہیں بڑھ کر تھا، اس کام کو شروع کیا تھا، اور وہ میری رفیق کار اور رفیق سفر بن گئی تھیں، والیر کے اسٹیشن پر مجھے ان سے اور مہاتما گاندھی سے جدا کیا گیا، مہاتما جی کو مجھ سے ملنے کی اجازت نہیں ملی، مگر وہ آخر پولیس کی کوٹھری میں مجسٹریٹ ضلع اور ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس کے سامنے، جنھیں پردے کے خیال سے مجھ سے ملنے کی اجازت دینے میں تامل تھا، پردہ کھینچے ہوئے مجھ سے ملیں، اس وقت

ایک ہندوستانی صحابی

بابا[1] رتن رضؓ

از جناب ڈاکٹر سید وحید اشرف صاحب لکچرر شعبہ فارسی اردو مہاراجا سیاجی راؤ یونیورسٹی بڑودہ،

"بابا رتن پر اردو میں متعدد مضامین نکل چکے ہیں، اور بیشتر محققین نے ان کی شخصیت فرضی قرار دی ہے، لیکن مضمون نگار نے بعض نئے ماخذوں کی روشنی میں بابا رتن رضؓ سے متعلق تمام روایات پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے، اس لئے اس کو شایع کیا جاتا ہے تاکہ اس افسانہ کے سارے پہلو سامنے آجائیں۔ "م"

بابا رتن کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ایک ہندوستانی صحابی ہیں، بھٹنڈہ میں پیدا ہوئے جو لاہور سے ساٹھ[60] میل کے فاصلہ پر ہے[2]، معجزہ شق القمر دیکھکر نبی اکرمؐ کی زیارت کے مشتاق ہوئے اور دیدار نبیؐ کے بعد فوراً اسلام قبول کرلیا،

---

[1] مضمون نگار کی زیر تالیف کتاب حیات سید اشرف جہانگیر سمنانی سے چند ورق،

[2] نزہتہ الخواطر ج ا ص ۱۴۷ (طبع حیدرآباد دکن)

ضرور ختم کر دی گئی، لیکن ترکوں کو اپنے علاقہ کو آزاد اور خود مختار حکومت قائم کرنے کا حق دیا گیا جس کے بعد انگورہ میں ایک قومی اسمبلی قائم ہوئی، اس کے صدر مصطفےٰ کمال پاشا تھے، سلطان وحید الدین خلیفہ اب بھی تھے لیکن اُن کے سارے اختیارات قومی اسمبلی کو منتقل کر دیئے گئے، کچھ دنوں کے بعد سلطان وحید الدین کو ٹرکی چھوڑ دینا پڑا، اور اُن کی جگہ پر سلطان عبد المجید خلیفہ ہوئے،

اگست ۱۹۲۳ء کی آخری تاریخوں میں مولانا محمد علی جیل سے رہا ہوئے، تو باہر نکل کر ہندوستان کی سیاسی فضا کو بالکل بدلا ہوا پایا، جیسا کہ ان کی حسب ذیل تحریر سے معلوم ہوگا،

"ہمارے قید ہوتے ہی ہندو مہا سبھائی مہاراشٹر نے مہاتما گاندھی اور عدم تعاون کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، خود مہاتما گاندھی نے الٹی میٹم دے چکنے کے بعد بار دولی میں وہ روش اختیار کی جسے ملک نے ہتھیار ڈال دینے کے مرادف سمجھا، اور خود بھی ہماری طرح قید کر دیئے گئے، ان کے قید ہونے کے بعد پنڈت موتی لال نہرو اور دیش بندھو آزاد ہو گئے، اور بجائے سول نافرمانی شروع کرنے ....

.... کے گیا میں سوراج پارٹی کے نام سے وہ علم بغاوت بلند کیا گیا، جس نے عدم تعاون کی تحریک کا خاتمہ کر دیا، پھر لطف یہ کہ ہندو مہا سبھائیوں نے شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں شروع کیں، جنھوں نے ان مذہبی تعصبات کی آگ کو بھڑکایا جنھیں ہم ٹھنڈا کر چکے تھے، ان کے جواب میں مسلمانوں کے اس عنصر نے تبلیغ و تنظیم کے نام سے وہ زبانی جمع خرچ دکھانا شروع کیا، جو آج وطن پرستی اور ملت شکنی کا ڈھول بجا رہا ہے، اس طرح ہمارا کیا کرایا کام اکارت گیا، اور جب مجھے جیل خانہ ہی میں اس کا احساس ہوا تو میں نے اس طرح اس کا اظہار کیا، ؎

یہ حالت ہو گئی ایک ساقی کے نہ ہونے سے
کہ خم کے خم بھرے ہیں مے سے اور میخانہ خالی ہے

اور سچ تو یہ ہے کہ اس وقت ہندوستان کے سیاسی میخانہ میں مولانا محمد علی ہی ساقی بنے ہوئے تھے
(باقی)

اسماعیل العارفی[4]، ابوالفضل عثمان بن ابی بکر بن سعید الاربلی[5]، داؤد بن اسعد بن حامد القفال المحوری[6]، شریف علی بن محمد خراسانی الهروی[7]، معمر ابوبکر مقدسی[8]، ہمام السہرکندی[9]،

معمر ابوبکر مقدسی سے ابو مروان عبد الملک بن بشر المغربی نے رتن کے بارے میں روایت بیان کی ہے لیکن ابن بشر مغربی نے خود رتن کو نہیں دیکھا، رتن کو دیکھنے والوں میں ایک نام اور ملتا ہے جس کی تصدیق شیخ علاء الدولہ سمنانی (م ۷۳۶ھ) نے کی ہے اور شیخ علاء الدولہ سمنانی کی روایت کو ان کی کسی کتاب سے مولانا جامی نے نفحات الانس میں نقل کیا ہے[1]، یہ ملنے والے شیخ رضی الدین علی لالا (م ۶۴۲ھ) ہیں جو شیخ نجم الدین کبریٰ (م ۶۱۸ھ) کے خلفاء میں ہیں۔

نزہۃ الخواطر میں رتن کی تصدیق کرنیوالوں میں خواجہ محمد پارسا (م ۸۲۲ھ) کا بھی نام آیا ہے[2]۔

رتن کا اس زمانہ میں بسلسلۂ تجارت مدینہ جانا جب کہ نبی اکرمؐ کا ابھی بچپن تھا اور اکتالیس یا تئیس سال کے بعد پھر مدینہ جانا اور معجزۂ شق القمر کا مشاہدہ کرنا، اس کے بعد نبی اکرمؐ سے ملاقات کرنا اور اسلام قبول کرنا، غزوۂ خندق میں شریک ہونا، آپ کی درازی عمر کے لئے رسول اکرمؐ کا دعا کرنا، یہ تمام روایتیں حافظ ابن حجر نے مختلف ذرائع سے بیان کی ہیں، یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ رتن نے کوئی رسالہ بھی ترتیب دیا تھا جس میں ان تمام حالات کو قلمبند کیا تھا۔

---

[1] نفحات الانس بتصحیح مہدی توحیدی پور ص ۴۴۶، [2] نزہۃ الخواطر ج ۱

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں برکت عمر کی دعا دی اور انھوں نے تقریباً سات سو سال کی عمر پائی، ۶۳۲ھ یا ۶۰۸ھ یا ۵۹۵ھ میں وفات پائی اور اپنے وطن بھٹنڈہ میں سپرد خاک ہوئے۔[1]

رتن کے بارے میں محدثین میں بڑا اختلاف ہے، اور ان کا ایک گروہ ان کے وجود ہی سے انکار کرتا ہے، ان کی نظر میں یہ محض ایک فتنہ تھا، جو حصول دنیا کے لئے پیدا کیا گیا تھا، رتن کی مخالفت میں علامہ ذہبی سب سے زیادہ متشدد ہیں اور اس کے انھوں نے باوزن دلائل بھی پیش کئے ہیں۔

رتن کے بارے میں مختلف ذرائع سے جو اطلاعات ملتی ہیں انھیں حافظ ابن حجر عسقلانی نے اپنی کتاب الاصابہ فی تمیز الصحابہ میں یکجا کر دیا ہے لیکن حافظ ابن حجر نے فارسی مآخذ کا استعمال غالباً نہیں کیا ہے،

رتن کے والد کا نام مختلف طریقوں سے آیا ہے جو یہ ہیں:۔ رتن بن عبداللہ الہندی، رتن بن ساہوک بن جگندریو، رتن بن نصر بن کربال، رتن بن مبدن بن مندی، لیکن چونکہ رتن پہلی بار اسلام لائے اس لئے ان کے والد کا نام عبداللہ یا نصر قرین قیاس نہیں، ان کے دو بیٹوں کا نام آیا ہے، ایک محمود دوسرے عبداللہ۔ ان کے بیٹوں کے علاوہ جن لوگوں نے رتن کو دیکھا اور ان سے روایتیں بیان کی ہیں ان کے نام حافظ ابن حجر نے اسطرح دیے ہیں:۔

موسیٰ بن مجلیٰ بن بندار الدمتری، حسن بن محمد الحسینی الخراسانی، کمال تیراندی

---

[1] اصابہ ج ۱ باب ر ت (طبع مصر)

[2] ایضاً ج ۲ ق ۱ ص ۲۲ -

إنّ النبيّ صلى الله عليه وسلم قال قبل موته بشهر أو نحوه أ رأيتكم ليلتكم هذه فانه على رأس مائة سنة منها لا يبقى على وجه الأرض ممن هو اليوم عليها أحد۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وصال سے تقریباً ایک ماہ یا اس سے قریب میں فرمایا کہ کیا میں تمہاری اس رات میں تمہیں بتا دوں کہ سو سال کے آخر میں روئے زمین پر ان لوگوں میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہیگا جو آج موجود ہیں۔

اس حدیث میں جو مدت مقرر کی گئی ہے اسکے ۹۵ سال یا اس سے کچھ زیادہ تک ابو الطفیل عامرؓ زندہ رہے اور اسوقت اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے کوئی بھی بقید حیات نہیں تھا۔

اصابہ میں صفدی کی رائے بھی خود انہی کی کسی کتاب کے حوالہ سے نقل کی گئی ہے، صفدی نے رتن کے وجود اور ان کی صحابیت کا اقرار کرتے ہوئے ذہبی کے قول میں تاویل کی کوشش کی ہے، صفدی کا کہنا یہ ہے کہ ذہبی کو اصل واقعہ سے انکار ہے نہ کہ واقعہ کے امکان سے، یعنی ذہبی کو رتن کے واقعی وجود میں تردد ہے نہ کہ امکان وجود میں، اس لئے نزاع باقی نہیں رہ جاتا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ صفدی کا یہ محاکمہ صحیح نہیں ہے، اگرچہ صفدی کی کتاب موجود نہیں ہے لیکن ہمکو یقین ہے کہ حافظ ابن حجر نے جو کچھ اس میں نقل کیا ہے وہ صفدی کے بیان کا خلاصہ اور اصل ہی ہے کیونکہ ابن حجر نے صرف خاص باتوں کے نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے اور جن بیانات کو غیر ضروری سمجھا ہے انھیں نظر انداز کر دیا ہے، انھوں نے نہایت صاف طور سے اپنی کتاب

گروہ صوفیہ اور حافظ ابن حجر کے علاوہ رتن کے اسلام اور صحابیت کے قائلین میں صلاح الصفدی اور شیخ اللغۃ مجد الدین شیرازی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں، مجد الدین شیرازی کا بیان ہے کہ ان کے زمانے میں ہندستان میں رتن کا اسقدر چرچا تھا جسکا احصار ممکن نہیں اور کثرت سے لوگ اپنے آباء و اجداد سے رتن رضؓ کے واقعات بیان کرتے تھے، بھٹنڈہ کی اکثر آبادی رتن کی اولاد و احفاد ہی پر مشتمل تھی۔[۵]

لیکن ذہبی رتن کے قائلین میں سے کسی کی بات ماننے پر تیار نہیں، وہ ان کے شدید مخالف ہیں، لیکن جہاں اس تشدد میں ان کے طبعی مزاج کا بھی دخل معلوم ہوتا ہے وہاں ان کے بعض باوزن عقلی و نقلی دلائل بھی ہیں جنھیں ذیل میں پیش کیا جاتا ہے،

(۱) پانچ صدیوں میں رتن کا کہیں ذکر نہیں ملتا، اچانک چھٹی صدی ہجری میں ان کے وجود کا چرچا ہو جاتا ہے، اور ان سے روایتیں بیان کی جانے لگتی ہیں، ان روایتوں کو صوفیہ بے چون وچرا قبول کر لیتے ہیں، اگر واقعی ان کا وجود ہوتا تو اس سے پہلے بھی ان کا ذکر ضرور ہوتا اور اس لئے محض صوفیہ کی بیان کردہ روایات تاریخی اعتبار سے ناقابل اعتبار ہیں۔

(۲) محدثین اس بات پر متفق ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیکھنے والوں میں جنھوں نے سب سے بعد میں وفات پائی وہ ابو الطفیل عامر بن واصلہ ہیں اور اس بارے میں صحیح حدیث وارد ہے کہ

---

[۵] اصابہ جلد ۱، باب رت،

البتہ کشف کی تصدیق یا تکذیب ان سے متعلق علوم تاریخی حقایق سے کیجا سکتی ہے۔ مولانا گیلانی اگر اس اصول کو پیش نظر رکھ کر رائے دیتے تو ان کی رائے مزید تحقیقات یا نئے آخذ کی دریافت سے مجروح نہیں ہوسکتی تھی۔ لیکن اس اصولی غلطی کی وجہ سے نئے آخذ کی دریافت ان کی رائے کی مکمل تردید کرتی ہے۔ رتن کے وجود، ان کی درازی عمر اور ان کی صحابیت کی روایات کو مقبول بنانے میں سب سے زیادہ ہاتھ شیخ علاء الدولہ سمنانی ہی کا ہے، اسکا ذکر آگے آئے گا۔

رہا قبر پرستی یا نفس پرستی، تو اسکا کسی ایسے تاریخی واقعہ سے کیا تعلق جس سے کوئی دینی مسئلہ نہ مستنبط ہوتا ہو اور کیا کسی ایسے واقعہ کا انکار یا اقرار کر کے کسی برائی کو مٹایا یا کم کیا جا سکتا ہے؟

صاحب نزہتہ الخواطر نے بھی رتن کے بارے میں اصابہ کی روایات کو اختصار کے ساتھ جمع کر دیا ہے اور اس میں خواجہ الوفیات اور بحر زخار کی روایتوں کے علاوہ بعض اور اقوال کے اضافے بھی کئے ہیں۔ لیکن اصل آخذ حافظ ابن حجر اور ذہبی ہی کی تالیفات ہیں۔

یہاں محدثین کی رایوں میں محاکمہ کرنا نہ ہمارا مقصد ہے اور نہ ہمارا منصب لیکن اگر ذہبی کے اعتراض کے جواب میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ چونکہ رتن کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود درازی عمر کی دعا دے چکے تھے، اس لئے حدیث مائۃ سے رتن کو مستثنیٰ سمجھنا چاہئے، تو رتن کے وجود اور

۱۔ نزہتہ الخواطر ج ۱ ص ۱۴۷۔

میزان الاعتدال[1] اور تجرید میں نہ صرف رتن کا انکار کیا ہے بلکہ نہایت سخت لفظوں میں کذب و افترا کا الزام لگایا ہے، ان سے ملنے والوں کے بیانات کی بھی شدید مذمت کی ہے اور انھیں غلاۃ صوفیہ سے تعبیر کیا ہے، انکا کہنا ہے کہ حدیث ماتیہ کے بعد کسی کلام کی گنجائش ہی نہیں باقی رہ جاتی، اس لئے یہ کہنا کہ نزاع اصلی نہیں ہے ذہبی کے اعتراضات کا جواب نہیں ہے،

اصابہ میں منقول روایات کو مولانا مناظر احسن گیلانی نے بھی اردو میں ملخص کر کے قلمبند کیا ہے لیکن انھوں نے کھل کر کوئی رائے نہیں دی ہے، البتہ علمی استدلال سے ہٹ کر انھوں نے ایک دوسرا معیار مقرر کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھی انکار کی طرف مائل ہیں، وہ یہ ہے :-

(۱) مولانا گیلانی صوفیہ میں شیخ علاء الدولہ سمنانی کے کشف کی صداقت کے قائل ہیں اس لئے وہ لکھتے ہیں کہ اگر شیخ علاء الدولہ سمنانی نے اپنے کشف سے رتن کی تصدیق کی ہوتی تو انھیں ماننے میں کوئی تامل نہیں تھا۔

(۲) قبر پرستی اور شرک کی لعنت سے بچنے کے لئے بہتر یہی ہے کہ رتن کا انکار کیا جائے تاکہ لوگ ان کی قبر تک جانا چھوڑ دیں۔[2]

یہاں مولانا گیلانی سے یہ فرو گذاشت ہوئی ہے کہ انھوں نے اس اصول کو نظر انداز کر دیا کہ حق معیار کشف ہے نہ کہ کشف معیار حق، کسی تاریخی واقعہ کی تصدیق یا تکذیب کسی بزرگ کے کشف کی بنیاد پر نہیں کی جا سکتی۔

---

[1] میزان الاعتدال فی نقد الرجال بتصحیح سید محمد بدر الدین النعسانی ج ۱ ص ۳۳۶

[2] دیکھئے رسالہ "ایک ہندوستانی صحابی بابا رتن ہندی صحابی رسول کے حالات" از مولانا مناظر احسن گیلانی ناشر صدیقی بک ایجنسی دیوبند۔

(۱) تمام روایتیں متفق ہیں کہ رتن پانچ صدیوں تک بالکل گمنام رہے اور چھٹی صدی ہجری میں موت سے کچھ پہلے مشہور ہوئے اور یہ شہرت ان سے ملنے والے صوفیہ کے ذریعہ ہوئی، اگر رتن کا مقصد اپنے کو صحابی مشہور کر کے شہرت اور منفعت حاصل کرنا تھا تو یہ کام وہ بہت پہلے کر سکتے تھے، انھوں نے ایسے وقت میں اپنے کو ظاہر کیا کہ اپنی شہرت اور صحابیت سے وہ کوئی دنیاوی فائدہ اٹھانے کے قابل نہ رہ گئے تھے، اس لئے رتنؒ پر کذب و افترا کا الزام کوئی وزن نہیں رکھتا،

(۲) رتن کی تصدیق کرنے والوں میں زیادہ تر ان لوگوں کا نام آتا ہے جو رتن سے بالکل غیر متعلق اور مختلف ملکوں کے رہنے والے تھے، مثلاً خراسان، یمن اور مکہ وغیرہ، ان کی تصدیق پر حسن ظن کا گمان تو ہو سکتا ہے لیکن کذب یا فتنہ پردازی کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا،

(۳) بھٹنڈہ کا علاقہ ساتویں صدی ہجری میں نسلاً بعد نسلٍ رتنؓ کی اولاد و احفاد سے آباد تھا جیسا کہ مجدالدین شیرازی وغیرہ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے[1] اس سے ان کے طول عمر کا پتہ چلتا ہے اس لئے ان کے دیکھنے والوں کو ان کی عمر کے بارے میں شک نہ ہو سکا۔

ہم لکھ چکے ہیں کہ ساتویں صدی ہجری میں یعنی رتن کی وفات کے کچھ ہی عرصہ بعد رتن کے وجود اور انکی صحابیت کی روایت کو مقبول بنانے میں سب سے زیادہ ہاتھ شیخ علاء الدولہ سمنانی کا رہا ہے، انھوں نے رتن کی تصدیق کی اور ان سے سید اشرف جہانگیرؒ، مولانا جامی اور دوسرے بزرگوں نے نقل کیا۔

[1] اصابہ ج ۱ باب رتن،

ان کی صحابیت کے بارے میں پائی جانے والی روایات کو باور کرنے میں کوئی بڑی رکاوٹ حائل نہیں رہ جاتی، رہا یہ سوال کہ وہ ایک طویل عرصہ تک کیوں پوشیدہ رہے اور چھٹی صدی ہجری سے قبل کی کسی کتاب میں انکا ذکر کیوں نہیں ملتا، اگرچہ اہم ہے لیکن ان کی پوشیدگی ہی کتابوں سے ان کی گمنامی کا سبب قرار دی جا سکتی ہے اس سے کچھ ایسا مترشح ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک عرصہ تک اپنے کو گمنام ہی رکھنا مناسب سمجھا ہوگا۔

رتن سے ملاقات کرنے والوں کے نام ابتدا میں دئے جا چکے ہیں، انہیں سے موسیٰ بن مجلی نے ۶۰۳ھ میں سمنان کی خانقاہ سابقیہ میں کچھ لوگوں کے سامنے رتن کے بارے میں روایات اور ان سے روایت کردہ احادیث بیان کیں،

ان کے سامعین میں ایک تاج الدین محمد بن احمد بن محمد خراسانی تھے، انھوں نے شیخ ابو القاسم محمد الحسینی الکاشغری سے چالیس حدیثیں بیان کیں اور کاشغری نے مدینہ میں ذہبی سے روایت بیان کی۔ ابو مروان بن عبد الملک بشیر المغربی نے ابو بکر مقدسی سے رتن کی ملاقات کی تفصیل نقل کی ہے جسے حافظ ابن حجر نے قلمبند کیا ہے، ان کے علاوہ حسین بن محمد خراسانی اور چند دوسرے ملنے والوں کی ملاقات کی بھی تفصیل بیان کی ہے، جن کا بیان اعادہ غیر ضروری طوالت ہے، اس لئے انھیں نظر انداز کیا جاتا ہے،

رتن کے بارے میں جو روایتیں ملتی ہیں ان کی بنیاد پر یقین کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے لیکن ان روایتوں میں ایسے قرینے موجود ہیں جن سے انکے وجود اور ان کی صحابیت کے بارے میں کچھ قیاس کیا جا سکتا ہے، مثلاً،

تصنیف میں کیا ہے جنھوں نے رتن سے ملاقات کی تھی اور ان سے تبرکات بھی حاصل کئے تھے اسکا ذکر جامی نے اسطرح کیا ہے :-

شیخ رضی الدین علی لالاء الغزنوی سفر ہندوستان کردہ بود وصحبت ابو رضا رتن رضی اللہ عنہ دریافتہ و امانت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم از وی گرفتہ چنانچہ شیخ رکن الدین علاء الدولہ آنرا تصحیح فرمودہ وگفتہ "صحب" یعنی الشیخ رضی الدین علی لالاء صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابا الرضا رتن بن النصر رضی اللہ عنہ فاعطاہ مشطاً من امشاط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

و شیخ رکن الدین علاء الدولہ آن شانہ را در خرقہ پیچیدہ و آن خرقہ را در کاغذے نہادہ و بخط مبارک خود بر آن کاغذ نوشتہ هذا مشط من امشاط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وصل الی هذا الضعیف من صاحب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وهذہ الخرقة وصلت من ابی الرضا رتن الی هذا الضعیف

وہم شیخ رکن الدین بخط مبارک خود نوشتہ است کہ چنین گویند کہ آن امانت برای شیخ رضی الدین علی لالاء بودہ است از رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم[1]

شیخ علاء الدولہ سمنانی کے صحبت یافتہ بزرگ سید اشرف جہانگیر سمنانی نے رتن کا تذکرہ اپنے ایک مکتوب میں اسطرح کیا ہے :-

" ایں درویش........ ہر درویش را کہ یافت از و استفادہ کردہ

---

[1] نفحات الانس ص ۲۳۶ ،

ساتویں صدی ہجری میں ایران میں شیخ علاء الدولہ سمنانی کی شخصیت اتنی اہم تھی کہ ان کے اقوال سے دوسرے صوفیہ کا متاثر ہونا ناگزیر ہے۔ ان کے بعد ایران کے بیشتر صوفیہ بالواسطہ یا بلاواسطہ شیخ علاء الدولہ سے فیض یافتہ ہیں۔ شیخ نے خود کہا ہے۔

ہر جا کہ سیہ گلیم و آشفتہ دلیست
شاگرد من است و خرقہ از من دارد [۱]

اس لئے رتن کے بارے میں شیخ علاء الدولہ سمنانی کی بیان کردہ روایت تقریباً سبھی صوفیہ کے لئے سند کی حیثیت رکھتی ہے۔

شیخ علاء الدولہ سمنانی نے شیخ رضی الدین علی لالا الغزنوی [۲] کا ذکر اپنی کسی

---

۱ شیخ علاء الدولہ سمنانی کے مختصر حالات کیلئے دیکھئے معارف اگست ۱۹۶۸ء حاشیہ مقالہ تصوف اسلامی پر ایک ہندوستانی کتاب، لطائف اشرفی، از ڈاکٹر سید وحید اشرف،

۲ علی بن سعید بن عبدالجلیل اللالا الغزنوی معروف بہ رضی الدین علی لالا، شیخ نجم الدین کبریٰ کے مرید و خلیفہ ہیں۔ شیخ لالا کے دادا عبدالجلیل حکیم سنائی کے چچا تھے، شیخ لالا نے ایک عمر سیر و سیاحت میں گزاری اور ایک سو چوبیس بزرگوں سے استفادہ کیا، وفات کے بعد ان کے صندوق سے ایک سو تیرہ خرقے نکلے ۲۰ ربیع الاول ۶۴۲ھ کو وفات پائی (نفحات الانس ص ۴۳۶) ابو الجناب احمد بن عمر الخیوقی معروف بہ شیخ نجم الدین کبریٰ علم ظاہری و باطنی میں بلند مرتبہ رکھتے تھے، انکے بعض خلفاء مقتدائے زمان اور یگانہ جہان تھے مثلاً شیخ مجد الدین بغدادی، شیخ سعد الدین حموی، باکمال جندی، شیخ رضی الدین علی لالا، شیخ سیف الدین باخرزی، شیخ نجم الدین رازی، شیخ جمال الدین گیلی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مولانا جلال الدین رومی کے والد شیخ بہاء الدین ولد بھی ان کے مرید تھے، ۶۱۸ھ میں خوارزم میں تاتاریوں سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ (نفحات ص ۴۱۹)

کی تاریخ تحریر میں تقریباً پون صدی یا اس سے بھی زیادہ کا فرق[1] ہونے کے سبب سے ممکن ہے کہ تفصیلات پوری طرح ذہن میں محفوظ نہ رہ گئی ہوں، ایک تیسری وجہ عبارت میں الحاق و تحریف بھی ہوسکتی ہے اور یہی زیادہ قرین قیاس ہے۔

پانچ یا چھ صدیوں تک بابا رتن کی گمنام شخصیت کے صندوق سے ایکسو دہ مشائخ کے خرقوں کا نکلنا قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ صحابی رسولؐ ہونے کی بنا پر اتنے مشائخ سے ملنے کے بعد وہ مسلسل گمنام نہیں رہ سکتے تھے اور جب انھیں لوگوں نے دیکھا تو ان کی حالت یہ تھی کہ وہ خود ملنے والوں کو نہیں دیکھ سکتے تھے، اصنا کے بیان کے مطابق ان کے لڑکوں نے انھیں نرم روئی میں رکھ کر ایک زنبیل میں کھجور کے ایک درخت سے لٹکا دیا تھا اور بوقت ضرورت شہد کی مکھی کی طرح بھنبھناتی ہوئی آواز میں بولتے تھے، البتہ شیخ رضی الدین علی لالا، کے بارے میں خود نفحات الانس میں ہے کہ انھوں نے ۱۲۴ مشائخ سے خرقے حاصل کئے تھے، جن میں سے وفات کے وقت تک ۱۱۳ خرقے باقی رہ گئے تھے اور یہ بقچہ جس میں ۱۱۳ یا ۱۱۴ خرقے تھے شیخ رضی الدین علی لالا، کا تھا۔ اس میں حضرت جہانگیرؒ نے کنگھی کو جس طرح دیکھا بیان کر دیا یعنی وہ جسطرح کپڑے میں لپٹی ہوئی تھی اس پر جو عربی عبارت تحریر تھی اس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ کنگھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے، لیکن جامی نے یہ تصریح کر دی ہے کہ یہ عبارت خود شیخ علاء الدولہ سمنانی نے لکھی تھی،

---

[1] شیخ علاء الدولہ سمنانی کی تاریخ وفات ۷۳۶ھ ہے اسلئے شیخ علاء الدولہ اور حضرت جہانگیر میں ملاقات ۷۳۶ھ سے قبل ہی ممکن ہے اور موجودہ مکتوبات اشرفی کے خطوط ۷۸۶ھ کے بعد لکھے گئے، اسکی تصریح خود مکتوبات کے مرتب نے مقدمہ میں کر دی ہے۔

وبخدمت حضرت بابا رتن رسیدہ واز ایشاں خرقہ بیک واسطہ از حضرت علیہ السلام پوشیدہ و وقتیکہ بخدمت شیخ علاء الدولہ سمنانی رسیدہ واز ایشاں استفادہ ظاہری و باطنی کردہ میفرمودند کہ من از حضرت بابا رتن غرائب آثار و عجائب اسرار دریافتہ ام چوں بابا سفر آخرت کردہ اند شیخہ بر آمد چوں واکردند صد و چہار دہ خرقہ از اکابر متعدد بر آمدہ و بر ہر خرقہ نامی از اکابر کہ از دریافتہ بودند نوشتہ و یک مربع بچند پارہ جامہ پیچیدہ بود و بروی نوشتہ کہ ھذا مشط من امشاط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم از آنجا ی کہ التفات بسیار و توجہات بیشمار بایں درویش داشتند عنایت نمودند و سالہای کثیرہ و حالتہای کبیرہ از صحبت جدا نکردہ بودیم در ایام قریب سفر آخرت بفرزند اعزالآفاق سید عبد الرزاق را سپردہ شد۔“ [۱]

جامی اور حضرت جہانگیر کی بیان کردہ روایت میں بہت فرق نظر آتا ہو لیکن دونوں کے بیان سے کم از کم اتنا ضرور واضح ہوتا ہے کہ بابا رتن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک کنگھی شیخ علاء الدولہ سمنانی تک پہونچی تھی۔ جامی نے شیخ علاء الدولہ سمنانی کی جو تحریر دیکھی تھی اسے نقل کر دیا اور حضرت جہانگیر نے واقعہ کو جسطرح دیکھا اپنے مکتوب میں بیان کر دیا۔ مکتوب کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو شیخ علاء الدولہ سمنانی نے پوری تفصیل حضرت جہانگیر کو نہیں بتائی کہ وہ کنگھی اور خرقے انھیں کس طرح ملے تھے اور اگر بتائی ہوگی تو اس واقعہ کے زمانہ اور اس مکتوب

---

[۱] مکتوبات اشرفی مکتوب شصت و نہم بنام زبدۃ المعاصر شیخ ناصر،

درج ہے یعنی ۹۶ھ ۶۰۸ھ ۶۳۲ھ ۔اس وقت حضرت جہانگیرؒ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے ۔

حافظ ابن حجر سے پہلے رتن کے بارے میں ذہبی نے روایت بیان کی ہے ،اور ذہبی کو یہ روایات ان کی وفات کے بعد ملیں ،اگر دوران حیات ہی انھیں اطلاع ملی تو وہ ضرور اسکا ذکر کرتے ،ذہبی کا سنہ پیدائش ۶۷۳ھ اور سنہ وفات ۷۴۸ھ ہے یعنی ساتویں صدی ہجری ہی میں رتن کی وفات ہوچکی تھی ،اور حضرت جہانگیرؒ آٹھویں صدی ہجری کے اوائل میں پیدا ہوئے ،اسلئے دونوں میں ملاقات کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا ۔

اس مکتوب میں بابا رتن سے ملاقات کا ذکر یقیناً الحاقی ہے اور اسطرح کی تحریف والحاق لطائف اشرفی اور مکتوبات اشرفی میں متعدد جگہ ملتے ہیں ،یہ بات بھی بہت مشتبہ ہے کہ شیخ علاء الدولہ سمنانی سے وہ کنگھی حضرت جہانگیرؒ کو ملی ہو ورنہ اسکا ذکر متعدد طریقوں سے ملتا اور جب آپ کو کنگھی ملی ہی نہیں تو سید عبدالرزاق نور العین کو اس کے ملنے کا سوال خود بخود خارج از بحث ہو جاتا ہے ،یہاں قارئین کنگھی کے بارے میں مکتوب کے اس جملہ کو پھر ملاحظ کریں ۔

"...... در ایام قریب سفر آخرت بفرزند اعزالآفاق سید عبدالرزاق سپردہ شد"

جب سفر آخرت کے قریب وہ کنگھی سید عبدالرزاق کے سپرد کی گئی تو کیا یہ خط اپنی وفات کے بعد حضرت جہانگیرؒ نے عالم آخرت سے لکھا تھا اس لئے کوئی بھی ذی ہوش اس مکتوب کی اصل عبارت قرار نہیں دے سکتا ،یہ جملہ یقیناً الحاقی ہے ۔

اب ہم اصل مسئلہ کی طرف رجوع کرتے ہیں جو تین تحقیق طلب امور پر مشتمل ہے،
اوّل یہ کہ کیا حضرت سید اشرف جہانگیرؒ کی ملاقات بابا رتن سے ہوئی تھی؟
دوسرے کیا انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی کنگھی شیخ علاء الدولہ سمنانی سے ملی تھی؟
تیسرے اگر وہ کنگھی ملی تھی تو کیا وہ حضرت نور العینؒ کو دی گئی؟[۱]

مکتوب کی عبارت سے ان سوالوں کا جواب اثبات میں ملتا ہے۔ لیکن اس پر ایک تحقیقی نظر ڈالنے سے صاف پتہ چل جاتا ہے کہ مکتوب کی عبارت تحریف و الحاق کا شکار ہو گئی ہے،

مکتوب میں بیان کیا گیا ہے کہ جب حضرت شیخ سید اشرف جہانگیرؒ استفادہ کے لئے شیخ علاء الدولہ سمنانی کی خدمت میں پہونچے تو اس سے پہلے بابا رتن کا انتقال ہو چکا تھا اور اس وقت ان کے تبرکات اور وہ کنگھی شیخ علاء الدولہ سمنانی کی ملکیت میں آ چکے تھے جسے حضرت جہانگیرؒ نے مشاہدہ بھی فرمایا تھا، شیخ علاء الدولہ کا سال وفات ۳۶ ؍ ھ ہے، یعنی خود اس مکتوب کے مطابق بابا رتن ۳۶ ؍ ھ سے بہت پہلے وفات پا چکے تھے مکتوب کی اندرونی شہادت اس بات کے لئے دلیل ہے کہ حضرت جہانگیرؒ کی ملاقات بابا رتن سے ناممکن ہے کیونکہ حضرت جہانگیرؒ کے ہندوستان میں آنے سے پہلے بابا رتن وفات پا چکے تھے،

خارجی شہادتیں بھی بتاتی ہیں کہ ساتویں صدی ہجری کے پہلے نصف حصہ کے اندر بابا رتن کی وفات ہو چکی تھی، اصابہ میں تاریخ وفات اختلاف کے ساتھ

[۱] چونکہ ان سوالات کا تعلق صرف حضرت سید اشرف جہانگیرؒ سے نہیں بلکہ بابا رتن سے بھی ہے اس مضمون میں ان کا ذکر ضروری تھا۔

اقبال اور اسلامی فکر کی تشکیلِ جدید

از

جناب پروفیسر عبد المغنی صاحب

اقبال ایک عظیم ترین شاعر تھے اور ان کے فکری اجتہادات کا وسیلۂ اظہار شاعری ہی ہے، لیکن وہ محض فنکار نہیں تھے اور نہ شاعری ان کا مقصود بالذات تھی، بلکہ وہ اپنے دور میں حیات انسانی کی ایک نئی تشکیل چاہتے تھے، اور اس تشکیل کے لئے انھوں نے وسیع مطالعہ اور عمیق غور و فکر کے بعد اسلامی نصب العین اختیار کیا تھا اس لئے اقبالؔ کی شاعری کا بنیادی موضوع اسلامی فکر ہے،

جس دور میں اقبال نے آنکھ کھولی وہ عصر حاضر کا نقطۂ آغاز تھا، جب انیسویں صدی کی مغربی سائنس، صنعت و حرفت، فلسفہ اور سیاست نے عالم انسانیت کو تباہی کے راستے پر لگا دیا تھا، اقبالؔ کی مشق سخن کے ابتدائی ایام یعنی بیسویں صدی کے آغاز میں، ایک طرف سائنس کے تازہ ترین انقلابی انکشافات اور دوسری طرف جنگ عظیم اول (۱۹۱۴ء-۱۸ء) کی ہولناک تباہی نے زندگی اور سماج کے پورے ڈھانچہ کو برہم کر دیا تھا، اور یہ نظر آنے لگا تھا کہ یورپ کا نظام فرسودہ ہو کر رہ گیا ہے اور وہ نئے ماحول کی ترقی پذیر زندگی کے تقاضوں

لیکن قابل اطمینان یہ ہے کہ اس الحاق کے پیچھے جو تصور بھی کار فرما رہا ہوگا، وہ ابتک وجود میں نہ آسکا اور اس کتاب کی اشاعت کے بعد اس تصور کی عملی شکل آیندہ کے لئے بھی محال ہو جائیگی، خاندان اشرفیہ میں ابتک جو چیزیں تبرکات کی شکل میں رہی ہیں ان میں کنگھی کی قسم کی کوئی چیز نہیں تھی۔

حیاتِ سلیمانؒ

حیاتِ سلیمانؒ جس کا شایقین کو انتظار تھا، الحمد للہ چھپ کر شائع ہوگئی، یہ محض جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری ہی نہیں ہے بلکہ اون کے گوں ناگوں مذہبی، علمی، قومی و ملی وسیاسی حالات اور کارناموں کا ایک دلآویز مرقع ہے، جس میں سید صاحب کے دور کی تمام ملی و قومی وسیاسی وعلمی تحریکوں مثلاً ہنگامۂ مسجد کانپور، تحریک خلافت، تحریک ترک موالات اور تحریک جنگ آزادی کی پوری تاریخ آگئی ہے اس کے ساتھ تاسیس دار المصنفین جو ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، قیام ریاست بھوپال اور ہجرت پاکستان اور پھر بھوپال اور پاکستان میں انھوں نے جو علمی خدمات انجام دیں، پھر سفر افغانستان سفر یورپ اور سفر حجاز وغیرہ کی بہت مفصل روداد بھی سید صاحب کی تحریر کی روشنی میں قلمبند ہوگئی ہے یہ اپنے اسلوب اور طرز انشاء کے لحاظ سے بالکل حیات شبلی کا ثنیٰ ہے

مؤلفہ　شاہ معین الدین احمد ندوی　　　منیجر

یہ نکتہ سرگذشتِ ملّتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے

یہی مقصودِ فطرت ہے یہی رمزِ مسلمانی　　　اخوّت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا　　　نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

(طلوعِ اسلام)

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارا ہے کہ ہر شب کو سحر کر　(شعاعِ امید)

لیکن اس بحرانی دور میں جو ابھی تک جاری ہے خود اسلامی مشرق کا حال کیا تھا؟

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم　　　جس نے مومن کو بنایا مہ و پروین کا امیر
تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز　　　تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

(تن بہ تقدیر: ضربِ کلیم)

ہند میں حکمتِ دیں کوئی کہاں سے سیکھے　　　نہ کہیں لذتِ کردار نہ افکارِ عمیق
حلقۂ شوق میں وہ جرأتِ اندیشہ کہاں　　　آہ محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق
خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں　　　ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

(اجتہاد: ضربِ کلیم)

کو پورا نہیں کر سکتا، اقبال نے "پیام مشرق کے دیباچے میں آئین اسٹاین کے نظریۂ اضافیت کے عملی مضمرات پر گفتگو کرتے ہوئے یہ اہم نکتہ واضح کیا ہے:

"یورپ کی جنگ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لئے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے جس کا ایک دھندلا سا خاکہ ہمیں حکیم آئن اسٹاین اور برگسان کی تصانیف میں ملتا ہے۔"

ان حالات نے اقبال کو انسانیت کے مستقبل کے متعلق متفکر کر دیا، انھوں نے محسوس کیا کہ یورپ نے سرمایہ داری جمہوریت اور اشتراکیت کی مختلف شکلوں میں جو نظام انسانی مسائل کے حل کے لئے پیش کئے وہ سب کے سب ناقص تھے، اسلئے ناکام ثابت ہوئے، اگر ان کے مقابلے میں کوئی بہتر نظام نہیں پیش کیا گیا تو انسانیت فنا ہو جائے گی، اس کے لئے رائج الوقت تمام فلسفوں اور حالات کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اقبال اس نتیجے پر پہونچے کہ عصر حاضر کے تمام انسانی مسائل کا حل صرف اسلامی تصور حیات کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے ملت اسلامیہ کا یہ فرض ہے کہ وہ نسلی اور قومی بنیاد کے بجائے اصولی اور نظریاتی بنیاد پر ایک آفاقی تحریک برپا کرے، اور سب سے پہلے مشرق اور پھر پوری دنیا کی اصلاح و تجدید کی مہم سر انجام دے۔

ربط و ضبط ملت بیضا ہے مشرق کی نجات

ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر (خضر راہ: دنیائے اسلام)

کا وہ تصور بھی جو اقبال کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ صحیح نہیں ہے، اسکا مقصد ہندوستان کی تقسیم نہیں تھا، جیسا کہ لوگوں نے بلا تحقیق مشہور کر دیا ہے، اگر اقبال کے سن ۱۹۳۰ء کے خطبہ الہ آباد والے نقشے کو تسلیم کر لیا جاتا، تو تقسیم اور اس کے خون خرابے کے بغیر ایک متحدہ آزاد ہندوستان وجود میں آجاتا۔ اس دور میں پورے مغرب میں جو اضطراب برپا تھا اور اسلامی مشرق کی جو حقیقت تھی اس نے اقبال کو ایک ہمہ گیر بنیادی اصلاح کی طرف متوجہ کیا۔

دیکھ چکا المنی شورشِ اصلاحِ دیں
جس نے نہ چھوڑے کہیں نقشِ کہن کے نشاں
حرفِ غلط بن گئی عصمتِ پیرِ کنشت
اور ہوئی فکر کی کشتیِ نازک رواں
چشمِ فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب
جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں
ملتِ رومی نژاد کہنہ پرستی سے پیر
لذّتِ تجدید سے وہ بھی ہوئی پھر جواں
روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب
رازِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں
دیکھئے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

(مسجد قرطبہ: بالِ جبریل)

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلۂ علمِ کلام
روشن اس سے اگر ظلمت کردار نہ ہو
خود مسلمان سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام
میں نے اے میر سپہ تیری سپہ دیکھی ہے
قل ہو اللہ کی شمشیر سے خالی ہے نیام
آہ! اس راز سے واقف ہے نہ ملا نہ فقیہہ
وحدت افکار کی بے وحدت کردار ہے خام

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

(توحید: ضرب کلیم)

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں
بہانہ بے عملی کا بنی شراب الست
فقیہہ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور
کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دست بدست
گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی
اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست؟

(شکست: ضرب کلیم)

غرض

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

(بالِ جبریل)

متحدہ ہندوستان کو اقبالؔ اسلامی مشرق کا ایک نہایت اہم حصہ سمجھتے تھے، اور اسلامی نشأۃ ثانیہ کے لئے وہ ہندوستان کی آزادی کو ویسا ہی ضروری سمجھتے تھے جیسا ایشیا و افریقہ کے دوسرے خطوں کی آزادی کو، اسی لئے ہندوستان کی تحریک آزادی میں اقبالؔ کا فکری حصہ برصغیر کے تمام ادبا و شعراء سے بڑھ کر ہے، اور پاکستان

پیران کلیسا ہوں کہ شیخان حرم ہوں — نے جدت گفتار ہے نے جدت کردار
ہیں اہل سیاست کے وہی کہنہ خم و پیچ — شاعر اسی افلاس تخیل میں گرفتار
دنیا کو ہے اس مہدی برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالم افکار

(مہدی برحق: ضرب کلیم)

عالم افکار میں یہ زلزلہ پیدا کرنے کے لئے اقبال کو اسلامی فکر میں ایک تجدید کی ضرورت محسوس ہوئی جس سے عہد حاضر میں انسانیت کی نئی تشکیل کے لئے معتبر و موثر نظریاتی بنیاد مہیا ہو سکے۔ اس سلسلہ میں انکا خیال تھا کہ "تین سو سال" سے اجتہاد و اصلاح کی کوئی نئی تحریک نہیں اٹھی تھی، حضرت مجدد الف ثانیؒ کے بعد شاہ ولی اللہؒ نے اس تحریک کو جاری رکھا، اور شیخ محمد بن عبد الوہابؒ کی تجدید و اصلاح اسی سلسلہ کی کڑی تھی، لیکن سترہویں صدی میں مسلمانوں کا جو ذہنی زوال شروع ہوا وہ چند وقتی تحریکاتِ اصلاح کے باوجود رُک نہ سکا اور وقت گذرنے کے ساتھ بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ مغربی سائنس اور صنعت کی ترقی نے یورپی اقوام کو فوجی، سیاسی اور معاشی حیثیت سے غالب کر دیا، اور پورا عالم اسلام ان کے تسلط میں آگیا، ان کے مادی غلبے نے مغربی فکر و تہذیب کو بھی تفوق کا ایسا مقام دے دیا کہ اس کے مقابلے میں اسلامی فکر و تہذیب انتشار اور جمود کا شکار ہو گئی، علمائے اسلام یا تو شکست کھا کر اپنی قدیم روایات کے خول میں سمٹ گئے یا مرعوب ہو کر مغربی حیاتِ و نظام کے آگے سپر ڈالدی جس سے اسلامی معاشرے میں اندھی تقلید کا دور دورہ ہو گیا۔

اس تصور کا اظہار اقبال نے "پیام مشرق" کے دیباچے میں بھی کیا :

"..... اس سے سو سال پیشتر کی جرمنی اور مشرق کی موجودہ حالت میں کچھ نہ کچھ مماثلت ضرور ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقوام عالم کا باطنی اضطراب جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم محض اس واسطے نہیں لگا سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں ایک بہت بڑے روحانی او تمدنی انقلاب کا پیش خیمہ ہے......"

اسی دیباچے میں آگے چل کر لکھتے ہیں :

"مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے مگر اقوام مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہئے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اسکی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اسکا وجود انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو، فطرت کا یہ اٹل قانون جسکو قرآن نے "ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسہم" کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے۔"

ان اقتباسات سے اندازہ ہوگا کہ اقبال کا نقطۂ نظر سراسر آفاقی تھا، ان کی نگاہ میں پورا انسانی معاشرہ خراب اور بوسیدہ ہو چکا تھا، اور اسلئے پوری انسانیت کی تشکیلِ جدید کی ضرورت، اشد ضروری تھی،

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس		خاور کے ثوابت ہوں کہ افرنگ کے سیار،

اسلامی فکر کی تشکیلِ جدید اقبالؔ کی زندگی کا مشن تھا، اسرارِ خودی اور رموز بیخودی سے لے کر ارمغانِ حجاز تک انکے کلام کا کوئی مجموعۂ اشعار اس سے خالی نہیں، ان سب کا مرکزی خیال اور مقصود یہی ہے، اب غور کرنے کی بات ہے کہ اقبالؔ نے اپنا مطمحِ نظر تو ملتِ اسلامیہ کی دینی فکر کی تجدید قرار دیا، لیکن اس مقصد کے لئے گفتگو انھوں نے فلسفہ اور شاعری کے اصطلاحات و استعارات میں کی، خطباتِ مدارس کا عنوان ہے: "Reconstruction of Religious Thought In India".
اس کا اردو ترجمہ "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" کے نام سے کیا گیا ہے، کہا جاتا ہے کہ اس ترجمے کی منظوری اقبالؔ نے خود اپنی زندگی میں دے دی تھی، میرے نزدیک اگر انگریزی الفاظ کا بعینہٖ ترجمہ کیا جائے تو وہ اس طرح ہوگا: اسلامی فکر کی دینی تعمیرِ نو (یا تشکیلِ جدید) رائج ترجمے میں الٰہیات کا لفظ ممکن ہے فلسفیانہ اصطلاح کے طور پر استعمال کیا گیا ہو، لیکن انگریزی کے اصل الفاظ تو غیر اصطلاحی ہیں، ورنہ الٰہیات کا مترادف Theology ہے، سوال یہ ہے کہ کیا تھیالوجی اور ریلیجس تھاٹ میں معنی و مطلب کا کوئی فرق ہے اور کیا اقبالؔ کے ذہن میں ایسا کوئی فرق تھا جس کو انھوں نے مذکور خطبات میں ملحوظ رکھا؟ اگر فکرِ دینی اور الٰہیات کا تقابلی تجزیہ کیا جائے تو واضح ہوگا کہ الٰہیات اصلاً دینیات سے متعلق ہے اور فکر فلسفے سے، چنانچہ اقبالؔ نے خطبات میں اسلام کی دینی فکر پر جو بحث کی ہے اس میں پورا زور موضوع کے فلسفیانہ پہلو ہی پر دیا ہے، ... انداز گفتگو میں بھی اس کو مدِ نظر رکھا ہے، اس لئے انگریزی نام ہی موضوع کے متعلق مصنف کے نقطۂ نظر کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔

خطبات کے تقاضے کے ساتھ ساتھ ان کے کلام کے مجموعے۔ بانگِ درا، بالِ جبریلؔ،

متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی

اس مرض کی تشخیص اقبالؔ نے یہ کی کہ مسلمانوں کے دینی قویٰ جو ان کی تمام قوتوں کا اصل سرچشمہ ہیں مضمحل ہو چکے ہیں، اس لئے مسلمانوں کی مذہبی فکر کے انتشار کو دور کر کے قرآن مجید کی تعلیمات کے مطابق اس کی تجدید کی ضرورت ہے، اقبالؔ کے نزدیک مذہبی فکر کے جمود و انتشار نے مسلم ذہن کو ایمان و اعتماد کی اس کیفیت سے محروم کر دیا تھا، جس کے ذریعہ موجودہ دور کے حالات و مسائل کا مقابلہ کر کے اُن سے عہدہ برآ ہو سکتا تھا، ضروری تھا کہ مذہبی فکر کی نئی تشکیل کر کے مسلم ذہن کا کھویا ہوا اعتماد و ایمان بحال کیا جائے،

وہی دیرینہ بیماری، وہی نامحکمی دل کی
علاج اسکا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

دل کی اسی نامحکمی کو محکم کرنے کے لئے اقبالؔ نے فلسفۂ خودی پیش کیا، جسکا مقصد یہ تھا کہ ملت اسلامیہ اپنی اصلیت اور حقیقت کو پہچانے اور اپنے میں اعتماد پیدا کر کے مغرب کی بنائی ہوئی شرانگیز دنیا کو چھوڑ کر اپنی خیر پسند دنیا آپ پیدا کرے، اور یورپ کی تقلید چھوڑ کر اپنی راہ خود نکالے، دوسروں کی طاقت پر بھروسہ کرنے کے بجائے اپنی قوت پر اعتبار کرے اور کوہِ وقار بن کر نامساعد حالات کے مقابلہ کے لئے کھڑی ہو جائے اور عصر حاضر کا چیلنج قبول کر کے اس کی مقاومت کے لئے تیار ہو جائے،

یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام
میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ

ساتھ پڑھا جائے اور فکر اقبال کے نظام میں ان کی شاعری کی جوہری حیثیت کو ملحوظ رکھا جائے اور اس سے جو مجموعی تاثرات حاصل ہوں، ان کو نظریات اقبال کا معیار تسلیم کیا جائے۔ اقبال کا ذریعۂ اظہار شاعری ہی ہے اور ان کے ذہنی ارتقاء کے ہر مرحلے اور ہر پہلو کا اظہار اشعار ہی کے ذریعے ہوا ہے۔ ان کے خطبات میں فلسفے کی جو اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں ان سب کا پس منظر مغربی و مسیحی ہے، اس لئے ان کے بعض مضمرات ایسے بھی ہیں جو گرچہ اصلاً ان سے وابستہ ہیں مگر اقبال کے سیاق و سباق سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے، ایک عام قاری کے ذہن میں ان سے کچھ الجھن پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں شاعری کے استعارات اپنی ایمائیت کے باوجود، مشرقی پس منظر رکھتے ہیں، جس میں اسلام کی تہذیبی قدریں پائی جاتی ہیں اس لئے ان کی فکر کو سمجھنے کے لئے فلسفہ سے زیادہ ان کی شاعری مناسب ہے، یوں بھی پیام اقبال کی روحانی ولولہ انگیزی کے لئے تفلسف سے زیادہ موزوں اور موثر شعریت ہے، اسی لئے اقبال نے شاعری کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا،

نغمہ کجا و من کجا، ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

فکر اقبال کے مطمح نظر اور عناصر ترکیبی کی تعین میں بعض وقت الجھن پیدا ہوتی ہے مثلاً جدید تعلیم یافتہ کے ایک طبقہ کا خیال ہے کہ اقبال ملت اسلامیہ میں اس قسم کا انقلاب فکر چاہتے تھے جس قسم کا مسیحی یورپ کی تحریک اصلاح Reforma-tion کے نتیجے میں اقوام مغرب میں ہوا تھا جس کی جانب اقبال کے بعض بیانات میں اشارہ ملتا ہے، لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے، اقبال نے خود اس کو واضح کر دیا ہے،

ضربِ کلیم، زبورِ عجم، پیامِ مشرق اور ارمغانِ حجاز۔ جاوید نامہ کی شعریت پر بھی غور کر لینا چاہیئے، ان میں سے کسی میں بھی موضوع کی صراحت نہیں ہے سب استعارے اور کنائے ہیں، مگر جن سے ان کتابوں کے مباحث کی طرف اشارہ ہو جاتا ہے، اقبالؔ کی فکر کتنی ہی واضح ہو مگر ان کا فن بہرحال ایمائی ہے، اقبال خواہ مجدد ہوں یا مجتہد یا مفکر و مصلح اور فلسفی، وہ سب سے پہلے شاعر ہیں، اور ان کی دوسری حیثیتوں کا اظہار شاعری ہی کے وسیلے سے ہوا ہے، اگر ان کی شاعری سے قطع نظر کر لیا جائے تو ان کا نظام فکر بالکل بے رنگ ہو جائیگا۔

اس بحث سے مقصود یہ ہے کہ اسلامی فکر کی تشکیل جدید کے لئے اقبال نے جو تصورات پیش کئے ہیں وہ بہت واضح ہیں لیکن متعین اور مربوط نہیں ہیں، ان پر مشتمل نظامِ فکر ترتیب دینے کے لئے خطبات کے علاوہ منظومات، و غزلیات وغیرہ میں بکھرے ہوئے نکتوں کو ترتیب کے ساتھ جمع کر کے کلی تصور کی ترکیب ہو سکے گی اس سلسلے میں اقبال کے ذہنی ارتقار کے مختلف ادوار میں ان کے افکار کا تحقیقی و تنقیدی موازنہ کر کے حکیمانہ طور پر کچھ متعین نتائج اخذ کرنے ہوں گے اور نتائج تک پہونچنے کیلئے فلسفیانہ اصطلاحات اور شاعرانہ استعارات کے تمام مضمرات و اشارات کو سمجھنا ہوگا، اقبالؔ کے نظامِ فکر کی اس منضبط ترتیب کے لئے رہنما اصول ان کا وہ تصور حیات و کائنات ہے جس کی تصریح خود انھوں نے کر دی ہے، یعنی اسلام کا نصب العین اور دینی مطمح نظر، یہ حقیقت ان کے پورے کلام سے ظاہر ہوتی ہے،

فکرِ اقبالؔ کے صحیح فہم کے لئے بنیادی اور اہم شرط یہ ہے کہ اسکی مختلف النوع تحریروں کا پورا مطالعہ کیا جائے اور فلسفہ و شعر دونوں کو تقابل اور تطبیق کے

مگر یہ نظرِ ثانی مروج نظام کے نظائر کی روشنی ہی میں ہوگی، نظامِ فقہ کی تشکیلِ جدید کے علاوہ جن افکار کی تجدید پر خطبات میں بحث کی گئی ہے وہ فلسفے سے تعلق رکھتے ہیں جو ظاہر ہے کہ شریعتِ اسلامی سے بالکل الگ ایک چیز ہے اور ملتِ اسلامیہ کے قدیم فلسفیوں کے تصورات کی اصلاح و ترمیم اگر جدید فلسفی کرنا چاہیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، اس سے مذہب اسلام پر کوئی اثر نہیں پڑتا، یہ تو ہر دور کا ایک علمی شغل ہے اور یہ قولِ اقبالؔ "بدلتے رہتے ہیں خرد کے نظریات" درحقیقت کسی ملت کے لئے اصل چیز نہ اس کی فقہ ہے اور نہ فلسفہ، بلکہ حیات و کائنات کا وہ بنیادی و کلّی تصور ہے جسے اقبالؔ نے "دینی فکر" قرار دیا ہے۔

اسلام کی دینی فکر کی تشکیلِ جدید کے متعلق اگر اقبالؔ کا حقیقی نقطۂ نظر جاننا ہو تو ان کی ان تحریروں کو دیکھنا چاہئے جن میں انھوں نے اسلامی ثقافت کے عناصرِ ترکیبی کا تجزیہ اور ان پر تبصرہ کرتے ہوئے بعض قدیم متکلمینِ اسلام کی اس روش پر سخت تنقید کی ہے کہ انھوں نے یونانی افکار کی تخیلیت کو معیار بنا لیا، اور قرآن کی تجربیت کو نظرانداز کر دیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دورِ حاضر میں اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے لئے انقلابِ فکر کا مطلب اقبالؔ کے نزدیک یہ بھی تھا کہ مسلمان یونانی تصورات کو یکسر رد کر کے خالص قرآنی تصورات کو اختیار کریں، اسی سے اسلامی تہذیب کو وہ فروغ حاصل ہو سکے گا جس سے آج کی دنیا کو بڑھتی ہوئی تاریکی میں روشنی ملے گی اور عصرِ حاضر کی انسانیت کو نجات حاصل ہوگی، یہ ہے فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید کے لیے اقبالؔ کا بنیادی تصور، جسے "رجعت پسندی" کا طعنہ تو دیا جا سکتا ہے، خواہ یہ کتنا ہی جاہلانہ ہو، لیکن اسے

کہ درحقیقت یورپ کی تحریکِ اصلاح ایک سیاسی مہم تھی، جس کا مقصد پاپائے روم کے جابرانہ تسلط سے آزادی تھی اور اقبالؔ اسلام کی "فکر دینی" (ریلجس تھاٹ) کی تشکیل جدید چاہتے تھے، اس کے علاوہ مسیحی یورپ کی تحریکِ اصلاح نے دنیائے مسیحیت کو مختلف فرقوں میں بانٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور پروٹسٹنٹ اور کیتھلک کی تفریق سے بے شمار انحرافات ظاہر ہوئے جس سے مسیحی ملّت کی وحدت فنا ہو گئی اور مسیحی اقوام نے آپس میں دو عظیم جنگیں لڑ کر اپنے معاشرے کو پارہ پارہ کویا، اس کے برخلاف اقبالؔ اخوّت اسلامی کے علم بردار تھے اور ملت اسلامیہ کی فرقہ بندیوں کو ختم کر کے خالص اسلامی اصول کے تحت ایک عالمی وحدت بروئے کار لانا چاہتے تھے، اور دین کے معاملے میں وہ کسی تفرقے کے روادار نہیں تھے، اقبال نے جس انقلاب کی طرف اشارہ کیا ہے اس کا مفہوم وہ نہیں ہے جو مغرب زدہ اور تجدد نواز پیش کرتے ہیں، اسکا صحیح مفہوم وہ ہے جو خود اقبالؔ نے اپنی شاعری اور خطبات میں پیش کیا ہے، بلا شبہہ اقبالؔ کے پیش کردہ انقلاب میں جو خطبات میں ہے ایک قسم کے کلّی انقلاب فکر کا خاکہ ملتا ہے اور اس میں تجدّد عام کا رنگ بھی ہے، لیکن خطبات کے ان تجدیدی مباحث میں بنیادی نکتہ یہی ہے کہ قرآن وسنّت کا نظریۂ حیات اور نظام زندگی اساسی اصولوں کی حد تک مکمل قطعی اور آخری ہے اور اس کی ہدایتیں ہر دور کے لئے یکساں قابلِ عمل اور واجب العمل ہیں اور اصلاح و تجدید کی جو کچھ ضرورت اور گنجایش ہے وہ صرف نظامِ فقہ میں ہے کیونکہ یہ نظام ایک خاص دور کے مخصوص حالات کے پیشِ نظر مرتب کیا گیا تھا؛ اس لئے دوسرے ادوار میں اس پر نظرِ ثانی کیجا سکتی ہے

الہیات اسلامیہ" درحقیقت آج اور آنے والے کل کی انسانیت کے لئے نظریہ اسلامی پر مبنی، ایک نیا عہدنامہ (New Testament) ہے مگر ابھی تک ہمارا سماج فکر اقبال کے مستقبل کے مضمرات کو اپنے دماغ میں نہیں اتار سکا ہے۔

بعض قدیم ذہنی حلقوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اقبال کی فکر ایک قسم کے تصوف پر مبنی ہے، میرے نزدیک یہ خیال بھی ویسا ہی مغالطہ آمیز ہے جیسا تجدد کے متعلق ہے، بلاشبہہ "مرید ہندی" "پیر رومی" سے بہت متاثر تھا اور اقبال اکابر صوفیہ کے تخلیقی و عملی کارناموں کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے، خود کلام اقبال میں بھی رموز و اسرار کی کمی نہیں مگر اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اقبال کا ایک مشن مسلم معاشرے سے خانقاہیت کے تصور و اثرات کو دور کرنا تھا اور وہ اس کو ملی زوال کا بہت بڑا سبب بلکہ دورحاضر کے مسلم ذہن کا بنیادی مرض سمجھتے تھے؟ اسلئے تصوف کے مروجہ مفہوم سے اقبال کو ہرگز کوئی وابستگی نہیں تھی۔ "تصوف" کے بارے میں اقبال کا صحیح نقطۂ نظر جاننے کے لئے شیخ محی الدین ابن عربی اور حافظ شیرازی کے افکار و خیالات پر ان کا تبصرہ پڑھ لینا چاہئے، اقبال نے اپنے اشعار اور دوسری تحریروں میں بالکل واضح کر دیا ہے کہ مروجہ خانقاہی تصوف کو وہ اسلام کے خلاف ایک عجمی سازش سمجھتے ہیں اور اس کی تعلیمات کو "گوسفندانہ" تصور کرتے ہیں، جو اللہ کے شیروں کو روباہی سکھاتی ہے۔

ایک زمانے میں ایک خیال یہ بھی رہا ہے کہ اقبال اشتراکیت نواز تھے اور ان کی فکر میں اشتمالی میلانات پائے جاتے ہیں مگر اقبال کا پورا کلام .... اس خیال کی قطعی تردید کرتا ہے، ابتدا میں اقبال کو روسی کمیونزم سے کچھ تو تعاطف ضرور قائم ہوئی

تجدّد Modernism تو کسی طرح نہیں کہا جا سکتا۔

اس سلسلے میں اقبال کی دینی اساسیت Religious Fundamentalism کا ایک اور بیّن ثبوت ختم نبوّت پر ان کی وہ معرکہ آرا بحث ہے جو خطبات میں کی گئی ہے، عام مسلمانوں کی طرح اقبالؔ بھی دین اسلام کو ہر جہت سے کامل و مکمل سمجھتے ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلۂ وحی ختم ہو گیا اور اس کے ذریعہ انسانی زندگی کے متعلق بنیادی ہدایات مکمل کر دی گئیں، جس کے بعد کسی بھی دینی ہدایت کی ضرورت عالم انسانیت کو نہیں رہ گئی، اور اب شریعت محمدی تمام زمانوں اور قوموں کے لئے بالکل کافی ہے، یہ ختم نبوت ہی کا طفیل ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ بھیجی گئی آخری وحی کے مقرر کردہ حدود کے اندر انسانی عقل آزاد ہے کہ وہ پورے طور پر اپنی قوتوں کو کام میں لائے۔ اس سے انسان کی ذمہ داری بھی بڑھ گئی ہے کہ اب اس کو کسی فوق الانسانی مداخلت کے بغیر اسے خود ہی اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کی تشکیل کرنی ہے۔

اقبالؔ کے اس طرز فکر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اساسیت ماضی پرستی پر مشتمل نہیں ہے، بلکہ اس میں مستقبل پسندی کا انداز پایا جاتا ہے؛ "من شاعر فردا ستم" ہونے کا تو دعویٰ ہی انھوں نے کیا ہے، اور "پیام مشرق" کے دیباچے میں بھی انھوں نے اس کو واضح کر دیا ہے کہ وہ مستقبل کی انسانی زندگی کی تشکیل کے لئے ایک نقشہ پیش کرنا چاہتے ہیں، اور خطبات کی تو ایک ایک سطر سے جدت و تازگی نمایاں ہے، میرا خیال ہے کہ "تشکیل جدید

ان کے جرم کے ثبوت میں اسکا حوالہ دینے کی جرأت الزام لگانے والوں کو کبھی بھی نہیں ہوئی۔ شاہین اور نٹشے پر اقبال کی جو نظمیں اور ان کے متعلق مکاتیب میں جو وضاحتیں ہیں ۔۔۔۔ ان کو دیکھنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اقبال دراصل فاشزم کے سخت مخالف ہیں۔ اسی طرح انھوں نے مسولینی کی جو مدح کی ہے وہ اس کے ان مغربی حریفوں کے مقابلے میں ہے جو خود انتہائی جابر و ظالم ہونے کے باوجود مسولینی پر زبانِ طعن دراز کرتے تھے اور جن کا ارتکاب خود ان کے شہروں میں شب و روز سالہا سال سے ہوتا رہا۔ "میں پھٹکتا ہوں تو چھلنی کو برا لگتا ہے کیوں؟" اس کے علاوہ اپنی قوم کی خودی کو بلند کرنے کے لئے مسولینی کے مجرد اوصاف کی تحسین، فاشزم سے قطع نظر کر کے کی گئی ہے۔ اقبال کے آئینہ گفتار میں مسولینی کا پورا روپ "ابی سینیا کی لاش" میں دیکھا جا سکتا ہے۔

فکرِ اقبال کے سلسلے میں یہ ساری الجھنیں کچھ لوگوں کو محض اس لئے پیش آتی ہیں کہ انھوں نے اقبال کے کلام و پیام کا مکمل و مرتب مطالعہ نہیں کیا ہے یا پھر ان کے ذہن میں کچھ تحفظات و تعصبات اور اغراض و مفادات ہیں جن کی تسکین کے لئے وہ خواہ مخواہ اقبال کو استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر ایک ترتیب و تنظیم کے ساتھ اقبال کے ارتقار کا حکیمانہ مطالعہ، پوری صفائی قلب اور غیر جانبداری کے ساتھ کیا جائے تو کسی قسم کی کوئی الجھن فکرِ اقبال کو سمجھنے میں پیش نہیں آئے گی۔ اقبال نے نظم و نثر دونوں میں اپنے مطمحِ نظر کی اتنی کافی اور قطعی وضاحتیں کر دی ہیں، کہ غلط فہمی کی کوئی گنجایش ہی نہیں رہ جاتی۔ اس سلسلے میں اس بنیادی نکتے کو ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ اقبال کا ذہن سادہ نہیں، بہت

تھیں اور اس کے بعض اقدامات کو انھوں نے سراہا تھا۔ لیکن انسانی زندگی کے ایک کلی اور جامع نظریے کی حیثیت سے کمیونزم نے کبھی بھی اقبال کو اپیل نہیں کیا۔ ان کے نزدیک بعض جزوی خوبیوں کے باوجود کمیونزم کی خامیاں بہت زیادہ تھیں اور اس کی بنیادی خرابی الحاد و دہریت نے تو اس کی جزوی خوبیوں کو بھی ملیامیٹ کر دیا۔ درحقیقت کمیونزم کے متعلق اقبال کا ردِعمل کچھ منفی قسم کا ہے، چونکہ یہ نظریہ اخلاقی سطح پر مسیحی کلیسائیت اور سیاسی اعتبار سے استبدادی قوتوں کے لئے زبردست چیلنج بن کر سامنے آیا، اس لئے اقبال نے محسوس کیا کہ اس کی وقتی کامیابیوں سے اہل کلیسا کا زور ٹوٹے گا اور زمین ایک بہتر نظریے کے لئے صاف اور ہموار ہو سکے گی، دوسرے معاشی عدل و مساوات کا جو مجرد تصور، اپنے ابتدائی دور میں، سوویت روس نے پیش کیا تھا وہ اقبال کو رائج الوقت نظاموں کی بہ نسبت اسلام کے معاشی نظام سے قریب تر نظر آیا۔ "لیکن خدا کے حضور میں" (بالِ جبریل) ملت روسیہ کے نام افغانی کا پیغام (جاوید نامہ) "ابلیس کی مجلس شوریٰ" (ارمغان حجاز) وغیرہ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کمیونزم کو فکرِ اسلامی کا صرف ایک ناقص جز سمجھتے تھے، اور اسی اعتبار سے انھوں نے اس کی توصیف اور تنقید دونوں کی ہے، لیکن مجموعی طور پر یہ نظریہ ان کے نزدیک لائق ترک اور قابلِ اعتراض ہے۔

اقبال کی فکر پر فاشزم کا الزام بھی لگایا گیا ہے۔ اور نٹشے سے ان کے تاثر اور شاہین سے ان کی ذہنی وابستگی کو دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے لیکن نٹشے اور شاہین دونوں کے بارے میں اقبال نے اپنی نظم و نثر میں جو کچھ لکھا ہے،

قرآن پاک اور مرزا غالب

(از جناب پروفیسر مسعود حسن صاحب صدر شعبہ عربی مولانا آزاد کالج کلکتہ)

(۲)

چند اور مباحث — مضمون نگار کی چند ایسی مباحث جن کی نشاندہی گذشتہ صفحات میں نہیں ہوسکی ہے، یہاں درج کی جاتی ہیں،

(۱) حضرت یونسؑ کی دعا میں سے جس آیت قرآنی کا اقتباس پیش کیا گیا ہے[1]، اس میں "سبحانک"[2] چھوٹ گیا ہے، اصل آیت کا وہ ٹکڑا یہ ہے، لا الٰہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین (۸۷۔ سورۂ انبیاء) خدا کرے یہ لیس کمثلہ شیئاً۔ مثالی الواد اور اخرج منھا[3] اور اس قسم کی بعض نحوی اور صرفی غلطیوں کی طرح کتابت کی غلطی ہو، مگر یہ آیت آیۃ الکرسی کی آیات میں سے نہیں ہے، اور نہ آیۃ الکرسی حضرت یونسؑ کی دعا ہے، خبر نہیں مضمون نگار کو کس طرح یہ اشتباہ ہوا،

(۲) ہنوز اک پرتو نقش خیال یار باقی ہے　　دل افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

غالب کے اس شعر میں حضرت یوسفؑ کی محبت کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہے، شاعر اپنی محبت کی تشبیہ جو اسکے دل کے نہاں خانے میں جاگزیں ہے، یوسف سے دے رہا ہے، جو قید خانے میں بند تھے، اس لئے اس شعر کا آیت کریمہ ان الحکم الا للّٰہ امر الا تعبدوا الا ایاہ

---

[1] معارف ص ۵۔ [2] ایک دوسری جگہ قرآن میں یونسؑ کی تسبیح کا ذکر آیا ہے فلولا انہ کان من المسبحین ہ للبث فی بطنہ الیٰ یوم یبعثون ہ (سورۂ الصافات) [3] معارف ص ۵ و ۲۹ و ۲۸۸ و ۲۱۳،

مرکب تھا اور انکا نصب العین نہایت جامع ہے، اقبال کا نظامِ فکر اپنے تمام اساسی تصورات اور عملی مضمرات میں سراسر اسلامی ہے لیکن اس کے محور و مرکز میں انھوں نے زمین و آسمان اور زمانۂ جدید و قدیم کے تمام موضوعات کو سمیٹ لیا ہے، مگر ان سب میں اسلام معیار اور کسوٹی کا کام کرتا ہے جس پر دنیائے انسانیت کے تمام انکشافات و ترقیات اور فلسفوں اور نظریوں کو جانچ کر دیکھا جا سکتا ہے، جو اجزا و عناصر فکرِ اسلامی کے موافق نظر آتے ہیں انکو تسلیم کیا جاتا ہے اور جو ناموافق ہوتے ہیں انکو رد کر دیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بعض غیر اسلامی فلسفوں اور نظریوں کے بعض جزوی تصورات کی جزوی توصیف کلامِ اقبال میں پائی جاتی ہے، اسطرح اقبال کی اسلامی فکر محض عقیدہ و ایمان پر موقوف نہیں ہے بلکہ وہ شعوری و تجربی طور پر مطالعہ و تفکر سے حاصل ہوئی ہے، اقبال جانتے تھے کہ حکمت مومن کی متاع گمشدہ ہے: الحکمۃ ضالۃ المومن، انھیں یہ بھی احساس تھا کہ: چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری، اس سلسلے میں دوسرا اہم نکتہ یہ بھی رکھنا چاہیئے کہ اقبال کا نظریہ کوئی روایتی نظریہ نہیں تھا، بلکہ اسمیں ایک اجتہادی شان تھی، انھوں نے اسلام کے ازلی و ابدی پیغام کو ایک خاص زمان و مکاں میں پیش کرنے کی کوشش کی تھی اسلئے دوسرے متکلمینِ اسلام کیطرح اقبال کا علمِ کلام بھی عصری مسائل و موضوعات پر ان ہی کی اصطلاحوں میں بحث کرتا ہے، اسی لئے ان کے اسالیب میں بڑی جدت اور تازگی ہے، اور اپنے مباحث میں نہ صرف اپ ٹو ڈیٹ ہیں، بلکہ اپنی گہری بصیرت اور دوررس نظر کی بدولت پیش بیں (Ahead of the time) بھی ہیں۔ (باقی)

تم نے بچھڑے کو معبود قرار دیکر بہت بڑا گناہ کیا ہے؛ اس لئے اب اللہ سے معافی مانگو اور اپنے آپ کو ہلاک کرو، یہ اپنے آپ کو ہلاک کرنا صرف سزا یا کفارے کے طور پر ہے، اسلام نے ہر جگہ خودکشی کی ممانعت کی ہے، لا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ اس لئے لاتقنطوا کی طرح اقتلوا کا استحباب قرآن سے کیسے پیش کیا جا سکتا ہے، حالانکہ اسی پر شعر کا دارومدار ہے، پوری آیت ملاحظہ فرمائیے:۔

واذ قال موسیٰ لقومہ یا قوم انکم ظلمتم انفسکم باتخاذکم العجل فتوبوا الی بارئکم فاقتلوا انفسکم ذالکم خیر لکم عند بارئکم فتاب علیکم انہ هو التواب الرحیم (۱۔ بقرہ ۶)

(۵) آں روز کہ پرسش رود ہر چہ گذشت ۱۔ کاش با ما سخن از حسرت ما نیز کنند
ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد ۔ یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

ناکردہ گناہوں کی حسرت کی داد حاصل کرنے کا خیال" برائے شعر گفتن خوب است" مگر نہ صرف اسلام بلکہ کسی مذہب میں ناکردہ گناہوں پر کوئی احتساب نہیں ہے، قرآن سے اسے کیسے ثابت کیا جا سکتا ہے، اور دونوں شعروں کی تلمیح قرآن کی کسی آیت کی طرف کیسے ہو سکتی ہے[1]، ماقدم واخر کا مفہوم صرف یہ ہے کہ جو کام پہلے کیا یا بعد میں کیا،

(۶) فاضل مضمون نگار کو مولانا ابو الکلام آزاد کی قرآن فہمی پر بھی شبہہ ہے، چنانچہ انھوں نے ان کو بھی اپنی حرف گیری کا ہدف بنایا ہے، ارشاد ہوتا ہے،[2]

جمالی دہلوی ایک متبحر بزرگ ہونے کے باوجود ایک نعتیہ قصیدے میں کہتے ہیں،

موسیٰ ز ہوش رفت بیک پرتو صفات ۔ تو عین ذات می نگری در تبسمے

---

[1] معارف ص ۲۹۳، [2] ایضاً ص ۲۰۹،

سے کوئی تعلق نہیں ہے، اور اسے اس کی طرف تلمیح کے طور پر نہیں پیش کیا جا سکتا ہے[1]۔

(۳) ہم انا الحق گوے مردے را سر دار آورد　　　　ہم انا اللہ خوان درختے را بگلزار آورد

غالب کے اس شعر کا دارومدار اس بات پر ہے کہ درخت نے خدا ہونے کا دعویٰ کیا اور اس کی بنیاد قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت پر رکھی گئی ہے،

فلما اتٰها نودی من شاطئ الواد الایمن فی البقعة المبٰرکة من الشجرة ان یا موسیٰ انی انا اللہ رب العالمین ہ افسوس ہے کہ قرآن کی اس آیت کا مفہوم نہ غالب نے سمجھا اور نہ مضمون نگار نے[2]، آواز وادی ایمن سے آئی یا درخت سے، اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہے کہ وادی نے یا درخت نے خدا ہونے کا دعویٰ کیا، مطلب یہ ہے کہ ایک غیبی آواز وادی میں درخت سے سنائی دی اس آواز نے شعر کے مفروضہ کے بالکل خلاف یہ کہا کہ میں ہی خدا ہوں، میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے، چنانچہ اس واقعہ کا ذکر قرآن میں دوسری جگہ ملاحظہ فرمائیے۔

فلما اتٰها نودی یا موسیٰ ہ انی انا ربک فاخلع نعلیک انک بالواد المقدس طویٰ وانا اخترتک فاستمع لما یوحیٰ ہ اننی انا اللہ لا الٰہ الا انا فاعبدنی واقم الصلٰوة لذکری ہ (۱۶ - سورہ طٰہٰ)

(۴) ہر جا کہ گشت ترجمۂ اقتلوا رقم　　　　گردید نوک خامہ بہ تیزی دم حسام

ہر جا کہ رفت معنی لا تقنطوا بکار　　　　پیچیدہ بوی سنبل فردوس در مشام

مضمون نگار نے پہلے شعر کو قرآن کی آیت فتوبوا الیٰ بارئکم فاقتلوا انفسکم کی طرف تلمیح قرار دیا ہے[3]، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محل بیان اور سیاق و سباق کا علم نہ غالب کو تھا اور نہ مضمون نگار کو ہے، اس آیت میں یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو کہا کہ

---

[1] معارف ص ۲۸۶ [2] ایضاً ص ۲۸۸ [3] ایضاً ص ۲۹۴،

ظاہر ہوا اور اس نے کہا "اقرأ" پڑھ اور پڑھنا اور بیان کرنا شروع کر،

رہ گیا یہ مسئلہ کہ حضور نبی کریم صلعم کو معراج میں جمال الٰہی کی دید کا شرف حاصل ہوا کہ نہیں اس میں علما اور صوفیہ مختلف رائے رکھتے ہیں "تو عین ذات می نگری" سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے مگر نص شرعی سے اس کی تردید نہیں کی جا سکتی ہے، لاتدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار کے متعلق مفسرین کرام بالاتفاق یہ کہتے ہیں کہ اس دنیا میں آنکھیں اسکو نہیں دیکھ سکتی ہیں،

خاتمہ

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مضمون ختم کرنے سے پہلے زیر بحث موضوع سے متعلق چند اصولی باتوں کی طرف اشارہ کر دیا جائے، افسوس ہے کہ مضمون نگار نے ان کی طرف سے تغافل برتا، اس لئے ان کو مختلف طرح کی غلط فہمیوں کا شکار ہونا پڑا، سب سے پہلی اور اہم بات یہ ہے کہ شاعری کی اور بالخصوص غزل کی خاص زبان ہوتی ہے، اسی طرح اس کی کچھ اصطلاحیں اور روایتیں بھی ہوتی ہیں جو اس کا ایک مخصوص سرمایہ ہوتی ہیں اور شاعر کیلئے ان تمام چیزوں کی پابندی ضروری ہوتی ہے اسلئے اسکا کلام تنہا اسکے اپنے خیالات اور معتقدات کی ترجمانی نہیں کرتا ہے، کلام کی صحیح اور قابل اعتماد تشریح شاعر کی زندگی کے حالات، اس کے اخلاق و کردار، اور اس کے ذاتی رجحانات کے پس منظر ہی میں ہو سکتی ہے، کتنے دیندار اور شرع کے پابند بزرگ شاعرانہ رندی و سرمستی میں کھل کھیلتے ہیں، اور کتنے فاسق و فاجر قسم کے لوگ شعر کے ذریعہ طریقت و شریعت کے رموز الم نشرح کرتے ہیں، خواجہ حافظ شیرازیؒ "مے دو سالہ و محبوب چاردہ سالہ" اور "سیہ چشمان کشمیری و ترکان سمرقندی" کا ذکر مزے لے لے کر کرتے ہیں، مگر ان سے ہماری مذہبی عقیدت کو ٹھیس نہیں لگتی ہے، خاقانی بات بات پر قرآن و حدیث کی طرف اشارے کرتا ہے، لیکن اس کو مذہبی

مولانا آزاد نے ترجمان القرآن کے مقدمہ سورۂ فاتحہ، لکتاب میں یہ شعر نقل کر دیا اور اس کی سند میں علمہ شدید القوی، ذومرۃ فاستوی وھو بالافق الاعلی ثم دنی فتدلی، فکان قاب قوسین او ادنی کو پیش کیا ہے، (ترجمان القرآن ساہتیہ اکاڈمی ۱۹۶۳ء) حالانکہ مندرجہ بالا آیات حضرت جبریلؑ سے متعلق ہیں،

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مضمون نگار نے مولانا کی پوری عبارت پڑھے بغیر اس پر اعتراض کر دیا، مولانا کو اس سے کب انکار ہے کہ مذکورۂ بالا آیات قدسی حضرت جبریلؑ کے متعلق ہیں، ترجمان القرآن کی پوری عبارت یہاں نقل کی جاتی ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جلوۂ طور کا ذکر کر کے مولانا فرماتے ہیں[1]،

"اور پھر جس طرح وہاں روشنیوں کے اندر سے ندا اٹھی تھی، اسی طرح یہاں بھی ناموس اکبر نے ظاہر ہو کر سلسلۂ وحی کی اولین مرتبہ تعلیم کو شروع کیا، وہاں صرف آواز تھی اور صرف چنگاریوں کی نمود، کیونکہ مرتبہ موسوی اتنے ہی کا متحمل تھا، یہ یہاں ندائے محض اور نمود نور کی جگہ خود ناموس اکبر نے اپنے وجود کو ظاہر کیا، کیونکہ مرتبۂ محمدی کا مقام دوسرا تھا و نعم ما قیل

موسیٰ ز ہوش رفت بیک پرتو صفات ۔۔۔ تو عین ذات می نگری در تبسمے

عَلَّمَهٗ شَدِیْدُ الْقُوٰیۙ ذُوْ مِرَّةٍؕ فَاسْتَوٰیۙ وَ هُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰیؕ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰیۙ فَكَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰیۚ (۵۳:- ۵ - ۹)

سو جس طرح وہاں اولین مخاطبۂ وحی یوں ہوا تھا، کہ "انا اخترتک فاستمع لما یوحی" میں نے تجھے دعوت حق اور تبلیغ حکم الٰہی کے لئے اختیار کر لیا ہے، تو میرے پیاموں اور حکموں کو سن تاکہ دنیا والوں کو پہنچا سکے، اسی طرح یہاں اولین مخاطبہ یوں ہوا کہ ملاء اعلیٰ کا ناموس اکبر

---

[1] ترجمان القرآن جلد اول ساہتیہ اکاڈمی، ص ۹۴ - ۹۵۔

اس لئے ان حضرات کی صحبتوں میں ان کو مذہب کے بہت سے حقائق و معارف کا علم ہوگیا تھا ان ہی وجوہ کی بنا پر وہ عربی الفاظ اور عربی اقتباسات اس سلیقے سے استعمال کرتے ہیں کہ ان پر عربی کے فاضل وادیب ہونے کا دھوکہ ہوتا ہے[1]، اس کے علاوہ قرآن کی تلمیحات اور اس کے اقتباسات بڑی کثرت سے ان کو اپنے پیشرو شعراء کے دیوانوں میں یقیناً ملے ہونگے، اپنی غیر معمولی ذہانت اور اپنے بلند شعری ذوق کی مدد سے اُن کو نہ صرف ان کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں پیش آئی، بلکہ وہ ان کو خود اپنے اشعار میں صحت اور حسن کے ساتھ استعمال کرنے میں کامیاب ہوئے، تلاش و تفحص سے اگر کام لیا جائے تو اگلے شعراء سے انھوں نے جو استفادہ کیا ہے، اس کی بہت سی مثالیں دستیاب ہو سکتی ہیں۔ یہاں صرف دو نمونے پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

سعدی		غالب
(۱) زن بد در سرائے مرد نکو	ہمدریں عالم است دوزخ او	دھوپ کی تابش آگ کی گرمی
زنہار از قرین بد زنہار	وقنا ربنا عذاب النار	وقنا ربنا عذاب النار
(۲) کاج کانانکہ عیب می گفتند	رویت اے دلستاں بدیدندے	فزا ید لعوغائے یوسف دو سر
تا بجائے ترنج در نظرت	بے خبر دستہا بریدندے (گلستان)	ترنج و کف خردہ گیراں شمر

مرزا غالب کی قرآن فہمی کے سلسلے میں کوئی فیصلہ کرتے وقت ایک اور بات ذہن میں رکھنا مناسب ہوگا، مرزا کو فارسی زبان پر کامل عبور حاصل تھا، وہ ہمیشہ اپنی فارسی دانی پر فخر کرتے تھے، حتیٰ کہ امیر خسروؔ کے سوا ہندوستان کے کسی فارسی گو شاعر کو وہ خاطر میں نہیں لاتے تھے، اگر ان کی عربیت اس درجہ کی ہوتی، کہ وہ قرآن کے رموز و

[1] یادگار غالب ص ۵۵،

احترام حاصل نہیں ہے، اور ایک ضروری بات عرض کردوں کہ تلمیحات قرآنی کے استعمال کے لئے یہ بالکل ضروری نہیں ہے کہ اسے قرآن کے بیان کردہ مضامین تک محدود رکھا جائے، یہ تلمیحات فارسی اور اردو ادب میں اس قدر عام ہوگئی ہیں کہ اب ان کے لئے قرآن کے صفحات پر نظر ڈالنے کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے، بلکہ قرآن کے ان قصوں اور کہانیوں میں اس قدر اضافہ ہوگیا ہے اور بعض صورتوں میں ان کی شکل اس طرح مسخ کر دی گئی ہے کہ اب ان کی تصدیق کے لئے قرآن کی طرف رجوع کرنا فضول ہوگا، ایک آخری بات اور عرض کئے بغیر نہ رہونگا، کہ فہم قرآن کے لئے صرف عربی زبان کا جاننا کافی نہیں ہے، اس کے لئے بقول مولانا آزاد "عربی لغت وادب کا صحیح ذوق شرط اول ہے"[1]۔

مرزا غالب اتنی عربی نہیں جانتے تھے کہ وہ قرآن مجید سے براہ راست استفادہ کرتے اور قرآن کے نکات کو خود سمجھ سکتے، ہاں مرزا کو علم لسان سے فطری مناسبت تھی، ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا، انھوں نے تصوف پر بہت سی کتابیں اور رسالے پڑھے تھے، انہیں اللہ نے بڑا قوی حافظہ عطا کیا تھا، وہ جو کچھ پڑھتے تھے ہمیشہ کے لئے ان کے دماغ میں محفوظ ہوجاتا تھا، دوسری طرف آگرہ سے دہلی منتقل ہونے کے بعد ہی خوش قسمتی سے ان کو مذہبی اور علمی ماحول مل گیا تھا، ان کے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف نہ صرف شاعر تھے، بلکہ کٹر قسم کے مذہبی اور صوفی منش بزرگ تھے، حسن اتفاق سے مرزا کو اس زمانہ کے اکثر اصحاب علم اور ارباب فن مثلاً مولانا فضل حق خیرآبادی، مفتی محمد صدرالدین آزردہ، مولوی عبداللہ خاں علوی، مولوی امام بخش صہبائی، حکیم مومن خاں مومن کی ہمنشینی کا موقع ملا

---

[1] ترجمان القرآن ص ۱۴،

ادبیات

رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم

از جناب عثمان احمد قاسمی صاحب جونپوری

محمد مصطفیٰ انساں کو انساں کر دیا تم نے
تمام انسانیت پر کتنا احساں کر دیا تم نے

بیابانوں کو صد رشک گلستاں کر دیا تم نے
عنادل ہو گئے تھے چپ غزلخواں کر دیا تم نے

دیا تم نے سبق صحرا نشیں کو حکمرانی کا
گدائے راہ کو ہم دوش سلطاں کر دیا تم نے

غبار راہ کی صورت زمانہ جن کو سمجھے تھا
انھیں ذرات کو مہر درخشاں کر دیا تم نے

جہاں انسان خود انسان کو لقمہ بناتا تھا
اسی وادی وحشت کو بہاراں کر دیا تم نے

زمین و آسماں روشن ہوئے تیری تجلی سے
اندھیری رات تھی آکر چراغاں کر دیا تم نے

جو کانٹے تھے انھیں پھولوں کو رعنائی عطا کر دی
جو پتھر تھے انھیں لعل بدخشاں کر دیا تم نے

ضعیفوں کو عطا کی اک نظر میں وہ توانائی
کہ مور ناتواں کو بھی سلیماں کر دیا تم نے

جو ناقم تھے بنے عادل ترے درس محبت سے
شکستہ حال مظلوموں کو خنداں کر دیا تم نے

کچھ ایسے انداز سے حق بات پھیلا دی زمانے میں
ہمیشہ کے لئے باطل کو لرزاں کر دیا تم نے

جنازہ اٹھ گیا دنیا سے معبودان باطل کا
بتوں کی بزم کو شہر خموشاں کر دیا تم نے

چھپا کر حشر میں عثمان کو دامان رحمت میں
زہے تیرا کرم جنت بداماں کر دیا تم نے

نکات خود سمجھ لیا کرتے تو ان کی افتادِ طبع سے ہرگز یہ توقع نہیں کی جا سکتی ہے کہ وہ آسانی سے عربی زبان سے اپنی ناواقفیت کا اعتراف کر لیتے، جس کا ثبوت پیش کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی ہے، یہاں ان کا صرف ایک فارسی شعر نقل کیا جاتا ہے ؎

رموزِ دین نشناسم درست معذورم
نہادِ من عجمی و طریقِ من عربی ست

بزمِ تیموریہ جلد اوّل

بزمِ تیموریہ کے پہلے اڈیشن میں مغل سلاطین بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں، عالمگیر اور تمام تیموری شاہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق اور ان کے دربار کے امراء، شعراء اور فضلاء کے مختصر تذکرہ کے ساتھ ان کے علمی کمالات کی تفصیل بیان کی گئی تھی جس کو ادبی ذوق و تحقیق نے بیحد پسند کیا، اور اس کے حوالے اپنے مقالات اور تصنیفات میں دیئے اب اسی کو بکثرت اضافوں کے ساتھ دو جلدوں میں کر دیا گیا ہے کہ تمام مغل سلاطین اور ان کے عہد کی ادب و زبان کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجائے، پہلی جلد میں مغل سلاطین میں سے پہلے تین شہنشاہوں، یعنی بابر، ہمایوں اور اکبر کے علمی ذوق اور ان کے عہد کی امراء و شعراء و ارباب فضل و کمال کے تذکرہ کے ساتھ انکے علمی کمالات پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، اور دوسری جلد میں بقیہ مغل سلاطین اور ان کے دربار کے علماء، فضلاء و شعراء کا تذکرہ ہوگا، اس میں اس قدر اضافے ہوئے ہیں کہ بالکل نئی کتاب ہو گئی ہے، پہلے سے کہیں جامع اور مکمل، قیمت ۱۲ روپیہ،

منیجر،

روح بشر کو ہے دوام یکہ زیست ہے نمود
جن و ملک کا عجز سے خم ہے یہاں سرِ سجود

گاہ میری نگاہ تیز چیر گئی دلِ وجود
گاہ الجھ کے رہ گئی اپنے ہی توہمات میں

روح سے اپنی خاک کے پتلے کو زندہ کردیا
خلق میں کائنات کی شرف اسے عطا کیا
لیکن میری زبان پہ شکوہ یہی ہے اے خدا

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کردیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

غزل

از جناب اسلم صاحب سندیلوی

جہاں کی رنگینیوں میں الجھی رہے گی آخر نظر کہاں تک
فریب دیتی رہے گی مجھ کو یہ عقل دیوانہ گر کہاں تک

جگر کے زخموں سے رستے رستے رہے گا خونِ جگر کہاں تک
کسی کی فرقت میں اشکِ رنگیں بہائے گی چشمِ تر کہاں تک

یہ سوزِ الفت - غمِ محبت - یہ دردِ فرقت مگر کہاں تک
یہ بجھتی شمعیں کریں گی آخر ابِ انتظارِ سحر کہاں تک

حدودِ گلشن میں رہ سکے گی نہ داستانِ ستم کسی کی
یہ کون جانے کہ اڑ کے جائیں گے یہ مرے بال و پر کہاں تک

تضمین بر غزلِ اقبال

از جناب محمد شرف الدین ساحل

مرا وجود سرخرو محفلِ کائنات میں
دھوم سی مچ گئی ہے ایک عالمِ فلکیات میں
خاص مرا مقام ہے خلقِ الٰہیات میں
میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں

عکسِ الٰہ ہے مرے آئینۂ حیات میں
پر توِ حسنِ یار ہے میری حسین ذات میں
لاکھوں نکات ہیں نہاں میری ہر ایک بات میں
حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں
میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں

سترِ نہاں کو چیر دے میری یہ ہمتِ بلند
بارہا میں نے ڈال دی ماہ و نجوم پر کمند
رازِ خودی بتا گیا میرا یہ شوقِ دل پسند
گرچہ ہے میری جستجو دیر و حرم کی نقشبند
میری فغاں سے رستخیز کعبہ و سومنات میں

میری زباں کے ساز پر ہے یہی نغمہ و سرود

مطبوعات جدیدہ

تقویۃ الایمان ۔ تعریب الاستاذ عبد الوحید رحمانی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۰، قیمت درج نہیں، پتہ: مکتبہ جامعہ سلفیہ ص ۔ ب ۱۹ بنارس (ہند)

تقویۃ الایمان مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ کی مشہور و مقبول تصنیف ہے، اس کے متعدد اڈیشن چھپے اور بیشمار لوگ اس سے فیضیاب ہوئے، اب جامعہ سلفیہ کے لائق استاذ مولانا عبد الوحید رحمانی نے اس ایمان افروز کتاب کو اردو سے عربی میں منتقل کیا ہے، اس کے شروع میں جامعہ کے ایک اور لائق استاد مولانا مقتدی حسن اعظمی نے عربی میں مصنف کے حالات، علمی کمالات اور مجاہدانہ کارنامے تحریر کیے ہیں، ترجمہ اور مقدمے کی زبان نہایت سلیس، رواں اور شگفتہ ہے، لائق مترجم کو اللہ تعالے اس دینی و علمی خدمت کا صلہ عطا فرمائے۔

انتخاب ناسخ ۔ مرتبہ جناب رشید حسن خاں صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۳۲۰، قیمت طلبہ اڈیشن ۵ے پیسے، لائبریری اڈیشن ۵عہ پیسے پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

مکتبہ جامعہ نے اردو کی قدیم معیاری کتابوں کو شائع کرانے کا جو پروگرام بنایا ہے یہ اس سلسلہ کی چھبیسویں (۲۶) کتاب ہے، اس میں لکھنؤ اسکول کے سب سے قدیم اور اہم نمایندہ شاعر امام بخش ناسخ کا منتخب کلام شائع کیا گیا ہے، شروع میں جناب رشید حسن خاں صاحب کے

روش روش پہ ہے اک نمایش ۔ قدم قدم پہ ہے آزمایش
ہر ایک لحظہ ہزار جلوے نظر کو تابِ نظر کہاں تک

جہاں پہ طاقت جواب دیدے ۔ اسی کو منزل شمار کرلے
یہ تیرے بس کا نہیں تجسُّس ہے عشق کی رہ گذر کہاں تک

یہ چار آنسو یہ چند آہیں ہیں ترجمانِ فراقِ اسلمؔ
بس اور ہوتی غمِ محبت کی داستاں مختصر کہاں تک

غزل

از جناب توقیر جمالؔ صاحب لکھنوی

تری نظر سے جو پینے اُتر گئے ہوتے — ہم اپنی جان سے کب کے گذر گئے ہوتے
جو صرف تیری طلب میں گذر گئے ہوتے — وہ اپنے نقشِ قدم چھوڑ کر گئے ہوتے
خرد نواز نگاہوں کو تھی خبر نہ ہوتی — ہم اہلِ درد بہت کام کر گئے ہوتے
بہت دیئے ہیں سہارے ترے تغافل نے — وگرنہ آنکھ کے موتی بکھر گئے ہوتے
پکارتی انھیں خود بڑھ کے منزلِ مقصود — رہِ طلب میں جو باچشمِ تر گئے ہوتے
حقیقتیں تو سسکتی رہیں کہ تھیں خاموش — فسانے ہوتے تو کچھ کام کر گئے ہوتے
تری نگاہ جو شانہ کشِ خود ہوتی — مرے خیال کے گیسو سنور گئے ہوتے
جو ایک در سے طلب گارِ مدعا ہوتے — وہ اے جمالؔ نہ یوں دربدر گئے ہوتے

اقبال کی مقبولیت کا ذکر اور ان کے متعلق اہل عجم کی رائیں نقل کی گئی ہیں، ہندوستان کے دوسرے فارسی گو شعراء میں بیدل، غالب اور سید محمود آزاد (ڈھاکہ، بنگال) کے سوانح اور کلام کے خصوصیات اور نمونے بھی دیے گئے ہیں، دو مضامین میں جدید ایران کی ایک شاعرہ پروین اعتصامی اور ملک الشعراء بہار کے حالات کی مصوری اور ان کے کلام پر تبصرہ کیا گیا ہے، مگر اس میں بعض غیر ضروری بحثیں بھی آگئی ہیں، شاہنامہ کے سیاسی، سماجی اور مذہبی اثرات دکھانے میں بڑے مبالغے سے کام لیا گیا ہے، ان کے خیال میں حافظ کو شیعی یا سنی ثابت کرنا زیادتی ہے، مگر انھوں نے خود بھی ان کو صلح کل، وحدت ادیان اور جبر کا قائل ثابت کرکے یہی زیادتی کی ہے، اس سلسلہ میں وہ خواہ مخواہ عقیدہ و مذہب کی ایک بحث میں الجھ گئے ہیں، اس بارہ میں ان کے خیالات بڑے غیر متوازن اور سطحی ہیں، مگر اس سے قطع نظر ان کو فارسی زبان و ادب کا اچھا ذوق ہے، اور یہ مضامین انھوں نے محنت و مطالعہ سے لکھے ہیں، فارسی زبان و ادب سے اس سرد مہری کے زمانہ میں ان کی یہ خدمت لائق ستایش ہے۔

ہفت جوہر۔ از ملک الشعراء میر اسماعیل خان ابجدی تحقیق افضل العلماء محمد یوسف کوکن عمری تقطیع کلاں، کاغذ بہتر، ٹائپ، قیمت درج نہیں، شائع کردہ شعبۂ عربی، فارسی، اردو مدراس یونیورسٹی۔

میر اسماعیل خاں ابجدی (م ۱۲۰۳ھ) مدراس کے مشہور اور باکمال فارسی گو شاعر اور نواب سراج الدولہ محمد علی خاں بہادر والا جاہ اول حاکم ملک کرناٹک کے دربار سے متوسل تھے، ان کی تصنیف شرح تحفۃ العراقین اور چار مثنویاں انور نامہ، مودت نامہ، راغب و مرغوب اور زبدۃ الافکار اس سے قبل مدراس یونیورسٹی

قلم سے ایک مبسوط تعارف ہے جس کو انھوں نے حسب معمول بڑی جانفشانی اور عرق ریزی سے لکھا ہے، اس میں ناسخ کی شاعری کے پس منظر، ان کی اصلاحات مختصر حالات و کمالات، اور ان کے بعض قدیم کلیات کے متعلق معلومات تحریر کیے گئے ہیں، اور ناسخ کی شاعری کا گہری نظر سے جائزہ لیا گیا ہے، اور اس کے اسلوب، خصوصیات، محاسن و معائب وغیرہ کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اور موجودہ زمانہ میں اس کی قدر و قیمت دکھائی گئی ہے، اس ضمن میں ناسخ کے معاصر شعرائے دہلی و لکھنؤ اور بعض متقدمین و متاخرین شعراء کے کلام سے ان کے کلام کا موازنہ بھی کیا گیا ہے، سب سے زیادہ اہم اور قابل توجہ وہ بحث ہے جس میں اس عام خیال کو مفروضہ اور غلط بتایا گیا ہے کہ "ناسخ نے اصلاح زبان کے ضابطے مقرر کیے اور متروکات کا تعین کیا" گو اس پر مدلل گفتگو کی گئی ہے، تاہم یہ ابھی مزید بحث و نظر کی محتاج ہے۔ تعارف میں کہیں کہیں مقدمہ نگار کے قلم سے بعض تیز طنز آمیز جملے نکل گئے ہیں، جو ان جیسے سنجیدہ اور باوقار اہل قلم کو زیب نہیں دیتے۔

تجلیات شعرستان فارسی۔ ازجناب سید لطیف الرحمن صاحب۔ تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۱۴۴، قیمت درج نہیں، پتہ عثمانیہ بکڈپو ۱۲ رابندر سرانی (لور چیت پور روڈ) کلکتہ ۱۰

اس کتاب میں ایران و ہندوستان کے چند ممتاز فارسی گو شعراء کے مختصر حالات اور بعض شاعرانہ کمالات بیان کیے گئے ہیں، یہ دس مضامین پر مشتمل ہے، پہلے مضمون میں شاہنامۂ فردوسی کی مقبولیت اور ایران میں اس کے غیر معمولی اثرات، اور دوسرے میں خیام کی یورپ میں شہرت و مقبولیت کا ذکر ہے، تیسرے میں خاقانی کے حسان العجم اور چھٹے میں خواجہ حافظ کے مذہب و مسلک کی وضاحت کی گئی ہے، پانچویں مقالہ میں ایران میں

نے تقریباً نصف صدی پہلے امیر جامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے ایما سے جامعہ کے نصاب کے لیے قرآن و حدیث کا ایک مختصر انتخاب تیار کیا تھا، اب جامعہ کے موجودہ استاذ اسلامیات مولانا جمال الدین اعظمی نے طلبہ کی سہولت کے لیے اسکا سلیس اردو ترجمہ شائع کیا ہے، لیکن بعض آیات و احادیث کی اصل روح محض ترجمہ سے ظاہر نہیں ہوتی، اس لیے اگر حواشی میں ان کی مختصر وضاحت کر دی گئی ہوتی تو افادہ دوچند ہو جاتا، کہیں کہیں کتابت و طباعت کی غلطیاں بھی رہ گئی ہیں، اعمال و عبادات اور اخلاق و آداب سے متعلق اسلامی ہدایات و تعلیمات کا یہ مجموعہ بڑا کارآمد اور واقعی اسم با مسمی ہے۔

علم التصریف ۔ مرتبہ مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی ندوی، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۲۸، قیمت ۶ روپے، پتہ: مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

زیر نظر کتاب میں فن صرف (عربی) کے مبادی و مسائل اردو میں تحریر کیے گئے ہیں قدیم طرز کی کتابوں کے ذریعہ صرف کی تعلیم میں زیادہ وقت صرف ہوتا ہے، اور اس کے مسائل مشکل سے مستحضر ہوتے ہیں، اس لیے لائق مصنف نے جو دار العلوم ندوۃ العلماء میں ادب کے استاد اور عربی زبان و ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں، جدید طرز کی یہ کتاب اردو زبان میں لکھی ہے، دار العلوم ندوہ نے نصاب کی ترتیب اور عربی تعلیم کو سہل الحصول بنانے کے لیے کورس کی جو مفید کتابیں تیار کی ہیں، یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی اور عربی مدارس کے ابتدائی درجات کے نصاب میں داخل کیے جانے کے لائق ہے۔

غنی کشمیری ۔ مرتبہ ڈاکٹر ریاض احمد شیروانی، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت

سے چھپ چکی ہیں، یہ پانچویں مثنوی ابھی تک نایاب تھی، دارالمصنفین کے سابق اعزازی رفیق اور مدراس یونیورسٹی کے شعبۂ اردو، عربی اور فارسی کے موجودہ صدر افضل العلماء ڈاکٹر محمد یوسف کوکنی کو اس کا ایک مخطوطہ دستیاب ہوگیا اور انھوں نے اس کو ایک مختصر دیباچہ کے ساتھ شائع کرکے ایک مفید ادبی خدمت انجام دی ہے، امید ہے کہ فارسی شعروادب سے دلچسپی رکھنے والوں میں یہ مقبول ہوگی۔

مسلم پرسنل لا۔ از مولانا منت اللہ صاحب رحمانی، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۷۰، قیمت ایک روپیہ ۲۵ پیسے، ناشر: مکتبہ امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ۔

اس کتابچہ میں مسلم پرسنل لا سے مقصود اس کی دینی و شرعی اہمیت اور ان محرکات کا ذکر ہے جن کی بنا پر اس میں تبدیلی کا مطالبہ کیا جارہا ہے، اس ضمن میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ انگریزوں کے عہد اور موجودہ دستورِ ہند میں مسلم پرسنل لا کی کیا حیثیت ہے؟ آخر میں اجتہاد کے بارہ میں صحابۂ کرام اور ائمۂ فقہ کا طریقۂ عمل بیان کرکے اس کا صحیح لائحۂ عمل اور اس کے متعلق اصل اسلامی نقطۂ نظر واضح کیا گیا ہے، یہ رسالہ مدلل و متوازن اور بقامت کہتر و بقیمت بہتر کا مصداق ہے۔

کتاب و سنت کے جواہر پارے۔ ترجمہ مولانا جمال الدین اعظمی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۱۰، قیمت دو روپیے ۲۵ پیسے۔ پتہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

مولانا سعد الدین انصاری مرحوم سابق استاذ اسلامیات جامعہ ملیہ اسلامیہ

رجسٹرڈ نمبر ال (۵۲۰)

ستمبر ۱۹۷۳ء

معارف

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپیہ سالانہ

دفتر دارالمصنفین اعظم گڈھ

(کتبہ اقبال احمد)

وطباعت نفیس، صفحات ۲۸۶، مجلد، قیمت درج نہیں، پتہ: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، سری نگر۔

ہندوستان کے متاخر شعرائے فارسی میں غنی کشمیری کو غیر معمولی شہرت اور قبول عام حاصل ہے، ان کا کلام ان کی زندگی ہی میں ہندوستان کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی مشہور ہو چکا تھا، ان کے دیوان کے بکثرت اڈیشن شائع ہوئے، چند سال پہلے جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی نے محمد امین داراب اور علی جواد زیدی صاحبان کا مرتبہ دیوان بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا، اس میں زیدی صاحب کا ایک پُر از معلومات مقدمہ بھی ہے، اب اکیڈمی نے غنی کے حالات و کمالات کا یہ مرقع فارسی زبان میں شائع کیا ہے، جو پانچ فصلوں پر مشتمل ہے، پہلی میں کشمیر کے جغرافیہ اور طبعی و قدرتی حالات تحریر کیے گئے ہیں، دوسری فصل میں وہاں فارسی زبان کی ترویج و اشاعت کا حال ہے، تیسری فصل میں غنی کے زمانہ کے ہندوستان خصوصاً کشمیر کے اجتماعی و سیاسی، علمی و ادبی اور مذہبی و اخلاقی حالات بیان کیے گئے ہیں، ایک فصل میں غنی کے سوانح سیرت و اخلاق، افکار و عقائد اور ان کے معاصرین امراء و اصحاب کمال اور تلامذہ کا ذکر ہے، اس میں ان کے متعلق بعض غلط روایات و واقعات کی تردید بھی کی گئی ہے، آخر میں غنی کی شاعری پر تبصرہ اور اس کے ادبی و فنی محاسن اجاگر کیے گئے ہیں، کتاب کے شروع میں ان کی رہایش گاہ اور مزار کا عکس بھی دیا گیا ہے، ابھی تک غنی کے متعلق اس سے زیادہ مبسوط اور جامع تحریر موجود نہیں تھی، فاضل مصنف اور اکیڈمی دونوں اس ادبی و تحقیقی کتاب کی اشاعت پر مبارکباد کے مستحق ہیں، اس کا اردو ترجمہ بھی شائع کرنے کی ضرورت ہے،　　"ض"

جلد ۱۲ ماہ شعبان المعظم ۱۳۹۳ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۷۳ء عدد ۳

مضامین

شذرات	شاہ معین الدین احمد ندوی	۱۶۲-۱۶۴

مقالات

مولانا محمد علی کی یاد میں	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	۱۶۵-۱۸۸
اقبال اور اسلامی فکر کی تشکیل جدید	جناب پروفیسر عبدالمغنی صاحب پٹنہ	۱۸۹-۲۰۵
مسعود بک (ہندوستان کے حسین بن منصور حلاج)	جناب الطاف حسین خان صاحب شروانی اسلامیہ کالج اٹاوہ	۲۰۶-۲۱۵
خریطۂ جواہر	شاہ معین الدین احمد ندوی	۲۱۶-۲۲۸
چند قدیم نایاب سکے	جناب انوار احمد صاحب سوپاروی)	۲۲۹-۲۳۲

ادبیات

غزل	جناب عروج زیدی	۲۳۳
"	جناب ولی الحق انصاری (لکھنؤ)	۲۳۴
مبادِ طلب	جناب وارث القادری	۲۳۵
مطبوعاتِ جدیدہ	"ض"	۲۳۶-۲۴۰

سامنے طرح طرح کے پیچیدہ مسائل ہیں۔ اُن کو حل کرنے کے لئے اس کو سب سے زیادہ امن و سکون کی ضرورت ہے، پاکستان کو گذشتہ جنگ نے بہت کمزور کر دیا ہے، ہولناک سیلاب کی تباہی اس پر مستزاد ہے اس کو بھی سنبھلنے کے لئے امن و سکون درکار ہے، ہندوستان اگرچہ طاقتور اور بڑا ملک ہے لیکن وہ بھی جنگ کے نتائج سے محفوظ نہیں، اور اس کے سامنے اندرونی اور بیرونی مسائل ہیں جو امن کے بغیر حل نہیں ہو سکتے، اس لئے تینوں ملکوں کے لئے امن و صلح کے سوا فلاح کی کوئی راہ نہیں ہے۔

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان سب سے بڑا مسئلہ جنگی قیدیوں کا تھا، وہ طے ہو گیا ہے باقی مسائل کا تعلق پاکستان اور بنگلہ دیش سے ہے۔ اُن کو طے کرنے کے لئے جذبات کے بجائے تدبر اور ٹھنڈے دماغ سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ مفاہمت میں ماضی کے واقعات کو بھلا کر مستقبل کی مصلحتوں کو دیکھنا اور ہر فریق کو کچھ نہ کچھ دینا پڑتا ہے۔ ایسے مسائل پر اڑنے سے جن سے جذبات کی تسکین کے سوا کوئی فائدہ نہ ہو، کوئی نتیجہ نہیں نکلتا، اس لئے دونوں ملکوں کو حقیقت پسندی سے کام لینے کی ضرورت ہے، اگر آئندہ گفتگو میں دونوں ان باتوں کا لحاظ رکھیں تو اُن کے معاملات آسانی سے طے ہو سکتے ہیں۔

اس وقت بنگلہ دیش میں ہزاروں مہاجر اور پاکستان میں بنگالی خاندان مصیبت میں مبتلا ہیں، خود ہندوستان کے لاکھوں مسلمان اپنے پاکستانی اعزہ کے حالات نہ معلوم ہونے سے مضطرب ہیں، اس لئے دونوں ملکوں کی مصالحت کا مسئلہ تنہا سیاسی نہیں بلکہ اخلاقی اور انسانی بھی ہے۔ اور اس پہلو سے بھی اس کو جلد حل کرنے کی ضرورت ہے ہندوستان

شذرات

ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کی جنگ اور اس کے نتائج نے تینوں ملکوں کا امن و سکون ختم کر دیا تھا۔ اُن کے ہزاروں خاندان مصیبت میں مبتلا تھے۔ اور اُن کی کشمکش سے آیندہ بھی بڑے خطرات تھے۔ اس لئے ساری دنیا کی نگاہیں اُن کے مذاکرات پر لگی ہوئی تھیں، خدا کا شکر ہے کہ اس کا ایک مرحلہ بخیر و خوبی طے ہوگیا، اور تینوں ملکوں کو اطمینان کا سانس لینے کا موقع ملا۔ اور پوری امن پسند دنیا نے اس پر مسرت و شادمانی کا اظہار کیا، مگر ابھی متعدد اہم اور نازک مسائل کا حل باقی ہے،

اس حقیقت کو تینوں ملک سمجھتے ہیں کہ اُن کی فلاح باہمی مصالحت اور تعلقات کی خوشگواری پر موقوف ہے۔ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش اگرچہ سیاسی حیثیت سے تین ملک بن گئے ہیں لیکن وہ ایک ہی ملک کے کٹے ہوئے ٹکڑے ہیں۔ اس لئے ان میں جغرافی وحدت، نسلی، تہذیبی اور تجارتی و اقتصادی اشتراک وغیرہ کے اتنے گوناگوں رشتے ہیں، جو سیاسی تقسیم سے نہیں ٹوٹ سکتے اور اُن میں کوئی بھی ملک دوسرے سے بے تعلق نہیں رہ سکتا، اور وہ آپس میں مل ہی کر ترقی کر سکتے ہیں۔

بنگلہ دیش ابھی نوزائیدہ ملک ہے، اس کی حالت ہر حیثیت سے نہایت ابتر ہے، اس کے

مقالات

مولانا محمد علیؒ کی یاد میں

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۷)

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مولانا محمد علی کے جیل جانے کے بعد ملک میں ترک موالات و سول نافرمانی کی تحریک بڑے زور سے چل پڑی، جیل جانے والوں کا سلسلہ کسی طرح ختم ہی نہیں ہوتا تھا، ایسی مثالیں بھی سننے میں آئیں کہ سرکاری دفتر کا کوئی ملازم شام کو اپنے کام سے واپس آرہا ہے، راستے میں وہ بھی اس رو میں بہ گیا اور گھر کے بجائے جیل پہنچ گیا، دسمبر ۱۹۲۱ء و جنوری ۱۹۲۲ء میں ترک موالات کے سلسلہ میں تیس ہزار اشخاص جیل گئے، لیکن خود مہاتما گاندھی ابھی باہر تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برطانوی حکومت کا خاتمہ اب جلد ہی ہو جائیگا، ہر جگہ کے قید خانے ہندو مسلمانوں سے بھر گئے، دونوں کے اتحاد و یگانگت کے پرکیف مناظر بھی ہر جگہ دیکھنے میں آرہے تھے، مسلمانوں کے جوش و خروش کا پلہ بھاری تھا، صوبہ سرحد میں اس زمانے میں حکومت کی طرف سے گولیاں چلائی گئیں تو مسلمانوں کو فخر رہا کہ یہ گولیاں کسی سرحدی مسلمان کی پیٹھ پر نہیں بلکہ سینے پر لگیں، ہندوستانی مسلمان اپنی آبادی کے تناسب سے زیادہ جیل گئے، ڈاکٹر راجندر پرشاد اپنی کتاب "باپو کے قدموں میں" اس زمانہ کی تصویر کھینچتے ہیں کہ

اس وقت ہندو اور مسلمان دونوں ہی بڑے جوش و خروش کے ساتھ عدم تعاون میں شریک تھے، دونوں میں سب ہی کاموں میں ایک طرح کے مقابلے کی رقابت ہو جاتی، سب جگہوں میں کانگریس کے علاوہ خلافت کمیٹیاں قائم ہو گئی تھیں، اور جوش کے ساتھ ہندوؤں نے خلافت کمیٹیوں کو منظم کرنے اور چندہ جمع کرنے میں مدد کی، مسلمان کانگریس میں شریک تھے اور مدد کرتے ہی تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ ایکا اور اتحاد کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے،

بنگلہ دیش کا بہت بڑا محسن ہے، اس کی حیثیت اس کے مربی کی ہے، اگر وہ اپنے اثرات سے کام لیکر دونوں کے معاملات طے کرا دے تو یہ اس کا بڑا کارنامہ ہوگا۔

اس میں شبہ نہیں کہ پاکستان اور بنگلہ دیش کی جنگ نے دونوں کے دلوں میں بڑے گہرے زخم لگائے ہیں لیکن وہ رفتہ رفتہ مندمل ہو جائیں گے، چنانچہ اب سے سال ڈیڑھ سال پہلے دونوں کے جو جذبات تھے وہ اب نہیں ہیں اور جو اب ہیں وہ آئندہ نہیں رہیں گے، اور ان دونوں کے درمیان اتنے رشتے ہیں اور ان کے مفاد ایک دوسرے سے اتنے وابستہ ہیں کہ وہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے بے تعلق نہیں رہ سکتے، ایک نہ ایک دن ان کو تعلقات قائم کرنا پڑینگے، اس میں تاخیر سے دونوں کا نقصان ہے، اسلئے جسقدر جلد یہ کار خیر انجام پا سکے، بہتر ہے، اس وقت ضرورت اس کی ہے کہ تینوں ملکوں کے درمیان آمد و رفت اور یا کم سے کم خط و کتابت کا سلسلہ قائم ہو جائے، اس کے لئے سارے مراحل کی تکمیل ضروری نہیں ہے، تینوں حکومتیں اس سے پہلے بھی اس کام کو کر سکتی ہیں، آئندہ تعلقات پر بھی اس کا اچھا اثر پڑے گا۔

افسوس ہے کہ گذشتہ جولائی میں ایک ممتاز علمی شخصیت مولانا ضیاء احمد بدایونی سابق صدر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی نے وفات پائی، مرحوم فارسی زبان کے فاضل اور مسلم الثبوت استاد تھے، انھوں نے فارسی کی درسیات پرانے طرز پر پڑھی تھیں اور عربی سے بھی واقف تھے اسلئے فارسی زبان و ادب پر ان کی نظر ماہرانہ تھی، ان کا ذوق بڑا متنوع تھا، مذہبیات اور تاریخ اسلام سے بھی ان کو دلچسپی تھی، اور ان سب پر ان کے مضامین اور تصانیف موجود ہیں، ان میں سب سے اہم دیوان مومن کی شرح اور اس کا فاضلانہ مقدمہ ہے اور یہ کہنا صحیح ہوگا کہ جس طرح سب سے پہلے ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری نے کلام غالب کی اہمیت نمایاں کی تھی، اسی طرح مولانا ضیاء احمد نے مومن کے کلام کی اہمیت واضح کی، وہ علامہ صرف دیندار بلکہ خوش عقیدہ مسلمان تھے جس کا اثر ان کی تمام مذہبی تحریروں میں ہے، اس زمانہ میں جب کہ فارسی کا ذوق گھٹتا جا رہا ہے، مرحوم کی جگہ مشکل سے پر ہو سکے گی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے،

سے روک دیں اور عدم تعاون کی تحریک ملتوی کردی، اخباروں میں ہم نے یہ بھی پڑھا کہ چورا چوری کے واقعات کی وجہ سے انھوں نے یہ طرز عمل اختیار کیا، یہ موضع گورکھپور کے ضلع میں ہے، یہاں دیہاتیوں کے ایک مجمع نے پولیس کے مظالم سے تنگ آکر تھانے کو آگ لگادی، اور چھ سات سپاہیوں کو زندہ جلادیا، ہمیں جنگ کے التوا کی خبر سنکر بڑا غصہ آیا، کیونکہ اس وقت ہماری قوت بڑھی ہوئی تھی، اور ہم ہر محاذ پر پیش قدمی کررہے تھے۔ لیکن جیل خانے کے اندر ہماری مایوسی اور غصہ سے کیا نتیجہ نکل سکتا تھا، چنانچہ عدم تعاون ختم ہوگیا اور ترک موالات کی کلی کھلنے سے پہلے مرجھاگئی۔ مہینوں کی تگ و دو اور پریشانی کے بعد حکومت نے بھی اطمینان کا سانس لیا، اور اب اسے پہلی موقع ملا کہ پیش قدمی کرے، چنانچہ چند مہینے کے اندر اندر اس نے گاندھی جی کو گرفتار کرکے طویل مدت کے لیے جیل خانے میں بند کردیا۔ (میری کہانی ص ۱۴۲)

پنڈت جواہرلال نہرو یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس زبردست تحریک کے یکایک بند کردینے سے ملک میں وہ افسوسناک صورت حال پیدا ہوگئی کہ جس نے قومی تحریک کو بڑا نقصان پہنچایا، تشدد کے دبے ہوئے جذبات اور طریقوں نے ہاتھ پیر نکالنے شروع کئے، آگے چل کر فرقہ وارانہ فسادات اٹھ کھڑے ہوئے، جو رجعت پسند اور فرقہ پرست ترک موالات کی ہماہمی اور غیر معمولی مقبولیت کی وجہ سے منہ چھپائے بیٹھے تھے، اب انھیں موقع مل گیا، اور وہ اپنی کمین گاہوں سے نکل پڑے۔"

ملک کی فضا ہی بدل گئی، سب سے بڑا حادثہ مالابار میں پیش آیا، یہاں کے موپلے مسلمان حکومت برطانیہ کے انتہائی مخالف ہوکر اس سے برسرپیکار تھے، انگریزوں کی فوقیت

بہت سے لوگ ایسا ہی خیال کرتے تھے، بقر عید کا دن ایک ایسا دن ہوتا ہے جب خاص کر ہندوستان میں گائے کی قربانی کی وجہ سے ہندو اور مسلمانوں میں جھگڑے ہو جایا کرتے ہیں، اس سال جب بقر عید کا دن قریب آیا تو سب کو یہ فکر ہوئی کہ اس اتحاد میں کوئی رکاوٹ نہ پڑنے پائے، گاندھی جی مولانا محمد علی کے ساتھ پھر دورہ کرنے آئے، کئی دن مختلف اضلاع میں پھرتے رہے، سب ہی مقامات پر ان کی اور مولانا کی تقریریں ہوئیں، انھوں نے گائے کی رکھشا اور حفاظت مسلمانوں پر چھوڑ دی، مسلمانوں کی طرف سے اعلان نکالے گئے کہ جہاں تک ہو گائے کی قربانی نہ ہونی چاہیے، نتیجہ یہ ہوا کہ اس سال بقر عید میں گائے کی قربانی اتنی کم ہوئی کہ اس سے پہلے شاید کبھی نہیں ہوئی تھی، اس سے اتحاد اور ایکے پر اور بھی مضبوطی کی مہر لگ گئی، لیکن بعد میں ایسا معلوم ہوا کہ یہ اتحاد مستقل نہیں تھا۔" (ص ۲۴۳۔ ۲۴۴)

اسی زمانہ میں ۵ فروری ۱۹۲۲ء کو گورکھپور ضلع میں عوام نے پولیس کے ظلم وستم سے تنگ آکر چورا چوری کے تھانے کو چند سپاہیوں کے ساتھ نذر آتش کر دیا، گاندھی جی کو اس سے بڑا دکھ پہنچا، وہ اہنسا اور عدم تشدد کے قائل تھے، ان کے دل کے اندر انسانی محبت کی نہر بہتی رہتی تھی، سپاہیوں کے جلائے جانے سے ایسے غمزدہ ہوئے کہ انھیں یقین ہو گیا کہ تحریک اگر جاری رہی تو تشدد سے محفوظ نہیں رہ سکے گی، انھوں نے بردولی جا کر پوری تحریک روک دی، جس سے ہندو مسلمان دونوں کو بڑی حیرت ہوئی، پنڈت جواہر لال نہرو اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھتے ہیں:

" فروری ۱۹۲۲ء کے آغاز میں یکایک تمام منظر بدل گیا، جیل خانے میں یہ سنکر بڑی حیرت اور پریشانی ہوئی کہ گاندھی جی نے تمام جارحانہ کارروائیاں ایکدم

میں مدد دے کر گاندھی جی اور ان کی لیڈری میں کام کرنے والے دوسرے ہندو نیتاؤں نے زبردست غلطی کی، ان لوگوں کی وجہ سے مسلمانوں میں اتنی بیداری پیدا ہوئی، اور اس بیداری کا نتیجہ یہ ہے کہ اس طرح سے ہندوؤں کے ساتھ وہ لوگ زیادتی کرنے لگے، جو لوگ زیادہ سمجھداری سے باتیں کرنے کا دعوی کرتے تھے، وہ بھی یہ کہنے لگے کہ اسلام کٹرپن سکھاتا ہے، اور چونکہ ساری خلافت تحریک مذہبی تحریک تھی اس لیے اس کا ایک ہی نتیجہ ہو سکتا تھا، وہ یہ کہ مسلمانوں میں کٹرپن بڑھے، اس کا ہی نتیجہ مالابار میں ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنانے اور صرف ہندو ہونے کی وجہ سے ان کے گھر بار لوٹے جانے کی شکل میں دیکھنے میں آیا، دوسری طرف مسلمانوں کا کہنا تھا کہ مالابار کی باتیں بہت بڑھا چڑھا کر ہندوؤں میں مسلمانوں کے خلاف جذبہ ابھارنے کے لیے کہی گئی ہیں، اگر کہیں مسلمانوں نے کسی ہندو کے ساتھ زیادتی کی تو اس لیے نہیں کہ وہ ہندو تھا، بلکہ اس لیے کہ اس نے موپلوں کے خلاف برٹش گورنمنٹ کی مدد کی، علی برادران کا کہنا تھا کہ کانگریس اور ہندوؤں کی وجہ سے مسلمانوں میں بیداری نہیں پیدا ہوئی بلکہ اس بیداری کا سبب یہ تھا کہ ان کے مذہبی عقیدوں پر برٹش گورنمنٹ نے اپنے اعتبار سے گہری چوٹ دی تھی، اگر کانگریس یا گاندھی جی ان کا ساتھ نہ دیتے تو بھی وہ اس مسئلہ کو لیکر برٹش گورنمنٹ سے ضرور لڑتے، چاہے اس لڑائی کا طریقہ کوئی دوسرا ہی کیوں نہ ہوتا، اور اس کا نتیجہ خواہ کچھ بھی ہوتا، کانگریس اور ہندوؤں نے جو مدد کی تھی، اس کے وہ شکر گذار تھے، لیکن ہندوؤں اور کانگریس کو بھی یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ مسلمانوں کے آجانے سے ان کی بھی طاقت کتنی بڑھ گئی، اور اب وہ اس قابل ہوئے ہیں کہ برٹش گورنمنٹ سے مقابلہ کرنے کو تیار ہیں۔"

(ص ۷-۳۰۵-۲۴۴)

کو جہاد قرار دیا اور شہادت کے شوق میں مرمٹنے کے لیے آگے بڑھے، انگریزوں سے بری طرح پیش آئے، اور جن ہندوؤں نے انگریزوں کا ساتھ دیا اُن سے بدظن ہو کر ان کے ساتھ بھی بدسلوکی کی، انگریزوں نے ان کے فسادات پر قابو پا لیا، تو اُن پر ایسے مظالم ڈھائے کہ ان کی تفصیل معلوم کر کے اب بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، دو ہزار دو سو چھیاسٹھ موپلوں کو بڑی بے رحمی سے بندوق کی گولیوں سے ہلاک کیا گیا، ۵۶۸۸ گرفتار کیے گئے، ان کو جلاوطن کرنے کی خاطر مال گاڑی کے ایک ڈبے میں ستر موپلے جانوروں کی طرح بھر دیے گئے، جن میں ۶۶ گھٹ گھٹ کر اسی میں مر گئے، ان کے گھروں کو تاراج کیا گیا، ان کو ان کی املاک سے محروم کر دیا گیا، بدقسمتی سے ان کے ساتھ انگریزوں کی یہ سفاکی اور بے رحمی تو نظر انداز کر دی گئی لیکن انھوں نے ہندوؤں کے ساتھ جو بدسلوکی کی تھی اس کو بہت اچھالا گیا، اس سلسلے میں ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اپنی کتاب "باپو کے قدموں میں" جو کچھ لکھا ہے اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔

"موپلہ لوگ سیدھے لیکن جوشیلے ہوتے ہیں، ان کی بغاوت خلافت کی وجہ سے برٹش سرکار کے خلاف تھی، اس میں مذہبی جذبہ ہی اہم سبب تھا، مذہبی جذبہ جب ایک بار ابھر جاتا ہے تو اس کی بہت سی شکلیں ہو جاتی ہیں، اس بار مالابار میں مذہبی جذبہ نے ایک عجیب رنگ دکھایا، موپلوں کا جھگڑا برٹش سرکار سے تھا لیکن کچھ ایسے ہندوؤں کے ساتھ جن کے متعلق ان کو شبہہ تھا کہ یہ برٹش گورنمنٹ کی مدد کر رہے ہیں، انھوں نے سختی اور زیادتی کی، اس کا اثر دوسرے ہندوؤں پر پڑا ....

...... ہندوؤں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ مسلمانوں کو خلافت کے معاملہ

کانگریس کے اندر بھی پھوٹ پڑ گئی، بعض ممتاز کانگریسی رہنما عدم تعاون اور ترک موالات ختم کرکے صوبوں کی کونسلوں اور مرکزی حکومت کی اسمبلی میں داخل ہوکر حکومت سے ٹکر لینا چاہتے تھے، ان ہی میں پنڈت موتی لال نہرو، سی، آر داس اور لالہ لاجپت رائے تھے، انھوں نے سوراج پارٹی قائم کرکے گیا کانگریس کے اجلاس میں اپنی بات منوالی، اس کے بعد کانگریس میں دو جماعتیں ہوگئیں، کونسل میں جاکر کام کرنے والے چینجرز کہلاتے، کونسل کے باہر رہنے والے نو چینجرز کہے جانے، سوراج پارٹی اور گاندھی جی میں ہم آہنگی ہو سکی، لیکن موتی لال نہرو اپنی شخصیت اور ایثار کی وجہ سے گاندھی جی پر بھاری پڑے گاندھی جی ان سے ہار مان گئے، ان سے ٹکر لینے کے بجائے سیاست سے علٰحدگی اختیار کرلینا زیادہ پسند کیا،

گیا ہی کانگریس کے اجلاس کے موقع ہی پر ہندو مہاسبھا کی تاسیس ہوئی، اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ ۱۹۲۲ء میں ملتان میں ہندو مسلمان بلوہ ہوگیا، وہاں ڈاکٹر راجندر پرشاد کے ساتھ پنڈت مدن موہن مالوی بھی گئے، اس کے بعد کی داستان ڈاکٹر راجندر پرشاد اس طرح بیان کرتے ہیں :-

"مالوی جی نے وہاں بھی ایک بات کہہ دی تھی، وہ یہ کہ ہندوؤں کے متحد نہ ہونے کی وجہ سے ان کے ساتھ اس قسم کی زیادتی ہوتی ہے، اس لیے ان کو اب متحد ہوجانا چاہیے، اس بات کو انھوں نے بڑی خوبی سے کہا، جس سے ہندو مسلم دشمنی بڑھنے کا خطرہ نہیں ہو سکتا تھا، اور نہ کوئی یہ کہہ سکتا تھا کہ ہندوؤں کا اتحاد مسلمانوں سے لڑنے کے لیے یا ان کی مخالفت کے لیے کیا جائیگا، مسلمانوں میں فضا کچھ سدھر گئی لیکن یہ بات بھی نہ رہی، دوسری جگہ کے ہندوؤں کو متحد کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی،

ہمارے ملک کی بدقسمتی سے خود ہمارے ہم وطنوں کے دلوں میں شکوک پیدا ہونے لگے جو یہاں تک بڑھے کہ ملکانہ راجپوتوں کو شدھ بنانے کی کوشش جاری ہو گئی، اور یہ ہزاروں کی تعداد میں شدھ کر لیے گئے، اس کے سربراہ سوامی شردھانندجی تھے جنکو کچھ دنوں پہلے دہلی کے مسلمانوں نے جذبۂ اتحاد میں اتنی عزت دی تھی کہ دہلی کی جامع مسجد کے منبر پر بٹھا کر ان سے تقریر کرائی تھی، وہ آریہ سماجیوں کے لیڈر تھے، آریہ سماجیوں کے متعلق مولانا محمد علی لکھتے ہیں :-

"جو طریقہ تبلیغ آریہ سماجیوں نے اختیار کیا ہے، اور جو ہمارے نبی کی جس طرح ... توہین کرتے ہیں اور مسلمان حکمرانان ہند سے جو بدگمانی انھیں ہے اور جس ... جذبۂ انتقام سے وہ لبریز ہیں، اس سے مجھے سخت نفرت اور بیزاری ہے۔"

سوامی شردھانند کے متعلق وہ فرماتے ہیں :-

سوامی شردھانند کو مالوی جی سے زیادہ بہادر اور زیادہ آزاد سمجھتا تھا اور سمجھتا ہوں، اور گو وہ بت پرست نہیں اور بہادر ... کے قیود سے آزاد ہیں اور ... تبلیغی مذہب رکھتے ہیں، ...... وہ ... اس حکومت سے بیزار ہوں اور اس کے دشمن ہوں، اور اس معاملہ میں لاکھ مالوی جی سے متحدہ ہوں ...... لیکن میں ہرگز ایسے شخص کو ملک کا دوست نہیں سمجھتا جو مسلمانوں کے خلاف ذلیل حرکات کرنے والوں کو پناہ دے یا دلائے یا چندہ دے یا دینے والے کو دوست رکھے۔" (ہمدرد یکم دسمبر ۱۹۲۶ء)

شدھی تحریک زور پکڑنے لگی تو مسلمانوں نے عام طور پر تبلیغی مہم شروع کی۔ شدھی اور سنگٹھن کے مقابلہ میں تبلیغ اور تنظیم کے نعرے بلند ہونے لگے۔ اس کے سربراہ ڈاکٹر سیف الدین کچلو ہو گئے، جو خود بڑے کانگریسی تھے اور ... آخر وقت تک رہے۔

کو ملازمت میں پچپن فی صدی دی گئی ۔

مولانا محمد علی اس پیکٹ سے خوش تھے ، وہ سی ، آر داس سے بڑی محبت کرتے رہے ، ان کی وفات پر ان کو بڑا صدمہ ہوا ، ہمدرد میں ان کا ایک نثری مرثیہ دل کھول کر لکھا تو اس کی ابتدا اس طرح کی :۔

آج صبح داس کی موت کی خبر ملی ، چند حرف اس سانحہ پر لکھنا چاہتا ہوں ، لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں ، قلم اور زبان دونوں قاصر ہیں کہ قلب کی کیفیت کا صحیح اظہار کر سکیں ، دل پر ایک ایسا دھچکا لگا ہے کہ دماغ بالکل مفلوج ہو گیا ہے ، الفاظ کی تلاش میں ناکامی کیوں نہ ہو ، جبکہ ابھی تک کیفیت قلب ہی کا دماغ کو صحیح طور پر پتہ نہیں چلا ، حسیات و جذبات کا ایک تلاطم ہے ، جس میں سوائے موجوں کے شور کے کچھ سنائی نہیں دیتا ، ان موجوں کے شور کو کس عبارت میں سپرد قلم کروں اور اس تلاطم کا کن الفاظ میں نقشہ کھینچوں ۔

پھر داس پیکٹ کا ذکر ان جذبات کے ساتھ کیا ،

" بنگال میں مسلمان اور ہندو تقریباً مساوی التعداد ہیں ، لیکن مسلمان اپنے افلاس اور جہالت کی بدولت ایک ایسی قوم تھے ، جن کا سیاسی پاس و لحاظ کرنا کسی ہندو لیڈر کے خیال میں بھی نہ آتا تھا ، تقسیم بنگال کی شورش اور اس کے بعد مسلمانوں کی تعلیمی ترقی اور بالخصوص تحریکات خلافت و سوراج نے ضرور مسلمانان بنگال کو بیدار کیا ، لیکن اس پر بھی مجھے سارے ہندوستان میں کوئی دوسرا شخص مہاتما گاندھی کے سوا نظر نہیں آتا ، جو بنگال کے مسلمانوں کا اتنا خیال رکھ سکتا تھا ، جتنا کہ داس نے رکھا ، لیکن داس کی دادرسی کا اپنی ہی زندگی میں پورا صلہ مل گیا ، حکومت نے

تھوڑے دنوں میں گیا میں کانگریس ہونے والی تھی، کچھ ہندوؤں نے ہندو سبھا کرنے کا خیال کیا، محترم مالوی جی کو صدر بنانے کا ارادہ کیا گیا مالوی جی نے صدر بننا اس شرط پہ منظور کیا کہ میں بھی سبھا میں شریک ہوں، اور ان کو دعوت دوں، میں نے اس بات کو منظور کر لیا، کیونکہ مجھ کو اس میں کوئی برائی نظر نہیں آئی، بعد میں جب ہندو سبھا کا کانگریس سے اختلاف ہوا تو مالوی جی نے اس بات کو مجھ سے یاد دلایا کہ میرے ہی کہنے پر انھوں نے گیا میں صدر ہونا منظور کیا تھا، بہرحال کچھ ہو، سبھا گیا میں پوری کامیابی سے ختم ہوئی، سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ ہندوؤں کا وہاں ایک سنگھٹن قائم کرنا طے پایا" (باپو کے قدموں میں، ص ۱۳-۳۱۱)

اجتماعی حیثیت سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایک دوسرے سے سیاسی بدگمانی بڑھتی گئی، لیکن مخلص اور محب وطن رہنما اس بدگمانی کو دور کرنے کی کوشش میں لگے رہے، ان میں سب سے نمایاں نام بنگال کے سی، آر داس کا ہے، وہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں مقبول اور ہر دلعزیز رہے، ان کی وفات کو ایک عرصہ گذرا لیکن آج بھی ان کا نام عزت اور محبت سے لیا جاتا ہے، ہندو مسلمانوں میں اور جھگڑوں کے علاوہ فرقہ وارانہ نمایندگی اور کونسلوں اور ملازمتوں میں تناسب کا جھگڑا بھی تھا، سی، آر داس کی کوشش سے بنگال میں ایسا حل تلاش کر لیا گیا جس سے ہندو و مسلمان بظاہر خوش نظر آئے، یہ داس پیکٹ کے نام سے مشہور ہوا، اس کی رو سے مسلمانوں کو بنگال میں نمایندگی ان کی آبادی کے تناسب سے جداگانہ انتخاب کے ذریعہ دی گئی، لوکل بورڈ میں جہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی، ان کو ساٹھ فی صدی نمایندگی دی گئی، اور جس ضلع میں ہندوؤں کی آبادی زیادہ تھی، ان کو بھی نمایندگی ساٹھ فی صدی دی، مسلمانوں

اور جب مولانا محمد علی تقریر کر رہے تھے تو کسی نے صدر جلسہ کو مخاطب کر کے یہی سوال بھی کر دیا، مجمع کچھ پریشان ہوا، لیکن مولانا محمد علی نے بڑی دلیری اور جرأت سے اس کا یہ جواب دیا،

"میں نے علی گڑھ میں جو کچھ کہا اسے دہرانے کے لیے یہاں بھی تیار ہوں، اور ہر جگہ، گاندھی جی اس وقت آزادی ملک کے لیے جو خدمات انجام دے رہے ہیں، انکے لحاظ سے وہ اپنا نظیر نہیں رکھتے، اور جہانتک ان کی بیش بہا خدمات وطن کا لحاظ ہے وہ مہاتما جی کو اپنے ہی سے افضل نہیں بلکہ اپنی والدہ ماجدہ سے بھی زیادہ قابل تعظیم اور اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا عبد الباری فرنگی محلی سے بھی بڑھکر قابل احترام سمجھتا ہوں، لیکن ایک دوسری حیثیت اعتقاد و ایمان کی ہے، میں عقیدۃً مسلمان ہوں، اور اس کے معنی یہ ہیں کہ عقیدۃً اسلام کو اور تمام عقائد سے کہیں بہتر و اعلیٰ تر سمجھتا ہوں، جہاں تک عقائد ایمانی کا تعلق ہے میں اکیلے گاندھی جی ہی سے نہیں تمام ہندوؤں، تمام عیسائیوں تمام غیر مسلموں کے مجموعے ہر ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان، ہر بدعمل سے بدعمل کلمہ گو کو بہتر سمجھتا ہوں، اسلام کی افضلیت میرا جزو ایمان ہے، اگر آج میں خدانخواستہ اس کا قائل نہ رہوں، تو پھر مسلمان رہنے کی بھی کوئی وجہ نہیں رہتی، میری بات کوئی انوکھی بات نہیں، جس طرح میں اپنے عقیدہ کی افضلیت کا قائل ہوں، اسی طرح ہر مذہب والا اپنے عقیدہ کو افضل تسلیم کرتا ہے، کیا پنڈت مدن موہن مالوی اپنے عقیدہ کو سب سے افضل خیال نہیں کرتے" (محمد علی کی ڈائری: جلد اول ص ۱۳۵ - ۱۴۳)

مولانا محمد علی نے یہ تقریر پورے جوش و خروش کے ساتھ کی، تو مجمع میں بجلی کی ایک رو سی دوڑ گئی، مخالفین سناٹے میں آ گئے، اور حامیوں کے چہرے چمک اٹھے،

لاکھ جتن کیے اور مسلمانوں کو وزارت کی چاٹ دے کر قومی اور ملکی پالیسی سے توڑنا چاہا لیکن بنگال کے مسلمانوں نے داس کا ساتھ دیا، اور حکومت کو بھی پیہم شکستیں نصیب ہوئیں، اور بالآخر کل ہی کی بات ہے کہ حکومت نے اپنی شکست اور داس کی فتح تسلیم کی۔" (ہمدرد ۱۸ جون ۱۹۲۵ء)

بنگال کی مفاہمت کی طرح ہندوستان کے اور صوبوں میں بھی اسی رواداری اور خیرسگالی کے جذبے کے اظہار کی ضرورت تھی، مخلص رہناؤں کو اس کا احساس برابر رہا، ۱۹۲۲ء میں لالہ لاجپت رائے کانگریس کے صدر منتخب ہوئے، اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری مسلم لیگ کے صدر منتخب کیے گئے، تو ان دونوں نے مل کر ہندو مسلمان کے تعلقات کو خوشگوار بنانے کی کوشش کی، انھوں نے سولن میں سمجھوتے کا ایک خاکہ تیار کیا جو "سولن پیکٹ" کے نام سے مشہور ہوا لیکن آگے چل کر یہ بھی غیر موثر ثابت ہوگیا،

ان ہی حالات میں مولانا محمد علی رہا ہوئے، تو ۱۹۲۳ء کے کوکوناڈا کانگریس کے سالانہ اجلاس کے لیے وہ بالاتفاق صدر منتخب ہوئے، یہ زمانہ انکی مقبولیت کے شباب کا تھا، جہاں جاتے ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے، ان کی زیارت کرنے والوں کا ٹھٹ کا ٹھٹ لگ جاتا، اسی زمانہ میں لکھنؤ آئے تو امین الدولہ پارک میں ایک بہت بڑا جلسہ ہوا، اس کے صدر چودھری خلیق الزمان تھے، جلسہ گاہ میں ایک ہندو نے ایک ہینڈ بل تقسیم کرنا شروع کر دیا، جس میں لکھا تھا کہ یہ محمد علی وہی ہیں جنھوں نے جامع مسجد علی گڑھ میں ایک تازہ تقریر میں کہا ہے کہ میں ایک فاجر و فاسق مسلمان کو بھی گاندھی جی پر ترجیح دیتا ہوں، ایسا شخص بھلا کانگریس کا صدر کیسے ہو سکتا ہے،

مرتکب ہونا پسند نہ کروں گا، ہندو مسلمان تعلقات پر طویل بحث کرنے کے بعد انھوں نے کہا

"یہ بات مسلّم اور یقینی ہے کہ نہ تو ہندو ہی مسلمانوں کو معدوم کر سکتے ہیں اور نہ مسلمانوں کو ہندوؤں سے نجات مل سکتی ہے، اگر ہندو اس قسم کی تدبیر سوچتے ہیں تو ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ انھوں نے اس موقع کو اس وقت کھو دیا جب کہ محمد بن قاسم نے بارہ سو سال قبل سرزمین سندھ پر اپنا قدم رکھا، اس وقت تو مسلمان تلیل تعداد میں تھے، اور اب تو ان کی تعداد سات کروڑ سے بھی زیادہ ہے، اور اگر مسلمانوں کو اس قسم کا کوئی خیال ہے تو انھوں نے بھی اپنا موقع ہاتھ سے کھو دیا، جب کہ وہ کشمیر سے، راس کماری اور کراچی سے چٹا گانگ تک حکمراں تھے، اس وقت اگر وہ چاہتے تو ہندوؤں کی نسل کو فنا کر سکتے تھے۔ فارسی کی کیا خوب مثل ہے، ع مشتے کہ بعد از جنگ یاد آید برکلہ خویش باید زد۔ جب کوئی چارۂ کار نہیں کہ دونوں فریق ایک دوسرے سے چھٹکارا پا سکیں تو ان کی ایسی صورت نکالنی چاہیے کہ ایک دوسرے کی معاونت تسلیم کی جائے۔"

اس کے بعد کی روداد پنڈت جواہر لال نہرو کی زبانی سنیے :۔

"دسمبر ۱۹۲۳ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس کوکوناڈا (دکن) میں ہوا، مولانا محمد علی صدر تھے، حسب عادت انھوں نے ایک بے حد طویل خطبۂ صدارت پڑھا، لیکن تھا وہ دلچسپ، انھوں نے مسلمانوں کے سیاسی اور فرقہ وارانہ احساسات کی نشو و نما کا خاکہ کھینچا......... محمد علی نے میری مرضی کے خلاف مجھے مجبور کیا کہ ان کی صدارت کے دوران آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سکریٹری کا عہدہ قبول کرلوں، ایسی حالت میں کہ ملک کے آیندہ پروگرام کے متعلق کوئی بات صاف طور پر میرے ذہن میں

مجمع تالیوں سے گونج رہا تھا، مسرت کے نعرے بلند ہو رہے تھے، اور مولانا محمد علی
یہ شعر پڑھ رہے تھے ؎

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے پر یہ تماشا نہ ہوا"

اس تقریر کے سننے والوں کا یہ بھی بیان ہے کہ مولانا محمد علی نے یہ بھی فرمایا کہ میرا عقیدہ ہے
کہ دنیا کے تمام لوگوں کی فلاح و نجات اس میں ہے کہ وہ اسلام کی تعلیمات پر کاربند ہوں،
اور انسانیت کی تکمیل اس میں ہے کہ اسلام کی تعلیمات پر عمل کیا جائے، مجھکو گاندھی جی
سے بڑی محبت ہے اور اس مخلصانہ محبت کی بدولت میری خواہش ہے کہ وہ مکمل انسان
بن جائیں، اور میری سراسر بدخواہی ہوگی اگر میرے دل میں یہ بات پیدا نہ ہو کہ وہ
مکمل انسان بنجائیں، اور ان کو دنیاوی فلاح اور اخروی نجات حاصل ہو،

کوکوناڈا میں کانگریس کا سالانہ اجلاس شروع ہوا تو مولانا محمد علی نے اپنے
خطبۂ صدارت میں گاندھی جی کو جابجا اپنا سردار اور سردار اعظم کہا، اور اپنے زمانہ
کا سب سے بڑا مسیح نا شخص اور شاہ امن کہا، اور یہ بھی لکھا کہ جو نسخہ انھوں نے ہندستان
کے امراض کے لیے انتخاب کیا، وہ وہی تھا جو حضرت عیسیٰؑ نے یہودیہ کے لیے منتخب کیا،
اس سے ظاہر ہوگا کہ ان کے دل میں گاندھی جی کی کتنی محبت اور وقعت تھی، کانگریس
کے اس خطبۂ صدارت میں پہلی اور شاید آخری بار قرآنی آیات اور رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کی تعلیمات کا غلغلہ سنائی دیا، انھوں نے گاندھی جی کے عدم تشدد کو قبول
تو کر لیا تھا، لیکن اسی خطبہ میں یہ بھی اعلان کیا کہ قیامت کے روز عرش الٰہی کے نیچے میں تشدد
کے مجرم کی حیثیت سے کھڑا ہونا پسند کروں گا لیکن نامردانہ اطاعت کے ناگفتہ بہ جرم کا

بیان میں کہاں تک صداقت ہے ....

"مجھ سے اور محمد علی سے مذہبی بحثیں نہیں ہوتی تھیں، لیکن ان میں خموشی کا وصف نہیں تھا، آخر چند سال بعد (غالباً ۱۹۲۵ء یا شروع ۱۹۲۶ء میں) ان کو یارائے ضبط نہ رہا، اور ایک دن جب میں ان کے گھر میں ان سے ملنے گیا تو برس ہی پڑے، کہنے لگے کہ تم سے مذہب کے معاملہ میں بحث کیے بغیر نہ مانوں گا، میں نے انھیں باز رکھنے کی ہزار کوشش کی، اور ان کو لاکھ سمجھایا کہ میرے اور آپ کے نقطۂ نظر میں اتنا اختلاف ہے کہ ایک کا اثر دوسرے پر نہیں پڑ سکتا، لیکن وہ بھلا کب ماننے والے تھے، کہنے لگے کہ یہ بحث تو آج ہو گی ضرور، تم سمجھتے ہو گے کہ مجھے مذہبی جنون ہے، لیکن آج میں یہ ثابت کر کے رہوں گا کہ مجھے جنون نہیں، سچا جذبہ ہے، انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں مذہبی مسائل کا بہت گہرا اور وسیع مطالعہ کر چکا ہوں، اور مجھے ایک الماری دکھائی جس میں مختلف مذاہب خصوصاً اسلام اور عیسائیت پر کتابیں بھری ہوئی تھیں، ان میں بعض جدید کتابیں بھی تھیں، مثلاً ایچ، جی ویلس کی کتاب "خدا نا دیدہ بادشاہ" جنگ کے زمانے میں جب وہ کئی سال نظر بند رہے تو انھوں نے قرآن کو بار بار پڑھا، اور سب تفسیروں کا بھی مطالعہ کیا تھا، اس مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ قرآن میں ۹۷ فی صدی ایسی باتیں ہیں جو سراسر عقل کے مطابق ہیں، اور قرآن سے الگ کر کے اپنی جگہ پر بھی انھیں ثابت کیا جا سکتا ہے، باقی تین فی صدی باتوں کو اگرچہ عقل پہلی نظر میں تسلیم نہیں کرتی۔ لیکن یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ جب قرآن کی ۹۷ فی صدی باتیں بدیہی طور پر صحیح ہیں تو باقی ۳ فی صدی بھی صحیح ہوں گی، بہ نسبت اس خیال کے کہ ہماری ناقص عقل صحیح ہے

نہ تھی، کوئی انتظامی ذمہ داری قبول نہیں کرنا چاہتا تھا، لیکن میں محمد علی سے انکار نہیں کر سکا، اس کے علاوہ ہم دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر کوئی دوسرا شخص سکریٹری مقرر ہوا تو شاید وہ نئے صدر کے ساتھ اس ہم آہنگی سے کام نہ کر سکے جس طرح سے میں کر سکتا تھا، ان کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی دونوں بہت شدید ہوا کرتی تھی، اور میں خوش قسمتی سے ان لوگوں میں تھا جنھیں وہ پسند کرتے تھے، ہم میں الفت اور محبت کے تعلقات تھے، اور ہم ایک دوسرے کی بہت قدر کرتے تھے، ان پر مذہب کا رنگ بہت گہرا تھا، جس میں میرے خیال میں عقلیت کی جھلک تک نہ تھی، میں اس معاملہ میں ان کے بالکل برعکس تھا، مگر اس اختلاف کے باوجود ان کی غیر معمولی سرگرمی، زبردست قوت عمل اور انتہائی ذکاوت کا دلدادہ تھا، ان کی تیزی طبع کی کوئی حد نہ تھی، لیکن بعض اوقات ان کے طنز کا وار بہت گہرا پڑتا تھا، اسی کی وجہ سے کتنے دوست ان سے چھوٹ گئے، یہ ناممکن تھا کہ کوئی چست فقرہ ان کے ذہن میں آجائے اور وہ اسے بے کہے چھوڑ دیں، اس وقت انھیں اس کا ذرا خیال نہ آتا کہ نتیجہ کیا ہوگا...... ان کی عداوت کے زمانے میں ہم دونوں میں اچھی طرح نبھی، اگرچہ معمولی اختلافات اکثر ہو جاتے تھے......

ان میں اور مجھ میں خدا کے وجود کے بارے میں اکثر بحث ہوا کرتی تھی، محمد علی کی یہ عادت تھی کہ کانگریس کی قرارداد میں کسی نہ کسی عنوان سے خدا کا ذکر ضرور کر دیا کرتے تھے، مثلاً شکر کے طور پر یا دعا کے انداز میں، میں اس کے خلاف احتجاج کرتا تو وہ مجھ پر برس پڑتے، اور میری بے دینی پر مجھے خوب ڈانٹتے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ بعد میں وہ ہمیشہ مجھ سے کہتے تھے کہ چاہے تم ظاہری طور پر کچھ بھی کرو، لیکن دل سے تم مذہبی آدمی ہو، میں نے اکثر اس پر غور کیا کہ انکے اس

ان اشعار میں ایک بے چین ، مضطرب اور مجبور باپ کی کیسی دردناک گڑگڑاہٹ ہے ، لیکن باپ کی محبت مومن کی شان تفویض اور شان توکل کے نیچے دبی ہوئی ہے ، ابھی آمنہ بی بی کو کوناڈا کے اجلاس کے تین مہینے کے بعد جنت کو سدھارے ہی تھیں اور ابھی مولانا اپنی پیاری بیٹی کا ماتم کرہی رہے تھے کہ ترکی سے خبر پہنچی کہ وہاں کی نیشنل اسمبلی نے خلافت ختم کر دی ، اور ۴ر اپریل ۱۹۲۴ء کی درمیانی شب میں خلیفہ عبدالمجید اپنی دو بیویوں ، ایک بیٹی اور ایک بیٹے کے ساتھ ترکی سے نکل گئے ، اس حادثہ سے مولانا محمد علی پر کیا گذری ہو گی ، اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ، جس چیز کے لیے انھوں نے جان و مال کی بازی لگا رکھی تھی ، برطانوی حکومت سے ٹکر لیکر جیل کی سختیاں برداشت کی تھیں ، مسلمانوں کے مذہبی ضمیر کو بیدار کر کے انکو خون کی ہولی کھیلنے کے لیے آمادہ کیا تھا ، وہ ترکی میں ختم ہو کر رہ گئی ، وہ دیوانے ہو کر کسی جنگل کی طرف نکل کھڑے ہوتے ، تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی ، خود ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"خلافت کے اس قضیہ نے دل کی وہ حالت کر دی ہے کہ اگر خداوند کریم کا فضل شامل حال نہ ہوا تو نہ معلوم میری کیا کیفیت ہو جائے ۔"

(محمد علی کی ڈائری جلد اول ص ۱۵۳)

خلافت کا سقوط مولانا محمد علی ہی کی زندگی کا المیہ نہ تھا ، بلکہ پورے عالم اسلام کا ایک بڑا دردناک حادثہ تھا ، مسلمانوں کی تیرہ سو برس کی مذہبی ، سیاسی اور بین الاقوامی مرکزیت جاتی رہی ، وہ موتی کی لڑی جس میں وہ ایک دوسرے سے منسلک تھے ، بکھر کر رہ گئی ، وہ عیسائیوں کی سیاسی چالبازیوں سے ضرور مات کھا گئے ، لیکن اس میں خود ان کی نااہلی ، ناعاقبت اندیشی اور نا اتفاقی کو بھی بہت کچھ دخل تھا ،

اور قرآن غلط، اس قرآن کے حق میں شہادت اتنی قوی تھی کہ وہ اسے سو فی صدی صحیح تسلیم کرنے لگے، اس دلیل کی منطق اگرچہ واضح نہ تھی لیکن میں بحث سے گریز کر رہا تھا، اس کے بعد جو کچھ انھوں نے کہا اس پر واقعی مجھے بہت تعجب ہوا، کہنے لگے کہ میرا ایمان ہے کہ جو کوئی بھی قرآن کو بے تعصب ہو کر تلاش حق کے خیال سے پڑھے گا وہ اس کی صحت کا ضرور قائل ہو جائے گا، میں جانتا ہوں کہ باپو (گاندھی جی) نے قرآن کو غور سے پڑھا ہے، اور وہ ضرور اسلام کی حقانیت کے قائل ہونگے لیکن محض خود بینی کی وجہ سے اس کا اعلان نہیں کر سکتے۔" (میری کہانی حصہ اول ص ۲۰۴-۲۰۳)

اسی کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو نے جو کچھ لکھا ہے، وہ بہت ہی معنی خیز جملے ہیں، وہ لکھتے ہیں :-

"اپنے زمانۂ صدارت کے بعد محمد علی رفتہ رفتہ کانگریس سے دور ہونے لگے یا شاید ان کے الفاظ میں کانگریس ان سے دور ہونے لگی، یہ صورت بہت آہستہ آہستہ واقع ہوئی، (میری کہانی جلد اول ص ۲۰۴)

محمد علی کی صدارت کا زمانہ ان کے لیے بہت ہی غمناک رہا، ان کی صاحبزادی ان کی قید کے زمانہ سے بیمار تھیں جیل ہی سے یہ دردناک غزل لکھ کر بھیجی تھی۔

میں ہوں مجبور پہ اللہ تو مجبور نہیں
تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں

امتحاں سخت سہی پر دل مومن ہی وہ کیا
جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اسکو
نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

تیری قدرت سے خدایا تیری رحمت نہیں کم
آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں

میری اولاد کو بھی مجھ سے ملا دے یا رب
تو ہی کہہ دے یہ تری رحمت کا دستور نہیں

قوم کا غصہ مسلمانوں ہی پر اترے گا کہ ایک مسلمان میزبان نے اپنے مہمان کو مرجانے دیا، اور اس طرح ہندو مسلم منافرت کی آگ بجھنے کے بجائے اور بھڑکے گی۔ اس کا جواب گاندھی جی نے یہ دیا کہ اب تو خدا کے سامنے عہد کر چکا ہوں، مولانا نے تڑپ کر جواب دیا کہ جو عہد ہمارے مشورے کے بغیر کیا جائے وہ عہد ہی کب ہے، قسمیں تک جو جلد بازی اور بے سوچے سمجھے کھالی جاتی ہیں، قرآن نے جسے آپ بھی سچا اور خدائی کلام سمجھتے ہیں، ان کو لغو قرار دیا ہے اور ان کی پابندی لازمی نہیں رکھی ہے، یہ کہکر قرآن مجید کی آیت سنائی لا یؤاخذکم اللہ باللغو فی ایمانکم۔ گاندھی جی یہ سب مسکرا کر سنتے رہے، اور انھوں نے اپنا ارادہ ترک نہیں کیا، مولانا محمد علی نے پریشان ہوکر اپنی والدہ بی اماں کو بیچ میں ڈالا جو اس وقت بستر مرگ پر تھیں۔ انھوں نے گاندھی جی کو پیام بھیجا کہ تم مجھے اپنی ماں کے برابر سمجھتے ہو تو میرا حکم مانو اور اپنے اس ارادہ سے باز آجاؤ، میں آنے کے ذرا بھی قابل ہوتی تو زنانہ مکان سے خود تمھارے پاس کوٹھے پر آتی، گاندھی جی نے اس کا جواب کہلوایا، اگر میں اپنی سگی ماں کی اطاعت اس باب میں کر سکتا تو آپ کی بات ضرور مان لیتا۔

گاندھی جی نہ مانے اور انھوں نے برت شروع کر دیا، دو تین دن کے بعد وہ مولانا محمد علی کے گھر سے شہر کے باہر ایک کوٹھی میں لے جا کر رکھے گئے، مولانا محمد علی کے ساتھ مولانا شوکت علی ان کی دیکھ بھال میں لگے رہے، مولانا محمد علی نے گاندھی جی کی جان بچانے کے لیے سب ہی جماعتوں اور مذہبوں کے نمایندوں کی ایک کانفرنس طلب کی، ڈاکٹر راجندر پرشاد کا بیان ہے کہ اس میں کانگریس کے علاوہ ہندو، مسلم، عیسائی، سکھ، پارسی سب ہی جماعتوں کے نمایندے شریک ہوئے،

حوادثِ زمانہ کے وہ تھپیڑے بلکہ طمانچے کھاتے رہے، لیکن ان کو ہوش نہیں آیا، وہ اب پیچھے مڑکر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ خلافت کی مرکزیت کے خاتمہ کے بعد وہ محض سیاسی کھلونے بن کر رہ گئے ہیں، ان کو ایک لڑی میں پرونے والی کوئی قوت باقی نہیں رہی،

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار		لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

اس زمانہ میں ہندو مسلمان فسادات بھی برابر ہو رہے تھے، جن میں سب سے زبردست بلوہ صوبہ سرحد کے شہر کوہاٹ کا تھا، ایک ہندو شاعر نے ایک ایسی نظم شائع کی جو مسلمانوں کے لیے نہایت اشتعال انگیز تھی، اس پر بلوہ شروع ہوگیا جس میں دو دن کے اندر چھتیس ۳۶ آدمی مارے گئے، گاندھی جی اور مولانا شوکت علی دونوں کوہاٹ پہنچے، گاندھی جی کی نظر میں مسلمان قصوروار تھے لیکن مولانا شوکت علی نے ان سے اتفاق نہیں کیا، اور یہ پہلا اتفاق تھا کہ دونوں میں اختلاف ہوا، لیکن گاندھی جی نے اس کی تلافی مولانا محمد علی کے دہلی کی قیام گاہ پر ۲۱ روزہ کا برت رکھ کر کی، گاندھی جی نے یہ فیصلہ مولانا محمد علی کے مشورہ کے بغیر کیا، اس لیے ان کو بڑا تعجب ہوا، مولانا محمد علی کو یہ اقدام خودکشی کے مرادف معلوم ہوا، اس لیے گاندھی جی کے کمرے کے پاس پہنچکر پہلے تو روئے اور ان سے برت کا ارادہ ترک کرنے کو کہا لیکن وہ نہ مانے تو پھر غایتِ محبت و اخلاص سے کہنے لگے کہ ہم سے صلاح و مشورہ کے بغیر اتنا اہم قدم آپ نے کیسے اٹھالیا، دنیا کے سامنے تو یہ مشہور ہے کہ علی برادران کے مشورہ کے بغیر سانس بھی نہیں لیتے، پھر ہم لوگوں سے بالکل راز رکھ کر اتنی سخت کارروائی کر گزرے، یہ ہمارے ساتھ بدعہدی اور دغابازی ہوئی یا نہیں، یہ تو دھوکا دینا ہوا، ہمیں بدنام کرنا ہوا، پھر اگر یہ سخت مجاہدہ آپ نہ جھیل سکے اور آپ کی جان چلی گئی تو ساری ہندو

چرخہ، ہندو مسلم اتحاد، چھوت چھات، سوراج، آزادی، معاشرتی اصلاحات۔
اور قومی تعلیم وغیرہ پر جو کچھ کہا تھا، ان کی وضاحت مولانا محمد علی نے بہت ہی مؤثر
انداز میں کی، اور ان کی قیادت پر اپنے اعتماد کلی اور یقین کامل کا اظہار کیا۔
انھوں نے گاندھی جی کے سوادھرم اور سوراج کی زبردست مدافعت کی، اور یہ
بھی اعلان کیا کہ اگر اس کے سوادھرم اور سوراج میں مذہبی آزادی حاصل ہو
تو وہ ایسے ہی سوادھرم اور سوراج کو پسند کریں گے، خواہ اس کے چلانے والے
ہندو ہی کیوں نہ ہوں، لیکن ایسی حکومت میں جہاں مذہبی آزادی نہ ہو وہ انکے
لیے ناقابل برداشت ہو گی، خواہ وہ مسلمانوں ہی کی کیوں نہ ہو۔

گاندھی جی کی صدارت میں بھی ہندو مسلمان کے اختلافات ختم نہیں ہوئے
تو دہلی میں ایک ملاپ کانفرنس منعقد ہوئی جس میں مولانا محمد علی نے یہ تقریر کی:

"اگر کوئی ہندو میری بیوی کی بے عزتی کرے جب بھی میں اس پر ہاتھ نہیں
اٹھاؤں گا، میری ماں کو قتل کرے جب بھی میں عدالت میں مقدمہ نہیں لیجاؤنگا،
لیکن اس بدترین صورت حال کا علاج ہونا چاہیے، ذرا ذرا سی بات پر ہم کو
چاہیے کہ تلوار میان سے نہ نکال لیا کریں، ورنہ ہم آزادی کی منزل سے دور
ہوتے چلے جائیں گے، اور اغیار برابر مضحکہ اڑائیں گے، اور ہم پر زبان طعن
دراز کریں گے۔

لیکن اس قسم کی تقریر کا خاطر خواہ اثر نہ ہوا، فسادات میں اضافہ ہوتا
ہی رہا، ہندو مسلم تعلقات بد سے بدتر ہوتے گئے، ملک کی سیاسی فضا مکدر ہو گئی،
گاندھی جی جیسے انتھک کام کرنے والے رہنما بھی بد دل ہو گئے، اور یہ کہکر کہ اب میری

عیسائیوں کے سب سے بڑے پادری کلکتہ کے لارڈ بشپ بھی کانفرنس میں آئے، کئی دن تک بحث و مباحثہ رہا، آخر میں جھگڑوں کے جو اسباب ہوا کرتے تھے، مثلاً شدھی، گائے کی قربانی، مسجد کے سامنے باجا بجانا وغیرہ وغیرہ، ان سب ہی باتوں پر تجویزیں منظور ہوئیں، گاندھی جی کو اس سے اطمینان ہوا تو انھوں نے اپنا برت ختم کیا لیکن یہ سمجھوتہ بھی عارضی ثابت ہوا، فسادات کا خاتمہ نہیں ہوا، سنگھٹن، تنظیم، مسجد کے سامنے باجہ اور ذبیحہ گاؤ پر اختلافات بڑھتے گئے، محرم، دسہرہ اور ہولی پر فسادات کا ہو جانا ایک عام بات ہو گئی، نومبر ۱۹۲۴ء میں گاندھی جی نے ایک آل انڈیا پارٹیز کانفرنس طلب کی جس میں ہندو مسلمان کے جھگڑوں کو طے کرنے کی کوشش کی، لیکن یہ کانفرنس بھی کسی خاص نتیجہ پر نہ پہنچ سکی،

مولانا محمد علی کے بعد دسمبر ۱۹۲۴ء میں گاندھی جی بلگام میں کانگریس کے سالانہ اجلاس کے صدر ہوئے، انھوں نے جو صدارتی خطبہ دیا، وہ پنڈت جواہرلال نہرو کو پسند نہ آیا، وہ لکھتے ہیں :-

"۱۹۲۴ء میں کانگریس کا اجلاس بلگام میں ہوا اور گاندھی جی اس کے صدر ہوئے، ان کے لیے صدر ہونا گویا تنزل تھا، کیونکہ وہ تو عرصہ سے کانگریس کے مستقل صدر تھے، ان کا خطبۂ صدارت پسند نہیں آیا، مجھے تو یہ محسوس ہوا جیسے اس میں بالکل جان ہی نہ تھی۔ (میری کہانی جلد اول ص ۲۶)

اس کے برخلاف مولانا محمد علی نے اس خطبہ کی مدافعت "میں آزادی کی محبت کو چیلنج" کے نام سے جو انگریزی تحریر لکھی، وہ ان کی بہترین تحریروں میں شمار کیے جانے کے لائق ہے، گاندھی جی نے اپنے خطبۂ صدارت میں ترک موالات، عدم تشدد،

امیر علی دونوں جدہ میں جاکر پناہ گزیں ہوئے، وہاں شریف حسین خود تو حکومت سے علیحدہ ہوگئے، لیکن امیر علی کو دستوری ملک الحجاز بنادیا،

مولانا محمد علی کو یہ وحشت ناک خبریں ملیں تو وہ بےچین ہوگئے، اور انھوں نے خلافت کانفرنس کی طرف سے وہاں ایک وفد بھیجکر صحیح صورت حال معلوم کرنے کی کوشش کی، اور اس وفد کے صدر استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی ہوئے، اور اسکے ارکان مولانا عبدالماجد بدایونی اور مولانا عبدالقادر قصوری تھے، یہ وفد ۱۸ دسمبر ۱۹۲۴ء کو حجاز روانہ ہوا، جو ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے یہ پیام لیکر گیا کہ حجاز میں اسلامی شرع کے اصولوں پر جمہوری حکومت قائم ہو، جسمیں حجاز کی اندرونی آزادی کو پورے طور پر قائم رکھتے ہوئے تمام وہ مسائل جو حجاز کی اسلامی مرکزی حیثیت سے تعلق رکھتے ہوں مسلمانان عالم کے مرضی و مشورہ سے طے ہوں، اسکے لیے ایک ایسی اسلامی موتمر کا انعقاد ہو جس میں تمام اسلامی ممالک کے نمایندے شامل ہوں اور حجاز کی جمہوریت کے ساتھ شریف حسین اور اس کے خاندان کا کوئی تعلق نہ ہو، وغیرہ وغیرہ،

یہ وفد جدہ پہنچا تو اس وقت شریف حسین کے بیٹے امیر علی کی حکومت تھی، وفد نے امیر علی اور اسکے وزراء سے ملاقاتیں کیں، لیکن انھوں نے یہ بتایا کہ حجاز میں جمہوری حکومت ناممکن العمل ہے، جس کے لیے موتمر اسلامی کا انعقاد بےسود ہو، اسوقت سلطان ابن سعود سے جنگ جاری تھی، اسلیے وفد کو جدہ سے آگے جاکر ابن سعود سے ملاقات کرنے کی اجازت اس شرط پر دی گئی کہ ابن سعود امیر علی کو حجاز کا بادشاہ تسلیم کرلیں، ظاہر ہے کہ یہ شرط پوری نہیں ہوسکتی تھی، اسلیے وفد بڑی پریشانیوں کے ساتھ جدہ سے ہندوستان واپس آگیا،

ابن سعود اور امیر علی کی جنگ جاری تھی کہ ابن سعود نے یہ اعلان کیا کہ میں حجاز پر اپنی بادشاہت قائم کرنے نہیں جارہا ہوں بلکہ میں تو اس ارض پاک کو شریفیوں کے پنجۂ ظلم و ستم سے نجات دلانے کو

بات کوئی نہیں سنتا، سیاست سے علیحدہ ہوگئے اور اپنا وقت اصلاحی کاموں میں صرف کرنے لگے، ان کی سیاسی کنارہ کشی کے بعد کانگریس کی سیاست پر زیادہ تر سوراج پارٹی چھائی رہی، جس کی باگ موتی لال نہرو اور سی، آر، داس کے ہاتھ میں تھی، مولانا محمد علی گاندھی جی کی طرح تو جیلخانہ میں تھے، ہندو مسلم اتحاد سے مایوس نہیں ہوئے، انھوں نے مولانا شوکت علی کی مدد سے ہندو مسلم جھگڑوں کو ختم کرنے کے لیے شملہ میں ایک یونیٹی کانفرنس منعقد کرائی جس کی صدارت محمد علی جناح نے کی لیکن یہ بھی شورش بے مدعا ہو کر کچھ زیادہ مؤثر نہ ہو سکی،

اسی اثنا میں حجاز میں غیر معمولی سیاسی صورت حال پیدا ہو گئی، پہلی جنگ عظیم کے بعد وہاں حکومت برطانیہ کی سرپرستی میں شریف حسین کی حکومت قائم ہو گئی تھی، جو آل رسول میں تھے، وہ انگریزوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے، اس لیے عالم اسلام میں اچھی نظر سے نہیں دیکھے جاتے تھے، اسکے باوجود خلیفۂ اسلام بننے کی فکر میں لگے ہوئے تھے، اپنے خاص خاص نمایندوں کے ذریعہ سے مسلمانوں سے بیعت طلب کرتے، حجاج کو طرح طرح سے تنگ کرتے، بے گناہ مسلمانوں، حاجیوں اور حجازیوں کا خون کرنے میں تامل نہ کرتے، اور پورے جزیرۃ العرب کے بادشاہ بننے کی بھی کوشش تھی، اپنے ایک بیٹے امیر فیصل کو انگریزوں کا حلیف بنا کر عراق کا بادشاہ بنوا دیا، اور دوسرے بیٹے امیر عبد اللہ کو شرق اردن کا حکمراں تسلیم کرا لیا،

نجد کے سلطان ابن سعود سے انکی پرانی عداوت تھی، اس لیے اہل نجد کو حج کرنے سے روک دیا، جس سے حکومت نجد سے برابر چھیڑ چھاڑ جاری تھی، بالآخر دونوں میں باضابطہ جنگ شروع ہو گئی، تو ستمبر ۱۹۲۴ء میں نجدی فوجیں طائف میں داخل ہو گئیں، وہاں شریف حسین کے بیٹے امیر علی حکمراں تھے، وہ طائف چھوڑ کر مکہ معظمہ بھاگ گئے لیکن نجدی فوجیں مکہ معظمہ کی طرف بڑھیں تو شریف حسین اور

اقبال اور اسلامی فکر کی تشکیل جدید

ازجناب پروفیسر عبدالمغنی صاحب پٹنہ

(۲)

آخر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی فکر کی تشکیل جدید کے لئے اقبال کے مثبت تصورات کیا ہیں؟ اس کی وضاحت کے لئے خطبات اور منظومات سے کچھ مثالیں پیش کیجاتی ہیں۔

" اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یوں نظر آئے گا جیسے پیغمبر اسلام صلعم کی ذات گرامی کی حیثیت دنیائے قدیم اور جدید کے درمیان ایک واسطہ کی ہے، بہ اعتبار اپنے سرچشمۂ وحی کے آپ کا تعلق دنیائے قدیم سے ہے لیکن بہ اعتبار اس کی روح کے دنیائے جدید سے، یہ آپ ہی کا وجود ہے کہ زندگی پر علم و حکمت کے وہ تازہ سرچشمے منکشف ہوئے جو اس کے آیندہ رخ کے عین مطابق تھے، اس لئے اسلام کا ظہور جیسا کہ آگے چل کر پوری طرح پر ثابت کر دیا جائیگا، استقرائی عقل کا ظہور ہے، اسلام میں چونکہ نبوت اپنے معراج کمال کو پہونچ گئی اس لئے اسکا خاتمہ ضروری ہو گیا۔ اسلام نے خوب سمجھ لیا تھا کہ انسان ہمیشہ سہاروں پر زندگی نہیں بسر کر سکتا، اس کے شعور ذات کی تکمیل اسی طرح ہوگی کہ وہ خود اپنے وسائل سے کام لینا سیکھے، اسلام نے اگر دینی پیشوائی کو تسلیم نہیں کیا یا موروثی بادشاہت کو جائز نہیں رکھا یا بار بار عقل اور تجربے پر زور دیا، یا عالم فطرت اور عالم تاریخ

اٹھا ہوں، ذریات شریف کے نکل جانے کے بعد مسلمان جانیں اور ان کا کام، وہ جسے چاہیں
اپنا حکمراں منتخب کرلیں گے۔

اس اعلان کے بعد مولانا محمد علی کو ایسا معلوم ہوا کہ ان کی مدتوں کی آرزو پوری
ہوتی نظر آرہی ہے۔ یعنی شریف حجاز سے نکال دیے گئے تو وہاں اب بادشاہت نہ ہوگی،
بلکہ تمام اسلامی ممالک مل کر وہاں ایک شرعی جمہوریت قائم کریں گے، جہاں عالم اسلام
کی رائے اور شوریٰ سے حکومت ہوگی، مسلمانوں کی مرکزیت قائم ہوگی، اور
مسلمانوں کے روز روز کے جھگڑے ختم ہوجائیں گے، ترکوں نے خلافت ختم کردی تھی،
تو اس کا نعم البدل حجاز میں مل جائے گا۔ مولانا محمد علی کے دل کی آرزوئیں پھر
سرسبز اور شاداب ہونے لگیں، اور ان کو یقین ہوگیا کہ حجاز میں شریعت مطہرہ
قائم ہوکر رہے گی، اس لیے وہ سلطان ابن سعود کے طرفدار ہوگئے، لیکن جب
اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی کہ سلطان ابن سعود کی نجدی فوج نے مدینہ منورہ پر
حملہ کرکے گولہ باری کی تو مسجد نبوی کے ان گنبدوں کو بہت نقصان پہنچا جہاں
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مزار ہے، پھر تو مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ میں بہت اشتعال
پیدا ہوا، مولانا محمد علی اس حادثہ کو جنگ کا ایک اتفاقی حادثہ سمجھے، لیکن انکے مرشد مولانا عبدالباری
فرنگی محلی سلطان ابن سعود کے مخالف ہوگئے، اور انھوں نے خدام الحرمین قائم کرکے سلطان
ابن سعود کی مخالفت شروع کردی، انکے ہمخیال اور بہت سے لیڈر اور مسلمان ہوگئے،
مولانا محمد علی بڑی آزمائش میں مبتلا ہوگئے، ایک طرف انکے اپنے مخلصانہ جذبات تھے، دوسری طرف
انکے مرشد کے خیالات تھے لیکن وہ اپنے جذبات سے مغلوب ہوگئے اور مرشد سے اختلاف مول لے لیا اور جب وہ
اپنے مرشد کے شہر لکھنؤ آئے اور ایک جلسہ کو مخاطب کرنے کی کوشش کی تو اسمیں اتنا ہڑبونگ ہوا کہ وہ کچھ بول نہ سکے

(باقی)

اسلامی کلمہ کے جذبۂ اول نے انسان میں یہ نظر پیدا کی کہ عالم خارج کے متعلق اپنے محسوسات و مدرکات کا مطالعہ نگاہ تنقید سے کرے اور قوائے فطرت کو الوہیت کا رنگ دینے سے باز رہے جو قدیم تہذیبوں کا دستور تھا اس لئے مسلمانوں کو چاہئے کہ صوفیانہ واردات کو خواہ انکی حیثیت کیسی ہی غیر معمولی اور غیر طبعی کیوں نہ ہو ایسا ہی فطری اور طبعی سمجھیں جیسا دوسری واردات کو اور اس لئے ان کا مطالعہ بھی تنقید و تحقیق کی نگاہوں سے کریں"

(اسلامی ثقافت کی روح: تشکیل جدید الہیات اسلامیہ)

"...... بہ حیثیت مجموعی دیکھا جائے تو اس سلسلے میں دو بڑے تصور ہمارے سامنے آتے ہیں، دونوں تعلیمات قرآنی کا سنگ بنیاد ہیں۔

(۱) وحدت مبدأ حیات: "اور ہم نے تمھیں نفس واحد سے پیدا کیا" یہ ہے قرآن مجید کا ارشاد، مگر پھر یہ امر کہ زندگی کا ادراک بہ طور ایک وحدتِ نامیہ کے ہو جائے کچھ دیر ہی کے بعد ہوتا ہے، یوں بھی اس تصور کا نشو و نما اس امر پر موقوف ہے کہ اقوام و امم احوال عالم کی اصل رو میں داخل ہو جائیں، اسلامی فتوحات کی رفتار چونکہ بڑی تیز تھی اس لئے مسلمانوں کو یہ موقع جلد ہی میسر آگیا، اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام سے بہت پہلے عیسائیت نے بھی انسان کو مساوات کا سبق دیا لیکن یہ بات کہ نوعِ انسانی ایک جسم نامی ہے مسیحی روما کی سمجھ میں کبھی نہیں آئی۔ فلنٹ کہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ جو بات کسی عیسائی بادشاہ یا حکومت روما کے کسی مصنف کے حق میں کہی جا سکتی ہے، یہ ہے کہ اس کے ذہن میں وحدتِ انسانی کا ایک

کو علم انسانی کا سرچشمہ ٹھہرایا تو اسی لئے کہ ان سب میں یہی نکتہ مضمر ہے، اور یہ سب تصور خاتمیت ہی کے مختلف پہلو ہیں، لیکن اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو حیات انسانی اب واردات باطن سے جو بہ اعتبار نوعیت انبیا کے احوال و واردات سے مختلف نہیں، ہمیشہ کے لئے محروم ہو چکی ہے، قرآن مجید نے آفاق والنفس دونوں کو علم کا ذریعہ ٹھہرایا ہے، اس کا ارشاد ہے کہ آیات الہیہ کا ظہور محسوسات و مدرکات میں خواہ ان کا تعلق خارج کی دنیا سے یا داخل کی، ہر جگہ ہو رہا ہے، اس لئے ہم کو چاہئے کہ اس کے ہر پہلو کی قدر و قیمت کا پورا اندازہ کریں اور دیکھیں کہ اس سے حصول علم میں کہاں تک مدد مل سکتی ہے، غرض تصور خاتمیت سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ زندگی میں اب صرف عقل ہی کی کارفرمائی ہوگی، اور جذبات کے لئے اس میں کوئی جگہ نہ ہوگی، یہ بات نہ کبھی ہو سکتی ہے نہ ہونی چاہئے، اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ واردات باطن کی کوئی بھی شکل ہو ہمیں حق پہنچتا ہے کہ عقل اور فکر سے کام لیتے ہوئے اس پر آزادی کے ساتھ تنقید کریں، اس لئے کہ جب ہم نے ختم نبوت کو مان لیا تو گویا عقیدۃً یہ بھی مان لیا کہ اب کسی شخص کو اس دعوے کا حق نہیں ہے کہ اس کے علم کا تعلق مافوق الفطرت سرچشمے سے ہے، اس لئے ہمارے لئے اس کی اطاعت لازمی ہے، اس لحاظ سے دیکھا جائے تو خاتمیت کا تصور ایک طرح کی نفسیاتی قوت ہے جس سے اس قسم کے دعوؤں کا قلع قمع ہو جاتا ہے، اور جس سے مقصود یہ ہے کہ انسان کی باطنی واردات اور احوال کی دنیا میں بھی علم کے نئے نئے راستے کھل جائیں، بعینہٖ جس طرح

بیرونی کا یہ صاف و صریح اور واضح اقدام کہ کائنات کا تصور بطور ایک عمل تکوین کے کرنا چاہئے، یہ سب باتیں ابن خلدون کو ذہناً ورثے میں ملیں ...... یہ اسی کی ذہانت و فطانت تھی کہ قرآن مجید کی روح جو سرتاسر یونانیت کے منافی ہے حکمت یونان پر ہمیشہ کے لئے غالب آگئی۔" (ایضاً)

"...... بہ حیثیت ایک اصول عمل کے توحید اساس ہے حریت مساوات اور حفظ نوع انسانی کی، اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اسلام کی رو سے ریاست کا مطلب ہوگا ہماری یہ کوشش کہ یہ عظیم اور مثالی اصول زمان و مکان کی دنیا میں ایک قوت بن کر ظاہر ہوں، یہ گویا ایک آرزو ہے ان اصولوں کو ایک مخصوص جمعیت بشری میں مشہود دیکھنے کی، لہذا اسلامی ریاست کو انہی معنوں میں حکومت الہیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے، ان معنوں میں نہیں کہ ہم اس کی زمام اقتدار کسی ایسے خلیفۃ اللہ فی الارض کے ہاتھ میں دے دیں جو اپنے جور و استبداد پر پردہ ساڈالے رکھے ......"

دراصل ترک وطن پرستوں نے ریاست اور کلیسا کی تفریق کا اصول مغربی سیاست کی تاریخ افکار سے اخذ کیا، مسیحیت کی ابتدا کسی وحدت سیاسی یا مدنی کے طور پر نہیں ہوئی تھی، وہ ایک نظام رہبانیت تھا جو اس ناپاک دنیا میں قائم کیا گیا، اور جس کا امور مدنی میں کوئی دخل نہیں تھا، جہاں تک عملی زندگی کا تعلق ہے، وہ ہر معاملے میں رومی حکومت کے زیر فرمان رہی، مگر پھر جب آگے چل کر اسکو ریاست کا مذہب قرار دیا گیا تو ریاست اور کلیسا نے دو حریف قوتوں کی شکل اختیار کر لی اور

مجرد تصور موجود تھا، مگر پھر وہی عہد سے لے کر اب تک صورت حالات کچھ ایسی ہے کہ یہ تصور یورپ کے دل و دماغ میں جاگزیں نہ ہو سکا، بلکہ اس کے برعکس وطنی قومیت کے نشو و نما سے جس کا سارا زور نام نہاد قومی خصائص پر ہے، وسیع انسانیت کا جو عنصر مغربی ادب اور فن میں کام کر رہا تھا، برابر دب رہا ہے، مگر عالم اسلام کی تاریخ اس سے کس قدر مختلف ہے، یہاں وحدت انسانی کا خیال نہ محض کوئی فلسفیانہ تصور تھا، اور نہ شاعرانہ خواب، بلکہ روزمرہ زندگی کا ایک زندہ اور قائم عنصر جو غیر محسوس طریق پر اپنا کام کرتا رہا۔

(۲) اس امر کا گہرا احساس کہ زمانہ ایک حقیقت ہے اس لئے زندگی کا یہ تصور کہ وہ عبارت ہے ایک مسلسل اور مستقل حرکت سے، ابن خلدون کے نظریۂ تاریخ میں ہماری دلچسپی کا خاص مرکز بن جاتا ہے، اور فلنٹ بھی بجا طور پر اس کی تعریف میں رطب اللسان ہے …… یہ تصور بڑا اہم ہے، کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ تاریخ چونکہ زمانے کے اندر ایک مسلسل حرکت ہے جس سے یہ ماننا لازم آتا ہے کہ اس کی نوعیت فی الواقع تخلیقی ہے ……

اسلامی تہذیب و ثقافت کی تاریخ میں اس تصور کے ذہنی سوابق کی طرف ہم اس سے پہلے اشارہ کر آئے ہیں، قرآن مجید کا یہ ارشاد کہ اختلاف لیل و نہار کو حقیقت مطلقہ کی ایک آیت تصور کرنا چاہئے جس کی ہر لحظہ ایک نئی شان ہے، اسلامی مابعد الطبیعیات کا یہ رجحان کہ زمانہ ایک خارجی حقیقت ہے ابن مسکویہ کا یہ نظریہ کہ زندگی عبارت ہے ایک ارتقائی حرکت سے اور

اسلامی صداقتوں کی عالمگیر نوعیت سے بھی ہمارے قومی، اخلاقی اور اجتماعی مقاصد کی دنیا میں گونا گونی پیدا ہو جاتی ہے، چنانچہ اس بڑے ہی با بصر اہل قلم کا خیال ہے کہ تہذیب جدید کو جس کی بنا وطنی انانیت پر ہے، انسان کے حدود وحشت و بربریت ہی کی ایک شکل تصور کرنا چاہیئے، وہ نتیجہ ہے ایک حد سے زیادہ نشو و نما یافتہ صنعیت کا اور اس لئے محض ایک ذریعہ انسان کی ابتدائی جبلتوں اور رجحانات کی تسکین کا، سعید حلیم پاشا کو افسوس ہے کہ اسلام کے اخلاقی اور اجتماعی مقاصد بھی بعض ایسے توہمات کے زیر اثر جو امم اسلامیہ کے اندر زمانۂ قبلِ اسلام سے کام کر رہے تھے، غیر اسلامی شکل اختیار کرتے چلے گئے، ان کے مقاصد بھی تو اسلامی بہت کم ہیں، عجمی، عربی یا تمہ کی زیادہ نہ توحید کا صاف ستھرا اور پاکیزہ چہرہ کفر و شرک کے غبار سے محفوظ رہ سکا نہ قید مقامی کی روز افزوں پابندیوں نے اسلام کے اخلاقی مقاصد کی غیر شخصی اور عالمگیر نوعیت کو قائم اور برقرار رہنے دیا، لہٰذا اب کوئی چارۂ کار ہے تو یہ کہ ہم اس قشر کو جو سختی کے ساتھ اسلام پر جم گیا ہے اور جس نے زندگی کے ایک ایسے مطمح نظر کو جو سر تا سر حرکت تھا جامد اور مبتذل بنا رکھا ہے توڑ ڈالیں اور یوں حرکت، مساوات اور حفظ و استحکام انسانیت کی ابدی صداقتوں کو پھر سے دریافت کرتے ہوئے اپنے سیاسی، اخلاقی اور اجتماعی مقاصد کی تعبیر ان کے حقیقی، صاف و سادہ اور عالمگیر رنگ میں کریں......" (ایضاً)

"......بہرحال، ہم اس تحریک کا جو حریت اور آزادی کے نام پر عالمِ اسلام میں پھیل رہی ہے دل سے خیر مقدم کرتے ہیں، لیکن یاد رکھنا

ان کے حدود و فرائض کی تعین و تحدید میں بحث و نزاع کا ایک غیر مختتم سلسلہ شروع ہو گیا لیکن اسلام میں یہ صورتِ حال پیدا ہی نہیں ہو سکتی تھی اس لئے کہ اسلام کا ظہور بطور ایک اجتماع مدنی کے ہوا اور قرآن مجید کی بدولت اسے وہ صاف و سادہ قانونی اصول مل گئے جن میں جیسا کہ تجربے نے آگے چل کر ثابت بھی کر دیا یہ زبردست امکانات موجود تھے کہ رومیوں کی دوازدہ الواح کیطرح انھیں بھی بذریعہ تعبیر و تاویل مزید وسعت دیجا سکے، اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ترک وطن پرستوں کا نظریۂ ریاست بڑا غلط اور گمراہ کن ہے، کیونکہ اس کی رو سے یہ ماننا لازم آتا ہے کہ اسلام کے اندر بھی کوئی ثنویت کام کر رہی ہے، حالانکہ اسلام میں اسکا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں۔"

(الاجتہاد فی الاسلام، تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ)

اس کے برعکس حزبِ اصلاحِ مذہبی نے، جس کی زمامِ قیادت سعید حلیم پاشا کے ہاتھ میں تھی، اس بنیادی حقیقت پر زور دیا کہ اسلام میں عینیت اور اثباتیت دونوں کا امتزاج بڑی خوبی سے ہو چکا ہے، یوں بھی اس نے حریت، مساوات اور استحکامِ انسانیت کی ابدی صداقتوں کو ایک وحدت میں سمو دیا اس لئے اسکا کوئی وطن نہیں، جسطرح ریاضی نہ انگریزی کے ساتھ نہ کیمیا فرانسیسی کے ساتھ، وزیر اعظم ترکی کے نزدیک نہ تو کسی ترکی اسلام کا وجود ہے، نہ عربی، ایرانی اور ہندی اسلام کا، مگر جس طرح علمی حقائق کی عالمگیر نوعیت سے ہر قوم کے اندر علم و حکمت کی پرورش اپنی مخصوص قومی شکل میں ہوتی رہتی ہے اور وہ سب مل کر ہمارے علمی سرمائے کی نمایندگی کرتی ہیں، ایسے ہی

قدم بڑھا سکیں۔" (ایضاً)

...... عالم انسانی کو آج تین چیزوں کی ضرورت ہے، کائنات کی روحانی تعبیر، فرد کا روحانی استخلاص اور وہ بنیادی اصول جن کی نوعیت عالمگیر ہو، اور جن سے انسانی معاشرے کا ارتقاء روحانی اساس پر ہوتا رہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ جدید یورپ نے اسی نہج پر متعدد مثالی نظامات قائم کئے لیکن تجربہ کہتا ہے کہ جس حق وصداقت کا انکشاف عقل محض کی وساطت سے ہو اس سے ایمان ویقین میں وہ حرارت پیدا نہیں ہوتی جو وحی وتنزیل کی بدولت ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ عقل محض نے انسان کو بہت کم متاثر کیا، برعکس اس کے مذہب کو دیکھئے تو اس نے افراد میں اضافۂ مراتب کیساتھ ساتھ معاشروں تک کو بدل ڈالا، لہذا یورپ کے مثالی فلسفہ کو کبھی یہ درجہ حاصل نہیں ہوا کہ زندگی کا کوئی موثر جزو بن سکے اور اس لئے اب حالت یہ ہے کہ یورپ کی منافرزدہ خودی باہم دگر حریف جمہوریتوں کی شکل میں جن کا مقصد ہی یہ ہے کہ دولت مندوں کی خاطر ناداروں کا حق چھینیں، اپنے تقاضے پورے کر رہی ہے۔ یقین کیجئے یورپ سے بڑھ کر آج انسان کے اخلاقی ارتقاء میں رکاوٹ اور کوئی نہیں، برعکس اس کے مسلمانوں کے نزدیک ان بنیادی تصورات کی اساس چونکہ وحی وتنزیل پر ہے جس کا صدور ہی زندگی کی انتہائی گہرائیوں سے ہوتا ہے۔ لہذا وہ اپنی ظاہری خارجیت کو ایک اندرونی حقیقت میں بدل دیتی ہے، ہمارے لئے تو زندگی کی روحانی اساس ایمان ویقین کا معاملہ ہے جس کی خاطر ایک غیر

چاہئے، آزاد خیالی کی یہی تحریک اسلام کا نازک ترین لمحہ بھی ہے، آزاد خیالی کا رجحان بالعموم تفرقہ اور انتشار کی طرف ہوتا ہے، لہذا نسلیت اور قومیت کے یہی تصورات جو اس وقت دنیائے اسلام میں کارفرما ہیں اس وسیع مطمح نظر کی نفی بھی کر سکتے ہیں جس کی اسلام نے مسلمانوں کو تلقین کی ہے، پھر اس کے علاوہ یہ بھی خطرہ ہے کہ ہمارے مذہبی اور سیاسی رہنما حریت اور آزادی کے جوش میں، بشرطیکہ اس پر کوئی روک نہیں عاید کی گئی، اصلاح کی جائز حدود سے تجاوز کر جائیں۔ ہم کچھ ویسے ہی حالات سے گذر رہے ہیں جن سے کبھی پروٹسٹنٹ انقلاب کے زمانے میں یورپ کو گذرنا پڑا تھا، لہذا ہمیں چاہئے کہ ان نتائج کو فراموش نہ کریں جو لوتھر کی تحریک سے مترتب ہوئے، یوں بھی جب تاریخ کا مطالعہ زیادہ گہری نظر سے کیا جائے تو اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ تحریک اصلاح دراصل ایک سیاسی تحریک تھی جس سے بحیثیت مجموعی یورپ کے لئے کوئی نتیجہ پیدا ہوا تو یہ کہ مسیحیت کے عالمگیر اخلاق کی جگہ قومی اخلاقیات کے مختلف نظامات نے لی، لیکن قومی اخلاقیات کا انجام ہم نے جنگ عظیم کی شکل میں دیکھ لیا جس سے ان دونوں متصادم نظامات میں مفاہمت کے بجائے صورت حالات اور بھی خراب ہو گئی. لہذا عالم اسلام کی قیادت اس وقت جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے ان کا فرض ہے کہ یورپ کی تاریخ سے سبق لیں۔ انھیں چاہئے کہ اپنے دل و دماغ پر قابو رکھتے ہوئے اول یہ سمجھنے کی کوشش کریں، کہ بحیثیت ایک نظام مدنیت اسلام کے مقاصد کیا ہیں اور پھر آگے

کوئی نئی تشکیل افکار نہیں دینا چاہتے تھے، بلکہ جو بنیادی اصول حیات قرآن حکیم نے تیرہ صدیوں پیشتر دنیا کو دئے تھے انھی کا عملی احیا اور اطلاق اپنے دور میں کرنا چاہتے تھے، چنانچہ عالم انسانیت کے متعلق اسلام کی بنیادی ہدایات کو وہ اپنے تمام افکار کا مرکز و مرجع قرار دیتے تھے۔ فکر اسلامی کی تشکیل جدید کے سلسلے میں اقبال نے ترکوں کی تحریک کا جو تنقیدی تجزیہ خطبات میں کیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اقبال مغرب زدہ تجدد کے خلاف تھے اور اس کو ملت اسلامیہ اور انسانیت عامہ دونوں کے لئے سخت مضر سمجھتے تھے،

۲۔ اقبال کے افکار کی اصل نوعیت سمجھنے کے لئے اس بات پر پوری طرح غور کرنے کی ضرورت ہے کہ انھوں نے ان افکار کا اطلاق عملی مسائل پر کس طرح کیا ہے خطبات کے باب الاجتہاد فی الاسلام کے مباحث سے ذیل کے حقائق کی وضاحت ہوتی ہے:

الف۔ قرآن کو اقبال تمام احکام شریعت کے لئے آخری سند تصور کرتے ہیں اور انکا خیال ہے کہ کتاب اللہ نے حیات و کائنات کی بنیادی و عمومی صداقتوں کی ہمیشہ کے لئے تعیین کر دی ہے، اسلئے مسائل حیات کے حل کے لئے جب کبھی کوئی اجتہاد ہوگا تو قرآن کی مقرر کردہ حدود کے اندر ہی ہوگا، اور انسانی زندگی کا کوئی نقشہ بھی ہو اسی وقت معتبر ہوگا جو قرآن کے تجویز کردہ فکر و عمل کے مطابق ہو۔

ب۔ حدیث ماخذ قانون اسی شکل میں ہو سکتی ہے کہ اس کو جرح و تعدیل کے بعد اور دلیل و حجت کے بعد قبول کیا جائے، البتہ غیر قانونی امور، مثلاً قرآن کی سورتوں کی ترتیب کے سلسلے میں حدیث ہی معیار فیصلہ ہوگی، اس کے لئے حدیث کی حجت کافی ہے۔

ج۔ قانونی اور فقہی امور میں احکام کے استخراج اور مسائل کے استنباط کا حق ان متاخر علماء کو جنکی علمی و دینی قابلیت و بصیرت مسلم ہے اسی طرح ہے جسطرح علمائے متقدمین

تعلیم یافتہ مسلمان بھی برضا و رغبت اپنی جان دے دیگا۔ پھر اسلام کے اس بنیادی تصور کے پیش نظر کہ وحی کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہے لہذا اب کوئی ایسی وحی نہیں کہ ہم اس کے مکلف ٹھہریں، ہماری جگہ دنیا کی ان قوموں میں ہونی چاہئے جو روحانی اعتبار سے سب سے زیادہ استخلاص حاصل کر چکی ہیں۔ شروع شروع کے مسلمان تو جنہوں نے ایشیا پہ قبل اسلام کی روحانی غلامی سے نجات پائی تھی اسلام کے اس بنیادی تصور کی ٹھیک ٹھیک حقیقت سمجھنے سے قاصر رہے، لیکن ہمیں چاہئے آنا لینا اس موقف کو سمجھیں اور اپنی حیات اجتماعیہ کی از سر نو تشکیل اسلام کے بنیادی اصولوں کی رہنمائی میں کریں تاکہ آیندہ اسکی وہ غرض و غایت جو ابھی تک صرف جزوی ہمارے سامنے آئی ہے یعنی اس روحانی جمہوریت کا نشو و نما جو اس کا مقصود و منتہا ہے تکمیل کو پہنچ سکے،، (ایضاً)

منظومات میں تشکیل جدید پر روشنی ڈالنے والی بے شمار تخلیقات میں سے چند یہ ہیں!

تقدیر، توحید، مسلمان کا زوال، معراج، ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام سلطانی، صوفی سے، تصوف، ہندی اسلام، پستی کردار، مدنیت اسلام، امامت، نکتہ توحید، نبوت، مرد مسلمان، آزادی، احکام الہٰی، مقصود مغربی تہذیب، خودی کی تربیت، آزادی فکر، اشتراکیت۔ (ضرب کلیم)

یہ اور اس قسم کی بہت سی شاعرانہ سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں،

۱۔ اسلامی فکر کی تشکیل جدید کا جو تصور اقبال کے پیش نظر تھا وہ اسلامی نظریۂ حیات کے احیاء سے مختلف کوئی چیز نہیں تھی۔ تاکہ عصر حاضر کے انسان کو اسلام کے نام پر

حیات کو رائج کیا جائے ،

۴ ۔ اسلامی نظریۂ کائنات ایک مرکب اور متحرک تصور ہے جو ارتقا پذیر کائنات کے ہر مرحلے میں انسان کے جدید ترین احساسات کی ترجمانی اور تنظیم اسطرح کر سکتا ہے ، کہ انفس و آفاق کے متعلق کی جانے والی تمام سائنسی تحقیقات کو اپنے اندر سمولے اور انکا بہترین اطلاق مسائل حیات پر کرے ، یہ ایک جامع اور ترقی پذیر نظام فکر ہے ، جو اپنی الہیاتی اور روحانی بنیادوں پر قایم رہتے ہوئے ہر دور کی مادی ترقیات کی صحیح سمت متعین کر سکتا ہے ،

۵ . اسلام کی جامعیت کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ عملی و تجربی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ قلبی واردات اور ذہنی تصورات کا بھی محرک ہے ، اس میں عقل اور عشق دونوں کا متوازن امتزاج اور روحانی و مادی کوائف کا کامل اعتدال ہے ، اسلام دنیا و آخرت اور دین و سیاست کے درمیان کوئی تفریق روا نہیں رکھتا ، اور فرد و معاشرہ کے مابین مکمل موافقت پیدا کرنا چاہتا ہے اسمیں مذہب اور سیاست دونوں ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں اور ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں ،

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی	سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں	کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا	چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیری
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی	ہوس کی امیری ہوس کی وزیری
دوئی ملک و دین کیلئے نامرادی	دوئی چشم تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا	بشیری ہے آئینہ دار نذیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی	کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

(بال جبریل)

کو تھا، کیونکہ اجتہاد کا دروازہ شرعی طور پر کھلا ہوا ہے اور ہر دور کے فقہاء علما کو حق ہے کہ وہ خلوص و دیانت کے ساتھ عصری مسائل کا حل شرعی ہدایات کی روشنی میں ڈھونڈھنے کی کوشش کریں، قیاس و اجماع کے اصول ہر زمانے کے لئے یکساں قابل عمل ہیں۔

اس سے ظاہر ہوگا کہ اقبال نے نہ صرف نظام شریعت کیخلاف کسی مسئلے میں کوئی اقدام نہیں کیا، بلکہ اس دور کے تجدد پسندوں نے ترکی وغیرہ میں جو اقدامات کئے ہیں ان پر سخت تنقید و تردید کی،

۳۔ اقبال نے تشکیل جدید کا جو نہج تجویز کیا ہے اس کا اہم پہلو یہ ہے کہ وہ یونانی فکر اور اس پر مبنی مغربی نظام فکر کو قرآنی و اسلامی نظریے کے بالکل متضاد سمجھتے ہیں، انکے نزدیک یونانی فکر محض خیالی ہے اور اسلامی فکر حقیقی ہے، اول الذکر طلسم خیالات میں اسیر ہے اور ثانی الذکر حقائق زندگی پر قائم ہے، یونانی فلسفہ تجریدی ہے قرآنی تصور تجربی

حقائق ابدی پر اساس ہے اس کی
یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسم افلاطوں

(مدنیت اسلام، ضرب کلیم)

اس لئے یونانی فکر، قرآنی فکر کے مقابلے میں فروتر ہے، اور عالم انسانیت کی تشکیل نو کے لئے اسلامی فکر ہی موزوں و مفید ہے، اس حقیقت کے پیش نظر اقبال نے بھی اعلان کیا ہے کہ جدید تہذیب میں یگانہ تجربیت کے جو عناصر پائے جاتے ہیں وہ صرف اسلام اور مسلمانوں کی دین ہیں، مگر کلیسائی اخلاق نے مغرب میں ان عناصر کو بھی مسخ کر کے رکھ دیا اور مادی ترقی نے اس بے دینی و بے اعتدالی کے باعث، عالم انسانیت کو تباہی کے دہانے پر کھڑا کر دیا ہے، اب اسے نجات کی صورت صرف یہ ہے کہ دنیا میں اسلامی نظریۂ

اسلامی فکر کے اس پیکر کو اقبال نے "مرد کامل" یا "مردِ مومن" سے تعبیر کیا ہے اور اس کی تعریف و توصیف میں بکثرت اشعار کہے ہیں، "مسجد قرطبہ" کے بند ۴، ۵ اور ضربِ کلیم کی نظم "مردِ مسلمان" اس شخصیت کا نہایت ولولہ انگیز تعارف ہے، یہ شخصیت مثالی اوصاف کی حامل ہے لیکن یہ کوئی خیالی تصور نہیں، اور عالمِ واقعہ میں اس کا ظہور نہ صرف ماضی میں ہو چکا ہے، بلکہ ہر دور میں ہو سکتا ہے، کمال کا مطلب حدودِ انسانیت سے ماورا ہو جانا نہیں بلکہ ان حدود کے اندر انسانیت کے امکانات کو عروج تک پہنچانا ہی کمال ہے۔

۹۔ "مردِ مومن" کا کوئی تعلق ڈارون کے "بقائے اصلح" سے نہیں ہے، اگرچہ اقبال نے ابن مسکویہ کے حوالے سے خطبات میں ارتقائے حیات کا ذکر کیا ہے، لیکن کسی تحریر سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ کائنات کے تخلیق نظریے کے مقابلے میں اس مادی ارتقا کے قائل تھے جو ڈارون سے منسوب کیا جاتا ہے، اس کے برخلاف اقبال کی نظم و نثر سے اس کی شہادت ملتی ہے کہ وہ الوہی تخلیق ہی پر ایمان رکھتے تھے، ارتقا کے جو تصورات ان کے یہاں پائے جاتے ہیں وہ تخلیقی ارتقا کی طرف اشارہ کرتے ہیں، میکانکی کی طرف نہیں، کائنات بلاشبہ اقبال [illegible] ایک متحرک اور ترقی پذیر وجود ہے لیکن مشیت [illegible] اور ایک الوہی منصوبے کے مطابق اور اس کی قوت محرکہ روح ہے، نہ کہ مادہ، ارتقا کے سلسلے میں اقبال کا ایک تصور یہ بھی ہے کہ مارکس کی معاشی جدلیات کے برعکس تاریخ کی حرکت خیر و شر کی رزم آرائی پر مشتمل ہے، اور مومن ایسی صالح شخصیت کا مالک ہے، جو شر کے مقابلے میں خیر کی علمبردار ہے:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی (وارتقا: بانگِ درا)

۶۔ اسلام انسانیت عامہ کا پیغام پیش کرتا ہے، اس کے اصول آفاقی ہیں، رنگ ونسل و وطن اور فرقہ وطبقہ کی تفریق سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، یہ ایک نظریاتی تحریک ہے، روایتی مذہب نہیں۔ ایک نظام فکر وعمل ہے، رسوم واوہام کا ادارہ نہیں۔

عالم حریت کا دکھایا تھا جو خواب اسلام نے
اے مسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ

(دنیائے اسلام، خضر راہ)

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا

(طلوعِ اسلام)

تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود
اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم

۷۔ انسانی ترقی کی کوئی حد انسانیت کے سوا نہیں، خدا کی خدائی اور اپنی بندگی کی حد میں مادی و روحانی ترقیات کے بہت سے امکانات اب بھی انسانوں میں مضمر ہیں، خلافتِ الٰہی کے قرآنی تصور نے اس کی قوتوں اور فضیلتوں کو انتہائی حد تک بڑھا دیا ہے، مستقبل کے انسان کو ارتقا کے بہت سے ایسے مدارج طے کرنے ہیں جنکا تصور بھی مادہ پرست سائنس داں نہیں کرسکتے، معراجِ محمدیؐ نے انسانی ترقی کا آخری سنگ میل نصب کر دیا ہے۔

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفےٰ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

(پوری غزل — بالِ جبریل)

ازل اس کے پیچھے، ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے، نہ حد سامنے

(ساقی نامہ)

یعنی اقبال نے اسلامی اصولوں کی ترجمانی عصر حاضر کی اصطلاحات میں کی ہے اسی لئے ہم اس کو اسلامی فکر کی تشکیل جدید کہتے ہیں، یہ ہو فکر اقبال کے نظریات تصورات کی بنیادی نوعیت ممکن ہے بعض میلانات کے اعتبار سے فکر اقبال کے کچھ پہلو ایسے بھی ہوں جو خالص اسلامی نقطۂ نظر سے محل نظر ہوں، لیکن انکا تعلق اسلام کے بنیادی اصولوں سے نہیں ہے، بلکہ فروعی ہیں جنہیں تعبیر و تشریح کے اختلافات ہر دور میں رہے ہیں۔

ہماری نئی کتاب

حیاتِ سلیمان

حیات سلیمان جس کا شایقین اور قدر دانان دار المصنفین کو انتظار تھا بحمد اللہ چھپ کر شائع ہو گئی، یہ محض جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی۔۔۔۔۔ سادہ سوانح عمری ہی نہیں ہے، بلکہ انکے گوناگوں مذہبی، علمی، قومی، ملی، سیاسی حالات و واقعات اور کارناموں کا ایک دلاویز مرقع ہے، جس میں سید صاحب کے دور کی جو نصف صدی سے زیادہ تک محیط تھا، تمام ملی و قومی و سیاسی علمی و ادبی و لسانی تحریکوں مثلاً ہنگامہ مسجد کانپور، تحریک خلافت، تحریک ترک موالات، تحریک جنگ آزادی، مسئلہ ملوکیت حجاز، انہدام مقابر و مآثر حجاز وغیرہ کی بھی ضمناً تفصیل آگئی ہے، اسی کے ساتھ دار المصنفین جو سید صاحب کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، اس کی تاسیس اور سال بہ سال اسکی ترقی کی روداد کے ساتھ ترک قیام دار المصنفین، سفر بھوپال، ہجرت پاکستان اور پھر بھوپال اور پاکستان کے چند سالہ قیام کے دوران میں انھوں نے جو علمی خدمات انجام دیں پھر مختلف وفود کے رکن و صدر کی حیثیت سے پہلے سفر یورپ پھر سفر حجاز پھر سفر افغانستان وغیرہ کی بہت مفصل روداد بھی سید صاحب کے خطوط اور تحریروں کی روشنی میں قلمبند ہو گئی ہے، یہ کتاب اپنے اسلوب طرز و انشاء کے لحاظ سے بالکل حیات شبلی کا مثنیٰ ہے، ویسی ہی دلکش، دلچسپ اور لذیذ، مؤلفہ شاہ معین الدین احمد ندوی، قیمت مجلد عہ / غیر مجلد

قیام خیر کیلئے اسی کائناتی جد وجہد کو اقبال جہاد کہتے ہیں اور اسی کے لئے قوت و شوکت کے حصول کا پیغام دیتے ہیں،

۱۰۔ مرد مومن کی خودی سلطانی اور تعمیری ہوتی ہے، اور غیر مومن کی ناسلطانی اور تخریبی ہوتی ہے، سلطانی خودی جب بیدار اور فعال ہوتی ہے تو "تقدیر" بھی اس کی راہ میں روک نہیں بنتی اور بندے کا ارادہ خدا کے ارادے کا پابند ہو جاتا ہے، اس لئے اس کی تدبیر اور تقدیر کے درمیان عملاً کوئی فرق نہیں رہ جاتا، وہ صرف احکام خداوندی کی پیروی کرتا ہے، اور اس کو پورا اعتقاد ہوتا ہے کہ "کارساز ما بہ فکر کار ما"!

تقدیر کے پابند نباتات وجمادات — مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

(احکام الٰہی: ضرب کلیم)

اس مقام پر پہنچ کر مومن کے "ارادے" "قدرت کے مقاصد کا عیار" بن جاتے ہیں اور "خدا کی تقدیر" مومن کے "ارادوں" میں "پنہاں" ہو جاتی ہے، اور قدرت کے مقاصد ہی کو حاصل کرنے کے لئے مومن سلطنت و حکومت کا قیام عمل میں لاتا ہے اور اس اقتدار کو منشائے الٰہی کے مطابق استعمال کر کے "ظل سبحانی" کے درجہ پر فائز ہو جاتا ہے،

یہی مقام ہے مومن کی قوتوں کا عیار — اسی مقام سے آدم ہے ظل سبحانی

(سلطانی: ضرب کلیم)

اسلامی فکر کی تشکیل جدید کے سلسلے میں اقبال کے تصورات کے متعلق وثوق کیساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان میں کوئی بات اسلامی مسلمات کے خلاف نہیں ہے، یہ ضرور ہے کہ اقبال نے کسی خاص مکتبِ فکر کی تقلید کرنے کی بجائے [illegible] کیا ہے اور اپنے غور و فکر کے نتائج ایک خاص اسلوب سے پیش کئے [illegible] انکا پیش کردہ یہ نظام فکر، اسلامی مسلمات پر مبنی ہونے کے باوجود جدید ترین انسانی تحقیقات پر مشتمل [illegible]

(حضرت نظام الدین اولیاؒ (متوفی ۱۳۲۵ء)

شہاب الدین امام، علاء الدین نیلیؒ، شمس الدین یحییٰ متوفی ۱۳۴۷ء، ۱۳۲۵ء
فخر الدین زرادی، قاضی محی الدین کاشانی متوفی ۱۳۱۹ء، مولانا مغیث الدین متوفی
نصیر الدین چراغ دہلوی متوفی ۱۳۵۶ء

رکن الدینؒ،

مسعود بکؒ متوفی ۱۴۳۲ء)

مسعود بکؒ کا تذکرہ معاصر ماخذوں میں بہت کم ملتا ہے، درویشوں کے ملفوظات میں کہیں کہیں نام نظر آتا ہے، بعد کے تذکروں میں معارج الولایت، گلزار ابرار اور اخبار الاخیار میں انکا تذکرہ کسی قدر تفصیل سے ہے، متاخرین میں تکملہ سیر الاولیاء مصنفہ خواجہ گل محمد احمد پوری (مطبوعۂ دہلی، ۱۳۱۷ء) میں کچھ واقعات ملتے ہیں، شعراء کے فارسی تذکروں میں انکا کہیں ذکر نہیں ہے،

ان کے نام کے بارے میں اختلاف[4] ہے، اصل نام شیر خاں تھا مسعود بک کے نام سے مشہور ہوئے، بخارا کے قریب ایک مقام بک سے انکا تعلق تھا۔ سلطان فیروز شاہ تغلق کے عزیزوں[5] میں تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۶) [1] گلزار ابرار کے مؤلف نے ایک موقع پر منصور زماں مسعود بک لکھا ہے، دیکھئے ترجمہ، ص ۲۱۴، [2] ترجمہ، ص ۲۱۴، [3] تفصیل کے لئے دیکھئے؛

Ency. of Islam vol. ii (London-1965-67) P 51.

[4] گلزار ابرار، ترجمہ، ص ۴۹۲ میں مسعود بیگ، تکملہ سیر اولیاء، ص ۲۴ میں خواجہ مسعود بکؒ اور قاموس المشاہیر جلد دوم، ص ۲۱۳ میں مسعود خواجہ درج ہے، [5] مبلغ الرجال (مخطوطہ) کے مؤلف نے خواہرزادہ سلطان الشہید فیروز شاہ لکھا ہے، مولانا آزاد لائبریری شعبۂ مخطوطات حبیب گنج کلکشن، فارسیہ نمبر ۱۹۱، ص ۲۵ ب،

مسعود بکؒ

ہندوستان کے حسین بن منصور حلاجؒ

از جناب لطاف حسین خاں صاحب شروانی اسلامیہ کالج اٹاوہ

مسعود بکؒ ہندوستان کے ایک مشہور اہل دل شاعر گذرے ہیں، یہ شیخ رکن الدینؒ ابن شہاب الدین امامؒ سے بیعت تھے، انکو حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ سے بھی عقیدت تھی، اپنے ایک شعر میں اسکا اظہار کیا ہے، ؎

شاہنشاہے جہانِ لطافت نصیر دیں — کو داد حسن از رخِ خود ایں دیار را

پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی نے Ency. of Islam میں اپنے ایک مقالے میں چشتیہ سلسلہ کا جو شجرہ دیا ہے اس کے آخری رکن مسعود بکؒ ہیں، مسعود بکؒ کے بعد کے خلفاء کے سلسلہ میں میری نظر میں تمام تذکرے خاموش ہیں، البتہ گلزار ابرار میں ایک موقع پر ضمناً مسعود بکؒ کے خلیفہ کا تذکرہ آگیا ہے، محمد غوثی فرماتے ہیں:-

"یا شیخ بہاؤ الدین شاہ باجن" یہاں سے شہر بیدر میں پہونچے، بیدر میں شیخ جھلے تھے جو منصور زماں مسعود بک کے خلیفہ تھے، ان کی ملازمت میں آپ نے چلہ کشی کی. ایسی مقبولیت پیدا ہوئی کہ مسعود بک کا خرقہ عنایت ہوگیا، پھر آپ گجرات لوٹے[2]"

پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی نے چشتیہ سلسلہ کا جو شجرہ[3] تحریر فرمایا ہے اس کا آخری حصہ یوں ہے:-

---

نوٹ:- حاشیہ ص ۲۰۷ پر ملاحظہ ہو،

مسعود بکؒ مسئلہ توحید پر اعلانیہ گفتگو کرتے تھے اسلئے علماء نے ان کے قتل کا فتویٰ دیدیا[1]۔ یہ الگ بحث ہے کہ یہ فتویٰ کہاں تک صحیح تھا، لیکن جہاں تک شریعت کا سوال ہے ان باتوں سے عوام کے عقائد میں فساد پیدا ہونے کا اندیشہ تھا اسلئے سلاطین وقت نے سختی برتی اور صوفیائے کرام اس سے واقف تھے اس لئے مسئلہ وحدت الوجود کو خواص کی مجلسوں میں بیان فرماتے، عوام کے سامنے نہ بیان کرتے۔

پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی نے صحیح تجزیہ فرمایا ہے:

"سب سے پہلے ہندوستان میں جس بزرگ نے وحدت الوجود کو عام گفتگو کا بحث بنایا وہ مسعود بکؒ تھے، یہ فیروز تغلق کا زمانہ تھا، عوام کو اس گفتگو میں شریک کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ "انا الحق" کی صدائیں بلند ہونے لگیں .... جاہل انسانوں سے ان ہی صداؤں کا اندیشہ تھا جسکی وجہ سے مشائخ اسلام نے مسئلہ وحدت الوجود پر بحث کرنے کی ممانعت کردی تھی۔

ان حالات میں شریعت کا سارا نظام درہم برہم اور اسلامی سوسائٹی کا شیرازہ منتشر ہوجانے کا خطرہ تھا، فیروز شاہ نے حالات کی نزاکت کو سمجھا اور اس قسم کے لوگوں کو سخت سزائیں دیں[2]"

---

[1] وحدت الوجود کے سلسلہ میں دیکھئے، تعارف، پروفیسر محمد حبیب، تاریخ مشائخ چشت، ص ۲۹ ۔ ۳۲۔

آں انا بیوقت گفتن لعنت است وان انا در وقت گفتن رحمت است

یہاں پہلے آں کا اشارہ فرعون کی طرف ہے اور دوسرے کا منصور کی طرف،

[2] تاریخی مقالات، ص ۳۴،

مسعود بکؒ نے جاہ و ثروت سے منہ موڑ کر فقر و درویشی کی زندگی اختیار کی تھی[1]، ان کا پورا دیوان پڑھ جایئے زندگی کے حالات کہیں نہیں ملتے، وہ مست شراب لایزالی سر حلقۂ عاشقان لاابالی[2] تھے، ان کو اس کا دھیان کہاں تھا کہ اپنے حالات بیان کرتے۔

نظریۂ وحدت الوجود اور مسعود بکؒ مسعود بکؒ حضرت امام اکبر کے نظریۂ وحدت الوجود سے متاثر تھے، اس سے ان کے کلام میں ایسی مستی پیدا ہو گئی تھی کہ چشتیہ سلسلے کے کسی بزرگ نے اسرار حقیقت کا ایسا انکشاف نہیں کیا جیسا مسعود بک نے کیا، حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ فرماتے ہیں، "در سلسلہ چشتیہ ہیچ کس این چنیں اسرار حقیقت فاش نگفتہ و مستی نکردہ کہ او کردہ"[3] ان کا یہ بھی بیان ہے کہ مسعود بکؒ کے آنسو اتنے گرم ہوتے تھے کہ اگر کسی کے ہاتھ پر گر پڑتے تو اس کا ہاتھ جل جاتا[4]۔ صوفیائے کرام ان کا کلام دروازہ بند کر کے سنا کرتے تھے کہ عوام کے کانوں تک نہ پہونچنے پائے، مگر خود مسعود بکؒ اپنا کلام بلا تکلف عوام کو سناتے تھے[5]، پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی فرماتے ہیں:

> "مسعود بکؒ اور شیخ شرف الدین یحیٰی منیریؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں وحدت الوجود کے خیالات کو اپنے اشعار اور تصانیف میں عوام تک پہونچانا شروع کر دیا"[6]

---

[1] گلزار ابرار کے مؤلف لکھتے ہیں "سپاہیانہ وضع تھی، ظاہری علم اور فضیلت کی تحصیل سے کوئی حصہ نہیں ملا تھا، چراغ دہلی کی خدمت سے آپ کی دانش و بینش کی شمع روشن ہوئی تھی اور آپ کاملوں کے درجہ پر پہونچے"، ص ۲۹۱، ۲۹۲۔ [2] تکملہ سیر اولیا، ص ۲۴، [3] اخبار الاخیار، ص ۱۶۹، [4] ایضاً [5] ایضاً [6] سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص ۳۸۸، ۳۸۹،

فرمود کہ اضافت برای ادنیٰ ملابست درست است شما پوسیدہ بود کہ کفش خدائے تعالیٰ برای مالکیت حق تعالیٰ میگفت کہ بِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یا حق تعالیٰ را لابس کفش میگفت قاضی از جواب عاری شد پس آنحضرت را جوش آمد فرمودند اے رو سیاہ فی الحال روئے قاضی سیاہ د حالش تباہ گردید"[1]

مسعود بکؒ کی گمنامی | مسعود بک فارسی کے اچھے شاعر تھے پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ تذکرہ نگاروں نے ان کی طرف سے اتنی بے اعتنائی کیوں برتی۔ حالانکہ یہی الزام منصور پر بھی تھا، لیکن فارسی ادب میں نظم ہو یا نثر، تذکرہ ہو یا تاریخ منصور کا نام ہر جگہ نظر آتا ہے۔ غالباً مسعود بکؒ کے معاصر تذکرہ نگاروں نے مذہب اور حکومت کے دباؤ سے ان کو نظر انداز کر دیا۔ مگر تعجب کہ صوفیائے کرام کے ملفوظات بھی ان کے ذکر سے خالی ہیں۔ حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ پہلے تذکرہ نگار ہیں جنھوں نے اخبار الاخیار میں تفصیل سے انکا تذکرہ کیا ہے۔ پھر جہانگیر کے عہد کے تذکرہ نگار محمد غوثی نے گلزار ابرار میں انکا مختصر حال لکھا ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے آج بھی سوائے مندرجہ بالا[2] پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی کے علاوہ کسی محقق یا مورخ نے ان پر تحقیقی نظر نہیں ڈالی۔

تصانیف | حسب ذیل تصانیف ان کی جانب منسوب ہیں۔

(۱) دیوان نور العین: اسکا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن میں ہے اور عرصہ ہوا دیوان نور العین شائع ہوا تھا اب نایاب ہے مولانا آزاد لائبریری علی گڈھ میں بھی دیوان مسعود بک

---

[1] تکملہ سیر اولیاء مصنفہ خواجہ گل محمد احمد پوری، مطبوعہ دہلی ۱۳۱۲ھ ص ۲۴و۲۵ [2] ۸۰ء میں نے اپنے استاد حافظ غلام مرتضیٰ صاحب الہ آباد یونیورسٹی کا ایک مقالہ "اسلامی فکر میں وحدت الوجود کا نظریہ" بڑے ذوق سے پڑھا لیکن مجھے بڑی ناامیدی ہوئی جب میں نے وحدت الوجود سے متاثر صوفیائے کرام میں مسعود بک کا نام نہ پایا۔

شہادت | چنانچہ پہلے علمانے یہ کوشش کی کہ شاہی دربار اور عوام مسعود بکؒ کے کلام سے محفوظ رہیں لیکن مسعود بکؒ جب عوام کے حلقہ تک اپنے خیالات پہونچانے لگے تو ان پر کفر کا فتویٰ دیا گیا اور وہ قتل کر دیئے گئے، اس کے متعلق محمد بولاق نے صرف اتنا ہی لکھا ہے" انکے ہم عصر علمار کو ان سے بڑی عداوت تھی چنانچہ ان کے فتویٰ پر حسین منصور کی طرح ان کو قتل کر دیا گیا"[1]

واقعہ شہادت کی تفصیل خواجہ گل محمد احمد پوری نے اپنے تذکرے میں دی ہے اس کو انھیں کے الفاظ میں سنئے،

منقول است از حضرت غریب پرور رضی اللہ عنہ کہ روزے حضرت مسعود بک نفیس برائے شیخ خودمی آورد یکے عالمے در راہ ملاقی شد پرسید کہ کفش کدام کس بر داشتہ آید فرمودند کہ کفش حق تعالیٰ بر داشتہ ام علمائے ظاہر متفق شدہ زیر قلعہ فیروزہ آباد بر لب جون آنحضرت را شہید ساختہ اعضاء مبارک او را پارچہ پارچہ کردہ در آب انداختند بعد از وقوع ایں قضیہ ہر چند معتقدان واحباء در آب جون انداختند اثرے ازاں نیافتند بعد از روز بسیار جمیع اعضائے او جمع شدہ مجسم گردیدہ در حجرۂ خاص حضرت سلطان المشائخ رضی اللہ عنہم در کیلو کھری یافتند از انجا بر داشتہ در مقبرہ پیران قریب مقام خواجہ قطب الاسلام بختیار اوشی در لادو سرائی مدفون ساختند چوں ایں خبر بحضرت شیخ . سید قاضی را فرمودند کہ بکدام مسئلہ شہید کردہ اند قاضی گفت کہ حق تعالیٰ را پائی ثابت کردہ بود حضرت شیخ

---

[1] روضۃ الاقطاب ، ص ۸۸ ،

زلف او از کفر مست درویش از اسلام مست

شکل مست و حسن مست و غمزہ مست و یار مست

مسعود بک چگونہ سلامت بریم جاں

ہندی خان باز چوں ترکاں کمیں گرفت

بودند شاہ ملک و صفا خواجگان چشت

مسعود بک ولایت ایشاں فرو گرفت

مکتوبات خواجہ محمد معصوم رح اور تکملۂ سیر الاولیا میں درج دو شعر ملاحظہ ہوں۔

رفت ز مسعود بک جملہ صفات بشر

او کہ ہماں ذات بود باز ہماں ذات شد

بیزارم از آں کہنہ خدائی کہ تو داری

ہر لحظہ مرا تازہ خدائی دگر ست

ای الٰہی کار و بار من جانِ ہراساں توئی — ظلمت کفر ست از تو نور ہر ایماں توئی

تابش ہستی ز تست و حسن ہر صورت ترا ست — بلکہ در صورت بمعنی حسن تاباں توئی

کعبہ و بتخانہ سازی دیر را مسجد کنی — مومناں را دیں توئی کفر را شایاں توئی

بت پرستی و نماز و کعبہ و دیر مغاں — نزد من یکسانست چوں در نفس جاناں توئی

نور خدا ست روی محمد صلی اللہ علیہ وسلم — ملک بقا ست جای محمد صلی اللہ علیہ وسلم

محرم رازدان الٰہی ہمدم مجلس نا متناہی — بر ہمہ عالم یافتہ شاہی صلی اللہ علیہ وسلم

خاتم ملکش میم محبت تاج کلاہش نون نبوت — بر سر عالم سایۂ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم

اسم محمد و ست مسمی تسمیں دادہ اسما — اسم مسمی زو شدہ شید صلی اللہ علیہ وسلم

کے نام سے ایک قلمی نسخہ موجود ہے[1]۔

(۲) مراۃ العارفین: صوفیائے کرام اس کو بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے تھے، گلزار ابرار کا مولف لکھتا ہے: "جن ایام میں راوی ہدایہ قاضی محمود سے اور قاضی محمود نقد فصوص اور مراۃ العارفین اس درویش سے پڑھتے تھے تو آپ (قاضی محمود مو ربی) کو ایک مسئلہ کلام میں سخت دشواری پیش آئی"[2]

(۳) تنزیہ العقاید: اس تصنیف کا ذکر مبلغ الرجال کے مولف نے کیا ہے، حضرت خواجہ عبداللہ المعروف بہ خواجہ کلاں فرماتے ہیں:

"شیخ شہاب الدین مسعود بک خواہرزادہ سلطان الشہید فیروز شاہ بن سالار رجب در رسالہ تنزیہ العقاید می گفت" ص ۲۵ ب،

(۴) حاشیہ تمہیدات عین القضات ہمدانی[3]:

نمونۂ کلام

روح مست و قلب مست و عقل مست و عشق مست
از نسیم شاہدہ این نفس و روی خوار مست

لوح مست و عرش مست و کفر مست و اسلام مست
واز شراب لایزالی مومن و کفار مست

(بقیہ حاشیہ ص ۲۱۱) دیکھئے معارف، مارچ ۱۹۶۰ء، مولانا آزاد لائبریری علیگڈھ کے شعبۂ اردو کے میگزینوں کی فہرست مرتب کرنے کے سلسلہ میں تقریباً سو سال کی تمام میگزینیں دیکھیں مگر کسی میں بھی مسعود بک کے سلسلہ میں کوئی مضمون نظر سے نہیں گذرا۔

[1] مولانا آزاد لائبریری علی گڈھ حبیب گنج کلکشن، مکتوبہ حبیب اللہ، عہد بادشاہ فرخ سیر، نمبر ۱۴۰/۴۲، [2] ترجمہ ص ۳۶۹،

[3] دیکھئے، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات (حاشیہ) ص ۴۱۲، گلزار ابرار کے مولف نے انکے دوسرے رسالوں کا تذکرہ کیا ہے لیکن نام نہیں لکھے: "بہت سے رسالے عربی اور فارسی میں آپ کی طرف منسوب ہیں"، ص ۹۲،

امروز درین خرقہ تن بار بر آمد — خورشید حقیقت بتب تاد بر آمد

از بس کہ یکی گشت دو چشم بخیالش — ہر جا طرف صورتِ دلدار بر آمد

بیا بیا کہ زخنجر بجان خلید فراق — نہاں عقل بکلی ز جان برید فراق

بیا نسیم بہاری وصال ازاں گلشن — کہ بر حدیقۂ دل چوں خزاں برید فراق

این چشم شوخ کرد نظر بر جمال او — رویش سیاہ ساختہ مردم برین نگاہ

مسعود بکؒ کہ سرکش آفاق حسن بود — بر خاک آستانش نکندہ ز سر کلاہ

ما جانب اغیار چرا می بینم — پیوستہ چو او ہست بصیر دل ما

تفسیر ماجدی اردو کے ہدیہ میں

خصوصی رعایت

مولانا عبدالماجد دریابادی کی اردو تفسیر کا جو دوسرا اڈیشن خود مولانا کے اہتمام میں ہندوستان میں چھپ رہا ہے اسکی دو جلدیں دسویں پارہ کے سورہ توبہ کے ترجمہ و تفسیر تک ابھی شائع ہوئی ہیں، ان کے ہدیہ میں خصوصی رعایت کر دی گئی ہے، یعنی جو صاحبان ان دونوں جلد وکیے الگ الگ پانچ پانچ نسخے یا اس سے زائد یکشت خریدیں گے اون کے لئے غیر مجلد تفسیر کے ہر حصہ کے ہدیہ میں پچاس فیصدی کی رعایت کی جائے گی، البتہ جلد کی قیمت دو روپیہ فی نسخہ کے حساب سے اس کے ساتھ لی جائے گی محصول بذمہ خریدار ہوگا،

جلد اول اور جلد دوم غیر مجلد کا ہدیہ فی نسخہ پندرہ روپیے ہے،

منیجر

صدق جدید بک ایجنسی، کچہری روڈ، لکھنؤ،

حسن او در جمال دل بینی | لیک چون صاف بر قرار شود
گرچه ابلیس ہست دشمن دین | گر ہمانی فرشتہ یار شود
ساربانم اگشد ز مستیٔ خون | اشتر مست بی مہار شود
چشم چون ابر دار خون افشان | تا خزان دولت بہار شود
در ہمہ کل جمال اوست نہان | رو نماید چو وقت کار شود
کل شود میوہ میوہ تخم و ہد | گر بکاری شجر د بار شود

ساقی مست من بدہ بادۂ عاشقانہ را | از دل خستہ دور کن درد و غم و زمانہ را
جان ہمہ تو بستۂ در خم زلف ہر شکن | کے برہیم زین محن تا نکنی تو شانہ را
ساقی جان محمد است کہ بدہد م شراب نو | بر کشد از وجود من صورت خسروانہ را
آب حیات جاودان آمدہ در میان جان | مطرب خوش نوائی من کردہ چو بر ترانہ را

فاتح ارواح بیا کوکب مصباح بیا | جذبۂ فتاح بیا تابش انوار بیا
روشنیٔ روح بیا حادثۂ نوح بیا | عالم مفتوح بیا تابش انوار بیا
کعبۂ حاجات توئی پیر مناجات توئی | مست خرابات توئی جانب شیار تو بیا
بوئی بیا عود بر و نور بیا دور بر و | پردۂ مستور بر و مژدۂ دیدار بیا

ای آفتاب حسن بر افگن نقاب را | بی تاب کردہ ایں دل و جان خراب را
آں زلف دلفریب کہ بر رخ فگندۂ | در شب نمودہ مہ من آفتاب را

یاران ہمہ مشغول تسبیح و تہلیل | من سجدہ کنان پیش بتان در ہمہ اوقات
ہر نکتۂ من آیت اسرار الٰہی است | در فہم تو باآنکہ نماید ز محالات

حسن جمال صورت خوبان نازنین | صاحب نظر ز پر تو نور خدا گرفت

نہیں جانتا تھا ورنہ اس کو تو آہ کے بجائے تحسین و آفریں کرنا چاہئے تھا،

نوعی خبوشانی: وجد و منعِ بادہ اے صوفی چہ کافر نعمتیست ــ منکرِ مے بودن و ہم رنگِ مستاں زیستن

صوفی سے کہتا ہے کہ تو خود تو وجد و حال میں مست رہتا ہے اور لوگوں کو شراب سے منع کرتا ہے، آخر یہ کون سا کفران نعمت ہے کہ شراب سے تو انکار ہے اور زندگی مستوں جیسی ہے،

نکی صفاہانی: اے کہ دستے می نہی بر دل کہ بینی حال ما ــ ساعتے بنشیں کزیں ذوقم دل از جا رفتہ است

تو میرا حال معلوم کرنے کے لئے دل پر ہاتھ رکھ رہا ہے، تھوڑی دیر ٹھہر جا کہ تیرے ہاتھ رکھنے کی لذت میں دل اپنی جگہ پر نہیں رہ گیا ہے، (وہ اپنی جگہ پر آجائے اسوقت اندازہ ہوگا)

عرفی شیرازی: نہ مروت است ما را بہ مراد خود رساندن ــ کہ ہزار نا امیدی بہ امید ما نشستہ

مجھکو میری مراد تک پہنچا دینا مروت کے خلاف ہے، کیونکہ ہزاروں نا امیدیاں میری مراد کی تاک میں بیٹھی ہیں کہ جیسے ہی وہ پوری ہو اسکو نا امیدی سے بدل دیں، اسلئے میری مراد کو پوری کرنا نا امیدی کو دعوت دینا ہے،

ناظم تبریزی: بسکہ جاں را در دم بسمل برغبت می دہم ــ رشک بر من می برد آنکس کہ جلادِ من است

تڑپتے وقت اس ذوق و شوق سے جان دے رہا ہوں کہ اسکو دیکھ کر جلاد کو بھی میری موت پر رشک آجاتا ہے،

ناظم ہروی: کشتی مرا و کشتہ شد از رشک عالمے ــ ہر خوں کہ میکنی تو بصد خوں برابر است

تو نے مجھکو قتل کیا اس رشک میں ایک عالم مرگیا، اس لئے تیرا ایک خون کرنا سیکڑوں خونوں کے برابر ہے،

واقفی مشہدی: بیروں میا ز خانہ کہ ذوقِ امیدِ وصل ــ بہتر ز دیدنی است بہوشی آورد

تو گھر سے باہر نہ نکل کہ تیرے وصل کی امید کی لذت تیرے دیدار سے بہتر ہے تیرا دیدار

خریطۂ جواہر

از شاہ معین الدین احمد ندوی

(۸)

میر معصوم نامی امشب بتمنائے مہ روے تو تا روز چشمم چو در خانۂ ویراں شدہ باز است

آج کی رات تیرے چاند سے چہرہ کی تمنا میں میری آنکھیں دن تک ویران مکان کے دروازے کی طرح کھلی رہیں، کیونکہ ویران مکان کا دروازہ کوئی نہیں بند کرتا، اس سے دل کی ویرانی کی طرف بھی اشارہ ہوگیا،

میر نجات بست است بمردم سرِ رہ چشم سیاہش خوں کردہ و در بستہ نشست است نگاہش

کہنا یہ ہے کہ محبوب کسی پر نگاہ نہیں ڈالتا، اسکی تعبیر ان الفاظ میں کی ہے کہ اس کی آنکھوں نے لوگوں پر راستہ بند کر دیا ہے (یعنی کسی کی طرف نہیں دیکھتا) اسکا سبب یہ ہے کہ اسکی نگاہ نے لوگوں کا خون کیا ہے، اسلئے دروازہ بند کرکے چھپ کر بیٹھی ہے،

براہِ عاشقی پروانہ باشد رہنمائے من بسوزم ہر یارے کو بسوزد از برائے من

عاشقی کے راستہ میں پروانہ میرا رہنما ہے، اس کی طرح میں بھی اس محبوب کے لئے جلتا ہوں جو میرے لئے جلتا ہے، (جیسے شمع پروانہ کے لئے جلتی ہے،)

محمد میر نظمی خدنگ غمزہ بہ نظمی زدی و آہ کشید زبان بریدہ مگر آفریں نمی دانست

تونے نظمی پر غمزہ کا تیر چلایا، اس نے درد سے آہ کی، وہ زبان بریدہ غریب آفریں کہنا

میں جاؤں،

کمال الدین وحشی　بلبل گلشن پرستم لیکنم پر باز نیست　باغ نزدیک است اما طاقت پرواز نیست

میں گلشن پرست بلبل ہوں لیکن میرے پر کھلے نہیں ہیں، باغ تو قریب ہی ہے، مگر افسوس کہ پرواز کی طاقت نہیں ہے،

مریضِ طفل مزاج اند عاشقاں ورنہ　علاج رنج تغافل دو روزہ پرہیز است

عاشقوں کا مزاج بیمار بچوں جیسا ہے (جو بیماری میں مشکل سے پرہیز کرتے ہیں) ورنہ محبوب کے تغافل کا علاج دو روزہ پرہیز ہے، یعنی اگر دو دن کے لئے بھی اس کو چھوڑ دیا جائے تو اس کا تغافل دور ہو جائے، لیکن عشاق کی بے صبری سے یہ پرہیز نہیں ہو سکتا،

تو منکری ولیک بمن مہربانیست　می بارد از ادائے نگاہ نہانیست

اگرچہ تجھکو انکار ہے لیکن میرے حال پر تیری مہربانی تیری نگاہ پنہاں کی ادا سے برستی ہے

جائے ہنوز نیست بذوق دیارِ عشق　ہرچند ظلم ہست، ستم ہست، داد ہست

دنیائے عشق میں ظلم و ستم داد و فریاد سب کچھ ہے، پھر بھی عشاق کے ذوق کی تسکین کا سامان نہیں ہے، وہ کچھ اس سے بھی سوا چاہتے ہیں،

فرماندہی کشورِ دل کار بزرگ ست　از دولتِ حسنِ تو ازیں کار نہ آید

اقلیم دل کی حکمرانی بڑا بھاری کام ہے، تیرے حسن کی حکومت سے یہ کام انجام نہیں پا سکتا یعنی تو اسکی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کر سکتا۔

رسم کجاست ایں تو بگو در کدام شہر　دل می برند و چشم بیالا نمی کنند

تم ہی بتاؤ یہ دستور کہاں ہے اور کس شہر میں ہے کہ دل اڑا لیجاتے ہیں اور نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتے؛

بیہوش کر دیتا ہے، اس لئے لطف دید بھی حاصل نہیں ہوتا اور امید میں ایک لذت ہوتی ہے اسلئے اس کو قائم رہنے دے

مُیرالی تی، آمدی بر سرِ خاکِ من و شرمندہ شدم — کیں زماں از پئے قربانِ تو جاں می بایست

تو میرے مرنے کے بعد میری قبر پر آیا اور مجھے یہ شرمندگی ہے کہ یہ وہ مبارک ساعت ہے کہ تجھ پر قربان کرنے کے لئے جان کی ضرورت تھی جواب باقی نہیں ہے،

سرِشک از رُخم پاک کردن چہ حاصل — علاجے بکن کز دلم خوں نہ آید

میرے چہرے سے آنسو پوچھنے سے کیا حاصل، کوئی ایسا علاج کر کہ دل کے زخم سے خون نہ نکلے، اور نہ آنسو برابر بہتے رہیں گے،

طبیبم آں چناں از رہِ منت میکند چارہ — کہ پندارد من بیچارہ میلِ زیستن دارم

میرا طبیب اس دلسوزی اور منت سے علاج کر رہا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ مجھے زندہ رہنے کی تمنا ہے، (حالانکہ میں زندگی سے بیزار ہوں)

وقتِ مردن چشم بکشا و آنگہ روئش ببیں — راہ دوری میروی اندیشۂ زادے بکن

مرتے وقت آنکھ کھول کر اسکا چہرہ دیکھ لے کیونکہ تیرا سفر دور دراز کا ہے، اس لئے زاد راہ کی فکر کرنی چاہئے، (اس کے چہرہ کی یاد زاد راہ کا کام دیگی)

اے عشق خوار تر کن ازیں ہم بکوئے او — تا ہر کہ بیندم نکند میل سوئے او

اے عشق میں اس کے کوچہ میں جس قدر ذلیل و رسوا ہوں اس سے بھی زیادہ رسوا کر تاکہ جو شخص مجھ کو دیکھے پھر اس کی طرف رخ نہ کرے،

ناصح ملامتم کند و من دریں خیال — کامروز بگذرم بہ چہ تقریب سوئے او

ناصح تو مجھ کو ملامت کرتا ہے، اور میں اس فکر میں ہوں کہ آج کس تقریب سے اس کی گلی

وصفی　نومیدیم رسید بجائے کہ گر کسے　　　آرد نوید وصل تو باور نمی کنم

میری ناامیدی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اگر کوئی وصل کی خوشخبری بھی لاتا ہے تو یقین نہیں آتا

وقوعی تبریزی　می نماید کہ سر عہد شکستن داری　　　خشم ایں بار تو چوں رنجش ہر بار تو نیست

اس مرتبہ تیری برہمی پہلے کی رنجشوں کی طرح نہیں ہے، معلوم ہوتا ہے کہ تو عہد شکنی پر آمادہ ہے

غالبؔ کا شعر ہے،

بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں　　　لیکن اب کے سرگرانی اور ہے

چہ پیش آمد دلم را کز طپیدن باز بہ نشیند　　　چو مرغے کو بدام افتد از پرواز بہ نشیند

میرے دل کو کیا واقعہ پیش آیا کہ اس نے تڑپنا چھوڑ دیا، اس مرغ کی طرح جو دام میں گرفتار

ہونے کے بعد اڑنے سے مجبور ہو جاتا ہے،

مرزائی　داشتم بر دے لہ تا اکنوں زوصالش عار داشت　　　ایں زماں محتاج دربانش شدی پرسی چرا

میرا ورد ایسا تھا کہ اب تک اسکو دربان سے عار تھا اور اب وہ دربان کا محتاج ہو گیا ہے، مگر

تو اس کا سبب نہیں پوچھتا، حالانکہ اس تغیر حال کا سبب پوچھنا چاہئے

گفتمت ناشکیبم وعدہ را حدیست نشنیدی　　　بشوخی امرو تو روزی در صدد ساختی ادا

میں کہتا نہ تھا کہ میں بے صبر ہوں وعدے کی بھی ایک حد ہوتی ہے، مگر تو نے نہیں سنا

اور تیری شوخی اتنی بڑھ گئی کہ تو نے اس کی طرف توجہ نہیں کی، اور بے صبری نے مجھے رسوا کر دیا

ہلاک میشوی اکنوں وتی نمی گفتم　　　مکش کہ جام فریب است ناچشیدہ بہ است

وتی میں تجھ سے کہتا نہ تھا کہ محبت، فریب کا جام ہے اسکو نہ چکھنا ہی بہتر ہے، مگر تو نے

میرا کہنا نہیں مانا، اور اب اس کا نتیجہ ہلاکت سامنے آرہا ہے،

بہ تمنائے تو ترک جہاں کردو کی　　　مہربانیِ تو ہم در خورِ ایں می بایست

دعاہاے سحر گویند میدارد اثر وحشی
اثر می دارد اما کے شب ہجراں سحر دارد

وحشی! لوگ کہتے ہیں کہ دعا سحری میں اثر ہوتا ہے، بیشک اثر ہوتا ہے، لیکن شب ہجراں کی سحر ہی کہاں ہوتی ہے، کہ دعا کی جائے اور اس کا اثر ظاہر ہو،

می آید از کشادنِ در بوئے منتے
در بستہ باغ خلد بہ رضواں گذاشتیم

کسی کے بند دروازہ کھولنے میں احسان کی بو آتی ہے، (میری خودداری جسے قبول کی اجازت نہیں دیتی) اس لئے میں نے باغ خلد کو بھی جس کے دروازے بند ہیں رضواں کیلئے چھوڑ دیا

غالب کا یہ شعر

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

اسی سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے

زمینِ عشق پہ وضعِ جہاں خوش خندہ کردم
معاذ اللہ اگر روزے بدستِ روزگار افتم

میں عشق کی برکت سے دنیا اور اہلِ دنیا کے طور وطریق پر خوب ہنسا ہوں، اس لئے خدا سے پناہ مانگتا ہوں کہ کسی دن میں بھی زمانہ کے ہاتھوں میں نہ پڑ جاؤں، اور دوسروں کو مجھ پر ہنسنے کا موقع ملے،

وحشی خوشنوائی
ہزار سال پس از مرگ میتوانم زیست
اگر بروں نکشند از دلم خدنگ ترا

اگر میرے دل سے تیرے تیر کو کھینچکر نہ نکال لیں تو میں اس کی لذت سے اور اس کے سہارے مرنے کے بعد بھی ہزاروں سال زندہ رہ سکتا ہوں،

یک لحظہ گر یہ گر نکنم کور می شوم
گویا چراغ چشم من از آب روشن است

اگر ایک لمحہ کے لئے بھی رونا بند کر دیتا ہوں، تو اندھا ہو جاتا ہوں گویا میری آنکھ کا چراغ پانی سے روشن ہے، جس کی خاصیت آگ کو بجھانا ہے،

آرزو اور تمنا نے دل کے لئے سیکڑوں مشکلیں پیدا کر دی ہیں، ورنہ ناامیدی نے کام بہت آسان کر دیا تھا، کیونکہ کسی چیز سے یاوسی ساری مشکلیں ختم کر دیتی ہے۔ مشکلات تو امید پیدا کرتی ہے

بود شِ تسلّی تو غرض اے دل خموش ... ایں وعدہ اقتضائے تقاضا نمی کند

اے دل خاموش ہو جا محبوب کے وعدے کا مقصد محض تسلّی دینا تھا اس قسم کے وعدے ایفا کیلئے نہیں کئے جاتے،

بگذشت ز پیش من و غیرت بحکایت ... پیچید کہ ہرگز نتواند بلاقصا دید

محبوب میرے سامنے سے گذر رہا تھا، مگر رقیب نے اسکو اسطرح باتوں میں لگایا کہ پیچھے مڑکر نہیں دیکھ سکتا تھا

بقدر طاقت خود ہر دلے غمے دارد ... دل من است کہ اندوہ عالمے دارد

ہر دل اپنی طاقت کے مطابق غم میں مبتلا ہے، میرا دل ہے کہ سارے جہاں کا غم رکھتا ہے، اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ میرے دل میں سارے جہاں کا غم کھانے کی طاقت ہے، دوسرا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنی طاقت سے زیادہ بار اپنے اوپر ڈال لیا ہے،

ایں شام ہجر بود دلا چوں بسر رسید ... خاکت بسر کہ روز شدہ زندہ ہنوز

دل یہ ہجر کی شام تھی کس طرح بسر ہو گئی، تیرے سر پہ خاک ہجر کی صبح ہو گئی اور تو ابتک زندہ ہے تجھ کو تو مر جانا چاہئے تھا،

در سخن بود بغیرے چو بہ راہش دیدم ... شد خجل گفت کہ احوال تو می پرسیدم

میری نظر پڑی کہ محبوب سرِ راہ رقیب سے باتوں میں مشغول ہے تو مجھے دیکھ کر وہ شرمندہ ہو گیا کہنے لگا تمہارا ہی حال پوچھ رہا تھا،

ہر تو شنیدہ ام سخنہا ... شاید کہ تو ہم شنیدہ باشی

میں نے تیرے لئے لوگوں سے چہ میگوئیاں سنی ہیں، شاید تیرے کانوں تک بھی کچھ باتیں پہنچی ہوں،

تیری تمنا میں وکی نے دونوں جہاں کو چھوڑ دیا ہے، اس لئے تیری مہربانی اسی کے مطابق ہونی چاہئے

گر بمن قاصد اُو وعدۂ دیدار نداشت | چوں نگاہے کہ بمن داشت باغیار نداشت

اگر محبوب کا قاصد اسکی طرف سے دیدار کا وعدہ نہیں لایا تھا، تو پھر کیوں مجھ پر اس کی جو نگاہ تھی دوسروں پر نہ تھی، یہ نگاہ توجہ وعدۂ دیدار کا ثبوت ہے،

چوں بد و نیک منِ سوختہ خرمن پرسند | آہ گر آنچہ بدل کردہ ام از من پرسند

جب (قیامت کے دن) مجھ سوختہ ساماں کی نیکی و بدی کی پرسش کریں تو کاش میرے دل میں جو تمنائیں ہیں ان کو بھی پوچھیں،

اسی سے ملتا جلتا ہوا غالب کا یہ تخیل ہے،

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد | یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

خرسند بہ امید جوابست دلم کاش | قاصد کہ رود جانب اُو دیر تر آید

میرا دل محبوب کے جواب کی امید میں بہت مسرور ہے، کاش جو قاصد جائے وہ دیر میں لوٹے کہ امید قائم رہے، ورنہ ممکن ہے جواب امید کے خلاف ہو،

بخواری کہ منم تا چہ لطف کرد بغیر | کہ میرسد بمن و شرمساری گذرد

میں جس ذلت و خواری میں مبتلا ہوں (اسکے مقابلہ میں) محبوب نے رقیب کے ساتھ کیا لطف و عنایت کی ہے کہ جب میرے سامنے آتا ہے تو شرمندہ گذر جاتا ہے،

بمصلحت گلہ می کند وَلی ز تیغ ستم | فدائے تست اگر صد ہزار جاں دارد

وَلی تیغ ستم کا گلہ مصلحۃً کرتا ہے ورنہ اگر اسکے تو ہزار جانیں ہوں تو تجھ پر سے نثار کردے ایسی حالت میں شکایت کا کیا سوال ہے،

آرزو صد کار مشکل باز پیش دل نہاد | ورنہ بر من ناامیدی کار آساں کردہ بود

یں ہر شخص کے پاس جاکر محبوب کے حال کی جستجو کرتا ہوں اور خود ہی رشک

یں کہتا ہوں (کہ میں تو اس کا حال پوچھتا پھرتا ہوں) مگر وہ میری طرف سے یا میری

جستجو سے بے خبر ہے،

گشتم خجل ز دامنِ جاناں وسعی خویش تا چند شوق گیرد و ہمت رہا کند

یں محبوب کے دامن اور اپنی کوشش دونوں سے شرمندہ ہوں کہ کب تک شوق

دامن پکڑتا رہے گا اور ہمت اس کو چھوڑتی رہے گی،

بباغ ہستی خود چوں شگوفۂ بادام چو باز شد نظرم چشم از جہاں بستم

اپنی ہستی کے باغ یعنی دنیا میں آنکھ بعد بادام کی کلی کی طرح جیسے ہی آنکھ کھلی دنیا سے آنکھ

بند کرلی، اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ زندگی کا وقفہ اتنا مختصر ہے کہ آنکھ

کھلتے ہی بند ہو گئی، یا دنیا کو دیکھ کر جب اسکی حقیقت ظاہر ہوئی تو اسکی طرف سے آنکھ بند کرلی

ز سرتاپا ہمہ حسنی نداری عیب از یں بیشے کہ ہر عضو تو نگذارد کہ عضوے دیگرے بینم

تو سراپا حسن و خوبی ہے، صرف ایک عیب ہے، (تیرا ہر عضو حسن کے سانچے میں

ایسا ڈھلا ہوا ہے) کہ ایک عضو دوسرے عضو کو دیکھنے کی فرصت نہیں دیتا،

ز زخم تیغ نمیریم و لیک می ترسم کہ زندہ مانم و گردی تو شرمسار از من

میں تیری تلوار کے زخم سے نہیں مر سکتا، لیکن خوف اس کا ہے کہ میں زخم کھانے

کے بعد زندہ رہ جاؤں اور تجھ کو مجھ سے شرمندہ ہونا پڑے کہ قتل نہ کر سکا،

نظیری نہد شراب خانۂ ما تا بحشر اگر کاوی بجائے ریزۂ خم توبہ شکستہ ہم آید

اگر حشر تک بھی تو میرے شراب خانہ کی زمین کھودتا رہے تو ٹوٹے ہوئے خم کے

ٹکڑے کے بجائے ٹوٹی ہوئی توبہ برآمد ہوگی

مرا بہ نیم نگہ می تواں تسلی بود — دریغ از تو کہ ایں شیوہ را نمی دانی

مجھ کو نیم نگاہ یعنی ادنیٰ توجہ سے تسلی دی جا سکتی ہے، مگر افسوس تو یہ طریقہ ہی نہیں جانتا، اور تجھ سے اتنا بھی نہیں ہوتا،

ملا واقف جلالی — یک صبحدم بصحن گلستاں گذشتہٗ — شبنم ہنوز بر رخِ گل آب می زند

تو ایک مرتبہ صبح کے وقت گلستاں کے صحن سے گذرا تھا، اور شبنم اب تک پھولوں کے رخ پر پانی کے چھینٹے مار رہی ہے، یعنی تجھے دیکھ کر پھولوں کو بیہوشی طاری ہو گئی یا تیرا چہرہ دیکھ کر پھول کمھلا گئے، ان کو ہوش میں لانے کے اور ان کو تر و تازہ کرنے کے لئے شبنم پانی چھڑک رہی ہے،

میر طاہر وحید — دیدم آں چشمۂ ہستی کہ جہانش نامند — آں قدر آب کزو دست تواں شست نداشت

میں نے اس سرچشمۂ وجود کو دیکھا ہے جسے دنیا کہتے ہیں، اس میں اتنا پانی بھی نہیں تھا کہ ہاتھ دھویا جا سکے، یعنی کہنے کو تو دنیا وجود کا سرچشمہ ہے، مگر وہ اتنی بے حقیقت کہ اس سے معمولی کام کی بھی نہیں نکل سکتا،

شوخی از رخ پردۂ شرم ترا وا می کند — لیک ہنگامیکہ عاشق را خبر از خویش نیست

تری شوخی تیرے رخ سے شرم کا پردہ ہٹاتی ہے، مگر اس وقت جب کہ عاشق کو اپنی خبر نہیں رہتی، اس لئے وہ لطف دیدار سے محروم رہتا ہے،

با یار کسے چہ گونہ سازد — چوں با دل خود نمی تواں ساخت

وہ عاشق محبوب کے ساتھ کیسے نباہ کر سکتا ہے، جب خود اپنے دل کے ساتھ نہیں نباہ سکتا، یعنی جب اپنے دل پر قابو نہیں تو دوسرے پر کیا اختیار ہے،

سراغ یار می گیرم، بہر کس می رسم، اما — بجو از رشک میگویم کہ یا رب بیخبر باشد

دریں مدت غم ہجراں عبث بر خود پسندیدم		ندانستم کہ از مرگم دلت خوشنودی می گردد

میں اتنے دنوں تک غم ہجر بیکار برداشت کرتا رہا مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ میری موت سے تیرا دل خوش ہوگا ورنہ جان دیدیتا

بہ بدی در ہمہ جا نام بر آرم کہ مباد		خون من ریزی و گویند سزاوار نبود

میں بدی میں ہر جگہ اپنا نام اس لئے مشہور کر رہا ہوں کہ ایسا نہو کہ تو میرا خون کرے اور لوگ یہ کہیں کہ یہ ناروا بات کی اور جب بدنام ہو جاؤں گا، تو لوگ تجھکو مجرم بنانے کے بجائے سمجھیں گے کہ میں اسی سزا کا مستحق تھا،

مشو از حال من غافل کہ زخم کاری دارم		مبادا دیگرے صید ترا از خاک برگیرد

میرا زخم بڑا کاری ہے اس لئے میری طرف سے غفلت نہ برت ایسا نہ ہو کہ کوئی دوسرا شخص تیرے شکار کو زمین سے اٹھالے زخمی شکار بھاگ نہیں سکتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر شکاری اس کو چھوڑ دیتا ہے تو کوئی دوسرا شخص اس پر قبضہ کر لیتا ہے،

شد عمر و سرگرانی او برطرف نہ شد		بر من بقدر مرتبہ عشق ناز کرد

محبوب کی کشیدگی یہ بیلطف توجیہ کرتا ہے کہ پوری عمر گذر گئی مگر اس کی سرگرانی دور نہ ہوئی کیونکہ سکا ناز میرے عشق کے مطابق ہے میرے عشق کا مرتبہ بلند ہے، اسلئے اس کا ناز بھی مجھ سے زیادہ ہے،

آنکہ شام زندگانی شمع بالینم نہ شد		کے پس از مرگم چراغ بر سر گور آورد

جو میری شام زندگی میں شمع بالیں نہ بنا یعنی میرے مرتے وقت نہ آیا وہ میرے مرنے کے بعد میری قبر پر چراغ کیا جلا ئیگا،

دولت ایں بود کہ مردیم بہنگام وداع		آنقدر زندہ نماندیم کہ محمل ببرود

بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ محبوب کو رخصت کرتے وقت ہی مرگیا اور محمل کی روانگی کے وقت تک

شیخ علی نقی کمرہی:۔

وائے بر جان خلائق اگر آرند بحشر عوض روز قیامت شب تنہائی را

اگر حشر کے دن قیامت برپا کرنے کے بجائے شب تنہائی کو لے آئیں تو مخلوق کی جان پر بنجائے گی، کیونکہ ہجر کی شب تنہائی کو برداشت کرنا قیامت سے زیادہ سخت ہے،

امروز پرسش من کن بہ تکلف کیں خستہ اگر دیر زید شام بمیرد

تکلف ہی سے سہی آج میری حالت پوچھ لے کیونکہ یہ خستہ دل اگر بہت جیا تو شام تک مرجائے گا،

عاشقاں نامے بعجز ناتوانی کردہ اند کوہکن آخر بزور ایں قوم را بدنام کرد

عاشق اپنی ناتوانی و درماندگی کیلیے مشہور تھے، مگر کوہکن نے پہاڑ توڑ کر اپنی زور قوت سے ان کو بدنام کردیا،

تجدید عہد اعشق مکنم تو عہد دیرینہ چوں بیمار سے کہ وقت مرگ تجدید ایماں می کند

میں محبوب کو رخصت کرتے وقت پرانے عہد کو پھر تازہ کرتا ہوں جس طرح بیمار مرتے وقت ایمان کی تجدید کرتا ہے،

علاج سرکشی او تغافل ست دریغ کہ در طبیعت عشق ایں دوا ضرر دارد

محبوب کی سرکشی کا علاج یہ ہے کہ اس کو بھلا دیا جائے، مگر افسوس کہ عشق کے مزاج کے لئے یہ دوا مضر ہے کہ تغافل شان عشق کے خلاف ہے،

مولانا ذکی نے گلاب است آنکہ بر رخسار ہوش میزنی تا نسوزد عالمے آبے بر آتش می زنی

محبوب کے رخساروں پر جو عرق گلاب چھڑک رہا ہے، وہ عرق گلاب نہیں بلکہ آگ پر پانی چھڑک رہا ہے کہ اس کی تپش سے دنیا نہ جل جائے،

چند قدیم نایاب سکے

از جناب انور احمد صاحب سوپاری

سوپارہ کے تاریخی پس منظر کے لئے ملاحظہ ہو، راقم کا مضمون (معارف اگست ۱۹۶۳ء

تا نومبر ۱۹۶۳ء) اس مضمون کے بعد راقم کو سوپارہ سے ساتواہن خانوادہ کے چند نایاب سکے

دستیاب ہوئے، اُن سکوں کو سمجھنے میں بڑی دقت کا سامنا تھا تاہم میرے دوست ڈاکٹر

پرمیشوری لال گپتا (پٹنہ میوزیم) کی اعانت سے ان سکوں پر ایک مقالہ تیار ہو گیا جسے

راقم نے وہ دیں Numismatic Conference منعقدہ ناگپور ۱۹۷۰ء

میں پڑھا تھا۔

۱۸۸۲ء کی کھدائی کے بعد سوپارہ سے متعلق آرکیولوجی کے اعتبار سے بہت کم معلومات

حاصل ہوئی ہیں، اس کھدائی کے دوران میں استوپے خانوادہ ساتواہن کا ایک سکہ دستیاب

ہوا تھا، اس کے بعد کسی کو اس خاندان کے کسی سکہ کا پتہ نہیں چلا، راقم کو مختلف حکمران

خاندانوں کے تقریباً دو سو سکے ملے ہیں، جن میں چند سکے نایاب ہیں، اور اس ساخت کے

سکے اب تک دستیاب نہیں ہوئے تھے، یہ بات قابلِ غور ہے کہ یہ سب سکے کُمٹی (Kumeti

نامی جگہ سے ملے ہیں، کمٹی قاضی قطب الدین کمال الدین کی ملکیت تھی، یہ کل تین سکے

ہیں، جن پر براہمی رسم الخط میں عبارت کندہ ہے، بہت سے سکے فرسودہ حالت میں ہیں،

ان میں جتنا نایاب سکوں کو کسی حد تک پڑھ سکا ہوں اُن کا ذکر حسب ذیل ہے،

(۱) دھات : سیسہ - گول - وزن : ۲ گرام

زندہ نہیں رہا اور نہ اس کا نظارہ موت سے بھی زیادہ سخت تھا،

گر زیر گلبنے قفسم را نمی نہی　　جاے بنہ کہ نالہ بگوش چمن رسد

اگر تو کسی پھول کے پودے کے نیچے میرا قفس نہیں رکھتا تو کم سے کم ایسی جگہ رکھدے کہ جہاں سے میرا نالہ چمن کے کانوں تک پہنچ سکے،

نظیری را بمحفل بردم امروز و غلط کردم　　مرا رسواے عالم ساخت چشم گریہ آلودش

میں نے آج نظیری کو (محبوب کی) محفل میں لیجا کر غلطی کی اسکی گریہ آلود آنکھوں نے مجھے ساری دنیا میں رسوا کر دیا

بوے یار من ازیں سست وفا می آید　　گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم

اس سست وفا سے میرے محبوب کی بو آتی ہے، پھول کو میرے ہاتھ سے لینا کہ میں بیخود اور از کار رفتہ ہوا جاتا ہوں، ع ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں،

بیرا دے تو... پروانہ شب بہ چراغم　　خود را بجاں بیخودی سوخت کہ داغم

آج رات جب تیرا رخ انور سامنے نہیں تھا پروانہ میرے چراغ پر اس بیخودی سے جل گیا کہ میرے دل پر داغ پڑ گیا یعنی پروانہ کی جانسوزی کو دیکھکر میرے دل میں اسلئے داغ پڑ گیا کہ اگر تیرا رخ روشن موجود ہوتا تو میں اس پر سے پروانہ وار نثار ہو جاتا یا یہ کہ اگر تو موجود ہوتا تو پروانہ چراغ پر جان دینے کے بجائے تجھ پر جان دیتا،

گر در خدمت عمریست نی بندم چہ تقصیرم　　برہمن می شدم گر ایں قدر زناری بستم

میں تیری خدمت میں ایک مدت سے اسیر ہوں، مگر تیری نگاہوں میں اسکی کوئی قدر نہیں اگر اتنے دنوں تک زنار باندھتا تو برہمن کا درجہ حاصل کر لیتا،

چہ خوش است از دو یکدل سر حرف باز کردن　　سخن گذشتہ گفتن گلہ دراز کردن

دو ہم مذاق (یکجہت) دوستوں کا آپس میں مل کر باتیں چھیڑنا پرانی باتوں کو یاد اور آپس میں گلے شکوے کرنا، کس قدر خوشگوار ہوتا ہے،

سیدھے رخ پر: سہ محرابی ٹیلے، اوپر ہلال، نیچے سیدھا خط، دائیں طرف ایک نشان جو دو شاخہ انکس کے مماثل ہے،

پشت پر: اجینی نشان کے ساتھ صرف ایک دائرہ ہے

یہ سکے اس لئے قابل توجہ اور نئے ہیں کہ ان کے بائیں طرف دو شاخہ انکس کا نشان کندہ ہے، اگر ان سکوں کو ساتواہن خاندان سے منسوب کیا جائے تو یہ بات قابل غور ہے کہ ساتواہن کے جتنے بھی سکے اب تک دستیاب ہوئے ہیں ان میں یہ نشان نہیں ہے، اور پھر یہ کہ یہ سکے سوپارہ میں ملے ہیں، جو ان کے دوران حکومت میں ایک اہلہ (ضلع) اور ان کے مرکز سے بہت دور تھا، حالانکہ آندھرا پردیش سے جو قریب ہے، اس ساخت کے سکے ابھی تک نہیں ملے ہیں،

ان تینوں سکوں کی عبارت واضح نہیں ہے، البتہ نچلے حصہ کی عبارت صاف ہے، اس کے باوجود مفہوم اچھی طرح واضح نہیں ہوتا، ایک سکہ پر چند حروف کے مٹے مٹے نشان نظر آتے ہیں، بقیہ دو سکوں کی عبارت کے حروف کسی حد تک پڑھے جا سکتے ہیں،

یہ کل گیارہ حروف ہیں، ان دو سکوں میں سے ایک سکہ پر "ربنون، س، و" صاف نظر آتے ہیں، ان کے بعد ایک اور غیر واضح حرف ہے، دوسرے سکہ پر ربنون، س، و، شکستہ حالت میں ہیں، دوسرے سکے پر مندرجہ بالا تمام حروف شکستہ اور دھندلے ہیں ان کے بعد دو حروف ر، پ صاف ہیں اور ایک حرف "ل" سے مشابہ ہے، اس کے بعد م، اور ر ہے، ان حروف کی ترتیب یوں ہو سکتی ہے،

"(ر) ربنون، س، و، ر، پ، (ل) م، ر" ان حروف سے کوئی واضح عبارت نہیں بنتی، جس سے اس بادشاہ کا نام ظاہر ہو سکے، جس نے یہ سکے جاری کئے،

سیدھے رخ پر سہ محرابی ٹیلے، ان پر ہلال، ان کے نیچے ایک سیدھا خط کنارے
پر یہ عبارت ہے "رینو...... و.......... وی س"۔ پوری عبارت یوں ہو سکتی ہے
"رینو، واسی تھ پوتا س، پولو ادس"۔

پشت پر:- اجینی نشان

اس ساخت کے سکوں کا عکس ڈاکٹر وی، وی، میراشی شائع کر چکے ہیں، انھیں یہ سکے
دکن سے دستیاب ہوئے تھے، مگر ان سکوں کی عبارت صاف نہیں تھی، زیر بحث سکوں
کی دریافت سے ساتواہن خانوادہ کے جاری کردہ مختلف سکوں میں اضافہ ہوا ہے، اس سے
اس کی پوری تصدیق ہوتی ہے، کہ واسٹھی پتر پولو مادی (Vaasithi Putra Pulumasi)۔ اس خاندان کا حکمراں تھا، جس نے اس ساخت کے سکے جاری کئے تھے،

(۲) سیسہ۔ گول۔ وزن ۲/۱۰ گرام،

سیدھے رخ پر: سہ محرابی ٹیلے، نیچے ایک لہراتا خط

عبارت:-

"س۔ہ..... م.... س...... ن س"

پشت پر: کوئی عبارت نہیں،

سکہ کی عبارت نامکمل ہے، جس حد تک پڑھی جا سکتی ہے، اسے ہم سمس پڑھ سکتے ہیں
جو "سوامی" کے ہم معنی ہے، اور آخری دو حروف "ن س" سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس بادشاہ نے
یہ سکے جاری کئے تھے، اس کا نام ساتکرنی تھا، سوامی کا لفظ ساتواہن کے سکوں پر اگرچہ نیا
نہیں، لیکن اس ساخت کے سکوں کے لئے بالکل نادر ہے، جو مزید تحقیق کا طالب ہے،

(۳) تین سکے۔ سیسہ۔ گول۔ وزن (۱) ۲ گرام (۲) ۲ گرام (۳) ۲/۱ ۲ گرام

ادبیات

غزل

از جناب عروج زیدی

اندھیرا شام ہی سے جسکی کرنوں کو نگل جائے
خدا کی شان ہے وہ سنتِ یونسؑ کو دہرائے

وہ کیا اپنی نظر فردوِ عصرِ نو سے ٹکرائے
غلطی ہو کے جو بھڑکے ہوئے شعلوں سے ڈر جائے

مرا ذوقِ تماشا ہر نفس مجروح ہوتا ہے
کوئی دیوانہ اٹھے پرچمِ تہذیب لہرائے

بتا اے خفتہ دل! اسوقت تیرا حال کیا ہوگا
یہاں جو کر رہا ہے حشر میں وہ سامنے آئے

تغیر آفریں لمحو! یہ چھیڑ اچھی نہیں ہم سے
نہیں وہ سوزِ دل رکھتے تھے جو پتھر کو پگھلائے

انہیں پھر کون اس دنیا میں سینے سے لگائیگا
اگر انسان ہی اخلاق کی قدروں کو ٹھکرائے

مری کشتی کو ٹکراتا ہے امواجِ حوادث سے
یہ کیوں چاہوں کہ ساحل کھینچ کے میرے پاس آ جائے

سب جانتے ہیں اولِ افتادِ آدم سے
قیامت ہے بنی آدم کو وہ شیطان بہکائے

[illegible] اسکا ذوقِ عبدیت دیکھے
جو پھولوں کو شگفتہ [illegible] میں کر جائے

[illegible] لیس للانسان کی پابندی
جو ہم چاہیں تو وہ عشرت [illegible] آئے

عروج! اعجازِ اسلوبِ بیاں کی انتہا یہ ہے
کہانی کہنے والا خود کہانی بن کے رہ جائے

تھے، لیکن اتنا یقینی ہے، کہ جس حکمران نے اس ساخت کے سکے جاری کیے تھے وہ یا تو خانوادہ ساتواہن سے تعلق نہیں رکھتا تھا، اور اگر تعلق رکھتا تھا، تو تاریخ میں اب تک گمنام ہے، یا ایسے خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو ساتواہن سے قبل یا بعد میں اس علاقہ پر قابض تھا، اس لئے جب تک اس مخصوص ساخت کا کوئی صاف سکہ دستیاب نہیں ہوتا قیاس امر مشکل ہے،

بزم تیموریہ جلد اول

بزم تیموریہ کے پہلے اڈیشن میں مغل سلاطین بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں، عالمگیر اور تمام تیموری شاہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق اور ان کے دربار کے امراء، شعرا اور فضلاء کے مختصر تذکرہ کے ساتھ ان کے علمی کمالات کی تفصیل بیان کی گئی تھی جس کو ارباب ذوق و تحقیق نے بیحد پسند کیا، اور اس کے حوالے اپنے مقالات اور تصنیفات میں دئیے اب اسی کو بکثرت اضافوں کے ساتھ دو جلدوں میں کر دیا گیا ہے کہ تمام مغل سلاطین اور انکے عہد کی ادب و زبان کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجائے، پہلی جلد میں مغل سلاطین میں سے پہلے تین شہنشاہوں یعنی بابر، ہمایوں اور اکبر کے علمی ذوق اور انکے عہد کے امراء، شعراء و ارباب فضل و کمال کے تذکرے کے ساتھ انکے علمی کمالات پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے اور دوسری جلد میں بقیہ مغل سلاطین اور انکے دربار کے علماء، فضلا و شعراء کا تذکرہ ہوگا، اسمیں اتنے اضافے ہوئے ہیں کہ بالکل نئی کتاب ہو گئی ہے، پہلے سے کہیں جامع و مکمل، قیمت ۱۲ ادو آنہ

"منیجر"

معیارِ طلب

از جناب وارث القادری

کیا ہے اس دنیا میں کس منہ سے یہ دنیا مانگتا
مانگتا اُن سے تو میں اُنکے سوا کیا مانگتا

دربدر اے کاش دنیا میں نہ پھرتا مانگتا
بات بن جاتی جو مالک تجھ سے بندہ مانگتا

خود جھک سکتا تو کیوں پر تو تمہارا مانگتا
بھیک آ جائے کی نہ سورج روزمرہ مانگتا

سارا عالم دولت دیدار کا طالب اُدھر
اور اِدھر یہ آرزو میری کہ تنہا مانگتا

ہم نہ کہتے تھے کہ جھولی خالی ہی رہ جائیگی
بندگی کے دائرے میں کاش بندہ مانگتا

درد آہیں یاد آنسو غم خلش بے تابیاں
اس نے بے مانگے ہی سب کچھ دیدیا کیا مانگتا

چاند آیا ان کے آگے ہاتھ پھیلائے ہوئے
اور سورج عاجزی کے ساتھ نکلا مانگتا

جی! وفا کے قدرداں بھی آپ ہیں بندہ نواز
آپ سے انعام میں اپنی وفا کا مانگتا؟

گلشن ہستی کے رکھوالے! یہ کیا ممکن نہ تھا
اک ذرا کھلنے کی مہلت دل کا غنچہ مانگتا

چشم ساقی بے نیاز جام و صہبا کر گئی
توبہ توبہ میں بھلا کیوں جام صہبا مانگتا

اس کی عظمت سے اگر آگاہ ہوتا باغباں
وہ بھی میرے آشیاں کا کوئی تنکا مانگتا

سب یہ کہتے ہیں خوشی میں ہمکو حصہ چاہئے
کاش وارث رنج و غم میں کوئی حصہ مانگتا

غزل

از جناب ولی الحق صاحب انصاری لکھنوی

وہی طبیعت کی ہے اداسی وہی ہے دل کی فغاں مزاجی
بہار کیا زندگی میں آئے نہ جا سکے جب خزاں مزاجی

نبھے گی کیونکر بنے گی کیسی تمہیں بتاؤ یہ مہ جبینو،
ادھر تمہاری وہ جلوہ پاشی ادھر ہماری کتاں مزاجی

ہیں فلک کی بلندیوں تک اڑائے پھر رہے تھے بازو
زمیں پہ لیکن اتار لائی ہماری یہ آشیاں مزاجی

یہی ہے فطرت یہی طبیعت یہی اصولِ حیات اپنے
یہ پیش گرگاں درندہ خوئی یہ روبہ یاں شباں مزاجی

بلندیوں تک اگر رسائی کی ہے تمنا تو مثلِ شاہیں
خمیر میں پہلے اپنے شامل تو کرلے تو آسماں مزاجی

مصیبتوں کا اگر اندھیرا ہوا تو چمکیں گے اور جوہر
ملی ہے میرے وجود کے ذرّے ذرّے کو کہکشاں مزاجی

نہ جانے کیا کچھ کرے گی ظالم یہ تیری شوخی یہ تیری تیزی
نہ جانے ڈھائے گی کیا قیامت یہ تیغ طبعی سناں مزاجی

ولی نہ جانے کبھی بھی یاد گے تم مصالح کے بندھنوں سے
نہ جانے برے گی بھی کبھی یہ تمہاری سود و زیاں مزاجی

جامع مسجد، دہلی نمبر ۶،

قرآن مجید کے منزل من اللہ ہونے کا ایک ثبوت امور غیب کے متعلق اسکی جزئیں اور پیشین گوئیاں بھی ہیں جو حرف بحرف صحیح ثابت ہوئیں، فاضل مصنف نے اس کتاب میں قرآن مجید کی پینسٹھ اور حدیث کی پینتیس خبریں اور پیشینگوئیاں نقل کرکے ان کی تاویل و تشریح کی ہے اور آیندہ ہونے والے واقعات و حوادث سے ان کی تطبیق و تصدیق دکھائی ہے، شروع میں قرآن مجید کے اعجاز کے بعض پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے، گو مصنف کی بعض توجیہات سے اتفاق ضروری نہیں ہے تاہم ان کی یہ محنت اور اس پہلو سے قرآن و حدیث کی خدمت قابل تحسین ہے،

امراض صدر، مرتبہ جناب مولوی حکیم عزیز الرحمن صاحب اعظمی متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت قدرے بہتر صفحات ۲۰۶، قیمت درج نہیں ناشر وصیۃ المعارف دیوبند یوپی

زیر نظر کتاب میں سینہ اور قلب کی بیماریوں کی تشخیص اور ان کے اسباب اور علامتیں تحریر کی گئی ہیں، یہ دراصل ایک امریکن کتاب کی تلخیص ہے، جس میں جسم کی تمام بیماریوں کے اسباب اور علامتوں کی نشاندہی کی گئی تھی، لائق مصنف نے اس کے اسی حصہ کی تکمیل کی ہے، جس میں امراض صدر و قلب کا ذکر ہے، اس سے انگریزی سے ناواقف معالجین اور اطبار کو ان امراض کی تشخیص میں آسانی ہوگی، اس میں اسی سے زیادہ امراض قلب و صدر کے اسباب بیان کئے گئے ہیں، اور آخر میں بعض کے مجرب نسخے بھی لکھ دیئے گئے ہیں، یہ خالص فنی کتاب عام مذاق کی نہیں ہے، مگر اہل فن کے لئے نہایت کارآمد اور مفید ہے، اس سے اردو کی طبی کتابوں میں مفید اضافہ ہوا،

دنیا اسلام سے پہلے اور اس کے بعد، مرتبہ مولانا عبد السلام قدوائی ندوی، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۱۲۰ مجلد قیمت ۲/۸ پیسے، پتہ:-

مطبوعات جدیدہ

اللآلی المنثورہ ۔ مرتبہ مولانا عبد الحفیظ بلیاوی مرحوم تقطیع کلاں، کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۲۰۹ قیمت عہ ناشر کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی ۶۔

یہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی جامع ترمذی اور سنن ابی داؤد پر ان تقریروں کا مجموعہ ہے، جن کو ان کے ایک لائق شاگرد اور دار العلوم ندوۃ العلماء کے سابق استاذ مولانا عبد الحفیظ بلیاوی مرحوم نے دوران درس قلمبند کیا تھا، اس میں ان دونوں کتابوں کے بعض ابواب اور ان کے اسناد و متون کے مشکلات سے تعرض کیا گیا ہے، اور ان میں بیان کئے گئے فقہی آثار، ائمہ کے مسالک حنفی مذہب کے وجوہ ترجیح اور متعارض حدیثوں میں تطبیق وغیرہ کی خاص طور پر وضاحت اور مختلف وجوہ و معانی پر دلالت کرنے والی حدیثوں اور روایت و درایت سے متعلق ضروری اور اہم مسائل و مباحث کی تشریح کی گئی ہے، اس حیثیت سے یہ مجموعہ طلبۂ حدیث کے لئے واقعی ایک نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں، لیکن اگر اس کو ترتیب و تہذیب کے بعد کسی صاحب فن کے مقدمہ و حواشی کے ساتھ شایع کیا گیا ہوتا تو اس سے مراجعت میں بھی آسانی ہوتی اور اس کا افادہ بھی زیادہ ہو جاتا، موجودہ شکل میں یہ نوٹ اور اشارات درس و تدریس کا مشغلہ رکھنے والوں ہی کے لئے مفید اور کارآمد ہو سکتے ہیں۔

اخبار التنزیل ، مرتبہ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سنبھلی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۱۸۴، قیمت غیر مجلد عہ مجلد سے، پتہ مکتبہ ... اردو بازار

کے اقوال و اعمال کے تعارض کی توجیہات تحریر کی گئی ہیں، دوسرے میں اختلاف آثار یعنی صحابہ کرام و تابعین عظام کے اقوال و افعال میں تعارض کے وجوہ کا ذکر ہے، اور آخر میں اختلاف مذاہب یعنی فقہاء و مجتہدین کے درمیان اختلاف کے اسباب بیان کرکے دکھایا گیا ہے کہ فروع و جزئیات میں اختلاف ناگزیر اور فطری ہے، اور اس بارہ میں جو اشکالات و شبہات پیش کئے جاتے ہیں وہ محل اور احکام شرعیہ میں قصور نظر کا نتیجہ ہیں گو رسالہ ناتمام ہے تاہم اس میں کوئی نقص اور کمی معلوم نہیں ہوتی، اور جس قدر بھی ہے نہایت مفید ہے، حضرت شیخ الحدیث کے دوسرے علمی افادات و تبرکات کی طرح یہ رسالہ بھی مفید حدیثی و فقہی مباحث پر مشتمل ہے اس لئے یہ فقہ و حدیث کے طلبہ کے خاص طور پر مطالعہ کے لائق ہے،

مکاتیب طیب - مرتبہ جناب مولوی شفیق احمد اعظمی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۲۴ مجلد قیمت للعہ رپتہ :- مکتبہ نعمانیہ دیوبند، یوپی،

یہ مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند کے ان خطوط و مکاتیب کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ہندو پاک کے بعض اصحاب کے استفسارات کے جواب میں، گذشتہ دس سال کے اندر وقتاً فوقتاً لکھے ہیں، اس لئے ان میں مختلف النوع علمی و دینی اور فقہی و کلامی مسائل کا ذکر ہے، بعض میں شرعی احکام کے حکم و مصالح بیان کئے گئے ہیں، بعض خطوط میں اسلام اور اسلامی تعلیم کے بارہ میں شکوک و شبہات اور بعض عصری مسائل تسخیر قمر وغیرہ سے متعلق سوالات کا جواب دیا گیا ہے، چند خطوط میں جماعت دیوبند کے افکار و عقائد تحریر کئے گئے ہیں، اور آخر میں مولانا کا ایک طویل مکتوب درج ہے، جو انھوں نے لندن سے اپنے خویش مولانا حامد الانصاری غازی کو لکھا تھا، اس میں وہاں کے دلچسپ حالات و کوائف کا ذکر ہے، فاضل مرتب نے ہر مکتوب سے پہلے اصل استفسار کا خلاصہ بھی دیدیا ہے، جس سے جواب کا پس منظر واضح ہوجاتا ہے، یہ خطوط دلچسپ اور مفید علمی و دینی معلومات پر مشتمل ہیں شروع میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی صاحب برہان کے قلم سے دلچسپ مقدمہ بھی ہے،

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی نمبر ۲۵

اس کتاب میں دکھایا گیا ہے کہ اسلام سے پہلے دنیا کا کیا حال تھا، اور اسلام کے بعد اس میں کیا تبدیلی پیدا ہوئی یہ فاضل مصنف کے چار مضامین پر مشتمل ہے، پہلے مضمون میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے کی دنیا کا عمومی جائزہ لیا گیا ہے، اور اس زمانہ کے متمدن ممالک اور مشہور مذاہب روم، ایران، چین و ہندوستان اور یہودیت و عیسائیت کے سیاسی، معاشی، سماجی اور مذہبی و اخلاقی حالات بیان کئے گئے ہیں، دوسرے مضمون میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس لائحہ عمل اور پروگرام کا ذکر ہے، جو آپ نے دنیا کے حالات کی اصلاح اور انسانیت کے بگاڑ کی درستی کے لئے پیش کیا تھا، تیسرے مضمون میں اسلام کی اہم اور بنیادی تعلیم یعنی خدا کی وحدانیت کا ذکر ہے، اور آخری مضمون میں سیرت پاک کا مختصر خاکہ پیش کیا گیا ہے، یہ مضامین مختصر ہونے کے باوجود نہایت مفید ہیں، انداز تحریر موثر اور دلکش ہے،

اختلاف الائمہ، از حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۷۹ قیمت ۵۰ پیسے پتہ: کتب خانہ اشاعت اسلام محلہ مفتی سہارنپور۔

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ نے رسالہ المظاہر کے لئے ۱۳۴۶ھ میں یہ مقالہ بالاقساط لکھنا شروع کیا تھا، مگر رسالہ کے بند ہو جانے کی وجہ سے یہ سلسلہ موقوف ہو گیا، اور قدردانوں کے اصرار اور حضرت شیخ کی خواہش کے باوجود ان کی علمی تدریسی اور تصنیفی مشغولیتوں کی وجہ سے اس کی تکمیل کا موقع نہ مل سکا، اس لئے ان کے عزیز مولوی محمد شاہد صاحب نے افادۂ عام کے لئے اسی ناتمام مضمون کو اب کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے بعض رسائل و تصنیفات کی طرح امت کے اختلافات کے اسباب و وجوہ بیان کئے گئے ہیں، یہ تین حصوں میں ہے، پہلے حصہ میں اختلاف روایات یعنی رسول اکرم صلعم

رجسٹرڈ نمبر ال (۵۲۰)

اکتوبر ۱۹۷۳ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

(کتبہ اقبال احمد)

درخشاں :- از جناب حفیظ بنارسی تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۱۹۲، مجلد مع گرد پوش قیمت صہ، پتہ کلچرل اکاڈمی رینا ہاؤس جگ جیون روڈ۔ گیا،

جناب حفیظ بنارسی نوجوان اور خوش فکر شاعر ہیں انکا کلام ادبی رسائل میں چھپتا رہتا ہے، اب انھوں نے "درخشاں" کے نام سے اپنا پہلا مجموعہ کلام شائع کیا ہے، جو غزلوں کے علاوہ چند نظموں اور قطعات و رباعیات پر مشتمل ہے۔ ان کے کلام میں حسن و عشق کی رنگینیاں بھی ہیں، اور حالات حاضرہ کے مرقعے بھی، "عہد نو" کی اخلاقی پستی اور سماجی ناہمواری کے بارہ میں کہتے ہیں، ؎

ابھی نامکمل ہے جشن چراغاں کہیں روشنی ہے کہیں ہے سیاہی

حفیظ صاحب کی نظموں اور رباعیات و قطعات میں فکر و خیال کی بلندی کے ساتھ انداز بیان کی دلکشی بھی ہے، "تاج محل" میں ایک مشہور ترقی پسند شاعر کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے، "جوانی" اور "شاہد یاد" وغیرہ نظموں سے ان کے تخیل کی پاکیزگی ظاہر ہوتی ہے، "درخشاں" ادبی حلقوں کے خیر مقدم کے لائق ہے،

ہدیہ عثمانی :- از مولانا عثمان احمد قاسمی، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۱۲۰، مجلد مع گرد پوش قیمت عہ، پتہ علمی کتاب گھر۔ شاہ گنج، جون پور،

مولانا عثمان احمد قاسمی مدرس مدرسہ بدر الاسلام شاہ گنج موزوں طبع اور خوش فکر شاعر بھی ہیں نعت گوئی سے ان کو زیادہ مناسبت ہے، اور وہ توحید و رسالت کے مرتبہ شناس اور الوہیت و نبوت کے حدود و مراتب سے واقف ہیں، اسلئے ان کی نعتیں جوش و جذبہ کے ساتھ خیالات کے اعتدال و توازن کا نمونہ ہیں۔ مجموعہ کے آخر میں چند نظمیں اور غزلیں بھی ہیں، نظموں میں بعض مرحومین اور موجود اکابر علم کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے،

ض

جلد ۱۱۲ ماہ رمضان المبارک ۱۳۹۳ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۷۳ء عدد ۴

مضامین

شذرات — سید صباح الدین عبدالرحمن — ۲۴۲-۲۴۴

مقالات

ملا محمود جونپوری کی سوانح حیات کے بعض نئے ماخذ — جناب بشیر احمد خانصاحب غوری ایم اے، ایل ایل بی، سابق رجسٹرار عربی و فارسی اترپردیش — ۲۴۵-۲۶۲

مولانا محمد علیؒ کی یاد میں — سید صباح الدین عبدالرحمن — ۲۶۳-۲۷۸

دیوان ہادی — جناب ڈاکٹر امیر حسن عابدی صاحب دہلی یونیورسٹی — ۲۷۹-۲۹۴

ابوداود نے صاحب اسرار میں — جناب مولانا محمد شفیع حجۃ اللہ فرنگی محلی — ۲۹۵-۳۱۱

خریطۂ جواہر — شاہ معین الدین احمد ندوی — ۳۱۲-۳۱۶

مطبوعات جدیدہ — "ض" — ۳۱۷-۳۲۰

اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں

مصر و شام و حجاز وغیرہ اسلامی ملکوں کے مقابلہ میں ہمارے ملک ہندوستان میں بھی اسلامی علوم و فنون پر کچھ کم کام نہیں ہوا ہے، تقریباً تمام علوم پر ہندوستانی علماء اور مصنفین کی بہترین کتابیں موجود ہیں جن سے تمام دنیا متمتع ہو رہی ہے، لیکن اُن کی کوئی جامع فہرست اُردو میں کیا کسی زبان میں بھی مرتب نہیں ہوئی تھی، اسی خلاء کو پُر کرنے کے لئے مولانا حکیم سید عبد الحئی صاحب نزہۃ الخواطر نے الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند کے نام سے عربی میں ایک فہرست مرتب کی تھی جو دمشق سے شائع بھی ہو گئی ہے، یہ اسی عربی کتاب کا ترجمہ ہے، اس میں ہندوستانی علماء مصنفین کی تمام معلوم تصانیف کے ذکر کے ضمن میں اجمال کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کے علمی و دینی و فکری تاریخ بھی آگئی ہے، اس طرح سے یہ کتاب ہندوستان کے اسلامی دور کے محققین کے لئے ایک مستند ترین ماخذ بن گئی ہے،

ضخامت:۔ ۴۰۰ صفحے قیمت:۔ دس روپے

مترجمہ: مولانا ابو العرفان ندوی

اور مفید احکام کو دبائے رکھتے ہیں، یا ان کو عملی شکل دینے میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں،
یہ بھی کہا جارہا ہے کہ اردو اساتذہ کے تقرر کی جو تعداد بتائی جاتی ہے وہ صحیح نہیں ہے،
اگر کاغذ پر ان سب کا تقرر ہو گیا ہے تو ابھی وہ بہت سے اسکولوں میں بھیجے نہیں گئے ہیں،
ایسے لوگوں کا یہ بھی اعتراض ہے کہ اردو کی جو ریڈر بچوں کو پڑھانے کے لئے تیار کی گئی ہیں
وہ بعض وجوہ سے پڑھانے کے لائق نہیں، پھر یہ کتابیں آسانی سے بازار میں ملتی بھی نہیں، غیر
ضروری اہتمام کے بعد مختلف ناشروں سے منگوائی جاتی ہیں تو وقت پر نہیں پہونچتی ہیں، جن
اسکولوں کو اردو پڑھانے کے سلسلہ میں امداد ملتی ہو اسکا وقت پر حاصل کرنا بھی صبر آزما ہوتا ہے، اور اگر کسی وجہ
سے رک جاتی ہو تو اسکو پھر سے اجراء کرانے کی ساری کارروائیاں دفتری کاغذات کے ڈھیر کی نذر ہو جاتی ہیں۔

اردو بولنے والوں کی نگرانی میں جو ثانوی اسکول قائم ہیں انہیں سے بعض جگہوں
پر ابتدائی درجوں میں تعلیم اب تک ہندی میں دیجا رہی ہے، ان کا عذر یہ ہے کہ اگر انہیں
اردو میڈیم کر دیا جائے تو ہندو طلبہ داخلہ لینا پسند نہ کریں گے، جس سے تعداد میں اتنی
کمی ہو جائے گی کہ مالی آمدنی پر اثر پڑے گا، اور اگر ان کا داخلہ لیا جائے تو علحدہ ہندی
سیکشن کرنا ہوگا جس کے لئے اساتذہ اور عمارت میں اضافہ کرنا ناگزیر ہو جائیگا یہ آسانی
سے ممکن نہیں ہے، اس کے علاوہ ان کی یہ بھی ذہنی کشمکش ہے کہ اردو میں ابتدائی و ثانوی
درجوں میں تعلیم پانے کے بعد یونیورسٹیوں میں ہندی کے ذریعہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا کیسے ممکن
ہو سکے گا، پھر صرف اردو میں تعلیم پاکر طلبہ سرکاری ملازمتوں کیلئے مفید اور قابل ترجیح سمجھے بھی جائینگے کہ نہیں،
ممکن ہے کہ یہ مشکلات اور اعتراضات صحیح ہوں لیکن نجی مجلسوں میں بیٹھ کر سینے کے
داغوں سے دل کے پھپھولوں کو جلاتے رہنے میں اردو کے مشکل مسئلوں کا حل نہیں ہے، زبان
کو اسی وقت زندہ رہتی ہے جب اس کے بولنے والے اس کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں، غیرت و

شذرات

ابھی حال ہی میں اترپردیش کی اردو اکاڈمی کی طرف سے دو گشتی مراسلے جاری ہوئے ہیں، جنکا خلاصہ یہ ہے کہ اترپردیش کی میونسپلٹیوں کے پرائمری اسکولوں میں اسوقت تک ساڑھے تین ہزار استاد اردو پڑھانے کے لئے مقرر ہو چکے ہیں، ایک ہزار جونیر اسکولوں اور ۲۰۴ گورنمنٹ ہائر سکنڈری اسکولوں میں بھی اردو کے استاد مقرر کئے جا رہے ہیں، کسی ڈگری کالج میں اگر اردو کا شعبہ کھولا جائے گا تو حکومت اسکو بھی مالی امداد دیگی۔

مگر ان مراسلوں میں یہ بھی ہے کہ ان اسکولوں میں اردو پڑھنے کے لئے بہت کم بچوں نے داخلہ لیا ہے، جو ایک افسوسناک امر ہے، جس کے بعد اردو کے اساتذہ کا تقرر بے معنی ہوتا نظر آتا ہے، اس کے علاوہ درجہ تین سے درجہ آٹھ تک اردو میڈیم کی جو کتابیں حکومت نے چھپوائیں، وہ کم تعداد میں فروخت ہوئیں، آخر میں اردو اکاڈمی کی طرف سے اپیل ہے کہ اردو دوست اس کی پوری کوشش کریں کہ ہر شہر کی درسگاہوں میں بچے کافی تعداد میں "ہندوستان جنت نشان کی مشترکہ تہذیب کی علامت یعنی اردو پڑھتے نظر آئیں"۔

ابتک اترپردیش کی حکومت پر اعتراض تھا کہ اس کی طرف سے اردو پڑھانے کا کوئی انتظام نہیں ہے، حکومت نے اپنی طرف سے تو اس اعتراض کو دور کر دیا ہے، لیکن اب اس کی نیت پر شکوک کا اظہار یہ کہکر کیا جا رہا ہے کہ یہ محض آیندہ انتخابات میں ووٹ حاصل کرنے کی ایک چال ہے اس کے پیچھے اردو دوستی کا کوئی مخلصانہ جذبہ نہیں ہے، اسکی تائید میں محکمۂ تعلیم کے ان ملازموں کے رویے کو پیش کیا جاتا ہے جو اردو سے متعلق ہیں

مقالات

مُلّا محمود جونپوری کی سوانح حیات کے بعض نئے مآخذ

از جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے، ایل ایل بی، سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش (۱)

معارف کی سابقہ اشاعت میں مولانا قاضی اطہر مبارکپوری صاحب کا ایک فاضلانہ مقالہ "ملا محمود جونپوری علیہ الرحمۃ پر شائع ہوا ہے، قاضی صاحب نے اپنے رئیس التذکرہ کے متعلق دس مآخذ گنائے ہیں، جن میں سے تین کمیاب یا نایاب ہیں اور سات ان کے پیش نظر تھے، ان میں سے قدیم ترین مآخذ فاضل جونپوری کے معاصر اور بہنوئی حاجی شاہ ابوالخیر بن شاہ ابو سعید بھیروی کی نایاب کتاب "شیر و شکر" ہے جسے انھوں نے ملا صاحب کی وفات سے پانچ چھ سال پہلے ۱۰۵۶ھ میں مرتب فرمایا تھا، آخری مآخذ قاضی صاحب نے مولانا عبد الحی فرنگی محلی کا ترجمہ مولف "شمس البازغہ" بتایا ہے جو "شمس بازغہ" کے آخر میں چھپا تھا۔

زندہ قومیں اپنے اکابر کی سوانح حیات سے متعلق معمولی سے معمولی چیزوں کے ساتھ اہتمام برتتی ہیں، چنانچہ ایران میں عمر خیام کی سوانح کے سلسلے میں وہاں کے فضلاء کے درمیان عرصہ تک یہ بحث چلتی رہی کہ اسکا قدیم ترین حوالہ کس کتاب میں ملتا ہے اور پھر یہ بحث ہندوستان میں بھی ہونے لگی: "چہار مقالہ" نظامی عروضی سمرقندی کی ترتیب و تحریر کے بعد پروفیسر ای جی براؤن

حمیت کا بھی یہ تقاضا نہیں کہ ہم خود تو کچھ نہ کریں لیکن امید لگائے بیٹھے رہیں کہ حکومت سب کچھ ہمارے لئے کر دیگی، پھر محض حکومت کے سہارے کسی زبان کا زندہ رہنا ضروری نہیں، مغلوں کے دورِ حکومت میں فارسی زبان کو ہر قسم کی سرپرستی حاصل رہی لیکن وہ اس ملک میں اس لئے زندہ نہیں رہ سکی کہ اس کے بولنے والوں نے اس کو زندہ رکھنے کی صحیح کوشش نہیں کی، زبان کی بقا کے لئے ضروری ہے کہ اس کے لئے حکومت کچھ کرے یا نہ کرے اس کے بولنے والے اس کے لئے اپنی طرف سے سب کچھ کرتے رہیں، مغلوں کے زمانے میں کچھ ایسے منصب دار بھی تھے جو کچھ بھی نہ کرتے لیکن گھر بیٹھے تنخواہ پاتے رہتے، ایسے منصبدار احدی کہلاتے، اب اردو میں یہ اصطلاح کاہلوں کے لئے استعمال ہونے لگی ہے، اردو بولنے والے اردو کی خدمت احدی منصبدار بن کر نہیں کر سکتے۔

اقلیت خواہ سیاسی ہو یا لسانی، رعایتوں کی بھیک مانگ کر اثر انداز نہیں ہو سکتی ہے، وہ اسی وقت باعزت اور باوقار ہو سکتی ہے جب وہ اپنی جدوجہد بلکہ پامردی اور سرفروشی سے ہر مشکل کا سامنا کرنے میں سینہ سپر رہتی ہے پھر جب پوری نہ سہی تھوڑی ہی بہت رعایتیں مل رہی ہوں تو ان پر شکوک کا اظہار کرنا خود شکستگی اور کوتاہ دستی کی دلیل ہے، زندگی کے میخانہ میں جو بڑھ کر خود ہاتھ میں مینا اٹھا لیتا ہے، جینا اسی کا جینا ہوتا ہے، تعلیم حاصل کرنے میں ملازمت حاصل کرنیکی اقتصادی منفعت کا لحاظ ضرور سامنے ہونا چاہئے لیکن اسکا بھی احساس رکھنا ضروری ہو کہ مادری زبان کی محرومی کے بعد قوم یا ملت گونگی اور بہری بنکر رفتہ رفتہ فنا ہو جاتی ہے، اندھرا پردیش میسور، مہاراشٹر، اور بہار میں، اسکول اور کالج اردو میڈیم کے ذریعہ چل رہے ہیں جو زبان حال سے اتر پردیش کے اردو بولنے والوں پر یہ طنز کر رہے ہیں کہ وہ اردو کے کعبہ میں رہ کر اردو کو کفر کا درجہ دئے ہوئے ہیں، پھر بھی اقتصادی طور پر ان سے کچھ بہتر نہیں ہیں۔

کی شخصیت بحیثیت ایک رباعی گو شاعر کے مشکوک الصحۃ ہے، مگر ملا محمود جونپوری کی شہرت بحیثیت ایک عظیم فلسفی کے مسلم الثبوت ہے، وہ نہ صرف اسلامی عہد کے ہندوستان کے عظیم ترین فلسفی تھے، بلکہ اسلامی فکر کی تاریخ میں جن عباقرہ نے فکر انسانی کی ثروت میں اضافے کئے ہیں، ان میں بھی اسکا ایک ممتاز مقام ہے، اس صدی کے نصف اول تک ان کی مایہ ناز تصنیف "الشمس البازغہ" عربی مدارس میں داخل درس اور علما، فضلاً کی بحث وتمحیص کا ایک اہم موضوع تھی، اور نہ صرف خواص ہی اس کی عظمت کے آگے سر احترام خم کرتے تھے، بلکہ عوام میں بھی اس کی جلالت قدر مسلم تھی۔ وہ نہ صرف سنجیدہ جگر کاوی کا "SYMBOL" (علامت) تھی، بلکہ اسکا منتہائے کمال سمجھی جاتی تھی۔

آخری زمانہ میں بھی جب جدید کا قدیم سے ناطہ ٹوٹ چکا تھا اور فضلائے عہد اپنے اسلاف کی علمی وفکری کاوشوں کو بالکل بھلا چکے تھے، وہ ملا محمود جونپوری کی عظمت و جلالت قدر اور تفکیری سرگرمیوں کے باب میں ان کی انفرادیت کو فراموش نہ کرسکے، چنانچہ جب علامہ اقبال کو معلوم ہوا کہ مسئلہ زمان کے بارے میں اسلامی عہد کے ہندوستان کے فضلا بھی قابل قدر فکری کارنامے انجام دیئے ہیں تو انھوں نے مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم ومغفور سے دریافت کیا:۔

ملا محمود جونپوری کو چھوڑ کر کیا اور فلاسفہ بھی ہندوستانی مسلمانوں میں پیدا ہوئے، ان کے اسمارسے مطلع فرمایئے، اگر ممکن ہوسکے تو ان کی بڑی بڑی تصانیف سے بھی،، (مکتوب اقبال بنام سید سلیمان ندوی مورخہ ۲ اگست ۱۹۳۳ء بحوالہ معارف اکتوبر ۱۹۵۱ء ص ۳۱۲)

یقیناً ایسی عظیم المرتبت شخصیت ہمارے انتہائی اعتنا و اہتمام کی مستحق ہے اور اسے

اور مرزا محمد بن عبد الوہاب قزوینی کا خیال تھا کہ اس باب میں اقدمیت کا شرف اس کتاب (چہار مقالہ) کو حاصل ہے، مگر پروفیسر قاری کلیم اللہ حسینی صاحب نے جب ابو الحسن البیہقی کی "تتمہ صوان الحکمہ" کو ازسرنو ایڈٹ کرنا چاہا جسکو اس سے پہلے پروفیسر محمد شفیع اسے باقاعدہ ایڈٹ کرکے شائع کر چکے تھے، تو انھوں نے دعویٰ کیا کہ خیام کی سوانح حیات کے باب میں "چہار مقالہ" سے بھی اقدم "تتمہ صوان الحکمہ" ہے،

ملاحظہ ہو "معارف" اکتوبر ۱۹۶۲ء و نومبر ۱۹۶۲ء میں راقم الحروف کا مقالہ "عمر خیام کا قدیم ترین تذکرہ" صفحہ ۲۸۴-۲۹۵ و ۳۶۶-۳۸۰، مگر اب خود ایران میں عمر خیام کے قدیم ترین تذکرہ کی حیثیت سے ان دونوں کتابوں کی اہمیت تقویم پارینہ بن چکی تھی، کیونکہ فضلائے ایران نے نئے اور قدیم تر مآخذ ڈھونڈھ نکالے ہیں: مکاتیب حکیم سنائی، رسالہ الزاجر للصغار للزمخشری اور میزان الحکمہ للخازنی - ابھی یہ بحث چل ہی رہی تھی کہ آقائے سعید نفیسی نے ایک اور مآخذ کا پتہ چلایا، یہ امام فخر الدین رازی کی "تفسیر کبیر" ہے مگر اس سلسلے میں بنیادی سوال یہ پیدا ہوا کہ

خیام کا تذکرہ تفسیر کبیر میں؟

(ملاحظہ ہو عنوان بالا سے راقم الحروف کا مقالہ مجلہ "علوم اسلامیہ" علیگڈھ بابت دسمبر ۱۹۶۰ء میں)

اس غیر متعلقہ تفصیل سے اس بات کی اہمیت نمایاں کرنا ہے کہ زندہ قومیں اپنے اسلاف کے احوال و آثار کے علاوہ ان کے مآخذوں کے سلسلے میں بھی کس قدر اہتمام برتتی ہیں -

ملا محمود جونپوری کی شخصیت کسی حیثیت سے بھی عمر خیام سے کم نہیں ہے، عمر خیام تو ایران ہو یا ہندوستان یا یورپ ہر جگہ صرف اپنی "رباعیات" ہی کی وجہ سے مشہور رہے، حالانکہ یہ رباعیاں ابھی تک قیل و قال کا موضوع بنی ہوئی ہیں، بلکہ بعض محققین کے نزدیک تو خود خیام

تعلقات رہے ہوں گے، جہاں تک عہد شاہجہانی کے علما، وفضلار کے حالات کا تعلق ہے یہ تذکرہ بہت زیادہ مستند اور قابل اعتماد ہے، اس تذکرہ کا نام "باغستان" ہے اور اس میں ملا محمود جونپوریؒ کے حالات اسطرح مذکور ہیں،

"ملا محمود جونپوری در فروع واصول ومعقول ومنقول بکمال رسیدہ بود ودر تفسیر وحدیث وحکمت مہارت تمام داشت، مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی باوجو کمال خود بکمال جامعیت او، اظہار اقرار واعتراف لفضل ودانش او می نمود۔ فاضل محقق وکامل مدقق بود۔ عالم متوحد وعارف موحد مولوی عبدالحکیم در مناظرہ علم توحید ہائے مقاومت نداشت ومی فرمود کہ مولانا نفس قدمی لست نادر دیو دسخن را خاصہ معقولات بمنوالے یافتہ کہ کارنامۂ دیگران در پیش او بمصداق ان اوھن البیوت لبیت العنکبوت ست تار نسج عنکبوت است"۔

(تذکرہ باغستان صفحہ ۶۸۴ ب، ۶۸۵ الف)

اس سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں:۔

(۱) تذکرہ باغستان کا سال تصنیف ۱۱۴۵ھ ہے، اس لئے یہ مولانا غلام علی آزاد کے دونوں تذکروں "سبحۃ المرجان" اور "مآثر الکرام" سے زیادہ قدیم ہے،

امام الدین ریاضی ایک صاحب تصنیف عالم تھے، اور اپنے روسائے تذکرہ کی علمی کاوشوں کو ذمہ داری کیساتھ پرکھنے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے، مولانا غلام علی آزاد بھی ایک جیّد عالم تھے مگر ان کے دوسرے مشاغل اس وقت نظر کی انھیں فرصت نہیں دیتے تھے، مثلاً علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کا ایک مشہور رسالہ ہے "الدرۃ الثمینۃ" مولانا آزاد نے اس کے موضوع کے متعلق فرمایا ہے:۔

یہ حق ہے کہ اپنے اخلاف سے اپنے مرتبہ کے مطابق خراجِ تحسین وعقیدت وصول کرے، قاضی اطہر صاحب نے اس قرض کی پہلی قسط چکا کر پوری قوم کی جانب سے فرض کفایہ انجام دیا ہے،

لیکن قاضی صاحب کی کاوش کو حرف آخر قرار دینا خود ان کے رئیس التذکرہ کی تنقیص کے مترادف ہوگا، ملا محمود جونپوریؒ کا فضل وکمال اتنا محدود نہیں ہے، کہ ایک ہی محقق کا دامن قلم اسے سمیٹ سکے،

اور یہی احساس ان چند سطور کی نگارش کا باعث ہوا وللہ التوفیق

(الف) ملا محمود جونپوری کی سوانح حیات کا ایک نیا ماخذ | مجھے جس ماخذ کو متعارف کرانا ہے وہ نہ تو "نثر وشکر" کی طرح قدیم یا اس سے اقدم ہے اور نہ قاضی صاحب کے گنائے ہوئے دوسرے ماخذوں کی طرح تفصیلی، بایںہمہ قدیم بھی ہے اور اس میں فاضل جونپوری کی علمی زندگی سے متعلق ایسے واقعات بھی مذکور ہیں جو دوسرے تذکروں وتراجم میں نہیں ملتے،

امام الدین ریاضی عربی مدارس کے اساتذہ وطلبہ میں "التصریح فی الہیئۃ" کے مصنف کی حیثیت سے مشہور ہیں، وہ تاج محل آگرہ کے مشہور معمار استاد احمد کے پوتے اور اس علمی خاندان کے ایک فرد فرید تھے، ان کے حالات زندگی پر مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم ومغفور نے ایک سیر حاصل مقالہ سپرد قلم فرمایا تھا، مگر اس میں ان کی صرف دو تین کتابوں ہی کا نام ہے،

لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری میں ان کی ایک اور نادر تصنیف کا پتہ چلا ہے جو شعراء کے علاوہ علماء وفضلاء کے تذکرے پر بھی مشتمل ہے، ان میں سے بہت سے فضلاء سے ان کے براہ راست تعلقات تھے، باقی کے حالات میں ان کا ماخذ اپنے پدر بزرگوار لطف اللہ مہندس کا تذکرہ ہے، لطف اللہ مہندس اپنے عہد کے اکابر علماء میں تھے اس لئے ان کے دوسرے معاصرین سے بھی

(۲) ملا محمود جونپوری، ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کے ہمعصر تھے، دونوں کے سنین وفات سے خیال ہوتا ہے کہ شاید موخر الذکر مقدم الذکر سے عمر میں چھوٹے ہوں[1]، کیونکہ حسب تصریح مولانا غلام علی آزاد ملا محمود کا انتقال ۱۰۶۲ھ میں اور ملا عبدالحکیم کا ۱۰۶۷ھ میں ہوا تھا لیکن عہد جہانگیری کے مشاہیر علماء و فضلاء میں علامہ سیالکوٹی کا نام تو ملتا ہے، چنانچہ معتمد خاں ساقی نے "اقبالنامہ جہانگیری" کے آخر میں "ذکر فضلائے عہد" کے زیر عنوان لکھا ہے، .... ملا عبدالحکیم سیالکوٹی[2]،

مگر اس ذکر فضلائے عہد میں ملا محمود جونپوری کا نام نہیں ملتا۔

ہو سکتا ہے کہ اسے جہانگیر کے آخری پر محمول کیا جائے جیسا کہ "بادشاہنامہ" میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کے تذکرے میں عبدالحمید لاہوری کی صراحت سے مترشح ہوتا ہے۔

"در ایام سعادت فرجام حضرت جنت مکانی بضروریات معیشت در ساختہ عزلت گزیدہ بود[3]"

مگر اس کی توجیہ تو یہ کی جا سکتی ہے کہ جس زمانہ میں "اقبالنامہ" مرتب ہو رہا تھا[4]، ملا محمود جونپوری کم عمر[5] تھے اور فارغ التحصیل ہوئے مشکل سے چار سال ہوئے تھے[6] ....

---

[1] ملا محمود کا یہ بیان صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ ملا محمود جونپوری ۹۹۳ھ میں پیدا ہوئے تھے جب ملا عبدالحکیم سیالکوٹی فارغ التحصیل ہو چکے تھے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ علامہ سیالکوٹی کے استاد ملا کمال الدین کشمیری کا ۱۰۱۷ھ میں انتقال ہو چکا تھا (مزید تفصیل آگے آرہی ہے)، [2] بادشاہنامہ جلد اوّل صفحہ ۳۴۱۔ بادشاہنامہ ہی سے مولانا غلام علی آزاد نے نقل کیا ہے۔ "در عہد جہانگیری بمعاش ضروری ساختہ و در وطن مالوف بسر می بردہ" (مآثر الکرام صفحہ ۲۰۴)،

[3] شاہجہاں ۱۰۳۷ھ میں تخت نشین ہوا، اسی زمانہ میں جہانگیر نے وفات پائی لہٰذا اس سے کچھ پہلے غالباً ۱۰۳۶ھ کے قریب "اقبالنامہ" مرتب ہوا ہوگا، [4] ملا محمود علی صح الاقوال حسب تصریح "شیر و شکر" بحوالہ معارف جون ۱۹۷۳ء صفحہ ۴۴۴) ۱۰۰۳ھ میں پیدا ہوئے تھے: "ولادت با سعادتش در ماہ مبارک سہ ہزار و یاز دہ واقع شدہ" اسلئے ۱۰۳۶ھ میں ان کی عمر تیس سال ہوگی، [5] ملا صاحب نے سترہ سال کی عمر میں فاتحہ فراغ پڑھا تھا۔ "در هفده سالگی فاتحہ الفراغ خواندہ و افادہ علوم اشراقیین و مسائل حکمائے مشائین گشت" (بحوالہ معارف جون ۱۹۷۳ء صفحہ ۴۴۰)

"درثمینہ دراثبات واجب تعالیٰ"

حالانکہ اس رسالہ میں اثبات باری تعالیٰ سے قطعاً تعرض نہیں کیا گیا۔ "درثمینہ" کے مخطوطے برصغیر کی مختلف لائبریریوں میں محفوظ ہیں[1] اور ان کے مطالعہ سے اس کی تصدیق کی جا سکتی ہے اسکا موضوع ہے فلاسفہ کے موقف "قدم عالم" "نفی علم واجب تعالیٰ بجزئیات مادیہ اور نفی حشر اجساد" کا ابطال، جیساکہ رسالہ "الدرة الثمینة" (اسکا دوسرا نام "الرسالة الخاقانیة" بھی ہے) کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے، اگرچہ علامہ سیالکوٹی نے اس کے اندر پہلے اور تیسرے مسئلے (یعنی قدم عالم اور نفی حشر اجساد) سے یونہی سا تعرض کیا ہے، زیادہ زور "علم واجب تعالیٰ بجزئیات مادیہ" پر دیا ہے، اور اسی وجہ سے بعض اہل علم نے اسے "در علم واجب تعالیٰ" بتایا ہے،

امام الدین ریاضی نے نہ صرف اس کی تفصیل دی ہے بلکہ اس کی تصنیف کے علمی تاریخی پس منظر کو بھی وضاحت کیساتھ بتایا ہے، انھوں نے علامی سعد اللہ خان وزیر اعظم شاہجہاں کا وہ خط بھی نقل کیا ہے، جس کی تعمیل میں علامہ سیالکوٹی نے یہ رسالہ لکھا تھا، رضا لائبریری رامپور میں "الدرة الثمینة" کا جو مخطوطہ ہے، اس میں بھی سعد اللہ خان کا یہ خط موجود ہے،

اس تفصیل سے یہ اندازہ ہو گیا ہوگا، کہ ہرچند آزاد کے دونوں تذکروں پر بعد کے لوگوں نے غیر مشروط اعتماد کیا ہے، اور اس عہد کی علمی سرگرمیوں کے سلسلے میں انھیں دلمد ماخذ کی حیثیت دی ہے، اس کے باوجود امام الدین ریاضی کا یہ تذکرہ (باغستان) نہ صرف ان سے قدیم ہے، بلکہ زیادہ مستند بھی ہے،

---

[1] اس رسالہ کو ... محمد علی شوق نے معارف برائے اکتوبر ۱۹۳۲ء میں "اسلامی ہندوستان کی علمی خود داری الدرة الثمینة ... عبد الحکیم سیالکوٹی اور شاہجہاں اور نواب سعد اللہ خاں" کے عنوان سے متعارف کرایا تھا ... راقم محمود نے ... عنوان سے اس پر معارف ستمبر ۶۶ء جون، جولائی، اگست ... میں ... کیا ...

اس لئے شاید ان کے تبحر علمی نے اتنی شہرت حاصل نہ کی ہو کہ ان کا ذکر خیر دربار کے وقائع میں ثبت کیا جاتا، ان کے مقابلے میں ملا عبد الحکیم[1] بیس[2] سال سے زائد عرصہ سے نہ صرف تعلیم و تدریس بلکہ تصنیف و تالیف میں بھی ید طولی حاصل کر چکے تھے، البتہ حیرت اس پر ہے کہ عبد الحمید لاہوری نے بھی "بادشاہنامہ" میں ملا محمود کو درخور اعتنا نہیں سمجھا حالانکہ جس زمانہ میں یہ تاریخ مرتب ہو رہی تھی[3] اسوقت وہ "الامام الاعظم والمولی المکرم..... السراج الوهاج فی الملة الحنیفیة والبحر المواج فی العلوم الحقیقة.... ملاذ العلماء الراسخین[4]" کا مصداق بن چکے تھے، اس کے برعکس ملا عبد الحکیم کا مستقل ترجمہ دونوں جلدوں کے آخر میں "فضلائے عہد" کے ضمن میں دیا ہے[5] اس کے علاوہ دربار کے واقعات میں دو مرتبہ بارگاہ شاہجہانی میں انکی آمد و باریابی اور انعام و اکرام سے سرفرازی کا بھی ذکر کیا ہے، پہلی مرتبہ سال ۱۰۵۵ھ کے واقعات میں :-

---

[1] ملا عبد الحکیم ملا کمال الدین کشمیری کے شاگرد تھے چنانچہ واقعات کشمیر میں مرقوم ہے۔ مطلع الانوار لایزال، اخوند ملا کمال برادر مولانا جمال است..... علمائے بسیار مثل مولانا عبد الحکیم سیالکوٹی از نزدش مستفید گردیدند" اسی طرح آزاد بلگرامی نے انکے (ملا عبد الحکیم سیالکوٹی کے) تذکرے میں لکھا، "در عنفوان سن تمیز دامن ہمت بہ طلب علم بر زد و بیشتر نزد ملا کمال الدین کشمیری..... تلمذ نمود، ماثر الکرام ص ۲۲۹، ملا کمال الدین نے ۱۰۱۷ھ میں وفات پائی، سلئے علامہ عبد الحکیم سیالکوٹی ۱۰۱۷ھ سے پہلے ہی تاریخ تحصیل ہو چکے ہونگے، اسطرح ۱۰۳۶ھ میں جب "اقبالنامہ" مرتب ہو رہا ہوگا، تحصیل تعلیم سے فارغ اور درس و تدریس میں مشغول ہوئے بیس سال سے زائد عرصہ ہو چکا ہوگا اس عرصہ میں تعلیم و تدریس کے علاوہ انھوں نے تصنیف و تالیف کا مشغلہ بھی شروع کر دیا تھا، جیسا کہ "تفسیر بیضاوی" پر ان کے حاشیہ کے مقدمہ سے مترشح ہوتا ہے کہ انھوں نے اسکو لکھنا تو بہت پہلے شروع کر دیا تھا مگر معنون بادشاہ شاہجہاں کے نام کیا۔

[2] عبد الحمید لاہوری نے ۱۰۶۵ھ میں وفات پائی، انکے "بادشاہنامہ" میں عہد شاہجہانی کے پہلے بیس سال کی تاریخ ہے لہذا یہ تاریخ ۱۰۴۵ھ اور ۱۰۶۵ھ کے مابین مرتب ہوئی، اسوقت ملا محمود علمی دنیا میں اپنا منفرد مقام حاصل کر چکے تھے وہ ۱۰۵۰ھ کے قریب شاہجہاں کے دربار میں آئے تھے اور اسے احمد بندی کیلئے آمادہ بھی کر لیا تھا مگر وزیر کی دراندازی سے یہ منصوبہ پورا نہ ہو سکا۔ [3] "شیر و شکر" بحوالہ معارف مئی ۱۹۶۳ء صفحہ ۳۳۰، "شیر و شکر" ۱۰۵۵ھ کی تصنیف ہے یعنی "بادشاہنامہ" کے مرتب ہونے سے پہلے کی۔ [4] "بادشاہنامہ" جلد اول ص ۳۴۲ و جلد دوم ص ۵۰۔

عبدالحکیم رسید و با دانشمند خاں مباحثہ شد بر مراد ایاک نعبد و ایاک نستعین گفتگو بطول کشید۔ و بآخر درستی قول مولوی و راستی سخن ایشان بر بادشاہ و سائر امرار و علمائے عالی شان در حضور انجامید۔" (باغستان صفحہ ۱۶۸۵ الف)

ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کا فضل و کمال اور فن مناظرہ کے آداب اور اس کے داؤ پیچ میں انکی مہارت بھی مسلم، لیکن قلمروے شاہجہانی میں بفحوائے "وفوق کل ذی علم علیم" ایک اور فاضل اجل بھی تھا جس کے تبحر علمی اور مناظرانہ حذاقت کے خود ملا عبدالحکیم بھی معترف تھے، چنانچہ ادم الدین مرید انھوں نے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کے علم و عرفان کی تعریف کرنے کے بعد ملا محمود جونپوری کے بارے میں ان کا حسب ذیل اعتراف بھی نقل کیا ہے:۔

"عالم متوحد و عارف موحد مولوی عبدالحکیم در مناظرہ علم توحید با وے (ملا محمود جونپوری) مقاومت نداشت وی فرمود کہ مولانا نفس قدسی است تار و پود سخن را خاصہ منقولات بمنوالے یافتہ کہ کارنامۂ دیگراں در پیش او مبصد وقران اوہن البیوت لبیت العنکبوت سست تر از نسج عنکبوت است۔"

(باغستان صفحہ ۶۸۴ ب - ۱۶۸۵ الف)

"افضل کے ہوتے ہوئے مفضول کا انتخاب" ایک معمہ ہے جس کے حل میں قیاس آرائیوں اور ظن" کے لئے کافی گنجائش ہے۔

۲۔ جب حکومت ایران سے تعلقات بحال کرنے کے لئے شاہجہاں نے جان نثار خاں کی سربراہی میں سفارت بھیجی تو اس سفارت میں دو کارپرداز محمد فاروق اشرف اور محب علی واقعہ نویس بھی تھے جنھیں اپنے علم و فضل بالخصوص معقولات میں دستگاہ عالی کا دعویٰ تھا، ان کے زعم میں یہ دونوں وزیر اعظم ایران خلیفہ سلطان وزیر دانشور عراق سے جو وہاں کے اعلم العلماء

بالجملہ از رایات جلال او (ملا عبدالحکیم سیالکوٹی) شاگردان صاحب کمال اند۔ از انجملہ است: ملا سعد اللہ مخاطب بسعد اللہ خاں وزیر اعظم شاہجہاں بادشاہ صاحب قران کہ نشان مذکور از فضل او نشان می دہد۔

(باغستان صفحہ ۶۸۶ الف)

اگرچہ استاد نے شاگرد سے کوئی غلط کام نہ کرایا ہوگا، مگر ظاہر ہے شاگرد نے ضرور حق شاگردی ادا کرنے میں کوئی دریغ نہ کیا ہوگا، یوں بھی شاگرد کے فضل و کمال کا شہرہ استاد کی جلالت قدر کا سبب ہوتا ہے اس لئے جب بھی کسی علمی مہم کی انجام دہی کا موقعہ آتا تو علامی کے مشورے سے ان کے استاد ملا عبدالحکیم ہی کو دربار میں بلایا جاتا۔

تاریخ نے اس قسم کے دو موقعوں کی تفصیل محفوظ رکھی ہے:-

۱۔ جب ایران سے ملا شفیعا نے آکر دربار شاہجہانی میں ملازمت اختیار کی اور اپنے فضل و کمال سے "دانشمند خاں" کا خطاب حاصل کیا تو "دانشمند خاں" کی "دانشمندی" کا امتحان لینے کیلئے قلمروئے شاہجہانی سے کسی فاضل اجل کے انتخاب کا سوال پیدا ہوا، اس وقت قرعۂ فال وزیر اعظم کے استاد ملا عبدالحکیم سیالکوٹی ہی کے نام پڑا۔ چنانچہ وہ بلائے گئے اور "ایاک نعبد وایاک نستعین" کی مراد و مفہوم پر مناظرہ ہوا۔ آخر میں ملا عبدالحکیم (وزیر اعظم کے استاد) ہی کی فتح ہوئی اس سے ان کے علمی تبحر کے ساتھ ان کی طلاقت لسانی اور مناظرہ میں دستگاہ کا بھی غلغلہ بلند ہوگیا۔ امام الدین ریاضی نے تذکرہ باغستان میں لکھا ہے:-

"آوردہ اند کہ پادشاہ شاہجہان ایشاں (ملا عبدالحکیم) را از سیالکوٹ برائے مناظرہ ملا شفیعا کہ تازہ از ولایت آمدہ بود (و) خطاب دانشمند خاں یافتہ بود، طلبید۔ ایشاں آمدند و اجلاس علماء و فضلاء و حکماء شد، چوں نوبت سخن بمولوی

العباقرہ کے فضل و کمال کا "روشن سورج" آج بھی عربی مدارس کے اندر منتہی طلبہ کے فلسفہ و حکمت کے اعلیٰ نصاب میں شامل ہے، اسے دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ

فیضِ روح القدس ار باز مدد فرماید ۔ دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا می کرد

اس لئے اگر یہ امر خطیر ملا محمود کو تفویض کیا جاتا تو شاید وہ زیادہ بہتر طور پر اس سے عہدہ برآ ہوتے۔ علامی سعد اللہ خاں نے ان مباحث کے عنوان بھی استاد کی سہولت کے لئے تجویز کر دیئے تھے جن پر ان سے روشنی ڈلوانا چاہتے تھے،

الف ۔ احاطہ سائل متعدد بر یک مطلب علمی از حضوری و حصولی،

ب ۔ بودن علم بعین معلوم بعلمِ حضوری باعتبار تعلق بجزئیات بدون آنکہ کلی یا جزئی،

ج ۔ تحریر آنکہ جزئیت و کلیت مفہوم تابع مدرک (بکسر را) یا تابع مدرک (بفتح را)

و نسبت و حسب جزئی ہست یا نہ،

د ۔ بیان آنکہ ادراک تعقلات راحاجت نیست،

ہ ۔ حصول علم بجزئیات و تخصصات از زمان و غیر آں،

و ۔ بقاء علم بعدم یا تبدل زماں۔

ز ۔ حضور زمانہ بجمیع جزئیہ من ازل الآزال الی ابد الآباد مع کونہ غیر قار۔

"الدرۃ الثمینہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یا تو ان میں سے اکثر مباحث سے تعرض ہی نہیں کیا گیا اور اگر کیا گیا ہے تو کچھ یوں نہیں، ویسے بھی درۃ العمر کی تدریس سے بحث و نظر کا ایک خاص انداز بن چکا تھا جس سے انحراف دشوار تھا اور اس انحراف کی کوشش قلیل عرصہ (در عرض دہ پانزدہ روز) میں کوشش لا یطاق تھی اور آخری مبحث سے تو علامہ سیالکوٹی نے سرے سے تعرض ہی نہیں کیا،

بھے الجھ گئے اور منھ کی کھائی، بقول علامی سعد اللہ خاں

"مدعیان دروغ چوں شمع کشتہ بے فروغ ماندند و از مسلک معقولیت دور افتادند"

جب یہ خبر شاہجہاں کو پہونچی تو اسکو کمال صدمہ ہوا کیونکہ یہ ایرانی علم و فضل کے سامنے ہندستانی فضل و کمال ہی کی سبکی نہیں بلکہ گویا خود مغل تاجدار ہندوستان اور اس کے دربار کی سبکی تھی۔

(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "معارف" اعظم گڑھ بابت اگست ۱۹۵۶ء صفحات ۱۰۲ - ۱۱۸)

وزیر اعظم نے شاہی مزاج کے تکدر و انقباض کو دور کرنے کے لئے اس کی تلافی کی تجویز ہیش کی۔ مگر اسوقت بھی ان کی جنبہ داری نے استاد کے علاوہ کسی اور فاضل کو اس امر خطیر کی انجام دہی کا اہل نہ سمجھا اور بادشاہ کے ایما سے انھیں خلیفہ سلطان وزیر دانشور عراق کے اٹھائے ہوئے سوالات کے جواب میں ایک رسالہ تحریر کرنے پر مامور کیا۔ اس حکم کی تعمیل میں انھوں نے الدرۃ الثمینہ لکھی جو رسالۂ خاقانیہ کے نام سے بھی مشہور ہوا۔ "الدرۃ الثمینہ" واقعی ہندوستانی عبقریت کا گوہر نایاب ہے

[ملاحظہ ہو (۱) راقم الحروف کا مقالہ "علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی اور ان کے رسالہ الدرۃ الثمینہ کا تعارف" "تعمیر" سرینگر کشمیر جنوری ۱۹۶۳ء صفحہ ۲۴ - ۳۸، اور "The Adducent ... Thaminah of Mulla Abdul Hakim of Sialkot by Shabbir Ahmad Ghori, published by the Journal of Research Society of Pakistan, Lahore for October 1964, PP 47-48 especially 74-78.]

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اسوقت قلمرو شاہجہانی میں ملا عبدالحکیم کے علاوہ ایسے علماء نہ تھے جو اس امر جلیل ... کی انجام دہی کے اہل ہو سکتے۔ دوسرے فاضل کی تصانیف ہمارے سامنے نہیں ہیں، لہذا ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا، مگر وارد الجبور جونپور کے رئیس

وزیر اعظم کے استاد مکرم کی بیجا عزت افزائی کی انتہا یہ ہے کہ ان کے حریف پنجہ شکن کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا۔ مگر اس سے اس فاضل اجل کے مرتبے میں کوئی کمی نہیں آتی۔

۳-عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ ملا محمود جونپوری فلسفہ و حکمت کے فاضل بے بدیل تھے، خصوصاً "شمس بازغہ" کے فلسفہ و حکمت کے اعلیٰ نصاب میں شمول ہونے سے یہ خیال پختہ سے پختہ تر ہو گیا ہے، پھر مولانا غلام علی آزاد نے "سبحۃ المرجان" اور "مآثر الکرام" میں انھیں "نقادہ علماء اشراقیین و سلالہ حکماء مشائین" بتایا ہے جس سے تو وہ خالص حکیم و فلسفی ہی معلوم ہوتے ہیں۔ مگر امام الدین ریاضی کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ ملا محمود علوم حکمیہ کے بعد میں اور علوم دینیہ کے پہلے عالم الحق و فاضل مطلق تھے۔ امام الدین ریاضی نے تفسیر و حدیث ہی میں ان کی دستگاہ عالی سے ان کے تبحر علمی کے ذکر کی ابتدا کی ہے۔ "در تفسیر و حدیث و حکمت مہارت تمام داشت"

غالباً ملا محمود اپنی زندگی میں بھی بالخصوص اپنے خاندان میں عالم علوم دینیہ ہی کی حیثیت سے مشہور تھے، چنانچہ ان کے اولین سوانح نگار اور بھنوئی حاجی ابو الخیر فاروقی نے حسب تصریح قاضی اطہر صاحب مبارکپوری ان کے بارے میں لکھا تھا۔

"وہو الامام الاعظم والمولی المکرم، جامع المناقب، شمس المشارق والمغارب، السراج الوہاج فی الملۃ الحنیفیہ والبحر المواج فی العلوم الحقیقیہ، علم الہدیٰ و العلامۃ المقتدیٰ، ملک العلماء الراسخین، افتخار الملۃ والدین"

مگر قدرت کے کرشمے بھی عجیب ہیں، غالب جس اردو کے سہارے آج غالب بنے، تیرھویں century نوانے کے مستحق ٹھہرے اور جس کی بنا پر ان کا کلام وید مقدس کا ثانی قرار پایا، اپنی زندگی بھر اسے "مجموعہ بیرنگ من" ہی کہتے رہے۔ حضرت ملا محمود جونپوری بھی اپنے عصر "فی التفسیر والحدیث" و "السراج الوہاج فی الملۃ الحنیفیہ" ہونے کے باوجود "نقادہ العلماء الاشراقیین و سلالۃ الحکماء المشائین" ہی کی

"وحضور زمان بجمیع اجزا یہ من ازل، لا ازل الی ابد الآباد مع کو نہ غیر قار"!

یہ ایسا مبحث ہے جس پر "شمس بازغہ" کا فاضل مصنف ہی روشنی ڈال سکتا تھا، جس نے ایران کے عظیم المرتبت عبقری میر باقر داماد کے نظریہ "حدوث دہری" کے پرخچے اڑا کر ہندوستان کی اسلامی فکر میں ایک نئی علمی تحریک کا آغاز کیا جو عرصہ تک علمی حلقوں میں بڑی شد و مد سے چلتی رہی آخر میں ملا امان اللہ بنارسی نے دونوں فاضلوں کے موقف پر محاکمہ لکھکر اسے ختم کیا۔

ایسے مسلم الثبوت "افضل" کے ہوتے ہوئے مفضول کے انتخاب کی کیا توجیہ کیجائے خصوصاً جبکہ "مفضول" کو "افضل" کی افضلیت کا اعتراف بھی ہو:

"مولانا نفس قدسی است تار و پود سخن را ...... بمنوالے بافتہ کہ کارنامۂ دیگراں پیش او سست تر از نسج عنکبوت است"!

اس لئے بالآخر یہی فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ اس انتخاب کے پس پردہ بشریت کے تقاضے بھی کارفرما تھے، اور جب خود وزیر اعظم کا یہ وطیرہ ہو تو اس سے دربار کے دوسرے اراکین اور وقائع نویس کا متاثر ہونا بالکل فطری ہے جس کے اثرات سرکاری تاریخ میں بھی نمایاں نظر آتے ہیں، اس کی کچھ تفصیل حسب ذیل ہے:۔

بادشاہنامہ اصولی طور پر عہد شاہجہانی کے اہم سیاسی واقعات کا جائزہ ہے، رسماً اس کی دونوں جلدوں کے آخر میں "ذکر فضلائے عہد" کے عنوان سے علماء مشاہیر کے مختصر تذکرے بھی ہیں، ان میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کا تذکرہ بھی ہے مگر ملا محمود جونپوری کا کوئی ذکر نہیں ہے) وقائع نویس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ جب بھی ملا عبدالحکیم شاہجہاں کی خدمت میں حاضر ہوتے تو ان کی آمد کو بڑے اہم واقعہ کی طرح درباری وقائع میں لکھا جاتا۔ عبدالحمید لاہوری نے اس طرح کے دو واقعے لکھے ہیں جن کی تفصیل اوپر مذکور ہو چکی ہے۔

نہ ہوسکی، البتہ ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے عبداللہ لبیب سے یہ تقریر سنی جیسا کہ امام الدین ریاضی نے لکھا ہے:-

"آوردہ اند کہ بادشاہ (عالمگیر) بدیشاں مولوی عبداللہ لبیب خلف الرشید ملا عبدالحکیم سیالکوٹی گفت کہ والد شما مسئلہ وحدت الوجود چہ طور تلقین شما کردہ اند، آنرا می خواہیم از زبان شما شنویم کہ گویا از مولوی مرحوم شنیدہ باشیم ایشاں خود دراں وقت بجواب اجمالے کہ مقتضائے وقت بود اکتفا کردند و گفتند کہ چوں ایں سخن شرح طلب است، اگر امر شود بزودی رسالہ موجزے در حل ایں رمز شگرف تحریر نمودہ بسمع مبارک رسانند، فرمودند: بہتر، چنانچہ آخوند در اندک فرصتے رسالہ بسیار خوب در حل مسئلہ وحدۃ الوجود تصنیف کردہ بعرض رسانیدند، و فقیر ایشاں را ہم دراں ایام دریافتہ داں رسالہ حاصل نمودہ بمطالعہ آوردہ۔"

(باغستان صفحہ ۶۸ ب)

ملا عبدالحکیم حضرت شیخ احمد سرہندی (مجدد الف ثانیؒ) کے ہم سبق تھے، دونوں بزرگ شروع میں اس توحید وجودی کے زبردست ترجمان تھے، یہاں تک کہ ملا عبدالحکیمؒ نے مجدد صاحب کو "اسد العلماء" کا خطاب دیا تھا حضرت مجدد صاحب نے تو بعد میں اس مسلک سے رجوع کر لیا اور وحدۃ الشہود کے عقیدے کو اپنایا، مگر ملا عبدالحکیم آخر تک اسی عقیدۂ قدیم ہی پر رہے۔

ہندوستان کی اسلامی فکر میں وحدت الوجود کا عقیدہ عرصہ سے راسخ ہو چکا تھا، اس کی جڑیں فیروز شاہ تغلق کے زمانہ تک پہونچی ہیں، مگر اکبر کی مذہبی بے راہروی سے اس عقیدہ کی اشاعت کو بہت زیادہ مدد ملی۔ وہ خود شیخ تاج الدین ذکریا اجودھنؒ سے خلافت اخذ ۔۔

حیثیت سے مشہور ہوئے اور ان کی "الفرائد" قبول عام تو درکنار معمولی شہرت بھی نہ حاصل کر سکی، شہرت نصیب ہوئی تو ان کی "شمس بازغہ" کو جس کی نذوق بھی فرما گئے،

"کہ شمس بازغہ کی جا پڑھتے ہیں بد مہیرہ"

۴۔ ملا محمود جونپوری کو علم و ادب کے علاوہ معرفت و حقیقت کا بھی ذوق تھا جیسا کہ حاجی ابوالخیر صاحب نے لکھا ہے "والبحر المواج فی العلوم الحقیقیہ"

انکے خاندان میں اس حقیقت و معرفت کا ہمیشہ سے چرچا تھا اور ان کے اسلاف اس راہ کے رہبر و بلکہ رہنما سمجھے جاتے تھے، مگر تعجب اس پر ہوتا ہے کہ اس ذوق کے ہوتے ہوئے بھی وہ اس عہد کے مروجہ منہاج "توحید وجودی" کے منکر ان کے معاصر حریف ملا عبد الحکیم سیالکوٹی اس کے علمبرداروں میں تھے، بادشاہ شاہجہاں جو غالباً حضرت مجدد الف ثانی کی تعلیمات سے متاثر تھا شیخ ابن عربی کی عظمت فکر سے زیادہ واقف نہ تھا، اس لئے ایک دن ملا عبد الحکیم سے ان کے بارے میں دریافت کیا اور ان کے جواب سے بہت زیادہ متاثر ہوا امام الدین ریاضی نے لکھا ہے

"آوردہ اند کہ بادشاہ مغفور از مولوی ملا عبد الحکیم سیالکوٹی پرسید کہ شیخ ابن عربی چگونہ بود۔ فرمود عرب ما معجزات آنحضرت را شق قمر و کلام مجید دانستہ و عدہ نمایند و ترکہ نورانیت جسم لطیف مبارک است در نظائر آن بسیار بود۔ در ما اینچنیں معجزہ تواند بود کہ ابن عربی در دین محمدی ہست۔ والا اگر می خواست دعویٰ نبوت می کرد و با ثبات می رسانید و کسے را یارائے تاب مناظرہ نبود"

(تذکرہ باغستان صفحہ ۱۴۸ الف)

یہی نہیں بلکہ توحید وجودی کے موضوع پر ان کی تقریر کو خاص شہرت حاصل تھی یہانتک کہ بادشاہ عالمگیر بھی اس کے سننے کا مشتاق تھا، مگر ان کی زندگی میں بادشاہ کی یہ خواہش پوری

مولانا محمد علی کی یاد میں

از سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۸)

ابن سعود کی حمایت | سلطان ابن سعود نے جب مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی قبروں کو منہدم کرنا شروع کیا، تو ان کے خلاف اور بھی اشتعال پیدا ہوا، مولانا محمد علی پھر بھی ان کے طرفدار اس امید میں بنے رہے کہ ان کے ذریعہ حجاز میں شرعی جمہوریت قائم ہوگی، مولانا محمد علی کے مخالفین اس طرفداری پر انکو بھی سلطان ابن سعود کی طرح وہابی اور قبہ شکن کہتے ہے، ان پر اپنے مرشد مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی کی مخالفت پر آئین طریقت کی رو سے کفر کا بھی الزام رکھا گیا لیکن انھوں نے اپنے سیاسی خیالات اور مرشد کے احترام کو علٰحدہ علٰحدہ خانوں میں رکھا، اپنے ایمان کی پختگی اسی میں تصور کیا کہ وہ اپنے مرشد کے احترام میں فرق نہ آنے دیں، اسی زمانہ میں وہ لکھنؤ آئے تو اپنے مرشد سے ملنے فرنگی محل گئے بچھڑے ہوئے مرید کو اپنے آستانہ پر دیکھ کر خود مرشد بیحد متاثر ہوئے اور وہ اپنے مرید کے گلے سے لپٹ کر رونے لگے، جس سے دونوں کی عظمت ظاہر ہو رہی تھی، مرشد کو اپنے مرید کی نیت کی پاکیزگی اور جذبات کے اخلاص پر شک نہیں ہوا،

مولانا محمد علی کی نظر برابر حجاز کی طرف اٹھی ہوئی تھی، اسی لئے وہاں کے صحیح حالات سے واقف ہونے اور ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات کا احساس دلانے کے لئے خلافت کانفرنس کی طرف سے ایک دوسرا وفد مرتب کیا، جس کے صدر بہار کے مشہور لیڈر مولوی محمد شفیع داؤدی تھے، اور ارکان مولوی قمر احمد، مولانا عرفان، شیخ عبدالمجید (سندھ) اور حافظ عثمان تھے، جمعیۃ العلماء کی طرف سے بھی مولانا عبدالعلیم صدیقی بھیجے گئے،

یہ تقریر سنا کرتا تھا، ملا عبد الحکیم سیالکوٹی اور ملا محمود جونپوریؒ کے زمانہ میں شیخ محب اللہ الہ آبادیؒ جو اس باب میں شہزادہ دارا شکوہ کے روحانی رہنما تھے، اس عقیدہ کے سرگرم مبلغ تھے، اور اسمیں دستگاہ عالی کی بنا پر شیخ ابن عربی ثانی کہے جاتے تھے،

الہ آباد، غازی پور اور جونپور ایک دوسرے کے قریب واقع ہیں اور ایک علاقہ کے اکابر کا دوسرے علاقہ کے اکابر سے متاثر ہونا فطری ہے، مگر ملا محمود جونپوریؒ اپنی پختگی اور صلابت کی بنا پر "توحید وجودی" سے قطعاً متاثر نہ ہوئے اور اس کے تردید کے سرگرم مبلغ بنے رہے، یہاں تک کہ ملا عبد الحکیم سیالکوٹی بھی اپنے علمی تبحر اور توحید وجودی کی ترجمانی میں ید طولیٰ رکھنے کے باوجود ان کے حریف پنجہ شکن نہ بن سکے، بلکہ اس موضوع پر مناظرے میں ان سے شکست فاش کھائی اور اس کے اعتراف کے ساتھ ساتھ ملا محمود جونپوریؒ کے تفوق علمی کا بھی اظہار کیا، جیسا کہ امام الدین ریاضی نے لکھا ہے،

"عالم متوحد و عارف موحد مولوی عبد الحکیم در مناظرہ علم توحید با وے مقاومت نداشت دمی فرمود کہ مولانا نفس قدسی است، تار و پود سخن را خاصہ منقولات بہم والے بافتہ کہ کارنامہ دیگراں در پیش او بمصداق وان اوھن البیوت لبیت العنکبوت سست تر از نسج عنکبوت است" (باغستان صفحہ ۶۸۴ ب - ۶۸۵ الف)

دھکا لگا، وہ تو اس خیال میں تھے کہ ابن سعود کے ذریعہ سے حجاز میں ملوکیت ختم ہو جائیگی، اور یہاں ایک جمہوری اور شوری حکومت قائم ہو جائے گی جس میں تمام اسلامی ممالک کے لوگ شریک ہونگے، اسی اثنا میں وار، ۲۰ جنوری ۱۹۲۶ء کی درمیانی شب کو مولانا عبد الباری فرنگی محلی کا انتقال ہو گیا، مولانا محمد علی نے اپنی شرافت نفس کی بدولت سارے اختلافات بھلا دئے، دہلی سے لکھنؤ پہنچے اور سیدھے قبرستان پہنچے اور اپنے مرشد کی قبر سے لپٹ کر بے اختیار روئے، پھر فرنگی محل آئے، یہاں کے فاتحوں میں شریک ہوئے، مرشد کے جانشین قطب میاں صاحب کو اپنی اور اپنے بھائی مولانا شوکت علی کی طرف سے نذریں پیش کیں، ایک ایک سے ان کی تعزیت کی اور ایک ایک کو سمجھایا کہ پچھلی باتوں پر خاک ڈالو، جو ہونا تھا ہو کر رہا،

ابن سعود کی مخالفت | ابن سعود حجاز کے بادشاہ بن بیٹھے تو مولانا محمد علی کی امیدوں کے سارے قلعہ پر بجلی گر پڑی، جس کی حمایت میں انھوں نے اپنے مرشد کا ساتھ چھوڑ دیا تھا، اس نے خود ان کا ساتھ چھوڑ دیا، وہ اب ابن سعود کے مخالف تھے لیکن پنجاب میں مولانا ظفر علی خاں ابن سعود کے حامی ہو گئے، اب لڑائی مولانا محمد علی اور ان کے دوست مولانا ظفر علی خاں اور ان کی پنجابی ٹولی سے تھی، ان کے یہاں وقتی مصلحت سے مداہنت کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا، وہ رفاقت اور خدمات امت کی خاطر ذاتی عقیدت، مروت، اور دوستی کا خیال کرنا کفر سمجھتے تھے، ابن سعود کے حامی ان کو قامع بدعات سمجھتے تھے لیکن مولانا محمد علی ان کو بڑا بدعتی تصور کرتے رہے، کیونکہ ان کی نظر میں سلطان ابن سعود نے خلفائے راشدین کی سنت پر عمل کرنے کے بجائے شخصی اور نسلی حکومت قائم کرکے قیصر و کسریٰ کے طریقوں کی پیروی شروع کر دی،

مولانا محمد علی پر ہندوؤں کی تعریض | اس زمانہ میں مولانا محمد علی کو بعض ہندو رہنما اس نظر سے دیکھنے نہیں لگے جس سے وہ ترک موالات کی تحریک کے سلسلہ میں دیکھتے رہے، ان پر

یہ وفد سلطان ابن سعود سے ملا، منہدم کئے ہوئے قبوں اور مزاروں کو دیکھا، سلطان ابن سعود کو ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات سے آگاہ کیا، اور ان سے وعدہ لیا کہ جو مزار اور مسجدیں شہید کی گئی ہیں ان کو وہ پھر سے بنوا دیں گے، ان کا احترام کریں گے اور مدینہ طیبہ کے یہ اپنے آثار کو اصلی شکل پر قائم رکھیں گے، اس وعدہ پر وفد مطمئن لوٹا، گو ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات برگشتہ رہے، لیکن اس وفد کو یقین رہا کہ سلطان ابن سعود کے ذریعہ وہاں شرعی حکومت قائم ہو جائیگی،

شریف علی اور ابن سعود کی لڑائی آخری منزل پر پہنچ رہی تھی کہ ۲۲ اگست ۱۹۲۵ء کو یکایک ہندوستان میں یہ خبر پہنچی کہ نجدیوں نے مدینہ منورہ پر حملہ شروع کر دیا ہے، اور ان کی گولہ باری سے مسجد نبوی کے قبہ کو جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مزار مبارک ہے، صدمہ پہنچا، اور سیدنا حمزہؓ کی مسجد شہید کر دی گئی ہے، ہندوستان کے مسلمانوں میں بڑی کھلبلی پیدا ہوئی، گو بعد میں یہ معلوم ہوا کہ خبروں میں مبالغہ سے کام لیا گیا تھا، حجاز میں جنگ ختم ہونے کو تھی ... تو وہاں جمہوریت کے قیام کا مسئلہ زیادہ اہم ہو گیا، اس لئے مولانا محمد علی نے پھر خلافت کانفرنس کا ایک وفد مرتب کیا، جس کے صدر میرے استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی ہوئے اور ارکان مولانا محمد عرفان، مولانا ظفر علی خاں، سید خورشید حسن، مولانا عبدالماجد بدایونی اور شعیب قریشی تھے،

استاذی المحترم اسی زمانہ میں علیل ہو گئے، اس لئے وفد میں نہ جا سکے، پھر یہی مولانا عبدالماجد بدایونی بھی شرکت نہ کر سکے، یہ وفد اکتوبر ۱۹۲۵ء میں حجاز روانہ ہوا، لیکن وفد کے ارکان میں اختلاف ہو گیا، مولانا ظفر علی خاں ابن سعود کی پوری حمایت کرنے لگے، جو وفد کے اور ارکان کو پسند نہیں ہوا، چنانچہ اس وفد کی رپورٹ بھی متفقہ طور پر پیش نہ ہو سکی، اور یہ وفد حجاز ہی میں تھا کہ دسمبر ۱۹۲۵ء میں ہندوستان یہ خبر پہونچی کہ سلطان ابن سعود کا قبضہ مدینہ منورہ پر ہو گیا، اور شریفی فوجیں بھاگ نکلیں اسی کے ساتھ یہ خبریں آنے لگیں کہ ابن سعود شاہ حجاز بننا چاہتے ہیں، جس سے مولانا محمد علی کو سخت

جو میرے نزدیک ہر ایک ہندوستانی مسلمان کا ہونا چاہئے۔"

ان کی خلافت تحریک پر یہ اعتراض بھی برابر عائد کیا جا رہا تھا کہ مہاتما گاندھی نے زبردستی ہندوؤں کو خلافت کے جھگڑے میں پھنسا دیا، ان کو اس جھگڑے سے کوئی تعلق نہیں تھا، ان معترضین میں سب سے آگے بنگال کے مشہور صحافی بپن چندر پال تھے، جو ان کے خلاف کلکتہ کے مشہور اخبار انگلشمین میں مضامین لکھتے رہے، اس کا جواب محمد علی نے یہ دیا ۔۔

"سنو بھائیو! ہم مہاتما جی اور ان ہندو بھائیوں کے جو ان کی سرکردگی میں ہمارے شریک حال ہوئے بیحد ممنون ہیں، لیکن یہ یاد رکھئے کہ اگر مہاتما جی ہمارے ساتھ نہ بھی ہوتے بلکہ یوں کہو کہ پیدا بھی نہ ہوتے تب بھی میں تو یہی کرتا جو میں نے کیا، اور اسی طرح میرے بھائی شوکت صاحب بھی نہ ہوتے تو تب بھی میں وہی کرتا جو میں نے کیا، اور اگر میں نہ ہوتا تو وہ بھی وہی کرتے جو انھوں نے کیا، ہمارا بھروسہ مہاتما جی پر نہیں ہے، بلکہ خدا پر ہے، اور ہر ایک ہندو مسلمان کو صرف خدا ہی پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔ بپن بابو کولہو کے بیل کی طرح ہندوستان میں بند ہیں، وہ نہیں جانتے کہ ہندوستان کے باہر بھی ایک دنیا ہے جس کے ساتھ ہندوستان کا تعلق ہے، ترکوں نے صاف کہلا بھیجا ہے کہ ان کو غلام بنانے کی کوشش صرف اس لئے اور بھی ہے کہ ہندوستان کو ہمیشہ غلامی میں رکھنا منظور ہے،........ ہمکو چاہئے کہ خدا کی دی ہوئی عقل سے کام لیں اور خود سوچیں کہ ہمارے لئے کیا مناسب ہے، میں تو کہتا ہوں کہ مسلمانوں کے لئے مناسب ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ شریک ہو کر ہندوستان کو آزاد کرائیں اور ہندوؤں کو مناسب ہے کہ وہ مصری، ترکی فلسطینی اور حجازی باشندوں کو اپنا سمجھیں اور ان کی آزادی کو اپنی آزادی اور ان کی غلامی کو اپنی غلامی سے غیر متعلق نہ سمجھیں، ہم مسلمانوں کو تو فقط ہندوستان کی آزادی کیلئے

یہ اعتراض ہوا کہ ان کا ترکوں کی ملک سے باہر روپیہ بھیجنا ایک غلط کارروائی تھی، اس روپیہ کو ملک ہی میں خرچ کرنا چاہیے تھا، مولانا محمد علی نے اس اعتراض کا یہ جواب دیا،

"یہ غیر ملکی ترکوں کی مدد نہ تھی، خود ہماری اپنی مدد تھی، اسلامی نقطۂ نظر سے ترک اور ہندوستان کے مسلمان اور عرب اور ایرانی اور افغانی سب بھائی ہیں، انسان کی برادری نسل اور نسب کی وجہ سے نہیں ہوتی، اس طرح تو بلی کتوں کی نسل چلتی ہے، جیسے انگورہ کے نسل کی بلی اور جنا پار کی بھینسیں انسان کی نسل روح اور دماغ سے ہوتی ہے، گندے پانی کی بوند سے نہیں ہوتی، اسلام نے سکھایا ہے کہ سب انسان ایک ہی نسل ہیں، اور آدم کی اولاد ہیں، اور مٹی سے بنے ہیں، ترکوں کے ساتھ ہمارا تعلق روحی اور دماغی ہے، اور ہم ایک عقیدہ اور ایک مسلک کے پابند ہیں، اس وجہ سے ہمارا ان کے ساتھ رشتہ ہے"

اسی سلسلہ میں اپنے ہندو معترضین کو مخاطب کرکے کہا کہ

"تم پر صرف ایک ہندوستان کا فرض عائد ہوتا ہے، لیکن ہم پر اس فرض کے علاوہ مسلمانانِ عالم کی آزادی کا بھی فرض ہے، میرا ایک پاؤں ہندوستان میں ہے، اور ایک پاؤں مرکزِ اسلام میں تمھارا کاشی، تمھارا گیا، تمھارا اجودھیا جی سب یہیں ہیں، میرا مکہ میرا مدینہ میرا بیت المقدس یہاں سے باہر ہے، میں ان کو نہیں چھوڑ سکتا، لیکن میں کعبہ اور کاشی دونوں کی آزادی کے لئے لڑنے کو تیار ہوں، آج تو ہم سب بلا تشدد ترکِ موالات پر عامل ہیں، لیکن اگر کبھی جنگ کا وقت آئیگا تو مجھے بلا لینا، اس وقت اگر تلوار نہ بھی ہوگی جیسی کہ آج نہیں ہے، تو ڈنڈا لیکر آجاؤں گا، اور لالہ لاجپت رائے، لالہ گردھاری لال اور بابو بپن چندر پال ان میں سے انشاء اللہ کسی سے بھی پیچھے نہیں رہونگا، بلکہ شاید دو قدم آگے ہی رہونگا، یہ ہے ہندوستانی قومیت کے متعلق میرا نقطۂ نظر

گندگیوں کو دور کریگا" (ہمدرد ۱۶-۸ اکتوبر ۱۹۲۵ء)

مولانا محمد علی پر یہ اعتراضات ظاہر کر رہے تھے کہ ملک کے حالات میں ناخوشگواری پیدا ہوری تھی، فرقہ وارانہ فسادات برابر ہو رہے تھے، مسجد کے سامنے باجا اور گائے کی قربانی پر ہندو مسلمانوں کے اختلافات بڑھتے چلے گئے، کانگرسی لیڈروں کے بجائے، پنڈت مدن موہن مالوی، لالہ لاجپت رائے، بھائی پرمانند اور ڈاکٹر مونجے ہندوؤں کے ترجمان ہونے کے مدعی ہو گئے، مولانا محمد علی پر جس طرح اعتراضات ہو رہے تھے، اسی کے جواب میں انھوں نے ان ہندو لیڈروں کے خلاف بھی آواز اٹھائی، مثلاً پنڈت مدن موہن مالوی کے متعلق ان کی رائے بہت سخت تھی، اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں :-

"میں نے اپنی ساری زندگی میں ایک لمحہ کے لئے بھی ان کو سوائے دشمن اسلام اور دشمن مسلمانان کچھ نہ سمجھا گو وہ ہندوؤں کے لئے اپنی زندگی وقف کر چکے ہیں، لیکن میں ان کے تعصب، تنگ دلی اور تنگ نظری سے قطع نظر بھی کر لوں، تب بھی ان کا قائل نہیں ہو سکتا کہ وہ ملک دوست اور وطن پرست ہیں، اس لئے کہ وہ بالطبع حکومت سے اسی قدر ڈرتے ہیں، اور مسلمانوں کو دبائے رکھنے کی اس قدر پرواہ رکھتے ہیں کہ ان کو سوراج کا طالب نہیں سمجھتا"

لیکن پنڈت مدن موہن مالوی ہندوؤں میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے، پنڈت جواہر لال نہرو ان کے متعلق لکھتے ہیں :-

"مالوی جی کو اپنے اوپر بھروسہ ہے کہ وہ ہر قسم کے متضاد خیالات میں ہم آہنگی پیدا کر سکتے ہیں، وہ مسلسل قومی خدمات جو ابتدائے عمر سے اب تک مختلف میدانوں میں انجام دیتے رہے وہ غیر معمولی کامیابی جو انھیں ہندو یونیورسٹی جیسا عظیم الشان

لڑنا نہیں ہے، ہمکو تو جو کچھ بھی لڑائی لڑنا ہے، سب سے صحیح راستہ پر ہم ہیں کہ خلافت اور کانگریس
دونوں کے لئے جان دینے کو موجود ہیں، اور میں بالخصوص مسلمان بھائیوں سے کہتا ہوں کہ
اگر ہندو آزادی کے لئے کوشش نہ بھی کریں، تب بھی مسلمانوں کو کوشش کرکے ہندوستان کے
ہندو مسلمان دونوں کو آزاد کرانا چاہئے، یہ جو ہے یہ میری پالیٹکس ہے، اور یہ میرا مذہب ہے
خدا مجھکو توفیق دے کہ اس کے مطابق عمل کروں "

ان پر یہ بھی اعتراض کیا جارہا تھا کہ وہ سیاست میں مذہب کو بھی لے آتے ہیں، لیکن آج کل کے
رہنماؤں کی طرح اس اعتراض پر شرمندہ نہیں ہوتے، بلکہ اس کا دنداں شکن جواب دیتے رہے
چنانچہ اپنے اخبار ہمدرد کے مذکورۂ بالا مضمون میں یہ بھی لکھتے ہیں:۔

"مگر بعض لوگ ہیں جو ہندوستان میں جو کبھی رشیوں اور ولیوں کا مسکن تھا، کہتے ہیں
کہ مذہب کو سیاست سے علحدہ رکھو، ان ہی بابو بپن چندر پال نے اخبار انگلش مین میں
ایک مضمون لکھا ہے، یہ صاحب رنڈی نیڈنٹ کے جاتے ہیں، یہی بات لالہ ہر جیت رائے
فرماتے ہیں، یہ لوگ چاہتے ہیں کہ مذہب داتون یا مسواک کے جیسا ہو جائے کہ ایک دفعہ
کے داتون یا مسواک کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں، مذہب ایک نجی اور خانگی چیز ہو جائے
اور پبلک معاملات سے اسکو کوئی سروکار نہ رہے، لیکن یہی لوگ ہیں جو اپنے مذہب کے
عقیدے کی بنا پر مسلمانوں کو خود ان کی گائے ذبح کرنے سے بھی روکنا چاہتے ہیں، مذہب
ساری زندگی کی تفصیل ہے، اور زندگی کے ہر شعبہ سے اس کو تعلق ہے، کرنل ویجوڈ نے مجھے
پارلیمنٹ میں مدعو کیا تھا، ہم چلے جا رہے تھے تو انھوں نے فرمایا کہ بھائی تمھارا جو جی چاہے
کرو مگر اپنے مذہب کو ہمارے پارلیمنٹ میں نہ لاؤ، میں نے کہا کہ میرا مذہب آپ کی پارلیمنٹ
تو پارلیمنٹ آپ کے جنگلوں اور شراب خانوں تک میں جائیگا، اور وہاں کی

کہ حال میں بعض ہندو اکابر کی سرگرمیوں کی بدولت ہندو ذہنیت میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہوگیا ہے، کیونکہ جب مہاتما گاندھی نے بلا امتیاز تمام قوموں کی عنانِ رہنمائی اپنے ہاتھ میں لے لی تو یہ سپہ سالار بلا فوج کے رہ گئے، جب مہاتما جی اور دوسرے سربرآوردہ کارکن تحریک عدم تعاون کے دور میں جیل میں گئے تو ان ہندو لیڈروں نے مسلمانوں کی نہایت ہی تاریک تصویر کھینچنی شروع کی، اور یہ کہہ کر "یہ ہیں وہ موذی مسلمان جن کے ساتھ مہاتما جی چاہتے ہیں کہ تم مل کر کام کرو" ہندوؤں کو مہاتما جی سے بھی برگشتہ کر دیا، جب وہ عام ہندوؤں کو برافروختہ کرنے میں کامیاب ہوگئے تو اسی نمونہ کے مسلمانوں نے بھی وہی کھیل کھیلنا شروع کیا، اور اتنے ہی تاریک رنگوں میں ہندوؤں کو پیش کرنے لگے کہ ایسے ہیں یہ موذی ہندو جن کے ساتھ علی برادران اور دوسرے رہنمایانِ خلافت تمھیں اتحاد کرنے کو کہتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو قوم میں مہاتما جی اور مسلمانوں میں خلافت کے لیڈروں کا نفوذ و اثر روز بروز کم ہوتا چلا گیا، اس سے نہ ہندوؤں کا کچھ فائدہ ہوا، اور نہ مسلمانوں کو کچھ حاصل ہوا، البتہ ایک تیسری ہستی تھی جو جی بھر کر ان حالات سے محظوظ ہوئی،

اس مضمون کے آخر میں لکھا کہ اس وقت متعصب ہندو لیڈر ہندو عوام الناس کو ترغیب دے رہے ہیں، کہ ہندو جس قدر لڑاکا بن سکتے ہیں بنیں، مگر خلافت کانفرنس کو مسلمانوں کو قابو میں رکھنا پڑیگا، تاکہ وہ متعصب ہندوؤں کی نقل نہ کرنے لگیں، لیکن وہ مسلمانوں کو بزدل بنانے کی خواہش نہیں کر سکتی اور اگر وہ ایسا کرنا چاہے بھی تو اس میں کامیاب نہ ہوگی

مولانا محمد علی نے اس خصوصی خلافت کانفرنس کے کھلے اجلاس میں جو تقریر کی اس میں مسلمانوں کو مخاطب کرکے یہ کہا:۔

"یہ ملک کے لئے سخت ترین ابتلا و آزمائش کا زمانہ ہے نہ آپ خود مشتعل ہوں،

قومی ادارہ قائم کرنے میں حاصل ہوئی ان کا جوش اور خلوص، ان کا کمال خطابت، انکی نرمی اور بردباری، ان کی دلکش شخصیت، ان تمام چیزوں نے مل کر ان کو ہندوستانی قوم خصوصاً ہندوؤں میں بہت مقبول اور محبوب بنا دیا ہے، ممکن ہو کہ بہت سے لوگ سیاسیات میں ان سے متفق نہ ہوں اور ان کی پیروی نہ کریں، مگر سب ان کو محبت اور عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں" (میری کہانی جلد اول ص ۲۶۸)

اس اقتباس کی آخری سطروں میں پنڈت مالوی جی کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے، وہی مولانا محمد علی کے متعلق کہا جا سکتا تھا، مگر مالوی جی کے متعلق مولانا محمد علی اور پنڈت جواہر لال نہرو دونوں کی تحریروں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ملک میں سیاست کی ہوا اب کس رخ بہنے لگی تھی،

ہندو مسلم اتحاد کی دعوت

لیکن مولانا محمد علی صورت حال سے زیادہ بددل نہیں ہوئے، وہ اپنے سیاسی مشن کی تکمیل کی کوشش میں لگے رہے، ان ہی کی دعوت پر مئی ۱۹۲۶ء میں دہلی میں خلافت کانفرنس کا ایک خصوصی اجلاس ہوا، جس کی صدارت مولانا ابو الکلام آزاد کی تحریک اور حکیم اجمل خاں کی تائید سے استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی نے کی، اس کے خطبۂ صدارت میں انھوں نے ملک کی حالت زار کا نقشہ کھینچا، اور ہندو مسلم اتحاد پر پورا زور یہ کہہ کر دیا کہ ہم میدانِ عمل میں اتر چکے ہیں، اور اپنے ہندو دوستوں کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا رہے ہیں، اب انھیں اختیار ہے کہ وہ اس ہاتھ کو وہ ہاتھ سمجھیں جو ایک دوست دوسرے دوست کو مصافحہ کے لئے بڑھاتا ہے، یا وہ جو ایک پہلوان دوسرے پہلوان کی طرف اکھاڑہ میں بڑھاتا ہے"، اس اجلاس کے انعقاد سے پہلے ۲۹ راپریل کے ہمدرد میں مولانا محمد علی نے ایک تحریر لکھی جس میں ملک کے سیاسی حالات پر تبصرہ اس طرح کیا

حق کے خلاف نہ ہوگا، لیکن آثار یعنی وہ مقامات مقدسہ جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابۂ کرام سے کوئی خاص نسبت ہے ان کی حفاظت یا ان کی تعمیر و بنا کی ممانعت سے احادیث نبوی کا دفتر تمام تر خالی ہے، حکومت کا فرض ہے کہ ان کو محفوظ رکھے حجاز مسلمانوں کا مقدس مرکز ہے، اسلئے اسکے بارہ میں صرف نجدی علماء کا فیصلہ صحیح نہیں ہوگا، بلکہ سارے عالم اسلام کے علماء کی اکثریت کے فتویٰ کی ضرورت ہے، وفد نے اس پر بھی زور دیا کہ اگر اہل نجد کتاب وسنت کے واقعی قائل ہیں، تو پھر حکومت کے سربراہ کا انتخاب شرعی ہو، جمہوری ہو، اور خاندانی وراثت سے پاک ہو، اور حجاز پر فقط سلطان نجد کی نہیں، بلکہ پورے عالم اسلام کی بادشاہت ہو، وفد نے ان باتوں کو عمل میں لانے کی کوشش موتمر اسلامی کے ذریعہ سے بھی کی، لیکن زیادہ موثر نہ ہوسکا،

اگست ۱۹۲۶ء میں وفد ہندوستان واپس آیا، تو مولانا محمد علی نے آخری چارۂ کار کے طور پر یہ اعلان کیا کہ اگر سعودی حکومت راہ راست پر نہ آئے تو عالم اسلام کے مسلمان حج کے لئے نہ جائیں، اس طرح حکومت سعودیہ پر معاشی بار اور مالی دباؤ پڑیگا، وہ راہ راست پر آجائیگی، لیکن اس مشورہ کو قبول کرنے کے بجائے مسلمانوں کا ایک طبقہ ان کا مخالف ہوگیا، اور وہ ایک چقلش میں پڑکر اپنے مخالفوں کے نرغے میں گھر گئے، مگر وہ حق بات کہنے میں نہ کبھی رکے اور نہ دبے، وہ جو کچھ کہتے اس میں ذاتی کے بجائے اسلامی جذبہ غالب رہتا، وہ تو اپنی نظربندی اور قید کو بھی اسلامی دولت سمجھتے رہے، اسی لئے انھوں نے کہا تھا، :-

میں کھو کے تری راہ میں سب حاصل دنیا
سمجھا کہ کچھ اس سے بھی سوا میرے لئے ہے

اسی سلسلہ میں لکھا ہے کہ جب تک اسکے خلاف مجھے یقین نہ آجائے میں اپنے خیالات کو سچا اسلام سمجھ کر اپنے مخالفوں کے سامنے پیش [illegible] سے مجھے نہ کوئی اب تک روک سکا ہے اور نہ انشاء اللہ آئندہ روک سکیگا، ان کی بقیہ زندگی نے اسکا ثبوت دیا،

اپنے کسی لفظ یا عمل سے اہل ہنود کو مشتعل ہونے کا موقع دیں، میں درخواست کرتا ہوں کہ اگر وہ تمھارے اوپر ہاتھ اٹھائیں تو سر جھکا دو، اگر چھری دکھائیں تو سینہ آگے کر دو، اگر ظلم کریں تو صبر سے کام لو۔"

موتمر اسلامی: خلافت کانفرنس کے اسی اجلاس کے بعد اس کی طرف سے ایک وفد مکہ معظمہ گیا ۱۹۲۶ء کے حج کے موقع پر ابن سعود کی طرف سے ایک موتمر اسلامی منعقد کی جا رہی تھی ہندستان میں اس کے دعوت نامے خلافت کانفرنس، جمعیۃ العلماء، اور اہل حدیث کانفرنس کے نام آئے، مولانا محمد علی کی رائے سے خلافت کانفرنس کا ایک وفد اس میں شرکت کے لئے مرتب ہوا تو اس کے رئیس استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی منتخب ہوئے، ارکان میں مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی اور شعیب قریشی تھے، مولانا محمد علی اس وفد کے ساتھ اس امید کے ساتھ گئے تھے کہ وہاں شرعی جمہوریت قائم کرائیں گے لیکن وہاں پہنچے تو ملوکیت کی حکمرانی اور نجدیت کی کر تجلی دیکھی، بڑے بڑے مشاہیر کی قبریں مسمار کر دی گئی تھیں، جمہوریت کا نام و نشان نہ تھا،

وفد کا جہاز حجاز کے ساحل پر لنگر انداز ہوا تو ...... خبر ملی کہ مدینہ منورہ میں جنت البقیع کے مزارات کے قبے گرا دیئے گئے، سلطان ابن سعود سے وفد کی پہلی ملاقات ۷ر مئی ۱۹۲۶ء کو دوسری ملاقات ۳۰ر مئی ۱۹۲۶ء کو ہوئی، تیسری ملاقات کے بعد آخری ملاقات ۷ر جولائی ۲۶ء میں ہوئی،

وفد کے رئیس استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی نے سلطان ابن سعود سے کہا کہ مذہبی حیثیت سے مقابر اور مآثر دونوں کی الگ الگ حیثیتیں ہیں، مقابر کی تعمیر کے متعلق احادیث اور فقہ میں تصریحی ممانعت کے الفاظ ملتے ہیں، گو ایک فریق ان کی تاویل کرتا ہے، اور وہ ایسا نہیں سمجھتا ہے، تاہم اس کی ایک شرعی حیثیت ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ علماے اسلام کے سامنے کھلے طریقے سے اس مسئلہ کو پیش کر کے ان کے متعلق فتویٰ طلب کیا جائے جو یقیناً

پیدا ہوگیا ہے، اور بجائے اس کے کہ ہم موجودہ مذہب میں سے کسی کے احکام کی پابندی کریں یا پرانی مجالس میں سے کسی کے مقاصد کو پورا کرنے کی پوری کوشش کریں، ایک نئے مذہب یا ایک نئی مجلس کے بانی ہونے کا شرف حاصل کرنا چاہتے ہیں، ہر مذہب اپنے معتقدین پر کچھ نہ کچھ ذمہ داری عائد کرتا ہے، اور ہر مجلس اپنے اراکین کو کسی نہ کسی قدر ضرور پابند کرتی ہے، اس ذمہ داری کا شعور تو ہم میں پیدا نہیں ہوتا، اور ان پابندیوں سے ہم اکتا جاتے ہیں، مگر نئے مذاہب اور نئی مجالس کی بنیاد ڈالنے کے لئے ہمارے ہاتھ کھجلاتے رہتے ہیں، ایک ندرت البتہ اس نئی مجلس کے بانیوں نے اس میں رکھی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس کے اراکین تمام مجالسِ ملی سے علٰحدہ ہو جائیں، مگر یہ ندرت ایسی زبردست تھی کہ اس کے باعث یہ نئی مجلس اعجوبۂ روزگار بن گئی ہے، ایسی ملی مجالس سے دست کشی کو جن کا وجود اتحاد و اشتراک قومی کے منافی ہو، ہر شخص سمجھ سکتا تھا مگر ۱۳ر جولائی کے اعلان میں اس قدر تعمیم تھی کہ ہر وہ شخص جو کچھ بھی مذہبی اور ملی احساس رکھتا تھا، اپنی اپنی جگہ پر خائف ہو گیا، اور سمجھنے لگا کہ یہ نئی مجلس ہندوستان میں وجود قومیت کی خواہاں نہیں بلکہ مذہب و ملت کی دشمن ہے،

"اٹلی کے مشہور شاعر ڈانٹے اور انگلستان کے مشہور شاعر ملٹن نے دوزخ کی جو تصویر کھینچی ہے، اس کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس کے دروازے پر کندہ ہے کہ جو شخص اس میں داخل ہو، امید کو باہر چھوڑ آئے"

پنڈت موتی لال نہرو صاحب اور مولانا ابوالکلام صاحب آزاد نے بظاہر ایک نئی جہنم پیدا کرنا چاہی تھی، جس کے دروازے پر کندہ ہو کہ

متحدہ قومیت پر بحث

۱۹۲۶ء کے وسط میں پنڈت موتی لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد نے مل کر انڈین نیشنل یونین نام کی ایک مجلس قائم کی جس کا یہ مسلک قرار پایا کہ اس کا جو رکن ہوگا وہ ایسے فرقہ وارانہ نظام کا ممبر نہ ہو سکے گا، جسے یونین قومیت ہند کو نقصان پہونچانے والا قرار دیدے، مولانا محمد علی یہ سمجھے کہ اس کی رو سے متحدہ قومیت اور ملیت منافی قرار دے دی گئی ہے، اسی لئے جب ان کے پاس دعوت نامہ پہونچا تو انھوں نے ۶ اور ۷ اکتوبر ۱۹۲۶ء کے ہمدرد کی اشاعت میں اس یونین کے خلاف ایک تحریر لکھی جس کے خاص خاص ٹکڑے یہ ہیں،

"حقیقت یہ ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا قوم پرور اور ملت پرور اپنے نفس کی حفاظت اور اپنے خاندان اور کنبے والوں کی تربیت و تنظیم سے بے اعتنائی نہیں کر سکتا، منظم کنبوں اور خاندانوں کے بغیر نہ ایک ملت تنظیم پا سکتی ہے نہ ایک قوم، اسی طرح جس ملک میں مختلف ملتیں آباد ہوں، اس میں تنظیم قومی کی تنظیم لازمی اور لابدی ہے، لیکن ارتقا کی ہر منزل میں ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ اس منزل سے آگے بھی ایک اور یا چند اور منزلیں ہیں، آخری منزل نہ فقط اپنا نفس ہے، نہ خاندان ہے، نہ ملت ہے، نہ قوم، بلکہ نوع انسان یا اس سے بھی آگے تمام مخلوقات اور کائنات ہے، جو شخص اپنے نفس کی حفاظت اور تربیت سے غافل ہو وہ اپنے خاندان کو کیا نفع پہونچا سکتا ہے، جو اپنے خاندان والوں کے سود و بہبود سے غافل ہے، وہ ملت کی سود و بہبود کیلئے کیا کر سکے گا، اور جو ملت کے لئے کچھ نہیں کر سکتا ہے وہ بھلا قوم اور ملک کے لئے کیا کر سکے گا،..........

ہندوستان میں مذہب سازی اور مجلس سازی کا ایک مہلک مرض

ہمارا بھائی مظلوم ہے تو اس کی اعانت کی ضرورت کو تو ہم سمجھے، مگر جو بھائی ظالم ہو اس کی کیسے اعانت کی جاسکتی ہے، آپ نے فرمایا، اس کی اعانت صرف ایک طریقہ پر کی جاسکتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس کو اس کے ظلم سے روکا جائے، غور کیجئے کہ کس لطیف پیرائے میں پیغمبر اسلام (روحی فداہ) نے اپنی امت کو سمجھادیا کہ ظالم مسلمان کا اس کے ظلم میں ساتھ نہ دینا ہی ایک مسلمان کے لئے کافی نہیں ہے، بلکہ اس منفیانہ پہلو سے زیادہ اہم اس کا مثبتانہ پہلو ہے، ہر مسلمان کا فرض ہے کہ ایک ظالم مسلمان کو ظلم سے روکے اور اسے ناانصافی سے باز رکھے"

"ایک مسلمان اس قومیت کا ہرگز طرفدار نہیں ہو سکتا جو اسے اپنے دینی بھائیوں کی تنظیم سے باز رکھے، لیکن وہ اس نیت کا بھی طرفدار نہیں ہو سکتا، جس کی طرف اسے بعض مسلمان گھسیٹنا چاہتے ہیں، اور وہ ہمیشہ اسے اپنا فرض سمجھے گا، کہ اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم پر ظلم کرے تو یہی نہیں کہ اسکو ظلم میں مدد نہ دے، بلکہ اسے اس ظلم سے باز بھی رکھے، کیا قومیت کے نئے دلدادہ اپنی قوم پرستی کے لئے اس سے بہتر کوئی اصول ایجاد کر سکتے ہیں،

"ایک مسلمان قوم پرور اور محب وطن اس لئے ہے، کہ اسلام نے نہایت کشادہ دلی سے حقوق جار کو تسلیم کیا ہے، اور جس مذہب کے قانون نے غیر مسلموں کو بھی حق شفعہ دے کر پڑوسی کے بعض حقوق کو سگے بھائی اور مسلمانوں کے حقوق پر بھی ترجیح دی، وہ قومیت مشترکہ کے خلاف نہیں ہو سکتا...... ہر حالت میں غیر مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی اسلام اور ایمان کے منافی ہے، حقیقتاً ایک مسلمان کے لئے حب الوطن من الایمان ہے"

جو اس میں داخل ہونا چاہے، وہ ملت و مذہب کو باہر چھوڑ آئے،

"پہلا بیان ایک شورش برپا کردینے کے لئے کافی تھا، وہ فرقہ وارانہ جدوجہد جو دوسرے فرقہ سے دشمنی رکھنے کے باعث کی جائے، یقیناً ایک مختلف الاجزاء، مگر متحدہ اور مشترکہ قومیت کے منافی ہے، جس کا پیدا کرنا اور جس کو تربیت اور نشوونما دینا ہر محب وطن اور وطن پرور ہندوستانی کا فرض ہے، لیکن بے سوچے سمجھے کامل تعمیم کے ساتھ یہ کہہ دینا کہ کمیونلزم یا ملیت نیشنلزم یا قومیت کے منافی ہے، اس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا کہ کوئی شخص قوم پروری یا ملت پروری کے جوش میں لوگوں کو اپنے کنبے اور خاندان کی پرورش اور ان کی تنظیم سے منع کرتا پھرے ....

"اسلام نے دنیا کو مسلم و کافر دو ملتوں میں ضرور تقسیم کیا ہے لیکن کیا اسلام نے اس کی اجازت دی ہے کہ اپنی ملت کی محبت میں کوئی مسلمان اتنا سرشار ہو جائے کہ بنی آدم کے ساتھ انصاف کو یک قلم ترک کردے،

.... رسول اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اپنے بھائی یعنی مسلمان کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم، سطحی نظر سے دیکھنے والے اس ارشاد مبارک کو سنتے ہی کود پڑیں گے اور فرمانے لگیں گے کہ اسلام کی یہی تو تعلیم ہے، جو مسلمانوں کو قومیت کے احساس سے محروم رکھتی ہے، لیکن جتنی عقل مستفاد ان کے حصے میں یورپ کے فیض و کرم سے آئی ہے کم سے کم اتنی عقل تو عرب کے ایک بدو میں بھی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک صحابی نے دریافت کیا تھا یارسول اللہ صلعم! اگر

دیوانِ ہادی

از جناب ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی صاحب، دہلی یونیورسٹی

ہادی نام اور تخلص کے بہت سے فارسی شعراء گذرے ہیں جنمیں سے بعض کے نام تذکروں کی مدد سے یہاں درج کئے جا رہے ہیں، ممکن ہے کہ تذکرہ نویسوں نے ایک کو دوسرے سے مشتبہ کر دیا ہو۔

میر محمد ہادی یزدجردی | شمع انجمن میں انکو کاشانی اور عرفات عاشقین و آفتاب عالمتاب میں یزدجردی کہا گیا ہے، مگر مولفین صبح گلشن اور روز روشن نے کہا ہے کہ اصلاً وہ یزدجردی تھے مگر چونکہ کاشان میں انکی نشو و نما ہوئی بلکہ وہیں وہ طبابت کرتے تھے اسلئے انکو کاشانی بھی لکھدیا گیا ہے، یہ میر عبدالرزاق کاشی کے چچا زاد بھائی تھے اور شروع شروع میں وہ زیادہ تر عشق و عاشقی اور لہو و لعب میں زندگی بسر کرتے تھے، مگر بعد میں انھوں نے توبہ کر لی تھی شاہ طہماسپ (۹۲۰-۹۸۴ ہجری/۱۵۲۴-۱۵۷۶ عیسوی) کے عہد میں وہ محتسب مقرر ہوئے اور پھر امام رضا کے روضہ کے متولی ہوگئے، نیز اپنا وقت وہ زیادہ تر عبادت میں گذارتے رہے، آخرکار ۹۵۰ ہجری (۱۵۴۳-۴۴ عیسوی) میں انھوں نے انتقال کیا، صاحب ریاض الشعراء نے انکو شاہ سلیمان (۱۰۷۷-۱۱۰۵/۱۶۶۷-۱۶۹۴) کا معاصر بتلایا ہے جو صحیح نہیں ہے، صبح گلشن اور روز روشن میں ان کے یہ اشعار نقل کئے گئے ہیں:-

بگفتم تیغ کین بر داد و دل قتل ہادی کن　　بخندہ گفت در عاشق کشی ہادی نمی خواہم

معلوم نہیں کس منحوس ساعت میں اس قسم کی بحث کا آغاز ہوا تھا، کہ یہ ملک کے لئے یہ بہت ہی ناسازگار ناخوش گوار اور مضر ثابت ہوئی، قومیت متحدہ قومیت، علیحدہ قومیت اور فرقہ واریت کی اصطلاحات کے ساتھ طرح طرح کے جھگڑے کھڑے ہوگئے، گاندھی جی نے علی برادران کے ساتھ ہندو مسلمان بھائی بھائی کے نعرے دیئے تھے، جن کی بدولت ہندوستان میں میل ملاپ، اتحاد، یگانگت اور موانست کی ایسی خوش گوار فضا پیدا ہوگئی تھی، کہ یہ زمانہ ہندوستان کی تاریخ کا زریں دور کہا جا سکتا ہے، ہمارے ہموطن سیاسی اصطلاحات کا سہارا لینے کے بجائے ہم سب بھائی بھائی ہیں کی للکار اور پکار بلکہ صرف اسی کی حدی خوانی اور رجز خوانی کو اپناتے اور صرف اسی نعرہ سے ملک کی فضا میں گونج پیدا کرتے رہتے، اور اصطلاحات کے سیاسی، عمرانی اور فلسفیانہ مباحث میں نہ الجھتے، تو ہمارے وطن کی تاریخ کچھ اور ہوتی مولانا محمد علی نے تقریباً نصف صدی پہلے یہ کہا تھا، کہ جس طرح تحفظ نفس بگڑ کر نفس پروری بن جاتا ہے، تحفظ اہل وعیال بھی بگڑ کر ہیں ملت فروشی تک پہنچا دیتا ہے اسی طرح یہ بھی سچ ہے کہ ملت پروری بگڑ کر تعصب و غلو بن جاتا ہے، قوم پروری بگڑ کر ناانصافی کے درجہ تک پہونچ جاتی ہے ان کی اس رائے کا تجزیہ ہمارے وطن کی تاریخ کے گذشتہ واقعات کی روشنی میں کرنے کی ضرورت ہے، جو اصطلاحات باہمی اتحاد اور میل و ملاپ کے مقصد کو پورا کرنے کا ذریعہ بنائی گئیں وہ ہماری بدقسمتی سے اصل مقصد پر غالب آگئیں، ذریعہ کو زیادہ اہم کر دیا گیا اور مقصد اس طرح نظر انداز ہوتا گیا کہ اس کی حیثیت ذریعہ کے مقابلہ میں ثانوی ہوگئی، جس سے تلخ نتائج پیدا ہوتے رہے (باقی)

در گلشن جہان گلی نچیدم بی تو بوئی زگلستان نشنیدم بی تو
ہر چند نظر باہل عالم کردم بیخود دیدم ولی ندیدم بی تو

نیز آتشکدہ اور ریاض الشعرا میں انکا یہ شعر دیا ہوا ہے :-

روزی خود بیخودم ہر کہ درین عالم است واسطہ خوشناست ہمت کرم داشتن

۴۔ میرزا عبدالہادی کاشی | یہ ملا علی رضا تجلی (وفات ۱۰۸۰ ہجری/۱۶۶۹ عیسوی) کے صاحبزادے تھے، مؤلفین تذکرہ شعرای کشمیری اور مخزن الغرائب نے ان کے یہ اشعار نقل کئے ہیں :-

زپہلوی ہنر ہر بی کمالم دشمن جان است مرا از آب چون یاقوت آتش در گریبان است
ز آتش خونگاہی گشت خاکستر دل ای ہادی کہ گردش سرمۂ آوازۂ چشم غزالان است
سخن زیر لبش شد آب از شرم وتبسم شد لطافت غنچہ شان ....
آہ کین دل چو عقدۂ گوہر دانستہ تا نگشت خاکستر

۵۔ ہادی ابرقوہی | یہ میر برہان ابرقوہی کے بھائی تھے اور زیادہ تر شیراز میں رہا کرتے تھے، مؤلفین مجمع النفائس، روز روشن اور مخزن الغرائب نے انکے یہ اشعار نقل کئے ہیں :-

بی تا ہیم کشند ہمہ جا در قفای او افتادہ ام چو سایہ بدنبال آفتاب
دل را بدیدہ می افگند اضطراب اشک چون کشتی کہ موج بگرداب اش افگند

مؤلفین مجمع النفائس ونشتر عشق و نگارستان سخن نے انکا یہ شعر اور رباعی نقل کی ہے :-

می نمایند بہم تیغ ترا چون مہ عید خون تو می ریزی و انگشت نما شہر است
دنیا داران مسلمانی احسان ندہند جز حالت تپ نان بفقیران ندہند
این طائفہ سوختی اہجو تنور تا گرم نگردند بکس نان ندہند

۶۔ میر محمد جواد ہادی دہلوی | یہ اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے صبح گلشن میں انکا

درحبت رحمتش چہ نماید گناہ من　　　　یک مشت خاک گل نہ کند آب بحر را

مؤلفین عرفات عاشقین اور صبح گلشن نے انکا یہ شعر نقل کیا ہے :-

بجاں رسید دل از محنت جہاں مارا　　　　اجل کجاست کہ منت نہد بجان مارا

نیز مؤلف عرفات عاشقین نے جنکے زمانہ میں وہ موجود تھے انکا یہ شعر لکھا ہے :-

محتسب ... شیشۂ مستان لایعقل شکست　　　　شیشۂ عمرش بسنگ آید کہ مارا دل شکست

مؤلف مخزن الغرائب نے ان ہی ہادی کو یزد جردی "کہکنہ شکست" والا شعر اور کاشی "کہکنہ بحر را" والا شعر نقل کیا ہے اور اسطرح ایک کو دو کرکے پیش کیا ہے :-

۲- شیخ ہادی استرابادی | یہ استراباد کے شیخزادوں میں سے تھے اور شعر میں حیرتی (وفات ۹۶۱ ہجری / ۱۵۵۳ء ۱۵۵۴ عیسوی) کی پیروی کرتے تھے ایک مرتبہ جب وہ کچھ اشعار ان کے پاس لے گئے تو حیرتی نے کہا کہ یہ تو میرا مضمون ہے، انھوں نے کہا کہ میں نے تم سے بہتر باندھا ہے، اس پر حیرتی نے کہا کہ اگر تم میری دستار کو اچھی طرح سے باندھ لو تو وہ تمہاری تو نہ ہو سکے گا۔
مؤلفین مخزن الغرائب، روز روشن و نگارستان سخن نے انکے یہ شعر نقل کئے ہیں :-

منم بگوشۂ غم در فراق یار نشستہ　　　　قرار دادہ بہجران و بیقرار نشستہ
برہگذار تو دیگر کسی چگونہ نشیند،　　　　بخاطرت گر ازین رہگذر غبار نشستہ

۳- مرزا ہادی شہرستانی | یہ مرزا محمد رفیع شہرستانی کے صاحبزادے تھے اور شروع میں محتسب ممالک تھے، غالباً شاہجہاں (۱۰۳۷-۱۰۶۸ ہجری / ۱۶۲۸-۱۶۵۸ عیسوی) کے عہد میں وہ ہندوستان بھی آئے تھے، مگر بعد میں اپنے وطن چلے گئے، بعض نے لکھا ہے کہ وہ شاہ سلیمان (۱۰۷۷-۱۱۰۵ ہجری / ۱۶۶۷-۱۶۹۴ عیسوی) کے زمانہ میں ہندوستان آئے اور بلند عہدوں پر فائز رہے۔ مخزن الغرائب اور صبح گلشن میں انکی یہ رباعی نقل کی گئی ہے :-

۱۴- سید علی خاں ہادی ابن مہر خاں نعمت اللہی | سید علی خاں ہادی نواب نعمت اللہ خاں کے چچازاد بھائی تھے، مؤلف مخزن الغرائب نے انکا یہ شعر نقل کیا ہے:۔

دل بدست آن بت بیرحم دلی پروائی ما ہمچو مرغ نیم بسمل ماندہ بی پروائی ما

۱۵- ہادی | مؤلف مخزن الغرائب نے ایک ہادی نامی شاعر کا ذکر کیا ہے۔ مگر انکے متعلق کچھ اور نام و پتہ نہیں دیا ہے، نیز ان کے یہ دو مصرعے نقل کئے ہیں:۔

ع نگاہ آشنای او بہ بیگانہ می ماند ع کم ترا می بینم و بسیار می خواہد دلم

مجھے دیوان ہادی کا ایک ضخیم نادر قلمی نسخہ ملا ہے جو غالباً منحصر بفرد ہے اور غالباً ان ہادیوں میں سے کسی کا بھی نہیں ہے، کیونکہ تذکروں میں ان کے دئے ہوئے اشعار اس نسخہ میں نہیں ملتے، نیز اس دیوان کے ہادی کا کسی تذکرہ نویس نے ذکر نہیں کیا ہے جسکی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ ہادی اپنے کو شعرا کی صف میں ظاہرا شریک کرنا نہیں چاہتے تھے۔

شریک مردم صاحب سخن نمی گردد اگرچہ ہادی ما طبع قابلی دارد

بلکہ اپنے کو بحیثیت شاعر کے پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے:۔

در نہان ہادی سخن سنجیدہ ام چہ ضرور است آشکار شوم

بہرحال یہ نسخہ بمبئی ٹرسٹ کی جامع مسجد کی لائبریری میں ہے (نمبر ۲۳) جس میں تقریباً ۹۰۸۱ شعر ہیں یہ نسخہ عام طور سے اچھی حالت میں ہے، البتہ آخر اور وسط سے چند ورق غائب ہیں نیز اوراق الٹ پلٹ گئے ہیں، یہ نسخہ اس مطلع سے شروع ہوتا ہے:۔

گر دمجنوں در ہوا دارد سر زنجیر را کیست دیدہ طرح بزم مردم دلگیر را

ان ہادی کے حالات تذکروں سے معلوم نہ ہوسکے البتہ اس دیوان کے مطالعہ سے بہت سے جزئیات کا پتہ چل سکا، معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایران کے رہنے والے تھے:۔

یہ شعر نقل ہوا ہے :۔

گرد ہادی کہ از غبار من است
گرد کویت ہنوز میگردد

۷۔ ہادی نائنی | یہ مرثیہ گو تھے اور مذہبی مضامین باندھا کرتے تھے، صبح گلشن میں ان کے یہ اشعار نقل کئے گئے ہیں :۔

شد شاہ دیں سوار و حرم در قفای او
گریان و نوحہ سنج تمام از برای او

بس نخلہای گلشن آل عبا فگند
دہقان روزگار کہ اف بر وفای او

۸۔ ہادی کشمیری | مؤلف تذکرہ شعرای کشمیر نے انکے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے، بلکہ صرف ان کو "سالک مسلک ہدایت" کہکر انکا یہ شعر نقل کر دیا ہے،

ہر چہ یاد ابادمیگویم جز انیم شکوہ نیست
کم ترا می بینم و بسیار میخواہد دلم

۹۔ مرزا حسن ہادی اصفہانی | یہ اصفہان کے حسینی سادات میں سے اور مرزا شاہ نقی کے بیٹے تھے، نیز اپنے زمانہ میں مشہد کے شیخ الاسلام تھے، مؤلف آتشکدہ نے انکا یہ شعر نقل کیا ہے :۔

بس گرفتہ است دلم خانۂ صیاد خراب
کاش روی قفسم جانب صحرا می کرد

۱۰۔ میر ہادی قزوینی | مؤلفین عرفات عاشقین اور مخزن الغرائب نے انکے یہ شعر نقل کئے ہیں :۔

میانہ من و او اتحاد جسمانی
رسیدہ است بجائی کہ در نمی گنجد

بی داغ چوں رود ز کفن کشتۂ ترا
صد رہ گرش بآب بقا شست و شو کنند

صاحب عرفات نے انھیں دیکھا بھی تھا۔

۱۱۔ میر ہادی موسوی | مؤلف مخزن الغرائب نے انکا یہ شعر نقل کیا ہے :۔

خوش آنکہ پہلوی ہم چوں برگہای نرگس
جمعی نشستہ باشند جائی در آن میانہ

۱۲۔ شیخ امام الدین ہادی سنبھلی ، ۱۳۔ مرزا ہادی لاری

ہندوستان میں وہ غالباً شاہجہاں بادشاہ کے زمانہ میں موجود تھے، بلکہ ان کے دربار میں ملازم تھے:۔

کاری زیاد از بن نتوان ساخت در جہان
گردیده ایم بندۂ صاحب قران بن است

ہادی دکن اور بنگال بھی جانا چاہتے تھے:

ہادی اگر عنان کش قسمت بکام ماست
خواہیم کرد سیر دکن را بمدعا

غزل ما پر کاغذ چو بہ بنگالہ فگند
راہ بر آمدن نالۂ الہام کشاد

نیز دکن وہ جا گئے، تھے، جہاں شاید انھیں آرام کی زندگی مل گئی تھی اور وہ اس نتیجہ پہ پہونچے تھے کہ رہنے کے لئے اس سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہے:۔

نخواہم کرد ہادی شکوه دیگر از وطن دوری
اگر خود را مرفہ چند سالی در دکن بینم

ہادی زمین جای دگر دلنشین نشد
بہتر کہ ملک گر بخرد در دکن خرد

مگر پتہ نہیں وہ بنگال بھی پہونچ سکے یا نہیں، انھیں کشمیر دیکھنے کا بھی بیحد اشتیاق تھا جو شاید پورا نہ ہو سکا:۔

سیر ہادی ہست در ہر جا کہ کس دل وا کند
میتواند بود خاطر گلشن کشمیر ما

نتند ہادی چو کشمیر ش تواند در نظر آرد
چہ حاصل گر ز سیر خطۂ کابل خبر دارد

مشکل کہ از بہار دختر انش خبر شویم
ہادی ز دور حاصل کشمیر خورده ایم

شروع شروع میں ہادی وطن سے دوری پر بہت خوش تھے:۔

ہادی از دوری تا بسیار شدم دوری دست
میتوان گفت بدل خواہش اصفہان نیست

بال و پر را ز وطن دوری تا آتش میزنم
خار دامنگیر پرواز آشیان میوزدم

بزرگان کو ہندوستان اور ہندوؤں سے کافی لگاؤ اور علاقہ پیدا ہو گیا تھا:۔

نسبت شاہ عرب آئینۂ تعظیم شد
تا وطن در عشرت آباد عجم کردیم ما

ایران میں بھی اصفہان انکا وطن تھا جس کی جدائی ان پر شاق تھی، نیز وہ "اصفہان نصف جہاں" کو اصفہان کی پوری تعریف نہیں سمجھتے تھے:-

وطن جدائی ما بود سہل تر ہادی
اگر کہ مسکن ما اصفہان نمی گردید

در زندگی بہشت گرامی شود نصیب
دور از دلم خیال صفاہان فتادہ بود

شروع میں انکا خیال تھا کہ وہ وہیں رہیں گے اور باوجود زحمتوں کے دوسرے شعرا کی طرح مال و دولت کے لالچ میں پڑکر وطن کو ترک نہ کریں گے، کچھ دنوں وہ قزوین میں بھی تھے:-

بی تکلف سیرہا از خاطرش کی می رود
ہر کہ ہادی ہمچو ما چندی بقزوین ماندہ است

عزل شوق بگلزار وطن ساختہ ایم
آشیان از پر مرغان چمن ساختہ ایم

مگر باوجود اس فطری محبت کے، لوگوں اور دوستوں کے برے سلوک اور نفاق آمیز رویہ سے بحد کبیدہ خاطر ہوکر آخر انھیں آبائی سرزمین کو چھوڑنا ہی پڑا:-

ہادی اختیار وطن را نہ ترک کرد
مرغ شکستہ بال ز پر ہا شکستہ است

بیزار از وطن ز وطن ہم غریب تر
از خویشتن نشد کہ بیا یم غریب تر

از فراغت دشمنی پابند حسرت گشتہ ایم
از وطن دلگیر حاجتمند غربت گشتہ ایم

بد بیائی نفاق دوستان را ایں ثمر باشد
بخاطر یاد خوبیہای صفاہان نمی کردم

نشد وہمت بی عقل ازیں بیش زیاد
برضا ترک گلستان صفاہان کردم

ایران سے غالباً ہادی کابل ہوتے ہوئے ہندوستان آئے، اس لئے کہ کابل میں قیام کا انھوں نے ذکر کیا ہے، نیز اس کی توصیف کی ہے:-

بہرہ ہادی ازیں آب وہوا کم بردہ ایم
در دیار ہند جای زندگانی کابل است

جب اس سفر میں یمن سے یثرب کی طرف گئے تو کہتے ہیں:۔

ہادی از گلشن یثرب خبری خواہی داد — تو کہ از کشور رنگین یمن می آئی

حج کے بعد ہادی غالباً اپنے وطن پہونچ گئے ہوں گے، اگر ایسا ہے تو انکا انتقال بھی وہیں پر ہوا ہوگا:۔

خاکم از کعبہ صبا جانب ایران برد — گر بتوفیق خدا دست کہ رخصت باہم

انھوں نے کافی عمر پائی تھی، اس لئے کہ ذیل کے شعر میں انھوں نے اپنے بڑھاپے کیطرف اشارہ کیا ہے:۔

چون بہ پیری جوان شدم ہادی — دیدہ زر بخت مہربان برخاست

پیری [illegible] کہ چو شدی میل جوانی بچاست — این نہ راہیست کہ ہرکس برود واگردد

[illegible] صاحب [illegible] و عیال تھے، اس لئے کہ مندرجہ ذیل شعر میں انھوں نے اپنے بیٹے کی جدائی [illegible] کیا ہے:۔

[illegible] دوری فرزند قسمت است — ہادی دلم فراق عزیز پسر [illegible]

[illegible] معشوق بھی تھا جو مذہباً ان سے الگ تھا:۔

[illegible] آئینہ کفر نما شد — معشوق خود است کہ ہم کیش نباشد

[illegible] فرنگی نسبان بدنام — نتوان گشت بہر ہرد لیر ناپاک اسیر

[illegible] علی، امام حسین، امام رضا، آل عبا، امام زمانہ نجف، کربلا، مشہد، امام رضا [illegible] عقیدت رکھتے تھے،

[illegible] شاہ نجف چون سکندرم — ہادی اگر بسلک غلامان شوم [illegible]

[illegible] مرگ ہادی جنت است — گوشہ در مشہد شاہ رضا باید [illegible]

کفر ہندوزادگان ہادی سرایت میکند ہر گہ ز مژگان این بتخانہ می سوزد دلم

اتنے سیر و سفر کے بعد بھی انھیں غالباً حسب منشا ترقی نہ مل سکی، جس کے نتیجہ میں وہ بددل ہو گئے تھے:۔

چہ می داند کسی قسمت چہ خواہد کرد با ہر کس کہ می دانست باید بود در ہندوستان ما را

ہادی از مرتبۂ خویش شکایت بیجاست چہ توان کرد بہ بازار کساد آمدہ ایم

دوسری طرف فطری طور سے وہ وطن اور اصفہان کی مجلسوں کی یاد میں پڑ کر یہاں کی غربت سے گھبرانے لگے ہوں گے:۔

ز خامہ حرف زبان سیاہ ہند شنید چگونہ ہادی ما حرف واشگون گوید

ز وطن ہر کس بر آید کاش اندیاد خویش ہم دردی ہر کس کہ آمد در غربت را فزود

خاکم غبار سرمۂ ہر چشم حسرت است دردم ز یاد سیر صفاہان چہ می پری

اور جب کوئی بندر سورت سے بندر ہرمز کی طرف جاتا ہوا ملتا تو اس سے سلام بھجواتے تھے، نیز وہ اپنا کلام اصفہان بھیجنے کے لئے کوشاں رہتے تھے:۔

بہر شہری سلام ما بایاران یمن می سازد ز سورت ہر کہ ہادی داخل ہرمز می گردد

نیز جب کوئی وطن سے آتا تھا تو اسے دیکھ کر بیحد خوش ہوتے تھے:۔

جان معنی شدہ در جسم سخن می آئی چون نسیم از چمن جلد وطن می آئی

غالباً ہادی ہند سے حج کے لئے گئے، جس کے بعد وہ وطن واپس جانا چاہتے تھے:۔

دمی را با تمام عمر ہادی می کنم سودا اگر بعد از طواف کعبہ بینم در وطن خود را

ازین وادی توان از ہند ہادی رفت یا ثیرب

سخن تا می توانی از حجاز و از یمن سر کن

نیز وہ ہر زمین میں مگر غزلیں کہا کرتے تھے،

بعد ازیں طرح سخن یابد بدیوانہای خویشتن

شد مگر ہر زمین از طبع عالم گیر ما

صرف اس مصرع کے لئے انھوں نے پوری غزل کہی تھی:۔

برای مصرعی ہادی غزل از صدق دل گفتم — کفن از پیکرم در خاک راہ کربلا بکشا

نیز اس مصرع پر ایک اور غزل میں بھی تضمین کی ہے:۔

وصیت می کنم ہادی نسیم شوق پرور را — کفن از پیکرم در خاک راہ کربلا بکشا

متقدمین اور معاصر شعراء میں وہ سعدی، حافظ، خسرو، حسن، فغانی، نوائی، شفائی، عرفی، ظہوری، طالب آملی کا بڑا احترام کرتے تھے:۔

بیشتر چند روزی ساغر معنی کشید — در سخن سازی غزل شد حافظ شیراز ما

حافظ و سعدی و عرفی ہمہ ہادی ہستند — نشائی از سخن مردم شیراز ہست

از تربیت گلشن اندیشۂ خسرو — ہادی گل دیوان حسن سخت عزیز است

تا کہ ہادی ز تاب نشۂ رنگین فکر — بادۂ معنی بہار آرای آملی میخورد

ہادی از فکر سخن مستی دیگر دارد — تا بسی تر زمی عرفی شیراز نمود

چون ظہوری دیگری ہادی کجا پیدا شود — گر سراسر بو خطہ ملک دکن برہم قند

ہادی از تیرگی ہر دو جہان بیخبرم — توتیا در نظر از خاک حسن ساختہ ام

بفصاحت چہ روش ترک زبان خواہد شد — ہر کہ در وصف سخن آمد چو نوائی نکند

حافظ سے عام غزل گو شعراء کی طرح انھیں بھی خاص عقیدت تھی، نیز حسب ذیل شعر میں انھوں نے فال حافظ کی طرف اشارہ کیا ہے، جبکہ یہ ایک روایت تھا اور ابھی

ہرکہ از بندگی آل عبا بیرون است | از صف اہل یقیں روز جزا بیرون است
بر دشمن حسین علی تیغ می کشیم | ہادی زبان شعلۂ خنجر کشیدہ است
ز اعتقاد تو ہادی بعید چندان است | کہ کس ز گرد تو در کربلا خبر گیرد
دست از نہا تا لب کوثر چیاں ہادی کشیم | ما ز میراث نبی قرآن و عترت دیدہ ایم

وہ محرم بڑے غم و الم سے مناتے تھے :۔

محرم اشک خون بہر شہید کربلا ریزم | مسلماں نیست ہادی گر کسی ماتم نمی گیرد

وہ لوگوں خاصکر خوشحال لوگوں کی مذہبیات سے غفلت کے شاکی تھے :۔

حضرت صاحب زماں روز چنیں پیدا شود | کاش درد نہای مردم در دیں پیدا شود
میتواں گفتن فراغت کفر پرور بودہ است | در دیار میش ہادی درد اسلامی ندید

ہادی بظاہر ایک کشادہ دل اور پرخلوص انسان تھے نیز چاہتے تھے کہ لوگوں سے صاف دلی سے ملیں، مگر اسی کے ساتھ وہ ضمیر فروشی اور غلط قدروں کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہ تھے

تصدیق ہر حکایت بیجا چساں کنم | با مردم زمانہ مدارا چساں کنم

علاوہ بریں وہ ایک فقیر منش انسان معلوم ہوتے ہیں :۔

منت دولت نشین حمیت ار رغبت جدا | میتواں ہادی مرا در بزم درویشاں یافت

وہ عام مشرب سے اپنے کو الگ رکھنا چاہتے تھے :۔

خویش را دور ضرور است ز مشرب سازم | چند تہمت زدۂ شیشہ و پیمانہ کنم

نیز وہ گدا گر شعرا کی مذمت کرتے :۔

ہادی از بہر لب نان کہ خدا خواہد داد | منتِ لطف ز ہر شاہ و گدا چند کشیم

اور اشعار بغیر کسی دنیاوی غرض کے کہا کرتے تھے،

ہجو ناکیست کہ گوید سخن بی مطلب | ہمہ کس را بنظر آئینہ تحسین بود

وہ ایک پرگو شاعر تھے،

ہادی از فیض سخن یک نفسی درپیش است | ہر غزل را کہ بگوئی دگری درپیش است

البتہ رشید اکا جنکی عام طور سے شعرا خاصکر ایرانی صاحبان ہنر سے رقابت رہا کرتی تھی،
انھوں نے بھی حقارت سے ذکر کیا ہے:-

ہادی از شہرت بسیار کسی شاعر نیست
پیش ما مرتبۂ قدرت رشید و نخود

انھوں نے ایک جوان مرزا کا بار بار ذکر کیا ہے جو شاید ان کے جگری دوست تھے اور سفر
میں ان کے ساتھ رہے ہوں گے، مگر صحیح پتہ نہیں چلتا کہ ان مرزا سے کون مراد ہے:-

ہادی از نکہت [illegible] ہم خاطرم آسودہ بود
این سفر گمراں جوان میرزا ہمراہ بود

ہادی ایک طرف [illegible] سے کام لیتے ہیں:-

یک غزل ہادی نشد دلخواہ شہرت دوستاں
گرچہ فرد دفترم آمد ز دفترہا گذشت

مگر [illegible] ان کو اپنے [illegible]

[illegible] سخن در پردہ رسوائی شود
[illegible] مدعی گفتم ز کشورہا گذشت

انچہ من گفتم [illegible] ثانی ندیدہ است
در دو رنگا صاحب ثانی ندیدہ است

گر [illegible] بہان ہیچ معنی پیدا کن
جان [illegible] شدہ ام ہیچ معنی پیدا کن

وہ سنائی کو اپنے سے کمتر سمجھتے تھے:-

ہادی از بوی گل باغ سخن معلوم ہست
تجنیس فکر غزل طبع سنائی نکند

نیز ان کو یقین تھا کہ سنائی کی شہرت نے ان کے کلام کو بلند کر دیا تھا:-

گاہ باشد کہ سخن قدر ز شاعر یابد
کیست گوید کہ سخنہای سنائی حرفیست

ان کا خیال تھا کہ لوگوں کی عیب جوئی سے کسی کا ہنر چھپایا نہیں جا سکتا:-

ہادی از حرف کسی نقص رسد کی بکمال
بخت بی حاصل عرفی و ثنائی حرفیست

نیز ان کے نزدیک مدرسوں میں شاعری کو فرہنگ سے الگ کر کے دیکھا جاتا ہے:-

فال حافظ شدہ احوال دل ما ہادی — شد پریشاں و دلش برمن دیوانہ نسوخت

علاوہ بریں انھوں نے انوری، سعدی، اوحدی، حافظ، عرفی، صائب، حاتم، اسیر، ہاتف، وغیرہ کے اشعار پر تضمینیں لگائی اور ان کے جواب میں غزلیں کہی ہیں:۔

ہادی صد آفریں با سیری کہ گفتہ است — آں دانہ صرف بردہ کہ در خاک ماندہ است

رفتہ ام ہادی زشوق مصرع صائب زہوش — بسکہ پیش یار حرفم بر زمیں افتادہ است

بشنو از انوری کہ ہادی گفت — جامہ و جامی من جواب من است

ہادی نہ سر شوق بخوان مطلع ہاتف — چوں مست بگردد سر پیمانہ نگردد

ہادی جواب گفتہ سعدی است ایں غزل — شادی مکن کہ ہر تو ہمیں ماجرا رود

ہادی دریں غزل چہ بجا گفت اوحدی — بگذاشتیم تا کرم او چہ میکند

ہادی از حافظ شیراز نصیحت بشنو — راہ صعب است مبادا کہ خطائی بکنم

ہادی از مصرع حاتم نگذشتم بشنو — ہمہ را جمع شما انجمنی پیدا کن

کبھی کبھی وہ اپنی غزلوں کے جواب میں بھی غزلیں کہتے تھے:۔

ایں غزل ہادی جواب مصرع خود گفتہ ام — در خود فہمیدگی آزادئی باید کشید

معاصرین میں وہ سنجر کا ذکر بار بار بڑے شوق سے کرتے ہیں، جن سے غالباً ان کے دوستانہ تعلقات تھے اور جو غالباً ان کے زمانہ میں دکن میں رہتے تھے:۔

ہادی از صحبت سنجر نتواں دل برداشت — سخنی چند زیاران دکن می گذرد

سخن ہادی اگر آید پیش انشائی آرد — خیالم پیش طبع تازۂ سنجر چہ بنماید

نیز شاعری میں وہ انکی برتری کے قائل نظر آتے ہیں:۔

نشد ہادی توانم ہجو سنجر مصرعی گفتن — بمیدان سخن شد مدتی مردانہ می آیم

پردہ برداشتہ از دیدنِ او می داند رشک فرمای نظر موج نقاب است اینجا

نشۂ معنی بہار جولئی موج تاک نیست عکس در آئینہ برق ساغر ادراک نیست

مگر اسی کے ساتھ ان کے اس ضخیم دیوان میں بیشمار شگفتہ، رواں اور سلیس اشعار بھی مل سکتے ہیں، اب یہاں ایسے کچھ اشعار بطور نمونہ کے نقل کئے جا رہے ہیں:-

رنگ ہستی ۔ اجبلای پرتو عرفان کجا بینش آئینہ کو نظارۂ حیران کجا

بوی پیراہن مگر خضر نظر بازی شود مصر مارا طاقت سرگرمی کنعان کجا

دم بجولان طپیدہ تلاش نفس شود پرواز از برای اسیران قفس شود

زبسکہ مست شیشۂ خالی بسنگ زد نزدیک شد کہ شیشۂ شکن دل شکن شود

چشم سیاہ مست زدلہا خبر دہد این جام از حیات مسیحا خبر دہد

آسودگی بخاطر وحشت شعار نیست امروز ما ز وحشت فردا خبر دہد

شعلہ را نا مزد خویش بہار م کردند خون بیجاصل دل را گنا رم کردند

گل بہار چمن آتش رخسار تو بود دیدہ آئینہ پر آب ز دیدار تو بود

گل فروش است زعکس چمن ماہ رخت پرتو مہر کہ رخسار دیوار تو بود

بدام بال و پر افتادہ از آشیاں ترسم نمی ترسم ز دشمن از فریب دوستان ترسم

نقش پا گرداب شد ہر جا نگاہ اندا ختم تا کہ بحر بیقراری را براہ اندا ختم

چہ شد چہ شد کہ چنیں سرگراں باز شدی زمانہ دشمن ما شد زمانہ ساز شدی

"ملازم، خبرگہ، تنخواہ" اور شخص جیسے الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے جو غزل کی زبان پر گراں گذرتے ہیں:-

آنکہ در خبرگہ، تبخانہ فرزداں آمد آتشی بود کہ از کشور اسلام گذشت

ہادی از مدرس اندیشہ نتیش پرسیدم   شاعری ربط بفرہنگ ندارد آنجا

غالباً لوگوں سے انکا کبھی کبھی مقابلہ بھی رہا کرتا تھا اور وہ لوگوں کے ساتھ آمنے سامنے بیٹھکر بھی غزلیں کہنے کے لئے تیار رہتے تھے:-

تا کہ ہادی جرأت اندیشہ ہا ظاہر شود   با حریفان ہر غزل را روبرو باید نوشت

وہ طرز مردم سے آشنا ہونا نہیں چاہتے تھے:-

ندارم در نظر با طرز مردم آشنا گردم   سخن ہادی بطرز گفت وگوی خویشتن دارم

نیز انھیں عام طور سے اپنے اشعار یاد نہیں رہتے تھے:-

ہادی از مصرع خود ہیچ ندارم خاطر   شاعر تازہ سخن ہر کہ شود بی پرواست

ان کی شاعری عام طور سے سحری ہوا کرتی تھی:-

چند نسیم سحری گل بفروشد   ای کاش بمردم پر بلبل بفروشد

اور وہ شعر میں اجنبی خیالات کی فکر کرتے اور اس کے قائل تھے:-

چگونہ از سر اندیشہ بگذرم ہادی   مرا معنی بیگانہ کار بسیار است

ہادی نظر معنی و لفظی نمی کنی   در عالم خیال تو اینہا ضرور نیست

نیز وہ خیال بافی اور دور از کار خیالات اور تخیل کے پیچھے پڑ کر لفظی و معنوی خوبیوں سے بے خبر ہو جایا کرتے تھے:-

دل ز بس ہادی بوحشیان معنی رام شد   از خیال تند ما پی در پی معنی نرفت

میخواستم خیال تازہ در ہر زبان باید   نباشد لاف گر گویم کہ احیای سخن کردم

انکے شعر اکثر دقیق و پیچیدہ اور دور از کار ہو جاتے ہیں جسکی وجہ سے ان کے کلام کی سستی میں اضافہ ہو جاتا ہے:-

آیۂ وَاَوْرَثْنٰہَا بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ پر ایک نظر

از جناب مولانا محمد شفیع حجۃ اللہ فرنگی محلی

سورۂ شعرار کی آیۂ فاخرجناھم من جنّٰت وعیون وکنوز و مقام کریم کذالکؕ واورثنٰھا بنی اسرائیل، میں جس وراثت بنی اسرائیل کا ذکر ہے، بہت سے اہل علم قائل ہیں کہ اس سے مراد سرزمین مصر کے "جنات" اور کنوز وغیرہ نہیں ہو سکتے، کیونکہ سرزمین مصر کی تاریخ میں سے جہاں سے بنی اسرائیل کا ارض فلسطین میں آکر آباد ہونا بیان کیا جاتا ہے، ـــــ بنی اسرائیل کی اس وراثت کا ذکر نہیں، بلکہ اس سے ارض فلسطین وشام کے "جنات" وغیرہ مراد ہیں، یعنی قرآن کے جملہ "اورثنٰھا" میں جو ضمیر مونث ہے، اس کا مرجع وہ "جنات" "باغات" وغیرہ نہیں، جن سے فرعونیوں کو قدرت الٰہیہ نے نکال دیا تھا، بلکہ مطلق "جنات" وغیرہ مراد ہے، جس کا مصداق کوئی بھی باغ وغیرہ ہو سکتا ہے، گویا مذکور تو مخصوص "جنات" وغیرہ ہیں، جن سے فرعونی نکال دیئے گئے تھے، لیکن ضمیر سے مراد یہ مخصوص اور مذکور نہیں بلکہ مطلق "جنات" وغیرہ ہیں، اس سے لازم آتا ہے کہ ضمیر مرجع سے اعم ہو جائے (الضمیر اعم من المرجع) حالانکہ قرآن میں "الضمیر اخص من المرجع" (ضمیر کا مرجع سے اخص ہونا) کی تو مثالیں ملتی ہے، مثلاً ....

(۱) ما فی بطنی محرراً .... فلما وضعتھا الخ میں وضعتھا کی ضمیر مونث "ما فی بطنی"

توان دانست از خیل ز ربیا رخواہان است — اگر ہادی کسی از بہر تنخواہ تو بر خیزد

مآخذ

۱	صلح تخلص بہ میرزا	: تذکرہ شعرای کشمیر، اقبال اکادمی، کراچی، آبان ۱۳۳۶ ہجری شمسی
۲	مظفر حسین صبا	: روز روشن، کتابخانہ رازی، طہران ۱۳۴۳ ہجری شمسی
۳	سید علی حسن	: صبح گلشن، مطبع فیض شاہجہاں، ۱۲۹۵ ہجری
۴	محمد عبد الغنی	: تذکرۃ الشعرا، مطبع انسٹی ٹیوٹ گزٹ، علی گڈھ ۱۹۱۶ء
۵	صدیق حسن خاں	: شمع انجمن، مطبع رئیس المطابع شاہجہانی،
۶	سید نور الحسن	: نگارستان سخن، مطبع شاہجہانی،
۷	لطف علی بیگ آذر	: آتشکدہ، چاپ بمبئی
۸	تقی اوحدی	: عرفات العاشقین، نسخہ خطی شمارہ ۹۲۹ خدابخش لائبریری
۹	سراج الدین علیخاں آرزو	: مجمع النفائس، نسخہ خطی شمارہ ۳۸۰ " " "
۱۰	ہادی	: دیوان ہادی، نسخہ خطی شمارہ ۲۲۰ لائبریری جامع مسجد بمبئی ٹرسٹ
۱۱	حسین قلی خاں	: نشتر عشق، نسخہ خطی شمارہ ۱۳۳۴ خدابخش لائبریری،
۱۲	احمد علی ہاشمی سندیلہ	: مخزن الغرائب، نسخہ خطی شمارہ ۲۳۹ " " "
۱۳	والہ داغستانی	: ریاض الشعرا، نسخہ خطی، " " "

غالباً پانچ ہزار یا سو سے لیکر تین ہزار تین سو سال قبل مسیح تک ظہور پذیر ہوا، زیریں مصر کا زیادہ تعلق ان ملکوں سے رہا جو بحر متوسط (بحر روم) کے آس پاس واقع ہیں ان میں عربی قومیں شامل ہیں، مگر بالائی مصر کا تعلق افریقی اقوام سے رہا ہے، شاہنشاہی نسل کا دور کتیبی نسل تک جاکر ختم ہوا اس دور کی پہلی نسل سے نویں نسل تک مصری آرٹ نے نیا روپ اختیار کیا، چوتھی نسل سے چھٹی نسل تک کا وہ زمانہ ہے، جب سب سے بڑا، اور اس کے بعد دوسرا اور تیسرا دھرم مقام "گرہ" میں تیار ہو سکے، اس وقت دار السلطنت مصر زیریں میں "ممفس" کے مقام پر (جو موجودہ قاہرہ کے قریب تھا) منتقل ہوا، نویں اور دسویں نسل میں "ممفس" سے مرکز حکومت ہٹ کر مصر وسطیٰ میں "دٹیبز" کے مقام پر پہنچا، فراعنہ کی بارہویں نسل میں بڑی بڑی یادگاریں قائم ہوئیں، پندرہویں سے سترہویں نسلوں تک "ہک سوس" کا دور ہے، ان "ہک سوس" نے ان ملکوں سے تعلقات قائم کئے جو بحر متوسط کے قرب و جوار میں تھیں، اٹھارہویں نسل سے لیکر بیسویں نسل تک کا دور اہم واقعات سے بھرا ہوا ہے، اس دور کو گویا مملکتِ جدید کہہ سکتے ہیں، اس دور میں تاریخیں زیادہ قرین قیاس ملتی ہیں، اسی دور میں "ہک سوس" نکال دیئے گئے، اور ان کے تمام آثار ملیا میٹ کر دیئے گئے، اور مصری حکومت شام اور نیوبیا بلکہ شاید دریائے فرات تک پہنچ گئی، بڑے بڑے شہ کار عجائب مصریوں کے اسی زمانہ سے متعلق ہیں،

جو نسلیں دریائے نیل کے ڈیلٹا میں تھیں وہ اکیس[۲۱] سے اکتیس[۳۱] تک شمار کیجاتی ہیں، جن میں ایک نسل "سائیس" دریائے نیل کی مغربی شاخوں میں آباد تھی، ستائیسویں نسل ایرانیوں کے حملہ سے جس کا سپہ سالار "کیابس" تھا، پانچسو پچیس قبل مسیح تباہ ہو چکی تھی، اب ایرانیوں کا قبضہ تھا اور مصر کی مقامی نسلیں ان کے ماتحت رہیں، اکتیسویں نسل کے آخر تک جب آخری فرعون تین سو چالیس قبل مسیح "اتھوپیا" بھاگ گیا تھا، مصری نسلوں کی شاہنشاہی

سے اخص ہے،

(۲) یوصیکم اللہ فی اولادکم ..... فان کن نساءً الخ میں "کن" کی ضمیر مؤنث "اولادکم" سے اخص ہے،

(۳) "و بعولتھن احق بردھن" میں بقول علامہ بیضاوی ضمیر جمع مؤنث مرجع یعنی "المطلقٰت" سے اخص ہے، لیکن "الضمیر اعم من المرجع" کوئی نظیر قرآن میں اب تک نظر سے نہیں گذری، ان حضرات کے ساتھ حسن ظن کا تقاضا ہے کہ یہ مان لیا جائے کہ شاید یہ حضرات مخصوص جنات و کنوز وغیرہ کو "مذکور" نہیں قرار دیتے، بلکہ "مذکور" ہی کو مطلق جنات وغیرہ قرار دیتے ہیں، کیونکہ "جنتھم" اور "کنوزھم" وغیرہ نہیں کہا گیا ہے، بلکہ جنات و کنوز کو مطلق بیان کیا گیا ہے، اس لئے "الضمیر اعم من المرجع" نہیں ہوتی، (و ھو کما تری) اصل عنوان پر گفتگو کے پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ مصر کی تاریخ قدیم کی صورت حال کیا ہے؟

اس کے دو حصے ہیں (۱) شاہنشاہی نسل کے ماقبل کا دور جسے غیر تاریخی دور کہتے ہیں (۲) جو شاہنشاہی نسل کا دور کہلاتا ہے، اس دوسرے دور میں جس سے ایک حد تک تاریخی دور کا آغاز مانا جاتا ہے، کئی نسلوں کی شاہنشاہی رہی، مگر اس دور کے واقعات کے متعلق یہ یقینی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ کتنے برس قبل مسیح کا فلاں واقعہ ہے، کیونکہ اس دور کے بارہ میں ہمارے پاس صرف کچھ اجزا رہیں جو "مانی تھو" ایک مصری پروہت واقعہ نگار نے تین سو تیرہ اور دو سو چھیالیس سال قبل مسیح کے درمیان اس زمانہ میں تیار کئے تھے، جب مصر میں سکندر رومی کے بعد ٹالمی اول و دوم بادشاہ ہوئے تھے، اس پروہت واقعہ نگار کے بیان کے مطابق فراعنہ کی پہلی نسل اس وقت سے شروع ہوتی ہے، جب مصر کے ہر دو حصے "بالائی" و "زیریں" یک جہت ہو چکے تھے، اس کی تاریخ اتنی دریافت ہو سکی ہے کہ یہ واقعہ

کشش ہوتی ہوگی، اس بنا پر اس کا قوی امکان ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب فلسطینی علاقہ میں مقیم ہوچکے ہونگے تو ان کے پوتے حضرت یعقوبؑ کی اولاد (بنی اسرائیل) کے زمانہ میں جب قحط پڑا ہوگا تو ان کی اولاد غلہ کے حصول کے لئے مصر میں "زون" کی طرف جانے پر مائل ہوئی ہوگی، جو دریائے نیل کے ڈیلٹا میں اسکی مشرقی شاخ کے آس پاس تھا،

مصری آثار میں کہیں بھی حضرت یوسفؑ اور حضرت موسیٰؑ اور غرقِ فرعون کے متعلق کچھ نہیں ملتا، صرف ایک تختی ملی ہے جس میں بنی اسرائیل کی طرف ایک اشارہ ہے، مگر یہ بھی فلسطین میں اسرائیلیوں کے متعلق ہے، یہ تختی تقریبًا بارہ سو بچیس قبل مسیح کی ہے، جس سے بنی اسرائیل کا کنعان میں عرصہ سے آباد ہونا معلوم ہوتا ہے،

مصری آثار میں اگرچہ حضرت یوسف اور موسیٰ علیہما السلام اور غرقِ فرعون کے متعلق کوئی اثر نہیں، مگر یہودی روایتوں اور خود قرآن مجید میں ان کا ذکر موجود ہے، اب صرف یہ دیکھنا ہے کہ ان روایتوں اور قرآن مجید میں حضرت یوسفؑ و موسیٰؑ اور غرق فرعون کا جو تذکرہ ہے اس کے واقعات اُس مصری دور کے کس زمانہ میں ہوئے، جس کا پتہ اندازاً چلا ہے،

آگے بڑھنے سے پہلے حسب ذیل امور پیشِ نظر رکھئے،

(الف) اسرائیلی واقعات کے متعلق یہودی روایتوں میں جو کچھ ہے، قرآنی بیان سے ان سب کی تصدیق نہیں ہوتی،

یہودی روایتوں کی صحت معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں اور قرآنی بیانات غیر محرف طریقہ سے آج تک موجود ہیں، اس لئے اختلاف کی صورت میں (جبکہ دونوں بیانات محض اعتقادِ مذہبی پر مبنی ہیں) قرآن ہی کا بیان قابلِ اعتبار ہونا چاہئے،

(ب) قرآن مجید کوئی تاریخ کی کتاب نہیں اس میں عبرت و موعظت کے لئے گذشتہ واقعات

ختم ہوگئی، یہاں سے اصلی تاریخی دور شروع ہوجاتا ہے،اور تین سو تیس قبل مسیح میں "مقدونیہ کا دو "سکندر اعظم" کے فتوحات سے اس کا آغاز ہوتا ہے "ٹالمی" نسل نے جس کے پہلے اور دوسرے شاہنشاہوں کے زمانہ میں پروہت نامہ نگار نے قدیم فراعنہ کے اجزا تیار کئے تھے، تین سو تیئیس قبل مسیح سے لیکر ۳۰ قم تک حکومت کی۔ اور رومیوں کا دور ۳۰ ق م سے لیکر تقریباً ۶۳۸ء تک رہا، اس کے بعد عرب اور ترکوں کے فتوحات سے مصر کے مسلم دور کا آغاز ہوا، جو اب تک ہے،،

"ہک سوس" کے متعلق یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ کس نسل سے تھے "جوزیفن" مورخ کا خیال ہے، کہ اسرائیل نسل سے تعلق رکھتے تھے، مگر اس نظریہ کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، بعض مورخین انکو "فنیشین" یا "عمالقہ" یا "اناکیں" کہتے ہیں، اگر ان نسلوں میں سے کسی نسل کا تعلق تھا، تو وہ سامی نسل کے ہوئے نہ کہ قبطی اور مصری "ہک سوس" نے شہر زوئن، کی جسے "ٹانس" بھی کہتے ہیں بنیاد ڈالی، یہ شہر دریائے نیل کے دہانہ پر مشرقی شاخ کے آس پاس تھا، اور "حبران" میں ایک شہر "ہانس" تھا جس سے "ہک سوس" کے تعلقات تھے، یہ شہر فلسطین کے جنوب میں واقع ہے، قیاس ہے کہ جب "ہک سوس" طاقتور ہوگئے، تو غالباً مصر کا پرانا دار السلطنت "ممفس" ہی ان کا دار السلطنت رہا ہوگا "ہک سوس" کا آخری دور تقریباً ایک ہزار چھ سو قبل مسیح کہا جاتا ہے ابتدائی دور کے متعلق "رنین کا خیال ہے کہ دو ہزار قبل مسیح سے شروع ہوا،

"ہک سوس" کے "حبران" سے گہرے تعلقات تھے، (جیساکہ اوپر گذرا) اور چونکہ فلسطین کا جنوبی حصہ جہاں "حبران" آباد تھا، کچھ زرخیز علاقہ تھا، جہاں اکثر قحط پڑا کرتے تھے، اس کے مقابل میں دریائے نیل کے علاقہ میں نیل اور اس کی شاخوں سے آب پاشی ہوتی تھی اسلئے یہاں اتفاقاً اسی وقت قحط ہوسکتا تھا، جب دریائے نیل میں طغیانی نہ ہو، اس لئے جب فلسطین میں قحط پڑتا ہوگا، تو وہاں کے باشندوں کے لئے مصری علاقے میں جانے کے لئے بڑی

"جا سکتا ہے، اس سے قبل بنی اسرائیل کے جزئی اقتدار کا تصور ممکن ہے، جبکہ آخری ہِک سوسی فرعون غرق ہو گیا جو لاولد تھا، اس کی لاولدی کا اشارہ سورہ قصص میں "امرأة فرعون" کے قول "قرة عين لي ولك لا تقتلوه عسى ان ينفعنا او نتخذه ولدا" الخ سے نکلتا ہے، فرعون کی زوجہ نے فرعون سے کہا کہ اسے قتل نہ کرو یہ میری اور تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، عجب نہیں کہ ہم کو فائدہ پہنچا دے، یا ہم اس کو بیٹا ہی بنا لیں) اس لئے اگر مذکورہ بنیاد ہِک سوسی فراعنہ کے زمانہ میں مانے جائیں تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی، اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت یعقوبؑ (اسرائیل) کے زمانہ میں فلسطین کے قحط اور راشن کے لئے برادران یوسفؑ کے مصر جانے کا واقعہ ہِک سوسی فراعنہ کے زمانہ کا ہی اور حضرت یوسفؑ ہِک سوسی فرعون کے گورنر کے (جو دریائے نیل کے زیریں والے حصۂ مصر کا غالباً گورنر ہوگا جہاں شہر "زون" کسی ہِک سوسی فرعون نے بسایا تھا) وزیر خزانہ ہوئے ہوں گے نہ کہ خود مملکۂ فرعون کے وزیر خزانہ قرآن مجید نے "فرعون" کے بجائے "ملک" کا لفظ جو اختیار کیا ہے "وقال الملك اني ارى سبع بقرات" الخ (سورت یوسف) وہ بھی اسی طرف اشارہ کرتا ہے[1]،

حضرت یوسفؑ[2] کے پورے خاندان کے مصر میں آباد ہو جانے کی وجہ سے اسرائیلی آبادی میں

---

[1] خلافت عباسیہ کے زمانہ میں صوبوں کے گورنر بھی "ملک" یا "سلطان" کہے جاتے تھے، [2] سورہ مومن میں مومن آل فرعون کی تقریر اس طرح نقل ہوئی ہے "وقال رجل من آل فرعون يكتم ايمانه اتقتلون رجلا ان يقول ربي الله وقد جاءكم بالبينات" الخ (ایک مومن شخص نے جو آل فرعون میں تھا اور اپنا ایمان پوشیدہ کئے ہوئے تھا کہا کہ کیا تم ایسے شخص کو محض اسلئے قتل کرنا چاہتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے، درانحالیکہ وہ تمھارے پاس نشانیوں کے ساتھ آیا ہے) پھر آگے چل کر اسی تقریر کا ایک حصہ اس طرح مذکور ہے "ولقد جاءكم يوسف من قبل بالبينات فما زلتم في شك مما جاءكم به" الخ (یعنی اور اس کے قبل تم لوگوں کے پاس یوسف نشانیاں (بقیہ حاشیہ صفحہ پر

کا ذکر ہے، اسی لئے صرف جستہ جستہ اور اسی حد تک ان واقعات کا بیان ہے، جس حد تک اس مقصد کے لئے مفید ہیں، وہ بھی مختلف انداز سے، اس لئے تاریخی تسلسل کا قرآن میں تلاش کرنا بے محل اپنے درج، قرآن میں جن امور کا ذکر نہیں ان کی صحت و عدم صحت کا کوئی فیصلہ نہیں کیا جاسکتا، اور ایک حد تک ان کے بارے میں یہودی روایات پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے، بشرطیکہ وہ عام عادات انسانی مسلمہ تاریخی حقایق عقل وقیاس اور مسلمات دینیہ کے خلاف نہ ہوں اور کسی قرآنی بیان کی عدم صحت اس بنیاد پر نہیں کیجا سکتی کہ وہ یہودی اور اسرائیلی روایات کے خلاف ہے،

سب سے پہلے ہمکو یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ حضرت ابراہیم و اسحٰق و یعقوب و یوسف و موسیٰ علیہم السلام اور غرقِ فرعون سے متعلق واقعات مصر کے مستند تاریخی دور کے قبل کے ہیں، اس لئے اس سلسلہ میں کسی تاریخی مواد سے مدد نہیں مل سکتی، صرف مذہبی روایات اور مشہور قصوں اور افسانوں سے جو کچھ معلوم ہو اسی پر اکتفا کیا جانا چاہیے، اور اختلافات کی صورت میں حتی الامکان فکر و نظر اور عقل سلیم سے کام لے کر رائے قائم کرنا چاہیے، مگر اس کی یقینی صحت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا،

حضرت ابراہیم علیہ السلام عیسوی تاریخ کے لحاظ سے کس سنہ میں تھے، اس کے بارے میں تخمینی رائے یہ ہے کہ تقریباً دو ہزار قبل مسیح کا زمانہ تھا، اس حساب سے آپ کے پر پوتے، حضرت یوسفؑ کا زمانہ زیادہ سے زیادہ ڈھائی سو برس کے فاصلہ سے سترہ سو پچاس قبل مسیح ہوتا ہے، اور حضرت موسیٰؑ کا زمانہ زیادہ سے زیادہ اس سے تین سو برس کے فاصلہ سے چودہ سو پچاس قبل مسیح ہوتا ہے[1]، اور تقریباً سولھویں صدی قبل مسیح تک ہکسوسی فراعنہ کا زمانہ کہا جاتا ہے اور قبطی النسل فرعون تھامیز اول کا زمانہ ۱۵۴۵ء ق م تھا، جس کے زمانہ میں بنی اسرائیل کا مصر سے مکمل اخراج

---

[1] زیادہ سے زیادہ سے مقصد یہ ہے کہ اس سے کم زمانہ بھی ہو سکتا ہے، اس طرح حضرت موسیٰؑ کا زمانہ سولھویں صدی قبل مسیح مانا جا سکتا ہے، جسے ہکسوسی فراعنہ کا آخری زمانہ کہا جاتا ہے،

غلامانہ برتاؤ سے تھا، (غالباً بیگار کا معاملہ ہوا ہوگا) غرض اسرائیلیوں اور فرعونیوں میں یہ کشمکش جاری تھی، اور فرعونیوں کے مظالم عروج پر تھے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کو رسول بنا کر فرعون کی جانب بھیجا، سورۂ طٰہٰ میں اس کا ذکر اس طرح ہے،

فاذهبا الى فرعون انه طغى (الى ان قال) فأتياه فقولا انا رسولا ربك فارسل معنا بني اسرائيل ولا تعذبهم	موسیٰ و ہارون تم دونوں فرعون کے یہاں جاؤ، کیونکہ وہ بہت سرکشی پر اتر آیا ہے اس کے پاس تم دونوں جاؤ اور اس سے کہو کہ ہم دونوں تیرے رب کی طرف سے یہ پیغام لیکر آئے ہیں، کہ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ رخصت کر، اور یہ کہ انھیں مشقتوں اور تکلیفوں میں مبتلا نہ کر،
(سورۂ طٰہٰ)	

ان دونوں نے فرعون کے پاس جاکر خدا پرستی کی دعوت دی اور بنی اسرائیل کو آزاد کرکے ساتھ کر دے، فرعون نے دونوں مطالبوں کو ٹال دیا، اور خدا پرستی کی دعوت کو سیاسی تحریک پر محمول کیا کہ موسیٰؑ و ہارونؑ اس کے ذریعہ خود اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہیں،

قالوا اجئتنا لتلفتنا عما وجدنا عليه آباءنا وتكون لكما الكبرياء في الارض وما نحن لكما بمؤمنين ه	فرعونیوں نے کہا، کیا تم اس لئے ہمارے پاس آئے ہو کہ جس راہ پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو چلتے دیکھا ہے، اس سے ہمیں ہٹا دو، اور ملک میں تم دونوں بھائیوں کے لئے سرداری ہو جائے، ہم تو تمھیں ماننے والے نہیں،
(یونس)	

اضافہ ہو گیا ہوگا، وزیر خزانہ حضرت یوسفؑ کے کنبے کے افراد (اسرائیلی) رفتہ رفتہ مصر میں ایک طاقت بن گئے ہونگے، اسرائیلیوں اور ہکسوسیوں کے مابین آگے چل کر حقارت و نفرت کے جذبات پیدا ہو جانا بھی عجیب بات نہیں، (یہودی روایتوں میں تو حضرت یوسفؑ کے زمانہ ہی میں برادران یوسفؑ کو مصریوں کا بنظر حقارت دیکھنا بصراحت مذکور ہے) ہکسوسی حکومت اسرائیلیوں کی بربادی کی فکر میں مبتلا ہو گئی ہوگی، یہانتک کہ ہکسوسی کے آخری فرمانروائی کا زمانہ آگیا جو اتفاق سے لاولد بھی تھا جیسا کہ اوپر بیان ہوا) اسے سخت اندیشہ ہو گیا ہوگا کہ کہیں میرے بعد یہ اسرائیلی پورے مصر پر اپنا اقتدار نہ قائم کر لیں، اس لئے اس نے اسرائیلیوں کے اولاد ذکور کو قتل اور طرح طرح کی تکلیفوں میں مبتلا کرنا شروع کیا ہو، یہ صورت حال اس حد تک پہنچ گئی ہو کہ اسرائیل سے حکومت وقت غلاموں جیسا سلوک کرنے لگی ہو، اسی لئے جب فرعون نے حضرت موسیٰؑ پر ان کی پرورش کا احسان جتایا تو حضرت موسیٰؑ نے اس کے جواب میں فرمایا تھا:

وتلک نعمۃ تمنھا علی ان عبدت بنی اسرائیل　　تو جو پرورش کا احسان مجھ پر ظاہر کرتا ہے تو کیا تیرے لئے بنی اسرائیل کو غلام بنا لینے کے عوض ہو گیا

(سورۂ شعراء ع ۲)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرعونی اور اسرائیلی میں جو جھگڑا ہوا تھا، اور حضرت موسیٰؑ کے ہاتھوں فرعونی قتل ہو گیا تھا، اور خوف سے ان کو مصر چھوڑ دینا پڑا تھا، اس واقعہ کا تعلق بھی اسی

(بقیہ حاشیہ ص) لیکر آچکے تھے لیکن تم لوگ ان چیزوں میں بھی شک ہی میں رہے، جو وہ تمہارے پاس لیکر آتے تھے، اس تقریر سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس تقریر کے مخاطب "آل فرعون" تھے نہ کہ بنی اسرائیل (بقرینہ در اقتباس در حاشیہ) یا یہ اس امر کا بڑا قرینہ ہے، کہ آل فرعون ہکسوسی تھے، کیونکہ حضرت یوسفؑ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہکسوسی فراعنۂ مصر کے زمانہ میں مصر آئے تھے، نہ کہ قبطی النسل فراعنہ کے زمانہ میں، اسلئے کہ حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کا معاصر جو فرعون تھا بلکہ ہکسوسی فرعون تھا وہی غرق ہوا،

ادع لنا ربک بما عھد عندک	تو کہنے لگے، اے موسیٰ تیرے پروردگار نے
لئن کشفت عنا الرجز لنؤمنن لک	تم سے جو عہد کیا ہے اس کی بنا پر ہمارے
ولنرسلن معک بنی اسرائیل فلما	لئے دعا کرو اگر تیری دعا سے عذاب ٹل گیا
کشفنا عنھم الرجز الی اجل ھم	تو ضرور ہم تمھارے کہنے کے مطابق ایمان
بالغوہ اذا ھم ینکثون،	لے آئیں گے اور ہم بنی اسرائیل کو چھوڑ
	دیں گے کہ تمھارے ساتھ چلے جائیں،
	پھر جب ایسا ہوا کہ ہم نے ایک خاص
	وقت تک کے لئے کہ انھیں اس تک پہنچنا
	تھا عذاب ٹال دیا تو اچانک وہ اپنی
(اعراف)	بات سے پھر گئے،

بہرحال فرعونیوں نے فرعون سے کہا کہ موسیٰ اور اسکی قوم کو ملک میں فساد مچانے کے لئے چھوڑ کیوں رہا ہے، تو فرعون نے جواب دیا،

سنقتل ابناءھم ونستحیی نساءھم	ہم ان کے لڑکوں کو قتل کریں گے اور
وانا فوقھم قاھرون	عورتوں کو زندہ رہنے دیں گے (کہ ہماری
	باندیاں بنکر رہیں) اور ہمیں ڈر کس کا
	ہے وہ تو ہماری طاقت سے دبے ہوئے ہیں)
(سورۂ اعراف)	ہم ان پر غالب ہیں،

اس فیصلہ پر عمل کرنے کے لئے فرعون نے ارض مصر سے اسرائیلیوں کو ناپید کرنے کی ٹھان لی، مگر فرعون اپنے اس منصوبہ میں کامیاب نہ ہو سکا، اور وہ خود اپنے ساتھیوں

سورۂ اعراف میں فرعون کے درباریوں سے یہ مکالمہ بیان کیا گیا ہے،

اتذر موسیٰ وقومہ لیفسدوا	کیا تو موسیٰ اور اسکی قوم کو چھوڑ دیگا
فی الارض ویذرک والھتک	کہ ملک میں فساد پھیلائیں اور تجھے اور
(اعراف)	تیرے معبودوں کو چھوڑ دیں،

سورہ طٰہٰ میں فرعونیوں کے آپس کی گفتگو کا ایک حصہ اس طرح نقل ہوا ہے،

قالوا ان ھذان لسٰحران یریدان	یہ دونوں بھائی ضرور جادوگر ہیں، اور
ان یخرجاکم من ارضکم بسحرھما	چاہتے ہیں کہ اپنے جادو کے زور سے تمھیں
ویذھبا بطریقتکم المثلیٰ،	تمھارے ملک سے نکال باہر کریں اور
(طٰہٰ)	تمھارے عمدہ (مذہبی) طریقہ کا دفعۃً خاتمہ کر دیں

خود فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے کہا

قال اجئتنا لتخرجنا من ارضنا	فرعون نے کہا تو ہمارے پاس اس لئے
بسحرک یا موسیٰ	آیا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے ہمیں
	ہمارے ملک سے نکال دے،

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انکار کی صورت میں مختلف عذابوں کے آنے کی دھمکی دی جو پوری ہوئی، جب عذاب آجاتا، حضرت موسیٰؑ سے فرعونی کہتے کہ اپنے خدا سے دعا کرو کہ عذاب ٹل جائے، تو پھر ہم تمھارے مطالبوں کو (خدا پرستی اور بنی اسرائیل کے لئے پروانۂ آزادی) پورا کر دیں گے، مگر جب عذاب ٹل جاتا تو وعدہ پورا نہ کرتے، یہودی روایتوں میں اس کا تذکرہ ہے، قرآن بھی اس کی تائید کرتا ہے، سورہ اعراف میں ہے،

ولما وقع علیھم الرجز قالوا	اور جب ان پر عذاب کی سختی واقع ہوئی

ہو، جن کے غرق سے بچنے کا ذکر سورۂ شعراء میں مذکور ہے،

فانجینا موسیٰ ومن معہ اجمعین	پس ہم نے موسیٰ اور ان کے ساتھ والوں کو
ثم اغرقنا الآخرین،	نجات دی، اور دوسروں کو (فرعونیوں کو)
	جو ان تک پہونچنے کے لئے پیچھے پیچھے آرہے تھے،
	غرق کر دیا،

اور حضرت موسیٰؑ اپنے ساتھ کے لوگوں کو لیکر "ارض کنعان" جاتے ہوئے "ارض سینا" پہونچے ہوں اور راستہ میں وہ قوم ملی ہو جو "عاکفین علیٰ اصنام لہم" تھی، (جس کا ذکر آگے آئیگا، اور بقیہ بنی اسرائیل نے جو "مومن لموسیٰ" نہ تھے، (کیونکہ تمام بنی اسرائیل حضرت موسیٰؑ کو نجات دہندہ نہیں مانتے تھے جس کا بیان آگے آتا ہے، حکومت مصر کو بادشاہ (فرعون) اور اس کے حواریوں سے (جو غرق ہو چکے تھے) خالی پاکر حکومت پر ارادۂ الٰہیہ کے مطابق قبضہ کر لیا ہو اور جس بات کا فرعونیوں کو اندیشہ تھا وہ پورا ہو کر رہا (یعنی بنی اسرائیل کا اقتدار پر قبضہ) وعدۂ الٰہیہ کا تذکرہ سورۂ قصص میں ہے، (جس کا ذکر آگے آئیگا) اس وعدۂ الٰہیہ کے سلسلہ میں اللہ جل شانہ کا یہ ارشاد ہے،

ونری فرعون وھامان وجنودھما	ہم چاہتے ہیں کہ فرعون اور ہامان اور ان کے

(بقیہ حاشیہ ص ۳) ہے اور (ان کے مقابلہ میں) ہمارا ایک بڑا جتھا ہی جو بہت ہشیار اور بیباک ہے،

اور یوں بھی یہ بات بعید از قیاس ہے کہ تمام بنی اسرائیل جنکی تعداد یہودی روایتوں کی بنا پر کم از کم ساٹھ ستر ہزار تھی ایک قلیل عرصہ میں پار ہو گئے ہوں، اور فرعونیوں کو ان کی کوئی تعداد نہ ملی ہو جس پر وہ قابض ہو سکے ہوں کم از کم اس لئے لکھا گیا کہ روایتوں میں اس سے بہت زائد تعداد بھی بتائی گئی ہے، جلالین میں ہے "قد کانوا ستمائۃ الف وسبعین الفا الخ" (بیان کیا گیا ہے کہ یہ بنی اسرائیل چھ سو ہزار اور ستر ہزار تھے الخ)

سمیت غرق کر دیا گیا جس کے بعد بنی اسرائیل کو حکم ملا کہ تم اسی سرزمین میں اطمینان سے پڑے رہو، سورۂ بنی اسرائیل میں ہے (آگے اس آیۃ کے متعلق کچھ اور بھی بیان کیا جائیگا)

فاراد ان یستفزھم من الارض	پھر اس نے (فرعون نے) چاہا کہ بنی اسرائیل
فاغرقناہ ومن معہ جمیعا وقلنا	پر زمین میں رہنا دشوار کر دے، پس
لبنی اسرائیل اسکنوا الارض	ہم نے اسی کو اور جو اس کے ساتھ تھے غرق
	کر دیا، اور اس کے بعد بنی اسرائیل سے کہا
(بنی اسرائیل)	کہ اب تم اسی سرزمین پر رہو سہو،

"غرقِ فرعون ومن معہ" کے بعد یہودی روایتوں میں تو ملتا ہے کہ کل بنی اسرائیل نے ارضِ مصر کو خیرباد کہدیا، مگر سورۂ بنی اسرائیل کی مذکورہ آیۃ کے ظاہر سے ان کی غلطی معلوم ہوتی ہے کہ نہیں غرق کے واقعہ کے بعد بنی اسرائیل بالکلیہ مصر سے نہیں چلے گئے، ان کو تو غرق کے بعد "اسکنوا فی الارض" کا حکم ملا تھا، (تم اسی سرزمین پر رہو سہو) ہوسکتا ہے کہ موسیٰ ومن معہ نے مصر کو چھوڑ دیا

لہ اور یہی موسیٰ ومن معہ (موسیٰ اور ان کے ہمراہی) وہ تھے نہ کہ کل بنی اسرائیل کہ جنھیں فرعون نے "لشرذمۃ قلیلون" اور اپنے لوگوں کو "لجمیع حذرون" کہا تھا جیسا کہ سورۂ شعراء میں ہے،

واوحینا الی موسیٰ ان اسر بعبادی	اور ہم نے موسیٰ کو حکم بھیجا میرے بندوں کو شباشب
انکم متبعون فارسل فرعون فی المدائن	ہٹا لیجاؤ کیونکہ (فرعونیوں کی طرف سے) تمھارا
حاشرین ان ھؤلاء لشرذمۃ قلیلون	تعاقب کیا جائیگا، فرعون نے (تعاقب کی
وانھم لنا لغائظون وانا لجمیع حذرون	تدبیر کیلئے) آس پاس کے شہروں میں آدمی دوڑا دیئے
	اور (یہ کہلا بھیجا) کہ وہ لوگ (بنی اسرائیل)
	ایک تھوڑی جماعت ہے انھوں نے ہمکو بہت غصہ دلایا

(بقیہ صفحہ ۳۰۷)

اور حضرت موسیٰؑ کے اس وعظ پر قوم موسیٰ نے جو جواب دیا، وہ اور اس پر حضرت موسیٰؑ کا ارشاد یوں مذکور ہے:

قالوا أوذينا من قبل أن تأتينا ومن بعد ما جئتنا قال عسى ربكم أن يهلك عدوكم ويستخلفكم في الأرض

انھوں نے (قوم موسیٰ نے) کہا تمھارے آنے سے پہلے بھی ہم ستائے گئے، اور اب تمھارے آنے کے بعد بھی ستائے جاتے ہیں، موسیٰؑ نے جواب دیا کہ قریب ہے کہ تمھارا پروردگار تمھارے دشمن کو ہلاک کر دے، اور تمھیں زمین میں ان کا جانشین بنائے،

یہ بات کہ بنی اسرائیل حضرت موسیٰ کے نجات دہندہ ہونے پر یقین نہیں رکھتے تھے، سورۂ اعراف کی مذکورہ آیت سے جس میں حضرت موسیٰؑ کی صبر اور استعانۃ باللہ کی تلقین کا اور قوم موسیٰ کے جواب کا ذکر ہے۔ اور سورۂ یونس کی آیۃ

فَمَا آمَنَ لِمُوسَىٰ إِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّن قَوْمِهِ

پس موسیٰ پر اُن کی قوم میں سے صرف تھوڑے سے قلیل آدمی ایمان لائے۔

سے جب کہ "من قومہ" کی ضمیر "موسیٰ" کی جانب راجع مانی جائے (جیسا کہ کئی مفسرین کی رائے ہے) اور سورۂ قصص کی آیۃ

إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِن قَوْمِ مُوسَىٰ فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ

بے شک قارون موسیٰ کی قوم میں سے تھا، جس نے اُن کے مقابلہ میں سرکشی کی،

منهم ما كانوا يحذرون

لشکروں کو وہ دکھا دیں کہ جس کا انکی طرف سے (بنی اسرائیل کی طرف سے) انکو خطرہ تھا اور وہ اس سے بچنا چاہتے تھے؛

اور اقتدار پر قبضہ حاصل ہوجانے کا ذکر سورۂ اعراف میں اس طرح ہے؛

واورثنا القوم الذين كانوا يستضعفون مشارق الارض ومغاربها التي باركنا فيها وتمت كلمت ربك الحسنى على بني اسرائيل بما صبروا ودمرنا ما كان يصنع فرعون وقومه وما كانوا يعرشون

اور جب قوم کو کمزور اور حقیر سمجھا جاتا تھا اسی کو زمین کے مشرقی اور مغربی حصوں کا انکو مالک بنا دیا جو ہماری بخشی ہوئی برکات سے مالا مال ہیں اور اس طرح (اے پیغمبر) تیرے پروردگار کا پسندیدہ فرمان بنی اسرائیل کے حق میں پورا ہوا کہ (ہمت و ثبات کے ساتھ) جمے رہے تھے اور فرعون اور اس کا گروہ (اپنی شان و شوکت) کے لئے جو کچھ بناتا رہا تھا اور جو کچھ (عماروں کی) بلندیاں اٹھائی تھیں وہ

اور حضرت موسیٰ کا ارشاد اپنی قوم سے اسی سورۂ اعراف میں یوں مذکور ہے؛

استعينوا بالله واصبروا ان الارض لله يورثها من يشاء من عباده والعاقبة للمتقين؛

خدا سے مدد مانگو اور (اس راہ میں) جمے رہو، بلاشبہ زمین (کی بادشاہت صرف) خدا ہی کے لئے ہے، وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے، اس کا وارث بنا دیتا ہے، اور انجام کار انہی کیلئے ہے کہ جو متقی ہوں گے (۲۰۷)

اس آیت میں ارضِ مصر سے اخراج کا مفہوم کیسے قرار دیا جا سکتا ہے، جیسا کہ بعض لوگوں کو وہم ہوا ہے، سورۂ بنی اسرائیل کی آیۃ جس میں فرعون کے ارادۂ استفزاز کا بیان اور بنی اسرائیل کو "اسکنوا فی الارض" والے حکم کا بیان ہے، اوپر تحریر ہو چکی ہے، اور اگر بالفرض "استفزازہم من الارض" سے "اخراج از ارض" مراد لیا جائے، تب بھی "اسکنوا فی الارض" میں جس کے بارے میں اسکنوا کا حکم ہے، اسے اسی زمین کے متعلق ماننا چاہئے کہ جس زمین سے "اخراج" کا تعلق ہو اور ظاہر ہے کہ "اخراج" سرزمین مصر سے مقصود تھا، تو "اسکنوا" والے کا تعلق اسی سرزمین مصر سے ماننا ہوگا،

(باقی)

خصوصی رعایت

تفسیر ماجدی اردو جس کا دوسرا اڈیشن بکثرت اضافوں کے ساتھ خود صاحب تفسیر مولینا عبد الماجد دریابادی کے اہتمام میں ہندوستان میں چھپ رہا ہے، اس کی دو جلدیں ابھی تک شائع ہوئی ہیں، اور بقیہ زیر طبع ہیں، انہی دونوں جلدوں کی قیمتوں پر خصوصی رعایت کردی گئی ہے یعنی ان دونوں جلدوں کے الگ الگ پانچ پانچ نسخے یا اس سے زیادہ جو صاحب خریدیں گے، ان کے ہدیہ میں ۵۰ فی صدی کی رعایت ہے، البتہ جلد کا دو روپیہ قیمت فی نسخہ لازمی ہے، محصول بھی بذمہ خریدار ہوگا، ہر جلد کا ہدیہ بغیر مجلد کے ۵ روپے ہے،

پتہ :۔ صدق جدید بک ایجنسی کچہری روڈ ۔ لکھنؤ۔

"منیجر"

سے ظاہر ہوتا ہے،

سورۂ شعراء کی مذکورہ آیہ فَاَنْجَیْنَا مُوْسٰی وَمَنْ مَّعَهٗٓ اَجْمَعِیْنَ سے اس امر کی جانب اشارہ پایا جاسکتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے صرف اپنے ہمراہیوں کے ساتھ غرق سے نجات پائی تھی نہ کہ کل بنی اسرائیل نے، جس طرح سورۂ بنی اسرائیل والی آیت "فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِیْعًا" پس ہم نے اس کو اور اسکے تمام ہمراہیوں کو غرق کردیا سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف فرعون اپنے تمام ہمراہیوں کے ساتھ غرق ہوا نہ کہ سب فرعونی۔

اب نجات کے بعد یہ لازم نہیں آتا کہ "موسیٰ ومن معہ" (موسیٰ اور اُن کے ہمراہیوں نے) ارض مصر کو خیرباد کہدیا ہو، ہوسکتا ہے کہ وہ بھی ارض مصر ہی میں رہے ہوں اور بعد کو انھوں نے مصر کو چھوڑا ہو یا وہ ارض مصر سے چلے گئے ہوں، اور بقیہ بنی اسرائیل مصر میں رہے ہوں، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا) جب کہ حکم خداوندی سورۂ بنی اسرائیل میں "اسکنوا الارض" (زمین میں رہو سہو) غرق فرعون کے ذکر کے بعد متصلاً مذکور ہے، ظاہر ہی ہے کہ جس "الارض" (زمین) میں سکونت کا حکم ہوا وہ وہی الارض ہوگی جس سے اوپر متصلاً "استفزاز" من الارض" کا ذکر ہے اور جس "الارض" سے "استفزاز" کا ارادہ فرعون نے کیا تھا وہ ارض مصر ہی تھی، نہ کہ ارض شام و فلسطین" یعنی بنی اسرائیل کی نسل کو ارض مصر میں تباہ کردے، اور اور اُن کا ارض مصر میں رہنا دشوار کردے، نہ یہ کہ ارض مصر سے اُن کو نکال دے، ارض مصر سے نکال دینے اور حضرت موسیٰؑ کے ساتھ چلے جانے کو تو وہ حیلوں حوالوں سے ٹالتا ہی رہتا تھا، (جیسا کہ اوپر بیان ہوچکا ہے) پھر یہاں

دل کہ بے عشق شود از رحمتِ حق دور شود   مردہ را موج زدریا بکنار اندازد

جس دل میں عشق نہیں ہوتا وہ رحمت حق سے دور رہتا ہے، جس طرح اس مردہ کو جس میں جان نہیں ہوتی دریا کی موجیں کنارے پھینک دیتی ہیں،

ہر کجا میروی اے شوخ ہماں در نظری   چہ شبیہ است خرام تو برفتار نگاہ

اے شوخ تو جہاں بھی جاتا ہے میری نگاہ میں برابر رہتا ہے تیرے خرام کو میری رفتار نگاہ سے کتنی مشابہت ہے مطلب یہ ہے کہ تو جہاں بھی جاتا ہے یا جہاں بھی ہوتا ہے مری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوتا،

محمد امین بیگ واصل   در حقیقت عینکے بہتر ز پشت چشم نیست   دیدہ چوں بستی دو عالم را تماشا می کنی

آنکھ کے پوٹوں سے بہتر کوئی عینک نہیں کہ جہاں آنکھ بند کی دونوں عالم نظر آنے لگے،

مرزا مبارک اللہ واضح   نامہ را تا وا کنم جاں رفت است ز اشتیاق   حرفے اے قاصد اگر بشنیدہ باشی نقل کن

قاصد سے کہتا ہے کہ جب تک محبوب کا خط کھولوں جان شدتِ اشتیاق میں نکل جائیگی، اس لئے اگر تو نے زبانی کچھ باتیں سنی ہیں تو جلدی سے بیان کر دے،

مرزا نقی واحد   مست نازی و سرِ خانہ خرابے داری   از درِ خانہ ما می گذری خوش باشی

تو مست ناز ہوکر ایک خانہ خراب کے یہاں آنے کا ارادہ رکھتا ہے، خدا تجھکو خوش رکھے کہ میرے گھر (خانہ خراب) کے دروازہ سے گذر رہا ہے،

علی قلی خاں والہ   با سایہ ترا نمی پسندم   عشق ست و ہزار بدگمانی

عشق میں بڑی بدگمانیاں ہوتی ہیں، اسلئے میں سایہ کا بھی تیرے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتا

ملا ہزلی   ہر کس کہ پا نہاد بکوے تو سر گذاشت   و ہر کس کہ سر نہاد بپائے تو بر نداشت

جس نے تیرے کوچہ میں قدم رکھا اسے سر کو خیرباد کہنا پڑا اور جس نے تیرے پاؤں پر سر رکھا پھر نہ اٹھا سکا

مولانا اہلی   یار من ہرگز نیازارد دل اغیار را   گل ہمراہ آتش است اما نسوزد خار را

خریطۂ جواہر

از شاہ معین الدین احمد ندوی

(۸)

مرزا احسن بیگ واہ: دوش در میخانہ یک جام شرابم زندہ کرد ماہی بودم بخاک افتادہ آبم زندہ کرد

کل میخانہ میں مجھ کو ایک جام شراب نے زندہ کر دیا، میں زمین پر پڑی ہوئی مچھلی تھا، پانی نے زندہ کر دیا یعنی جس طرح خشکی میں پڑی ہوئی مچھلی پانی پاکر زندہ ہو جاتی ہے، اسی طرح جام شراب نے مجھے زندہ کر دیا،

آتش افسردہ از کاروان واماندہ ام ہمرہاں رفتند و خاکستر نشینم کردہ اند

جہاں قافلہ خیمہ زن ہوتا ہے وہاں مختلف ضرورتوں کے لئے آگ جلائی جاتی ہی، جن کے نشانات قافلہ کوچ کرنے کے بعد باقی رہتے ہیں، عربی شعراء نے اس پر بڑی طبع آزمائی کی ہی، فارسی کا شاعر کہتا ہے کہ میں اس دنیا میں قافلہ کی بجھی ہوئی آگ ہوں جو قافلہ سے بچھڑ گئی ہی، میرے ساتھی تو چلے گئے اور مجھکو خاکستر نشین بنا گئے یعنی وہ رخصت ہو گئے، اور میں تنہا باقی رہ گیا،

میرزا محمد شفیع واعظ: این قدر فیضے کہ من از بیزبانی بردہ ام ترسم آخر شکر خاموشی کند گویا مرا

مجھ کو بے زبانی سے اتنا فیض پہنچا ہے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ اس فیض کا شکریہ ادا کرنا مجھے گویا نہ بنا دے،

بہ زمیں برد فرو خجلت محتاجانم بے زری کرد بمن آنچہ بقارون زر کرد

مجھ کو محتاجی کی شرمندگی نے زمین میں گاڑ دیا، قارون کے ساتھ دولت نے جو سلوک کیا تھا (دولت کے غرور نے اسکو زمین میں دھنسا دیا تھا) وہی سلوک میرے ساتھ بے زری اور محتاجی نے کیا،

میں بیخود وبے خبر ہو جاؤنگا،

ہلاکی ہمدانی: نگہ بجانب من ہرگز از حیا نہ کنی — حیا کن ز من و شرم از خدا نہ کنی

تو شرم سے میری طرف نگاہ نہیں اٹھاتا، تو مجھ سے تو شرم کرتا ہے، لیکن خدا سے شرم نہیں آتی، کہ تیری اس شرم سے مجھ پر کیا قیامت گذر جاتی ہے،

ہوشی شیرازی: جز کوی تو دل را نبود منزل دیگر — گیرم کہ بود یار دگر کو دل دیگر

تیری گلی کے علاوہ دل کا دوسرا ٹھکانا نہیں ہے، اگر مان بھی لیں کہ دوسرا محبوب مل سکتا ہے، مگر اس سے لگانے کے لئے دل دوسرا کہاں سے آئے، میرا دل دوسرے کی طرف مائل نہیں ہو سکتا،

قاضی یحیٰ: جان باختن بعشق تو آسان بود کہ من — صد بار مردہ ام کہ برائے تو مردہ ام

تیرے عشق میں جان دینا آسان نہیں ہے، میں نے سیکڑوں مرتبہ تیرے لئے جان دی ہے یعنی ایک مرتبہ جان دینا آسان ہے، لیکن مر مر کر جینا بہت مشکل ہے،

یاری شیرازی: یک چشم زدن غافل ازاں ماہ نباشم — ترسم کہ نگاہے کند آگاہ نہ باشم

چشم زدن کے لئے بھی اس ماہرو کی طرف غافل نہ ہونا چاہئے کہ مبادا کسی وقت توجہ کرے اور مجھے خبر نہ ہو، اس لئے ہر وقت اس کی طرف سے ہوشیار رہنا چاہئے،

حاجی اسمٰعیل یحیٰی: پس از عمرے کہ با من گفت از راہ وفا حرفے — چنان گشتم ز خود خوشحال کز آنرا ہم نفہمیدم

ایک مدت دراز کے بعد جب محبوب نے از راہ وفا کوئی بات کی تو میں خوشی میں اتنا بیخود ہو گیا کہ اس کو بھی نہ سمجھ سکا،

میر یحییٰ کاشی: اے کہ از دشواری راہ فنا می ترسی — بسکہ آسان است این رہ میتوان خوابیدہ رفت

راہ فنا کی دشواری سے اتنا کیوں ڈرتا ہے، وہ تو بہت آسان ہے، سوئے اور گذر گئے،

دوا یکیست بدارالشفار میکدہ ہا — زہر مرض کہ بنالد کسے شراب دہند

میرا محبوب رقیب کا بھی دل نہیں دکھاتا، جس طرح پھول جو سراسر آگ ہے، مگر کانٹوں کو نہیں جلاتا،

ناصح زبان کشود کہ تسکین ما دہد نام تو برد باعث صد اضطراب شد

ناصح نے مجھکو تسکین دینے کے لیے زبان کھولی تھی کہ تیرے نام نے پھر مجھ کو سیکڑوں اضطراب میں مبتلا کر دیا،

نظارہ کن در آئینہ خود را حبیب من اما بشرط آنکہ نگردی رقیب من

میرے پیارے آئینہ میں اپنے حسن کا نظارہ کر بشرطیکہ اپنا حسن دیکھ کر میرا رقیب نہ بنجائے

بروز بیکسی جز سایۂ من نیست یار من وے آں ہم ندارد طاقت شبہائے تار من

بیکسی میں میرے سایہ کے علاوہ اور کوئی میرا رفیق نہیں لیکن اس میں بھی میری تاریک راتوں کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں، وہ بھی جدا ہو جاتا ہے، کیونکہ تاریکی میں آدمی کا سایہ نہیں پڑتا

امیر ہمایوں بدست آئینہ داد آنکہ دلستاں مرا یکے دو ساخت بلائے کہ بود جان مرا

جس نے میرے دلستاں (محبوب) کے ہاتھ میں آئینہ دیا، اس نے میری جان کی ایک بلا کو دونا کر دیا یعنی اپنا عکس، دیکھ کر اس کا غرور حسن اور بڑھ جائے گا، اور میری جان کی مصیبت دونی ہو جائیگی

نیابی در چمن سروے کہ من صد بار در پایش بسر نفتادم و نگریستم بر یاد بالایش

چمن میں کوئی سرو ایسا نہیں ہے کہ میں اسکو دیکھ کر محبوب کی کشیدہ قامتی کی یاد میں سیکڑوں مرتبہ اس کے قدم پر گر کر نہ رویا ہوں،

یکدم کہ با تو ام بسوئے من نظر مکن سیرت ندیدہ ام ز خودم بیخبر مکن

ایک گھڑی کے لئے جب میں تیرے پاس ہوں میری طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھ، میں نے تجھ کو جی بھر کے نہیں دیکھا ہے، اس لئے ابھی مجھکو اپنے سے بیخبر نہ کر، اگر تو اس وقت مجھ پر نظر ڈالے گا تو

مطبوعات جدیدہ

ہندوستان اسلامی عہد میں:- تالیف مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحب مرحوم ترجمہ مولوی شمس تبریز خاں صاحب، تقطیع کلاں، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۲۷۲، مجلد مع گردپوش قیمت مجلد عہ۵ پتہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام۔ لکھنؤ

فاضل مصنف نے عالم اسلام میں اسلامی ہند کو روشناس کرانے کیلئے جنۃ المشرق ومطلع النور المشرق کے نام سے عربی زبان میں ایک کتاب لکھی تھی، اسکو چند سال پہلے دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد نے "الہند فی العہد الاسلامی" کے نام سے شائع کیا تھا، اب اس کے بعض حصوں کو حذف کرکے اسکا شگفتہ اردو ترجمہ شائع کیا گیا ہے، عربی اڈیشن پر معارف میں مفصل تقریظ چھپ چکی ہے، اردو اڈیشن میں پہلے مسلمانوں کے عہد کے ہندوستان کی صوبہ جاتی تقسیم اور مشہور مقامات کا ذکر ہے، پھر مسلمانوں کے آئین حکومت کے بیان میں فوجی، سیاسی، مالیاتی، سڑکوں اور رسل و رسائل کے نظام، رفاہی کاموں میں نہروں، تالابوں اور تمدنی و تعمیری کارناموں میں باغ و چمن آرائی، جامع مساجد، مدارس، شفاخانے، مقبروں اور امام باڑوں کا ذکر ہے، مصنف کے نامور فرزند مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے عربی اڈیشن کے لئے جو مقدمہ لکھا تھا اسکا نہایت رواں اور سلیس ترجمہ مولانا محمد الحسنی نے کیا ہے اس میں مختلف ملکوں اور ہندوستان کے مسلمانوں کی اپنے وطن سے محبت و تعلق اور اس کی تعمیر و ترقی میں ان کی خدمات اور کارناموں کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے، اور اس کتاب کو

میکدہ کے دار الشفا میں ہر مرض کی دوا ایک ہی ہے، مریض جس مرض میں بھی مبتلا ہوتا ہے، صرف شراب دیتے ہیں،

به از دل در متاعِ آفرینش نیست کالائے　　　چرا عاقل دل از اسباب دنیا بر نمیدارد

اس دنیا میں جتنی چیزیں پیدا کی گئی ہیں، ان میں سب سے قیمتی متاع دل ہے، اس لئے عقلمند آدمی دنیاوی ساز و سامان سے دل کو کیوں نہیں الگ کرتا، اس لئے کہ سب سے قیمتی متاع تو وہی ہے، اس کو اپنے سے کم درجہ کی چیزوں کی طرف مائل ہونے کی کیا ضرورت ہے،

ز دست عقل نچیدم گلے بکام ز عشق　　　چو کودکے کہ بگلزار با ادیب رود

میں عقل کے ہاتھوں سے عشق کے کام کا کوئی پھول نہ توڑ سکا، اس بچے کی طرح جو باغ میں اتالیق کے ساتھ جاتا ہے، جو اسکو پھول توڑنے سے روکتا ہے، یعنی عشق کے معاملات عقل سے انجام نہیں پا سکتے، وہ تو اس سے روکتی ہے، اقبال کا شعر ہے،

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق　　　عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

بروز درد و غم دوری ز یار و آشنا بہتر　　　چو عضوے درد مند افتاد از اعضا جدا بہتر

درد و غم کے زمانہ میں دوست و آشنا سے دور رہنا بہتر ہے، جس طرح بیمار اور ماؤف عضو کا تندرست اعضا سے دور رہنا بہتر ہی،

محمد یوسف　پروانہ بے ملاحظہ در عشق کار ساخت　　　من حرف ہم نشیں بعبث گوش کردہ ام

پروانہ نے دیکھے بھالے اور انجام کو سوچے بغیر عشق میں کام کر گیا، (یعنی شمع پر نثار ہو گیا) میں بیکار ہم نشیں کی باتوں کی طرف توجہ کرتا ہوں، مجھے بھی اسکو نظر انداز کرکے اپنا کام کر گذرنا چاہئے،

محمد شرف کے ترک سجدہ و نوبتِ دلربا کنم　　　کارے کہ کافرے نکند من چرا کنم
یکتا

اے بت دلربا میں تیرا سجدہ اور پرستش کیسے چھوڑوں اور جو کام کافر بھی نہیں کرتا وہ میں کیسے کروں، یعنی وہ کسی حال میں بت پرستی نہیں چھوڑتا، اسلئے میں کیسے تیری پرستش چھوڑ دوں،

کی روداد بیان کی گئی ہے، اس کتاب سے مصنف کی ذہانت اور تصنیفی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے، گر ابھی یہ ان کی پہلی تصنیف ہے، جو اس میں کمی رہ گئی ہے وہ امید ہے کہ آیندہ پوری ہوجائیگی

تذکرۂ شعراء (حسرت) مرتبہ ڈاکٹر احمر لاری صاحب تقطیع متوسط، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۲۰۴، مجلد مع گرد پوش قیمت ۔/۳۵ پتہ ادبستان نظامپور گورکھپور،

ڈاکٹر احمر لاری استاذ شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی نے حسرت موہانی کی حیات : خدمات پر تحقیقی مقالہ لکھکر ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی ہے، اس کی ترتیب وتکمیل کے دوران ان کو جو مفید معلومات ملتے گئے وہ انھیں جمع کرتے گئے اور اب ان کو مقالات اور کتابوں کی صورت میں طبع کر رہے ہیں، زیر نظر کتاب اسی سلسلہ کی کڑی ہے، یہ حسرت کے لکھے ہوئے مندرجہ ذیل دس شاعروں کے تذکروں پر مشتمل ہے، (۱) حاتم (۲) سودا (۳) قائم (۴) مصحفی (۵) نصیر (۶) ذوق (۷) مومن (۸) غالب (۹) نسیم (۱۰) تسلیم،

ان میں حالات و کمالات [illegible] شاعری پر مختصر تبصرہ کے علاوہ کلام کے نمونے بھی دئے گئے ہیں، اس کے مبسوط مقدمہ میں لایق مرتب نے اردو تذکرہ نگاری کا مختصر جائزہ لینے کے بعد حسرت کی تذکرہ نگاری کے مختلف پہلوؤں پر سنجیدہ اور متوازن بحث کی ہے، اس سے انکے سلیقۂ تحریر اور قلم کی شگفتگی اور روانی بھی ظاہر ہوتی ہے، آخر میں دو ضمیمے ہیں، پہلے میں ان شعرا کی فہرست دی گئی ہے، جن کے تذکرے خود حسرت نے لکھے تھے اور دوسرے میں ان شعراء کے نام درج ہیں جنکے تذکرے حسرت کے رسائل کیلئے دوسرے ارباب قلم نے لکھے تھے حسرت نے اردوے معلّی میں باقاعدہ پروگرام کے مطابق اردو شعراء کا تذکرہ لکھنا شروع کیا تھا اگر ان سب کا مجموعہ شائع کر دیا جاتا تو یہ اردو تذکروں میں ایک اچھا اضافہ ہوتا، تاہم اس انتخاب کی اشاعت کیلئے بھی لایق مرتب قابل مبارکباد ہیں۔

سلسلۂ تصانیف کی ایک کڑی بتایا گیا ہے، جو اسلامی ملکوں کے تہذیبی، تمدنی، اور تعمیری کارناموں کو نمایاں کرنے کے لئے وہاں لکھی گئی ہیں، مقدمہ کے آخر میں اس کے موضوع و مباحث کا تعارف کراکے اس کی اشاعت کی سرگذشت تحریر کی گئی ہے، جس زمانہ میں یہ کتاب لکھی گئی تھی اس وقت اس موضوع کی جانب کم اعتنا کیا گیا تھا، گو اب اس پر اردو خصوصاً انگریزی میں اچھی اچھی کتابیں لکھی جا رہی ہیں تاہم اس ترجمہ کی اشاعت فائدہ سے خالی نہیں، یہ تاریخ ہند کے طلبہ کیلئے اچھا ماخذ ہے، شروع میں تفصیلی فہرست اور آخر میں مفصل انڈکس بھی ہے۔

تخلیق انسانی کا مقصد مرتبہ مولانا حبیب ریحان خاں ندوی، تقطیع خورد، کاغذ
دین و شریعت کا قیام کتابت و طباعت معمولی صفحات ۲۲۶، قیمت ۶ روپیے
پتہ منیجر دارالتصنیف والترجمہ، ۱۳ مسجد شکور خاں روڈ، بھوپال۔

مولانا محمد عمران خاں ندوی کے فرزند مولانا حبیب ریحان ندوی لکچرار اسلامک انسٹی ٹیوٹ البیضا (لیبیا) لایق اور ہونہار نوجوان ہیں، ان میں مذہبی درد اور اسلام کی خدمت کا جذبہ بھی ہے، اس لئے انھوں نے اپنے وطن بھوپال میں جو عرصہ دراز تک علم و فن کا گہوارہ رہ چکا ہے اردو میں عام فہم زبان میں علمی و دینی اور اصلاحی کتابوں کی تالیف و ترجمہ اور طباعت کے لئے دارالتصنیف والترجمہ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے، مذکورۂ بالا کتاب ادارہ کی پہلی کوشش ہے، اس میں دین و شریعت کی ضرورت و اہمیت بیان کرکے ان کے قیام کو تخلیق انسانی کا نصب العین بتایا گیا ہے، یہ چھ ابواب پر مشتمل ہے، شروع میں دین و شریعت کا مفہوم خلافت کی فرضیت و ضرورت، خلیفہ کی ذمہ داریوں اور طریقۂ انتخاب وغیرہ پر گفتگو کی گئی ہے اور آخر میں موجودہ دور میں اسلامی شریعت کے نفاذ کے لئے کیجانے والی کوششوں اور ان کی کامیابی کی بعض شرطوں کا ذکر ہے، ایک باب میں لیبیا میں ہونے والی آٹھ روزہ کانفرنس

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۲۰
نومبر ۱۹۷۳ء

Nov 1973

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

کاتب اقبال احمد

مختصر تاریخ گورکھپور مرتبہ ڈاکٹر احمد لاری تقطیع خورد کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۷۲، قیمت ۲/۵۰ روپیے، پتہ :- ادبستان۔ نظام پور، گورکھپور،

یہ مشرقی اتر پردیش کے مشہور مقام گورکھپور کی مختصر تاریخ ہے، اردو میں ابھی تک اسکی کوئی تاریخ نہیں لکھی گئی تھی، اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ڈاکٹر لاری نے یہ کتابچہ لکھا ہے، اس کے آخر میں ایک مختصر فارسی کتاب "تاریخ معظم آباد" کا اردو ترجمہ بھی شامل کر دیا ہے، اس میں انیسویں صدی تک کے واقعات ہی کا ذکر ہے، موجودہ صدی کے واقعات آیندہ اڈیشن میں شائع کئے جائینگے، لیکن یہ نہایت مختصر ہے، ممکن ہے آیندہ اڈیشن میں مزید تفصیل سے کام لیا جائے۔

فکری زاویے مرتبہ جناب ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۲۱۰، مجلد مع گرد پوش قیمت للعہ ناشر نسیم بکڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ،

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی ریڈر شعبہ اردو دلی یونیورسٹی نے وقتاً فوقتاً جو ادبی و تنقیدی مضامین لکھے تھے اب انھوں نے انکا مجموعہ شائع کیا ہے، یہ سولہ ۱۶ مضامین پر مشتمل ہے، ابتدا کے تین مضامین میں اردو نظم و نثر ۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء اور آزادی کے بعد اردو تحقیق کا جائزہ، اور اردو تراجم کے مسائل سے مختصر بحث کی گئی ہے، ایک مضمون میں تحقیق و تنقید کا مفہوم اور ان کی ضرورت کی شرطیں بیان کی گئی ہیں، چھ مضامین میں سودا، سوز، غالب، محسن، جگر اور فیض کی شاعری کے کسی نہ کسی اہم پہلو پر بحث کرکے ان کا درجہ و مرتبہ واضح کیا گیا ہے، دو مضامین میں فراق کی تنقیدی اور اختر اورینوی کی مقالہ نگاری کی خصوصیات نمایاں کی گئی ہیں، آخری مقالہ میں خواجہ احمد فاروقی صدر شعبہ اردو دلی یونیورسٹی کا مختصر تذکرہ پیش کیا گیا ہے، ڈاکٹر ظہیر احمد اردو شعر و ادب کے قدیم ذخیرے کے عظمت شناس بھی ہیں، اور نئے تنقیدی و ادبی رجحانات سے آشنا بھی، اس لئے وہ جو کچھ لکھتے ہیں اس میں غور و فکر کے ساتھ اعتدال بھی ہوتا ہے، اور یہ مجموعہ اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے۔

(ض)

جلد ۱۱۲ ماہ شوال المکرم ۱۳۹۳ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۷۳ء عدد ۵

مضامین

شذرات — سید صباح الدین عبد الرحمٰن — ۳۲۲-۳۲۴

مقالات

ملا محمد جونپوری کی سوانح حیات کے بعض نئے ماخذ — جناب بشیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے ایل ایل بی سابق رجسٹرار عربی فارسی اتر پردیش — ۳۲۵-۳۴۶

مولانا محمد علی کی یاد میں — سید صباح الدین عبد الرحمٰن — ۳۴۷-۳۶۶

ہندوستان میں مشرق وسطیٰ سے متعلق مطالعتی ادارہ کا قیام (ایک تجویز اور خاکہ) — جناب اے اے اے فیضی صاحب — ۳۶۷-۳۹۱

آیۂ داود ونہا بنی اسرائیل پر ایک نظر — جناب مولانا محمد شفیع حجۃ اللہ فرنگی محلی — ۳۹۲-۳۹۸

مطبوعات جدیدہ — «ض» — ۳۹۹-۴۰۰

تصحیح

صفحہ ۳۶۷ میں عنوان میں لفظ مقام کے بجائے قیام اور سطر ۶ میں اسلامک اسٹڈیز کے بجائے اسٹڈیز ان اسلام بنالیں۔

«اڈیٹر»

بزم تیموریہ جلد اوّل

بزم تیموریہ جلد اوّل کے پہلے اڈیشن میں تمام مغل سلاطین، اُن کے شاہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے امرا، شعرار و فضلار کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ تھا اب اُس کو بکثرت اضافوں کے ساتھ دو جلدوں میں کر دیا گیا ہے۔ تاکہ تمام مغل سلاطین، اور اُن کے عہد کے ادب و زبان کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجائے، پہلی جلد میں بابر، ہمایوں، شہنشاہ اکبر کے علمی ذوق، اور اُن کے عہد کے، اور اُن کے دربار سے متوسّل علمار، فضلار، و شعرار کا تذکرہ، اور اُن کے کمالات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس میں اس قدر ترمیم اور اضافے ہوگئے ہیں، کہ اپنے مواد و معلومات کے اعتبار سے بالکل نئی کتاب ہوگئی ہے، اور پہلے اڈیشن سے کہیں زیادہ جامع اور مکمل اور قابلِ مطالعہ، جہانگیر سے لے کر آخری مغل تاجدار تک کی جلد زیرِ ترتیب ہے،

قیمت:۔ ۱۲ روپیہ،

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

یعنی تم کو سزا دیں گے، اور ہم نے کافروں کے لئے جہنم کا جیل خانہ تیار کر رکھا ہے، (بنی اسرائیل ۱) عہد رسالت ہی سے یہودی مسلمانوں سے مکارانہ جنگ کرتے رہے ہیں، مگر ہمیشہ بشارت الٰہی دی گئی کہ وہ مسلمانوں کو معمولی اذیت اور آزار پہونچانے کے سوا اور کوئی نقصان نہ کر سکیں گے، اور اگر ان کی لڑائی مسلمانوں سے ہوئی تو وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے، اور پھر ان کو کہیں سے مدد نہ ملے گی، (آل عمران رکوع ۱) موجودہ سلسلۂ جنگ میں اگر عربوں نے ایمانی حرارت، اسلامی اخوت اور باہمی یگانگت سے کام لیا تو یہ بشارت پھر پوری ہو کر رہے گی، ایک اور موقع پر ارشاد ہوا ہے کہ یہودی مصر کے جنگل میں بھٹکتے پھریں گے، تو تم ان نافرمان لوگوں کے حال پر افسوس نہ کرنا (مائدہ رکوع) وہ اس وقت مصر کے سینائی صحرا میں بھٹک رہے ہیں، امریکہ کے سوا ساری دنیا ان کی ہٹ دھرمی پر ان کو ملعون کر رہی ہے، موجودہ دور کے سب سے بڑے مورخ آرنلڈ ٹائن بی نے بھی کہا ہے کہ امریکہ جس روز بھی ان سے نظر پھیر لیگا، وہ خود بخود ختم ہو جائیں گے، جس کے بعد کلام پاک کی یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہو گی، کہ ڈال دی گئی ہے اُن پر ذلت جہاں کہیں بھی وہ پائے جائیں بجز اسکے کہ اللہ کی ذمہ داری میں اور لوگوں کی ذمہ داری میں ہوں (آل عمران رکوع ۱۲) موجودہ جنگ کے بعد دنیا کا سیاسی شعور اس حیثیت سے بیدار ہو چکا ہے کہ اسرائیل امریکہ کے سہارے کے بجائے عربوں کی ذمہ داری کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے، اور اگر وہ امریکہ کے رحم و کرم پر زندہ رہنے کی کوشش کرتے رہے تو یہ بھی کلام پاک کے ارشاد کے مطابق ذلت کی زندگی ہو گی، لیکن موجودہ جنگ سے ظاہر ہو گیا ہے کہ امریکہ کے فینٹم اسکائی ہاک اور بمب کی امداد کے باوجود وہ موت کے منھ میں ڈھکیلے جا سکتے ہیں،

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے شعبۂ عربی کے صدر ڈاکٹر عبد المعید خاں کی وفات علمی حلقہ کیلئے

شذرات

گذشتہ مہینہ مصر و شام میں عربوں اور یہودیوں سے پھر ایکبار خونریز جنگ ہوئی، جس کا سردست کوئی خاطرخواہ نتیجہ نہیں نکلا، محاذ آرائی ابھی جاری ہے، یہ صلیبی جنگ کی طرح اس کا سلسلہ بھی طویل ہوتا نظر آتا ہے، مگر مسلمانوں کو یقین کامل ہے کہ آخر میں فتح عربوں ہی کو ہوگی، کیونکہ کلام پاک میں ہے کہ یہودیوں کو ذلت اور محتاجی کی مار رہے گی، انکی قسمت پر محرومی اور نامرادی کی مہر ہمیشہ کے لئے لگ گئی ہے (البقرہ رکوع ۷)، کلام پاک میں انکی شرارت پسندی فتنہ پروری، بے دریغ خونریزی اور ظلم و معصیت کی جتھا بندی کا ذکر بار بار آیا ہے، اور بڑی حقارت سے کہا گیا ہے کہ بار بار ان کے چہرے پر رسوائی پھیری گئی (بنی اسرائیل رکوع ۱۵)، اللہ تبارک و تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ ان کے نتائج عمل کا قانون اپنی نمود تب دکھلا کر رہے گا (بنی اسرائیل، رکوع ۱)

خود حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہودیوں کی نافرمانی اور سرکشی سے نالاں ہو کر دعا کی تھی کہ اے میرے پروردگار اپنی ذات خاص اور میرے بھائی ہارون کے سوا کوئی میرے بس کا نہیں، تو عذاب نازل کرتے وقت ہم میں اور ان نافرمان لوگوں میں امتیاز کیجیو، کہیں ہم ان کی لپیٹ میں نہ آجائیں (المائدہ رکوع ۴)، مشرق وسطیٰ پر اس وقت عذاب الٰہی نازل ہے، اس کی لپیٹ میں عرب بھی آگئے ہیں اسلئے کہ ان کو معاشرتی، سیاسی اور مذہبی حیثیت سے کیا ہونا چاہئے تھا، وہ کیا ہو کر رہ گئے ہیں، جب وہ اپنے کو ہر طرح سے سنوار لیں گے تو اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق یہودیوں کی سرکشی اور فساد کی طرف اس کی یاد داشت بھی لوٹ آئے گی (بنی اسرائیل رکوع ۱) کلام پاک میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کو مخاطب کر کے فرمایا ہے، کہ اگر تم وہی پہلی سی شرارتیں کروگے تو ہم بھی پھر وہی کریں گے، جو پہلے کیا تھا

مقالات

ملا محمود جونپوری

(ب) سوانح حیات کے دیگر ماخذ

از جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے ایل ایل بی۔ سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش

(۲)

زیر بحث موضوع کے نقطۂ نظر سے سب سے اہم محمد صالح کنبوہ کی "عمل صالح" ہے جو اصولاً تو شاہجہاں کے عہد حکومت کی تاریخ ہے لیکن دوسرے مورخین کی روش کے مطابق اس کے آخر میں فضلائے عہد کے تراجم کا بھی التزام کیا گیا ہے۔

عہد شاہجہانی سے پہلے دس سال کی تاریخ مرزا امینائے قزوینی نے لکھی تھی، اس کے بعد پہلے بیس سال کی تاریخ عبدالحمید لاہوری نے لکھی اور مورخین نے بھی اس عہد کی تاریخیں لکھیں، بعد میں عہد شاہجہانی کے تیس سال کی تاریخ محمد صالح کنبوہ نے "عمل صالح" کے نام سے مرتب کی "عمل صالح" ۱۰۷۰ھ میں مکمل ہوئی چنانچہ مصنف نے اس کے دیباچہ میں لکھا ہے:-

در سال ہزار و ہفتاد ہجری از چمن آرائی ایں گلشن فیض فراغ یافتہ سرفت دست سپہر پیمائی بر افراختم[۱]

اگرچہ بعد میں مصنف نے اس میں ۱۰۸۰ھ تک کے واقعات بڑھا دئے مگر اصولاً

[۱] عمل صالح کنبوہ ص ۵۔

ایک سانحہ ہے، انھوں نے قاہرہ اور کیمبرج میں تعلیم پاکر ساری عمر جامعہ عثمانیہ کی خدمت میں گذاری، کچھ دنوں آکسفورڈ یونیورسٹی میں بھی عربی کے پروفیسر رہے، حیدرآباد کے مشہور انگریزی رسالہ اسلامک کلچر کی ادارت کے فرائض آخر وقت تک بڑی خوبی سے انجام دیئے، مارماڈیوک پکتھال نے اس کا جو معیار قایم کیا تھا، اس کو انھوں نے قایم رکھا، دائرۃ المعارف حیدرآباد کی علمی سرگرمیوں میں بھی ان کا بڑا حصہ رہا، ان کی رہنمائی میں یہاں سے بہت سی مفید کتابیں شائع ہوئیں، مولانا ابوالکلام آزاد ان کی علمی صلاحیتوں کے معترف تھے، وہ حکومت کی علمی کمیٹیوں میں نامزد ہوتے رہے، جہاں وہ عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، امید ہے کہ جامعہ عثمانیہ ان کو ایک نامور فرزند کی حیثیت سے برابر یاد رکھے گی،

گذشتہ اکتوبر میں ڈاکٹر تاراچند کے انتقال پُر ملال سے بھی ہندوستان میں ایک بڑا علمی خلا پیدا ہوگیا، وہ الٰہ آباد کے کایستھ پاٹ شالہ کی مدرسی اور پرنسپلی کے بعد الٰہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ہوئے، پھر حکومت ہند کے تعلیمی مشیر بنے، ایران میں ہندوستان کی طرف سے سفیر بنا کر بھیجے گئے، وہاں سے واپسی پر پارلیمنٹ کے رکن نامزد کئے گئے لیکن انکی اصلی شہرت اور مقبولیت ایک بلند پایہ مورخ کی حیثیت سے ہوئی، انھوں نے "انفلوانس آف اسلام ان انڈین کلچر" پر ایک مقالہ لکھ کر آکسفورڈ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، یہ انکی ابتدائی تحقیقی کوشش تھی، لیکن اس سے بہتر کتاب اس موضوع پر اب تک نہیں نکلی، آخر میں وہ ہسٹری آف دی فریڈم موومنٹ کے بورڈ کے اڈیٹر تھے، ان کی ادارت میں یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام پا رہا، ان کی تحقیقی تحریروں میں دیدہ وری کے ساتھ بڑی فراخدلی بھی ہوتی، وہ ہندی اردو کی حسین آمیزش یعنی ہندوستانی زبان کے بھی بڑے موید تھے، اس کے کچھ اچھے نمونے بھی لکھ کر پیش کرتے رہے، ان کی نیک نامی اور مورخانہ بصیرت کی وجہ سے انکی خوشگوار یادوں کا چراغ علمی حلقہ میں برابر روشن رہے گا،

اما قلم فیض رقمش در حالت تحریر تفسیر آیات کلام الٰہی و تعبیر حقائق اشیاء کماہی بعنوان تصنع و تفنن بکار می برد کہ بر نقش کلکش دعوی فضیلت معنی پردازی آں جناب را زباں می دہد و سخنان ارجمندش بعلاقۂ عزائب معنی در صدر انجمن دلہائے والا فطرتان اقامت انداز گشتہ۔ ہر لفظش کہ در اثبات شرافت لطائف نفی (؟) نطق ناطق و معجزۂ صادق است، ابواب حیرت بر روئے روزگار می کشاید، (عمل صالح جلد دوم صفحہ ۳۸۳-۳۸۴)

اس تذکرے سے فاضل جونپوری کے متعلق چند نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں:۔

ملا صاحب "تفسیر و حدیث اور حکمت" کے علاوہ فن ریاضی میں بھی دستگاہ عالی رکھتے تھے،

"و در انواع فنون دانش خصوص علم معقول و منقول و ریاضی و طبیعی و الٰہی ہیچ کس از ارباب استعداد را قوت دعوی برابرے باوے نبود"[1]

محمد صالح کی اس تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ علوم حکمیہ و فلسفہ میں طبعیات و الٰہیات کے علاوہ ملا محمود کو ریاضیات میں بھی غیر معمولی دستگاہ حاصل تھی، وہ ریاضیات کی شاخ "علم الہیئت" میں بھی ممتاز مقام رکھتے تھے، مگر غالباً ان کی تحقیق پسند طبیعت اس فن میں اگلے جانے والوں کی "تقلید" پر راضی نہیں ہوسکی، اس لئے جیسا کہ آزاد بلگرامی نے لکھا ہے "وہ بادشاہ کو رصد بندی کے لئے آمادہ کرنے کے لئے دہلی تشریف لے گئے مگر وزیر کی دراندازی سے ان کی تجویز پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی"[2] اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

اپنے پیشرووں (ترک و افغان سلاطین دہلی) کے برخلاف مغل تاجداروں کو نجوم و ہیئت سے غیر معمولی دلچسپی تھی، بابر کے اسلاف میں الغ بیگ تو اپنی رصدگاہ،

---

[1] عمل صالح جلد اول ص ۳۸۳، [2] آزاد بلگرامی مآثر الکرام ص ۲۰۲۔

یہ کتاب ۱۰۷۰ھ میں لکھی گئی، یعنی فاضل جونپوری کی سوانح حیات کے قدیم ترین مآخذ "تبیرنگر" کے کوئی چودہ سال بعد۔

عبدالحمید لاہوری نے جن وجوہ سے بھی ہو، ملا محمود جونپوری کو "بادشاہ نامہ" میں درخور ذکر و اعتنا نہیں سمجھا، مگر محمد صالح نے اپنے پیشرو کے بخلاف ان کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے، اور اس طرح اس کوتاہی کی تلافی کر دی ہے جو اس باب میں عبدالحمید لاہوری سے ظہور میں آئی تھی اگرچہ زمانہ کی عام روش کے مطابق ان کا انداز نگارش بھی تزیین عبارت کا بڑا حسین و جمیل مرقع ہے مگر اس عبارت آرائی میں بھی بعض اوقات مختلف علماء و فضلاء کے متعلق بعض اہم تصریحات مل جاتی ہیں، جن سے ان کی شخصیتوں کے نکھار میں خاصی مدد مل سکتی ہے۔ جہاں تک فاضل جونپوری کا تعلق ہے، یہ واقعات ان کی وفات کے آٹھ سال بعد ہی قلمبند ہوئے ہیں، ان کی صحت میں کسی قسم کے شک و شبہہ کی گنجایش نہیں،

محمد صالح کنبو نے ملا محمود جونپوری کے بارے میں لکھا ہے :-

"سر دفتر علمائے خطۂ وجود ملا محمود"

کہ ضمیر پاکش معانی را مقام محمود است و سپہر فضل و دانش را کوکب مسعود۔ در شہر صفا پرور جونپور پذیرائی سرشت گردیدہ و از آغاز ایام شعور در ابداع بدایع محسنات سخن کوشیدہ۔ مظہر فضل سرمدی و منبع فیض ابدی بود۔ و در انواع فنون دانش خصوص علم معقول و منقول در ریاضی و طبیعی و الٰہی ہیچ کس از ارباب استعداد را قوت دعوی برابری با دے نبود۔ اگرچہ در خور دانش و بینش خود طلاقتِ زبان و تقریر لسان نداشت،

"آن زیچ تصحیح یافتہ باتمام رسید و بزیچ سلطانی گورگانی موسوم شدہ و درمیان جہرۂ صناعت تنجیم و اصحاب تقادیم معمول و متداول است"[1]

اس تفصیل سے مغل تاجداروں کا ہیئت و نجوم کیساتھ غیر معمولی اعتنا واضح ہو گیا ہو گا۔ ہندوستان میں مغل حکومت کی بنیاد بابر نے ڈالی، وہ ہرچند کہ "السیف اصدق امر الانبیاء" کا قائل و عامل تھا، مگر لوازم دربار میں نجومی کا ہونا بھی داخل تھا اسلئے اس کے یہاں بھی محمد شریف نام کا منجم تھا اور اپنے خلاف طبیعت بادشاہ اُسے برداشت کرتا تھا، رانا سانگا کے ساتھ جنگ میں اگرچہ اس منجم نے بڑی ہمت شکن پیشین گوئیاں کی تھیں مگر فتح کے بعد جب دوسرے جان نثاروں کو دل کھول کر انعام و اکرام سے نوازا تو اس "شوم نفس" منجم کو بھی ایک لاکھ دے کر مغل دربار کی دیرینہ روایت کو برقرار رکھا، بابر اپنی خود نوشت سوانحعمری "بابر نامہ" میں لکھتا ہے :۔

(وبعد از فتح) محمد شریف منجم کہ چہ نوع نقشہائے شوم راندہ بود بمبارکباد فتح آمدہ، دشنام بسیاری دادہ دل خود را خالی کردم ...... چوں قدامت خدمتی داشت یک لک انعام کردہ رخصت دادم کہ در قلمروے من نایستد"۔ (بابر نامہ صفحہ ۳۱۴)

اور ہمایوں تو گویا "تبحر فی علم الہیت" کا مظہر ہی تھا[2] ابو الفضل اس کے بارے میں لکھتا ہے :۔

در اقسام علوم خاصہ ریاضی در زمان خود نظیر و سہیم نداشتند۔ (اکبرنامہ جلد اول ص ۱۲۲)

دوسری جگہ لکھتا ہے :۔

---

[1] مطلع السعدین صفحہ ۲۳۹، [2] ابو الفضل اکبرنامہ جلد اول صفحہ ۱۲۰ میں اسکے تذکرہ کا آغاز صنعت براعۃ استہلال سے کرتا ہے جس میں علم ہیئت کی مصطلحات کو استعمال کیا ہے: "کرسی کرۂ اسرار ابدی و ازلی، عضادہ اصطرلاب حکمت علمی و عملی"۔

سمرقند (جس کے کھنڈر آج بھی موجود ہیں) اور "زیج سلطانی" کی تدوین و ترتیب کے لئے مشہور ہے، جو اسلامی علم الہیئت کی تاریخ میں آخری اہم ترین رصدگاہ اور زیج محسوب ہوتی ہیں۔ عبد الرزاق نے "مطلع السعدین" میں لکھا ہے:۔

مرزا الغ بیگ کہ در علوم و فنون صاحب نصیب اوفی و نصاب مستوفی بود...... با خواص حکماء و فحول عقلاء و مہندسان عطارد ذکا و فیلسوفان مجسطی کشا...... مثل...... قاضی زادہ رومی و...... مولانا علاء الدین علی قوشجی...... و مولانائے اعظم غیاث الدین جمشید کاشی و مولانائے معظم معین الدین...... انجمنے ساخت...... و بعد از تحصیل کمالات و تکمیل آلات میل انبساط رصد و استخراج زیج فرمود و در شمال سمرقند مائل بمشرق مقام لائق تعیین نمود...... و بنائے آں...... استحکام یافت[1]

اس رصدگاہ کی علمی و ہیئتی تحقیقات نے خواجہ نصیر الدین طوسی کی رصدگاہ مراغہ کی دریافتوں اور ان کی مرتبہ "زیج ایلخانی" پر قابل قدر اضافے کئے چنانچہ عبد الرزاق نے آگے چل کر لکھا ہے:

تقویم آفتاب و سائر کواکب را رصد کردہ بر زیج جدید ایلخانی کہ جناب حشمت مآب خواجہ نصیر الدین طوسی استخراج نمودہ بود، فوائد و لطائف افزود در تقویم آفتاب و کواکب دیگر تفاوت صریح ظاہر ساخت[2]

اس کا نتیجہ تھا کہ اس کے مقابلے میں پچھلی ہیئتی جدولیں اور زیجیں تقویم پارینہ بن گئیں اور بعد کے علمائے ہیئت کا نہ صرف عبد الرزاق کے زمانہ بلکہ رصدگاہ محمد شاہی اور زیج محمد شاہی کے زمانہ تک) اسی پر اعتماد کیا جاتا تھا، عبد الرزاق نے آخر میں لکھا ہے:۔

---

[1] عبد الرزاق: مطلع السعدین صفحہ ۲۲۷-۲۳۸۔ [2] مطلع السعدین صفحہ ۲۳۸،

میں لکھتا ہے :۔

"بسیارے از احکام او (جوتک رائے) مطابق افتادہ کہ خالی از غرابت نیست، در ین واقعات بتقریبات ثبت شدہ، بنا برین فرمودند کہ او را بزر کشیدند ششش ہزار و پانصد روپیہ برآمد بانعام او مقرر گشت۔"

(تزک جہانگیری صفحہ ۲۳۹)

ان ہی اسلاف کا خلف الرشید شاہجہاں تھا، نجوم و ہیئت کے ساتھ اعتنا، جو اس نے اپنے آبا و اجداد سے ورثہ میں پایا تھا، اور شاید اسی اعتناء مفرط کا نتیجہ تھا کہ اسکے دوسرے سال جلوس (۱۰۳۹ھ) میں ملا فرید منجم نے بادشاہ کے ایما، وزیر آصف جاہ کے زیر اہتمام اور اپنے بھائی ملا طیب نیز ہیئت اور جوتش کے ہندوستانی اور یونانی مذہب کے ماہرین کی معاونت سے ایک نئی ہیئتی جدول بعنوان "زیچ شاہجہانی" مرتب کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کی اور مورد صد ہزار تحسین و آفریں ٹھہرا۔ "طبقات شاہجہانی" میں ملا فرید کے تذکرے میں مرقوم ہے :۔

"ملا فرید منجم علیہ الرحمہ از علم و دانش خبرے تمام داشت و در جفر و وقف و اعداد و علم حساب و نجوم نظیر نداشتہ دیگانۂ آفاق بودہ...... و در آخر عمر زیچے بنام حضرت بادشاہ دین پناہ ابوالمظفر شہاب الدین محمد صاحب قران ثانی نوشتہ و از فضائل و کمالات خود یادگار گذاشتہ۔" (طبقات شاہجہانی صفحہ ۱۳۱)

مزید تفصیل محمد صالح کنبو نے دی ہے، اس نے "دوسرے سال جلوس" کے حالات میں لکھا ہے :۔

"از سوانح این ایام سعادت بے پایان، ملا فرید منجم کہ در تحصیل فن

---

[1] عمل صالح جلد اول صفحہ ۳۰۱

از اقسام علوم عقلی ونقلی آگاہی تمام داشتند علی الخصوص در اقسام علوم ریاضی آنحضرت راپایہ بلند بود وہموارہ با ارباب حکمت صحبت می داشتند وممتاز ان علم ریاضی در پایۂ سریر والا کامیاب سعادت بودند“

(اکبرنامہ جلد اول صفحہ ۳۶۸)

یہاں تک کہ اسی شوق فضول میں اس کی موت واقع ہوئی، ابو الفضل نے اس کے آخری دن کے پروگرام میں لکھا ہے:۔

آخر روز جمعہ ربیع الاول سنہ نہصد وشصت وسہ...... جمعے از ریاضی دانان را طلب فرمودند، وآں شب مقتضٰی طلوع زہرہ بود، می خواستند کہ ملاخظ فرمایند دیدنت حق طوبیت آں بود کہ چوں زہرہ طالع شود و ساعت مسعود گردد مجلس عالی داشتہ جمعے را بمناصب عالیہ امتیاز بخشند“[۱]

مگر شام کے وقت زینہ سے اتر رہا تھا کہ پیر پھیسلا اور راہی ملک عدم ہوا۔

اکبر نے کچھ تو خاندانی روایات کا اثر اور کچھ الحاد وبے راہ روی کے تحت علوم نقلیہ کو ترک کر کے علوم عقلیہ خصوصاً نجوم وحساب کی تعلیم وتعلّم کا حکم دیا۔

”حکم شد کہ اہیں از علوم غیر نجوم وحساب وطب وفلسفہ نخوانند وعمر گرامی صرف آنچہ معقول نیست، صرف نکنند“[۲]

جہانگیر بھی اپنی خوش باشی کے باوجود (جو علم وحکمت کی سرپرستی سے بے اعتنائی کی مقتضی تھی) نجوم کا معتقد تھا، اس کا درباری جوتشی جوتکرائے تھا جسے وہ نہایت فرزندلی کے ساتھ نوازتا رہتا تھا، چنانچہ اس کے بارے میں اپنی عقیدت کا ذکر کرتے ہوئے ”تزک

---

[۱] اکبرنامہ جلد اول صفحہ ۳۶۳۔ [۲] ذوالفقار اردستانی، دبستان المذاہب صفحہ ۳۲۸،

یں اوقات شبانروزی میں اصلاح کرائی جیسے محمد صالح نے اس سال کے واقعات میں "قانون محدود در گھڑیہائے شبانروزی" کے عنوان سے لکھا ہے[1] اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

عام طور سے دن آفتاب کے طلوع سے اس کے غروب تک کے عرصۂ زمانی کا نام ہے اور رات غروب سے طلوع تک کے عرصہ کا اور یہی نجومی روز و شب ہیں، مگر عملی زندگی میں دن طلوع آفتاب سے کچھ پہلے شروع ہو جاتا ہے اور غروب آفتاب کے کچھ دیر بعد تک رہتا ہے، ان عملی ضرورتوں میں مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے سب سے اہم فجر اور مغرب کی نمازیں اور ان کے اوقات کا لحاظ ہے، لہذا اونید اور ماہرین توقیت و علم الہیئت نے ایسا مقرر کیا ہے کہ دن طلوع آفتاب سے ڈیڑھ گھڑی (۳۶ منٹ) قبل شروع ہو جاتا ہے اور غروب کے آدھی گھڑی (۱۲ منٹ) بعد تک رہتا ہے[2]،

لیکن خود دن اور رات کی مقدار سال کے مختلف ایام میں گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ مثلاً عہد شاہجہانی میں لاہور کا بڑے سے بڑا دن ۳۵ گھڑی کا ہوتا تھا اور چھوٹی سے چھوٹی رات ۲۵ گھڑی کی، اسی اصول پر صبح اور شام کے گجر بجائے جاتے تھے،

مگر شاہجہاں کی دینداری اور اسلام پسندی نے جو فجر اور مغرب کی نمازوں کو مسنون و مستحب اوقات میں ادا کرانے کی مقتضی تھی، اس ضابطۂ متداولہ میں کچھ ترمیم کی۔ اور حکم دیا کہ صبح اور شام کے گجر تو حسب دستور بجتے رہیں مگر دن اور رات کی گھڑیوں کے پیمانوں کی تعدیل کر دی جائے اور ڈیڑھ گھڑی طلوع آفتاب سے قبل اور آدھی گھڑی غروب آفتاب کے بعد جو اہل تنجیم (ہیئت دانوں) کے نزدیک رات میں داخل ہیں، انھیں رات کی گھڑیوں سے کم کر کے دن کی گھڑیوں میں بڑھا دیا جائے، چنانچہ لاہور کا

---

[1] عمل صالح جلد اول صفحہ ۳۸۸، [2] ایضاً جلد دوم صفحہ ۳۸۸،

ریاضی باوجود مناسبت طبیعی و موافقت طالعی بتوفیق الٰہی ریاضت تمام کشیدہ بود...... کتاب زیج شاہجہانی کہ از توجہ حضرت صاحبقرانی در اہتمام دستور اعظم آصف جاہی بہمراہی برادر خود ملا طیب و سایر ریاضی دانان روش ہند و یونان باتمام رسانیدہ بود از نظر انور شاہنشاہ عالم دوم نیز اعظم گذرانیدہ و حسن سعی او بمحل تحسین و احسان و بتوقیع قبول و استحسان وصول یافت۔"[1]

اس کتاب کے آگے "زیج الغ بیگ" بھی ماند پڑ کر رہ گئی اور اہل علم نے اپنی تقویموں کی تیاری میں اسی پر اعتماد کرنا شروع کر دیا۔ کتاب کی افادیت اپنی جگہ، مگر اس علم سے بادشاہ شاہجہاں کی دلچسپی کا عالم یہ تھا کہ اس نے اس کتاب کے ہندی زبان میں ترجمہ کرنے کا حکم صادر فرمایا، محمد صالح آگے چل کر لکھتا ہے:-

"چوں اصول و ابواب ایں کتاب حسابی متضمن فوائد بے شمار و منافع بے حساب بود...... چنانچہ بالفعل اہل ایں فن از زیج الغ بیگی مستغنی شدہ استخراج تقادیم ازیں کرامت نامہ نامی می نمایند حسب الامر اقدس بقصد تعمیم نفع آں و سہولت تفہم و تفہیم و تعلم و تعلیم منجمان ہندی زبان رصد بنداں اقلیدس کشائے درجہ پیمایان دقیقہ رس عبارت آنرا بلغت ہندی ترجمہ نمودند۔"[2]

بادشاہ کو ان امور سے اتنی دلچسپی تھی کہ دکن اور بلخ کی مسلسل جنگوں کے باوجود وہ ان کے لئے وقت نکال لیا کرتا تھا، چنانچہ اس نے ۱۰ ویں سال جلوس (۱۰۵۲ھ)

---

[1] عمل صالح جلد اول صفحہ ۳۶۱ ، [2] ایضاً ۳۶۲ ،

داده بودند وچند جا محل رصد خیال فرموده بودند[1] مگر ابھی طلوع زہرا کے منظر" ہی میں قلعہ کی چھت پر چڑھ رہا تھا کہ پیام اجل آگیا، ان کے جانشین اکبر کو ان علوم سے بہت زیادہ دلچسپی تھی اور اگر امیر فتح اللہ شیرازی زندہ رہتے تو یہ منصوبہ عمل میں آجاتا، مگر ان کی موت (۹۹۷ھ) نے اسکے امکان کو معدوم کردیا امیر فتح اللہ کے شاگرد ملا حسن علی موصلی کے ساتھ استادی و شاگردی کا رشتہ ہونے کے باوجود ابوالفضل کا رویہ بڑا اہانت آمیز تھا[2] اس لئے انھوں نے اپنی عافیت ملک کے چھوڑنے ہی میں سمجھی اور رصدگاہ تعمیر نہ ہوسکی، مگر اس کی ضرورت کا احساس مغل تاجداروں میں باپ سے بیٹے کو ورثہ میں ملتا رہا۔

بادشاہ کی اسی رغبت کی بنا پر ملا محمود جونپوری دہلی تشریف لے گئے، اور بادشاہ کو قیام رصدگاہ پر آمادہ کرلیا مگر اسی زمانہ میں بلخ کی مہم کی تیاری زور شور پر تھی اسلئے وزیر کو بادشاہ کے اس علمی و حکمی کارنامہ کو انجام دینے سے باز رکھنے کا بہانہ ہاتھ آگیا۔[3]

اب یا تو یہ حکمراں وقت کی ذاتی رغبت اور خاندانی میلانات کے زیر اثر "الناس علی دین ملوکہم" کے ہمہ گیر قانون کی کارفرمائی کا نتیجہ تھا یا پھر زمانہ کا مذاق و رجحان ہی اس بات کا مقتضی تھا کہ اس عہد کے اکثر و بیشتر علماء علوم متداولہ کے ساتھ ریاضی و ہیئت میں دخل رکھتے تھے، ان "اکثر و بیشتر" علماء میں ملا محمود جونپوری اور ملا فرید منجم کے علاوہ علامہ سعد اللہ علامی تھے جنہوں نے اپنی غیر معمولی دانش و بینش، علم و فضل کا روانی اسپ منصبی سے عہد شاہجہانی ہی میں منصب ارجمند خانساماں و خطاب "فاضل خانی" حاصل کرلیا تھا، اور شاہجہاں کے جانشین عالمگیر اورنگ زیب کے عہد میں "بپایہ وزارت کل ہندوستان" اور منصب پنج ہزاری تک پہونچے محمد صالح نے ان کے علمی تبحر بالخصوص

---

[1] اکبرنامہ جلد اول صفحہ ۳۶۸ [2] منتخب التواریخ جلد سوم صفحہ ۱۳۶ [3] مآثر الکرام صفحہ ۲۰۲

طویل ترین دن ۳۰ گھڑی کا ہوگیا، اسی طرح دوسرے شہروں، آگرہ، دہلی، کشمیر، کابل اور دولت آباد (دیوگری) کے دن بھی بڑھ گئے، محمد صالح نے اس قانون کے تحت لکھا ہے:۔

"چوں دریں وقت ضابطۂ مذکورہ بہ پیشگاہ خاطر صواب ناظر خاقان جہاں ...... پرتو افگند و تفاوت گھڑیہا بہ فراز ظہور برآمد، از القائے ربانی و الہام آسمانی ضابطۂ دیگر کہ باعث ارتفاع تفاوت مقدار گھڑیہا و اختلاف پیمانہ و موجب تشخیص وقت نماز فجر و مغرب بروفق سنت سنیہ باشد بادشاہ دیں پناہ مقرر فرمودند کہ وقت نواختن گجر صبح و شام را بدستوری کہ گذارش یافت بحال داشتہ پیمانہ گھڑیہائے لیل و نہار مساوی المقدار گردانیدند و یک و نیم گھڑی پیش از طلوع آفتاب و نیم گھڑی بعد از غروب کہ نزد اہل تنجیم داخل شب است از عدد گھڑیہائے شب کم نمودہ بہ گھڑیہائے روز افزودند، چنانچہ روز اطول اکبرآبادی و سی و شش و شاہجہان آبادی و سی و شش و نیم و دارالسلطنت لاہوری و ہفت گھڑی و کابلی سی و ہشت و نیم گھڑی و کشمیری و ہشت گھڑی و در بلدۂ دولت آبادی و پنج گھڑی قرار یافت۔"

(عمل صالح جلد دوم صفحہ ۳۰۰)

ملا فرید نے "زیج شاہجہانی" مرتب کی تھی۔ مگر عملی طور پر ان کا اعتماد رصد گاہ الغ بیگ کے تحقیقی مشاہدات اور دریافتوں پر تھا، حضرت ہمایوں کے زمانہ سے ایک نئی رصد گاہ قائم کرنے کی محسوس کی جا رہی تھی، ابوالفضل نے بادشاہ ہمایوں کے بارے میں لکھا ہے:۔

"آنحضرت را ارادہ بستن رصد مصمم بود و بسیارے از آلات رصدی ترتیب

کسی فاضل کو نہ ہوئی، اور ہوئی تو ملا محمود جونپوری کو ہوئی، مگر

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

وزیر کی دراندازی نے ساری تجویز چوپٹ کر دی[1]، ورنہ شاید رصدگاہ مراغہ اور رصد گاہ سمرقند سے بھی عظیم الشان رصدگاہ ہندوستان میں قائم ہو جاتی، اور رصدگاہ محمد شاہی کی ضرورت باقی نہ رہتی۔

مگر فلسفہ "ماقبل الطبیعیات وما بعد الطبیعیات" کے مسائل کی شرح وایضاح میں غیر معمولی مشغولیت کی بنا پر اس عبقری روزگار کی ہیئتی صلاحیتیں منظر عام پر نہ آسکیں یوں بھی "شمس بازغہ" کی شہرت نے ان کی دیگر بلند پایہ تصانیف کو گوشۂ گمنامی میں ڈال دیا۔ چنانچہ آزاد بلگرامی نے ان کی صرف دو ہی کتابوں کا ذکر کیا ہے:۔

"شمس بازغہ در حکمت وفرائد در فن بلاغت" اگرچہ یہ بھی فرماتے ہیں "کمیت قلم در میدان تصنیف جولاں دارد"[2]

ظاہر ہے کہ ان کے "کمیت قلم کی جولانی کا میدان تصنیف" صرف دو کتابوں میں محدود نہ ہوگا، اسی لئے مولانا عبدالحئی فرنگی محلی نے فاضل جونپوری کے ترجمہ میں لکھا ہے:۔

"ومن تصانیفہ مالم یطلع آزاد: الدحۃ الیادۃ فی الصورۃ والمادہ ورسالہ فی الکلی والجزئی ورسالہ فی تحقیق اجتماع النقیضین وارتفاعہما ورسالہ فارسیہ فی تحقیق القضاء والقدر ورسالہ فی وحدۃ	انکی وہ تصانیف جن سے آزاد بلگرامی واقف نہیں تھے حسب ذیل ہیں:۔ الدحۃ الیادۃ فی الصورۃ والمادہ، رسالہ فی الکلی والجزئی، رسالہ فی تحقیق اجتماع النقیضین وارتفاعہما، فارسی رسالہ در تحقیق قضاء وقدر، رسالہ

[1] مآثر الکرام ص ۲۰۲، [2] ایضاً،

ریاضی و ہیئت میں ان کی دستگاہ کے بارے میں لکھا ہے :۔

"در فنون حکمت مہارتے تمام داشت ۔۔۔ در حساب و جبر و مقابلہ، ہیچ یکے با او یارائے مقابلہ نداشت و در ہیئت و ہندسہ کسے را با او نیروئے مقابلہ نبود و در فنون دانش و بینش مرتبۂ معلم ثالث بل رتبۂ عقل اول بہم رسانیدہ بود"

(عمل صالح جلد دوم صفحہ ۳۰۷)

علی مردان خاں نے خزانۂ عامرہ کا ڈیڑھ لاکھ روپیہ خرچ کرنے کے بعد بھی دریائے راوی سے نہر نکالنے میں کامیابی حاصل نہیں کی، مگر علاء الملک نے اس کے نقائص کی اصلاح کر دی، محمد صالح نے لکھا ہے،

"حسب الحکم اشرف جامع کمالات صوری و معنوی ملا علاء الملک تونی کہ از آب ترازو و علوم غریبہ وقوف تمام دارد تا پنج کروہ نہر آوردۂ علی مردان خاں را بحال واگذاشتہ سی و دو کروہ راہ نو بر نمودہ آب را آخر آورد چنانچہ از سال شانزدہم جلوس تا حال کہ سال بیستم است آب را آخر بے فتور بباغ می رسید"

(عمل صالح جلد دوم صفحہ ۳۱۲)

ملا علاء الملک کو صناعت تنجیم میں خصوصیت سے مہارت تامہ حاصل تھی، محمد صالح کہتے ہیں :۔

"جامع فضائل صوری و معنوی ملا علاء الملک تونی میر سامان کہ در صناعت تنجیم صاحب خبرۂ و مہارت کلی بودہ و در دقائق این فن ذو فنون درجہ علیا و ید طولیٰ داشتند"

(ایضاً صفحہ ۴۹۲)

مگر اسی مہارت کے باوجود علاء الملک ہوں یا فرید منجم رصد بندی کی جرأت

"طبقات شاہجہانی" نے انھیں عہد جہانگیر کے علماء میں محسوب کیا ہے۔ غالباً ان کا رسالہ "تشریح الافلاک" جلد ہی ایران کے علاوہ ہندوستان میں بھی مقبول ہوگیا، اور ۱۰۸۰ھ میں ملا عصمت اللہ سہارنپوری نے "باب تشریح الافلاک" کے نام سے اس کی شرح لکھی جو آج سے کوئی نصف صدی پیشتر تک عربی مدارس میں "تصریح" و "شرح چغمینی" کے علاوہ لائق اعتنا سمجھی جاتی تھی، مگر یہ کتاب فاضل جونپوری کی وفات کے بعد تصنیف ہوئی، لہٰذا اس کے بھی ان کے پیش نظر ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا، البتہ اس کا متن ان کے زمانہ میں تصنیف ہو چکا تھا، اور شاید ہندوستان میں متعارف بھی ہوگیا ہوگا، مگر حرارت شاہجہانی کی بنا پر ان کی نظر میں اس کے درخور اعتنا ہونے کا امکان نہیں ہے۔

شرح چغمینی کا متن ساتویں صدی ہجری کے ایک فاضل وقت محمود بن محمد بن عمر الجغمینی کی تصنیف ہے۔ "شرح چغمینی" بجائے خود ایک عظیم ریاضی داں و ماہر علم الہیئت قاضی زادہ رومی کی تصنیف ہے جو اپنے استاد میر سید شریف کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے، اور غیاث الدین جمشید کاشی کی وفات کے بعد رصدگاہ الغ بیگ کے منتظم اعلیٰ رہے تھے، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو گیارہویں صدی ہجری کے نصف اول میں کم از کم یورپ تک اس کتاب کا رواج نہ تھا یا ملا محمود ہی نے اسے قابل اعتنا نہیں سمجھا، "شمس بازغہ" سے تو ایسا ہی اندازہ ہوتا ہے، انھوں نے اس میں جن کتابوں کا اہتمام سے ذکر کیا ہے وہ ہیں: "شروح تذکرہ" اور "کتاب المجسطی"۔

اول الذکر کا حوالہ انھوں نے "افلاک جزئیہ" کی تعداد کے سلسلے میں دیا ہے مگر اس کی تصریح سے پیشتر بطلیموسی نظام ہیئت پر بالخصوص جس طرح وہ متاخر مسلمان

الوجود وغیر ذلک[1] فی وحدۃ الوجود، وغیرہ۔

اس "وغیر ذلک" سے خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ فہرست بھی مکمل نہیں ہے، اور اس کی کچھ اور کتابیں بھی ہیں، جو شمس بازغہ، کی وجہ سے شہرت نہ پاسکیں، ممکن ہے انہیں ریاضی و ہیئت کے بھی کچھ رسائل ہوں، لیکن جب تک یہ "رسائل" سامنے نہیں آتے نہ تو ان کے موضوع کے متعلق کچھ کہا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس کی بنیاد پر ان کی ریاضیاتی ذہنی صلاحیتوں پر کوئی تبصرہ کیا جاسکتا ہے،

پھر بھی "شمس بازغہ" میں ان کے جستہ جستہ افادات سے اس فن کے اندر ان کی بالغ النظری کا اندازہ ہو سکتا ہے،

مثلاً کائنات کی تشکیل (ہیئت افلاک وکواکب) اور اجرام سماوی کی گردش وحرکت کا مسئلہ قدیم علم الہیئت کا ایک اہم بالشان موضوع تھا، لیکن جس نہج سے ملا محمود جونپوری نے "شمس بازغہ" میں اس کی توضیح کی ہے وہ ایک انفرادی شان رکھتا ہے، کم از کم علم الہیئت کی متداول کتابوں میں یہ انداز توضیح نہیں ملتا۔

آجکل عربی مدارس کے نصاب میں علم ہیئت کی دو کتابیں داخل درس ہیں، امام الدین ریاضی کی "التصریح فی الہیئۃ" اور [illegible] قاضی زادہ رومی کی "شرح چغمینی" اول الذکر شیخ بہاء الدین عاملی کے ایک متن "تشریح الافلاک" کی شرح ہے، شارح امام الدین ریاضی فاضل جونپوری سے بہت زیادہ متاخر ہیں، اس لئے مؤخر الذکر کے زمانہ میں "تصریح" کے رواج کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، البتہ ماتن شیخ بہاء الدین عاملی، جو میر باقر داماد کے ہم عصر تھے، ملا محمود جونپوری کے معاصر متقدم تھے، صاحب

---

[1] شمس بازغہ ص ۱۰۰، مطبوعہ جید برقی پریس دہلی ۱۳۵۲ھ،

ملا محمود کے معاصر مقدم شیخ بہاء الدین عاملی نے عام ہیئت دانوں کا نظریہ لکھدیا ہے کہ

"العالم الجسمانی کرۃ منضدۃ من ثلث عشرۃ کرۃ متلاصقۃ اعلاہا الفلک الاطلس وہو کاسمہ غیر مکوکب ثم فلک الثوابت وکلہا مرکوزۃ فی ثخنہ بحیث یماس سطح اعظمہا سطحیہ المحدب والمقعر ثم السموات السبع للسیارات السبع المشہورۃ"

(التصریح فی الہیئۃ ص ۴-۵)

عالم جسمانی کرہ دی الہیئت ہے جو ایک تہ سے ملاصق (چپکے ہوئے) تیرہ کروں سے مرتب ہوا ہے، انہیں سب سے اوپر فلک اطلس ہے جو فلک اپنے نام کی طرح ستاروں سے خالی ہے پھر ثوابت ہے، اور جملہ کواکب ثابتہ اس کے ثخن میں اسطرح جڑے ہوئے ہیں کہ انہیں سے عظیم ترین ستارے کی سطح اس کی (فلک ثوابت کی) سطح محدب اور سطح مقعر دونوں کی مماس ہوتی ہے، پھر سات آسمان ہیں جو مشہور سیارات ہفتگانہ کے واسطے ہیں۔

متاخرین میں امام الدین ریاضی نے لکھا ہے:-

"ہذا جار علی مذاق الحکماء القائلین بالتسع ولیس لہم علی ذلک برہان"

(التصریح ص ۶۶)

(یہ بات، ان حکماء کے مذاق کے مطابق ہے جو نو افلاک کے قائل ہیں مگر اس خیال کے واسطے ان کے پاس کوئی دلیل و برہان نہیں ہے)

اس "مذاق حکماء" کی تقلید میں عوام کے اندر بھی آسمانوں کی تعداد نو ہی قرار پائی اور اس بات نے جلد ہی ایک حقیقت مسلّمہ کی شکل اختیار کرلی۔ چنانچہ ظہیر فاریابی اپنے ممدوح قزل ارسلان کی تعریف میں لکھتا ہے:-

ہیئت دانوں میں سمجھا جاتا تھا، ایک طائرانہ نظر ڈال لینا مستحسن ہوگا، اس کے لئے ہمیں آج کل ہی کی متداول ہیئت کی درسی کتابوں کو پیش نظر رکھنا ہے،

قاضی زادہ رومی نے ماتن (بلکہ جمہور ماہرین علم الہیئت و فلکیات) کے اتباع میں بتایا ہے کہ مرکز عالم میں کرۂ زمین واقع ہے، اس پر کرہ آب، اسی پر کرہ ہوا، اور کرہ ہوا پر کرہ نار محیط ہے، کرۂ نار کو فلک قمر احاطہ کئے ہوئے ہے، اسے فلک عطارد، اس پر فلک زہرہ، اس پر فلک شمس، اسے فلک مریخ، اسے فلک مشتری اور اسے فلک زحل محیط ہے، فلک زحل پر کواکب ثابتہ کا کرہ ہے اور سب کے آخر میں فلک اطلس ہے، اس طرح فلک قمر کے جوف میں عناصر اربعہ کے کرات ہیں اور کرہ نار کے اوپر افلاک تہگانہ توبتو متلاصق انداز میں محیط ہیں۔

اس ضمن میں دو باتیں: ان افلاک کی تعداد اور ان کی ترتیب قابل غور ہیں، سوال یہ ہے کہ ان دونوں باتوں کی دلیل کیا ہے۔

افلاک کلیہ کی تعداد کے بارے میں قاضی زادہ رومی نے لکھا ہے:-

"والوجہ فی کونہا تسعۃ انہم وجدوا تسعۃ حرکات متخالفۃ فاثبتوا لکل منہا فلکا فی بادی نظرہم لا انہم وجدوا فی بادی النظر تسع حرکات مختلفۃ فاثبتوا تسع افلاک اذ فی وجدان حرکۃ الثوابت فی بادی النظر نظر"

(شرح چغمینی صفحہ ۲۲)

آسمانوں کے نو ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ماہرین علم الہیئت نے (انکے اندر) نو باہمدگر مختلف حرکتیں پائیں لہذا بادی النظر میں ہر ایک کے لئے ایک مستقل فلک ثابت کیا، یہ وجہ نہیں تھی کہ انھوں نے بادی النظر میں نو مختلف حرکتیں پائی ہوں اور اس بنیاد پر نو افلاک ثابت کئے ہوں کیونکہ بادی النظر میں ثوابت کے اندر کسی حرکت کا پایا جانا محل کلام اور مختلف فیہ مسئلہ ہے

"فاما ان یکون افلاکہا ایضاً متحرکۃ من المشرق الی المغرب من غیر ان یتحرک بالحرکۃ الاولی بل بحرکۃ ناقصۃ فی السرعۃ منہا بقدر ما یتخلف عنہا کما توہمہ بعض الاوائل وجری علیہ بعض المنتمین الی الحکمۃ فی الاسلام او ان تکون متحرکۃ من المغرب نحو المشرق مع تحرکہا بالعرض بالحرکۃ الاولی فیکون المحسوس من التخلف ہو فضل الاولی علی ہذہ الحرکات"

(شمس بازغہ صفحہ ۱۴۳)

اب یا تو ان کے (ان حرکات سے وابستہ) افلاک بھی مشرق سے مغرب کی جانب حرکت کرتے ہوں بغیر اس بات کہ حرکت اولیٰ کے ساتھ متحرک ہوں بلکہ ایک کمتر سریع حرکت کیساتھ جو اپنی تیزی میں کچھ ناقص ہو اور اسکی مقدار اس کمی کے برابر ہوتی ہے جتنا کہ وہ اس (حرکت اولیٰ) سے پیچھے رہ جاتے ہیں جیسا کہ بعض قدماء فلکیین کا خیال تھا یا جیسا کہ عہد اسلام میں بعض ایسے لوگوں کا خیال تھا جو اپنی حکمت و دانائی کیطرف نسبت کرتے تھے، یا پھر مغرب سے مشرق کی جانب حرکت کرتے ہوں معہذا حرکت اولیٰ کے ساتھ بھی گردش کرتے ہوں۔ لہذا ان کے حرکت اولیٰ سے پیچھے رہ جانے کی مقدار اتنی محسوس ہوتی ہو جو حرکت اولیٰ اور ان (کواکب سیارہ) کی حرکات کے فرق کے برابر ہو۔

اس کے بعد ان دونوں نظریوں پر تنقید کی ہے اور خالی از سقم نظریہ کو متعین کیا ہے۔

"والاول باطل والالحفظ کل منہما مطلقاً" اس میں سے پہلی شق باطل ہے ورنہ ہر سیارہ

نُہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیر پائے تا بوسہ بر رکابِ قزل ارسلاں دہد

اور ظہیر کی اس مبالغہ آرائی پر طنز کرتے ہوئے شیخ سعدی فرماتے ہیں:۔

چہ حاجت کہ نہ کرسیِ آسماں نہی زیر پائے قزل ارسلاں

ان تصریحات کے مقابلے میں ملا محمود کی توجیہ ہے، انھوں نے پہلے تو ایک عام فلکیاتی مشاہدہ کی دعوت دی ہے:۔

"واعلم ان ہذہ الاجرام النیرۃ لاسیما الثابتۃ نجدہا فی بادی الرائے متحرکۃ من المشرق نحو المغرب بحرکۃ سریعۃ جداً یتم الدورۃ فی قریب من یوم بلیلۃ ثم نجد السیارات بقلیل من التدقیق مختلفا عن ہذہ الحرکۃ با قدار متخالفۃ فیما بینہا فیکون لکل منہا فلک غیر الفلک المتحرک بالسریعۃ"۔

(شمس بازغہ صفحہ ۱۴۳)

جاننا چاہئے کہ یہ روشن و درخشاں اجرام بالخصوص وہ جو ثوابت کے نام سے موسوم ہیں ہم انھیں بادی النظر میں مشرق سے مغرب کی جانب بڑی تیزی سے حرکت کرتے ہوئے پاتے ہیں اور اُنکا دورہ تقریباً ایک دن رات میں مکمل ہو جاتا ہے، پھر ہم ذرا غائر نظر سے دیکھنے کے بعد کواکب سیارہ کو بھی مذکورالصدر حرکت سے مختلف اور پچھڑے ہوا پاتے ہیں اور یہ اختلافات بھی آپس میں مختلف ہوتے ہیں۔ پس ان میں سے ہر ایک حرکت کیلئے لامحالہ ایک مستقل فلک ہوگا جو اس فلک سے بالکل مغائر اور جداگانہ جو انتہائی تیز حرکت (حرکت یومیہ) سے چکر لگاتا ہے۔

پھر ان متخالفۃ المقدار حرکتوں کی توجیہ کے لئے دو نظریے پیش کئے ہیں:۔

بالحرکۃ الاولیٰ من المشرق الی المغرب ویحرک الکل و بالحری ان یکون محیطاً بالکل وحدۃ الجہات حافظاً بحرکتہ السریعۃ جداً للزمان، وثمانیۃ تتحرک من المغرب الی المشرق، واحداً منہا للثوابت وسبعۃ للسیارات السبع"

(ان کا باہمی فاصلہ غیر متبدل رہتا ہے) تو انھوں نے (قدیم ہیئت دانوں نے) ان (کواکب ثابتہ) کے لئے ایک مستقل فلک ثابت کیا جو مغرب سے مشرق کی طرف گردش کرتا ہے جیسا کہ کواکب سیارہ کے سلسلے میں اوپر گذرا۔ اس طرح نو آسمان ثابت ہوئے ان میں سے ایک حرکت اولیٰ کے ساتھ مشرق سے مغرب کی جانب چکر لگاتا ہے اور جملہ (افلاک) کو حرکت دیتا ہے۔ لہذا چاہیئے کہ وہ سب کو محیط ہو اور محدد جہات ہو اور نیز اپنی سریع حرکت سے زمانہ کا حافظ ہو اور آٹھ افلاک مغرب سے مشرق کی طرف گردش کرتے ہیں۔

(شمس بازغہ صفحہ ۱۴۳)

غرض افلاک کلیہ کی تعداد جمہور فلاسفہ ومنجمین کے نزدیک نو[9] ہے۔ لیکن مسلمان ماہرین علم الہیئت و فلکیات میں ایسی شخصیتوں کی کمی نہیں تھی جو اپنے یونانی پیشرووں کی آنکھ بند کر کے تقلید کرنا نہیں چاہتے تھے انھوں نے کہا کہ ہیئتی حسابات (Astronomical calculations) کے لئے نویں آسمان کے فرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ افلاک نہگانہ کے نظریات پر کوئی نا... تر بد حسی دلیل تو قائم ہے نہیں، صرف حرکات تسعہ کے تخالف کی بنا پر یہ نظریہ وضع کیا گیا تھا، لیکن حرکات تسعہ کے تخالف کی توجیہ

واحداً ومغرباً كذلك ولم يختلف غاية الارتفاع كل في الفصول والايام فتعين الثاني۔"
(شمس بازغہ صفحہ ۱۴۳)

کی جائے طلوع ایک ہی رہتی اور اسی طرح جائے غروب بھی ایک ہی رہتی اور مختلف فصلوں یا دنوں میں ہر ایک سیارے کی غایت ارتفاع نہ بدلا کرتی۔

اس کے ساتھ یہ امر بھی ضروری ہے کہ ان کواکب سیارہ کی حرکت فلک الکل کی حرکت سے مختلف جہات میں ہو فرماتے ہیں:۔

"ويكون هذه الحركات على مناطق واقطاب غير منطقة الاولى وقطبيها"
(شمس بازغہ صفحہ ۱۴۳)

اور سیاروں کی یہ حرکتیں ایسے مناطق اور قطبوں پر ہوتی ہیں جو حرکت اولی کے منطقہ اور اس کے قطبوں سے مختلف ہیں۔

لیکن اس طرح آٹھ آسمانوں کے ثبوت کی گنجائش نکلتی ہے، حالانکہ حکماء کے مذاق کے مطابق ان کی تعداد نو ہے، اس لئے وہ ایک دقیق تر مشاہدہ کی دعوت دیتے ہیں جو کواکب ثابتہ کی حرکت کا مثبت ہے:۔

"ثم انهم وجدوا الثوابت بدقيق النظر تتخلف في مدة طويلة قدراً يسيراً جداً عما يقتضيه الحركة الاولى ولى يحفظ ابعادها بالنسبة الى منطقتها وقطبيها لكنها لا تتخالف فيما بينها. فاثبتوا لها ايضاً فلكاً آخر يتحرك من المغرب الى المشرق بمثل ما مر في السيارات فثبت تسعة افلاك: واحد منها يتحرك

پھر جب انھوں نے بنظر دقیق دیکھا تو معلوم کیا کہ کواکب ثابتہ بھی مدت طویل کے بعد اس حرکت کے مقابلہ میں جو حرکت اولی کا مقتضی ہے کچھ تھوڑے سے پیچھے رہ جاتے ہیں اور اس کے منطقہ اور قطبوں کے لحاظ سے اپنی دوری کو برقرار نہیں رکھ پاتے لیکن باہم آپس میں ایک دوسرے سے نہیں بچھڑتے،

مولانا محمد علیؒ کی یاد میں

از سید صباح الدین عبد الرحمن

(۹)

باجہ اور قربانی کا جھگڑا متحدہ قومیت پر نظری بحث تو دونوں کے حلقوں میں جاری تھی، لیکن عملی طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں مسجد کے سامنے باجہ اور گائے کی قربانی کے موقع پر جھگڑے کی وجہ سے جو روز بروز اختلاف بڑھتا جارہا تھا، ہر قسم کی مصالحانہ کوشش بے سود ہو رہی تھی، مولانا محمد علی اپنی پوری قوت سے اس کے لئے کوشاں تھے، ۲۵ نومبر ۱۹۲۶ء کے اخبار ہمدرد میں انھوں نے یہ مشورہ دیا،

"ہندو آزاد ہوں کہ جس وقت چاہیں اور جب تک چاہیں مسجد کے سامنے ڈھول اور تاشے پیٹا کریں اور سنکھ اور قرنا پھونکا کریں، ساتھ ہی ساتھ مسلمان بھی آزاد ہوں کہ جتنی گائیں جس طرح مناسب سمجھیں جس سڑک سے جہاں چاہیں لیجائیں، ان کا گوشت چاہے ڈھکا لیجائیں چاہے کھلا لیجائیں، کوئی کسی کا مزاحم نہ ہو، چند دنوں میں دونوں ملتیں ایک دوسرے کی ضد پر اپنے مذہبی فرائض کا ادا کرنا چھوڑ دیں گی، اور شرافت اور بھلمنسی کی طرف عود کر آئیں گی اور حقیقی رواداری کو اپنا شعار بنائیں گی، اسی سلسلہ میں انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ آج دونوں طرف سے ضد کا مظاہرہ ہو رہا ہے اور خواہ مخواہ مذہب کو اس میں گھسیٹا جا رہا ہے، ہندو مسلمانوں کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں اور مسلمان ہندوؤں کو، حکومت اس تماشہ کو دیکھ رہی ہے اور خود آج کسی سے مرعوب نہیں اور دونوں کو مرعوب کئے ہوئے ہے، یہ ایک سیاسی جنگ ہے، میں نہ اس کو گوارا کر سکتا ہوں کہ مسلمان ہندوؤں سے مرعوب ہو جائیں، نہ اسکو چاہ سکتا ہوں کہ ہندو مظلوم ہوں!!"

ہندو مسلمانوں کے تعلقات کی کشیدگی اور لڑائی جھگڑے کے سلسلہ میں جو کچھ ہوتا ہے اس کی ابتدا کہاں سے شروع

اس نظریہ کے علاوہ اور مفروضات سے بھی ہوسکتی ہے، چنانچہ تیسری صدی ہجری کے وسط میں بنو موسیٰ نے یہ جرأت مندانہ قدم اٹھایا اور نویں آسمان کے وجود سے انکار کیا۔ ابن القفطی نے ان کی ایک تصنیف کا ذکر کیا ہے جس کا عنوان

"کتاب فی انکار ان ثم کرۃ تاسعۃ الافلاک"[1]

ہے۔ اس کتاب کے اندر انھوں نے اپنے اختلاف کی توجیہ طبیعیاتی و مابعد الطبیعیاتی اصولوں پر نہیں کی، بلکہ ریاضی و ہندسہ کی مدد سے اپنے موقف کو ثابت کرنے کی کوشش کی چنانچہ ابن الندیم اسی کتاب کا نام وضاحت کے ساتھ:

"کتاب بین فیہ بطریق تعلیمی و مذہب ہندسی اندلیس فی خارج کرۃ الکواکب الثابتۃ کرۃ تاسعۃ"[2]

بتاتا ہے یعنی فلک البروج یا فلک الثوابت (آٹھویں آسمان) کے اوپر نواں آسمان نہیں ہے اس کا ثبوت بذریعہ ریاضی و ہندسہ۔

(باقی)

---

[1] ابن القفطی تاریخ الحکماء ص ۳۱۶ [2] ابن الندیم کتاب الفہرست ص ۲۷۹،

سکا ہوں، اس دلیری کا جس کی بدولت انسان ایک اعلیٰ مقصد کے لئے مرتے دم تک جسمانی مصیبتیں برداشت کرتا ہے میرے خیال میں اور لوگ بھی اس کی اتنی ہی قدر کرتے ہیں، سوامی شردھانند میں یہ دلیری انتہا کو پہنچ گئی تھی، ان کا لانبا قد، گیروے کپڑوں میں لپٹا ہوا شاندار جسم، بڑھاپے کے باوجود تن کر چلنا، آنکھوں سے شرارے نکلنا، دوسروں کی کمزوری دیکھ کر تیوری پر بل آجانا، یہ تصویر میری آنکھوں میں پھر رہی ہے، اور دل پر نقش ہے'' (جلد اوّل ص ۲۷۰-۲۷۱)

اس سانحہ کے بعد مسلمانوں کو خوف رہا کہ اس جان کا بدلہ مسلمانوں کے کسی لیڈر کی جان سے لیا جائیگا، اور مولانا محمد علی کی جان کا خطرہ لاحق ہو گیا لیکن وہ محفوظ رہے،

خواجہ حسن نظامی سے صحافی جنگ — اسی زمانہ میں مولانا محمد علی ایک ایسی صحافی جنگ پر اتر آئے جس سے ان کی سرگرمیاں خواہ مخواہ زائل ہوئیں، یہ جنگ خواجہ حسن نظامی سے تھی، خواجہ حسن نظامی کا ایک خط مورخہ ۲ اگست ۱۹۱۸ء مل گیا جس میں انھوں نے ہارڈنگ کے ضیاء الحق صاحب کو لکھا کہ میں نے نظام حیدرآباد کو پان اسلامزم کے جو سبق دیئے جاتے تھے اس کی باضابطہ اطلاع دہلی کے چیف کمشنر کو دیدی ہے، مولانا محمد علی کو دکھ ہوا، کہ خواجہ صاحب نے اس طرح ایک مسلمان فرمانروا کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی، انھوں نے یہ خط اپنے اخبار ہمدرد میں شائع کردیا، پھر تو دونوں طرف سے ایسی جنگ ہوئی کہ تمسخر و استہزاء کا کوئی دقیقہ باقی نہ رہا، مولانا محمد علی سیاسی لیڈر ہونے کے باوجود آج کل کے لیڈروں کی طرح ظاہر کچھ اور باطن کچھ اور ہونے کے فن سے واقف نہ تھے، جو کچھ ان کے دل میں ہوتا، وہی ان کی زبان پر بھی ہوتا، حق و صداقت کے لئے ان کی نیام سے تلوار ہمیشہ نکل پڑتی، اور وہ نتیجہ سے بے خبر ہو کر اس کو چلاتے رہتے،

مجاہدین ریف کیلئے دعائیں — اسی زمانہ میں یورپ میں تھوڑے دنوں کے لئے اس وقت بڑی سیاسی اور حربی ہل چل مچ گئی، جب ریف کے مجاہد غازی عبد الکریم کی قیادت میں اسپین اور فرانس

اور کہاں جاکر ختم ہوا، اس زمانہ میں عام خیال رہا کہ انگریز یہ جھگڑے اپنے مفاد کی خاطر کھڑا کرکے اپنی حکومت کو مستحکم بنانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں، اب انگریز ہندوستان سے جاچکے ہیں لیکن اس قسم کے جھگڑے اب بھی برابر ہوا کرتے ہیں، محض اس لئے کہ ہم نے ابھی تک حقیقی رواداری کو اپنا شعار نہیں بنایا ہے جس کی تمنا مولانا محمد علی کرتے تھے۔ لیکن ان کا محض داغ ہے کہ اللہ کو پیارے ہوگئے

سوامی شردھانند کا قتل ۱۹۲۶ء کے دسمبر کی آخری تاریخوں میں آریہ سماج کے مشہور لیڈر سوامی شردھانند کو ایک پنجابی قاضی عبدالرشید نامی نے قتل کر ڈالا، سوامی جی شدھی تحریک میں بہت آگے آگے تھے جس سے عام مسلمانوں میں بڑی بے چینی پھیلی ہوئی تھی جس کے بعد ایک صاحب نے ان پر ہاتھ صاف ہی کر دیا۔ ہندوؤں کو اس سے بڑا دکھ پہنچا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں اسکا ذکر اس طرح کیا ہے،

"۱۹۲۶ء کے آخر میں ایک بڑا اندوہناک حادثہ پیش آیا جس نے سارے ہندوستان میں ہلچل ڈال دی۔ اس سے روشن ہوگیا کہ فرقہ پرستی کے جوش میں ہم کتنی ذلیل سے ذلیل حرکت کرسکتے ہیں، سوامی شردھانند بستر علالت پر پڑے تھے، اور ایسی حالت میں ایک مذہبی دیوانے نے انھیں قتل کر دیا۔ ایسے شخص کو جو گورکھوں کی سنگینوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہوگیا تھا اور گولیوں کی بوچھاڑ میں بڑھتا چلا گیا ایسی موت نصیب ہوئی تھی۔ ابھی آٹھ سال پہلے آریہ سماجیوں کے اسی لیڈر نے جامع مسجد دہلی کے منبر پر کھڑے ہوکر ہندو مسلمانوں کے زبردست مجمع کو اتحاد اور آزادی وطن کا پیغام سنایا تھا، اور پورے مجمع نے ہندو مسلمان کی جے کے فلک شگاف نعروں سے اس کا خیر مقدم کیا تھا، باہر سڑکوں پر ایک دوسرے کے دوش بدوش اپنا خون بہا کر اس نعرے پر مہر توثیق لگا دی تھی، آج وہ خود اپنے ایک ہم وطن کے ہاتھوں مارا گیا، جو یقیناً یہ سمجھتا ہوگا کہ یہ ثواب کا کام ہے، اور اس کی بدولت جنت میں جائیگا۔ میں ہمیشہ سے جسمانی دلیری کا معترف

اس دعا کا پُر کیف منظر یہ تھا کہ جس وقت مولانا محمد علی خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں گڑگڑا رہے تھے، تو ان کے روتے روتے گھگھی بندھ گئی تھی، ان کے ساتھ مسجد میں ہزاروں کا مجمع تھا، زار و قطار رو رہا تھا، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ دعا، تو اس کی مصلحتوں کی وجہ سے قبول نہیں ہوئی لیکن یہ کتنی صداقت اور حقیقت سے پُر ہے اس دعا کو مانگے چھیالیس سال سے زیادہ گذر گئے لیکن دنیا کے تہذیبی اور تمدنی ترقی اور انسانی محبت کے دعوؤں کے باوجود شیطانی طاقت کے نشے کی سرشاری ابھی تک دیکھنے میں مصروف ہے آہنی آلات سے سطوت و جبروت کا سکہ ابھی تک بٹھایا جا رہا ہے، ابلیسی قوت کمزور اور ناتواں قوم کی گردن میں طرح طرح کے طوق لعنت ڈال رہی ہے اور انسان اپنی زبان حال سے اب بھی خدا سے فریاد کر رہا ہے، ع

دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

اور خود مسلمانوں کی بے زبانی اپنے خالق سے یہ کہہ رہی ہے،

کیونکر خس و خاشاک سے دب جائیں مسلماں ۔۔۔ مانا کہ تب و تاب نہیں اسکے شرر میں

مخلوط انتخاب کا مسئلہ ۱۹۲۷ء کے شروع میں ہندو مسلمانوں کے اتحاد کے لئے دہلی میں ایک آل پارٹیز کانفرنس کی گئی، یہ ناکام رہی، تو مولانا محمد علی نے یہ کوشش کی کہ مسلمان چند باتوں پر متفق ہو جائیں، تو ان کو کانگریس سے منوانے کی فکر کی جائے، چنانچہ ۲۰ راپریل ۱۹۲۷ء کو دہلی میں مسلمانوں کا ایک نمائندہ جلسہ ہوا، جس کی صدارت محمد علی جناح نے کی، اس میں یہ طے پایا کہ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے جدا صوبہ قرار دیا جائے، سرحد و بلوچستان میں اصلاحات جاری کی جائیں، سندھ، بلوچستان اور سرحد میں ہندوؤں کو وہی رعایت دی جائے جو ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کو دی جائے، پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت حقیقی نہیں ہے، بلکہ عددی تناسب کے لحاظ سے ان دونوں صوبوں

سے ٹکر لینے لگے، ان کو کچھ جنگی کامیابیاں بھی حاصل ہونے لگیں، اس سے تمام دنیا کے مسلمانوں کی نظریں ان کی طرف اٹھنے لگیں، مولانا محمد علی کا اسلامی اور ملی جذبہ بھی اس سلسلہ میں ابھرا چنانچہ جامع مسجد دہلی میں ایک جمعہ کو انھوں نے ان سرفروشوں کے لئے بہت ہی خضوع و خشوع سے بہت دیر تک دعائیں مانگیں، اس کے کچھ ٹکڑے یہ ہیں:

"خداوندا! یہ مٹھی بھر آدمی جو بے سرو سامانی مگر تیری نصرت فرمائیوں کے ساز و سامان کے ساتھ اسپین اور فرانس جیسی طاقتوں اور حکومتوں سے نبرد آزما ہیں تاکہ اسلام کا علم مغرب اقصیٰ کی سرزمین پر سرنگوں نہ ہونے پائے، اپنے خزانۂ غیب سے ان کی مدد فرما، کیونکہ بغیر تیری نصرت بخشی و نصرت فرمائی کے یہ بے سرو سامان مجاہد ایسی عظیم الشان سلطنتوں کا کیا مقابلہ کس طرح کر سکتے ہیں، جو اپنی شیطانی طاقت کے نشہ میں سرشار ہیں اور جن کو اپنے جہنمی آلات پر اس قدر گھمنڈ ہے کہ جہاں کہیں حق و صداقت کی روشنی نظر آتی ہے، چڑھ دوڑتے ہیں کہ اس کو گل کر دیں اور اپنی سطوت و جبروت کا سکہ بٹھائیں، اور جو اپنی ابلیسی قوت پر اس قدر مغرور ہیں کہ جس جگہ بھی کوئی کمزور اور ناتوان قوم بستی ہے یہ اس پر دھاوا بول دیتے ہیں، کہ جن گردنوں کو تو نے آزاد پیدا کیا ہے، ان میں اپنی غلامی کا طوق لعنت ڈال دیں، اور جن سروں اور پیشانیوں کو تو نے صرف اپنی بارگاہ کبریائی میں رگڑنے کے لئے بنایا ہے ان کو اپنی ناپاک چوکھٹوں پر رگڑوائیں، اے خدائے بے نیاز، اے وہ کہ تو نے اپنی قدرت کاملہ سے کمزوروں اور ناتوانوں کو طاقت و توانائی عطا فرما کر سرکش اور متمرد انسانوں کو شکست و ہزیمت کی ذلت و رسوائی دلوائی ہے، تیرے یہ ریفی بندے، جو بے سرو سامانی کے سوا کوئی ساز و سامان نہیں رکھتے بغیر تیری مدد کے فرانس و اسپین کے فراعنہ سے کس طرح سربر ہو سکتے ہیں۔"

(ہمدرد ۲۰ جنوری ۱۹۲۵ء)

(۱) بانیٔ اسلامؐ کی اہانت کی گئی۔ (۲) مسلمانوں کی توہین ہوئی (۳) بانیٔ اسلامؐ کے خلاف نفرت پھیلائی گئی۔ (۴) مسلمانوں کے مذہب کو قابلِ نفرت قرار دیا گیا۔ (۵) مسلمانوں کے جذبات مجروح کئے گئے، (۶) مسلمانوں کو ذلیل دکھایا گیا، لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ اس کتاب کے مصنف کو بری کر دیا گیا، تو اس کے لئے جسٹس دلیپ سنگھ قابلِ الزام نہیں ہو سکتے، بلکہ سارا الزام برطانوی حکومت کے ناقص قوانین پر آتا ہے، جن میں ترمیم کی ضرورت ہے اور انھوں نے قانون کا ایک ایسا مسودہ تیار کیا جس کی رو سے کوئی کسی نبی یا ولی یا مقدس بزرگ کی توہین کر کے کسی فرقہ کا دل دکھائے تو وہ قید اور جرمانے کی سزا کا مستحق سمجھا جائیگا، یہ مسودہ مرکزی اسمبلی میں قانون بنانے کے لئے پیش بھی کیا گیا، لیکن اس میں کچھ ایسی ترمیمیں ہوئیں کہ قانون پھر بھی ناقص رہا۔ اس سلسلہ میں مولانا محمد علی کا کارنامہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں جو اشتعال پیدا ہو رہا تھا اس سے شدید قسم کے ہندو مسلم فسادات کا احتمال پیدا ہو گیا تھا، لیکن مولانا محمد علی نے اس کا رخ موڑ دیا۔

ہندو مسلمانوں کے اتحاد کی کوشش

اس کے بعد فرقہ وارانہ فسادات پھر شروع ہو گئے، جن سے پورے ہندوستان کو دکھ تھا، مولانا شوکت علی کی کوشش سے پھر ایک اتحاد کانفرنس شملہ میں ۱۲ ستمبر سے ۲۲ ستمبر تک کی گئی، ڈاکٹر مونجے، مدن موہن مالوی، جے رام داس دولت رام، راجے گدادر ناتھ، دیوان سردول سنگھ کے ساتھ مولانا محمد علی، محمد علی جناح، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو بھی شریک ہوئے، محمد علی جناح نے اس کی صدارت کی، لیکن اس کانفرنس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا، اسی کے بعد کانگریس کے صدر سری نواس آئنگر نے کلکتہ میں ایک اتحاد کانفرنس بلائی جس میں

میں ان کی نشستیں محفوظ رکھی جائیں، مرکزی مجلس مقننہ میں مسلمانوں کی نمائندگی ۳۳ فی صدی ہو، اس میں کوئی ایسی قرارداد یا تحریک منظور نہ کی جائے، جس کی مخالفت کسی ایک قوم کے ۳/۴ ارکان کریں، اگر ان امور کا تصفیہ ہو جائے تو مسلمان مخلوط انتخاب کو منظور کر لیں،

مولانا محمد علی نے یہ تجویزیں کانگریس سے بھی منوا لیں، ان ہی کے اصرار سے محمد علی جناح نے کلکتہ کے اجلاس میں مسلم لیگ سے بھی منظور کرا لیں، اس وقت مخلوط انتخاب کو مسلمانوں سے منوانا کوئی معمولی بات نہ تھی، لیکن ان تجویزوں پر بحث شروع ہوئی تو یہ جھگڑا اٹھ گیا کہ اکثریت کے لئے کسی جگہ نشستیں متعین نہ رہیں، اس سے بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کی تھوڑی سی اکثریت خطرہ میں پڑ جاتی تھی، اسلئے مسلمان اس کے لئے راضی نہ ہوئے اور یہ تجویزیں کاغذ پر لکھی رہ گئیں،

رنگیلا رسول | جولائی ۱۹۲۷ء میں ایک عجیب جھگڑا اٹھ گیا، پنجاب کے راج پال نامی ایک مصنف نے رنگیلا رسول لکھ کر مسلمانوں میں بڑا اشتعال پیدا کر دیا، اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی اہانت آمیز تصویر پیش کی گئی تھی، مسلمانوں میں بڑی بیزاری اور برہمی پھیلی، راج پال کے خلاف پنجاب ہائی کورٹ میں مقدمہ کیا گیا، تو وہاں کے جسٹس دلیپ سنگھ نے اس کو سزا دینے کے بجائے رہا کر دیا، کیونکہ کسی قانون کے ماتحت وہ سزا کا مستحق نہ تھا، اب ہنگامہ جسٹس دلیپ کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا، جلسے ہوئے، جلوس نکلے، مسلمانوں نے اپنے کو قید و بند کے لئے پیش کیا، بڑی نازک صورت حال پیدا ہو گئی، مولانا محمد علی کو بھی اس سے بڑا دکھ ہوا اور انھوں نے بیانات دیئے، اور مضامین لکھے، کہ اس کتاب کی اشاعت سے (۱)

ہے کہ ہندو اس پر کیا کہیں گے، کانگریس والے کیا خیال کریں گے، خلافت والوں پر اس کا کیا اثر ہوگا،
مسلم لیگ اور ہندو مہاسبھا اور حکومت کے دل میں یہ کیا اثرات پیدا کریں گے، اور سب سے آخر میں
یہ کہ خدا کیا کہے گا، آج تقریر کرتے ہوئے بھی یہی حالت ہے، میں دشمنوں کے نرغہ میں ہوں
مگر میری تقریر آپ کو یا ہندوؤں کو یا حکومت کو خوش کرنے کے لئے نہیں، میری کوشش محض یہ
ہے کہ خدا راضی ہو، اور اسی پر بھروسہ رکھتے ہوئے، اپنے خیالات پیش کرتا ہوں، اس امر کا
لحاظ نہیں کرتا ہوں کہ آپ انھیں پسند کریں گے یا ناپسند، دعا کریں کہ خدا مجھے اس مقصد میں
کامیاب کرے۔

(۱) جب ہندو اور مسلمان متحدہ و مشترکہ طور پر غلامی کا طوق گردن سے اتار پھینکنے کی جد و جہد میں
مصروف تھے، اس وقت بعض خود غرض مسلمان ہم کو کہتے تھے کہ تم نے ہندوؤں کی غلامی قبول
کر لی ہے، تم گاندھی پرست ہو گئے، تم مسلمانوں کو برباد کر رہے ہو، اسی طرح بعض ہندو
بھی ایسے تھے جو مہاتما گاندھی کو متہم کرتے تھے کہ علی برادران کی رفاقت کر کے وہ ۲۲ کروڑ
ہندوؤں کو سات کروڑ مسلمانوں کا غلام بنا کر ان کا ستیاناس کر رہے ہیں، لیکن میں آپ سے سوال
کرتا ہوں کہ جس وقت محمد علی شوکت علی ڈاکٹر کچلو وغیرہ اسی تحریک کی وجہ سے جیل میں گئے
تھے تو تم میں سے کسی نے اس وقت کی فضا کی خرابی کی شکایت کی تھی، (مجمع سے نہیں نہیں کی آواز)
اچھا اگر نہیں تو تم ہی ایمان سے بتاؤ کہ اس میں میرا کیا قصور ہے

(۲) کانگریس کو انڈین نیشنل کانگریس فی الحقیقت مسلمانوں نے بنایا ہے، اس سے پہلے وہ
خوش وضع، عافیت پسندوں کی تقریر گاہ تھی، جو تیار کردہ تقریریں شاندار الفاظ میں
کرنے اور چند تجویزیں منظور کرانے کی خواہش سے سال میں ایک دفعہ جمع ہو کر نشستند
و گفتند و برخاستند کا نظارہ پیش کرتے تھے، مگر جس دن سے محمد علی و شوکت علی اس میں

یہ طے پایا کہ ہندو مسلمان رہنما ملک کا دورہ کر کے میل ملاپ کی فضا پیدا کریں، لیکن یہ فضا کچھ تو ضرور پیدا ہوئی، لیکن پھر ختم ہو گئی،

کانگریس اور مسلمان اس وقت تک کانگریس کی زبردست تنظیم گاؤں گاؤں تک پھیل رہی تھی، اور اس کی آواز گوشہ گوشہ میں گونج رہی تھی، گاندھی جی اس کی روح تھے، تو جواہر لال نہرو اس کے جسم تھے، کانگریس کی رہنمائی میں ہندوستان کی سیاست ایک نئی کروٹ بدل رہی تھی لیکن اس میں وہ جوش و خروش باقی نہیں، جو خلافت کانفرنس اور کانگریس نے مل کر ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء میں پیدا کیا تھا، ہندو مسلمانوں کے اختلافات بڑھ رہے تھے، اس سلسلہ میں یہ بحث اٹھ کھڑی ہوئی کہ کانگریس کی تنظیم اور اس کی جدوجہد میں مسلمانوں کا کیا حصہ ہے، ایک زمانہ تو ایسا تھا کہ گاندھی جی علی برادران کے مشورے کے بغیر کچھ بھی نہ کرتے لیکن بدلی ہوئی سیاسی فضا میں یہ بحث بھی چل نکلی کہ کانگریس کو ملک میں مقبول بنانے میں مسلمانوں کا بھی کوئی حصہ ہے بھی کہ نہیں، مولانا محمد علی اس سلسلہ میں کب خاموش رہ سکتے تھے، ستمبر ۱۹۲۷ء میں وہ پشاور گئے، وہاں ان کا ایسا شاندار استقبال ہوا کہ خود ان کو حیرت تھی، ان کا خود بیان ہے کہ ہندوستان بھر میں کسی اور جگہ ان کا استقبال اس گرمجوشی اور خوش سلیقگی سے نہیں کیا گیا، اس سے یہ ظاہر ہے کہ ان کی مقبولیت میں بھی کمی نہیں ہوئی تھی، گو وہ کانگریس سے دور ہو رہے تھے، یا خود کانگریس ان سے دور ہو رہی تھی، جیسا کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھا ہے، پھر بھی وہ اس وقت تک کانگریس کے ساتھ تھے، مگر بقول ان ہی کے وہ اپنے مخالفوں کے نرغہ میں تھے،، پشاور کے جلسہ کی تقریر میں مولانا محمد علی نے جہاں اور باتیں کہیں وہاں یہ بھی کہا۔

میں جب کبھی اپنے اخبار میں کچھ لکھتا ہوں، تو ہر لفظ کے انتخاب میں یہ خیال رکھنا پڑتا

میں لیبر پارٹی کی حکومت تھی، اُس کے وزیر اعظم ریمزے میکڈانلڈ تھے، اس کمیشن میں کسی ہندوستانی کو نہیں رکھا گیا، جس سے ہندوستان میں بڑی مخالفت ہوئی، اس کے بعد ہندوستانیوں کی اشک شوئی کے لئے کچھ ہندوستانیوں کو اس کی ذیلی کمیٹی میں نامزد کیا گیا، جو زیادہ تر [illegible] برطانوی حکومت کے حامی اور ان کی وفادار سمجھے جاتے تھے، اس کے صدر سر سنکرن نائر مقرر ہوئے، پھر بھی کمیشن کا پرزور مقاطعہ ہوا، اور جب یہ ہندوستان آیا تو "سائمن کمیشن گو بیک" کے نعروں سے پورا ملک گونج اٹھا، اور بقول پنڈت جواہر لال نہرو یہ تین الفاظ کمیشن والوں کو بھوت بن کر ستاتے رہے، مولانا محمد علی نے بھی مسلمانوں کی اکثریت کو اس کے بائیکاٹ پر آمادہ کیا، اور اپنے اخبار ہمدرد میں اس کے خلاف مسلسل مضامین لکھے، پہلے تو ہندوستان کی غلامی پر نوحہ اس طرح کیا،

"ہم ہندوستانی ساری دنیا کے انسانوں کا پانچواں حصہ ہیں، مگر غلام بن بیٹھے ہیں، ایک ایسی قوم کے جو تعداد میں خود ہمارا ساتواں آٹھواں حصہ ہے، اور ہم سے سات ہزار میل کے فاصلہ پر سات سمندر پار رہتی ہے، حقیقتاً تو ہم غلام ہیں، ان ساڑھے تین ہزار انگریزوں کے جو ہندوستان میں عمال حکومت ہیں، یا ان چالیس پینتالیس ہزار گوروں کے جو برطانیہ کی فوج میں داخل ہیں، اور ہم کو مرعوب کئے ہیں، بہرحال ہم غلام ہیں چالیس پینتالیس ہزار کے، ہم خدا کے دیئے ہوئے دل و دماغ کو کام میں لاکر منزل مقصود کی طرف بڑھنے کا فیصلہ بھی نہیں کر سکتے، نہ خدا کے دیئے ہوئے پاؤں کو حرکت دیکر اس طرح بڑھ سکتے ہیں، نہ تیز روی سے کام لے کر منزل مقصود تک جلد سے جلد پہونچ ہی سکتے ہیں،

شامل ہوئے، امرت سر اور کلکتہ کانگریس کو یاد کرو اسی دن سے اس میں جان پڑ گئی چنانچہ کلکتہ میں صدر لالہ لاجپت رائے کی مخالفت کے باوجود کانگریس نے ترک موالات کو اپنا شعار بنایا، اور یہ حقیقت ہمیشہ فخر کے ساتھ یاد رہے گی، کہ سب جلیل القدر ہندو رہنما مہاتما گاندھی ہمیشہ خلافت کے سرمایہ سے دورہ کرتے رہے، کیونکہ وہ کہتے تھے، اور بالکل بجا کہتے تھے کہ یہ تمام دورے تحریک خلافت سے متعلق ہیں، ہماری قید کے بعد بھی مہاتما جی نے دورے کے مصارف خلافت کے سرمائے سے لیے حتیٰ کہ کانگریس کے لیے ایک کروڑ روپیہ جمع کرنے کے ان دوروں کے مصارف بھی مجلس خلافت نے ادا کیے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کانگریس کی روح رواں تحریک خلافت اور مجلس خلافت تھی اور یہ پہلا موقع تھا جب حکومت کو یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ ہندوستانی فی الواقع کچھ کر سکتے ہیں، مجھ سے نہیں، لارڈ ریڈنگ اور مسٹر جان سیفی سے دریافت کر لیجیے کہ اس وقت حکومت کی قوت کے ایوان میں کیسا زلزلہ آگیا تھا، اب کہ تحریک خلافت سرد پڑ گئی ہے، اور اس کے نتیجہ کے طور پر تحریک کانگریس بھی، اسی لیے چیف کمشنر کو میرے آنے پر کوئی تشویش نہیں اور وہ آرام کی نیند سو رہے تھے" (ہمدرد ۲۵ ستمبر ۱۹۲۷ء)

سائمن کمیشن کا تقرر ان اختلافات کے باوجود آزادی کی جنگ جاری تھی جس سے برطانوی حکومت پر دباؤ پڑ رہا تھا، وہ آزادی دینا بھی نہیں چاہتی تھی لیکن آزادی دینے سے انکار کرنا بھی اس کی بین الاقوامی مصلحتوں کے خلاف تھا، اس دباؤ کی وجہ سے اس نے ایک کمیشن نومبر ۱۹۲۷ء میں سر جان سائمن کی صدارت میں مقرر کیا جس کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ گذشتہ اصلاحات سے اس وقت تک ہندوستان نے جتنی ترقی کر لی ہے اس کا جائزہ لے کر یہ سفارش کرے کہ ہندوستان میں کیا مزید اصلاحات کی جا سکتی ہیں تاکہ یہاں ایک ذمہ دار حکومت قائم ہو سکے، اس زمانہ میں برطانیہ

والے فیصلے کو بیکار کر کے گھورے پر پھنکوا دیا تھا، اور کلکتہ کی اسپیشل کانگریس سے اس کا فیصلہ صادر کرا دیا تھا کہ کونسلوں کے انتخابات کو ہاتھ نہ لگایا جائے، ہمارے ہی بھائیوں میں سے ایک جماعت نکل آئی جس نے اس امید پر کہ دس سال بعد یا شاید اس سے بھی پیشتر کچھ اور مل جائیگا، جو تلافی مافات کر دیگا، انتخابات میں حصہ لیا اور کونسلوں کی ہر نشست کو پر کر دیا، سر سپرو، واںمترا، چنتامنی صاحب جیسے لبرلوں نے بھی موڈی مین کمیٹی کے سامنے آکر صاف صاف کہدیا کہ یہ دوعملی ناقابل عمل ہے، مگر اس پر بھی نہ صرف لبرل اس کو چلاتے رہے بلکہ تارک تعاون کانگریسی سوراجیوں میں سے بھی جوابی تعاون کرنے والے اسی دوعملی کو چلانے کے لئے پیدا ہوگئے، یہ تعاون کس عنایت کا "جواب" تھا، جہاں مانٹیگو چمکارتا تھا، وہاں برکن ہڈ صاحب دھتکارتے بلکہ لات مارتے تھے، کیا لالہ لاجپت رائے صاحب، جیکر صاحب، کیلکر صاحب اور ڈاکٹر مونجے کے صوبجات متوسط نے اس دھتکار اور مار کے جواب میں جوابی تعاون کیا ہے، حقیقتاً یہ جوابی تعاون نہ تھا، بلکہ سوالی تعاون تھا، ان سب بھکاریوں کا دست سوال لارڈ برکن ہڈ کے سامنے دراز تھا، اور سب ۱۹۱۹ء کے اصلاحات کے بعد بھی پیٹ کو خالی پاکر ۱۹۲۹ء کی بھیک کے ٹکڑے کے منتظر تھے۔"

مولانا محمد علی کی ان تحریروں سے ظاہر ہوگا کہ وہ آزادی کے مطالبہ میں کس قدر انتہا پسند رہے، وہ آزادی کی خاطر ہمیشہ لڑنے کی ترغیب دیتے اور اس کی بھیک مانگنے کی مذمت کرتے رہے، وہ انگریزوں کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہوگئے تھے، اسلئے وہ سمجھتے تھے کہ ان کو کس طرح دبایا جا سکتا ہے، وہ ان کی سیاسی فریب کاریوں اور چالبازیوں سے بھی اچھی طرح واقف تھے، اس لئے جو ہندوستانی مدبر ان کی لگاوٹ کی باتوں سے متاثر تھے، ان کو یہ لکھ کر مجروح کیا،

بلکہ ہمارے لئے نسلِ منازل کا فیصلہ بھی ایک دوسری قوم کے نائب کریں گے اور اگر انھوں نے اس کی اجازت دے دی تب بھی ہم تیزروی سے کام نہیں لے سکتے اگر وہ آہستہ خرامی کا حکم صادر فرما دیں۔"

پھر برطانوی حکومت کے ان وفادار ہندوستانیوں پر یہ لکھ کر طنز کیا جو امید لگائے بیٹھے تھے کہ ان کی وفاداری کے صلہ میں ان کو کمیشن میں شریک کیا جائیگا،

"ہر وقت کمیشن کا انتظار لگا رہتا ہے، آہٹ پہ گوش، در پہ نظر ہے، کہ دیکھئے کب آتا ہے، کون کون آتا ہے۔ ہم میں سے کس کس کو شرف ہمرکابی حاصل ہوتا ہے کس کی طرف نظرِ عنایت ہے، کس پہ عتاب ہے؟ ہمارے کشکول گدائی میں دیکھئے کیا ڈالا جاتا ہے، یہی وہ کشمکشِ انتظار ہے، جس کے متعلق ایک شاعر نے خوب کہا ہے:۔

وائے اس شخص کی قسمت جو تجھے یاد کرے ہائے اس شخص کی قسمت جو تجھے یاد رہے

یہی وہ کشمکشِ انتظار ہے جس کی دل خراش صعوبت سے تنگ آکر کسی شاعر نے کہا ہے،

اے نگاہ کرم! نہ رکھ دھوکے میں اب بھی کہہ دے کہ مجھے مد نظر کچھ بھی نہیں"

پھر اپنے ان کانگریسی ساتھیوں پر بھی چوٹ کی جو سوراج پارٹی بنا کر مرکزی اور صوبائی قانون ساز جلسوں میں اس امید پر جا بیٹھے تھے کہ اندر جا کر وہ آزادی کی جنگ لڑنے میں بہت کچھ مراعات حاصل کر سکتے ہیں، انکے متعلق مولانا محمد نے لکھا،

"ان وفاداروں کو چھوڑ دیجئے جو ہر حال میں اپنی سرکار سے راضی ہیں، ان کو چھوڑ کر ہندوستان میں کون تھا جو ۱۹۱۹ء کے آخر میں جب کہ مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کا اعلان کیا گیا، ان سے خوش اور ان پر مطمئن تھا، لیکن باوجود خلافت اور پنجاب کے بارے میں برطانوی حکومت کے فیصلے کے جس نے امرتسر کانگریس کے جوابی تعاون

وضع فرما دیتے، لیکن جب ان امتیازات کے وجود کو تسلیم کر لیا جاتا ہے، تب تو اس کو بھی تسلیم کرنا پڑیگا کہ ہم مشرقیوں کے لئے ہم مشرقی ہی مناسب اور موزوں دستور اساسی وضع کر سکتے ہیں، نہ کہ یہ مغربی، پارلیمنٹ کے مغربی نمایندے، اگر مرافش کے لئے بنیتھم جیسا ماہر قانون اساسی بھی مناسب اور موزوں دستور و آئین نہیں وضع کر سکتا تھا تو ہندوستان کے لئے برکن ہڈ، ریڈنگ اور سائمن جیسے ماہرین بھی مناسب اور موزوں دستور آئین وضع نہیں فرما سکتے، ہماری قسمت کا فیصلہ خود ہمارے ہاتھ میں ہونا چاہئے جب تک ہم فاتر العقل نہ ثابت ہو جائیں، اپنے بیوی بچے کا انتظام ہمیں کو کرنا پڑیگا، کوئی دوسرا یہ کہہ کر ہمارے خانگی امور کی دیکھ بھال اپنے ذمہ نہیں لے سکتا کہ میں اس دیکھ بھال کی تم سے زیادہ اہلیت رکھتا ہوں، اپنا حلق اپنے ہی تھوک سے تر کیا جا سکتا ہے دوسرے کا تھوک گندگی اور غلاظت ہے"

مولانا محمد علی نے اوپر جو کچھ لکھا ہے، اس کی روشنی میں ہم اپنے اس برطانوی پارلیمانی طرز حکومت کا تجزیہ کر سکتے ہیں، جو اس وقت ہمارے یہاں گذشتہ چھبیس سال سے قائم ہے، یہ ہم اپنے ناظرین کے فہم و ادراک پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ اس کا فیصلہ خود کریں کہ اس سے ہمارا حلق تر ہو رہا ہے، یا اس میں گندگی اور غلاظت پیدا ہو رہی ہے،

برطانیہ کے وزیر اعظم ریمزے میکڈانلڈ نے یہ کمیشن مقرر کیا تھا، ان کے بارہ میں مولانا محمد علی کی رائے بہت ہی خراب تھی، ان کو وہ انتہائی درجہ کا جھوٹا، فریبی، بدعہد اور کینہ پرور انگریز سمجھتے رہے، اس لئے انھوں نے اس کی تلقین کی کہ اس انگریز وزیر اعظم سے کسی بھلائی کی امید نہ رکھنی چاہئے، اور جب یہ وزیر اعظم صاحب اپنی تانا شاہی اور استبدادیت کے ساتھ ہندوستان پر حکومت کر رہے تھے، تو مولانا محمد علی نے

"عربوں کی ایک پرانی مثل ہے، کہ اپنی گھر والی سے ہر کام میں مشورہ کر لیا کرو لیکن کیا وہی کرو جو تم خود مناسب سمجھو، کمیشن نے تو کسی ہندوستانی کو اپنی گھر والی بنانا قبول نہیں کیا، ہاں یوں جس کا جی چاہے کونسلوں اور اسمبلی سے نکل کر اس کے گھر پڑ جائے، لیکن لیڈران قوم مایوس نہ ہوں، اگر خدا نے چاہا تو ایک دن وہ بھی آنے والا ہے کہ کمیشن سے بھی ایک اعلیٰ اور ارفع جماعت یعنی پارلیمنٹ کی جوائنٹ کمیٹی انہیں اپنے حرم میں داخل فرمائے گی، اور اپنی گھر والی بنا کر ان سے اصلاحات کے بارے میں (اور ممکن ہے کہ اصلاحات اس بار نہ ملیں صرف فسادات ملیں) ضرور مشورہ لے گی، لیکن عرب شوہر کی طرح کریں گے، وہ بھی وہی جو خود وہ چاہیں گے"

مولانا محمد علی اس کے قائل نہ تھے، کہ جو طرز حکومت یورپ میں قائم ہے وہی ہندوستان کے لئے موزوں اور مناسب ہے، اسی لئے وہ برطانوی حکومت کی ہر اس سیاسی اصلاح کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے، جو وہ اپنے طرز اور مزاج کے مطابق اس کے لئے سفارش کرتے، ان کا خیال تھا کہ ہندوستان کا طرز حکومت ہندوستان کے مزاج کے مطابق ہونا چاہئے، اسی لئے انہوں نے سائمن کمیشن پر تنقید کرتے ہوئے لکھا کہ

"اس سے زیادہ مضحکہ انگیز کیا چیز ہوگی کہ کابینہ وزارت برطانیہ ایسے سات ممبر پارلیمنٹ کو ہندوستان بھیج رہا ہے جو ہندوستان سے آج تک بالکل ناآشنا رہے ہیں، تاکہ یہ چھ ہفتوں کے اندر نہ سہی چھ ماہ کے باہر ہی سہی اس امر کا فیصلہ کریں کہ ایک مغربی نظام ہم مشرقیوں کے لئے مناسب اور موزوں بھی ہے، یا نہیں، اور پھر ہم مشرقیوں کے لئے یہ مغربی ایک مناسب اور موزوں دستور اساسی وضع فرمائیں، اگر مشرق اور مغرب میں فروعی امتیازات نہ ہوتے تب تو شاید ممکن بھی ہوتا کہ سر جان سائمن اور ان کے رفقا نے مغربی ہم مشرقیوں کے لئے ایک مناسب اور موزوں دستور اساسی

نیچے کچھ اس طرح دب گیا کہ آج تک دبا پڑا ہوا ہے، تم تو جانتے ہی ہوگے کہ کس طرح بعض اوقات ضروری کاغذات اس طرح اور کاغذات کے نیچے دب کر رہ جاتے ہیں، اور حافظہ سے ان کی یاد تھوڑے دن بعد محو ہو جاتی ہے، میں اسی دن سے سمجھ گیا کہ یہ کس قماش کے بزرگ ہیں۔"

ریمزے میکڈانلڈ کے ظرف کا پول ایک دوسرا واقعہ بھی لکھ کر کھولا، جب وہ وفد خلافت لے کر انگلستان گئے، تو اس وقت ریمزے میکڈانلڈ پارلیمنٹ کے ممبر نہ تھے، لائڈ جارج کی لبرل پارٹی سے شکست کھا گئے تھے، لیکن لیبر پارٹی کے سکریٹری تھے، مولانا محمد علی وفد لے کر انگلستان پہونچے تو انگلستان کے تمام ضروری سیاست دانوں سے ملتے رہے، جنھیں حکومت کے وزراء کے علاوہ کلائنیل میکنس، کرنل ویجوڈ، اسنوڈن ٹامس وغیرہ جیسے حزب مخالف کے لیڈر بھی تھے، مگر ان کو ریمزے میکڈانلڈ سے ملنے کا موقع نہ مل سکا، اسی زمانہ میں لیبر پارٹی کا ایک جلسہ لندن میں ہونے والا تھا، مولانا محمد علی اس جلسہ میں وفد کی کچھ باتیں پیش کرنا چاہتے تھے، اس لئے جلسہ کے کارکنوں سے ملے، تو ان لوگوں نے کہا کہ اب تو پروگرام طے ہو چکا ہے، تاہم مسٹر ریمزے میکڈانلڈ سکریٹری ہیں، ان کو اختیار ہے کہ اگر چاہیں تو پروگرام میں اب بھی وقت نکال سکتے ہیں، وہ تو تمھارے پرانے دوست ہیں، ان سے کہو وہ ضرور تھوڑا سا وقت تو نکال ہی دیں گے، اس کے بعد کی کہانی مولانا کی زبانی سنیے:

"میں خوش خوش آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، ۱۹۱۳ء کے تلخ تجربے سے کسی قدر غیر مطمئن بھی تھا، میں نہیں کہہ سکتا کہ اس شخص نے کس تلخی کے ساتھ مجھے جواب دیا، ایک منٹ رکنا اس کو گوارا نہ تھا، راستہ چلتے چلتے فرمایا کہ ہرگز ہرگز نہیں، ہمارا پروگرام یوں ہی پڑا ہے،

بڑی جرأت کے ساتھ ان کے خلاف "بھائی رام جی میکڈانلڈ کے کچھ حالات" کے عنوان سے مضامین لکھنے شروع کئے، اور کچھ گذشتہ واقعات کو قلمبند کر کے ان کے جھوٹ تو بنے کا پول اس طرح کھولا،

"جب کانپور کی مسجد شہید ہوئی........ تو اس خبر وحشت اثر کو پڑھتے ہی ایک تار تو مسٹن صاحب کے نام دیا کہ مجھے اجازت دی جائے کہ جو خط و کتابت اور تار م تار آپ کے ساتھ گذشتہ ڈیڑھ سال میں ہوئی ہے، اسے شائع کر دوں اور دوسرا تار بھائی رام جی" میکڈانلڈ کے نام دیا کہ ہمارے ساتھ عمال حکومت نے یہ ظلم کیا ہے۔ آپ پارلیمنٹ میں اس سوال کو پیش کریں، اور ہماری مسجد کے شہید شدہ حصے کو دوبارہ تعمیر کا وزیر ہند کی طرف سے حکم دلوا دیں، ۲ رجولائی کے تار کا جواب نہ مجھے تار سے ملا، نہ خط سے، نہ پارلیمنٹ میں اس مرد خدا نے کوئی سوال ہی کیا، جب مسٹر جسٹس سید وزیر حسن اور میں ستمبر ۱۹۱۳ء میں اسی لئے انگلستان گئے، تو یہ بھی مجھ سے ملنے ہماری قیامگاہ پر تشریف لائے، میں نے تار کا جواب نہ آنے کی شکایت کی تو فرمایا بھئی واقعہ یہ ہے کہ تمہارا نام اس قدر عام ہے کہ میں سمجھ نہ سکا کہ تار تم نے بھیجا ہے یا کسی اور محمد علی نے اور یہ بھیجا بھی بمبئی سے گیا تھا، اگر دہلی سے آیا ہوتا تو میں سمجھ جاتا کہ تمہیں نے بھیجا ہے، مجھے اس جواب کو سن کر تعجب بھی ہوا، اور غصہ بھی آیا، اس لئے کہ میں نے تار میں صاف لکھدیا تھا کہ محمد علی اڈیٹر کامریڈ ارسال کر رہے والا ہے، تاکہ بمبئی کے مقام ارسال سے باعث کوئی غلط فہمی واقع نہ ہو، جب آپ نے دیکھا کہ چال کارگر نہ ہوئی تو فرمایا کہ ہاں میں بھولا واقعہ یوں تھا کہ تمہارا تار ملا تو میں نے احتیاط سے اپنی ڈاک کے ساتھ رکھ دیا کہ اس کے متعلق مزید حالات دریافت کر کے کارروائی کروں گا، مگر پھر بہت سے اور لوگوں کے خطوط آگئے، اور یہ تمہارا تار ان کے

"یہی ریمزے میکڈانلڈ صاحب وزیر اعظم ہوئے، لیکن ترکی کے ساتھ موصل کے مسئلے میں، مصر کے ساتھ سوڈان، سویز اور دردانہ رسائل میں اور ہندوستان کے ساتھ گول میز کانفرنس کے مطالبے اور بنگال آرڈیننس کے معاملوں میں اس شخص نے جو کارروائی کی وہ قدامت پسند سے قدامت پسند اور استبدادی سے استبدادی آمریت کی کارروائی سے کسی طرح کم نہ تھی، جو ذاتی تجربہ خود مجھے اس کا ہوچکا تھا، اس کے بعد ان کارروائیوں نے مجھے یقین دلایا کہ یہ شخص اس آئینی کمیشن کے معاملے میں ہمارے خلاف جائیگا، اور جس طرح پہلے ترکی، مصر اور ہندوستان کے ساتھ اس نے مستبدانہ اور ناانصافانہ سلوک کیا ہے، اسی طرح پھر ہمارے ساتھ ویسا ہی سلوک ہونے دیگا، اور اس کی اور اس کی پارٹی کی کمک پر بھروسہ ہندوستانیوں کی سخت حماقت ہے۔" (ہمدرد ۲۹ر نومبر ۱۹۲۷ء)

مولانا محمد علی نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے سائمن کمیشن کی سخت مخالفت کی، ان کا پیام تھا کہ اس وقت ہندو اور مسلمان دونوں نے مل کر سائمن کمیشن کی آمد کو ناکام بنا دیا تو ہمیشہ ہمیشہ ہندوستان کی تاریخ میں ہمارا نام زرّیں حروف سے لکھا جائیگا، مسلم لیگ بھی مولانا محمد علی کی رائے کے ساتھ ہو گئی، لیکن پنجاب کے سر محمد شفیع مقاطعہ کے خلاف تھے، اس لئے انھوں نے مسلم لیگ سے علٰحدہ ہوکر ایک علٰحدہ لیگ قائم کی، جو "شفیع گروپ" کے نام سے موسوم ہوئی، حکومت کے پرستاروں کی کمی نہ تھی، اس لئے ہندو اور مسلمان دونوں میں ایسے افراد حاصل ہوگئے، جنھوں نے کمیشن کا ساتھ دیا، اس کی جابجا دعوتیں بھی کیں، لیکن مجموعی حیثیت سے اس کا زبردست بائیکاٹ ہوا، جس کو حکومت نے بھی محسوس کیا،

اس لئے وقت نکالنا مشکل ہے، مجھے اس انکار سے سخت رنج ہوا، مگر رنج کے علاوہ میرے تعجب کی انتہا نہ رہی، جب مجھے اس انکار کا اصلی سبب معلوم ہوا، اس لئے کہ آپ سے نہ رہا گیا، اور آپ نے اسی وقت فرمایا کہ تم نے تو مجھے بالکل ہی بھلا دیا، تم مجھ سے آج ملتے ہو، اتنے دن تک کہاں تھے، میں نے کہا کہ میں لندن سے ایک عرصے سے باہر تھا، اور چونکہ وہ بھی اس وقت لندن میں نہ تھے، جب ہم لوگ شروع شروع ہندوستان سے آئے تھے، اور پارلیمنٹ والوں ہی سے ملنا، اس وقت سب سے زیادہ ضروری تھا، اس لئے ان سے ملاقات نہ ہو سکی، اس پر فرمایا کہ تم ان ناکارہ لوگوں کے پاس گئے اور مجھے بالکل ہی بھلائے رکھا آج مجھے یاد فرمایا، میں تمھارے لئے بالکل وقت نہیں نکال سکتا، جو شخص ایک دن برطانیہ کا وزیر اعظم ہونے والا تھا، وہ اتنا کم ظرف اور تنگ دل ہو، مجھے سخت حیرت ہوئی، کہ حزب عمال کے لیڈروں سے ان کی اس قسم کی مخالفت تھی، کہ میرا ان سے ملنا اتنا ناگوار ہوا، جو شخص رشک وحسد میں اس قدر ڈوبا ہوا ہو، کہ ہندوستان اور ترکی کے ساتھ انصاف اور خود برطانیہ کے مفاد کا ذرا خیال نہ رکھے، تو صرف اس کا فلاں شخص حزب عمال کے لیڈروں سے کیوں ملا، مجھ سے کیوں نہ ملا، اس سے بھلا کسی بھلائی کی امید ہو سکتی ہے، باوجود ان بزرگ کے انکار کے مسٹر کلائنس اور مسٹر لینسبری نے صدر کانفرنس سے کہہ کر مجھے پانچ منٹ تو تقریر کے لئے دلا ہی دیئے، اور جس انداز سے میں نے تقریر کی، اس سے سامعین اتنا محظوظ ہوئے کہ صدر کی گھنٹی تین بار بجی مگر ہر بار سامعین چلا چلا کر کہتے رہے کہ ابھی اور تقریر کرنے دیجئے، انھیں نہ روکئے،

اس کے بعد مولانا تحریر فرماتے ہیں:-

ہندوستان میں مشرق وسطیٰ سے متعلق
مطالعاتی ادارہ کا مقام
(ایک تجویز اور خاکہ)

از

جناب اے، اے، اے، فیضی صاحب

یہ مقالہ انگریزی میں دہلی کے رسالہ اسلامک اسٹڈیز میں شائع ہوا تھا، اس کا ترجمہ معارف میں پیش کیا جارہا ہے، مترجم محمد نعیم صدیقی ایم، اے رفیق دار المصنفین ہیں'' معارف،

لفظ "مشرق وسطیٰ" (عربی میں "الشرق الاوسط") کو چند وجوہ کی بنا پر قابل اعتراض خیال کیا جاتا ہے کیونکہ اولاً تو یہ اس دور کی یاد دلاتا ہے جب یورپ کی فوجی طاقت وہاں مسلط تھی ثانیاً یہ لفظ بڑی حد تک ناموزوں ہوگیا ہے، ثالثاً یہ کہ خود ہماری وزارت خارجہ نے اسے ترک کرکے "مغربی ایشیا" کہنا شروع کردیا ہے، بہرحال زیر نظر مطالعہ کے لئے اسی لفظ کا استعمال مناسب ہوگا۔ کیونکہ تمام یورپی اور مشرقی زبانوں کی کتابوں اور جرائد میں اس لفظ کا استعمال اتنا عام ہے کہ اسکو ترک کردینا ایک طرح کی خود نمائی ہوگی۔ لندن یونیورسٹی کے برنارڈ لیوس نے اس اصطلاح کے متعلق حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے۔

پنڈت مدن موہن مالوی جی بھی اس کمیشن کے مخالف رہے، مدراس کانگریس میں انھوں نے اس کی مخالفت میں ایک پرزور تقریر کی، اور حکومت کی پالیسی "لڑاؤ اور حکومت کرو"، کی تشریح کرکے اپنی بے بسی کا اظہار کیا کہ ہم ہندوستانی کس طرح حکومت کے اشاروں پر ناچ رہے ہیں، مولانا محمد علی کو یہ تقریر بے حد پسند آئی، گو وہ مالوی جی کی سیاسی رائے سے ہمیشہ اختلاف کرتے رہے، مگر اس تقریر کو سن کر اس قدر متاثر ہوئے کہ بڑھ کر مالوی جی کے قدم چوم لئے اور جب خود تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے تو فرمایا کہ اگر مالوی جی نے اپنی سچی ذہنیت کا اظہار کیا ہے، تو حضرات! سائمن کمیشن آنے دیجئے، ہمیں اس کی پروا نہیں ہے، جس طرح مصر میں ملنر کمیشن سے کہدیا گیا تھا، کہ جو کچھ پوچھنا ہو سعد زاغلول پاشا سے پوچھو، اسی طرح ہم بھی کہہ دیں گے، کہ ہم کچھ نہیں چاہتے، اقلیتوں کے امین مالوی جی ہیں، جو کچھ ہو ان سے پوچھو" (سیرت محمد علی از رئیس احمد جعفری ص ۱۲۷) اسی طرح ان کو لالہ لاجپت رائے کے خیالات سے کبھی اتفاق نہیں رہا، لیکن مرکزی اسمبلی میں انھوں نے کمیشن کے خلاف جو تقریر کی، تو ان کو بہت پسند آئی، اور ہمدردی دل کھول کر اس کی تعریف کی، سائمن کمیشن کی آمد کے سلسلہ میں لالہ لاجپت رائے لاہور میں پولیس کے ہاتھوں ڈنڈے کھا کر سخت زخمی ہوگئے اور کچھ عرصہ کے بعد وفات پاگئے، محمد علی اس زمانہ میں یورپ گئے ہوئے تھے، واپس آئے تو اپنے سب سے پہلے بیان میں لالہ لاجپت رائے کی وفات کو قابل رشک بتایا اور اپنے لئے تمنا کی کہ ایسی سعادت انھیں بھی حاصل ہوتی"

(سیرت محمد علی ص ۱۲۶)

(باقی)

کے اہل قلم "مغرب" کہا کرتے تھے اور اہل فرانس مغرب سے مراد شمالی افریقہ کا وہ علاقہ لیتے تھے جو لیبیا سے مراکش تک محیط ہے، یہاں لفظ "وسطیٰ" کو مشرق قریب سے جدا کرنے کے لئے ایک بات کی تصریح ضروری ہے کہ جغرافیائی اعتبار سے مشرق قریب پر مشتمل علاقوں یعنی یونان، بلغاریہ، ترکی اور مصر کو شرق اوسط کے علاقوں عرب، عراق، ایران اور افغانستان سے الگ سمجھا جاتا ہے[1]

مگر یہ تفریق محض مصنوعی ہے کیونکہ اس سے ایک ایسے خطے کی تقسیم ہو جاتی ہے جو سیاسی زندگی، معاشی جد و جہد اور مذہبی نظریات کے اعتبار سے ایک متحدہ علاقہ کہا جا سکتا ہے، اس خطۂ ارض کی تاریخ بھی مشترک ہے اس لئے آئندہ صفحات میں ہم اس لفظ کا استعمال اس کے وسیع پس منظر میں کریں گے جس میں قدیم مصنفین کا مشرق قریب کا اور جدید اصطلاح مشرق وسطیٰ دونوں شامل ہیں، اول الذکر سے مراد وہ ممالک ہیں جو ہندوستان کے مشرق میں واقع ہیں یعنی برما، تھائی لینڈ، ملائشیا اور انڈونیشیا، یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ملیشیا اور انڈونیشیا کے علاوہ جہاں اسلام غالب ہے اس مشرقی خطہ میں ہندوستانی تہذیب کا اثر گہرا ہے۔

اس طرح شرق اوسط مشرقی اور مغربی تہذیبوں کا سنگم ہے۔ یہاں کے باشندوں کے عقیدہ میں یہ خطہ تہذیب کا مرکز تھا مشہور مورخ آرنلڈ ٹوائن بی کی بیان کردہ بائیس مشہور تہذیبوں میں سے بارہ[2] یا تو اسی خطہ میں پروان چڑھیں یا پھر دوسرے علاقوں سے آکر یہاں ان کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا، مثلاً مصری تہذیب، کریٹ کا قدیم تمدن، سمیری تہذیب، شام بابل نینوا کا تمدن[3]، ایرانی، عربی، یونانی اور مغربی تہذیبوں کے نام لئے جا سکتے ہیں، دنیا کے تین بڑے مذاہب یعنی یہودیت، عیسائیت

"الشرق الاوسط" کی اصطلاح ۱۹۰۲ء میں امریکی بحریہ کے مورخ الفریڈ تھیر ماہن نے ایجاد کی تھی۔ اور اس سے مراد وہ پورا علاقہ تھا جو ہند و عرب کے درمیان واقع ہے جس کا مرکز بحری اصطلاح میں خلیج فارس ہو سکتا ہے، پھر اس جغرافیائی رقبہ کی اصطلاح کو "ٹائمس" اخبار اور بعد میں حکومت برطانیہ نے بھی اپنا لیا، اس طرح "مشرق وسطیٰ" اور اس سے کچھ پہلے کے ایجاد کردہ "مشرق قریب" دونوں الفاظ عام طور پر استعمال میں آنے لگے۔ یہ دونوں نام اس دور کی یادگار ہیں جب مغربی یورپ کو دنیا کا مرکز تسلیم کیا جاتا تھا، اور دوسرے تمام علاقے اس کے ارد گرد سمجھے جاتے تھے، بہر حال یہ الفاظ سامراجی نظریہ کے حامل ہونے کے باوجود اب بھی مقبول عوام ہیں اور روس ہندوستان اور افریقی ممالک اس خطہ کو اسی نام سے پکارتے ہیں، یہ خطہ روس کے جنوب، افریقہ کے شمال اور ہندوستان کے مغرب میں واقع ہے، خود مشرق وسطیٰ کے عوام بھی اس لفظ پر متفق ہیں، کیونکہ عربی ادب میں اکثر "الشرق الاوسط" کا ذکر ملتا ہے، یہ لفظ اتنا کارآمد ثابت ہوا کہ اس کا استعمال خلیج فارس کے گرد و پیش کے تمام علاقوں میں وسیع پیمانے پر عام ہے اور اب اس سے مراد وہ وسیع و عریض خطہ ہے جو بحر اسود سے افریقہ کے خط استوا، اور ہندوستان سے بحر اطلانٹک تک پھیلا ہوا ہے۔

بہر حال مسلمان مورخین کو اس لفظ کے استعمال میں کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا کیونکہ اس کے ذریعہ وہ اس علاقے کو ان خطوں سے ممتاز کرتے ہیں جیسے ازمنۂ وسطیٰ

ایرانیوں کی روایات الگ ہیں وہ نام نہاد طور پر اثنا عشری شیعہ عقاید پر قائم ہیں لیکن موجودہ دور میں نئی نسل میں بڑی حد تک آزاد خیالی اور مارکسی نظریات کا رجحان پایا جاتا ہے، مگر پرانی وضع کے لوگ اب بھی خاص طور پر نجف اور کربلائے معلیٰ کے علاقوں میں اپنے قدیم مسلک کے پابند ہیں۔ افغانستان اور ہند و پاک میں حنفی مسلک رائج ہے۔ اس طرح مشرق وسطیٰ میں مذہب کے تینوں نظریات یعنی کٹر سنی، تجدد پسند سنی اور ایرانی شیعہ موجود ہیں۔

بہت سے تاریخی، سیاسی اور معاشی اسباب کے باعث ہمیں مشرق وسطیٰ کے ممالک کا غائر نظر سے مطالعہ کرنا چاہیئے، عرب و ہند کے تعلقات کا سلسلہ ماقبل تاریخ کے عہد سے ملتا ہے۔ مصر اور عرب میں پائی جانے والی بہت سی اشیاء اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ ان ممالک میں تجارت کا سلسلہ تین ہزار سال قبل مسیح سے قائم تھا ہندوستانی جہاز جو معمولی بادبانوں اور بے شمار ملاحوں کے ذریعہ چلتے تھے، ہندوستانی مال مثلاً گرم مسالے، موٹی روئی، ریشم، ململ اور جواہرات وغیرہ لے کر عرب اور عراق جاتے تھے، اور وہاں سے سیپ، پارچہ، جستہ، سونا، سیندور، کیوڑا اور زعفران لے کر ہند آتے تھے، وادی سندھ یعنی موہنجو دارو کے لوگ عربوں سے قریبی تعلقات رکھتے تھے، ہندوستانیوں، مصریوں اور کریٹیوں کے درمیان تجارتی روابط پائے جاتے تھے، عربی النسل گھوڑے ہرش وردھن کے دربار میں بہت مقبول تھے، اور ہندوستان فولاد کی تلواروں کا ذکر عربی و فارسی ادب میں "ھندوانی" اور "المھند" کے نام سے بکثرت ملتا ہے، ہندوستانی روئی کی ان ملکوں میں بہت مانگ تھی جسے عربی میں "قطن" کہا جاتا تھا اور بعد میں یورپی زبانوں میں کاٹن (COTTON) کہا جانے لگا۔ ہندستانی

اور اسلام کی ابتدا اسی خطہ میں ہوئی، اور یہ حقیقت بھی بڑی حد تک ثابت ہو چکی ہے کہ جدید مغربی تمدن اسی درخت کا ایک ثمر ہے جو کبھی شرق اوسط کے ممالک میں اگا تھا۔

غرض مشرق وسطیٰ کے اطلاق سے مندرجہ ذیل خود مختار ممالک پر مشتمل علاقہ ذہن میں آتا ہے۔

براعظم افریقہ: مراکش، الجزائر، سوڈان، تونسیہ، لیبیا، مصر۔

ایشیا: ترکی، سعودی عرب، یمن، حضرموت، منطقائی ریاستیں، عراق شام، اردن، لبنان، ایران اور افغانستان۔

اس وسیع خطے کی تین اہم خصوصیات ہیں۔

۱۔ مذہب اسلام کا غلبہ

۲۔ عرب نسل کا شیوع

۳۔ عربی زبان کا وسیع استعمال۔

مذکورۂ بالا تمام ممالک میں اسلام مشترک مذہب ہے، عربوں کی تعداد تقریباً دس کروڑ ہے، تین کروڑ کے لگ بھگ ترک اور اتنے ہی ایرانی ہیں، اس خطے میں تین قسم کے مسلمان پائے جاتے ہیں، شمالی افریقہ کے مسلمان بیشتر مالکی المسلک ہیں، مصر سوڈان میں حنفی اور شافعی مخلوط ہیں، سعودی عرب میں حنفی غالب ہیں، ترک زیادہ تر حنفی ہیں لیکن ان کے قوانین سیکولر ہیں، کیونکہ انھوں نے مذہب اور سیاست کو علحدہ کر دیا ہے، یہ تمام اقوام راسخ العقیدہ اور سنی شریعت کے جدید تقاضوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔

شام کی سرحدوں تک بدھ مذہب پہونچ چکا تھا اور کافی حد تک ہندوستانی تہذیب مشرق وسطیٰ میں اپنا اثر جما چکی تھی۔

دولت عباسیہ میں عربوں نے ہندوستان کے سائنسی ادب سے دلچسپی لینا شروع کی جس طرح انھوں نے یونانی ادب کو ایشیائی سرزمین تک لانے میں اس سے پہلے کیا تھا۔ ہندوستانی کہانیوں کے مشہور مجموعے "پنچ تنتر" کا عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ "الف لیلہ و لیلہ" میں ہندوستانی کہانیاں بھی موجود ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب میں اتنے انواع و اقسام کے رنگ ہیں کہ اس عہد کی دنیا کے ہر علاقے کا کچھ نہ کچھ اثر اس میں پایا جاتا ہے۔

عیسائیت کے بارے میں بھی یہ روایت دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ پہلی صدی عیسوی میں ایک مشہور عیسائی مبلغ ٹامس جنوبی ہند آیا تھا، اگرچہ اس روایت کی صحت میں تاریخی ثبوت کی کمی ہے تاہم بہت سے ممتاز مورخین مثلاً جی ایم مورلیس وغیرہ اسکو صحیح تسلیم کرتے ہیں، مورلیس نے اپنی کتاب "ہندوستان میں عیسائیت کی تاریخ" میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔

علم طب کے میدان میں بھی عرب و ہند کے باہمی تعلقات کی نمایاں جھلک ملتی ہے۔ فارس کی مشہور یونیورسٹی جندیشاپور میں ہندوستانی ماہرین طبیعیات عرب اور ایرانی رفقاء کے ساتھ دوش بدوش کام کرتے تھے، ابتدائی عہد کے مشہور ترین عرب اطباء مثلاً حنین بن اسحاق وغیرہ عیسائی تھے، آگے چل کر بہت سی ہندوستانی کتابوں کے عربی میں ترجمہ کا ثبوت ملتا ہے، اسطرح علم طب یا قدیم یونانی طرز علاج ہندوستان میں جم گیا اور بوعلی سینا کے اصول ہمارے ملک کی

تجار کی مستقل آمد و رفت سے دوسری صدی قبل مسیح میں شمالی افریقہ میں ایک ہندوستانی نوآبادی قائم ہو گئی تھی، اور یہ تجارت آج بھی قائم ہے، دو سال قبل ساحل کوچین پر راقم سطور کی ملاقات ایک عرب تاجر سے ہوئی اس سے عربی میں گفتگو کرنے پر معلوم ہوا کہ بحری تجارت اب مائل بہ زوال ہے، اس تاجر نے غلط فہمی سے میری ٹوٹی پھوٹی عربی کو مصر کی مقامی زبان سمجھا اور اس نے قیاس کیا کہ میں مصر سے آیا ہوں۔

شامی مصنف زینوب (Zenob) کا بیان ہے کہ ہندوستانیوں نے وہاں دو مندر بنائے تھے، اور ان میں اپنے دیوتاؤں کے بت نصب کئے تھے، ایک بحری ہندوستانی ملاح کے بارے میں ایک مشہور واقعہ بھی منقول ہے کہ وہ کس طرح مصر پہونچنے کی کوشش میں اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا، اور منزل مقصود کے نزدیک نیم مردہ حالت میں پایا گیا۔ اسی ملاح نے مشہور حوصلہ مند یودوکسس (Eudoxus) کو ہندوستان کا بحری سفر کرنے اور بحری تاریخ کا رخ موڑ دینے کی ہمت دلائی تھی، اس روایت کی تاریخی حیثیت جو ہو لیکن یہ بات یقیناً کسی شک وشبہہ سے بالاتر ہے کہ ایک عرب ملاح ہی نے واسکوڈی گاما کو آبنائے راس الامید سے ہوتے ہوئے ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کرنے میں مدد دی تھی۔ اور احمد بن ماجد بھی عرب ملاح ہی تھا جس نے ۱۴۱۵ء میں مالندی (مشرقی افریقہ) سے کالی کٹ تک پہونچنے میں واسکوڈی گاما کی رہنمائی کی تھی۔

مذہب کے میدان میں بھی ہندوستان کے خود اپنے مبلغین تھے، جنکے ذریعہ زمانہ قدیم میں بدھ مت مغربی ایشیا میں پہونچا۔ البیرونی (م ۱۰۴۸ء) نے شہنشاہ اشوک کے اس دعوے کی تصدیق کی ہے کہ خراسان، ایران، عراق، موصل اور

سے مالامال بھی ہم نے اپنی دولت بھی اس ملک کے سپرد کر دی، اور ہندوستان نے اپنے سرچشمے سے ہم کو سیراب کیا۔ ہم نے اس ملک کو اپنے خزانہ کا ایک ایسا قیمتی تحفہ دیا ہے جس کی یہاں سخت ضرورت تھی یعنی جمہوریت اور مساوات کا سبق۔"

اب ہم سیاست اور ڈپلومیسی (حکمت عملی) کی طرف آتے ہیں، ہندوستان نے سیاسی میدان میں عرب ممالک کو ہمیشہ اپنا ہمنوا پایا ہے، جب اسرائیل کا تنازعہ پیدا ہوا اور گذشتہ عرب اسرائیل جنگ میں بھی ہندوستان نے عربوں کی پوری حمایت کی، گاندھی جی کے وقت سے لیکر اب تک ہندوستان نے دنیائے عرب کے قلب میں اسرائیل کی صیہونی توسیع پسندی کی کبھی حمایت نہیں کی۔ اور مسئلہ کشمیر میں عربوں نے ہمارا یہ قرض پورا پورا ادا بھی کر دیا۔ مرحوم صدر جمال عبدالناصر کی قیادت اور پاکستان سے مذہبی رشتے میں منسلک ہونے کے باوصف عرب ممالک نے ہمیشہ ایک غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کیا اور کشمیر کے متعلق وہ اپنے اس موقف پر شدت سے قائم رہے کہ یہ دو ایسے ہمسایہ ملکوں کے درمیان کا تنازعہ ہے جو خونی رشتوں اور معاشی فلاح وبہبود کی مشترک قدریں رکھتے ہیں۔ یہ بات بھی پوری طرح معلوم ہے کہ عربوں کی اکثریت گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو کا بے حد احترام کرتی ہے اور وہ ہندوستان کو ایک ایسا عظیم ملک شمار کرتے ہیں جو سیکولر اور جمہوری اقدار کا علمبردار ہے، بہت سے عرب ممالک ہندوستان کی ناوابستگی کی پالیسی کے مداح ہیں۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ پختونستان کے مسئلہ کے باوجود جس میں کبھی ہند نے افغانستان پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا۔ افغانستان کا رویہ ہمارے ساتھ پاکستان کی بہ نسبت زیادہ دوستانہ رہا، یقیناً اس کے

طبی کتابوں کا اہم جزو بن گئے، دہلی کا ہمدرد دواخانہ یونانی علاج کا بہترین نمونہ ہے، یہاں کے فن دواسازی اور اطبا کی معالجاتی صلاحیت کا عصر جدید کے بہترین دواخانوں سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے، خصوصاً اگر اس طرز علاج کی ارزانی پر نظر ڈالی جائے تو یہ ہر قسم کی توصیف وتحسین سے بالاتر قرار پائیگا، آصف علی روڈ نئی دہلی میں ہمدرد نرسنگ ہوم اور کلینک جدید فن تعمیر کی عمدہ مثال اور بہترین آلات سرجری سے معمور ہے، اسی کے ساتھ وہاں قدیم طرز کا مگر نہایت مؤثر علاج بھی جاری ہے۔

اکثر سوال کیا جاتا ہے کہ عربوں نے ہندوستان کو کیا دیا؟ میرا جواب یہ ہے کہ ہندوستان کو جمہوریت اور سوشلزم کا درس دینے میں یونانی عرب دنیا کا بہت بڑا حصہ ہے، ایسی جمہوریت جس میں ایک عام شہری کو بھی اپنے ملک کی تمام سرگرمیوں میں حصہ لینے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ اسلام کے قانون وراثت نے بھی ہندوستان کو سوشلزم کا پیغام دیا اس کے مطابق محض پہلی مرتبہ اولاد کو وراثت ملنے کا حق ختم ہوگیا، اسلام نے متوفی کی تمام اولاد کو (خواہ ذکور ہوں یا اناث) کچھ نہ کچھ وراثت ملنے کا حقدار قرار دیا ہے یعنی لڑکوں کو دو حصے اور لڑکیوں کو ایک حصہ۔ اس سلسلہ میں مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۴۲ء میں آل انڈیا کانگریس کے رام گڈھ سیشن کو خطاب کرتے ہوئے جو الفاظ کہے تھے وہ بلا شبہ آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہیں۔

"ہم (یونانی اسلامی تہذیب کے نمائندے یعنی ہندوستانی مسلمان) ایک بیش بہا خزانہ اپنے ساتھ لائے، یہ سرزمین پہلے ہی خود اپنے بے شمار خزانوں

یہاں بارہویں صدی تک مسلم حکمرانوں کے عہد میں کافی ترقی ہوتی رہی، بارہویں سے انیسویں صدی تک زوال کے آثار نمایاں رہے، گذشتہ دو صدیوں میں یوروپین تجارت کی ترقی، وسائل کے استعمال اور بیرونی امداد کے ذریعہ بہت تیزی سے حالات سدھرے ہیں اور روز بروز ان میں مزید ترقی ہوتی جارہی ہے، مشرق اوسط ایک پھلتا پھولتا علاقہ ہے، وہ ہمیشہ سے بڑھتا رہا ہے اور مزید ترقی کے امکانات سے بھرپور ہے، اس لئے اسکی سخت ضرورت ہے کہ ہندوستان مشرق وسطیٰ کے ساتھ گہرا ربطہ اور معاشی رشتہ قائم کرنے کی پوری کوشش کرے۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہو اس کے حالات بالکل واضح اور روشن ہیں، یہ ایک ترقی پذیر ملک ہے، ہم نے صنعت کو قومی پالیسی کے طور پر اپنا لیا ہے۔ اس لئے یہ چیز ہمارے لئے بڑی مفید ہوگی کہ ہم اپنا تیار شدہ مال دوسرے ممالک کو برآمد کریں اور وہاں سے سستا خام مال اپنے ملک میں لائیں، ہم کو مغربی ملکوں سے کافی معاشی امداد اور فنی واقفیت حاصل ہو رہی ہے، اس لئے ہم جو مال سستے داموں تیار کریں اس کو برآمد کرنے کے وسیع ذرائع بھی پیدا کرنا ضروری ہیں۔ اس مقصد کے لئے مشرق وسطیٰ ہماری بہترین منڈی بن سکتا ہے۔ وہاں برآمدی تجارت کو فروغ دینے کی بڑی گنجائش ہے، راقم سطور نے ۱۹۶۲ء میں وزارت مالیات و تجارت سے اسکا پتہ لگانے کی کوشش کی کہ مشرق وسطیٰ کے ساتھ ہماری تجارت کی کیا حالت ہے، اور مجھے یہ جان کر سخت صدمہ ہوا کہ ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۲ء تک کے پانچ برسوں کے دوران ہماری درآمد و برآمد دونوں بیس ۲۰ سے تیس ۳۰ فیصد تک گھٹ گئی ہے،

یہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں کہ پورے ہندوستان میں کوئی ایسا

بہت سے سیاسی اور معاشی اسباب بھی ہوسکتے ہیں، مشرق اوسط کے صرف دو ملک ترکی اور ایران ایسے ہیں جو ہمارے طرفدار نہیں ہیں، اسکا بڑا سبب ہماری ناوابستگی کی پالیسی ہے اور یہ دونوں ملک امریکہ کے ساتھی اور دفاعی اور دوسرے معاہدوں میں اس سے بندھے ہوئے ہیں، اس لئے اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ہندوستان مشرق وسطیٰ کے دوست ممالک کے ثقافتی، تاریخی اور سیاسی مسائل کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرے،

ہمارے سامنے ایک دوسرا مسئلہ بین الاقوامی تعلقات کا بھی ہے، مشرق وسطیٰ کے تقریباً سبھی ممالک میں ہمارے سفراء، وزراء اور قونصل موجود ہیں، اس سلسلہ میں سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ہمارے ایلچیوں کو ایسے لوگوں کا تعاون حاصل ہونا چاہیئے جو مشرق وسطیٰ کی تین مختلف زبانوں یعنی عربی، فارسی اور ترکی میں کامل مہارت رکھتے ہوں، کلاسیکی عربی سے ہم میں سے بہت کم لوگ واقف ہیں، اور جدید فارسی و ترکی میں بھی ہماری استعداد محض برائے نام ہے، ایسی صورت میں قاہرہ اور دمشق کے بازاروں میں قرآن مجید اور معلقات (سبعہ معلقہ) کی زبان کے استعمال سے کوئی فائدہ نہیں، ہمیں ایسے سفراء اور ان کے معاونین تیار کرنے چاہئیں جو روزمرہ کی عربی (جسکو عرب دارجہ کہتے ہیں) جدید ترکی اور جدید فارسی میں کامل دستگاہ رکھتے ہوں۔ اس وقت ہمارے سامنے یہ سب سے اہم کام ہے اس کے بغیر مشرق وسطیٰ میں ہماری سفارتی کامیابی محض درجۂ دوم کی ہی ہوسکتی ہے،

اب ہم مسئلہ کے معاشی پہلو کی طرف آتے ہیں، مشرق اوسط کی بہترین معاشی تاریخ کولمبیا یونیورسٹی کے چارلس عیسوی نے لکھا ہے جو دنیا کے دوسرے حصوں کی طرح اس خطۂ ارض کی تاریخ یعنی اس کی ابتداء، عروج اور زوال کی داستان سناتی ہے،

کروڑ عوام کی مقبول عام زبان ہے، ادارۂ اقوام متحدہ میں انگریزی، فرانسیسی، ہسپانوی اور روسی زبان کے بعد پانچواں نمبر عربی ہی کا ہے، پانچ سو برس سے زیادہ عرصہ تک تہذیب وسطیٰ کے دور میں بھی یہ عوامی زبان رہی ہے، عربی ہی وہ سرچشمہ ہے جس سے جدید مغربی تہذیب، سائنس اور فلسفہ وجود میں آیا، رومی اور یونانی تہذیبوں اور جدید تہذیب کے درمیان رابطہ کا کام کرنے والی یہی زبان ہے، اگرچہ ہمیں اسکا پورا احساس نہیں ہے لیکن عصر نو کی یہ ایک نہایت اہم زبان ہے جو مراکش سے سعودی عرب اور عراق تک پھیلی ہوئی ہے، میری رائے میں انگریزی اور روسی زبانوں کے بعد ہندوستان میں ہمارے لئے یہی سب سے اہم بیرونی زبان ہے۔

عربی زبان کی تین بہت مشہور قسمیں ہیں، قدیم عربی[۱]، معیاری عربی[۲]، اور روزمرہ[۳] کی بول چال والی عربی،

قدیم عربی ہمارے ملک میں وسیع پیمانے پر پڑھائی جاتی ہے، اس لئے اس کا تذکرہ بیکار ہے، معیاری عربی سے وہ زبان مراد ہے جو مشرق اوسط کے ریڈیو، اخبارات، فلم تھیٹر، یونیورسٹی، قانون سازی اور اہم کانفرنسوں میں استعمال کیجاتی ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس زبان پر دو طرح کے اثرات غالب ہیں، ایک کلاسیکی عربی کے اور دوسرے اس امر کا لحاظ کہ اس زبان کو ریڈیو اور سرکاری سطح کے مذاکرات میں استعمال کے قابل بنایا جائے، دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ معیاری عربی (فصحیٰ) کے قواعد قدیم عربی پر منحصر ہیں، لیکن اس میں جدید تقاضوں کی گنجایش بھی پورے طور پر موجود ہے، چنانچہ اس میں یورپین زبانوں خصوصاً فرانسیسی کے بہت سے الفاظ و محاورات دخیل ہو گئے ہیں۔

ادارہ یا ایجنسی موجود نہیں جہاں سے تجارت کے متعلق صحیح اعداد و شمار اور دوسری معلومات حاصل ہوسکیں، کسی چیز کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیئے یا تو دہلی وزارت کو لکھا جائے یا پلاننگ کمیشن کو، جبکہ انگلستان میں "ٹائمس" اخبار تمام عرب ممالک کے بارے میں ہر قسم کی تفصیل مہیا کرتا ہے، اور باقی معلومات بھی بآسانی دستیاب ہوجاتی ہیں، اب وقت آگیا ہے کہ ہمارے ملک میں یہ افسوسناک صورت حال ختم ہوجانی چاہیئے، میرا خیال ہے کہ ہمیں نہایت سنجیدگی کے ساتھ مشرق وسطیٰ کا مطالعہ کرنا چاہیئے، یہ صحیح ہے کہ عرب ملکوں کو ہندوستان کا مطالعہ کرنے اور اہم تعلقات استوار کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے، اور ہند و شرق اوسط کے تعلقات میں دوطرفہ سردمہری پائی جاتی ہے پھر بھی کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس سلسلہ کی ابتدا اپنی طرف سے کیوں نہ کریں۔

اس سلسلہ میں راقم سطور درج ذیل امور کو نہایت ضروری خیال کرتا ہے،

۱۔ شرق اوسط کی زبانوں کا سیکھنا

۲۔ اس خطہ کی جدید تاریخ کا علم

۳۔ وہاں کے معاشی حالات اور تیل کی صنعت سے نفع اندوزی،

۴۔ ثقافتی، سائنسی اور آثار قدیمہ سے متعلق مطالعہ۔

اس خطہ میں تین زبانیں بولی جاتی ہیں، عربی، فارسی اور ترکی، انھیں اکثر "اسلام کی تین زبانیں" بھی کہا جاتا ہے، ان میں سب سے اہم عربی ہے، یہ مذہب اسلام اسکی شریعت، قوانین، تاریخ اور اس کے آدرشوں کی زبان ہے، اسلام کی صحیح تاریخ کو سمجھنے کے لیئے عربی بہترین وسیلہ ہے، یہ اٹھارہ ۱۸ ملکوں کی سرکاری اور دستی

بڑی محنت کی، فرانسیسی طرز کی عربی زبان کی سب سے پہلی سائنٹفک اکیڈمی کی بنیاد ۱۹۱۹ء میں دمشق میں رکھی گئی جس کا نام "المجمع العلمی العربی" ہے، اس کے بعد ۱۹۳۲ء میں "عربی زبان کی شاہی مصری اکاڈمی" کا قیام عمل میں آیا جو آج "مجمع اللغۃ العربیۃ قاہرہ" کے نام سے مشہور ہے، عربی میں اب فرانسیسی اور انگریزی اثرات بہت نمایاں ہیں، وہاں کی موسیقی، ڈرامہ، نغمے، مصوری، فلم اور ریڈیو میں یورپ کے اثرات کے ساتھ ساتھ عوامی زندگی کی حقیقی جھلک اور روزمرہ بول چال کی زبان کا عکس بدرجۂ اتم موجود ہے۔

ریڈیو کی نشریات اس حقیقت کا بین ثبوت ہیں، کہ مراکش سے عراق تک تمام عرب ملکوں میں ایک یکساں معیاری عربی لکھی اور بولی جاتی ہے، کلاسیکی عربی معیاری عربی کے طرز تحریر اور محاوراتی بول چال سے گو مختلف ہے لیکن وہ اب بھی نہایت مفید اور کارآمد ہے، یہ صحیح ہے کہ جدید عربی زبان کو قدیم عربی کے قواعد کے بغیر سمجھنا دشوار ہے لیکن یہ خیال یقیناً غلط ہے کہ سبعہ معلقات اور المتنبی کو سمجھنے والا طالب علم لازمی طور پر طٰہٰ حسین، خلیل جبران خلیل اور توفیق الحکیم کو بھی اچھی طرح سمجھ سکتا ہے، بیسویں صدی میں تغیرات کی برق رفتاری نے عربی زبان کے مختلف پہلوؤں پر کافی اثر ڈالا ہے، لہذا ہمارے لئے قدیم وجدید دونوں زبانوں کی واقفیت نہایت ضروری ہے، قدیم عربی کی مہارت سے جدید معیاری عربی کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے، فرانسیسی اور مغربی افکار و تصورات کو قبول کرنے کے لئے جدید عربی سے واقف ہونا لازمی ہے، شیخ محمد عبدہٗ جنھوں نے چوالیس[۴۴] سال کی عمر میں فرنچ میں کامل دسترس حاصل کر لی تھی لکھتے ہیں:۔

دنیائے عرب میں مغربی اثرات اس وقت داخل ہوئے جب ۱۷۹۸ء میں نپولین بوناپارٹ نے مصر پر فوج کشی کی تھی، یہی وہ زمانہ ہے جسے ہم عربی ادب کے دور جدید کی ابتدا کہہ سکتے ہیں، میں اسی جدید عربی کی اہمیت پر زور دینا چاہتا ہوں، محمد علی نے مصر کو جدیدیت کا رنگ دینے کی جو کوشش کی تھی اس میں فرانسیسی طور طریقے اور وہاں کے افکار و ثقافت پر کافی زور دیا گیا تھا، بہت سے مشاہداتی وفود فرانس بھیجے گئے اور مصر میں ایسے تعلیمی اداروں کی بنیاد رکھی گئی جن کا طرز تدریس فرانسیسی تھا، وکلا اعلیٰ تعلیم کے لئے فرانس جاتے تھے اور مصر و لبنان میں فرنچ زبان کو وہی اہمیت حاصل ہو گئی تھی جو انگریزی کو ہندوستان کے مہذب طبقہ میں حاصل تھی اور آج بھی یعنی ۱۹۴۹ء تک یعنی رئیس ناصر کے انقلاب سے پہلے اگرچہ فرانسیسی زبان کے اثرات گھٹ رہے تھے اور اس کی جگہ انگریزی (یہاں تک کہ امریکن انگریزی) لے رہی تھی، پھر بھی طٰہٰ حسین جیسے مصنف اور مقرر اور صنہوری جیسے قانون داں فرنچ ہی کو فخریہ استعمال کرتے تھے کیونکہ ان کی تربیت فرانس میں ہوئی تھی، ان میں سے بعض کی بیویاں فرانسیسی تھیں اور ان کے ذہن اسلامی اور عربی اثرات کے باوجود مکمل طور پر فرانسیسی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے،

مغربی زبانوں کے تراجم اور جدید خیالات کی ترجمانی کے لئے دوسری زبانوں کے بہت سے نئے الفاظ بھی استعمال میں لائے گئے لیکن ان بیرونی الفاظ اور افکار کا ردعمل بھی ظاہر ہوا۔ اور متعدد ممتاز ادیبوں و نقادوں نے اس رجحان کی شدید مخالفت کی، فنی اصطلاحات کے وضع کرنے میں جب دشواریاں پیدا ہوئیں تو بعض مصنفین نے ان الفاظ و اصطلاحات کا بدل عربی میں تلاش کرنے میں

لہٰذا قدیم اور معیاری عربی کے ساتھ روزمرہ کی عامی زبان پر بھی توجہ دینا ضروری ہے۔ تاکہ ہم وہاں کے عوام سے بآسانی گفتگو کرسکیں۔ جب میں مصر میں مامور تھا تو اگرچہ مجھے کلاسیکی عربی سے اچھی طرح واقفیت تھی اس کے باوجود قاہرہ کے ایک ادارہ میں میں نے عامی زبان سیکھی، اس کے بغیر کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ لوگ مجھے نحوی جیسے تحقیر آمیز لفظ سے یاد کرتے تھے کیونکہ میری فصیح عربی ہمیشہ مقامی زبان پر غالب آجاتی تھی۔

اسلام کی دوسری اہم زبان فارسی ہے۔ یہ ہندوستان میں وسیع پیمانے پر استعمال ہوتی تھی اس لئے اس کے بارے میں کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں، فارسی ایک آریائی اور ہند مغربی زبانوں میں سے ایک ہے۔ لسانیاتی حیثیت سے اس کا عربی سے کوئی تعلق نہیں جس کا سلسلہ نسب سامی زبانوں سے ملتا ہے اور فارسی کا رشتہ سنسکرت اور یونانی سے قائم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ دارا خود ایرانی فارس نژاد تھا اور آرین قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ زردشتی بھی اپنے کو آریائی نسل سے کہتے ہیں، جدید علماء نے فارسی زبان کو تاریخی اعتبار سے تین قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ قدیم فارسی، عہد وسطیٰ کی فارسی، جدید فارسی، ایران کی قدیم زبانیں۔ ۔۔۔ وسطیٰ اور قدیم فارسی ہیں زردشت مذہب کی مقدس کتابیں قدیم ترین ایرانی زبان میں ہیں۔ اس کا اور ویدک کا زمانہ تقریباً ایک ہی ہے، جدید فارسی (جو پہلوی سے ۔۔۔ نکلی ہے) وہ زبان ہے جس میں فارسی ادب کا ذخیرہ ہے تاریخی اعتبار سے یہ زبان اس پورے ادبی سرمایہ پر مشتمل ہے جو عربوں کی فتح کے بعد لکھا گیا۔ لیکن فارسی ادب صرف ایران تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ زبان تین دوسرے مرکزوں یعنی وسط ایشیا اور ہندوستان اور افغانستان تک پہنچ چکی تھی

"کوئی بھی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ اپنے ملک کے اندر اپنے ملک کی خدمت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے تاوقتیکہ وہ ایک مغربی زبان نہ جانتا ہو۔"

اس سلسلہ میں عوام کی روزمرہ کی عربی کا ذکر بھی ضروری ہے، عامی زبان ہر ملک میں مختلف ہوتی ہے، یہاں تک کہ مختلف ضلعوں کی زبانوں میں فرق ہوتا ہے' یہ فرق عربی میں بھی ہے' اس کی عوامی زبان میں عربی کے قواعد کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا' روزمرہ کی بولی کا فرق مراکش اور یمن سے شام تک یکساں نظر آتا ہے، ظاہر ہے کہ ہم آج کے یونان میں ہومر کی زبان نہیں بول سکتے اور نہ موجودہ انگلینڈ میں ہم شیکسپیر یا مصدقہ ترجمہ والی بائبل (جو ۱۶۱۱ء میں کیا گیا) کی زبان کا استعمال کر سکتے ہیں، اس لئے ہمیں قاہرہ کے بازاروں میں معلقات اور المتنبی کو علیحدہ رکھ کر عوامی سطح پر اترنا لازمی ہے۔

گذشتہ دس برسوں میں یورپ اور مشرق وسطیٰ دونوں جگہوں میں مقامی عربی کے مطالعہ کو کافی فروغ حاصل ہوا ہے، ماہرین لسانیات نے مقامی عربی کی بیس قسمیں دریافت کی ہیں مگر ایک عام ہندوستانی شہری کو کم از کم تین مقامی عربی زبانوں سے واقف ہونا چاہئے یعنی قاہرہ' دمشق اور مکہ معظمہ میں بولی جانے والی زبانیں مثلاً اس کا علم ضروری ہے کہ مصر میں قدیم عربی کا قاف عین سے بدل جاتا ہوا ہے وہاں قہوہ کے بجائے عھوہ بولتے ہیں، خلیج فارس کے علاقوں میں وہی قاف جیم سے بدل جاتا ہے اور مقامی لوگ قاسم کے بجائے جاسم کہتے ہیں اور سوڈان میں وہی لفظ جاسم بن جاتا ہے، اخبار "المقطم" پورٹ سعید پر المعطم کہلاتا ہے جس

جس طرز سے ظاہر کرتے ہیں اسے بھی پورے طور پر سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیئے،

اس مضمون میں گنجائش کم ہے اور مجھے ترکی زبان کے متعلق بھی اپنے خیالات کا اظہار کرنا ہے، اس لئے مختصراً فارسی سے دلچسپی رکھنے والوں کو یہ مشورہ دونگا کہ وہ اس موضوع پر مزید واقفیت حاصل کرنے کے لئے ایک جدید ایرانی مصنف برتلز کا مطالعہ کریں، صرف جامی پر فارسی مطالعہ کو ختم کر دینا بڑی فاش غلطی ہے اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ہم انگریزی ادب کا مطالعہ صرف ایلزبتھ اول کے عہد تک یا عربی کا مطالعہ صرف عہد بنی امیہ تک اور فرانسیسی کا مطالعہ صرف ریسین (Racine) تک کریں۔ ادب کے سدا بہار سرچشمہ میں کوئی بھی مصنوعی رکاوٹ پیدا کرنا نادانی ہے۔ فکر انسانی کا دریا ہمیشہ رواں دواں رہتا ہے اور انسانی ذہن اپنے خیالات کی ترجمانی کے لئے نت نئے طرز اور پیرایے اختیار کرتا رہتا ہے، چنانچہ اردو کی ترقی پسند تحریک کی طرح جدید ایران میں بھی قومی اور مارکسی شاعری کا عنصر غالب ہے۔

اسلام کی تیسری اہم زبان ترکی ہے، عرصۂ دراز تک وہ عربی کے ایک ترمیم شدہ رسم الخط میں لکھی جاتی رہی لیکن اس کا عربی اور فارسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لسانیاتی اعتبار سے وہ وسط ایشیا کی زبانوں میں سے ایک ہے، یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ مغل حکمرانوں کی مادری زبان اگرچہ ترکی تھی مگر وہ ہندوستان میں کبھی رائج نہیں ہوئی، دربار دہلی کی زبان فارسی تھی اور اسی کو یہاں عام مقبولیت حاصل رہی۔ یہاں تک کہ آج ہمارے ملک میں ترکی زبان کا مطالعہ تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے، ہندوستان میں شاید ہی کسی یونیورسٹی میں اعلیٰ پیمانے پر ترکی پڑھانے کا انتظام ہو۔ اس لئے اس خلا کو پر کرنے کی بہت سخت ضرورت ہے،

سترہویں صدی تک ان تینوں مقامات پر پیدا ہونے والا فارسی ادب یکساں معیار کا تھا. لیکن گذشتہ دو صدیوں میں سماجی تغیرات اور سیاسی تبدیلیوں سے وہاں کی فارسی نظم و نثر ایک دوسرے سے کافی مختلف ہو چکی ہے۔ ہندوستان میں فارسی لکھنے اور بولنے کا رواج تقریباً ختم ہو گیا ہے صرف بمبئی کے مقیم چند ہزار ایرانی زرتشتی ہی شاید اب ہندوستانی، فارسی (یعنی دری) کا استعمال کرتے ہیں فارسی مضمون نگاری بھی نہ ہونے کے برابر ہے اور اب وہ محض اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھی پڑھائی جاتی ہے، لیکن افغانستان میں اب بھی سرکاری زبان ہے مجھے ذاتی طور پر وہاں پیدا ہونے والے فارسی ادب کی ترقی کی رفتار اور اس کی قدر و قیمت کا کوئی علم نہیں ہے بہرحال ہم کو فارسی کے اصل مولد ایران کا مطالعہ کرنا اور یہ معلوم کرنا ہوگا کہ قدیم فارسی کی بہ نسبت اس میں کوئی ترقی ہوئی ہے یا نہیں۔

ہمارے ملک میں پڑھائی جانے والی فارسی زبان قطعی غیر حقیقت پسندانہ ہے اس میں محض فردوسی سے جامی (یعنی دسویں پندرہویں صدی) تک کا مطالعہ شامل ہے اس دور کے متعلق بہت سی کتابیں انگریزی فرانسیسی اور فارسی میں موجود ہیں۔ زیر نظر مطالعہ میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ دور جدید میں فارسی نظم و نثر میں کیا تبدیلیاں ہوئی ہیں۔

میں پہلے ایک بنیادی نظریہ کو یہاں پھر دوہراتا ہوں کہ ماضی بلا شبہ ایک عظیم سرمایہ ضرور ہوتا ہے لیکن اسی کے ساتھ تقاضائے وقت کی رعایت بھی ناگزیر ہے، اس لئے ہمیں موجودہ حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جدید فارسی لکھنے، پڑھنے اور بولنے کی صلاحیت پیدا کرنی چاہئے اور جدید ایران کے عوام اپنے مافی الضمیر کو

کے ساتھ ساتھ یہ زبان بھی ترقی کرتی رہی، گذشتہ چار صدیوں میں اسکا شمار اسلام کی تین اہم زبانوں (بشمول، فارسی و عربی) میں ہونے لگا۔ اور آج بھی رومن رسم الخط اختیار کرلینے کے بعد جدید اسلام کا مطالعہ کرنے کے لئے یہ زبان نہایت اہم سمجھی جاتی ہے۔

معادن عثمانی ترکی دراصل ترکمانی (زبانوں کا مجموعہ) کی ایک شاخ ہے۔ اسکا معیار وہ زبان تھی جو سابق قسطنطنیہ اور موجودہ استنبول میں استعمال کی جاتی رہی ہے یعنی الفاظ کو مخفف اور شیریں بنا دیا جاتا ہے، مثلاً خانم کا تلفظ ہانم ہوجاتا اور محمد کے بجائے محمت بولا جاتا ہے، اسی طرح اور بھی مثالیں ہیں۔

اس لئے ظاہر ہے کہ ترکی زبان کی تاریخ کو پوری طرح سمجھنے کے لئے ہمیں مشرق وسطیٰ کے درس و مطالعہ کے کسی اچھے ادارہ میں رہ کر دونوں ہی رسم الخط کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ یہاں ہم ان ابتدائی صدیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں جب وہاں کی شاعری پر فارسی زبان کا اثر غالب تھا اور کمال اتاترک کے بعد کے عہد میں آتے ہیں، یہ ایک حقیقت ہے کہ کمال اتاترک کی اصلاحات نے ترکی میں وہی انقلاب پیدا کیا ہے جیسا محمد دوم کی فتح قسطنطنیہ کے بعد پیدا ہوا تھا، مثلاً تمام مقاصد کیلئے لاطینی حروف کو اختیار کیا گیا، ایک ممتاز نقاد کاپرولوزادہ فواد (Koprulu Zade-Fuad) نے اپنی عالمانہ تحقیقات میں واضح کیا ہے کہ ادب شاعری، سائنس اور فنون لطیفہ سب پر قومی تحریک کا اثر پڑا ہے، زبان کو بہت ہی آسان بنا دیا گیا ہے اور ادب برائے ادب کے بجائے ادب برائے زندگی کے نظریہ کو اپنا لیا گیا ہے علم نجات سائنس، تاریخ اور جدید ادبی موضوعات نے بہت ترقی کی ہے، مثلاً انقرہ یونیورسٹی کی مطبوعات کا مقابلہ بعض یورپی یونیورسٹیوں کی مطبوعات سے پوری طرح کیا جاسکتا ہے۔

لفظ ترک کا وجود (جسے چینی زبان میں "تو کو" کہتے ہیں) سب سے پہلے پانچویں صدی میں ایک خانہ بدوش قبیلہ کے نام کے طور پر ملتا ہے، اس صدی میں ترکوں نے ایک وسیع سلطنت کی بنیاد ڈالی جو منگولیا اور چین کی شمالی سرحد سے بحر اسود تک پھیلی ہوئی تھی، روسی، ترکی اور جرمن اہل علم نے ترکی عوام کی تاریخ کے بارے میں قابل قدر تحقیقات کی ہیں لیکن یہاں اس پر بحث کرنے کی بالکل گنجائش نہیں، خلافت عثمانیہ کے ذکر سے پہلے ایک اہم حقیقت کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ مسلمانوں کے ترکی فتح کرنے اور ترکوں کے اسلام قبول کرنے میں کوئی تعلق نہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تھا کہ "انھیں اس وقت تک سکون سے رہنے دو جب تک وہ تمھارے سکون میں خلل انداز نہ ہوں"! ترک بلا شبہہ نہایت جری اور ناقابل تسخیر قوم تھی جو خود برضا و رغبت اسلام کی حلقہ بگوش ہوئی، ترکی کے تین کروڑ باشندوں کے علاوہ روس میں بھی تقریباً ڈیڑھ کروڑ ترک موجود ہیں۔

آٹھویں اور نویں صدی عیسوی تک ترکی زبان کے ابتدائی حروف تہجی آج سے قطعی مختلف تھے، جو سامی زبان کے رسم الخط کا چربہ تھے، دسویں اور گیارہویں صدی میں ترکوں کے اسلام قبول کرنے پر وہاں عربی حروفِ تہجی رائج ہوئے، یہ سلسلہ بیسویں صدی تک چلتا رہا، لیکن کمال اتاترک کی اصلاحات کے بعد رومن حروف تہجی کی ایک ترمیم شدہ شکل اختیار کی گئی۔

ترکی زبان کی اس ابتدائی تاریخ سے قطع نظر اب ہم دولت عثمانیہ کے ترکی کی طرف توجہ کرتے ہیں عثمانیوں کی زبان (جو عرف عام میں [illegible] ہے) پندرہویں صدی تک تاریخ، سائنس اور ادب میں [illegible] استعمال اور دولت عثمانیہ کے عروج

سلہ [illegible] کا ماخذ معلوم نہیں کیا ہے؟ م

چار جیائی اور دوسری زبانوں کا پورا مطالعہ جس میں ان زبانوں کی جدید روزمرہ اور تحریر میں استعمال ہونے والی معیاری شکلیں شامل ہوں۔

۲۔ فصیح عربی، قدیم فارسی اور کلاسیکی ترکی کے مبادیات کی واقفیت پیدا کرنا۔

۳۔ اٹھارہویں صدی سے عہد حاضر تک کی مشرق وسطیٰ کی تاریخ کا مطالعہ۔

۴۔ کاروبار، تجارت اور معاشیات سے متعلق مطالعے جس میں تیل کے وسائل ان کی تقسیم و فروخت سب شامل ہوں۔

۵۔ زراعت، بنجر زمینوں کو زیر کاشت لانا اور جنگلات اگانا۔

۶۔ ثقافتی مطالعے جس میں سماجیات، قانونی اصطلاحات علم الانسان اور آثار قدیمہ کا علم شامل ہوں۔

۷۔ اس ادارہ کی ترقی کے بعد اس میں فلسفہ مختلف مذاہب کا تقابلی مطالعہ فنون لطیفہ، فن تعمیرات، موسیقی، سائنس اور دوسرے مضامین کو بھی شامل کر لیا جائے۔

اسناد ۱۔ اس ادارہ سے فارغ التحصیل ہونے والے ان طلبہ کو جو ہائی اسکول پاس نہ ہوں اس خطہ میں بولی جانے والی زبان میں مہارت کا سرٹیفکیٹ دیا جائے، یہ ایک سال کا تربیتی نصاب تحریری نیز بولی جانے والی عربی فارسی اور ترکی کی ابتدائی واقفیت پر مبنی ہوگا۔

۲۔ ان تینوں زبانوں میں سے کسی ایک کی مہارت کا ڈپلوما ان طلبہ کو دیا جائے جو انٹرمیڈیٹ سائنس یا آرٹ میں پڑھ رہے ہوں۔ یہ دو سال کا تربیتی کورس ہوگا۔ یہ نصاب ایک زبان کی کامل مہارت، دوسری زبان کی ابتدائی واقفیت

کہا جاتا ہے کہ شیخ الاسلام حسام الدین ابوالمحامد حامد العاصمی نے عربی زبان میں بہت سی دینی کتابیں اور اسلام کی تینوں زبانوں میں نظمیں بھی لکھی ہیں ان کی عربی نظمیں فصیح، فارسی کی لطیف و شیریں اُن کی ترکی شاعری شستہ و رفتہ ہے، کیمبرج یونیورسٹی میں میرے استاد پروفیسر ایڈ ورڈ براؤن عربی، فارسی اور ترکی آسانی سے بول لیتے تھے اور مجھے قوی امید ہے کہ جلد یا بدیر ہندوستان بھی ایسے ممتاز لوگ پیدا کرنے کے قابل ہو جائیگا۔

مذکورہ بالا سطور میں جو کچھ عرض کیا گیا اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ مشرق اوسط کو سمجھنے [illegible] کے تاریخی اور معاشی حالات کا مطالعہ بے حد ضروری ہے انگریزی کے علاوہ بہت سی یورپی زبانوں میں ان سے متعلق کتابیں موجود ہیں، مشرق وسطیٰ میں تیل اور معدنیات کا بڑا ذخیرہ ہے، مغربی طاقتیں تیل کے وسائل کا استعمال کر کے ان غیر ترقی یافتہ اور نسبتاً غریب ممالک کو بے انتہا دولت سے مالا مال کر رہی ہیں [illegible] دولت کو عرب ریاستیں تعلیم، صحت اور تعمیرات کی ترقی پر خرچ کرنا چاہتی ہیں، انھیں لائق اساتذہ، ڈاکٹروں، انجنیروں اور ٹیکنکی ماہرین کی بڑی ضرورت ہے۔ اگر ہمیں اس علاقے کی زبانوں سے واقفیت اور ان کے عوام کے حالات زندگی کا پورا تجربہ ہو تو ان کی نشاۃ ثانیہ کا کام بہت حد تک آسان ہو سکتا ہے۔ اور ہمارے نوجوانوں کو روزگار کے مواقع بھی فراہم ہو سکتے ہیں۔

ہم نے مشرق وسطیٰ سے متعلق ایک مطالعاتی ادارہ کے لئے ایک اجمالی تجرباتی خاکہ تیار کیا ہے۔ جو درج ذیل ہے۔

مقاصد ۱۔ جدید عربی، جدید فارسی، جدید ترکی اور اس کے بعد پشتو، کرد، آرمینیائی،

فارسی اور ترکی میں بھی پیدا کی جائے۔

اس کے بعد جیسے جیسے لائق اساتذہ کا انتظام ہوتا جائے دوسرے مضامین مثلاً فلسفہ قانون، فنون لطیفہ، موسیقی اور فن تعمیر کو بھی شامل نصاب کر لیا جائے۔

لائبریری یہ بہت ضروری چیز ہے اس میں نہ صرف جدید عربی، فارسی اور ترکی کی کتابوں بلکہ جرمن، فرانسیسی، انگریزی، اسپینی اور روسی کتب و جرائد کا ہونا بھی لازمی ہے، ساتھ ہی کل ہند پیمانے پر ایک باصلاحیت اور تربیت یافتہ لائبریرین کا ہونا بھی ضروری ہے۔

عملہ شرائط: جدید عربی، فارسی اور ترکی کی مہارت رکھنے والے لائق اساتذہ بہت ہی کم ہیں، اس لئے کسی استاذ کو اس وقت تک اسٹاف میں مستقل نہ کیا جائے جب تک کہ وہ ان تینوں زبانوں کے علاوہ فرانسیسی میں بھی اچھی خاصی مہارت حاصل نہ کرلے، ترجیحاً وہ اسپینی، روسی اور جرمن زبانوں میں سے بھی ایک جانتا ہو۔

ریسرچ امریکہ اور افریقہ کی یونیورسٹیوں میں مشرق وسطیٰ سے متعلق اداروں کی تعداد روز بروز تیزی سے بڑھتی جارہی ہے، مندرجۂ بالا لیاقت کے آدمیوں کی وہاں سخت ضرورت ہے، لیکن جب تک مشاہروں کا گریڈ معقول نہ ہوگا یہ ادارہ کوئی خاص ترقی نہیں کرسکیگا، صرف ایک امریکہ میں ایسے اداروں کی تعداد ۲۸ ہے جو مشرق وسطیٰ کے متعلق معلوماتی کورس فراہم کرتے ہیں۔

اور اٹھارہویں صدی سے اب تک کی سیاسی تاریخ کے مبادیات پر مشتمل ہوگا۔

۳۔ تین سال کا کورس پورا کرنے والے کو ڈگری دی جائے گی۔ اسکا نصاب تعلیم مندرجہ ذیل ہوگا۔

لازمی مضامین

۱۔ کلاسیکی عربی کی اچھی صلاحیت (جو انٹرمیجیٹ کے معیار کی ہوگی)

۲۔ جدید عربی، فارسی اور ترکی میں سے کسی ایک کی کافی استعداد

۳۔ انیسویں اور بیسویں صدی کی سیاسی تاریخ جو انگریزی اور خصوصاً فرانسیسی ذرائع سے حاصل کی گئی ہو۔

اختیاری مضامین

مندرجہ ذیل مضامین میں سے کسی ایک کی خصوصی مہارت۔

(الف) تجارتی تعلقات، کاروبار اور تیل کے وسائل کا استعمال

(ب) زراعت، ریگستان کی آبادکاری اور جنگلات اگانا۔

(ج) اس خطے کے سامی النسل قبائل کی جغرافیائی تقسیم اسلام کے مختلف فرقوں مثلاً دروزیوں، علویوں اور مشرق اوسط کے دوسرے فرقوں کا علم پیدائش ووفات کے اعداد وشمار اور مختلف قبائل کے باہمی تعلقات۔

(د) قانونی اصطلاحات، سماجی ارتقا، اور عرب قومیت کا تصور۔

(ہ) جدید عربی ادب میں مکمل دستگاہ۔ خصوصاً طٰہ حسین، منفلوطی، عباس محمود العقاد اور توفیق الحکیم جیسے مصنفین کا مطالعہ۔ جدید عربی شاعری میں دسترس معیاری عربی میں مضامین ومقالات لکھنے اور تقریریں کرنے کی سہولت اور بعد میں یہی مہارت

اور فرعون اور ہامان اور انکے لشکروں کو وہ

دکھادیں کہ جس کا ان کی طرف سے (کمزور

اور حقیر سمجھے جانے والوں کی طرف سے)

انکو خطرہ تھا اور جس سے وہ بچنا چاہتے تھے،

اور سب بنی اسرائیل (نہ کہ صرف موسیٰ و من معہ) مستضعفین تھے اور سرزمین فرعون ہی کے (ارض مصر کے) مستضعفین تھے، سورۂ قصص کی مذکورہ آیت کے پہلے یہ آیتہ ہے،

ان فرعون علا فی الارض وجعل اھلھا شیعا یستضعف طائفۃ منھم یذبح ابناء ھم ویستحیی نسائھم انہ کان من المفسدین

یقیناً فرعون زمین میں (سرزمین مصر میں) بہت بڑھ چڑھ گیا تھا اور ڈینگیں مارا کرتا تھا اور اس نے وہاں کے باشندوں کو مختلف گروہوں میں بانٹ رکھا تھا ان میں سے ایک گروہ کو بہت کمزور اور حقیر کر دینا چاہتا تھا، اور انکا زور گھٹانا چاہتا تھا، اس طرح کہ انکے بیٹوں کو ذبح کر ڈالتا تھا اور انکی عورتوں کو زندہ رہنے دیتا تھا، بیشک وہ مفسدین میں سے تھا

اور ظاہر ہے کہ یہ بنی اسرائیل ہی تھے کہ جن کے بیٹوں اور عورتوں کے ساتھ فرعون نے آیت بالا میں مذکورہ طریقہ کار اختیار کر رکھا تھا اسکا ذکر قرآن کی کئی آیتوں میں ہے،

توجس سرزمین میں یہ "مستضعف" تھے، اسی سرزمین پر ان کا "تمکن" اور اسی سرزمین کی "وراثت" ظاہر قرآن کے بالکل موافق ہے، فرعون حضرت موسیٰؑ کے مطالبات کے متعلق یہی تو خیال کرتے تھے، کہ یہ محض اقتدار حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور ان کو اندیشہ تھا کہ ارض مصر پر یہ اقتدار حاصل کر لیں گے جس سے وہ بچنا چاہتے تھے، (جیسا کہ اوپر

آیۂ واورثنٰہا بنی اسرائیل
پر ایک نظر

از جناب مولانا محمد شفیع مجتہد اللہ فرنگی محلی

(۲)

بہرحال "موسیٰ ومن معہ" ارض مصر سے چلے گئے ہوں یا "اسکنوا فی الارض" کے حکم کے ماتحت مصر ہی میں رہے ہوں، تو ایسا ہو سکتا ہے کہ پہلی صورت میں بقیہ بنی اسرائیل کو جو "مومن بموسیٰ" نہ تھے، یا یوں کہا جائے کہ جو حضرت موسیٰؑ کے ساتھ نہ تھے اور دوسری صورت میں کل بنی اسرائیل کو وہ "جنت وعیون وکنوز اور مقام کریم" مل گئے ہوں جن کی وراثت کا ذکر سورۂ شعراء کی آیت مبحوثہ میں "واورثنٰہا بنی اسرائیل" کے الفاظ سے ہوا اور مشارق الارض اور مغارب ارض کے وہ وارث بن گئے ہوں، جیسا کہ سورۂ اعراف میں ہے (آیہ اوپر مذکور ہو چکا ہے) اور "تمکین فی الارض" کے جس ارادۂ الٰہیہ کا ذکر سورۂ قصص میں ہے، بنی اسرائیل کے حق میں جو ارض مصر میں مستضعفین تھے۔ اس کا ظہور ہو گیا ہو۔ سورۂ قصص یہ ہے،

ونرید ان نمن علی الذین استضعفوا	اور ہم ارادہ کرتے تھے کہ زمین (مصر) میں
فی الارض ونجعلھم ائمۃ ونجعلھم	جو لوگ کمزور اور حقیر سمجھے جاتے تھے اور
الوارثین ونمکن لھم فی الارض و	انکا زور گھٹایا جا رہا تھا، ان پر احسان
نری فرعون وھامان وجنودھما	کریں اور انکو پیشوا بنادیں اور انکو (ملک کا)
منھم ما کانوا یحذرون،	مالک بنادیں اور زمین میں با اقتدار کردیں

كَانُوا مُنظَرِينَ ٥ ۔ رو نا آیا اور نہ انکو مہلت دی گئی،

اس آیہ میں اگر "قوماً آخرین" دوسری قوم سے مراد بنی اسرائیل ہیں، جیساکہ اکثر مفسرین کا خیال ہے تو معاملہ اور بھی واضح ہو جاتا ہے، کیونکہ یہاں "کم ترکوا" کے بعد وراثت کا ذکر ہے اور "وراثتِ متروکہ" کا تحقق اسی وقت ہوتا ہے، کہ جو چیز متروکہ ہو وہی دوسرے کو ورثے میں ملی ہوئی ہو، یہ نہیں کہ متروکہ ہو ایک مال اور ملے دوسرا مال اور معاملہ زیر بحث میں "متروکہ" مصر کے جنت وعیون وغیرہ ہیں، تو بھی مصری باغات اور عیون وغیرہ بنی اسرائیل کو ملنا متصور ہوتا ہے نہ یہ کہ متروکہ تو مصری باغات وغیرہ ہوں اور ملے ہوں شام و فلسطین وغیرہ کے باغات وغیرہ۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے ترجمان القرآن جلد دوم میں سورہ اعراف کی ایک آیت کے تشریحی نوٹ میں جس کا ذکر آگے آئیگا تحریر فرمایا ہے کہ شام و فلسطین وغیرہ فرعون کی خراجی اراضی تھی، اگر "خراج فرعون" اور "وراثت بنی اسرائیل" کے سلسلہ میں بھی اسی کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ عجیب و غریب منظر ہوگا، کہ فرعونیوں سے نجات پانے کے بعد پھر فرعونیوں ہی کی زمینوں کی جانب حضرت موسیٰ و من معہ گئے ہوں، تفسیر ماجدی میں "و اورثنا ہا بنی اسرائیل" کے سلسلہ میں یہ عبارت ہے،

"حاکی ضمیر مطلق باغوں اور چشموں وغیرہ کی جانب ہے، خاص مصر ہی کے باغ اور چشمے مراد لئے گئے ہیں، جب بھی حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں مصر کے علاقے دار السلطنت میں شامل ہو گئے تھے، اور یہ میاہ بنی کے زمانہ میں مصر یہود کا وطن از سر نو بن گیا تھا،"

اور سورہ قصص کی آیہ "و نجعلھم الوارثین" کے سلسلہ میں یہ عبارت ہے،

"اس مشیت (و نرید ان نمن الخ) کا ظہور یوں ہوا کہ فرعون کی غلامی سے آزادی نصیب ہوئی، اور آگے چل کر شام و فلسطین کی حکومت مل گئی۔"

ہو چکا ہے) تو وہی ارضِ مصر پر اقتدار ان" مستضعفین کو حاصل ہونا ماننا چاہئے، ورنہ ارادہ الٰہیہ "ونری فرعون وھامان وجنودھما منھم ما کانوا یحذرون" (اور فرعون وہامان اور ان کے لشکروں کو وہ دکھا دیں کہ جن کا ان کی طرف سے ان کو خطرہ تھا، اور اس سے وہ بچنا چاہتے تھے) کا ظہور کیسے ہوتا، ارضِ شام وفلسطین وغیرہ پر "تمکن"، اور ارض شام وفلسطین وغیرہ کی وراثت سے فرعونیوں کا کیا تعلق؟ (بعض حضرات ارض شام وفلسطین وغیرہ کی وراثت قرار دیتے ہیں،

اگر واقعہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ "موسیٰ ومن معہ" نے غرقِ فرعون کے بعد مصر کو چھوڑ دیا تھا، بقیہ بنی اسرائیل مصر ہی میں رہے تو "نجعلھم ائمۃ ونجعلھم الوارثین" (ان کو پیشوا بنا دیں اور ان کو ملک کا مالک بنا دیں، اور زمین میں ان کو با اقتدار کریں) کا ظہور یوں ہوا سکتا ہے کہ "مستضعفین" میں سے "موسیٰ ومن معہ" کو امامت اور پیشوائی کا منصب حاصل ہوا اور بقیہ مستضعفین" (بقیہ بنی اسرائیل) کو "وراثت ارض" (سرزمین مصر کی وراثت) حاصل ہوئی جبکہ "مستضعفین" میں یہ سب داخل تھے، اور ارادہ الٰہیہ کا تعلق انہی کے ساتھ بتایا گیا ہے، سورۂ دخان میں ہے،

کم ترکوا من جنت وعیون و	اور فرعونی لوگ کتنے ہی باغ اور چشمے
زروع ومقام کریم و	(یعنی نہریں) اور کھیت اور عمدہ مکان
نعمۃ کانوا فیھا فاکھین	اور آرام کے سامان جن میں وہ خوش
کذلک واورثنٰھا قوما	رہا کرتے تھے چھوڑ گئے" اسی طرح ہوا
آخرین فما بکت علیھم	اور ہم نے ایک دوسری قوم کو انکا وارث
السماء والارض وما	اور مالک بنا دیا، نہ تو ان پر آسمان اور زمین کو

سے مراد بنی اسرائیل ہوں، لیکن ہو سکتا ہے کہ بنی اسرائیل مراد نہ ہوں بلکہ ہک سوسی حکومت اور اس کے آثار کو بالکلیہ تباہ کرنے والے فراعنہ مصر ہوں، جو نسلاً ہکسوسی نہ تھے قبطی النسل تھے جن سے قبطی النسل شاہنشاہی کا جدید دور شروع ہوا، ان قبطی النسل فراعنہ نے ہک سوسی زمانہ کے تمام آثار ملیا میٹ کر دیئے تھے اسلئے ہم کو ابراہیمؑ و یعقوبؑ و یوسفؑ و موسیٰ علیہم السلام اور غرق فرعون کے متعلق مصری آثار میں کچھ نہیں ملتا اور غالباً اسی جانب قرآن نے "فما بکت علیھم السماء والارض" سے اشارہ کیا ہو، اور کیا عجب ہے کہ انہی قبطی النسل فراعنہ کی شاہنشاہی میں مصر سے بنی اسرائیل کا کلی اخراج ہوا ہے، کیونکہ بنی اسرائیل ہک سوسی جنت و عیون وغیرہ پر قابض ہو گئے تھے، یہ قبضہ عارضی تھا، اس لیے سورۂ شعراء میں صرف "واخرجناھم" کہہ کر وراثت بنی اسرائیل کا ذکر کر دیا گیا ہے اور قبطی النسل فراعنہ کی وراثت کے بیان میں "ترکوا" والے لفظ کے بعد وراثۃ قوماً آخرین" کا ذکر ہے، کیونکہ یہ "وراثۃ" بطور مستقل تملیک کے تھی، اور بنی اسرائیل کی وراثۃ عارضی اور قابضانہ اور دونوں جگہ "وراثت" کے پہلے "کذالک" کے اضافہ سے شاید اشارہ اس جانب ہو کہ یہ وراثت فوری واقع نہیں ہوئی تھی، تدریجی طریقہ سے ہوئی اور اس میں وقت لگا، بنا بریں یہودی روایتوں میں غرق فرعون کے بعد بنی اسرائیل کے مصر سے جس خروج کا ذکر ہے وہ اس میں قبطی النسل فراعنہ کے اخراج والا خروج ہے، نہ کہ غرق فرعون کے بعد تمام بنی اسرائیل کا مصر سے خروج ڈاکٹر عبداللہ یوسف علی مرحوم کا یہ اندازہ غالباً صحیح ہو کہ بنی اسرائیل پر مظالم قبطی النسل فرعون نے کئے، لیکن وہ غرق شدہ فرعون کو بھی غالباً قبطی النسل فرعون سمجھتے ہیں، کیونکہ وہ حضرت موسیٰ کو قبطی النسل فرعون کا معاصر قرار دیتے ہیں، اور قبطی النسل فراعنہ کے جو آثار مل گئے ہیں، ان میں کسی فرعون کے غرق کا تذکرہ تک نہیں ملتا ہے، اور کسی مذہبی روایت سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت موسیٰؑ

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خاص مذکورہ جنّٰت وعیون وغیرہ کی جانب ضمیر کیوں نہ مانی جائے
جبکہ ظاہر یہی بات ہے، جواب میں سوائے اس کے کیا کہا جا سکتا ہے، کہ تاریخ مصر میں اس کا
پتہ نہیں چلتا، لیکن تاریخ مصر میں تو سرے سے فرعونِ موسیٰ و غرق فرعون وغیرہ کا بھی
پتہ نہیں چلتا، صرف مذہبی روایتوں میں ان کا ذکر ہے، اس لئے مانا جاتا ہے، یہ ظاہر قرآن
سے وراثتِ بنی اسرائیل کا جو حال معلوم ہوتا ہے، اسے کیوں نہ تسلیم کیا جائے اور ظاہر سے
عدول کی کیا وجہ قرار دی جا سکتی ہے اور یہ ظاہر قرآن کی توجیہ میں حضرت سلیمانؑ اور یرمیاہ
نبی کے زمانہ کا جو حوالہ دیا گیا ہے تو یہ کہنا تو ویسا ہی ہوا کہ جیسے کہا جائے کہ مغل حکومت ختم
کر کے اللہ تعالیٰ نے اس کی قائم مقام اور وارث موجودہ بھارتی کی حکومت کو کر دیا یا یہ کہا جائے
کہ اشوک کی حکومت کی تباہی کے بعد اس کی قائم مقام اور اس کی وارث اللہ تعالیٰ نے انگریزی
حکومت کو کر دیا وَمِثْلُہٗ بہرحال یہ بھی ایک تاویل ہے، جبکہ اس کی ضرورت نہیں، بغیر اس کے
بھی کام چل سکتا ہے، کما مر اور سورۂ قصص والی آیۃ کے سلسلہ میں جو کچھ تحریر ہوا ہے، وہ کیسے
قابلِ اعتنا مانا جائے، کیونکہ آگے چل کر تو فلسطین کی حکومت مل گئی، والا قول آیۃ ونُری
فرعون وهامان وجنودهما منهم ما كانوا يحذرون، کے مناسب نظر نہیں آتا کما مر
یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ میرے عزیز محترم برزگ کی نظر سے لفظ "ترک"، "وراثت" و "استخلاف"
کے عمومی استعمالات نہ گذرے ہوں گے اور خصوصی استعمال قرار دینے کے لئے قرائن کی ضرورت
نہ محسوس فرماتے ہوں بظاہر مولانا موصوف کی اس تحریر کو ایک تاویل ہی کہا جا سکتا
ہے جس میں وہ منفرد نہیں ہیں لیکن بہرحال تاویل ...... کی کوئی ضرورت نہیں، بغیر اس کے بھی
کام چل سکتا ہے،

اوپر جو کچھ لکھا گیا وہ اس صورت میں ...... تھا کہ سورۂ دخان کی آیۃ مذکورہ میں تو آیۃ

مطبوعات جدیدہ

مبادی تدبر قرآن، مرتبہ مولانا امین احسن اصلاحی، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۲۰۰ مجلد مع گرد پوش، قیمت مجلد ۔ پتہ دار الاشاعۃ الاسلامیہ، کوثر روڈ، اسلام پورہ، لاہور نمبرا،

مولانا امین احسن اصلاحی کو قرآن مجید کے فہم و تدبر کا عمدہ اور بہتر ذوق اپنے استاذ مولانا حمید الدین فراہیؒ سے وراثۃً ملا ہے، ان کی تفسیر "تدبر قرآن" جس کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں، اردو کے تفسیری ذخیرے میں ایک بہت ہی مفید اضافہ ہے، یہ کتاب اسی تفسیر کا مقدمہ اور قرآنیات کے متعلق چار بلند پایہ مضامین پر مشتمل ہے، ان میں سے دوسرے اور تیسرے مضامین جو فکری حیثیت سے زیادہ اہم ہیں، پہلی دفعہ سراے میر کے رسالہ الاصلاح مرحوم میں اور اس کے بعد کتابی صورت میں طبع ہو چکے تھے اب مولانا کے دست راست ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ان کو دو اور نئے مضامین کے ساتھ بڑے اہتمام سے چھاپا ہے، ان میں قرآن کے فہم و تدبر کے لئے اخلاص نیت وعمل تقویٰ و طہارت کی ضرورت و اہمیت اور خارجی و داخلی وسائل بیان کرکے اس کی تردید کی گئی ہے کہ وہ نہایت آسان کتاب ہے، اسلئے محتاجِ غور و فکر نہیں، اس سلسلہ میں قرآن مجید کے نزول کا مقصد، تلاوت آیات تزکیہ اور تعلیم کتاب و حکمت کی تشریح کرکے قرآن میں فکر و نظر کو ضروری

کسی قبطی النسل فراعنہ کے معاصر تھے، جو غرق ہو گیا، صرف کسی فرعون کا ذکر ملتا ہے، مگر وہ کون تھا اس کی صراحت کہیں نہیں ملتی، پھر وہ صورت کیوں نہ مانی جائے کہ جس کا ذکر اوپر میں نے کیا ہے، کہ ہکسوسی نسل کا آخری فرعون حضرت موسیٰؑ کا معاصر تھا، اور وہی غرق ہوا، اور بنی اسرائیل کا مکمل اخراج قبطی النسل فراعنہ کے زمانہ میں ہوا، اور ہکسوسی فراعنہ کے آثار ناپید ہو گئے، اس لئے حضرت موسیٰؑ کا اور غرق فرعون کا، اور حضرت یوسف وغیرہ میں سے کسی کا بھی آثار مصر اور تاریخ مصر میں پتہ نہیں چلتا، اس لئے یہودی کسی روایت یا قرآنی کسی بیان کا انکار اس وجہ سے نہیں کیا جا سکتا کہ تاریخ مصر میں اس کا تذکرہ نہیں، اور آثار مصریہ میں سے کوئی اثر ان امور کے متعلق نہیں

(باقی)

دار المصنفین کی نئی کتاب

حیاتِ سلیمان

مولانا سید سلیمان ندوی کی وفات پر معارف سلیمان نمبر کے شائع ہونے کے بعد ہی سے شائقین کو حیاتِ شبلی کی طرح جانشین شبلی کی ایک مفصل سوانح عمری کا شدید انتظار تھا، مخلص حلقوں کی طرف سے اسکے تقاضے بھی ہوتے رہے، بحمد اللہ انتظار کی مدت ختم ہو گئی، اور توقع کے عین مطابق، وہ حیات سلیمان کے نام سے شائع ہو گئی، یہ کتاب ایک مختصر دیباچہ، نو ابواب، آخر میں اردو فارسی میں چند نظموں و تاریخی قطعات اور ایک ضمیمہ پر مشتمل ہے، جسمیں معارف کے شذرات سے ملک ملت کی فلاح و بہبود و ترقی و اصلاح سے متعلق سید صاحب کے افکار اکٹھا کر دیئے گئے ہیں، شروع میں بہت مفصل فہرست مضامین بھی ہے، یہ کتاب ہر لحاظ سے حیات شبلی کا مثنیٰ، پر از معلومات اور سید صاحب کی شخصیت اور انکے اوصاف و کمالات کی آئینہ دار ہے، مؤلفہ شاہ معین الدین احمد ندوی،

قیمت معہ ۱۵/-

"منیجر"

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۲۰ — دسمبر ۱۹۷۳ء

Dec 1973

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت دس روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

کاتب اقبال احمد

بتایا گیا ہے، آخر میں تفسیر کے بعض قدیم و جدید اصول و نظریات پر تبصرہ و تنقید اور ان اصول تفسیر کا ذکر ہے، جو مصنف کے نزدیک صحیح اور عقل و نقل کے مطابق ہیں قرآن مجید کے طلبہ کو اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے،

صدرنگ، مرتبین جناب نیاز گوالیاری و قمر الزماں مبارکپوری صاحبان

تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۶۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۵ عـہ

پتہ جعفر لائبریری، پوسٹ مبارکپور، ضلع اعظم گڈھ،

اعظم گڈھ کے مشہور قصبہ مبارکپور کے چند پرجوش اور باہمت نوجوانوں نے در جعفر لائبریری، قائم کرکے اس کی جانب سے یہ کتاب شائع کی ہے، اس میں دور حاضر کے تقریباً سوا سو شعراء کی ایک ایک غزلیں شامل ہیں، نوجوان اور ترقی پسند شعراء کے ساتھ، مسلم پختہ فن اور بعض قدیم رنگ سخن کے نمایندوں کا کلام بھی دیا گیا ہے، اور چند مشہور گمنام شعراء بھی شریک کئے گئے ہیں، اس اعتبار سے یہ واقعی اسم بامسمٰی ہے، ہر شاعر کا تعارف اور اسکے کلام کی خصوصیات کا بھی مختصر ذکر ہے، مگر اس انتخاب میں کچھ غیر معروف اور نومشق شعراء کا کلام بھی آگیا ہے، اور جب کہ بعض معروف اور کہنہ مشق شعراء نظر انداز ہوگئے ہیں، اس سے قطع نظر یہ ادبی پیشکش حوصلہ افزائی کی مستحق ہے،

عربی پریڈیشکا، مرتبہ حافظ فضل الرحمٰن صاحب بزمی، تقطیع خورد، کاغذ کتابت اچھی، صفحات ۴۸، ناشر کارخانہ دار المصحت مئو ناتھ بھنجن اعظم گڈھ،

یہ اس سٹ کا پہلا حصہ ہے، جو ہندی کے ذریعہ عربی سکھانے کے لئے لائق مرتب تیار کر رہے ہیں، اس میں حروف و حرکات کی شناخت اور انکی مشق کرائی گئی ہے، امید ہے کہ نوآموزوں کو عربی سکھانے کے لئے یہ مفید ثابت ہوگی،　　"ض"

جلد ۱۱۲ ماہ ذی قعدہ ۱۳۹۳ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۷۳ء عدد ۶

مضامین

شذرات — شاہ معین الدین احمد ندوی، ۴۰۲-۴۰۴

مقالات

ملا محمود جونپوری کے سوانح حیات کے بعض نئے مآخذ، — جناب شبیر احمد خان صاحب غوری ایم اے، ایل ایل، بی، سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش، ۴۰۵-۴۲۶

علم بلاغت کی ابتدا اور ارتقاء — جناب شفیق احمد خاں صاحب ندوی ایم اے علیگ ۴۲۷-۴۴۷

آیۃ "واورثنھا بنی اسرائیل" پر ایک نظر، — جناب مولانا محمد شفیع حجۃ اللہ فرنگی محلی ۴۴۸-۴۶۵

اردو کا اصلاح شدہ رسم خط — جناب غلام رسول صاحب سابق لائبریرین حیدرآباد سٹی کالج (آندھرا پردیش) ۴۶۶-۴۷۱

مکتوب ماسکو — جناب سید اختر امام صاحب ایم اے علیگ پی ایچ ڈی، برلن ۴۷۲-۴۷۵

مطبوعاتِ جدیدہ — "ض" ۴۷۶-۴۸۰

مجلسِ ادارت

بزمِ تیموریہ جلد اوّل

بزمِ تیموریہ جلد اوّل کے پہلے اڈیشن میں تمام مغل سلاطین، اُن کے شاہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے امرا، شعرار و فضلار کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ تھا اب اُس کو بکثرت اضافوں کے ساتھ دو جلدوں میں کر دیا گیا ہے تاکہ تمام مغل سلاطین، اور اُن کے عہد کے ادب و زبان کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجائے پہلی جلد میں بابر، ہمایوں، شہنشاہ اکبر کے علمی ذوق، اور اُن کے عہد کے، اور اُن کے دربار سے متوسل علماء و فضلا، و شعرار کا تذکرہ، اور اُن کے کمالات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس میں اس قدر ترمیم اور اضافے ہوگئے ہیں، کہ اپنے مواد و معلومات کے اعتبار سے بالکل نئی کتاب ہوگئی ہے، اور پہلے اڈیشن سے کہیں زیادہ جامع اور مکمل اور قابلِ مطالعہ، جہانگیر سے لے کر آخری مغل تاجدار تک کی جلد زیرِ ترتیب ہے۔

قیمت :- ۱۲ روپیہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن

سرمایہ فراہم ہو سکتا ہے، گاندھی جی نے اسکی سخت مخالفت کی اور کہا کہ جامعہ کو اسکی اسلامی خصوصیات کے ساتھ قائم رہنا چاہیے، تاکہ اگر کوئی غیرمسلم اسلام کو سمجھنا اور اس کا مطالعہ کرنا چاہے تو جامعہ میں کرسکے، کاش اہل جامعہ گاندھی جی کے اس نقطۂ نظر ہی پر عمل کریں۔

ہم کو خوشی ہے کہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے عزم ظاہر کیا ہے کہ وہ جامعہ کے "بنیادی مقاصد کو فراموش نہ کریں گے اور ماضی سے اس کا رشتہ استوار رکھیں گے اور اسکی کوشش کرینگے کہ اسکے وجود میں وہ شرر باقی رہے جس نے اس ادارہ کو جنم دیا تھا، اور جس کے خاطر ہمارے بزرگوں اور استادوں نے اپنی زندگیاں وقف کی تھیں"، ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انکو اس عزم میں کامیاب فرمائے، یہ انکا بڑا کارنامہ ہوگا۔

دارالمصنفین کے کتب خانہ کی عمارت کو بنے ہوئے ۴۵ سال ہوگئے اس لیے اب یہ عمارت بالکل ناکافی تھی اور عرصہ سے اس میں اضافہ کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی مگر تعمیر کے سامان کے غیر معمولی گرانی اور دارالمصنفین کی مالی حالت اس کی اجازت نہ دیتی تھی، گذشتہ سال جب جناب اکبر علی خاں صاحب گورنر اترپردیش دارالمصنفین تشریف لائے تو اس کی ضروریات معلوم کرکے کتب خانہ کی عمارت کی توسیع اور قلمی نسخوں کی حفاظت کے لیے اترپردیش کی حکومت سے ایک لاکھ کی رقم دلائی، اس سے عمارت کے دونوں بازوؤں پر دو بڑے وسیع کمرے بلکہ ہال زیرتعمیر ہیں، اس سے عمارت میں بڑی وسعت پیدا ہو جائے گی، اور اسکے حسن میں بھی اضافہ ہوگا، باقی رقم قلمی نسخوں کے تحفظ کے وسائل میں صرف ہوگی۔

ناظرین معارف کو معلوم ہوگا کہ دارالمصنفین کا قیام ریاست حیدرآباد کی امداد سے عمل میں آیا تھا، اور جب تک ریاست قائم رہی پانسو ماہوار اس کو ملتے رہے، جو اس زمانہ کے اعتبار سے خاصی رقم تھی، ریاست

جامعہ ملیہ کے نئے وائس چانسلر ڈاکٹر مسعود حسین خاں مقرر ہوئے ہیں، انکا انتخاب ہر حیثیت سے نہایت موزوں و مناسب ہے، وہ پرانے جامعی ہیں اور اپنی علمی قابلیت اور تعلیمی تجربے، سلامت روی، خیالات کے اعتدال و توازن اور شرافت و معقولیت ہر لحاظ سے اس کے مستحق ہیں، وراثت کے اعتبار سے بھی ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم کی جانشینی کا سب سے زیادہ حق انہی کو ہے،

جامعہ کے قیام کا مقصد حکومت کے اثر سے آزاد، ایسی تعلیم تھا جو ملک و ملت دونوں کے تقاضوں کی جامع ہو، اور اس کے تعلیم یافتہ صحیح اسلامیت اور سچی قوم پروری کا نمونہ ہوں، لیکن آزادی کے بعد وہ اس مقصد سے ہٹ گئی تھی اور دوسری سرکاری تعلیم گاہوں کی طرح ایک تعلیم گاہ اور اس دور کی مختلف ازموں کا گڑھ بن گئی تھی، خود دلی میں جامعہ سے بڑی یونیورسٹیاں بلکہ اس سے بڑے پوسٹ گریجویٹ کالج موجود ہیں، اس کا جو کچھ امتیاز تھا وہ اس کی خصوصیات اور مقاصد کی بنا پر تھا، اور آج بھی اس کی امتیازی حیثیت ان ہی سے قائم رہ سکتی ہے۔

اس سلسلہ میں ایک واقعہ کا ذکر بے موقع نہ ہوگا، ایک زمانہ میں جامعہ سخت مالی مشکلات میں مبتلا ہو گیا تھا کسی ہندو لیڈر نے کہا کہ اگر جامعہ سے اسلامیہ کا لفظ نکال دیا جائے تو اسکے لیے

مقالات

ملا محمود جونپوری

(ب) سوانح حیات کے دیگر مآخذ

از

جناب شبیر احمد خانصاحب غوری ایم اے ایل ایل بی سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اترپردیش

(۳)

ساتویں صدی ہجری کے وسط میں محقق طوسی نے اس نظریہ کی تجدید کی اور افلاک ثمانیہ کی تجویز پیش کی، چنانچہ محقق کی کتاب "تجرید الکلام" کے شارح جدید ملا علی قوشجی نے لکھا ہے:-

"وجوز المصنف ان یکون الافلاک ثمانیہ بان یستند الحرکۃ الیومیۃ الی مجموعہا لا الی فلک خاص وذلک بان یتعلق بہا نفس تحرکہا"
(شرح تجرید بر حاشیہ شرح المواقف جلد ثانی صفحہ ۴۱۳)

مصنف نے تجویز پیش کی تھی کہ آسمان آٹھ مان لئے جائیں بایں طور کہ حرکت یومیہ کو ان سب کے مجموعہ کی طرف منسوب کیا جائے نہ کہ کسی خاص مستقل فلک کی طرف اور اس طور پر کہ خود اس کا تحرک اس سے متعلق ہو۔

محقق طوسی کے شاگرد رشید علامہ قطب الدین شیرازی نے اس "آٹھ" کو مزید کم کر کے "سات" کی تجویز پیش کی، چنانچہ انھوں نے اپنی مشہور کتاب "تحفہ شاھیہ" میں لکھا ہے:

"جب میں نے مصنف سے یہ تجویز سنی تو میں نے کہا تب تو سات آسمان بھی ہو سکتے ہیں بایں طور کہ ثوابت اور دوائر بروج کو فلک زحل (ساتویں آسمان) کے محدب پر فرض کریں اور سات

کے خاتمہ کے بعد یہ امداد بند ہوگئی، ادھر چند سال سے نظام ٹرسٹ نے پانسو ماہوار مقرر کر دیئے تھے مگر وہ مستقل نہیں ہیں، دو دو سال کی توسیع ہوتی رہتی ہے، اس لیے دارالمصنفین نے ٹرسٹ سے درخواست کی تھی کہ وہ اتنی رقم یکمشت دیدے جس سے آمدنی کا کوئی مستقل ذریعہ پیدا کر لیا جائے، چنانچہ گذشتہ مہینہ جناب محامد علی صاحب عباسی آئی، اے، ایس نظام ٹرسٹ کی طرف سے دارالمصنفین کے معائنہ کے لیے تشریف لائے تھے، اور اسکے مختلف شعبوں اور بجٹ و حسابات وغیرہ کا معائنہ کر کے مطمئن و مسرور واپس تشریف لے گئے۔

افسوس ہے کہ سلام مچھلی شہری بھی چل بسے، وہ ممتاز ترقی پسند شاعر تھے، اعظم گڈھ اور دارالمصنفین سے ان کے تعلقات بہت پرانے تھے جسکا انھوں نے ہمیشہ لحاظ رکھا، کئی مہینے ہوئے خبر ملی تھی کہ انھوں نے شراب سے توبہ کر لی ہے اس خبر سے قدرۃً خوشی ہوئی، اتفاق سے اسی زمانہ میں انھوں نے جدید طرز میں ایک نعت لکھکر معارف میں اشاعت کیلئے بھیجی، میں نے انکو توبہ پر مبارکباد دی اور لکھا کہ نعت کیلئے پرانا طرز ہی مناسب ہے، انھوں نے جواب میں لکھا کہ انھوں نے شراب سے توبہ کر لی ہے اور دعا فرمایئے کہ خدا استقامت عطا فرمائے اور اپنے موروثی مذہبی اثرات کا بھی حوالہ دیا، اور دوسری نعت لکھکر بھیجنے کا وعدہ کیا، مگر ابھی اسکے ایفا کی نوبت نہ آئی تھی کہ انکا وقت پورا ہو گیا، شراب نے ہمارے بہت سے ہونہار شعرا کو تباہ کیا ہے، شکر ہے کہ سلام اس سے تائب ہو گئے تھے، جو انکی عاقبت کے لیے فال نیک ہے، اللہ تعالیٰ انکی توبہ قبول اور انکی مغفرت فرمائے۔

اس سال سعودی حکومت نے مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی، مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی اور راقم الحروف کو حج کی دعوت دی ہے، جس وقت یہ پرچہ ناظرین کے ہاتھوں میں پہنچے گا، راقم روانہ ہو چکا ہوگا، ناظرین معارف دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ حج قبول فرمائے، اور بخیریت واپس لائے اب انشاء اللہ فروری میں ملاقات ہوگی۔

لیکن اسلامی علم الہیئت کی اس دیرینہ روش کے برخلاف جو بنو موسیٰ (تیسری صدی ہجری کا وسط) کے زمانہ سے لے کر امام الدین ریاضی (بارہویں صدی ہجری کا آغاز) کے عہد تک "تقلیل تعداد افلاک" کی تجویز پر مصر رہی تھی، فاضل جونپوری نے "تکثیر تعداد افلاک" کے احتمال پر زور دیا۔ شاید جمہور ماہرین علم الہیئت کی اس سنت دیرینہ کے خلاف انحراف کی تہ میں مابعد الطبیعاتی فلسفہ کے قدیم میلانات غیر شعوری طور پر کارفرما رہے ہوں، جو کثرت عقول کے درپے اثبات تھے، ہر فلک کے ساتھ ایک "عقل" وابستہ ہے۔ لہٰذا جتنی "عقول" ہونگی، ان سے ایک کم تعداد افلاک کلیہ کی ہوگی اور جتنے افلاک ہونگے، ان سے ایک زیادہ تعداد "عقول" کی ہوگی۔

مگر کواکب سیارہ کے افلاک کلیہ [illegible] کوئی گنجائش نہیں تھی، ہر سیارہ ایک فلک میں [illegible] منفرد اور بسیط ہے، مگر گنجائش [illegible] ہے تو فلک [illegible] کواکب ثابتہ [illegible] ہر ستارہ ایک مستقل فلک میں مرکوز ہو اور چونکہ ثوابت مرصودہ کی تعداد ایک ہزار بائیس یا ایک ہزار پچیس ہے، اس لئے افلاک کلیہ کی تعداد ایک ہزار تیس یا اس سے زائد ہو سکتی ہے۔ یا کئی کئی کواکب ثابتہ ایک آسمان میں جڑے ہوئے ہوں، اس طرح بھی ان کی تعداد میں معتدبہ کثرت کا احتمال ہے۔

بہرحال ملا محمود جونپوری نے تعداد افلاک میں تقلیل کی کوشش کی رسم دیرینہ کے علی الرغم اس میں تکثیر کے احتمال کو اجاگر کیا اور فرمایا:۔

وهذا الاكتفاء بفلك واحد للثوابت انما هو قناعة منهم على ما لا بد منه في انتظام الامر و [illegible] اثبات التخيل، لا جزم بنفي [illegible] ان يكون [illegible] ثوابت عدة

کواکب ثابتہ کے لئے ایک ہی فلک پر اکتفا کرنا صرف حکماء سابقین کی (فلک واحد پر) قناعت کرنے کی بنا پر تھا، جو کائنات کے حسن منظم نیز زیادتی [illegible] بچنے کے لئے ناگزیر تھا۔

آسمانوں کے مجموعہ کے ساتھ یہ قوت محرکہ متعلق ہو جو اسے حرکتِ اولیٰ کے ساتھ گردش دیتی ہو اور ایک اور قوت محرکہ ساتویں آسمان کے ساتھ متعلق ہو جو دوسری حرکت کے ساتھ اسے گردش دیتی ہو لیکن شرط یہ ہے کہ دوائر بروج حرکت سریعہ کے ساتھ (نہ کہ حرکتِ بطیئہ کے ساتھ) حرکت کرتے ہوئے فرض کئے جائیں تاکہ اُن میں ثوابت ایک برج سے دوسرے برج میں منتقل ہوتے رہتے ہیں جیسا کہ واقع میں ہوتا ہے"

(قطب شیرازی فرماتے ہیں کہ محقق نے اس تجویز کو بہت زیادہ پسند کیا ہے اور بڑی تعریف کی" (شرح تجرید صفحہ ۴۱۳-۴۱۴)

نویں صدی کے وسط میں قاضی زادہ رومی نے ہیئت افلاک ہشتگانہ کی تجویز کا اعادہ کیا۔

"ویمکن ان ینسب حرکۃ فلک الافلاک الی مجموع [illegible] بان یتعلق بہا نفس واحدۃ تحرکہا بہذا الحرکۃ فیستغنی [illegible] (شرح چغمینی ص ۲۲)

اور ممکن ہے کہ فلک الافلاک کی (مزعومہ) حرکت کو (باقی) آٹھ [illegible] کے مجموعہ کی طرف منسوب کیا جائے بایں طور کہ اس سے ایک نفس متعلق ہو جو اسے اس حرکت کے ساتھ گردش دیتا ہو، اس وقت نویں آسمان کی حاجت نہیں رہتی۔

متاخرین میں امام الدین ریاضی قطب شیرازی کی تجویز کا امتحان کرتے ہیں اور فرماتے ہیں:-

"والاکتفاء بالسبع بفرض الکواکب فی ممثل زحل ودوائر البروج علی محدب ممثلہ علی ما ذکرہ العلامۃ فی التحفۃ ممکن"

(التصریح صفحہ ۶)

اور سات آسمانوں پر اکتفا کرنا بھی ممکن ہے، جیسا کہ علامہ قطب الدین شیرازی نے "تحفہ شاہیہ" میں ذکر کیا ہے، بایں طور کہ کواکب ثابتہ کو زحل کے ممثل میں فرض کیا جائے اور [illegible] اس کے ممثل کی سطح محدب پر

فلک کا ستارہ گہنایا ہے وہ گہنانے والے

(شرح چغمینی صفحہ ۲۱۲) ستارے کے فلک کے اوپر ہوگا۔

لیکن یہ اصول آفتاب کی وضع متعین کرنے میں معاون نہیں ہوسکتا کہ آیا وہ فلک مریخ کے نیچے اور زہرہ سے اوپر ہے یا نہیں، کیونکہ آفتاب کا ان دونوں ستاروں کے ساتھ اقتران ہوتا ہے تو وہ اس کی تیز اشعہ کے تحت مضمحل ہوجاتے ہیں، لہذا ماہرین نے اس کے تیقن کے لئے دوسرے اختبارات وضع کئے، یہ نیا طریقہ "اختلاف المنظر" کا تھا، کیونکہ مریخ کا "اختلاف منظر" نہیں ہوتا، اس لئے ثابت ہوا کہ وہ آفتاب سے اوپر ہے،

مگر آفتاب کا عطارد و زہرہ سے اوپر ہونا اس طریقہ "اختلاف المنظر" سے متعین نہیں ہوسکتا. کیونکہ اختلاف منظر "آلہ ذات الشعبتین" کے ذریعہ معلوم کیا جاتا ہے، مگر جب یہ دونوں ستارے (عطارد و زہرہ) آلہ ذات الشعبتین کے قریب پہونچتے ہیں تو عام طور پر مرئی نہیں رہتے، اس لئے یہاں طریقہ اختلاف المنظر، ناکام ہوجاتا ہے،

اس لئے مزید تحقیق "ابعاد و اجرام" کے اصولوں کی مدد سے کی گئی، ظاہر ہے جو جرم فلکی ہم سے قریب ہوگا، اس ستارے سے نیچے ہوگا جو ہم سے دور ہے، چونکہ آفتاب کا بعد زہرہ کے بعد سے اور موخر الذکر کا بعد عطارد کے بعد سے زیادہ ہے، اس لئے زہرہ آفتاب کے نیچے اور عطارد زہرہ کے نیچے ہوگا،

بہرحال قدماء (جن میں بطلیموس صاحب المجسطی خصوصیت سے قابل ذکر ہے) آفتاب کے عطارد و زہرہ سے اوپر ہونے کے قائل تھے، اگرچہ اس قائل ہونے میں تحقیق سے زیادہ خوش فہمی کی کارفرمائی تھی، کیونکہ آفتاب نیر اعظم ہے اس لئے یہ بار کے شمسہ (واسطۃ العقد) کی طرح نظام سیارات کے وسط میں ہونا چاہئے، تین سیارے قمر، عطارد اور زہرہ اس کے نیچے

افلاک اما بازاء کل کوکب فلک او دون ذلک۔"

اس کی وجہ فلک ثوابت میں کثرت افلاک نہ ہونے کے یقین پر مبنی نہیں تھی، بس اس بات کا بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ فلک ثوابت کے اندر بھی متعدد اور کثیر تعداد میں افلاک ہوں خواہ ہر ستارے کے لئے ایک مستقل فلک یا اس سے کم تعداد میں

(شمس بازغہ صفحہ ۱۴۲)

دوسرا مسئلہ "ترتیب افلاک" کا تھا۔ اس سلسلے میں قاضی زادہ رومی نے فرمایا تھا:۔

"واما ترتیبہا علی الوجہ المذکور فلان المحرک الکل ینبغی ان یکون محیطاً بہ و...... وان بعض الثوابت منکسف بزحل المنکسف بالمشتری المنکسف بالمریخ المنکسف بالزہرۃ المنکسفۃ بعطارد والقمر کاسف للشمس۔ ولا شک ان فلک المنکسف فوق فلک الکاسف۔"

رہی ان کی ترتیب سابق میں مذکور انداز پر تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جسم فلکی جو جملہ افلاک کا محرک ہے اس کے مناسب حال یہی بات ہے کہ وہ سب پر محیط بھی ہو... اور چونکہ بعض کواکب ستارہ زحل سے گہنا جاتے ہیں، زحل مشتری سے گہنا جاتا ہے، مشتری میں ستارہ مریخ سے گہن آجاتا ہے، مریخ ستارہ زہرہ سے منکسف ہو جاتا ہے اور چاند سورج کا کاسف ہے اور اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر ایک فلک کا جڑا ہوا ستارہ دوسرے فلک (میں جڑے ہوئے) ستارہ کا کاسف ہو تو جس

کہ میں ایک دن اپنے مکان کی چھت پر تھا، میں نے طلوع آفتاب کے وقت اس میں (آفتاب پر) دو تل جیسے پائے، پس میں نے زیچ کی مدد سے زہرہ و عطارد کی تقویموں کا استخراج کیا اور اعین تقویم آفتاب کے نزدیک پایا، اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ دونوں "تل" زہرہ و عطارد تھے۔ (شرح چغمینی صفحہ ۲۳ حاشیہ ۵)

مگر رصدگاہ مراغہ کے بعض کارکن بقول

ہم اگلے جانبوالوں کی تقلید کیوں کریں   اے خوردہ گیر نحن رجال ہم رجال

خود کو اس تقلید جمہور کا گلے میں پٹہ ڈالنے پر راضی نہ کر سکے، چنانچہ صاحب "تحفہ شاہیہ" (قطب الدین شیرازی) اور مؤید الدین عرضی نے یہ نظریہ پیش کیا کہ آفتاب زہرہ اور عطارد کے درمیان ہے یعنی زہرہ سے نیچے اور عطارد کے اوپر ہی نہیں بلکہ انھوں نے عطارد کی بعید ترین دوری اور آفتاب کی قریب ترین دوری نکال کر یہ معلوم کیا کہ دونوں کے فرق میں سیارہ زہرہ کی تدویر بھی نہیں سما سکتی، اس کے ممثل کا تو کیا مذکور، اس لئے وہ اس حتمی نتیجے پر پہونچے کہ فلک الشمس کا فلک زہرہ کے اوپر ہونا ممکن ہے[2]،

بلکہ بعض قدیم ہیئت دان یہاں تک کہتے تھے کہ فلک شمس فلک زہرہ اور فلک عطارد دونوں کے نیچے ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ دونوں اس کے کاسف ہو جایا کرتے[3]،

غالباً یہ سب قیل و قال اور مختلف کواکب کی باہمی فوقیت اور تحتیت دریافت کرنے کے گوناگوں طریقے فاضل جونپوری کے پیش نظر تھے مگر چونکہ فلسفہ کی کتاب میں ان جزئی تفصیلات کی گنجائش نہیں تھی، اس لئے انھوں نے "خیر الکلام ما قل و دل" کے مصداق اس پر حسب ذیل مبصرانہ تبصرہ فرمایا۔

---

[1] شرح چغمینی صفحہ ۲۲، [2] ایضاً ص ۲۲ حاشیہ ۱۱، [3] ایضاً ص ۲۳

اور تین سیارے مریخ، مشتری، اور زحل، اس کے اوپر لیکن بطلیموس نے علم الابعاد والاجرام کی مدد سے بھی اس کی تصدیق کر لی تھی،

متاخرین بھی اسی نظریے کے قائل تھے، چنانچہ قاضی زادہ رومی نے لکھا ہے :-

"فذہب بعض القدماء الی انہا فوقہا استحساناً لتوسط الشمس بین السیارات بمنزلۃ شمسۃ القلادۃ ..... والیہ مال صاحب المجسطی وقد تاکد ہذا الرای عندہٗ لما رای ابعاد الشمس المعلوم بطریقۃ معلومۃ فی الابعاد والاجرام مناسبا لہذا وعلیہ جمہور المتاخرین"

(شرح چغمینی صفحہ ۲۱۳)

بعض قدیم ماہرین علم الہیئت اس جانب گئے کہ وہ (آفتاب) ان دونوں (زہرہ وعطارد) سے اوپر ہے اس کی وجہ ان ماہرین کا آفتاب کو سیاروں کے بیچ بیچ میں فرض کرنا تھا جیسے ہار کے اندر واسطۃ العقد بیچ میں ہوتا ہے ..... اور اسی جانب (بطلیموس) مصنف کتاب المجسطی کا میلان ہے، بعد میں جب اس نے علم الابعاد والاجرام میں مذکورہ طریقوں سے آفتاب کی دوری اور اسی طرح زہرہ وعطارد کی دوریاں دریافت کیں تو اس رائے کی مزید تائید حاصل ہو گئی۔ اور اسی ترتیب کے جمہور متاخرین ماہرین علم الہیئت قائل ہیں،

اس "نظریۂ متوکہ" کی تائید بعض ماہرین علم الہیئت (جن میں شیخ بو علی سینا بھی شامل ہے) کے اس مشاہدہ سے ہوئی کہ انھوں نے زہرہ کا اس طور پر مشاہدہ کیا گویا وہ آفتاب کے چہرے پر تل ہے[۱] اور ابن ماجہ اندلسی نے تو حسب روایت صاحب نہایۃ الادراک "یہاں تک لکھا ہے"

[۱] شرح چغمینی صفحہ ۲۲،

بعد ایک دوسرے یونانی ہیئت دان کالیپس (callippus) نے جب اس طرح کی منضبط حرکات کو واقعی حرکات سے مختلف پایا تو ان افلاک جزئیہ کی تعداد میں مزید اضافہ کیا اور اس طرح اس کے یہاں ان افلاک جزئیہ کی تعداد تینتیس ۳۳ ہو گئی۔ ارسطو نے بھی اصولاً اسی مفروضہ کو اپنایا، صرف افلاک جزئیہ کی تعداد میں اضافہ کر دیا، اسکے یہاں یہ تعداد بڑھ کر پچپن ۵۵ ہو جاتی ہے، بعد کے ماہرین فلکیات نے بھی اسی مفروضہ کو معمول بہ بنایا۔

البتہ اپلونیوس (Apollonuus) نے "ہم مرکز کروں" (Concentric spheres) کے نظریہ کے بجائے "خوارج" (Eccentrics) اور "تداویر" (Epicycles) کے نظریہ کے ذریعہ سیاروں کی حرکات منضبط کرنے کا اصول پیش کیا، اس طرح افلاک جزئیہ کی تعداد خاصی کم ہو گئی،

بہرحال اپلونیوس کے پیش کردہ اصول کو ابرخس (Hipparchus) زمانہ دوسری صدی قبل مسیح) نے آفتاب و ماہتاب کی حرکات منضبط کرنے میں استعمال کیا، اس کے تین سو سال بعد بطلیموس نے اس اصول کو جملہ سیاروں کے باب میں استعمال کیا اور اس طرح اس نظامِ ہیئت کو سرحد تکمیل تک پہونچایا جو اس کے نام پر "بطلیموسی نظامِ ہیئت" کہلاتا ہے، اس کا شاہکار "کتاب المجسطی" ہے۔

عہد اسلام میں بھی یہی نظام ہیئت مسلمان ہیئت دانوں میں مروج رہا۔ دوسری صدی ہجری کے نصف آخر میں "المجسطی" کا باقاعدہ طور پر سرکاری سرپرستی میں عربی کے اندر ترجمہ ہوا[1] اور وہ اس فن کی معیاری اور معتمد علیہ کتاب سمجھی جانے لگی، کچھ معمولی تعدیلات کے ساتھ بعد کے مسلمان ماہرین علم الہیئت نے اسی نظام ہیئت کے اصولوں کا اتباع کیا۔

---

[1] الفہرست لابن الندیم ص ۳۷۴،

"وتوسلوا الی معرفة نضدها و ترتیبها بلحاظ کسف بعضها بعضاً و عدم اختلاف المنظر فی بعض و وجوده بقلة او کثرة فی بعض آخر الی غیر ذلک من الوجوہ"

(شمس بازغہ ص ۱۴۳)

اور ماہرین علم الہیئت کی سیارات سبع کی اس تنظیم و ترتیب کی معرفت کی جانب اس بات کے ذریعہ رسائی ہوئی کہ بعض سیارے دوسرے سیاروں کے کاسف ہوتے ہیں، بعض میں اختلاف المنظر بالکل نہیں ہوتا بعض میں ہوتا ہے کسی میں کم کسی میں بہت زیادہ، اور اسی طرح کے دوسرے طریقے،

ہاں یہ ممکن ہے کہ اگر وہ رصدگاہ تعمیر کرانے میں کامیاب ہو جاتے تو نہ صرف ان مروجہ طریقوں ہی کی تائید و اصلاح کرتے بلکہ شاید اس مسئلۂ لاینحل کی گتھی سلجھانے کے لئے کچھ نئے طریقوں کا بھی اختراع فرماتے،

مگر افلاک کلیہ کی تعداد سے زیادہ پیچیدہ اور لاینحل "افلاکِ جزئیہ" کی تعداد کا مسئلہ تھا، اس کی تفصیل یہ ہے:۔

علم الہیئت کا آغاز یونان میں ہوا، اس کا مقصد اجرام سماوی کی سیر و گردش کو منضبط کرتا تھا، سائنٹفک بنیادوں پر اس کی ابتدا افلاطون نے کی، اس نے ہیئت دانوں کے سامنے سیاروں کی گردش کو قابلِ تعدیل تشابہ حرکات دوریہ کے مفروضہ کے ذریعہ منضبط کرنے کا مسئلہ رکھا، اس کے شاگرد ایوذوکس (Eudoxus) نے ہر سیارہ کی حرکات کا انضباط افلاکِ جزئیہ کی حرکاتِ دوریہ کے مجموعی نتیجے (Resultant) کی مدد سے کرنے کی کوشش کی، اس کے مجوزہ نظام میں افلاکِ جزئیہ کی تعداد چھبیس[۲۶] تھی، اس کے

(شرح تجرید جلد ثانی ص ۱۸۱۴) ہم ذکر کر چکے ہیں،

بعد ہیں متاخرین نے اس تعداد میں مزید اضافے کئے ہیں، چنانچہ علامہ خضری کے یہاں یہ تعداد پچاسی ۸۵ تک پہونچ گئی ہے، اسی کی طرف فاضل جونپوری نے شمس بازغہ میں اشارہ کیا تھا،

"وقد زاد المتاخرون لذلک افلاکا واختلفوا فی تصویرہا من اراد الوقوف علیہ فلیرجع الی شروح التذکرہ"

اسی وجہ سے متاخرین علمائے علم الہیئت نے افلاک (جزئیہ) کی تعداد میں اضافے کئے اور انکی صورت کشی میں اختلاف کیا جو اس (کی تفصیل) پر واقف ہونا چاہئے، اسے (محقق طوسی کی کتاب التذکرہ فی الہیئۃ" کی شرح سے رجوع کرنا چاہئے،

(شمس بازغہ ص ۱۴۳)

معلوم نہیں اور مصنفوں نے ان افلاک جزئیہ کے تعدد و تکثر کی کوئی توجیہ کی ہے یا نہیں، علم الہیئت کی متداول کتابوں میں تو صرف ان کی ساخت اور صورت کو محض ادعائی انداز میں بیان کیا گیا ہے، جسکا ماحصل یہ ہے کہ جملہ افلاک جزئیہ کی تعداد بشمول فلک الثوابت چوبیس ۲۴ ہے تفصیل ذیل

۱۔	فلک اطلس	۱	۶۔	فلک شمس	۲ ممثل، خارج المرکز
۲۔	فلک الثوابت	۱	۷۔	فلک زہرہ	۳ ممثل، حامل، تدویر
۳۔	فلک زحل	۳ ممثل، حامل، تدویر	۸۔	فلک عطارد	۴ ممثل، مدیر، حامل، تدویر
۴۔	فلک مشتری	۳ ممثل، حامل، تدویر	۹۔	فلک قمر	۴ جوزہر، مائل، حامل، تدویر
۵۔	فلک مریخ	۳ ممثل، حامل، تدویر		جملہ	۲۴

ساتویں صدی ہجری کے وسط تک افلاک جزئیہ کی تعداد چوبیس[۲۴] سمجھی جاتی تھی محقق طوسی نے تجرید الکلام" اور "التذکرہ فی الہیئت" کے اندر یہی تعداد بتائی ہے، چنانچہ وہ تجرید الکلام" میں لکھتے ہیں:۔

"الفصل الثانی فی الاجسام وہی قسمان فلکیۃ وعنصریۃ، اما الفلکیۃ فالکلیہ منہا تسعۃ واحد منہا غیر مکوکب محیط بالجمع وتحتہ فلک الثوابت، ثم افلاک الکواکب السیارۃ السبعۃ علی الترتیب ویشتمل علی افلاک تداویر وخارجۃ المراکز المجموع اربعۃ وعشرون"

فصل ثانی در باب اجسام، اجسام کی دو قسمیں ہیں، اجرام فلکیہ اور اجسام عنصریہ جہانتک اجرام فلکیہ کا تعلق ہے تو ان میں افلاک کلیہ کی تعداد نو ہے جن میں سے ایک بغیر سیاروں کا ہے جو تمام افلاک وعناصر پر محیط ہے، اس کے نیچے فلک ثوابت ہے پھر سیارات سبعہ کے افلاک ہیں ترتیب مشہور کے مطابق اور (ان افلاک میں ہر فلک (افلاک جزئیہ یعنی) تداویر اور خارج المرکز پر مشتمل ہے اور ان سب کی مجموعی تعداد چوبیس[۲۴] ہے۔

(شرح تجرید ج ۲ ص ۲۱۲، ۲۱۳)

لیکن "تجرید الکلام" کے شارح علامہ قوشجی کے یہاں یہ تعداد پچیس[۲۵] ہے، چنانچہ وہ شرح تجرید جدید" میں فرماتے ہیں:۔

"فعدد الافلاک الجزئیۃ تصیر ستۃ عشر وہی مع الافلاک الکلیۃ التسعۃ ترتقی الی خمس وعشرین علی ما ذکرنا۔

پس افلاک جزئیہ کی تعداد سولہ[۱۶] ہو جاتی ہے اور وہ نو افلاک کلیہ کے ساتھ مل کر پچیس[۲۵] تک پہونچ جاتے ہیں جیسا کہ

علیٰ مناطق و اقطاب معینۃ، بحیث لایکون
فی شیٔ من الحرکات البسیطۃ اختلاف و
یلتئم من عدۃ عدۃ متعلقۃ بکوکب کوکب
ماینتظم بہ حالات ذلک الکوکب، ویلزم
بالعرض اختلافاتہا علیٰ ما یتکفل بتفصیلۃ
مفصلۃ صناعۃ المجسطی"

(ساکن ہو جاتا ہے یا قسر قاسر سے وہ ٹھہر جاتا
ہے یا جس طرح حرکت قسریہ میں ہوا کرتا
ہے کہ جب قوت قاسرہ ختم ہو جاتی ہے،
(تو جسم ساکن ہو کر ٹھہر جاتا ہے) اور نہ
(افلاک بسیطہ کی حرکات بسیطہ میں انعطاف
(مڑنا) ہی ہوا کرتا ہے جیسا کہ حرکت قسریہ
سے حرکت طبیعیہ میں منتقل ہوتے وقت
ہوتا ہے، یا اس طرح کے دوسرے امور،
کیونکہ ان اجرام فلکی کا مرتبہ اس سے کہیں
بلند ہے کہ ان کے اندر تفاوت حال راہ
پا سکے سوائے اس کے جو ان حرکات دوریہ
کے بسائط کا مقتضا ہو، ایسی حرکات دوریہ
جو (مرور زمان کے باوجود) ہمیشہ ایک ہی
نہج پر مستمر رہتی ہیں مجبوراً انھیں ہر سیارہ
کی گردش کے لئے بہت سے افلاک جزئیہ
ثابت کرنے پڑے جو مخصوص مراکز کے گرد
مختلف المقادیر حرکتوں کے ساتھ مخصوص
ومتعین مناطق اور اقطاب پر گردش
کرتے ہیں، اس طرح کہ ان کی حرکات

بہرحال شارح چغمینی ہوں یا مصنف "تشریح الافلاک" افلاک جزئیہ کے پیچیدہ نظام کی توجیہہ کسی نے نہیں کی، اس کوتاہی کو فاضل جونپوری نے پورا کیا چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"وہم لما لاحظوا احوال السیارات فوجدوا فی حرکۃ کل منھا اختلافاً بالسرعۃ تارۃ والبطوء اخری، وفی المتحیرۃ منھا مع ذلک اختلافاً بالاستقامۃ والرجعۃ والمعطیات من الاصول تدفع ان تکون فی حرکات الافلاک البسیطۃ اختلاف بالاشتداد والانتقاص فی السرعۃ والبطوء کما یکون فی الحرکات الطبیعیۃ والقسریۃ علی ما علمت ولا وقوف کما یکون فی الطبیعۃ ببلوغ المکان الطبیعی او قسر قاسر وفی القسریۃ بانتہاء القوۃ القاسرۃ وغیرہ ذلک او انعطاف کما یکون من قسریۃ الی طبیعیۃ او نحو ذلک، فان تلک الاجرام متعالیۃ عن ان یتطرق الیہا تفاوت احوال الا ما یقتضیہ بسائط حرکاتہا الدوریۃ المستمرۃ علی نہج واحد، لاجرم اثبتوا الکل افلاکاً علی مراکز مخصوصۃ یتحرک بحرکات متقدرۃ

جب علمائے ہیئت نے سیاراتکے حال کا ملاحظہ کیا تو اُن میں سے ہر ایک کی حرکت میں اختلافات پائے کہ کبھی یہ حرکت سریع ہو جاتی ہے اور کبھی بطی (ان سیارات سبع میں سے خصوصیت کیساتھ، متحیرہ میں ان کی "استقامت" اور "رجعت" کے بھی اختلافات پائے، حالانکہ اصول و مبادی (علم حکمت) کے ضابطے یہ ماننے کے مخالف ہیں کہ افلاک بسیط کی حرکتوں میں سرعت اور بطو کے اندر شدت اور کمی کے اختلافات ہوں، جیساکہ حرکت طبیعہ اور حرکت قسریہ میں ہوا کرتا ہے جیساکہ تمہیں معلوم ہو چکا ہے، اور نہ ہی ان اجرام فلکیہ کی حرکتوں میں (واقعی) سکون و وقوف اور ٹھہراؤ ہی ممکن ہو سکتا ہے جیساکہ حرکت طبیعی میں ہوا کرتا ہے (کہ جسم متحرک، اپنے مکان طبیعی میں پہونچکر

لیکن اس سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا کہ کواکب متحیرہ میں ان کی تداویر کے مراکز کیوں ایک موہوم فلک کے مرکز کے گرد حرکت متشابہ کے ساتھ گردش کرتے ہیں جسکا نام معدل المسیر ہے، اسی طرح فلک قمر میں اس کی تدویر کا مرکز کیوں فلک مائل کے مرکز کے گرد جو مرکز عالم پر منطبق ہے، حرکت متشابہ کے ساتھ چکر لگاتا ہے، حالانکہ انہیں اپنے حوامل کے مرکز کے گرد حرکت متشابہ میں گردش کرنا چاہئیے تھا جیساکہ اصول کا مقتضا تھا،

غرض یہ مسئلہ بطلیموسی نظام ہیئت میں لانحل رہا، اگرچہ بعد میں متاخرین نے اس اختلاف (Anomaly) کو حل کرنے کے لئے افلاک جزئیہ کی تعداد میں اضافہ کیا جیسا کہ فاضل خضری نے کیا، اس کی طرف نیز اس باب میں فاضل جونپوری کے مشورہ کی جانب سابق میں اشارہ کیا جاچکا ہے،

"شمس بازغہ" اصولاً فلسفہ کی کتاب ہے جس کا موضوع جمہور مصنفین فلسفہ و حکمت کے یہاں طبیعیات و مابعد الطبیعیات سمجھا جاتا ہے "شفائے بو علی" کی طرح یہ علوم حکمیہ کی قاموس یا مجموع العلوم (Compendium) نہیں ہے، خود مصنف علیہ الرحمہ نے اسے "ماقبل الطبیعیات و مابعد الطبیعیات" کے مباحث کی توضیح کے لئے لکھنا شروع کیا تھا، اگرچہ زندگی نے اتنی وفا نہ کی کہ وہ مابعد الطبیعیات پر تعرض فرماتے" ماقبل الطبیعیات" (طبیعیات) کے جملہ مباحث کا استقصا بھی نہ کر پائے، ریاضی و ہیئت کے مسائل سے تعرض کہیں کہیں ضرور کیا ہے، لیکن عبارت کے در و بست سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ان علوم (ریاضی و ہیئت) کے اندر اپنے اظہار مہارت کی نمایش کے لئے ان سے تعرض نہیں کیا تھا۔

مگر جس نہج سے یہ مسائل بیان ہوئے ہیں، ان سے ایک جانب ان علوم کے باب میں ان کی حکیمانہ بصیرت کا اور دوسری جانب ان کے اندر فنکارانہ خداقت کا ثبوت

بسیطہ میں کسی قسم کا اختلاف نہو، اور ہر ہر
ستارے کے مختلف افلاک جزئیہ کی حرکات
کے مجموعی نتیجے سے اس ستارے کے مختلف
حالات منتظم ہوتے ہیں، اسی طرح بالعرض
ان کے اختلافات لازم آتے ہیں جن کی
مفصل توضیح و تفصیل کے لئے کتاب المجسطی
یا (اس میں مذکور) علم الہیئت کے ضوابط
و قواعد متکفل ہیں (لہذا ان سے رجوع کیا
جائے　　　　(شمس بازغہ صفحہ ۱۴۳)

اس کے بعد نہایت ہی ناقدانہ تبصرہ فرماتے ہیں کہ بطلیموس نے جو افلاک جزئیہ کی تعداد ثابت کی ہے اس کے پیش نظر افلاک خارجۃ المراکز کے اوج وحضیض کے سبب سے پیدا ہونے والے اسراع و ابطاء کے اختلاف کا مسئلہ نیز تدا دیر کے سبب سے پیدا ہونے والے سرعہ و بطو کے اختلاف اور خمسہ متحیرہ کے اندر اقامہ و رجعۃ اور استقامہ کے مظاہر کی بھی توجیہ ہو جاتی ہے مگر ایک مسئلہ پھر بھی حل نہیں ہو پاتا، اصول یہ طے پا یا تھا کہ ہر حرکت دوری میں متحرک کی حرکت کا مقتضا یہ خود اس کے مرکز کے اعتبار سے متحقق ہوگا نہ کہ کسی اور مرکز کے اعتبار سے۔

" لکن لایخل بہ انہ کیف یتشابہ حرکات مراکز التداویر للمتحیرۃ حول مرکز الفلک المتوہم المسمّٰی بالمعدل للمسیر وللقمر حول مرکز الفلک المائل المنطبق علی مرکز العالم ولم یتشابہ حول مراکز حواملہا کما ھو الظاہر من الاصول " (شمس بازغہ ص ۱۴۳، ۱۴۴)

بہرحال محمد صالح کنبو کا یہ تبصرہ

"در انواع فنون دانش خصوص ...... ریاضی ...... ہیچ کس از ارباب استعداد در اقوت دعوی برابری باوے نبود" (عمل صالح جلد اول ص ۳۸۳)

متاخر مغل دور کے ایک ادیب کی عبارت آرائی و مبالغہ فرمائی نہیں ہے، وہ یقیناً ریاضی و ہیئت میں غیر معمولی دستگاہ رکھتے تھے، اور اگر حالات ان کے لئے سازگار مواقع فراہم کرتے تو ہیئت کے اندر بھی اسی پایہ کی "زیج" ظہور میں آجاتی جس پایہ کی کتاب فلسفہ میں "شمس بازغہ" ہے،

۲۔ قرآن کریم کی تفسیر میں ملا صاحب کو ید طولیٰ حاصل تھا، جس کی تصدیق امام الدین ریاضی کی [illegible] سے بھی ہوتی ہے جس کی جانب سابق میں اشارہ کیا جا چکا ہے، لیکن محمد صالح کنبو کی عبارت سے مزید معلوم ہوتا ہے کہ انھیں آیات قرآنی سے عجیب و غریب "نکات" پیدا کرنے میں کمال حاصل تھا اور یہ نکتہ آفرینی "کسی تفسیر بالرائے" کی مصداق نہیں تھی، بلکہ معاصر علما بھی اس کی توثیق و تصویب فرماتے تھے۔ محمد صالح کنبو نے لکھا ہے:۔

"قلم فیض رقمش در حالت تحریر تفسیر آیات کلام الٰہی و تعبیر حقائق اشیا کماہی بعنوان تصنع و تفنن بکار می برد کہ بر نقش کلکش دعوی فضیلت معنی پردازی آں جناب را زبان می دہد، نکتہ دانان ارجمندش بعلاقۂ غرائب معنی در صدر انجمن اولیائے والا فطرتان اقامت انداز گشتہ" (عمل صالح جلد اول ص ۳۸۳)

۳۔ البتہ اس سے ایک نیا انکشاف یہ ہوتا ہے کہ ان کی قوت تقریر اور طلاقتِ لسانی اس درجہ کی نہ تھی جس درجہ کی ان کی قوت تحریر تھی، محمد صالح لکھتے ہیں:۔

"اگرچہ در خور دانش و بینش خود طلاقت زبان و تقریر لسان نداشت

ملتا ہے، مثلاً افلاک کلیہ کی تکثیر اور افلاک جزئیہ کے تعدد کی انھوں نے جو توجیہہ و تعلیل کی ہے (اور جس کی نظیر ان علوم کی متداول کتابوں میں نہیں ملتی)، وہ ان علوم کے اندر ان کی حکیمانہ بصیرت کی دلیل ہے، اور مختلف افلاک کی ترتیب کے سوال سے جس ایجاز کے ـــــ ساتھ انھوں نے تعرض کیا ہے، وہ اعمال ارصاد (Observatory Techniques) میں ان کی فنکارانہ خذاقت، دستگاہ عالی اور مہارت تامہ کی دلیل ہے یہ شان خود اعتمادی اسی فاضل و ماہر کی پیشکش میں ہو سکتی ہے جس نے مختلف سیاروں کے کشف و انکشاف کا بچشم خود مشاہدہ کیا ہو، جسے آلات رصدیہ کے استعمال کا محض تجربہ ہی نہ ہو بلکہ جس نے اس کے ذریعہ مختلف سیاروں کے "اختلاف المنظر" (Parallex) کو دریافت کیا ہو اور جس نے متعلقہ آلات رصدیہ کی مدد سے مختلف اجرام فلکی کے ابعاد دریافت کیے ہوں،

ایسے حکیم بابصیرت اور تجربہ کار ماہر فن کو حق پہونچتا تھا کہ اس کی علمی و فنی تجاویز کی انتہائی گرم جوشی سے پذیرائی ہوتی، مگر افسوس ایسا نہ ہو سکا، بشریت کے تقاضے اور انسانی کمزوریاں علم و حکمت کی ترقی کی راہ میں آڑے آگئے،

علامی سعد اللہ خاں تاریخ کی اہم شخصیت ہیں، انھوں نے شاہجہانی مملکت کے انتظام و استحکام میں جو خدمات شائستہ انجام دیں وہ ہندوستان کی مغل تاریخ کا ایک روشن اور درخشاں باب ہے، لیکن اگر جو کچھ آزاد بلگرامی نے لکھا ہے صحیح ہے، ـــ اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ اسے ان کا اختراع و اختلاق سمجھا جائے ـــ تو علم و حکمت کی تاریخ ان کی اس کمزوری کو کبھی معاف نہ کر سکے گی کہ محض ان کی اس دراندازی کی وجہ سے تاریخ کی ایک عظیم ترین رصدگاہ ظہور میں آتے آتے رہ گئی۔

حریف کی علمیت کا بلکہ ان کی طلاقتِ لسان اور فنِ مناظرہ کے آداب میں ان کے تبحر کا اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکے اور فرمایا

"مولانا نفس قدسی است، تار و پود سخن را خاصہ منقولات بمنوالے یافتہ کہ کارنامۂ دیگراں در پیش او بمصداقِ اِنَّ اوہن البیوت لبیت العنکبوت سست تر از نسجِ عنکبوت است" (تذکرہ باغستان ورق ۶۸۵ الف)

بہرحال محمد صالح ان کی قوت تحریر کے مداح ہیں اور بجا طور پر مداح ہیں، ان کے سلیقۂ نگارش کی ایک قابل صد ہزار تعریف مثال ان کا وہ انداز بیان ہے جس کے ساتھ انھوں نے میر باقر داماد سے نظریۂ حدوث دہری میں اختلاف کیا ہے، پہلے تو انھوں نے اپنے موقف کی مناسب طور پر ترجمانی فرمائی ہے، پھر میر باقر داماد کے مخترعہ نظریہ حدوث دہری کو بیان کرکے اس پر تنقید کی ہے، مگر انداز انتہائی سنجیدہ اور شریفانہ ہے،

مگر فاضل جونپوری نے میر باقر داماد کے نظریۂ حدوث دہری کو اپنے لفظوں میں بیان کرنے سے پہلے حریف کی عظمت فکر کی مدح سرائی کی ہے، زاں بعد ان کے اس اختراع و بدعت طرازی کی بڑے اچھے انداز میں توجیہہ کی ہے اگر اس کی تفصیل سے پیشتر بمصداق "تتبین الاشیاء باضدادہا" خود میر باقر داماد کے انداز "شاہد بالا نقاب" پر ایک نظر ڈال لینا مستحسن ہوگا کہ وہ کس طرح علمی اختلاف سے یکایک شعلہ زیر پا ہوکر بھڑک اٹھتے ہیں، ہوا یہ تھا کہ جب متکلمین نے فلاسفہ کے اس موقف پر کہ زمانہ قدیم ہے یہ اعتراض کیا کہ "کان ویکون" کا مفہوم جس طرح ممکنات و مادیات میں جاری ہوتا ہے اسی طرح واجب تعالیٰ اور مجردات میں جاری ہوتا ہے، اس اعتراض سے بچنے کے لئے فلاسفہ نے "سرمد" دہر اور زمان" کی تدقیق کی۔ اس پر امام رازی نے یہ تبصرہ کیا کہ یہ

اما قلم فیض رقمش در حالت تحریر ...... بعنوان تصنع و تفنن بکار می برد
که بر نقش گلکش دعوی فضیلت معنی پردازی آں جناب راز بان می دہد"۔
(عمل صالح جلد اول ص ۳۸۴)

یہ بات قابل غور ہے کیونکہ امام الدین ریاضی نے "باغستان" میں لکھا ہے کہ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی ان کے علم و فضل کے ساتھ ان کی طلاقت لسان اور فن مناظرہ کے آداب میں ان کی مہارت نامہ کے معترف تھے، حالانکہ وہ (ملا عبدالحکیم سیالکوٹی) خود وقت کے مانے ہوئے فاضل اور آداب مناظرہ کے ماہر تھے، انھوں نے بڑے بڑے فضلائے وقت کو مناظرہ میں ہرایا تھا، ملا شفیعا الملقب بہ دانشمند خاں کے ساتھ ان کے مناظرے کا حال سابق میں مذکور ہو چکا ہے کہ کس طرح ایک جید عالم کے مقابلہ میں ان کی برتری دربار شاہ جہانی میں تسلیم کی گئی، بقول امام الدین ریاضی:۔

"بالآخر درستی قول مولوی (عبدالحکیم) در راستی سخن ایشاں بر بادشاہ و سائر امراء و علماء عالی شان در حضور انجامید"۔ (تذکرہ باغستان ورق ۵ ۶۸الف)

انھوں نے شیخ عبدالوہاب گجراتی قاضی القضاۃ کو ایک مناظرہ میں ڈانٹ دیا تھا جیسا کہ امام الدین ریاضی نے دوسری جگہ لکھا ہے:۔

"مولانائے مذکور را با قاضی القضاۃ فضائل مآب شیخ عبدالوہاب گجراتی مناظرہ واقع شد، در اثنائے گفتگو از زبان قاضی بر زد کہ مرد آدمی سخن آہستہ آہستہ بگو، بگفت تو مرد آدمی، مرد آدمی درچنیں مقامہا خر رامی گویند، سخن را فہمیدہ بگو،

گوشت خر بفردش و دیگر گوشت خر   ایں سخن را در نیابد گوشت خر

مگر انھیں ملا عبدالحکیم کا جب فاضل جونپوری سے مناظرہ ہوا تو اختتام مناظرہ کے بعد نہ صرف

غائر نظروں سے ملک کے زیریں حصوں کی
گہرائیوں میں پہونچ جاتا تھا اور جو اپنے بلند
پرواز افکار کے بازؤں سے سماء ملکوت
کے مختلف طبقوں میں عروج پاتا اور چڑھتا

شمس بازغہ ص ۱۱۱۸ ، ۱۱۱۷ چلا جاتا تھا۔

اس کے بعد ان کی اس نظریہ تراشی کو ایک نیک محل پر محمول کرنے کے لئے بلند انشائستہ
اس کی توجیہ فرماتے ہیں اور سے ان کے نظریات تراشی کا شوق فضول نہیں بتاتے جیسا کہ عام
فلاسفہ میں اپنے حریفوں کے خلاف جذبہ رشک و حسد کا دستور رہتا ہے (ملا محمود میر باقر داماد
کے معاصر تھے) بلکہ اسے ان کی قومی وملی اور دینی و خاندانی غیرت کا تقاضا بتاتے ہیں کہ
انھوں نے یہ جو کچھ کیا محض اپنے قومی وملی عقیدہ کی تائید کے لئے کیا، فرماتے ہیں:۔

او بعض عرقة الهاشمی لحمایة وتار الظاهر من	جب ظاہر دین کے لباس (اصول وعقائد)
الدین والذب عن حمی ما علیہ الجمهور من	کی حمایت اور حدوث عالم بشمول جملہ ما فیہ
الملیین من حدوث العالم بقضیہ وقضیضه	جس پر جمہور اہل ملت کا اجماع ہے ایسے
ما حدوثاً ذاتیا...... بل حدوثا احسن من	حدوث کے عقیدے کی حفاظت کے لئے
ذلک مصداقا سلب الوجود اصلاً فی	انکی (میر باقر داماد کی) رگ ہاشمی پھڑکی
الاعیان قبل صدق الایجاب ولم یرخصه	ایسا حدوث جو محض (فلاسفہ کا اصطلاحی
بصیرة انتقاده وقریحة الوقادة ان یقول	نام نہاد) حدوث ذاتی نہیں ہے ...بلکہ
بالحدوث الزمانی للزمان...... ابتدع	اس سے کہیں زیادہ اچھا اور صحیح حدوث
القول بالحدوث الدهری"	ہے جو اعیان و خارج میں (شے حادث پر)

"التحویل خال عن التفصیل"

ہے اتنی سی بات پر میر باقر داماد آپے سے باہر ہو گئے اور "افق المبین" میں فرمایا:-

"وھم و تزییف: اسمعت مشیر فتنة التشکیک یقلد ضعفاء التعقل و یقول رداً علی الفلاسفة ان ھذا التحویل خال عن التحصیل......

ولیس نسع فطنة ان ینفطن......

[ایک وہم اور اس کی تردید: کیا تم نے فتنۂ تشکیک کے مشیر کی بات سنی جو ضعیف العقل لوگوں کی تقلید کرتا ہے اور فلاسفہ کی تردید میں کہتا ہے کہ یہ (سرمد، دہر اور زمان کی تدقیق) بے سود و لایعنی ہے، کیا اس کی عقل میں یہ بات نہیں سماتی کہ........]

مگر یہی "نا بزبان القاب" کرنے والا، دوسروں کو فتنۂ تشکیک کا ترجمان اور کم عقلوں کا مقلد بتانے والا جب "حدوث دہری" کا نظریہ پیش کرتا ہے تو ملا محمود ہر چند کہ اس نظریہ کی اصابت سے منکر ہیں اور اسے ایک لایعنی ڈھکوسلے سے زیادہ نہیں سمجھتے مگر اس کی تنقید و تردید میں اطالت لسان کے کرشمے نہیں دکھاتے، بلکہ پہلے تو حریف کی عظمت فکر کی مدح سرائی میں اپنے زور فصاحت و بلاغت اور قادر الکلامی کی صلاحیتوں کو پورے طور پر صرف کرتے ہیں

بعض خیرة اللاحقین بالمھرة السابقین مع توغلہ فی سیاحة ارض الحقیقة و توطیہ سباحة یم الحکمة و ولوجہ فی اعماق ثری الملک باقدام انظارہ الغایرة و عروجہ عن اطباق سماء الملکوت بقوادم افکارہ السامرة

(علم حکمت کے) ماہرین سابقین کے بعد جو فضلا ہوئے ان کا بہترین فرد (میر باقر داماد) جسے حقائق کائنات کی سیاحت میں توغل تھا جو حکمت کے سمندر کی تیراکی میں موجوں کے تھپیڑے کھا کھا کر غوطے لگاتا تھا جو اپنی

علم بلاغت کی ابتدا اور ارتقاء

از جناب شفیق احمد خاں صاحب ندوی ایم اے علیگ

بلاغت مسلمانوں کے ایجاد کردہ علوم میں سے ایک علم ہے جس کو انھوں نے پہلے پہل تبلیغ دین اور اعجاز قرآن کی تفہیم کے لئے وضع کیا تھا، اس علم کا فائدہ یہ تھا کہ اس کے ذریعہ قرآن کریم کو پیغمبر اسلام کے سب سے بڑے "معجزہ" کے طور پر سمجھا جا سکے، یہ کلام کلام الٰہی ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت شستہ، صاف اور شگفتہ نیز جامعیت اور تعمق میں یکتا وہمہ گیر تو تھا ہی مقتضائے حال کے عین مطابق بھی تھا، اس لئے لوگوں کو اس کے اعجاز پر توجہ کرنے میں دیر نہ لگی عقل انسانی اس کی بلاغت کو سمجھنے سے قاصر تھی، البتہ زبان عربی کا جس کو جتنا ذوق نصیب ہو اکرتا تھا اس کے بقدر وہ اس کے فیضان سے بہرہ اندوز ہوتا تھا، اس کی تہہ تک پہونچنا یا اسکی بلاغت کی ہمسری کرنا بہر حال ناممکن رہا، البتہ اس کے مفہوم تک رسائی وہ اصحاب سعادت کسی قدر حاصل کر لیتے تھے جنھوں نے براہ راست حامل وحی سے استفادہ کیا تھا،[1]

بلاغت کی تعریف بلاغت کے لغوی معنی رسائی حاصل کرنے کے ہیں، اصطلاح میں اسکے معنی مقتضائے حال کے مطابق فصیح زبان میں گفتگو ہے، بلاغت کی پہلی شرط فصاحت ہے پھر اقتضائے حال" البلاغ فی اللغۃ الوصول والانتہاء وفی الاصطلاح ھی مطابقۃ

---

[1] ابن خلدون المقدمہ ص ۵۵۲ (ملخصاً) طبعۃ المکتبۃ التجاریۃ القاہرہ،

ایجاب صادق آنے سے پہلے قطعی سلب وجود
کا مصداق ہو، (یہ تھی ان میر باقر داماد کی
صلابت ایمانی و دینداری) اور (معہذا)
انکی نقاد بصیرت اور ان کے علوم حکمیہ میں
وقاد ملکہ راسخہ (طبع روشن) نے انھیں
زمانہ کے واسطے حدوث زمانی (کا قائل
ہونے) کی بھی اجازت نہیں دی......
لہذا (جمہور فلاسفہ و حکماء کے علی الرغم) انھوں
نے "حدوث دہری" کا نیا نظریہ پیش کیا۔ (شمس بازغہ ص ۱۱۸)

یہ اسلوب بیان نہ صرف سادات کرام کے ایک فرد سے عقیدت کا نتیجہ تھا، جو انھوں نے اپنے نانا سے ورثہ میں پائی تھی، بلکہ ان کے سلیقۂ نگارش کا بھی ایک کرشمہ تھا، اور یہ ایک ایسا اسلوب ہے جو کم از کم اس زمانہ میں کبریت احمر کا حکم رکھتا تھا۔

ج۔ اچھے اور برے عناصر کی حتی تمیز — اور پھر نتیجۃً

د۔ کلام الٰہی کی فوقیت و فضیلت کو مسلمہ معیاروں کی کسوٹی پر جانچ پرکھ کر بشری کلام کے مقابلہ میں واضح کرنے کی صلاحیت۔

جیسا کہ ڈاکٹر بدوی طبانہ لکھتے ہیں: "فالاساس الذی بنیت علیه البلاغة اولاً دراسة آسالیب القرآن فی التعبیر ومقابلتها بآسالیب البلغاء، ثم استخلاص عناصر الجودة فی الاولی ومواضع التقصیر فی الثانیة ثم موازنة الآی من التنزیل المجید من کلام العرب لیبین فضل الکتاب علی کلام الفصحاء الذین استوت لدیهم ملکة البیان واعترف البشر فیه بالاجادة والاتقان"[1]

"بلاغت کے دارومدار اولاً تو اس پر ہے کہ قرآن کے اسالیب اور طریقۂ تعبیر کا علمائے بلاغت کے اسالیب سے مقابلہ کر کے اول الذکر کے عمدہ عناصر اور مؤخر الذکر کی خامیوں کی نشاندہی کی جائے ثانیاً یہ کہ قرآنی آیات کا اہل عرب کے سب سے عمدہ اور بہتر کلام سے موازنہ کیا جائے تاکہ کلام مجید کے محاسن و فضائل کی برتری ان فصحاء و بلغاء کے کلام پر اچھی طرح واضح ہو جائے جن کی قوت بیان اور مہارت و پختگی کے لوگ معترف ہیں۔

بلاغت کی قسمیں | ابتدا میں "البیان" کا لفظ بلاغت کے عمومی مفہوم کی ادائیگی کے لئے بولا جاتا تھا۔ لیکن اب "بلاغت" کی الگ الگ تین قسمیں ہیں،

۱۔ معانی ۲۔ بیان (۳۔) بدیع

علم المعانی | علم معانی ان اصول و قواعد کے جاننے کا نام ہے جن کے ذریعہ ان طریقوں

[1] الدکتور بدوی طبانة۔ ابو هلال العسکری ومقاییسه البلاغیة ص ۷۔

الکلام لمقتضی الحال مع فصاحۃ عبارتہ[۳]

وجہ تسمیہ | بلاغت کو بلاغت اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کے ذریعہ مفہوم کی رسائی سامع کے دل تک ہوتی ہے اور وہ اس طرح سے بخوبی اس کی حقیقت تک پہنچ جاتا ہے ''سمیت البلاغۃ بلاغۃ الانہا تبلیغ المعنیٰ الیٰ قلب السامع فیفہمہ''[۴]

بلاغت، عناصر و اساس | بلاغت کے عناصر ترکیبی تین ہیں:-

۱۔ الفاظ

۲۔ معانی ——— اور ایسا

۳۔ ترکیبی اسلوب جس کے ذریعہ الفاظ و معانی کے درمیان موقع و محل کے مطابق تناسب و تاثر اور ذوق لطیف کی تسکین و آسودگی کا سامان فراہم ہو سکے۔

فصاحت کا انحصار محض لفظوں کی خوبصورتی پر ہوتا ہے اگر بلاغت کے مفہوم میں عمومیت ہے، کوئی کلام بلیغ نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس میں معنویت اور موقع و محل کی رعایت نہ ہو، دونوں میں عموم و خصوص کی نسبت ہے، ہر فصیح کے لئے بلیغ ہونا ضروری نہیں جبکہ ہر بلیغ لامحالہ طور پر اولاً فصیح بھی ہوگا۔[۵]

فن بلاغت میں دو خداداد صلاحیتوں کو بڑا دخل ہے:-

(۱) فطری ذوق (۲) ادبی بصیرت و تنقیدی صلاحیت

بلاغت کی بنیاد درج ذیل امور پر ہے:-

الف قرآن کریم کے اسالیب بیان کا گہرا مطالعہ

ب دنیا کے فصحاء و بلغاء کے کلام سے اس کا موازنہ

۳۔ السید احمد الہاشمی جواہر البلاغۃ ص ۳۲، ۴۔ ایضاً ص ۳، ۵۔

بلاغی اقدار منضبط نہ ہوئے تھے ،

یونان کی طرح یہاں بھی ادبی تنقید کی کسوٹی محض ذوق کو سمجھا جاتا تھا، ارسطو نے اپنی مشہور کتاب "الشعر" میں پہلے پہل تنقید کے اصول مرتب کرتے ہوئے کہا کہ یونان میں تنقید کا انداز سلبی یا انفعالی ہے اسے ختم ہونا چاہئے، کچھ یہی حالت عصر جاہلیہ کی تنقیدات کی تھی، وہ محض سلبی اور ذوقی چیزیں تھیں، اور جا بجا تنقید کے قابل قدر خیالات بکھرے ہوئے تھے، جاہلیہ میں عموماً شعر اور شعراء کے بارے میں اظہار خیال کو "نقد" کہا جاتا تھا ،

دھیرے دھیرے شعراء کے باہمی مقابلوں، اسواق عرب میں ادبی جلسوں، بادشاہوں اور امراء کے درباروں میں شاعرانہ رجحانوں نے نقد کو آگے بڑھایا، شعر و سخن اور ادبی مباحث کے لئے موسمی میلوں کی ادبی نشستوں نادی قریش، دارالندوہ اور سوق عکاظ، سوق ذوالمجاز اور سوق ذو المجنہ نے اس کو پروان چڑھایا جسکی بنا پر نقد و بلاغت کے تدریجی ارتقاء میں تیزی پیدا ہوئی، نابغہ، خنساءؓ اور حسانؓ کی تنقید میں روح انتقاد کی حیثیت سے تاریخ ادب کے دامن میں اب بھی تسلیم کیجاتی ہیں یہ اور بات ہے کہ یہ تنقیدی صلاحیتیں منظم و مرتب نہ تھیں، "الشعر دیوان العرب" اور "اشعر الناس امرء القیس اذا رکب، و زھیر اذا رغب والنابغہ اذا رھب والاعشیٰ اذا طرب" اسی دور کے تنقیدی سی پارے ہیں۔

صدر اسلام اور عہد اسلامی | عصر جاہلیہ میں عصبیت اور قبیلہ پروری کے جذبات عناصر نقد میں نمایاں رہے، اس دور میں ذاتی تاثرات اور شخصی میلانات کا اظہار ہوا کرتا تھا، اسلام نے آکر سب سے پہلے عصبیت اور حمیۃ الجاہلیہ کو ختم کیا جس کے نتیجہ میں عدل و توازن اور اخلاقی اقدار کو فروغ ہوا، ادبی تنقید بھی توازن اور عدل سے متعارف ہوئی: ان من الشعر لحکمۃ و ان من البیان لسحرا کے ساتھ ساتھ الشعراء یتبعھم الغاوون کہہ کر

کو جانا جاتا ہے جن کے ذریعہ کلام کے اقتضائے حال کے مطابق ہونے کی حقیقت معلوم ہوتی ہے یعنی مقتضائے حال کی شناخت اور اسکے مطابق کلام کو ترتیب دینے کا طریقہ علم معانی ہے،

اس علم کے باقاعدہ موجد و معمار شیخ عبدالقاہر جرجانی (المتوفی ۴۷۱ھ) ہیں۔

علم البیان | اصطلاحاً علم بیان ان اصول و قواعد کے جاننے کا نام ہے جن کے ذریعہ ایک ہی مضمون کو متعدد طریقوں سے ادا کرنے کا سلیقہ دلالت عقلیہ کے توسط سے سیکھا جاتا ہے،

اس علم کا بانی ابو عبیدہ ہے اور معماروں میں جاحظ، ابن المعتز، ابو ہلال عسکری اور شیخ عبدالقاہر جرجانی کے نام سرفہرست ہیں۔

علم البدیع | علم بدیع اصطلاح بلاغت میں ایسے علم کے جاننے کا نام ہے جس کے ذریعہ ایسی صورتیں معلوم ہوتی ہیں جو کلام کے حسن و زیبائش اور رونق و جمال کو اقتضاء حال کی مطابقت اور مفہوم کی وضاحت کے ساتھ ساتھ حالات و ضرورت کے لحاظ سے بڑھاتی ہیں،

اس علم کا موجد ابن المعتز (م ۲۹۶ھ) تھا۔ قدامہ بن جعفر، ابو ہلال عسکری ابن رشیق اور صفی الدین حلی کو معماروں میں گنا جاتا ہے،[1]

ابتداء اور تدریجی ارتقاء | قدماء کے نزدیک بلاغت وسیع معنوں میں ادبی تنقید سے عبارت تھی، ادبی تنقید کو فن بلاغت کی ابتدائی شکل قرار دیا جا سکتا ہے، ایک زمانہ تک نقد و بلاغت باہم گڈ مڈ رہے ہیں، اس لئے ابتدائی تحقیق کے مرحلہ میں تنقیدی عناصر پر گفتگو ناگزیر ہے،

عصر جاہلیہ | "عصر جاہلیہ" میں ادبی تنقید کے عناصر نمایاں تھے، مگر باقاعدہ طور پر فن تنقید کا رواج نہ تھا، ان کے خطبات و امثال اور اشعار بلاغت کے اعلیٰ نمونے تھے لیکن باقاعدہ طور پر

---

[1] البلاغۃ الواضحۃ (علی الجارم) سے استفادہ

پہلی ہی صدی میں نقد و بلاغت کے فن میں وسعت پیدا ہو گئی، الفاظ، معانی، اوزان کا لحاظ رکھا جانے لگا، ادبی موازنے ہونے لگے، لغت، نحو، عروض اور شاعری کی شخصیت معرض بحث میں آنے لگی، جریر، فرزدق اخطل کے شعری مناظرے اسی دور میں ہوئے،

ابن المقفع نے بھی بلاغت پر توجہ مبذول کرتے ہوئے کہا:

البلاغة هي التي اذا سمعها الجاهل ظن انه يحسن مثلها۔ — بلاغت یہ ہے کہ اگر جاہل بھی سنے تو اسکے اندر بھی یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ کیا وہ ایسی خوبصورت چیز پیش کر سکتا ہے،

ایک دوسری جگہ زیادہ جامعیت کے ساتھ بلاغت کا مفہوم یوں پیش کیا۔

البلاغة اسم جامع لمعانی تجری فی وجوہ کثیرۃ — بلاغت ایک معانی کے ایک جامع اسم کو کہتے ہیں جو بہت سی صورتوں میں جاری و ساری ہوا کرتا ہے۔

دوسری صدی میں محدثین و مولدین کے گروہ نے رندی و سرمستی کو موضوع شعر بنایا، سکینہ بنت حسینؓ اور مسلم بن ولید نے اس دور میں نقد و بلاغت پر خاص توجہ دی بحیثیت مجموعی عہد اوائل میں صرف و نحو اور دوسرے علوم عرب کی طرح بلاغت کے اصولوں کو بھی ادبی تنقید کے آلہ کار کی حیثیت سے برتا گیا، قدامہ کی نقد الشعر اور نقد النثر کو بلاغت اور تنقید دونوں فنون میں شمار کیا جاتا ہے، بلاغت کے مفہوم سے مطابقۃ الکلام لمقتضی الحال کی قید اگر ہٹا دی جائے کسی زحمت کے بغیر فن بلاغت فن تنقید ادب کے درجے میں اتر آئیگا،

فن بلاغت کا اجمالی جائزہ | تیسری صدی ہجری میں بلاغت کو مستقل فن کا درجہ دیا گیا،

افراط وتفریط میں توازن پیدا کیا، آگے الا الذین آمنوا کے ذریعہ استثنا ر بیان کر کے تعمیری شعرو ادب کی تحسین کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امراء القیس کی شاعرانہ حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے برے پہلو کو بھی واضح کیا ہے، آپ نے فرمایا وہ بحیثیت شاعر سب سے اعلیٰ تو ہے لیکن نار جہنم کی طرف لے جانے والا قائد بھی وہی ہے " امرء القیس اشعر الشعراء وقائدھم الی النار "

زہیر کے بارے میں حضرت عمرؓ کی تنقید ایجابی نقد کی شاندار علامت ہے، آپ نے فرمایا:۔

" ان کان لا یعاضل فی الکلام وکان	زہیر کے کلام میں الجھاؤ نہیں ہے، نامانوس اور
یتجنب وحشی الشعر ولم یمدح احد	غریب الفاظ سے احتراز کرتا ہے اور وہ غیر واقعی
الا بما فیہ "	اوصاف سے کسی کو متصف نہیں کرتا،

ڈاکٹر سر اقبال نے کہا ہے عنترہ کا یہ شعر

ولقد ابیت علی الطوی وآظلہ حتیٰ انال بہ کریم المأکل

برابر پڑھا کرتے تھے اور اپنی پسندیدگی کا اظہار فرماتے ہوئے کہتے " کاش میں ایسے شاعر سے مل سکتا "[1]

قرآن کریم کا سب سے بڑا معجزہ اس کی بلاغت ہے، اس لئے لوگ صدر اول ہی سے بلاغت کے جویا بن گئے، حضرت معاویہؓ نے ایک بار صحار العبدی سے پوچھا " بلاغت سے تم کیا سمجھتے ہو؟ جواب ملا " ایجاز " پوچھا گیا ایجاز کیا ہے؟ تو کہا " ان تجیب فلا تبطی وان تقول فلا تخطی (بلاغت تو ایجاز کو کہتے ہیں اور ایجاز یہ ہے کہ جواب ہو تو برجستہ ہو اور گفتگو میں غلطی نہ ہو، یعنی موقع پر فوراً ٹھیک بات کا کہہ گذرنا بلاغت بتایا "[2]

---

[1] مضامین اقبال: مرتبہ امتیاز علی تاج (مضمون: رسالت مآب کا ایک ادبی تبصرہ)

[2] البیان والتبیین: جاحظ ص ۵۴

کی تفسیر کی بنیاد اسی فن پر ہے، اہل مغرب نے علم بدیع پر خصوصی توجہ دی، کیونکہ انھیں محاسن شعر سے زیادہ لگاؤ تھا مگر معانی و بیان گہرا مطالعہ چاہتے ہیں اور مشکل بھی ہیں اسلئے مغرب میں ان کی پذیرائی نہیں ہوئی، اہل افریقہ میں ابن رشیق قیروانی نے کتاب العمدۃ جیسی بلند پایہ کتاب لکھی حتی کہ عبدالقاہر جرجانی اور سکاکی وغیرہ نے اسکو بام عروج پر پہنچادیا۔

ارتقاء بلاغت کا عمومی جائزہ البیان و التبیین (جاحظ)

علم بلاغت میں سب سے پہلی اور باقاعدہ کتاب جاحظ (المتوفی ۲۵۵ھ) کی "البیان و التبیین" ہے، یہ بلاغت کی بنیادی کتابوں میں بڑی اہمیت کی حامل ہے، جاحظ محض متکلم نہ تھا، ادیب اور بتیشر بلاغت بھی تھا، اس نے فنون ادب کے معاییر کو بلاغت کی شکل اور عربیت کے رنگ میں رنگ کر نہایت خوش اسلوبی سے پیش کیا، یوں تو "البیان و التبیین" خطبات، مقالات پر مبنی ہے جن کی ترتیب و تنقیف میں بلاغت کے اصولوں کو برتا گیا ہے، لیکن ضمنی طور پر جاحظ نے مختلف بلاغی اصطلاحات، تشبیہات، استعارات، مجاز، مزدوج ایجاز، اطناب اور بدیع پر نہایت خوش اسلوبی سے سیر حاصل گفتگو کی ہے،

مخارج حروف اور تنافر کلمات پر گفتگو کرتے ہوئے جاحظ نے الفاظ و معانی کے تناسب کو جان بلاغت قرار دیا ہے، وہ لکھتا ہے،

فاذا کان المعنی شریفا، و اللفظ بلیغا، وکان صحیح الطبع بعیدا من الاستکراہ صنع فی القلب صنیع الغیث فی التربة الکریمة،[1]	اگر معنی عمدہ اور لفظ بلیغ ہوگا اور مخاطب صحیح الطبع اور ناگواری سے دور ہوگا تو اسکا اثر دل پر وہی ہوتا ہے جو زرخیز مٹی پر بارش کا ہوا کرتا ہے۔

[1] جاحظ: البیان و التبیین ج ۱ ص ۲۱۹،

بشر بن المعتمر نے سب سے پہلے ایک قیمتی رسالہ "بلاغت" کے موضوع پر قلمبند کیا، جاحظ نے اس رسالہ کا تذکرہ اپنی کتاب البیان والتبیین میں (صفحہ ۵۷پر) کیا ہے، اس کے بعد ابو حاتم سہل بن محمد الجشمی السجستانی (المتوفی ۲۴۸ھ) نے ایک کتاب "کتاب الفصاحۃ" لکھی[1] پھر معتزلہ نے عنان بلاغت سنبھال لی، اعجاز القرآن کی روشنی میں علم بلاغت کے پودے کی آبیاری اصول دین سمجھ کر زیادہ تر معتزلہ ہی نے کی، خود جاحظ اسی طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ باقاعدہ طور پر سب سے پہلے منظم طور پر جاحظ (المتوفی ۲۵۵ھ) ہی نے اس موضوع پر کام کیا اور الجھے ہوئے حقائق کی ترکیب و تنظیم سے ایک مستقل اور بلند پایہ فن کو وجود بخشا۔

ابن خلدون کے الفاظ ہیں "جاحظ، قدامہ اور جعفر بن یحییٰ وغیرہ نے سب سے پہلے اس علم پر کچھ رسالے لکھے، پھر مسائل کا روز بروز اضافہ تھوڑا تھوڑا ہوتا رہا تا آنکہ سکاکی نے اسکا لب و لباب نکال کر پیش کیا، اس کے مسائل کو ترتیب دیکر ابواب میں مبوّب کیا، اور مفتاح کے نام سے ایک بلند پایہ کتاب لکھی، اس نے اپنی کتاب میں نحو، صرف اور علم بیان میں ہر سہ علوم کو جگہ دی، پھر متاخرین کی نظر میں یہ کتاب ایسی چڑھی کہ سب نے اپنی تصانیف کے لئے اسی کو نمونہ بنایا، اور اسکی رہنمائی میں جو متون تیار ہوئے وہ آج تک پڑھے پڑھائے جاتے ہیں، سکاکی نے تبیان میں خود ہی اس کا خلاصہ لکھا، ابن الملک نے المصباح کے نام سے، جلال الدین قزوینی نے الایضاح اور التلخیص کے نام سے اور پھر سعد الدین تفتازانی نے مختصر المعانی کے نام سے اس کی شرح لکھی، مطول بھی اسی کی طویل شرح ہے،

ابن خلدون مزید لکھتے ہیں، "مشرق اور عجم میں اس فن کی زیادہ ترقی ہوئی، زمخشری

---

[1] ابن خلکان ج ص ۲۱۹،
[2] ابن خلدون: مقدمہ: ص ۷۰۵ (اردو ترجمہ عنایت اللہ)

کے مسائل ابن معتز اور بعض جگہ جاحظ نے بھی بدیع کے ذیل میں بیان کئے ہیں، جو صاف طور پر اب علم بیان سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً استعارہ مکنیہ کی مثال، ساعد الدھر وکاھلہ، ومنکبہ اور استعارہ تصریحیہ طلع البدر علینا من ثنیات الوداع، کو "البدیع" میں بدیع میں بیان کیا گیا ہے، حالانکہ یہ مثالیں اپنی بداعت وندرت کے باوجود تمام تر علم بیان سے متعلق ہیں۔ ابن معتز کے زمانہ (تیسری صدی ہجری) میں باقاعدگی سے نقد و بلاغت پر توجہ مبذول کرنے کا آغاز ہوا، ابن سلاّم، ابن قتیبہ، ابن طبا طبا، ابو سعید سکری اسی دور میں تھے، ان کے اثر سے نقد و بلاغت کے علوم چار طبقوں میں منقسم رہے،

۱۔ اہل لغت　　　۲۔ اہل ادب

۳۔ دیگر زبانوں سے استفادہ کرنیوالے لوگ　　　۴۔ یونانی علوم کے فضلائے عرب

نقد الشعر (قدامہ بن جعفر) قدامہ بن جعفر کا شمار یونانی علوم کے فضلائے عرب میں ہوتا ہے، قدامہ نے ابن معتز کے ادبی ورثہ میں بڑا تنوع پیدا کیا، اور ابن معتز کی بدیع میں مزید ۱۳ قسمیں شامل کیں اور فکر و نظر کے ایسے دریچے کھولے کہ بدیع ابن حجہ حموی (۸۳۷ھ) تک پہونچکر ۱۴۲ قسموں تک پہنچ گئی جیساکہ ابن حجہ کی خزانۃ الادب سے معلوم ہوتا ہے[1]،

ارسطو کی "الخطابۃ" اور "الشعر" کے عربی ترجمے علی الترتیب ابن اسحاق اور ابن یونس نے قدامہ سے پہلے کردئے تھے، لیکن باقاعدہ طور پر یونانی بلاغت سے استفادہ و استخراج کا کام قدامہ بن جعفر نے کیا، قدامہ چوتھی صدی کے نصف اول کا ادیب و ناقد نقد و بلاغت تھا، ابن المعتز کے ادبی ورثہ سے اس کا تعلق ہے، اس لئے تاریخی ترتیب زمانی کو نظرانداز کرکے ابن المعتز کے فوراً بعد اسکا تذکرہ کیا جاتا ہے، تاکہ تاریخ بلاغت کے سلسلہ میں الجھن

---

[1] احمد حسن زیات: تاریخ ادب عربی ص ۵۵۰ (اردو ترجمہ)

جاحظ کی اس معرکۃ الآرا کتاب نے نقد و نظر اور ادب و بلاغت کے دریچے کھولدئے، اب لوگ باقاعدہ طور پر ادبی اور بلاغی موضوعات پر کھل کر لکھنے لگے، ابو تمام اور بحتری کے فن پر تنقیدیں ہوئیں، ابو عبیدہ کی مثالب العرب، ابن سلام کی طبقات الشعراء اور ابو سعید سکری کی اشعار الهذلیین اسی دور کی یادگاریں ہیں۔

"البدیع" (ابن المعتز) | جاحظ کے بعد ابن المعتز (۲۴۹ھ ۔ ۲۹۶ھ) کا نام روشن ہے، ابن المعتز ایک عباسی خلیفہ تھا، مادی خلافت میں تو وہ ناکام رہا لیکن اس نے خود کو جاحظ کی علمی وراثت کا کامیاب خلیفہ ضرور ثابت کر دکھایا، جاحظ نے البیان کے تیسرے حصے میں بدیع پر گفتگو کرتے ہوئے بشار راعی اور قصاب وغیرہ کی کوششوں کا تذکرہ کیا گیا تھا یہ گفتگو ناکافی تھی، عبداللہ بن المعتز نے اپنے فطری اسلوب نگارش کیساتھ بدیع کے جملہ فنون پر سیر حاصل گفتگو کی، اس نے بدیع کے سترہ فنون مستنبط کئے، کتاب الاغانی کی بعض روایات کی بنا پر بہت سے اہل علم کا خیال ہے کہ اس نے اپنے درباری ادیب جعفر سے جو قدامہ کے والد تھے بہت کچھ استفادہ کیا تھا جعفر بلاغت کی یونانی اصطلاحات کا بہت بڑا واقف کار تھا،

ابن المعتز کے دور تک علم بدیع نے مستقل فن کی حیثیت حاصل نہ کی تھی، بدیع کے احکام و مسائل موجود ضرور تھے مگر وہ سب غیر منظم ہونے کے سبب عمومی طور پر بلاغت اور بیان کے احکامات کی حیثیت سے جانے جاتے تھے، خود ابن معتز نے بدیع کے نام سے لغوی معنی کی رعایت کرتے ہوئے بہت سی انوکھی اور دلکش تعبیرات خواہ اصطلاحی طور پر وہ علم بدیع سے متعلق ہوں یا نہ ہوں اپنی "البدیع" میں عمداً یا سہواً جمع کی ہیں حالانکہ ابن معتز ہی "علم البدیع" کا مخترع سمجھا جاتا ہے انح معنوں میں امتیاز و تفریق پانچویں صدی سے شیخ عبدالقاہر جرجانی کے بعد ہوئی۔ استعارات، تشبیہات وغیرہ

اور پھر آیتوں کے فصل کو محور بنا کر اس کے اعجاز کو مبرہن کرتے ہیں۔ باقلانی نے لکھا ہے کہ آیتوں کے درمیان وصل و فصل بجائے خود ایک اعجاز ہے، اس کے اسلوب کو نہ تو نثر میں رکھا جا سکتا ہے اور نہ شعر ہی کے دائرہ میں داخل کیا جا سکے گا، وہ تو بس ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں محکم ہیں اور ایک دانا و بینا ذات گرامی کی طرف سے واضح طور پر فصل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔ (کتاب فصلت آیاتہ ثم فصلت من لدن حکیم علیم)

شیخ باقلانی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ فواصل سجع بھی نہیں، سجع تو کاہنوں کی زبان جن کی تردید خود قرآن نے کی ہے، البتہ اگر اسے سجع معجز کے قسم کی ایک منفرد صنف کہنا چاہیں تو ضرور کہہ سکتے ہیں۔ آیات قرآنی میں دراصل ایک خاص قسم کی لفظی تنظیم ہے جو نغمہ آفریں و قوف و فواصل کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے، اس کی ہمسری سے بنی نوع انسان عاجز ہیں، اور اعجاز قرآن کے منجملہ خصائص میں یہ بھی ایک گراں بہا امتیازی خصوصیت ہے۔ عبدالقاہر جرجانی اس نہج پر اثبات اعجاز کے کچھ زیادہ قائل نہیں۔

باقلانی کا زمانہ چوتھی صدی ہجری کا نصف آخر تھا، اس دور میں ابن عبدربہ (۳۲۸ھ) کی العقد الفرید، ابن ندیم (۳۸۵ھ) کی الفہرست، ابوہلال عسکری کی الصناعتین، ابوعبداللہ مرزبانی (۳۸۴ھ) کی الموشح، ثعالبی (م ۴۲۹ھ) کی یتیمۃ الدھر، ابن شہید قیروانی (م ۴۲۶ھ) کے رسائل الانتقاد، خوارزمی (۳۸۳ھ) کے الرسائل اور ابن رشیق (م ۴۵۶ھ) کی العمدۃ اور دوسری اہم ادبی کتابیں منظر عام پر آئیں۔

الصناعتین (ابوہلال العسکری) | باقلانی کے دوش بدوش ابوہلال عسکری (المتوفی

نہ پیدا ہو، قدامہ نے ادب و فلسفہ کی آمیزش سے ارسطو اور اس کے شاگرد افلاطون کے نظریات کی روشنی میں عربی فن بلاغت خصوصًا بدیع کو جامعیت بخشی۔ اس کی کتابوں میں "نقد الشعر" و "نقد النثر" اور صناعۃ الکتابۃ بہت مشہور ہیں۔ اول الذکر دونوں کتابیں بلاغت اور تنقید ادب کے شاہکار کی حیثیت سے تمام نقد و بلاغت کے طلبہ کے لئے مشعلِ راہ ہیں۔

اسی دور میں ایک اور اہم ترین کتاب لکھی گئی۔ یہ ابن طباطبا کی "عیار الشعر" تھی۔ اس کتاب میں تنقید ادب کے بلاغی اصول اور عروض شعر سے متعلق نہایت اہم مباحث و مسائل پیش کئے گئے ہیں بے شبہہ یہ کتاب شعر و سخن اور تنقید ادب کی بلند پایہ کسوٹی ہے، ابھی تک یہ کتاب ناقابلِ اعتنا تھی، اب دور حاضر کے بعض مصری فضلاء کی توجہ سے شائع ہو ئی ہے[1]۔

"اعجاز القرآن" (باقلانی) | قدامہ بن جعفر کے بعد باقلانی (صاحب اعجاز القرآن) کا نام نمایاں ہے جنھوں نے قرآن کریم کے ادبی و بلاغی اعجاز کو ثابت کرتے ہوئے علم بلاغت کو ارتقا میں نمایاں حصہ لیا،

باقلانی نے اپنی تفسیر میں اعجاز کے اسباب پر گفتگو کرتے ہوئے بیان و بدیع اور انکے انواع و اقسام کو واضح کیا ہے، اعجاز قرآنی کو استعارہ اور مجاز وغیرہ کے ذریعہ بھی مدلل کیا ہے اگرچہ باقلانی ان مناہج سے کوئی خاص ربط و تعلق نہیں رکھتے اور وہ حکایتی انداز سے بھی اثبات اعجاز کے قائل نہیں، مغیبات کے ذریعہ عوام کو قائل کرنے کے مخالف ہیں، وہ قرآن کریم کی آیتوں کے درمیان نظام نسق پر غور و فکر کرنے کی تعلیم دیتے ہیں

[1] الدکتور طہ الحاجری: عیار الشعر لابن طباطبا العلوی" (طبعۃ المکتبۃ التجاریۃ القاہرہ ۱۹۵۶)

وصحة البنیۃ[۱]

کتاب الصناعتین میں ابو ہلال کا اسلوب نگارش متکلمانہ کے بجائے خالص ادبیانہ ہے۔ کہیں کہیں استدلالی رنگ بھی نظر آتا ہے، عموماً اسالیب کی دلکشی پر توجہ دی گئی ہے، مگر معانی کی خوبی و عمدگی پر بھی پوری توجہ ہے۔ اس کا کہنا ہے "معنی اگر گھٹیا ہیں تو لفظوں کی خوبی کوئی خوبی نہیں" (ولاخیر فیما أجید لفظه اذا سخف معناہ)

ابو ہلال عسکری کے نزدیک معانی کی حیثیت جسم کی سی ہے، الفاظ کی حیثیت ایسی ہے جیسے جسم پر لباس، اگر جسم ہی بیمار ہو تو خوبصورت کپڑے بیکار ہوں گے، وہ رقمطراز ہے:

"انه لاخیر فی الکسوۃ الجمیلۃ علی البدن العلیل السقیم"

اخلاق سے گرے ہوئے خیالات و الفاظ بیمار ذہنیت کی علامت ہیں، متنبی کے ایک شعر:

انی علی شغفی بما فی خمرها　　لاعف عما فی سراویلاتها

پر نہایت سخت لہجہ میں تبصرہ کرتے ہوئے کہا اس شعر میں کنایہ انتہائی قبیح ہے جو ادب کے ذوق لطیف کو ٹھیس لگاتا ہے" ایسے لفظ کے ذریعہ جو پاکبازی ظاہر کی گئی ہو اس سے تو اچھا فجور ہی تھا" ابو ہلال کے الفاظ ہیں:

"الفجور أحسن من عفاف یعبر عنه بهذا اللفظ"

بہرکیف دس ابواب اور تین فصلوں پر مشتمل یہ کتاب اپنے موضوع پر عدیم النظیر ہے۔

"الموازنۃ بین أبی تمام والبحتری" (ابن بشر آمدی) علم بلاغت کے تاریخی ارتقاء میں آمدی کی مشہور کتاب "الموازنہ بین ابی تمام والبحتری" نے اہم رول ادا کیا، ساتویں صدی کے مشہور محقق ابن الاثیر اس کتاب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے، جیساکہ انھوں نے خود اپنی کتاب

---

[۱] کتاب الصناعتین، المقدمۃ: ابو ہلال عسکری،

۳۹۵ھ) کی بلاغی خدمات انتہائی تابناک ہیں، ابو ہلال کی سب سے مشہور کتاب "الصناعتین"، ہے، جس میں انھوں نے نثر و نظم کی صنعتوں کو متمائز کرتے ہوئے انکے الگ الگ امتیازی خصائص اور نقد و نظر کے لئے ان کے بلاغی معیار و مقیاس بیان کئے ہیں۔[۱] حقیقت یہ ہے کہ ہر شاعر اور ادیب کو ان معیاروں کا پڑھنا ضروری ہے،

ابو ہلال نے ادبی اسلوب اور فنی تعبیر کے مسائل پر خصوصی توجہ مرکوز کی ہے، قدامہ نے بدیع میں کچھ گرانقدر اضافے کئے تھے، ابو ہلال نے ابن المعتز اور قدامہ کے افکار کو منظم و مبوب کیا، پھر ان میں درج ذیل چھ اضافے کئے:

(۱) تشطیر (۲) محاورہ (۳) تطریز (۴) مضاعف (۵) استشہاد (۶) تلطف

نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب قدامہ کی نقد النثر اور نقد الشعر کا تتمہ و تکملہ کہی جاسکتی ہے، لیکن قدر و قیمت میں یکتا بے نظیر ہے، ابو ہلال کی تخلیقی صلاحیتوں نے الصناعتین کے ذریعہ فکر و فن کے بکثرت دروازے کھولے، مقدمۃ الکتاب میں علم بلاغت کی اہمیت، غرض و غایت اور اقسام کا تجزیہ کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے بعد سب سے بنیادی اور بزرگ و برتر علم بلاغت کا علم ہے، جو ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے، کیونکہ اس کے بغیر کلام الٰہی کے ادبی اعجاز اور رسالت کی تصدیق بہت مشکل معلوم ہوتی ہے وہ لکھتے ہیں:

"ان مسألۃ البلاغۃ مسألۃ جوھریۃ فی الدین فان آحق العلوم بالتعلم واولاھا بالتحفظ بعد المعرفۃ باللہ جل ثناؤہ علم البلاغۃ و معرفۃ الفصاحۃ الذی بہ یعرف اعجاز کتاب اللہ تعالیٰ الناطق بالحق الھادی الی سبیل الرشاد المدلول بہ علی صدق الرسالۃ

---

[۱] الدکتور بدوی طبانۃ: ابو ہلال العسکری و مقاییسہ البلاغیۃ ص ۱۲۵،

سے استفادہ کرتا ہے، توارد خیال بھی ایک دوسرے کے درمیان خود بخود ہوتا رہتا ہے، اس کو سرقہ، کا الزام لگانے میں محتاط رہنا لازمی ہے۔

عروض و قوافی اور ایک ایک حرکت و سکون تک میں ادبی موازنہ آمدی کی دقیقہ رسی اور سخن سنجی کا پتہ دیتا ہے: دو شاعروں کے اسی موازنہ میں بلاغت کے تمام فنون تشبیہات استعارات، تجنیس اور صنعت طباق وغیرہ سے متعلق تمام ہی مباحث زیر بحث آگئے ہیں، ابن المعتز، جاحظ، اور بزرجمہر (فارسی) سے استفادہ اور خود آمدی کی جدت وجودت کتاب میں ہر جگہ نمایاں ہے، تعقید، تنافر، غیر مانوس الفاظ اور مشکل تراکیب کے سلسلہ میں آمدی کی رائے نہایت قابل قدر ہے،

"الوساطۃ بین المتنبی وخصومہ" (قاضی علی جرجانی) | شیخ عبد القاہر جرجانی کی تصنیف

درا صل صاحب بن عباد کی کتاب مساوی المتنبی، کا جواب ہے، شاعر کی فطرت اور ماحول کی تاثیر و تاثر پر گفتگو کرتے ہوئے قاضی علی نے لکھا ہے کہ فطرت انسانی مختلف اور نرم و گرم ہوا کرتی ہے، عدی بن زید جیسے جاہلی شاعر کے کلام میں جو نرمی ہے وہ تہذیب و تمدن اور اخلاق و اسلام کے باوجود فرزدق کے یہاں ناقابل تصور ہے قاضی علی نے زبان و بیان اور اقتضائے حال کے معیاروں سے اس کتاب میں بحث کی ہے اور شعر کے اغراض و اسالیب سے بحث کرتے ہوئے موضوع کے مطابق تغیر اسلوب پر زور دیا گیا ہے، اسلوب بیان کی یکسانیت ایک طرح کی خامی ہے مضامین کی مناسبت سے لفظوں کی ترتیب و ترکیب اور تخصص ناگزیر ہے، غزل کے الفاظ فخر کے مماثل نہ ہوں گے طنز و تعریض کے الفاظ مدح و توصیف میں کام نہ دیں گے۔ مراثی کے کلمات و اسالیب تشبیب میں نہیں کھپ سکتے، ان باتوں کا لحاظ شعری

"المثل السائر فی ادب الکاتب والشاعر" میں اس کا اعتراف کیا ہے۔

یوں تو اس کتاب میں دو شاعروں کے محبین کے درمیان مباحثہ و مناظرہ کے طور پر ایک ادبی موازنہ ہے، لیکن حقیقۃً تنقید ادب اور فن بلاغت کے بیشمار مباحث اس کتاب میں موجود ہیں۔ اس کا کہنا ہے، ابو تمام معانی کا زیادہ اہتمام کرتا ہے الفظوں کا نہیں، حالانکہ شعر و سخن کا جمال اس کے دلکش لباس یعنی لفظوں ہی میں پوشیدہ ہوا کرتا ہے۔ بحتری کے یہاں الفاظ کی شیرینی، وصف کی خوبی، خوش ادائیگی کے ساتھ ساتھ سادگی و سلاست اور مخصوص قسم کا آب و تاب پایا جاتا ہے۔ اس کے بعد خاتمہ پر قول فیصل صادر کرتے ہوئے مصنف کہتا ہے:

"الشعر أجوده أبلغه، والبلاغة انما هی اصابة المعنی وادراك الغرض بألفاظ سهلة عذبة مستعملة سليمة من التكلف"

سب سے اچھا شعر وہی ہے جو سب سے بلیغ بھی ہو اور بلاغت تو بس ایسے آسان، عام فہم اور شیریں الفاظ کے ذریعہ جو تکلف سے پاک ہوں، مفہوم تک رسائی حاصل کرنے اور غرض و غایت کو پالینے کا نام ہے۔

آمدی نے صنائع بدائع میں اعتدال و توازن پر قائم رہنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا "الاغراق لابد أن يؤدی صاحبه، الی الهلكة" (غلو و اغراق تو ضرور آدمی کو لے ڈوبتی ہے) مسلم بن ولید کے اتباع میں ابو تمام نے ہر شعر میں کوئی نہ کوئی بداعت پیدا کرنے کی کوشش کی یہ اس کی انتہاپسندی تھی جس کی بنا پر وہ اپنی شاعری کے محاسن کو لے ڈوبا مضامین کی بنات اور بدائع میں افراط ہی کا نتیجہ تھا کہ اس کی شاعری دلکشی سے محروم ہوگئی۔ مصنف نے بشر بن تمیم کی کتاب سرقات البحتری من ابی تمام کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ ہر ایک کسی نہ کسی

(۱) لفظ ایسے حروف سے مرکب ہو جو تباعد المخارج ہوں، متقارب المخارج اگر ہوں تو اُن کے درمیان کافی فرق و تفاوت ہو،

(۲) لفظ کی ترکیب میں سلیقہ مندی اور حُسن و خوبی کو ملحوظ رکھا گیا ہو، کیونکہ مخرج میں محض تباعد پوری طرح فصاحت کے لئے کافی نہیں ہوتا،

(۳) کلمہ بھونڈا (وحشیہ) نہ ہو،

(۴) گھٹیا (غیر ساقطۃ عامیہ) نہ ہو،

(۵) عرف عام میں عموماً مستعمل بھی ہو،

(۶) کسی دوسرے ناگوار امر کی تاریخ و تعبیر وابستہ نہ ہو،

(۷) تعداد حروف میں کلمہ معتدل ہو، بہت زیادہ حروف کا ہونا بھی فصاحت کے خلاف ہو جاتا ہے،

(۸) کسی لطیف یا مخفی یا کمی کے مفہوم کی ادائیگی کے موقع پر تصغیر کا استعمال ہو،

فصاحت مفرد کے بعد فصاحت مرکب کی بحث ہے، مصنّف کے نزدیک ہر ادبی صنعت کا کمال پانچ چیزوں پر منحصر ہے،:

(۱) موضوع،

(۲) صانع و صنعت،

(۳) شکل و ہیئت،

(۴) وسیلہ و آلہ،

(۵) غرض و غایت،

غرض یہ کتاب اپنی جگہ نہایت مہتم بالشان ہے۔ فصاحت چونکہ بلاغت کا پہلا زینہ ہے،

میں نہیں بلکہ نثر میں بھی ضروری ہے، قاضی علی نے اس کتاب میں لکھا ہے کہ صنائع بدائع کی کثرت سے فلسفہ تو مرتب ہو سکتا ہے، قابلیت کا سکہ بھی بیٹھ سکتا ہے، زبان و بیان کی ترقی بھی ہو سکتی ہے لیکن روح ادب کی تسکین اور شاعرانہ ذوق جمال کی آسودگی و انبساط کا سامان میسر ہونا ناممکن ہے۔

یونان کے شاعرانہ مبالغہ کا مصنف مخالف ہے، وہ کہتا ہے: وہ مبالغہ بھی کیا جو کبھی ممدوح کو فرشتہ اور کبھی شیطان بنا کر رکھدے، سرقات شعری کے سلسلہ میں کہتے ہیں، ہمیشہ یہی ہوتا رہا ہے کہ چراغ سے چراغ جلتا رہا ہے، واردات، جذبات و احساسات یکساں ہیں اس لئے یگانگت و مماثلت کی بنا پر فوراً سرقہ کہدینا صحیح نہیں، تاآنکہ ہو بہو نقل ہو۔

تشبیہ، اس کے انواع، استعارہ، اس کے اقسام، بدیع کے مسائل، تجنیس، طباق اور پھر نحوی، صرفی اور لغوی مباحث کی روشنی میں متنبی کے فن پر یہ ایک فاضلانہ اور بلیغ کارنامہ ہے، انداز آمدی جیسا ہے، مگر اسلوب آمدی سے شگفتہ ہے۔

سرالفصاحۃ (ابن سنان)

ابن سنان خفاجی کی "سرالفصاحۃ" ابن اثیر کے مراجع میں سے ہے، اس کتاب میں زیادہ تر صوتی لحاظ سے بحث کی گئی ہے، عربی زبان اور اہل عرب کے فضائل گنانے کے بعد وہ حروف ذکر کیے گئے ہیں جنکی بنا پر عربی زبان دنیا کی دوسری زبانوں سے ممتاز ہے، ابن سنان کے نزدیک ان حروف کی تین قسمیں ہیں:

(۱) متباعد المخارج (۲) متجاور المخارج اور (۳) متضاعف المخارج

ان حروف کی رعایت سے فصاحت تک پہنچنا آسان ہوتا ہے، ابن سنان نے سرالفصاحۃ میں مفرد الفاظ کی فصاحت کا راز درج ذیل آٹھ شرطوں میں مضمر بتایا ہے:

میں سمجھتا ہوں یہ خیال آج کی نیچرل شاعری کی بنیاد ہے، اس لحاظ سے ابن رشیق کو اس کا مؤسس کہہ سکتے ہیں، فصاحت کے بنیادی اصولوں سے بحث کرتے ہوئے ابن رشیق نے آمد اور آورد کے مسئلہ کا احاطہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"شعر تو صحیح معنوں میں وہی ہے جو دل کی گہرائیوں سے نکلا ہوا ہو۔ لالچ یا کسی خوف کے باعث جو شعر کہا گیا ہوگا، وہ جاندار نہ ہوگا، امرءالقیس کی عظمت کا راز اسی حقیقت میں مضمر ہے، متنبی کی شاعری عقل کو اپیل کرتی ہے، دل پر کوئی پائدار اثر نہیں ڈالتی، شاعرانہ تعبیرات میں جان اس وقت آتی ہے جب کہ اشعار تکلف کی فکر سے ہٹ کر محض شاعرانہ رنگ و آہنگ میں ڈوب کر لکھے گئے ہوں، وہ شعر شعر ہی کیا جس میں حرکت، تڑپ اور روح کو وجد میں لانے کی صلاحیت نہ ہو؟ ابن رشیق کے الفاظ میں "انما الشعر ما اطرب و هز النفس و حرک الطباع" [۱]

(باقی)

---

[۱] ابن رشیق: العمدہ ص ۴۴۔

انتخابات شبلی

مولانا شبلی کی شعر العجم اور موازنہ انیس و دبیر کا انتخاب جس میں کلام کے حسن و قبح عیب و ہنر شعر کی حقیقت، فصاحت و بلاغت کی تعریف اور اصول نقد کی تشریح کی گئی ہے۔

مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی

قیمت للعہ/ ۲۵

"منیجر"

اس لئے علم بلاغت کی ابتدا، اور ارتقا میں اس کتاب کا حصہ قابلِ تعریف حد تک مسلّم ہے۔

العمدۃ (ابن رشیق) سر الفصاحت کے بعد ابنِ رشیق قیروانی (المتوفی ۴۵۶ھ) کی مشہور کتاب "العمدۃ" کا نمبر ہے۔ یہ کتاب بھی نقد و بلاغت کا شاہکار ہے، جس میں مختلف ابواب کے تحت عوام سے لیکر فقہاء و علماء، قضاۃ، خلفاء اور امراء تک کے اشعار کو بلاغت و نقد کے معیار پر پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے، شعر کے فائدے اور اُس کے نقصانات، محاسن اور معائب اور اور اسی طرح کے بہت سے عنوانات پر علیحدہ علیحدہ قیمتی بحثیں اس کتاب میں موجود ہیں، شاعری پر قبائلی اثرات اور مشہور شعراء کے کلام پر سیر حاصل گفتگو بھی نقد و بلاغت کی کسوٹی پر اس کتاب میں سمجھی جا سکتی ہے۔

قیروان کے تابناک ادبی ماحول پر فلسفیانہ و متکلمانہ رنگ چھایا ہوا تھا کہ یکایک ابنِ رشیق جیسا فاضل ادیب ابھرا، اس نے "العمدۃ" کے نام سے زمانہ کے رائج مذاق کے خلاف ایک خالص ادبی و بلاغی کارنامہ انجام دیا، جو توقع سے زیادہ مقبول ہوا۔ ابنِ خلدون نے مقدمہ میں اُس کے اس بلند پایہ ادبی کارنامے کی تعریف کی ہے کہ "اس بے نظیر کتاب میں بلاغت کے تقریباً سبھی مسائل زیرِ بحث آگئے ہیں"۔ وسیع تر معنوں میں اگرچہ ابنِ رشیق نے ان اصولوں پر بھی اعتماد کیا ہے جو پہلے سے آمدی، قاضی جرجانی، جاحظ اور رمانی جیسے اہلِ بلاغت کے یہاں معروف تھے، تاہم چراغ سے چراغ جلتا ہے، دوسروں کے افکار کو اپنے خاص رنگ میں رنگ کر اور نئے سانچے میں ڈھال کر پیش کرنا بجائے خود ایک کارنامہ ہے، جس سے اُن کی عظمت داغدار نہیں ہوتی، ابنِ رشیق العمدہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"خیال کا اصل سرچشمہ نیچر ہے تخیل اور جذب کی تحریک فطری مناظر سے ہونی چاہیئے شعراء کو تصنع کے بجائے حقیقت نگاری سے کام لینا لازمی ہے"[۵]

---

۵ علی احمد رفعت: تاریخ ادب عربی ص ۲۰۴

الخ یعنی "غرق فرعون" اور بنی اسرائیل کے "تجاوز عن البحر" کے درمیاں میں ہے، ما قبل وما بعد والی آیتوں کے ساتھ مذکورہ آیت سورہ اعراف میں اسطرح ہے۔

فانتقمنا منھم فاغرقنھم فی الیم بانھم کذبوا بآیٰتنا وکانوا عنھا غافلین ہ واورثنا القوم الذین کانوا یستضعفون مشارق الارض ومغاربھا التی بارکنا فیھا وتمت کلمۃ ربک الحسنیٰ علی بنی اسرائیل بما صبروا ودمرنا ما کان یصنع فرعون وقومہ وما کانوا یعرشون ہ وجاوزنا ببنی اسرائیل البحر فاتوا علی قوم یعکفون علی اصنام لھم الآیۃ۔

اور یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ ارض فلسطین اور اس کے مشارق ومغارب پر بنی اسرائیل کا قبضہ خداوندی تقسیم و غرق فرعون اور بنی اسرائیل کے "تجاوز عن البحر" کے بیالیس برس بعد ہوا ہے، تو پھر ربط آیات کی کیا صورت ہوگی؟ اس موقع پر یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ ارض فلسطین کی تعبیر قرآن میں "الارض المقدسہ اور ارض مکتوبہ (مقررہ) یا موعودہ" سے مراد کی گئی ہے، نہ کہ "مبارکہ" سے،

سورہ مائدہ میں حضرت موسیٰؑ کا اپنی قوم سے ایک خطاب کا ذکر اسطرح ہوا ہے۔

یٰقوم ادخلوا الارض المقدسۃ التی کتب اللہ لکم الخ	اے میری قوم اس مقدس زمین میں داخل ہو جسکو اللہ نے تمہارے حصہ میں لکھدیا ہے الخ

اور یہ واقعہ غرق فرعون اور بنی اسرائیل کے "تجاوز عن البحر" کے بعد کا ہے اور قوم موسیٰ کے انکار کے بعد ان کو اللہ جل شانہ نے سزاءً چالیس سال تک ارض سینا میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا جیسا کہ اگلی آیتوں میں بیان ہوا ہے، اور یوں بھی خود

آیہ وادر ثنھا بنی اسرائیل

ایک نظر

از مولانا محمد شفیع حجۃ اللہ فرنگی محلی

(۳)

اب حل طلب "مشارق الارض ومغاربہا" کا معاملہ باقی رہا جسکا ذکر سورۂ اعراف میں ہے، تو وہ حضرات کہ جو "الارض" سے ارض فلسطین مراد لیتے ہیں ان کے خیال کے مطابق تو ارض فلسطین کے مشارق و مغارب مراد ہونگے یعنی دریائے فرات سے لے کر بحر متوسط تک بشمول ارض سینا جسے موجودہ اسرائیلی حکومت اپنے قبضہ میں کرنا چاہتی ہے، مگر آیۃ میں ارض فلسطین کا کوئی ذکر نہیں نہ ماقبل نہ مابعد، البتہ اس موقع پر مولانا مودودی نے تفہیم القرآن میں یہ عمدہ اور دلچسپ نکتہ پیدا کیا ہے کہ آیت میں مشارق الارض ومغاربہا کے بعد "التی بارکنا فیہا" موجود ہے، اور قرآن کی مختلف آیتوں میں "بارکنا فیہا" کا استعمال ارض فلسطین کے متعلق ہوا ہے، مثلاً "ونجینہ ولوطاً الی الارض التی بارکنا فیہا" وغیرہا اور سورہ بنی اسرائیل میں "المسجد الاقصیٰ" کے متعلق "الذی بارکنا حولہ" کہا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ مسجد اقصیٰ ارض فلسطین میں ہے اور اس مسجد کے گردا گرد کا بابرکت ہونا بتایا گیا ہے، مولانا مودودی کا یہ دلچسپ نکتہ اس پر موقوف ہے کہ "التی بارکنا فیہا" کا تعلق "الارض" سے ہو، جو "مشارق" اور "مغارب" کا مضاف الیہ ہے، لیکن اس سلسلہ میں یہ خلجان پیدا ہوتا ہے کہ مشارق الارض ومغاربہا والی وراثت کا ذکر انعام

مشرقی ممالک اور "مغارب الارض" سے زمین کے مغربی ممالک مراد ہوں اور وراثت بنی اسرائیل یوں پوری ہوئی کہ مشرق میں بھی بنی اسرائیل کو عرصہ کے بعد اقتدار حاصل ہو گیا (شام و فلسطین وغیرہ میں) اور مغرب وغیرہ میں بھی کسی حکومت کے بعد مصر میں ان کو اقتدار حاصل ہوا، شام و فلسطین وغیرہ کا شمار مشرقی ممالک میں اور مصر کا مغربی ممالک میں اب بھی ہوتا ہے اور یہ آج کی بات نہیں، قدیم تاریخوں میں اسکا استعمال موجود ہے۔

تیسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ "مشارق الارض و مغاربہا" میں "الارض" سے مراد سرزمین مصر ہو، چنانچہ مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم نے ترجمان القرآن میں "مشارق الارض و مغاربہا" کا ترجمہ یوں تحریر فرمایا ہے:۔

"ملک کے تمام پورب کا اور اس کے مغربی حصوں کا کہ ہماری بخشی ہوئی برکت سے مالامال ہے"

اور اس کے فٹ نوٹ میں تحریر فرمایا ہے،

"یعنی فلسطین اور شام کا ملک جو مصر کے پورب میں واقع ہے اور اس کے مغربی حصوں کا ملک یعنی جزیرہ نمائے سینا جو فلسطین کے پچھم میں ہے، یہ تمام علاقہ اسوقت مصری شاہنشاہی کا خراج گذار تھا"

اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ "الارض" سے سرزمین مصر مراد لیتے ہیں اور "مغاربہا" کی ضمیر "مشارق الارض" کی جانب پھیرتے ہیں (نہ کہ الارض کی جانب) اگر یہی صورت ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ "مغاربہا" والی ضمیر کا "مشارق الارض" کی جانب پھیرنا عربی محاورات اور استعمالات کے مناسب نہیں معلوم ہوتا کیونکہ ایسے موقع پر "مغارب"

کسی زمین کو اللہ تعالیٰ کا "مقدس" یا "مبارک" قرار دینا اور کسی زمین کے متعلق "بارکنا فیہا" فرمانا یکساں مفہوم نہیں رکھتا، تفسیر کبیر میں التی بارکنا فیہا کے متعلق ہے،

التی بارکنا فیہا المراد بارکنا فیہا بالخصب وسعۃ الارزاق وذالک لا یلیق الا بارض الشام "یعنی التی بارکنا فیہا سے مراد یہ ہے کہ اس میں ہم نے سرسبزی اور کھانے پینے کے سامان کی فراخی دی" اور اس کا تعلق ارض شام ہی سے ہو سکتا ہے،

اور "بارکنا فیہا" کا ذکر مولانا مودودی نے جن دوسری آیتوں میں کیا ہے ان آیتوں میں "التی بارکنا فیہا" سے ارض فلسطین مراد ہونا کوئی مسلمہ امر نہیں ہے، حضرت ابراہیمؑ حضرت لوطؑ کا ورود پہلے ارض شام ہی میں ہوا تھا اور روایتوں میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ سے اسی ارض شام کے متعلق وعدہ کیا گیا تھا کہ تمہاری نسل کو یہ سرزمین دی جائیگی اور ارض سبا یمن سے ارض شام ہی تک کا راستہ آسان اور آرام دہ تھا وغیرہ وغیرہ

لیکن اگر سورہ اعراف والی وراثتہ مشارق و مغارب کا تعلق ارض فلسطین سے مان لیا جائے تو اس سے یہ کیسے لازم آتا ہے کہ سورہ شعراء اور سورہ دخان والی آیۃ میں جس وراثت بنی اسرائیل کا ذکر ہے اس سے مراد سورہ اعراف والی وراثت ہے جیسا کہ مولانا مودودی بتانا چاہتے ہیں کیونکہ سورۂ اعراف والی وراثت کا تعلق خود سرزمین سے ہے اور سورۂ شعراء اور سورۂ دخان والی وراثتہ کا تعلق جنّت وعیون و زروع وغیرہ سے ہے، کیا ارض فلسطین میں بھی مصر کے جیسے جنّت وعیون و زروع وغیرہ تھے یا نہیں؟

دوسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مشارق الارض ومغاربہا، میں "الارض" سے جنس ارض مراد ہو (کوئی خاص حصۂ زمین نہ ہو، اور "مشارق الارض" سے زمین کے

نہیں کیا تھا، اور تم اپنی عمر میں برسوں ہم میں رہا کیے الخ" جیسا کہ سورۂ شعراء میں ہے:-

قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ الخ

اور غالباً اسی خیال کے ماتحت مولانا مرحوم سورۂ یونس کی آیت فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ الخ کے ترجمہ کے تشریحی نوٹ میں تحریر فرماتے ہیں:-

"آیت کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ تو اب موت سے تو نہیں بچ سکتا، لیکن تیرا جسم مسئلہ کی موجوں سے بچا لیا جائے گا، تاکہ وہ حسب معمول ممی کر کے رکھا جائے، اور آنے والی نسلوں کے لیے عبرت و تذکیر کا موجب ہو، اگر مصریات (ایجپٹالوجی) کے بعض علماء کی یہ تحقیق درست ہے کہ فرعون امیس ثانی تھا تو اس کا بدن آج تک زائل نہیں ہوا ہے کیونکہ اس کی ممی نکل آئی ہے اور قاہرہ کے دارالآثار میں صحیح و سالم موجود ہے"۔

حالانکہ ڈاکٹر عبداللہ یوسف علی اپنے انگریزی ترجمۂ قرآن کی تشریحات کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:-

"پہلے عموماً یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ رامیس ثانی تقریباً بارہ سو پچاس قبل مسیح وہ فرعون تھا جس نے اسرائیلیوں پر مصر میں بڑے ظلم کیے، اور اس کے جانشین منفتاح (بارہ سو پچیس قبل مسیح ۱۲۲۵ ق م) کے زمانہ میں اسرائیلیوں کا مصر سے اخراج ہوا، اس میں شک نہیں کہ اس فرعون کی پالیسی بڑی جارحانہ تھی، مگر یہ تاریخیں صریحاً غلط اس لیے ہیں کہ تاریخی مواد موجود ہے کہ اس زمانہ میں اسرائیلی مدت مدید سے متمکن اور قائم تھے، علاوہ اس کے ہکسوس کو تو اٹھارہویں نسل فراعنہ نے شکست دے کر نکالا تھا جنھوں نے نئی حکومت تقریباً سولہ سو قبل مسیح میں قائم کی تھی، اس لیے تھاتمیس اول (پندرہ سو چالیس قبل مسیح) وہ فرعون ہو سکتا ہے جس نے ابتدائے جوش قومی کی بنا پر اسرائیلیوں پر

سے اسی چیز کے "مغارب" مراد ہوتے ہیں جس کا ذکر "مشارق" کے سلسلہ میں ہوا ہو،

اور یہ امر کہ "یہ تمام علاقہ اس وقت مصری شاہنشاہی کا خراج گذار تھا" یہ ثبوت طلب ہے

شاید ھکسوس فراعنہ کے "حیران" سے تعلقات قائم ہونے کی بنا پر مولانا مرحوم اس نتیجہ پر پہنچے ہوں، لیکن ظاہر ہے کہ "تعلقات" کا اس نوعیت کا ہونا کہ انھیں "خراج گذاری" کا نام دیا جائے، خوش فہمی ہی ہو سکتی ہے، یا شاید مولانا مرحوم اس زمانہ کا ذکر فرما رہے ہیں جب مصری قبطی النسل شاہنشاہی نے ھکسوس فراعنہ کا اقتدار ختم کر دیا تھا، اور مصری حکومت کا اقتدار شام اور نینویا تک پہنچ گیا تھا، بلکہ شاید دریائے فرات تک، اس کے بعد بنی اسرائیل نے غرق فرعون والے واقعہ کے بہت بعد شام و فلسطین اور جزیرہ نمائے سینا پر اپنا اقتدار قائم کر لیا تھا، اور ان زمینوں کے مالک اور وارث بنی اسرائیل ہو گئے تھے، لیکن اس زمانہ کی اس وراثت کا "فرعونیوں سے انتقام اور غرق فرعون" کا کیا تعلق، حالانکہ اس کا ذکر ان ہی دونوں کے درمیان قرآن میں ذکر ہے، (جیسا کہ اوپر تفہیم القرآن والے بیان کے سلسلہ میں اس کا تذکرہ ہوا ہے)

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مولانا مرحوم قبطی النسل شاہنشاہی کے کسی فرعون کے "غرق فی الیم" کے ہونے کے قائل ہیں، اور اسی خیال کے ماتحت سورۂ طٰہٰ والی آیت "اذہبا الیٰ فرعون انہ طغیٰ" کے ترجمہ کے توضیحی نوٹ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"یاد رہے کہ جس فرعون کی طرف حضرت موسیٰ ؑ جا رہے ہیں یہ وہ نہیں ہے جس کے محل میں ان کی پرورش ہوئی تھی، وہ مر چکا تھا، اور دوسرا فرعون تخت نشین ہو چکا تھا"

معلوم نہیں مولانا مرحوم نے اس واقعہ کو کس بنیاد پر یاد دلایا ہے، واقعہ تو یہ ہے کہ حضرت موسیٰ ؑ فرعون کی طرف گئے تھے۔ اس نے حضرت موسیٰ ؑ سے کہا تھا "کیا ہم نے تم کو بچپنے میں پرورش

لیکن اس پانچویں صورت میں اس وراثت کے ذکر کو (جس کا ذکر سورہ اعراف میں ہے) بطور جملہ معترضہ قرار دینا ہوگا، اور اس کا اس وراثت سے کوئی تعلق نہ ہوگا جس میں جنّٰت وعیون وغیرہ والی وراثت کا ذکر ہے، جو سورۂ شعراء اور سورۂ دخان میں ہے،

سورۂ شعراء و سورۂ دخان والی وراثت جنّٰت وعیون وغیرہ کے سلسلہ میں تفسیر جواہر القرآن مصنفہ مولانا ولی اللہ فرنگی محلی المتوفی ۱۲۷۰ھ (مخطوطہ آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) اور تفسیر مظہری اور جلالین اور بعض دوسری اگلی تفسیروں میں غرق فرعون کے بعد ہی بنی اسرائیل کا فرعونی جنت وزروع وغیرہ کا مالک اور وارث ہو جانے یعنی بنی اسرائیل کے مصر پر اقتدار پا جانے کا ذکر موجود ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ نہیں ہوا کہ بنی اسرائیل نے غرق فرعون کے بعد مصر کو خیرباد کہہ دیا ہو، حضرت حسن بصری تابعی سے یہی تفسیر مروی ہے کہ "جنّٰت وعیون وغیرہ" سے ارض مصر ہی کے جنت وعیون وغیرہ مراد ہیں، جو فرعونیوں کے تھے، اور جن سے وہ محروم کر دیے گئے تھے۔ لیکن حضرت قتادہ والی تفسیر اس کے خلاف بھی ہے۔

فرعونیوں کے غرق کے بعد اُن کے جنت وعیون وغیرہ پر بنی اسرائیل کا قبضہ نہ ہونا اس صورت میں مانا جا سکتا ہے، کہ یہودی روایتوں کے مطابق کل بنی اسرائیل کا مصر سے خروج اور فرعونیوں کے غرق کا واقعہ بحر قلزم میں نہ مانا جائے، بلکہ اُس کے بجائے دریائے نیل کی کسی شاخ میں مانا جائے اُس کے لئے قرآن میں لفظ "الیم" جا بجا آیا ہے، آگے اس کا بیان ہوگا۔ اس موقع پر یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ قرآن میں آل فرعون کے غرق کے ذکر کے بعد "یعکفون علیٰ اصنام لھم" ایک قوم کا ذکر ہے، جسے دیکھ کر بنی اسرائیل کو بھی ایک "الٰہ" کی خواہش ہوئی، سورۂ اعراف میں ہے :-

مظالم کیے ہوں گے جس کی وجہ سے اسرائیلیوں کو مصر چھوڑنا پڑا الخ"

چوتھی صورت یہ ہے کہ "الارض" سے مراد مصر ہی کی سرزمین ہو کہ غرق فرعون کے بعد مصر کے مشرقی حصہ پر بھی بنی اسرائیل کو اقتدار حاصل ہوا اور مغربی حصہ پر بھی، (یہ واقعہ ہکسوسی حکومت کے بعد پیش آیا، اور اس اقتدار کا خاتمہ قبطی النسل فراعنہ کے ہاتھوں عمل میں آیا، اوپر اسکی جانب اشارہ ہو چکا ہے)۔ بنی اسرائیل کی آبادی ارض مصر کے مختلف صوبوں میں پھیلی ہوئی تھی مگر ایک کثیر آبادی دریائے نیل کے ڈیلٹا میں دریائے نیل کی ایک مشرقی شاخ کے آس پاس تھی (جیسا کہ مولانا مودودی کی تفہیم القرآن کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے) اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ "مشارق الارض" سے مراد دریائے دریائے نیل کی اس شاخ کا مشرقی حصہ اور "مغاربہا لارض" سے مراد اس شاخ کا مغربی حصہ ہے، اور غرق فرعون کے واقعہ کا تعلق دریائے نیل کی اسی شاخ سے تھا کہ اسی میں فرعون موسیٰ غرق ہوا تھا، (نہ کہ بحر قلزم میں جیسا کہ یہودی روایات میں ہے)، غرق فرعون کے بعد "موسیٰ ومن معہ" (جنھیں غرق سے نجات ملی تھی) مشرقی حصہ پر اور بقیہ بنی اسرائیل (جو مومن موسیٰ نہ تھے) مغربی حصہ پر قابض ہو گئے ہوں۔

وراثۃ مشارق الارض ومغاربہا کا تعلق "فانتقمنا منہم" (جس کے بعد متصلاً مذکورہ وراثت کا ذکر ہے اور غرق فرعون فی الیم (جس کے قبل متصلاً مذکورہ وراثت کا ذکر ہے) اس کا قرینہ ہے کہ دوسری یا چوتھی صورت اختیار کیجائے، لیکن اگر اس اتصال کا لحاظ نہ کیا جائے تو یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "الارض" سے مراد جنس ارض کو لیا جائے، اور مشارق الارض سے مشرقی زمینیں (شام و فلسطین وسینا) اور "مغاربہا" سے مغربی زمینیں (مثلاً مصر کی زمین) اور یہ وراثۃ "غرق فرعون والے واقعہ کے بہت بعد اس وقت ہوئی جب یرمیاہ نبی کے زمانہ میں سرزمین مصر ایک یہودی وطن ہو گیا (جیسا کہ تفسیر ماجدی میں ہے)، یہ گویا پانچویں صورت ہوئی۔

راستہ سے حضرت موسیٰؑ ایک فرعونی کے قتل کے سلسلہ میں مصر سے نکل کر مدین کی طرف جانے ہوئے "مدین" تک پہونچے تھے، جیسا کہ سورۂ قصص میں ہے فلما توجہ تلقاء مدین الخ اور ولما ورد ماء مدین الخ یہی وہ راستہ تھا جس کے ذریعہ مصر اور شام و حجاز و یمن وغیرہ کے درمیان تجارتی قافلے آتے جاتے تھے، برادران یوسف ارض کنعان سے اسی راستہ سے مصر آئے تھے، اس راستہ میں کہیں بحرِ قلزم نہیں پڑتا، حال کی ایک تفسیر میں اس کی توجیہ یہ کی گئی ہے کہ حضرت موسیٰؑ راہ بھٹک گئے تھے جس کو محض تاویل کہا جا سکتا ہے، مگر کیا کیا جائے کہ یہودی روایتوں میں تو رہبری کی خدمت ایک فرشتہ کر رہا تھا، (جس کی خاک پا سے سامری نے بعد کو بچھڑا بنایا تھا، بہت سے مفسرین نے بھی سامری کے قول کی جو قرآن میں ہے یہی تشریح کی ہے سامری کا ذکر ابھی آگے آتا ہے) یہودی روایتوں سے قطع نظر خود قرآن مجید میں حضرت موسیٰؑ کا یہ قول درج ہے کہ میرا رب میری رہبری کرے گا (سورۂ شعراء) اس لئے ہدایت ربانی کے بعد بھٹک جانے کا خیال کیسے کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن مجید میں حضرت موسیٰؑ کا یہ قول "ضرب عصا" سے جس "انفلاق بحر" کا ذکر ہے، اُسے یوں بیان کیا گیا،

فانفلق فکان کل فرق کالطود	وہ بحر پھٹ گیا، اور ہر حصہ اتنا
العظیم (سورۂ شعراء)	بڑا تھا جیسے بڑا پہاڑ،

پانی کے دونوں حصوں کا الگ الگ ایک پہاڑ کی ایسی دیوار بن جانا، اور درمیان میں خشکی کا راستہ نکل آنا جو اگرچہ معجزہ تھا، مگر اس معجزہ کا تصور ایک دریا کے سلسلہ میں تو کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے، مگر سمندر کی صورت میں بہت ہی متعذر ہے کسی بہتے دریا میں اگر خشکی کا راستہ پیدا ہوگا، تو اس راستہ کے دائیں بائیں پانی کی ایک بہت اونچی دیوار بن جائے گی خصوصاً جب کہ دریا بہت گہرا ہو، سمندر میں بھی ایسا ہی ہوگا، مگر سمندر کی گہرائی اتنی زائد ہوتی ہے کہ

"وجاوزنا ببنی اسرائیل البحر فاتوا علی قوم یعکفون علی اصنامھم
قالوا یا موسیٰ اجعل لنا الٰھا کما لھم الٰہ"

اس صورت میں اگر "بحرِ قلزم" میں غرقِ آلِ فرعون کے بعد بنی اسرائیل نے مصر کو بالکلیہ خیرآباد کہدیا ہو جیسا کہ یہودی روایتوں میں ہے، تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہودی روایتوں کے لحاظ سے جس چٹیل میدان میں بنی اسرائیل کا پڑاؤ ہوا تھا، اس بے آب و گیاہ میدان میں کون ایسی قوم تھی جس کو "عاکفین علیٰ اصنامھم" کہا گیا ہے، اس میدان میں تو دور دور تک آبادی ہی نہ تھی، چہ جائیکہ عبادت خانہ، بظاہر معلوم یہی ہوتا ہے، کہ "فرعون ومن معہ" کے غرق کے جو دریائے نیل کی مشرقی شاخ میں ہوا، حضرت موسیٰ ومن معہٗ اسی شاخ کے پار ہو کر اس پر قابض و متصرف ہو گئے۔ اور جب ارضِ مصر سے ارضِ کنعان کی طرف تشریف لیجانے لگے۔ تو غالباً سرحدِ مصر پر بنی اسرائیل کے ہمراہیوں کو کوئی بتخانہ ملا ہوگا، جس کا ذکر قرآن میں ہے، (کیا عجب ہے کہ وہ بتخانہ وہی ہو، جو مصر پر حملہ آوروں کی تاخت کے سلسلہ میں کھنڈر بتخانہ اسکندریہ حاج تباہ ہو گیا، کیونکہ اسے مصریوں نے حملہ آوروں کی مدافعت کے لئے اڈہ بنا لیا تھا، اس کے کھنڈر موجودہ نہرِ سویز میں آگئے ہیں۔

بحرِ قلزم میں غرقِ فرعون کے سلسلہ میں یہ لطیفہ خوب ہے کہ بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے کے راستہ میں یہ بحرِ قلزم کہاں سے آگیا، ظاہر حال کے لحاظ سے ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ غرقِ فرعون کے بعد حضرت موسیٰؑ اپنے ہمراہی بنی اسرائیل کو لے کر کوہِ طور کی طرف جہاں سے وہ فرعون کی طرف مصر بھیجے گئے تھے، "اذھب الیٰ فرعون انہ طغیٰ" (سورۂ طٰہٰ) پھر ارضِ کنعان کی طرف جو یہودی روایتوں کی بنا پر "ارضِ موعودہ" یا "ارضِ مقدسہ" تھی (قرآن نے جسے ارضِ مقدسہ اور "ارضِ مکتوبہ" سورۂ مائدہ میں کہا ہے) یہ راستہ براہِ راست خشکی کا تھا یعنی وہ راستہ کہ جس

نا قابلِ قبول ہونے کے (کیونکہ حالتِ یاس کا ایمان تھا) بیان کے بعد خداوند تعالیٰ کا یہ فرمان نقل کیا ہے،

فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ	پس آج ہم ایسا کریں گے کہ تیرے
لِمَنْ خَلْفَكَ آیَۃً	جسم کو (پانی کی موجوں سے) بچا
(سورہ یونس)	لیں گے تاکہ ان لوگوں کے لئے جو
	تیرے پیچھے ہیں ایک نشانی ہو،

جس کا ظاہر مطلب یہی ہے، کہ منشاے خداوندی اس کی لاش کو صحیح وسالم محفوظ کرنا تھا، تاکہ وہ دوسروں کے لئے ایک نشان کا کام دے، اور عبرت کا ذریعہ بنے اگر یہ واقعہ بحر قلزم کا ہو، تو یہ منشاے خداوندی بظاہر پورا نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس زمانہ میں سمندر سے کسی لاش کے صحیح وسالم نکال لینے کے آلات وذرائع نہ تھے، بخلاف اس صورت کے جو اوپر بیان ہوئی کیونکہ اس صورت میں سیلاب اور طغیانی کے ختم ہونے پر فرعون کی لاش زمین پر پڑی ہوئی مل سکتی تھی، لاش کو پانی سے نکالنے کی ضرورت نہ ہوتی، اور اگر دریاے نیل کی اس مشرقی شاخ میں لاش ہو تو دریا کی اس شاخ سے صحیح وسالم لاش نکال لینا بھی کوئی مشکل امر نہ ہوا ہو، یہ لاش حنوط شدہ ہی سہی اب تک دستیاب نہیں ہوئی، یا اس وجہ سے کہ جب ھکسوسی حکومت پر قبطی النسل فراعنہ کے ہاتھوں تباہی آئی تو ھکسوسی زمانہ کے دوسرے آثار کی طرح یہ حنوط شدہ لاش جس مقبرہ میں تھی، وہ بھی برباد ہو گیا، جس کی وجہ سے حضرت موسیٰؑ اور غرق فرعون وغیرہ کے واقعات مصری آثار اور مصری تاریخ میں نہیں ملتے، یا اس وجہ سے کہ اب تک صرف میدانی وسطی اور بالائی مصر کے آثار کی تفتیش ہوئی ہے اور دریاے نیل کے ڈیلٹا پر اب تک کام نہیں شروع ہوا ہے، آئندہ اگر اس حصہ پر کام شروع ہو تو امید ہے کہ غرق شدہ فرعون کی حنوط شدہ لاش کسی جگہ مل جائے،

پانی کے ہٹ جانے کے بعد جو خشکی کا راستہ پیدا ہوگا، وہ دونوں ساحلوں کی طرف سمندر والی خشکی سے اس قدر اونچا ہوگا کہ اس سے اترنا اور پھر چڑھنا خود ایک دوسرا معجزہ ہی ہوسکتا ہے۔ لیکن اگر اس معجزۂ موسوی کی تصویر کشی یوں کی جائے، تو مناسب ہوگی، کہ

"دریائے نیل کے سیلاب نے خشکی کے ایک بڑے حصہ کو زیر آب کر دیا ہو اس طرح کہ اونچائی میں کئی فٹ پانی خشکی پر آگیا ہو، اور اونچی اونچی لہروں میں پانی جوش کھا رہا ہو، اور دوسری طرف دریائے نیل کی مشرقی شاخ میں طغیانی کا زور بہ اجھکڑ چل رہا ہو، سو سو اسو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے طوفان برپا ہو، اور سیلاب کا پانی، اور دریائے نیل کی اس شاخ کی طغیانی کا پانی مل کر ایک سمندر سا بن گیا ہو، (بنگلہ دیش کے ڈیلٹا میں طوفان اور سیلاب اور دریاؤں کی طغیانی سے ٹھاٹیں مارتا ہوا سمندر کا منظر بارہا لوگوں نے دیکھا ہے) اپنے سامنے پانی کی اس روک کو دیکھ کر حضرت موسیٰؑ کے ہمراہی گھبرا گئے ہوں کہ سامنے پانی کا سمندر پیچھے فرعون کا لشکر، بچنے کا کوئی راستہ نہیں، لیکن قدرتِ الٰہیہ کے کرشمہ سے (عصائے موسوی) کے ذریعہ حضرت موسیٰؑ اور ان کے ہمراہیوں کو راستہ مل گیا ہو، ان کے پار ہوتے ہی ان کا تعاقب فرعونیوں نے اس خیال سے کیا ہو کہ اب راستہ ہوگیا ہے، مگر قدرتِ الٰہیہ نے اُن کے لئے راستہ مسدود کر دیا، اور وہ اس سمندر میں غرق ہوگئے، اور غرق کے وقت وہ واقعہ ہوا جس کا ذکر سورۂ یونس میں ہے" اسی منظر کی جانب سورۂ طٰہٰ کی آیت فغشیھم من الیم ما غشیھم کا بلیغ اشارہ ہو فرعون کے غرق کے واقعہ کو بحرِ قلزم [illegible] نے کی اس واقعہ کی تصویر کشی بہت ہی مستبعد عن الفہم ہے، کیونکہ قرآن نے فرعون کے اظہار ایمان کے

اس میں بھی لفظ یم کا استعمال ہوا ہے، سورۂ طٰہٰ میں ہے" اذ اوحینا الیٰ امک مایوحی ان اقذفیہ فی التابوت فاقذفیہ فی الیم فلیلقہ الیم بالساحل یاخذہ عدو لی وعدو لہ" سورۂ قصص میں ہے :- فاذا خفت علیہ فالقیہ فی الیم ولا تخافی ولا تحزنی" اسی طرح سامری والے "الٰہ" کے جلانے اور اس کی خاک کو پانی میں بہادینے کے سلسلہ میں قرآن میں "یم" ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے، لنحرقنہ ثم لننسفنہ فی الیم نسفا" (سورۂ طٰہٰ) اور یہ ظاہر ہے کہ ان مذکورہ واقعات کا تعلق سمندر (دریائے شور) سے نہیں مانا جاسکتا،

سر سید مرحوم فرعون کے بحر قلزم میں غرق ہونے کو تسلیم کرنے کی صورت میں یہ رائے رکھتے تھے، تاکہ واقعہ بالکلیہ معجزہ نہ رہے، کہ جوار بھاٹے کی صورت پیدا ہوگئی تھی، مگر یہ تاویل قرآنی الفاظ" کالطود العظیم سے میل نہیں کھاتی،

فرعون نے اپنی قوم کے سامنے مصر اور مصری نہروں پر اپنی ملکیت کی ڈینگیں ماری تھیں، اور اس نے اس کا بطور فخر اظہار کیا تھا، سورۂ زخرف میں ہے :-

الیس لی ملک مصر وھذہ الانھار تجری من تحتی افلا تبصرون ام انا خیر من ھذا الذی ھو مھین ولا یکاد یبین،	کیا مصر کی سلطنت میری نہیں ہے اور یہ نہریں جو میرے بائیں اور دائیں رواں دواں ہیں، میری نہیں ہیں، کیا تم لوگوں کو سوجھتا نہیں، کیا میں اس سے بہتر نہیں جو ایک بے قدر اور ذلیل شخص ہے، اور جو ٹھیک طریقہ سے صاف صاف بول بھی نہیں سکتا،

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ "بمن خلفک آیۃ" میں خلف سے مراد "آیندہ آنے والے" نہ ہوں، بلکہ وہ لوگ مراد ہوں جو فرعون کے ساتھ غرق ہونے سے اس لئے بچ گئے تھے، کہ یا تو پیچھے رہ گئے تھے، یا فرعون کے ساتھ نہ آئے تھے، اور فرعون کی لاش ان لوگوں کے لئے نشان ہو، کہ تمہارا سربراہ اور بادشاہ مرگیا ہے، اس نشان نے ھک سوسی لوگوں کو بالکل مایوس کر دیا ہو، اور بنی اسرائیل کو موقع دیا ہو، کہ وہ تدریجی طریقہ سے کی حکومت پر اقتدار قائم کرلیں، فرعونی جنّت وعیون وغیرہ پر قابض ہو جائیں، اس لئے محفوظ شدہ لاش کے دستیاب ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

عربی میں پانی کے کسی بڑے حصہ پر بحر کا اطلاق ہوتا ہے، خواہ وہ "سمندر" ہو یا کوئی بڑا دریا یا چشمہ ہو، منتہی الارب میں ہے "بحر جوئے بزرگ یا دریائے شور" اس لئے قرآن میں غرق فرعون کے سلسلہ میں لفظ "بحر" کے استعمال سے لازمی طریقہ سے یہ نہیں سمجھا جاسکتا کہ اس سے مراد "سمندر" ہی ہے چنانچہ یہودی روایات میں بحر قلزم ہے۔

خود قرآن مجید میں بھی جابجا غرق فرعون کے سلسلہ میں بحر کے بجائے لفظ "یم" کا استعمال ہوا ہے، سورۂ اعراف میں ہے:۔ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ الخ اور سورۂ طٰہٰ میں ہے، فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُودِهِ فَغَشِيَهُم مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ وَأَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهُ وَمَا هَدَىٰ، سورۂ قصص میں ہے:۔ فَأَخَذْنَاهُ وَجُنُودَهُ فَنَبَذْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ الخ سورۂ ذاریات میں ہے:۔ وَفِي مُوسَىٰ إِذْ أَرْسَلْنَاهُ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ فَتَوَلَّىٰ بِرُكْنِهِ وَقَالَ سَاحِرٌ أَوْ مَجْنُونٌ فَأَخَذْنَاهُ وَجُنُودَهُ فَنَبَذْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ وَهُوَ مُلِيمٌ، اور "یم" کا اطلاق عموماً دریا اور چشمہ پر ہوتا ہے، منتہی الارب میں ہے، یم بالفتح دریا لا یکسر ولا یجمع" خود قرآن میں حضرت موسیٰؑ کی ماں کو جو القاء خداوندی ہوا تھا،

فقبضت قبضة من اثر الرسول فنبذتھا" اس پر حضرت موسیٰؑ کا غضب اور بھی بھڑک گیا، کہ ہم کو چڑاتا ہے، (بیوقوف بناتا ہے) دور ہو نکل جا اور چھوت ہو کر زندگی بسر کر، اور دیکھ میں اس خود ساختہ "الٰہ" کی کیا گت بناتا ہوں، جلادوں گا اور اس کی خاک پانی میں بہادوں گا ،

سورۂ طٰہٰ میں ہے :-

قال بصرت بما لم یبصروا بہ فقبضت قبضۃ من اثر الرسول فنبذتھا

وکذالک سولت لی نفسی قال فاذھب فان لک فی الحیوٰۃ ان تقول لامساس

وان لک موعدا لن تخلفہ وانظر الی الٰھک الذی ظلت علیہ عاکفا

لنحرقنہ ثم لننسفنہ فی الیم نسفا

تفسیریں اٹھا کر دیکھئے، اس سلسلہ میں کیا کیا موشگافیاں ہوئی ہیں؟ مولانا آزاد مرحوم نے ترجمان القرآن میں اپنی طرف سے ایک عجیب غریب تشریح فرمائی جس کا حاصل یہ ہے کہ "رسول" سے مراد خود حضرت موسیٰؑ ہیں، اور "اثر" سے مراد ان کے "احکام" اور ان کی دینی باتیں ہیں، اور "قبضۃ" سے مراد ظاہری اتباع اور پیروی اور نبذ سے مراد ترک یعنی ترک اتباع ہے، حالانکہ نہ تو مفسرین کی موشگافیوں کی ضرورت ہے اور نہ مولانا آزاد مرحوم کی اس انوکھی تشریح کی۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ سامری کا یہ قول بالکل اپنے ظاہری معنی میں ہے۔ اگرچہ حقیقت اور واقعہ سے دور محض حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کے مذہبی مزاج کے مطابق حضرت موسیٰؑ کو لاجواب کرنے اور عام بنی اسرائیل کو بچکار دینے کے لیے (کیونکہ پوچھ گچھ عام لوگوں کے سامنے ہو رہی تھی، اور سامری کو بڑی رسوائی کا سامنا تھا) اس کے اس جواب پر حضرت موسیٰؑ اور بھی غضبناک ہو گئے، اور اس سے کوئی جرح بھی نہیں کی کہ "اثر" کا کیا مطلب ہے، اور رسول کون تھا، کس وقت تو نے انکو دیکھا، دوسرے لوگوں کے نہ دیکھنے کی کیا وجہ تھی؟ یہ واقعہ کہاں کا ہے؟ اور پھر خاص "بچھڑے" کی صورت

کیا عجب ہے کہ ان ہی نہروں ہی میں سے (جن پر فرعون اپنا اور حضرت موسیٰؑ کا موازنہ کرتے ہوئے اپنے مالک ہونے کا فخریہ اظہار کیا کرتا تھا کسی نہر میں (دریائے نیل کی مشرقی شاخ بھی ایک نہر ہو سکتی ہے) قدرت الٰہیہ نے اسے غرق کیا ہو، اور حضرت موسیٰؑ اور ان کے ہمراہیوں کے لیے اسے پایاب بنا دیا ہو، واللہ اعلم۔

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ غرق فرعون کے بعد بھی بعض یا کل بنی اسرائیل مصر میں رہے، اور فرعونی باغوں اور نہروں اور کھیتوں پر ان کا قبضہ ہو گیا تھا تو پھر "سامری" کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ مصر میں ایک اجنبی کی حیثیت سے رہتا تھا، اور بنی اسرائیل کی آبادی میں گھل مل گیا تھا، اور جب حضرت موسیٰؑ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ سرزمین مصر سے نکل کر ارض موعودہ (ارض کنعان) کی طرف تشریف لیجانے لگے تو وہ بھی ساتھ ہو لیا ہو اور چونکہ وہ خود واقعۃً خدا پرست نہ تھا، اس لیے حضرت موسیٰؑ کے ہمراہیوں کو خدا پرستی کے راستہ سے ہٹانے کی تدبیروں میں رہا ہو، پہلی تدبیر تو یہ تھی کہ جب حضرت موسیٰؑ کے ہمراہی بنی اسرائیل کا گذر "قوم عاکفین علی اصنامہم" پر ہوا، جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، تو اس نے اپنے پروپیگنڈے کے ذریعہ ایک انسانی مجسم الٰہ کی تمنا اپنے ہمراہیوں میں پھونک دی، پھر آگے چل کر ایک بچھڑے کا ڈھونگ رچایا، (مصر میں گاؤ پرستی کا بھی رواج تھا، جیسا کہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے ترجمان القرآن میں تحریر فرمایا ہے)، اور ایک آواز نکالتا ہوا بچھڑا تیار کیا ہو (یہودی روایتوں میں تو خود حضرت ہارونؑ کو اس میں ملوث کیا گیا ہے، مگر قرآن مجید نے اس کی تکذیب کی ہے) پھر جب حضرت موسیٰؑ نے اس سے باز پرس کی تو کوئی معقول جواب تو بن نہ پڑا، اس نے حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کے مذہبی مزاج اور مذاق کے مطابق ایسی بات کہہ دی جس سے اس کے خیال کے مطابق حضرت موسیٰؑ کو خاموش ہو جانا پڑتا، وہ یہ کہ انی بصرت بما لم یبصروا بہ

یہ کھنڈر کس زمانہ کے تھے ؟ ہوسکتا ہے کہ یہ کھنڈر اس زمانہ کے ہوں کہ یرمیاہ نبی کے بیان کے مطابق (حسب بیان تفسیر ماجدی) مصر ایک یہودی وطن بن گیا تھا۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ کھنڈر بنی اسرائیل کے اس عارضی دور اقتدار کے ہوں کہ جو ہکسوسی فرعون کے غرق ہونے پر سرزمین مصر کے مشرقی اور مغربی حصوں پر انھیں حاصل ہوگیا تھا جس کا خاتمہ قبطی النسل فراعنہ کے زمانہ میں ہوا۔

نوٹ

مذکورۂ بالا مضمون میں تاریخ مصر کے سلسلہ میں اور ڈاکٹر عبداللہ یوسف علی کے انگریزی ترجمۂ قرآن کے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا ہے، یہ بیان جناب حمید الدین خاں سابق پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی اعانت اور مدد کا رہین منت ہے، موصوف نے اس کے بارے میں ایک تحریری یادداشت مجھے نومبر ۱۹۶۲ء میں عنایت فرمائی تھی، جو میرے پاس موجود ہے، افسوس کہ ۱۰ر جولائی ۱۹۶۳ء کو موصوف کا انتقال ہوگیا،

کیوں بنائی تھی؟ وغیرہ وغیرہ

اختتام کلام پر دو باتیں اور بھی بیان کرنا ہیں،

(۱) کہا جاتا ہے کہ بہت قدیم زمانہ سے ایک نہر جاری تھی جو دریائے نیل کی مشرقی شاخ سے بحر قلزم تک تھی، اور اس نہر کے ذریعہ بحر متوسط اور بحر قلزم کے درمیان تجارتی کشتیوں کی آمد و رفت رہتی تھی، اور اس کے دونوں طرف دور تک باغات کا سلسلہ تھا، (اسی نہر میں "کلوپیٹرا" کا وہ مشہور بجرا رہتا تھا، جو اس کی تفریح کے لیے ہر دم آراستہ رہتا تھا) اس نہر کا بہت بڑا حصہ اب نہر سویز میں شامل ہو گیا ہے، امتداد زمانہ سے یہ نہر آمد و رفت کے لیے ناکارہ ہو گئی تھی، کیا عجب ہے کہ حضرت عمرو بن العاصؓ نے اسکندریہ کی فتح کے بعد اسی نہر کی مرمت کی اجازت حضرت عمرؓ سے مانگی ہو، کسی نئی نہر کے کھودنے کے متعلق نہیں، مگر حضرت عمرؓ نے اس کی اجازت نہیں دی، ہو سکتا ہے کہ اسی نہر میں "فرعون ومن معہ" غرق ہوئے ہوں اور ایک طرف نہر کے جوش میں آئے ہوئے پانی اور دوسری طرف دریائے نیل کی مشرقی شاخ کی طغیانی کے درمیان پھنس کر رہ گئے ہوں، اور پھر بعد کو فرعون کی صحیح و سالم لاش نکالی گئی ہو جس کا کسی نہر سے نکالنا مشکل نہیں، اور چونکہ یہ نہر بحر قلزم سے تعلق رکھتی تھی اسلیے یہودی روایتوں میں "بحر قلزم" کا نام آگیا، جس طرح بہ سلسلہ واقعات کربلا بعض کربلائی روایتوں میں دریائے فرات کا نام آگیا، حالانکہ "کربلا" کا میدان دریائے فرات کے کنارے نہ تھا، وہ تو "نہر علقمہ" کے کنارے تھا، جو دریائے فرات سے نکلی ہوئی ایک نہر تھی،

(۲) مصر کے مغربی حصہ میں "بہنسا" نامی ایک علاقہ تھا، جسے زبیر بن العوامؓ کی سرکردگی میں مسلمانوں نے فتح کیا تھا، اور وہاں کچھ پرانے کھنڈر دیکھ کر وہاں کے باشندوں سے اس کے بارے میں دریافت کیا تھا جس کا جواب یہ ملا کہ یہ بنی اسرائیل کے کھنڈر ہیں، غور طلب یہ ہے کہ

رسم خط ان کی لکھاوٹ میں ناقص، جس کی بنا پر اردو رسم خط کی اصلاح کا مسئلہ اردو والوں کے لئے پریشان کن اور لاحل بنا رہا،

اردو میں بعض سنسکرت کے خالص حرفوں کا بدل موجود نہ ہونے کے سبب مجھ کو اردو خط کی اصلاح کا خیال پیدا ہوا، اور ۱۹۵۶ء سے اس کے لئے کدوکاوش شروع کردی اور ۱۹۵۸ء سے وقتاً فوقتاً اخبارات ورسائل کے ذریعہ اپنی تجویزیں اہل علم ونظر کے رو برو پیش کرتا رہا جس کو ارباب اردو نے قبول اور منظور کیا، میں نے غور وفکر کے بعد اردو زبان میں پانچ جدید اعرابوں کا اضافہ کیا، جو میری دس سال کی جدوجہد کا نتیجہ ہے، اس سے اردو زبان کا رسم خط جامع بن گیا ہے، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے،

(۱) ادھیمہ۔ یہ کسی حرف کی آدھی یا ادھوری آواز کو ظاہر کرتا ہے، اس کی علامت (ں) ہے، جو اردو اور ہندی میں رائج ہے، اور لسانیات میں مسلم ہے، یہ بہت کارآمد اعراب ہے، اس سے اپنی اور غیر زبانوں یعنی سنسکرت اور انگریزی کے بیسیوں مخصوص الفاظ کی لکھاوٹ آسان ہو جاتی ہے، مثلاً (اردو) کیا، کیوں، اور نہاں (سنسکرت) نیاگ لچھ، اور ستھان (انگریزی) بلاک، اور کلاس،

(۲) رائے ممدودہ، یہ سنسکرت ہندی کے لئے خاص ہے، اور رِی (ऋ) کا بدل ہے، اس کی علامت (رٖ) ہے، مثلاً، رتو، کرپا اور امرت،

(۳) شین ثقیلہ یا سنسکرت شین، یہ سنسکرت ہندی کے لئے خاص ہے، اور ش (ष) کا بدل ہے، اس کی علامت (شٖ) ہے، مثلاً کوش (کوش)، دوش (دوش)، اور روش (روش)

(۴) نون ثقیلہ یا سنسکرت نون یہ سنسکرت ہندی کے لئے خاص ہے، اور انڑ (ण) کا بدل ہے، اس کی علامت (ݨ) ہے، مثلاً مرݨ، ترݨ، اور راوݨ،

اردو کا اصلاح شدہ رسم خط جامع ہے

از جناب غلام رسول صاحب سابق لائبریرین حیدرآباد سی کالج

رسم خط سے مراد وہ علامتیں ہیں جن کے ذریعہ کسی زبان کے مقررہ قاعدوں کے مطابق خیالات و واقعات کا تحفظ اور ان کا اظہار اور ترسیل ہو۔

واضح ہو کہ اردو خط کی اصل نسخ خط ہے، جس کو ابن مقلہ نے ۱۲۲۱ء میں ایجاد کیا، اس کا ارتقا بتدریج مختلف ملکوں میں ہوا، پہلے عربی میں (۲۹) حروف تھے، بعد میں ہمزہ کا اضافہ ہوا، جس کی وجہ سے ان کی تعداد تیس ہو گئی، یہ خط جب ایران میں پہنچا، تو آوازوں کے لحاظ سے اس میں پ، چ، ژ اور گ حروف بڑھائے گئے، اس وقت یہ خط فارسی خط کے نام سے موسوم ہوا، پھر جب فارسی خط ہندوستان میں داخل ہوا، تو اس میں ہندوستانی زبانوں کی آوازوں کے بموجب ٹ، ڈ، ڑ، ھ اور ے کا اضافہ ہوا، ایک عرصے تک حتیٰ کہ انگریزوں کے دور میں بھی فارسی خط ہی کے نام سے پکارا جاتا رہا، حالانکہ مذکورہ بالا حرفوں کے شامل ہونے کے بعد اس کو اردو خط کہنا چاہئیے تھا، جب سے ہندوستان آزاد ہوا اور اس کی سرکاری زبان ہندی قرار پائی، تو اردو والے اپنے خط کو اردو خط کے نام سے پکارنے لگے، اب اسے فارسی خط کہنا نامناسب ہے، ہندی کو سرکاری زبان کا درجہ ملنے کے بعد سنسکرت کے بعض الفاظ تعلیم، بول چال اور صحافت کے ذریعہ اردو میں داخل ہوتے جا رہے ہیں، لیکن ہمارا

جاتا ہے، جس سے پڑھنے میں بڑی پیچیدگی پیدا ہوتی ہے، مثلاً (۱) (कलाम) (کلاس)

(अडम) (اڈم) اور (बटा) (بٹا) (ب) (विद्या) (ودیا) (पदम) (پدم) اور

(विघ्न) (دگھن)

(۲) حرفوں کے وصل میں تلفظ کے خلاف لکھاوٹ ہوتی ہے، جو اس کے سقم کو ظاہر کرتا ہے، مثلاً (चिह्न) (چنہ) (शान्ति) (شانتی) اور (मुक्ति) (مکتی)، پہلی مثال میں न پہلے اور ह بعد میں بولا جاتا ہے، دوسری مثال میں न پہلے اور ह بعد میں بولا جاتا ہے، اور تیسری مثال میں क پہلے اور त بعد میں بولا جاتا ہے، اوپر کے لفظوں میں تلفظ سے ہٹ کر لکھاوٹ ہوتی ہے، جس سے اس کی تکذیب ہوتی ہے کہ ہندی رسم الخط میں "جیسا بولا جاتا ہے، ویسا لکھا جاتا ہے"،

(۳) ناگری خط میں र کی لکھاوٹ میں بڑی پیچیدگی ہے، جو ہندی کے لئے پریشان کن ہے، مثلاً कर (کر) बर्फ (برف) प्रकाश (پرکاش) اور ड्रामा (ڈراما) ان میں र کی آواز سب جگہ یکساں ہے، پھر र کی لکھاوٹ میں اترائی پینترے بدلنے کی کیا ضرورت ہے؟

(۴) ناگری خط میں نون غنہ کی جگہ نون ظاہر کی علامت لکھی جاتی ہے، جو اصولاً غلط ہے، مثلاً मैं (میں) हैं (ہیں) اور क्यों (کیوں) ان سب میں نون غنہ ہے حالانکہ اس خط میں نون غنہ کی علامت چندر بندو (ँ) ہے، اور نون غنہ کی علامت فقط نقطہ ہے، غرض جس خط میں اس قدر اسقام پائے جاتے ہوں وہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے؟

رومن خط میں حسب ذیل خامیاں ہیں،

(۱) رومن خط میں بخلاف اردو خط کے مفرد حرف ایک سے زیادہ آوازوں کو ظاہر

(۵) یاے قصیر۔ یہ ہندی اسی کی درمیانی لکھاوٹ کا بدل ہے، اور زیر سے زیادہ کھل کر پڑھی جاتی ہے یہ اعراب، ہندی اور برج زبانوں کے لئے خاص ہے، مثلاً کوی، ہانی اور بابکا (ہندی) جی، ناہی، اور تاہی، (برج)

فی الحقیقت (برج) ناگری خط (ہندی) اعراب والا ہے، برخلاف اس کے اردو خط بے اعراب ہے، اس لئے کسی لفظ کو صحت کے ساتھ ادا کرنے میں یہ اعراب کا محتاج ہے۔ اعراب ہی اردو خط کے اہم جزو ہیں، لہذا اردو والوں کو چاہئے کہ وہ عسیرالفہم اور مشکل الفاظ کی لکھاوٹ میں اعراب کا ضرور خیال رکھیں،

اب ہم ناگری اور رومن خطوں میں جو نقائص پائے جاتے ہیں، ان کا تذکرہ کرتے ہیں تاکہ اردو خط میں جو نقائص بیان کئے جاتے ہیں، اس کی حقیقت ظاہر ہو جائے،

ہندی والوں کا دعویٰ ہے کہ ناگری خط سائنٹفک ہے، اس میں جو کچھ لکھا جاتا ہے وہی پڑھا جاتا ہے، اس کے برخلاف اردو اور انگریزی میں لکھا کچھ جاتا ہے اور پڑھا کچھ جاتا ہے، اردو میں "بالکل" کو بال کُل لکھا اور بالکل پڑھا جاتا ہے اور انگریزی میں (Half) لکھا اور ہاف پڑھا جاتا ہے،

ناگری خط کے مکمل ہونے کا دعویٰ کہاں تک درست ہو سکتا ہے، جب کہ اردو حروف خ، ز، ع، غ، ف اور ق کے ادا کرنے کے لئے مذکورہ بالا خط میں متشابہ حروف پر نقطے لگا کر کام لیا جاتا ہے، اس کے علاوہ ث، ح، ذ، ژ، ص، ض، ط اور ظ حرفوں کی آوازوں کا کوئی صحیح بدل اس خط میں موجود نہیں ہے، اس حیثیت سے وہ سراسر ناقص ہے اس کے سوا حسب ذیل خرابیاں پائی جاتی ہیں:-

(۱) ناگری خط میں حروف کی ملاوٹ میں اوپر تلے یا اگل بغل میں حرفوں کو لکھا

کی کمی اور وقت کی بچت ہے،

میں نے اپنی کتاب دکنی زبان کا آغاز اور ارتقا میں جس کو اندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی حیدرآباد نے ۱۹۶۰ء میں شائع کیا ہے، اردو کے اصلاحی رسم خط پر پورا پورا عمل کیا ہے اردو کے جدید اعرابوں کا ذکر میں نے اپنی کتاب جدید اردو قواعد میں کیا ہے، جو امتحانات اردو فاضل اور اردو عالم ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد میں شریک نصاب ہے، اس سلسلے میں ترقی اردو بورڈ ہند سے میری پرزور اپیل ہے کہ وہ اپنی کتابوں کی کتابت و طباعت میں اردو کے اصلاحی خط کو رائج کرے تاکہ محبان اردو کو غیر زبانوں کا الفاظ صحت کے ساتھ پڑھنے میں سہولت ہو،

مرعاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح

طلبہ و اصحاب درس حدیث کیلئے ایک نعمت غیر مترقبہ

مرعاۃ المفاتیح کے نام سے محدث جلیل مولانا عبید اللہ رحمانی ایک عرصہ سے مشکوٰۃ کی جو مبسوط و محققانہ شرح لکھ رہے ہیں، اس کی بڑی تقطیع پر تین ضخیم جلدیں شائع ہو کر اہل علم تک پہنچ چکی ہیں، اور بقیہ زیر تدوین ہیں، اس کی پہلی جلد کا دوسرا اڈیشن مکتبہ سلفیہ مرکزی دارالعلوم بنارس نے نہایت دیدہ زیب ٹائپ میں اپنے خاص پریس میں چھپوایا ہے، یہ مشکوٰۃ شریف کی نہایت مبسوط، مفصل اور محققانہ شرح ہے، جس میں حل لغات، حل مشکلات حدیث تخریج احادیث اسماے صحابہ و تابعین و ائمہ و مصنفین حدیث کے تفصیلی تذکرہ وتراجم کے ساتھ فقہی مسائل و احکام پر نہایت سیر حاصل محدثانہ بحث اور محاکمہ کیا گیا ہے،

پتہ:۔ جامعہ سلفیہ مرکزی دارالعلوم ریوڑی تالاب، پورہ لالی، مبارکپور اعظم گڈھ،

کرتا ہے، C سے س اور ک کا اظہار ہوتا ہے، مثلاً centre (سنٹر) craft (کرافٹ) (D) سے د اور ڈ کا اظہار ہوتا ہے، مثلاً Dal (دال) Date (ڈیٹ) G سے ج اور گ کا اظہار ہوتا ہے، مثلاً Gentre (جنٹر) Gulf (گلف)

(۲) رومن خط میں اردو خط کے مقابلے میں مخلوط حروف سے ایک سے زیادہ آوازوں کا کام لیا جاتا ہے۔ ch سے چ، ش، اور کا ف کا اظہار ہوتا ہے، مثلاً Chamber (چیمبر) Chivarly (شی ورلی) Chrial (کرائسٹ) Gh سے گھ اور غ کا اظہار ہوتا ہے مثلاً Ghar (گھر) (باغ) Kh سے خ اور کھ کا اظہار ہوتا ہے، مثلاً Khak (خاک) Sakh (ساکھ) Ph سے پھ اور ف کا اظہار ہوتا ہے، مثلاً Phal (پھل) Pharmacy (فارمیسی) Th سے تھ، ٹھ، ث اور د کا اظہار ہوتا ہے، مثلاً Booth (بوتھ) That (ٹھاٹ) Hadith (حدیث) اور There (دیر) (۳) رومن خط میں تحریر کچھ ہوتی ہے، اور تلفظ کچھ ہوتا ہے، مثلاً Knit (انٹ) Write (رائٹ) Psychology (سیکالوجی)

اوپر کے بیان سے واضح ہوگا کہ اردو اصلاحی خط ناگری اور رومن خطوں کے نقائص سے پاک ہے، اور ان سے زیادہ مکمل اور جامع ہے، اس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے، کہ اس میں تمام ابتدائی اور درمیانی حرفوں کو ان کے سروں سے اور آخری حرفوں کو سالم صورت میں لکھا جاتا ہے۔ بر خلاف اس کے ناگری خط میں سب حرفوں کو الگ الگ اور ملاوٹ کی صورت میں منقطع حروف سے کام لیا جاتا ہے، اور رومن خط میں تمام حرفوں کو سالم صورت میں لکھا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے اردو خط، ناگری اور رومن سے منفرد ہے، اور اسی کو مختصر نویسی میں تفوق حاصل ہے، اس کی لکھاوٹ میں کاغذ

معاف کریں اندر اوتو ابھی سکر ادئیے چونکہ میگھ یا برشگال انہی کے قبضۂ تصرف میں ہے، تو انھوں نے دیکھتے ہی دیکھتے جل تھل کر دیا، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے میرے دیرینہ دوست! ماسکو کے پس منظر میں تو یہ شعر قطعاً نامناسب ہی ہے، اور اختر امام بس "تل ٹپ ہی چلائے جاتا ہے، اس لئے عرض یہ ہے کہ اس ماحول یا پس منظر میں اس سے زیادہ موزوں اور چست شعر مجھے ملا ہی نہیں؟ وہ کیسے؟

جب میں یہاں لنکا کے وفد کے ساتھ ہوائی جہاز سے اترا تو برفباری برائے نام ہو رہی تھی، میں نے رفقاء سے کہا، یہ تو ماسکو کی توہین ہے کہ ہلکی ہلکی پھواروں کی طرح برفباری ہو، جی تو چاہتا ہے کہ شدت کی برفباری دیکھوں، دوسرے اور تیسرے دن کچھ زیادہ برفباری ہوا کی، تاہم وہ لطف نہ آیا، جس کے لئے میں چشم براہ تھیں، بلکہ منتظر تھا، ایک ہفتہ بعد آج صبح باضابطہ برفباری شروع ہوئی اور اس طرح کہ خزاں رسیدہ درختوں کی ننگی ٹہنیاں سفید برف کی تہوں سے مالا مال ہوگئیں، کانگریس لے مانی تشریفات یعنی اخلاقی ضوابط کے تحت لینن کی آرامگاہ کی طرف چل پڑے جو اس عظیم الشان ہوٹل سے چوتھائی میل پر واقع ہے، سفید میدانوں میں کالی کالی چیونٹیوں کی قطاریں نظر آرہی تھیں، یہ سیاہ لمبے لمبے لبادوں اور کنٹوپ میں ملبوس غیر ملکی مہمان تھے جس طرح شمالی ہندوستان میں کار گذرنے کے بعد دھول اُڑتی رہتی ہے یا گرد و غبار اڑنے والی ہوائیں چلتی رہتی ہیں، اسی طرح برف کی پھواریں اڑتی ترچھی لہراتی ہوئی گذر رہی تھیں، جن سے کالے لبادے اور کنٹوپ بھی سفید ہوتے جا رہے تھے۔۔۔۔ میں اس سے لطف اندوز ہو رہا تھا، اس کی وجہ یہ ہے کہ وقت کی سوئیوں کو لاکھوں بار گردش دے کر میں طالب علمی کے اس ولولہ انگیز اور رومان پرور دور میں پہنچ گیا، جب کہ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ سیر سپاٹے کیا کرتا تھا، اور سب لوگوں کے چہرے برف آلود ہو جایا کرتے تھے، آپ دیکھتے ہیں، بات شروع ہوئی تھی، آرزو لکھنوی کے ایک زوردار شعر سے اور بہکتا ہوا، بلکہ برف پر پھسلتا ہوا کہاں سے

مکتوب ماسکو

"یہ مکتوب میرے عزیز دوست ڈاکٹر سید اختر امام ام۔اے۔ علیگ (پی۔ ایچ۔ ڈی برلن) کا ہے، اس وقت وہ لنکا یونیورسٹی میں شعبۂ عربی اور اسلامیات کے صدر ہیں، لنکا کی طرف سے ماسکو کی طرف سے بین الاقوامی امن کانفرنس میں گئے ہوئے تھے، جو اکتوبر ۱۹۷۳ء میں ماسکو میں منعقد ہوئی تھی، وہیں جناب شوکت سلطان صاحب پرنسپل شبلی نیشنل پوسٹ گریجوایٹ کالج سے ملاقات ہوئی، جو ہندوستان کی طرف سے اس کانفرنس میں شریک ہوئے" "ص ع"

ماسکو
۱ر نومبر ۷۳ء

عزیز دوست صباح الدین صاحب سلام و محبت

اردو میں یہ خط لکھتے وقت ایک مشہور شعر یاد آرہا ہے جو غالباً آرزو لکھنوی کا ہے،

کس نے ٹپکا کھینچ کے ساغر موسم کی بے کیفی پہ
اتنا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب چلا میخانہ بھی

آپ ٹھہرے ادیب اور مصنف ایک دو نہیں بلکہ بیسیوں کتابوں کے، اس لئے دل ہی دل میں مسکرائیں گے کہ آرزو نے تو یہ شعر جھنجلا کر کہا ہوگا کہ جب آسمان پر کالی کالی گھٹائیں چھائی نہ ہوں تو پینے والے آخر پئیں تو کس منہ سے؟ پینے کا لطف تو جب ہی ہے کہ گھنگھور گھٹائیں موسلا دھار مینھ برسائیں، فطرت کی ستم ظریفیوں پر جب شاعر نے اپنے پیالہ کو دے ٹپکا، تو

کے بعد جب سید صباح الدین عبدالرحمٰن پر نظر گئی تو میں نے وہ کتاب چھین لی، اور ہمارے کرمفرما نے بخوشی ہماری دست درازی تسلیم کرلی، یہ تھے آپ کے شوکت سلطان صاحب! ماسکو میں صباح الدین کی یہ تصنیف اور وہ بھی اردو میں! کیا کہئے اس حُسن تضاد کے!

عید کی نماز یہاں کی قدیم مسجد میں پڑھی، ڈیڑھ دو سو بیرونی نمازیوں سے قطع نظر خود مقامی مسلمانوں کی تعداد بلا مبالغہ چار پانچ ہزار سے کم نہ ہوگی، مسجد کھچا کھچ بھری ہوئی اور باہر برفیلی سطح پر جا نمازیں بچھی ہوئی تھی، سنا کرتا تھا کہ ماسکو میں جو مسجد ہے، اس میں صرف معمر اور پیر فرتوت قسم کے نمازی دیکھے جاتے ہیں میں نے تو جماعت میں ہزاروں نوجوان اور بچے بھی دیکھے اب اپنی آنکھوں پر ایمان لاؤں یا خبر تراشوں پر؟ امام صاحب سے نماز بعد میں خود ملا، اور عربی میں باتیں کیں، شوکت سلطان صاحب آپ کو مفصل حالات سنائیں گے،

۱۹۷۰ء میں پاکستانی علمی ملازمت کو خیر باد کہہ کر لنکا آگیا تھا، اس کے بعد سے اب تک عربی اور اسلامیات کے شعبہ کا نگراں ہوں،

یہاں سے واپسی میں کراچی اتر پڑوں گا، سوچتا ہوں کہ تعطیل کا زمانہ ہے لگے ہاتھوں عزیزوں سے ملتا ملاتا ہوا براہ لاہور اسلام آباد چلا جاؤں، جہاں منجملہ احباب کے ڈاکٹر محمد شمیم سے بھی ملاقات ہوگی، جو ڈھاکہ سے سب کچھ کھوکر اور جان بچاکر وہاں آگئے ہیں، اور طبابت کرتے ہیں،

چونکہ پاکستان میں شاید مہینہ بھر تک آوارہ گردی کرتا پھروں، اس لئے مناسب یہی سمجھا کہ سرزمین روس ہی سے لکھوں کیونکہ ہند و پاکستان کے درمیان حقہ پانی بند ہے،

اب اجازت ہو،

آپ کا دیرینہ دوست:- اختر امام

کہاں جا پہنچا!

آپ کے لیے یہ عریضہ معمہ ہی ہوگا، اُس کی وجہ یہ ہے کہ کہاں تو میں آپ کو پیچھے وار خط لکھا کرتا تھا، اور پھر شامتِ اعمال سے یک لخت یہ سلسلہ بند ہو گیا، کیوں؟ یہ خود میں بھی نہیں جانتا ہوں۔ پھر ذرا یا وحشت ملاحظہ ہو کہ یاد آئے کہاں؟ ماسکو میں! آپ کی یاد تو بخدا ہمیشہ شگفتہ رہا کی، مگر اُس کی توفیق نصیب نہیں ہوئی کہ ایک مخلص دوست کو چند سطریں ہی لکھ ڈالوں ایران کے ڈھائی ہزار سالہ جشنِ ملوکیت میں شاہی دربار نے مجھے نوازا تھا، شیراز میں لنکا اور ایران کے ثقافتی تعلقات پر ایک مقالہ بھی پڑھا تھا، جسے جانے کیوں بہت سراہا گیا، اور اب منجملہ دیگر بلند پایہ مقالوں کے جو مستشرقین نے پیش کیے تھے، آپ کا یہ دیرینہ دوست بھی ایک تاریخی جلد میں خرافات بک رہا ہے، سوچا تھا کہ جزیرہ کو لوٹنے کے بعد آپ کو اپنے تاثرات لکھوں گا، مگر بات بھی آئی گئی ہو گئی، یا غالب کی زبان میں یوں کہہ لیجئے کہ ع :-

"تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی"

شاید یہ خط بھی معرضِ التوا میں پڑ گیا ہوتا، مگر چونکہ آج مجلسوں اور دعوتوں کی رسمی دنیا سے بے نیاز ہوں، اس لیے آپ کا یہ نیازمند حاضرِ خدمت ہے، آپ کو کہاں نہیں یاد کیا۔ وحشتناک راتوں میں روحانی مجلسوں میں آپ رفیق رہا کیے، برطانی میوزیم کے کرم خوردہ نسخوں کی اوراق گردانی کرتے ہوئے آپ روبرو نمودار ہوا کیے، "رقصِ شرر" اور دست چھگے میں بھی دل نے کہا تھا کہ ہائے نہ ہوا ہمارا مصنف ورنہ اس وقت وہ اقبال کے ایک مصرعہ کی داد دیتا

ع گراں ہے شب پرستوں پر سحر کی آسماں تابی

اب ہماری خوش نصیبی دیکھئے کہ اس بین الاقوامی اجلاس میں ایک آپ کے ہم وطن تو نہیں، ہم شہر صاحب سے ملاقات ہوئی، اُن کے ہاتھ میں "علامہ شبلی نعمانی" پر نظر پڑی، شبلی

طباعت اچھی، صفحات ۱۰۴، قیمت ۲ روپئے، پتہ ادارۂ احتساب، امینی منزل، دودھ پور روڈ، علی گڑھ۔

اس کتابچہ میں حضرت عمرؓ کی معاشرتی، معاشی اور سیاسی اصلاحات اور افراد کی تربیت سے متعلق مستند واقعات اس مقصد سے تحریر کیے گئے ہیں کہ ان سے معاشرہ کی تشکیل اور اس زمانہ کے مسائل کے حل میں مدد مل سکے، ممکن ہے ایک ہی طرح کے واقعات کی مختلف عنوانات سے تکرار عام قارئین کے لیے گرانی کا باعث ہو، اس سے قطع نظر یہ کتابچہ بقامت کہتر و بقیمت بہتر کا مصداق ہے۔

آغا شاعر حیات و شاعری۔ مرتبہ جناب مجتبیٰ حسین صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۳۲۸ مجلد مع گرد پوش، قیمت: چھ روپئے، پتہ:۔ مکتبہ دانیال وکٹوریہ چیمبرز ۲ وکٹوریہ روڈ۔ کراچی۔

آغا شاعر قزلباش دہلوی مرحوم مشہور ادیب و شاعر اور حضرت داغ کے ممتاز تلامذہ میں تھے، ان کے بعض شعری مجموعے، ڈرامے اور ناول چھپ گئے ہیں اور بعض ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں، ان پر دوسرے ارباب قلم نے جو کچھ لکھا تھا، وہ مختلف رسائل و اخبارات میں بکھرا ہوا تھا، زیر نظر کتاب میں اس کا بڑا حصہ یکجا کر دیا گیا ہے، یہ مجموعہ اکیاون اصحاب قلم کی نگارشات پر مشتمل ہے، گو اکثر مضامین ہلکے پھلکے اور بعض کسی قدر مفصل ہیں، ان میں مرحوم کے متعلق مختلف النوع معلومات ہیں، مولانا شبلی مرحوم اور ڈپٹی نذیر احمد کی مختصر تحریریں بھی اسکی زینت ہیں، مرحوم و موجود اصحاب علم و فن میں سر شیخ عبد القادر، ریاض خیر آبادی، صفی لکھنوی، آرزو لکھنوی، سیماب اکبر آبادی، خواجہ حسن نظامی، ملا واحدی، رضا علی وحشت، اسمٰعیل دتاترو کیفی، تلوک چند محروم، سدرشن، گوپی ناتھ امن، نیاز فتحپوری، میاں بشیر احمد، سید عابد علی عابد، عبد المجید سالک، شاہد احمد دہلوی، جگر مراد آبادی، جوش ملیح آبادی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، سید وقار عظیم

مطبوعات جدیدہ

اذا ہبت ریح الایمان ۔ از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، متوسط تقطیع کاغذ عمدہ، خوبصورت ٹائپ، صفحات ۲۸۰، قیمت تحریر نہیں، پتہ: دار عرفات دائرہ شاہ علم اللہ، رائے بریلی، ہند۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی مشہور اردو تصنیف سیرت سید احمد شہید بریلویؒ بہت مقبول ہوئی اور اس کے متعدد اڈیشن چھپے، سید صاحبؒ کے مجاہدانہ کارناموں کو اسلامی ممالک میں روشناس کرانے کے لیے ۵۳ء میں انھوں نے مصر کے مجلہ المسلمون میں مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا جو انکی دوسری مشغولیتوں کی وجہ سے اس وقت نامکمل رہ گیا تھا، اب ان کو زیر نظر کتاب کی صورت میں مکمل کیا گیا ہے، یہ کتاب اصلاً تو سید صاحبؒ کے مجاہدانہ کارناموں پر ہے لیکن اس کی ابتدا میں ان کی مختصر سیرت اور ضمناً مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اور سید صاحب کے دوسرے رفقاء کی ایمانی حرارت اور دینی جوش کا ذکر بھی آگیا ہے، مولانا نے ان واقعات کو ادبی انداز میں قصے کے پیرایہ میں لکھا ہے، مصنف سید صاحبؒ ہی کے دودمان عالی کے چشم و چراغ ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو دعوت و تبلیغ کے جذبۂ صادق سے بھی نوازا ہے، اس لیے سید صاحب کے متعلق ان کی تحریریں ع "ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا" کا مصداق ہیں، یہ کتاب اردو میں ترجمہ کے لائق ہے۔

امت مسلمہ کی رہنمائی حضرت عمرؓ کی تعلیمات میں مرتبہ مولانا محمد تقی امینی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و

اور کائنات کا مرکز ہے، اور زمین غیر ساکت اور کائنات کا مرکز نہیں ہے، اس کتاب میں اسکے متعلق گلیلو کی تحقیقات، اس کے شاگردوں سے تبادلۂ خیالات، مذہبی طبقوں اور ارباب کلیسا کے ردعمل وغیرہ کی سرگذشت بیان کرکے یہ دکھایا گیا ہے کہ گو اس نے جبر و تشدد کے خوف سے اپنے ان خیالات سے برأت کا اعلان کر دیا تھا، مگر درحقیقت ان سے اس کی وابستگی ختم نہیں ہوئی تھی، کتاب مکالمہ کے انداز میں لکھی گئی ہے، اس لیے دلچسپ ہے، رضیہ سجاد صاحبہ نے اس کا اچھا اردو ترجمہ کیا ہے۔

معجونِ نشاط - از جناب نواب حیدر علی خاں، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۹۲ مجلد مع گرد پوش، قیمت آٹھ روپئے۔ پبلشر سید مہدی حسین اختر بلگرامی صادق منزل، ۲۸ - جگت نرائن روڈ، لکھنؤ۔

نواب حیدر علی خاں حشم اپنے طرز کے نرالے شاعر ہیں، معجون نشاط ان کے اسی انوکھے طرز کلام کا مجموعہ ہے، اس میں ان کی شوخی و ظرافت نے اردو کے بعض مشہور اور بلند پایہ شعراء خصوصاً مرزا غالب مرحوم کے کلام میں دلچسپ اور خوش آیند تصرفات کرکے بڑی شیرینی و دلکشی پیدا کر دی ہے۔ اس لحاظ سے یہ مجموعہ واقعی اسم بامسمیٰ اور طنز و ظرافت کا ایسا زعفران زار ہے جس کو پڑھ کر طبیعت باغ باغ ہو جاتی ہے، حشم صاحب نے خود اس کا تعارف اس طرح کرایا ہے:-

ہر تصرف سے حشم کی صرف اتنی ہے غرض
ہوں مضامین مہذب پر ظریفانہ غلاف

حشم صاحب ایسے خانوادہ کے چشم و چراغ ہیں، زبان جن کے گھر کی لونڈی ہے اسلیے ان کا کلام لطف زبان سے بھی مرصع ہے، اور ظرافت بھی ابتذال و رکاکت سے پاک ہے، امید کہ اصحاب ذوق اس سے لطف اندوز ہونگے۔

اور نادم سیتاپوری وغیرہ نے ان کو خراج عقیدت پیش کیا ہے، اور ان کی سیرت و شخصیت، ادبی و فنی خصوصیات اور شعر و سخن اور ناول و افسانہ نگاری مختلف پہلوؤں کو دکھایا ہے، آخر میں آغا صاحب کے منظوم ترجمۂ قرآن کے بارہ میں مولانا ابو الکلام، مفتی کفایت اللہ اور مولوی عبد الحق مرحوم وغیرہ کی رائیں نقل کی گئی ہیں، آغا صاحب کے حالات و کمالات کا یہ مرقع دلچسپ اور لائق مطالعہ ہے،

مختصر تاریخ بنگلہ ادب۔ (حصہ اول)۔ از جناب شانتی رنجن بھٹا چاریہ صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۰۸، قیمت تین روپے۔ پتہ: انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ۔

ہمارے ملک کی مختلف زبانوں میں بنگالی ایک مشہور اور مشرقی ہند کے ایک بڑے خطہ کی زبان ہے، اس کتاب میں اس کی ابتدا سے انیسویں صدی تک کی مختصر ادبی تاریخ اور اس کی نظم و نثر کی ابتدا و ارتقار کی اجمالی سرگذشت بیان کی گئی ہے، مصنف نے بنگلہ ادب کی بعض منظوم داستانوں رامائن و مہابھارت، منگل کتھاؤں اور سنگیت وغیرہ کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے، اور ان کی مقبولیت و اہمیت بھی دکھائی ہے، آخر میں بنگلہ زبان کے مسلم ادیبوں اور شاعروں کے خدمات اور ٹیگور سے پہلے کے کئی ممتاز بنگالی شاعروں کے متعلق مفید معلومات تحریر کیے گئے ہیں، جناب شانتی رنجن بھٹاچاریہ اور انجمن ترقی اردو اس کتاب کی اشاعت پر اردو خواں طبقے کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

گلیلو۔ از بریخت، مترجمہ رضیہ سجاد ظہیر صاحبہ، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۸۴، مجلد، قیمت پانچ روپے، پتہ: ساہتیہ اکیڈمی، نئی دہلی۔

سائنس و طبیعیات کے مشہور عالم گلیلو کے اہم سائنسی انکشافات میں یہ بھی ہے کہ سورج ساکت

دائرۃ المعارف

یعنی

معارف اعظم گڈھ

کی

۱۱۱ویں جلد

جنوری ۱۹۷۳ء تا جون ۱۹۷۳ء

مُرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

مطبع معارف پریس اعظم گڈھ

اسلام اور عصر حاضر: مرتبہ مولینا محمد شہاب الدین ندوی، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت وطباعت بہتر صفحات: ۱۹۴- مجلد مع گرد پوش، قیمت مجلد صہر، پتہ: فرقانیہ اکیڈمی نمبر ۱۰۴، پولس روڈ، بنگلور ۲۔

اس کتاب میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اسلام ایک زندہ اور ابدی مذہب ہے، اس لئے موجودہ علمی وتمدنی ترقیوں اور سائنسی انکشافات سے اس کی عظمت وصداقت میں کوئی فرق نہیں آتا، بلکہ وہ کائنات کے بارہ میں عصری تحقیقات اور دریافتوں کی غلطیوں کی اصلاح اور نئے حالات ومسائل میں انسان کی صحیح رہنمائی کرتا ہے، یہ کتاب ان اٹھارہ مضامین کا جو وقتاً فوقتاً مختلف اخبارات اور رسائل میں چھپے تھے، مجموعہ ہے اور تین ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں جدید علمی حقائق کے معیار پر قرآن کا منطبق ہونا ثابت کیا گیا ہے، اور سائنٹفک نظریات کی روشنی میں بنیادی اسلامی تعلیمات توحید ورسالت اور معاد کے دلائل فراہم کئے گئے ہیں، دوسرے باب میں خلائیات کے متعلق جدید تحقیقات سے پیدا ہونے والے شبہات کا جواب اور اُن سے حاصل ہونے والی بصیرتوں کا ذکر ہے، تیسرے باب میں انسان کی موجودہ اخلاقی پستی اور غلط روی بیان کرکے سیرت وکردار کی تعمیر وتشکیل کا اسلامی نظریہ پیش کیا گیا ہے، مصنف کا مقصد صحیح ہے مگر اس کیلئے قرآن مجید کی آیتوں کی توجیہ وترجمہ میں پوری احتیاط ضروری ہے، بعض آیتوں کی تشریح وترجمہ میں غلطیاں ہوگئی ہیں، اس سے قطع نظر یہ کتاب مفید اور معلوماتی ہے۔

"ض"

••••••
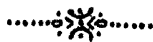
فہرست مضمون نگاران معارف

(جلد ۱۱۱)

ماہ جنوری ۱۹۷۳ء تا ماہ جون ۱۹۷۳ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شمار	مضمون نگار	صفحہ
۱	جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری اڈیٹر البلاغ بمبئی	۵-۸۵، ۳۲۵، ۴۲۳
۲	ڈاکٹر ام ہانی ریڈر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۲۰۱، ۲۸۴
۳	جناب بدیع الزماں صاحب اعظمی	۳۹۴
۴	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	۲۰-۱۶۵، ۲۳۵-۲۴۵، ۴۰۵
۵	ضیاء الدین اصلاحی، رفیق دار المصنفین	۷۷-۱۵۷، ۲۳۶-۳۱۸، ۲۹۸-۳۶۵، ۴۶۵
۶	جناب عبدالخالق صاحب پٹنہ	۲۶۵
۷	جناب ڈاکٹر غلام مصطفٰے صاحب ریڈر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ	۳۴۳، ۴۴۴
۸	جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب پیرس	۴۱-۷۳، ۹۹-۱۸۵، ۳۱۷
۹	محمد نعیم صدیقی ندوی ایم، اے رفیق دار المصنفین	۱۳۵
۱۰	جناب معین احمد صاحب علوی	۱۱۷
۱۱	شاہ معین الدین احمد ندوی	۲-۵۷-۷۵، ۷۶، ۸۲، ۱۴۷، ۱۹۲، ۲۱۵، ۲۳۹، ۲۴۲، ۳۱۸، ۳۲۲، ۳۸۲، ۳۹۸، ۴۰۲، ۴۰۵، ۴۹۱، ۴۷۳، ۴۷۴

شمار	مضمون	صفحہ	شمار	مضمون	صفحہ
۱۳	ہندوستان میں علم حدیث اموی دور تک	۵-۸۵		باب التقریظ والانتقاد	
	وفیات		۱	ایران سوسائٹی جوبلی سووینیر (۱۹۴۴ء۔۱۹۶۹ء)	۲۳۵
۱	چودھری خلیق الزماں مرحوم	۴۷۳	۲	سترھویں صدی عیسوی میں ہندوستان کی بعض اہم نثری تصنیفات	۴۷۵
۲	مرزا احسان احمد بیگ وکیل	۷۵		مطبوعات جدیدہ	۷۷-۱۵۷-۲۳۶-۳۱۸-۳۹۸-۴۷۹
۳	مولانا عبدالصمد رحمانی مرحوم	۴۷۴			
۴	مولانا عبدالمجید حریری بنارس	۷۶			

فہرست مضامین معارف

(جلد ۱۱۱)

ماہ جنوری ۱۹۷۳ء تا ماہ جون ۱۹۷۳ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شمار	مضمون	صفحہ
	شذرات	
	۲، ۸۲، ۱۶۲، ۲۴۲، ۳۲۲، ۴۰۲	
	مقالات	
۱	خریطۂ جواہر	۵۷-۱۴۷ ۲۱۵-۳۸۲ ۴۶۱
۲	سلطان عبدالحمید کی معزولی کا حقیقی سبب	۱۳۵
۳	سید امیر ماہ بہرائچی	۱۱۷
۴	غالب کا مذہبی رجحان ان کے کلام کی روشنی میں	۲۰۱ ۲۸۴
۵	فن توشیح	۳۴۳-۴۴۴
۶	کیا اسلامی قانون رومی قانون کا مرہون منت ہے	۴۱-۹۹ ۱۸۵-۲۱۷ ۳۰۳
۷	کیا موجودہ دنیا کو مذہب کی ضرورت نہیں رہی	۴۰۵
۸	مکتوب حمید	۷۳
۹	ملا محمود جونپوری	۳۲۵-۴۲۴
۱۰	مولانا شبلی کا نثری اسلوب	۲۶۵
۱۱	مولانا محمد علی کی یادیں	۲۰-۱۲۵-۲۴۵
۱۲	ہمارے کیلنڈر تاریخ کے آئینہ میں	۳۶۴

دائرۃ المعارف

یعنی

معارف اعظم گڈھ

کی

۱۱۲ ویں جلد

جولائی سنہ ۱۹۷۳ء تا دسمبر سنہ ۱۹۷۳ء

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

معارف پریس اعظم گڈھ

فہرست مضمون نگارانِ معارف

(جلد ۱۱۲)

ماہ جولائی ۱۹۷۳ء تا ماہ دسمبر ۱۹۷۳ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شمار	مضمون نگار	صفحہ	شمار	مضمون نگار	صفحہ
۱	جناب سید اختر امام صاحب ایم اے بیگ، پی ایچ ڈی، (برمنگھم)	۴۰۳	۷	جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے ایل ایل بی سابق رجسٹرار عربی و فارسی اترپردیش	۲۴۵ ۳۲۵ ۴۰۵
۲	جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری، اڈیٹر البلاغ بمبئی	۵	۸	جناب شفیق احمد خاں صاحب ندوی ایم اے علیگ	[illegible]۲۰
۳	جناب الطاف حسین خاں صاحب شروانی اسلامیہ کالج اٹاوہ	۲۰۰	۹	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	۸۵، ۱۰۵ ۲۴۲، ۲۹۳ ۳۲۲، ۳۶۰
۴	جناب ڈاکٹر سید امیر حسن صاحب عابدی دہلی یونیورسٹی	۲۶۹	۱۰	ضیاء الدین اصلاحی رفیق دار المصنفین	۱۰۸، [illegible] ۲۳۶، ۳۱۶ ۳۹۹، ۴۰۶
۵	جناب انور احمد صاحب سوپوری	۲۲۹	۱۱	جناب پروفیسر عبدالمغنی صاحب پٹنہ	۱۳۵، ۱۸۹
۶	جناب اے اے اے فیضی صاحب	۳۶۰	۱۲	جناب غلام رسول صاحب سابق لائبریرین حیدرآباد سٹی کالج حیدرآباد دکن	۲۶۶

فہرست مضامین معارف

(جلد ۱۱۲)

ماہ جولائی ۱۹۷۳ء تا ماہ دسمبر ۱۹۷۳ء

بہ ترتیب حروف تہجی

شمار	مضمون	صفحہ	شمار	مضمون	صفحہ
	شذرات	۲، ۸۲، ۱۶۲، ۲۴۲، ۳۲۲، ۴۰۳	۹	قرآن پاک اور مرزا غالب	۲۷، ۱۴۳،
۱	اردو کا اصلاح شدہ رسم خط	۴۰۰	۱۰	مسعود بک (ہندوستان کے حسین بن منصور حلاج)	۲۰۶،
۲	اقبال اور اسلامی فکر کی تشکیل جدید	۱۲۵، ۱۸۹،		مکتوب ماسکو	۴۷۳
۳	ایک ہندوستانی صحابی بابا رتن	۱۰۵	۱۲	ملا محمود جونپوری	۵، ۲۱۶
۴	آیہ وادر تنہائی اسرائیل پر ایک نظر	۲۵۵، ۲۹۲، ۴۴۸		ملا محمود جونپوری کی سوانح حیات بعض نئے ماخذ	۲۴۵، ۳۲۵، ۴۰۵
۵	چند قدیم نایاب سکے	۳۳۹	۱۳	مولانا محمد علی کی یاد میں	۸۵، ۱۶۵، ۲۶۳، ۳۴۷،
۶	خریطۂ جواہر	۴۵، ۱۲۱، ۳			
۷	دیوان ہادی	۲۶۹	۱۴	ہندوستان میں مشرق وسطی سے متعلق مطالعہ کے ادارہ کا قیام (ایک تجویز اور خاکہ)	۳۶۷،
۸	علم بلاغت کی ابتدا اور ارتقاء	۴۲۰،			

شمار	مضمون نگار	صفحہ	شمار	مضمون نگار	صفحہ
۱۳	جناب مولوی محمد ایوب صاحب استاد مدرسۃ الاصلاح سرائے میر	۵۰	۱۶	جناب ڈاکٹر معتصم عباسی آزاد مسلم یونیورسٹی علی گڈھ	۶۰
۱۴	جناب مولانا محمد شفیع حجۃ اللہ فرنگی محلی	۲۹۵، ۳۹۲، ۴۴۸	۱۷	شاہ معین الدین احمد ندوی	۱۲، ۴۵، ۶۶، ۸۳، ۱۲۳، ۲۱۶، ۳۱۲، ۴۰۲
۱۵	جناب پروفیسر مسعود حسن صاحب صدر شعبۂ عربی مولانا آزاد کالج کلکتہ	۲۰، ۱۰۳	۱۸	جناب سید وحید اشرف صاحب لکچرر شعبۂ فارسی و اردو مہاراجہ سیاجی راؤ یونیورسٹی (بڑودہ)	۱۰۹

شعراء

شمار	شاعر	صفحہ	شمار	شاعر	صفحہ
۱	جناب اسلم صاحب سندیلوی	۱۵۴	۵	جناب عروج زیدی	۲۳۳
۲	جناب توقیر جمال لکھنوی	۱۵۴	۶	جناب ولی الحق انصاری لکھنؤ	۲۳۴
۳	جناب محمد شرف الدین صاحب ساحل	۱۵۲	۷	جناب وارث القادری	۲۳۵
۴	جناب عثمان احمد صاحب قاسمی جونپوری	۱۵۱			

دائرۃ المعارف

یعنی

معارف اعظم گڈھ

کی

۱۱۲ ویں جلد

جولائی سنہ ۱۹۷۳ء تا دسمبر سنہ ۱۹۷۳ء

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

معارف پریس اعظم گڈھ

تلخیص و تبصرہ

صفحہ	مضمون	شمار
۶۵	ایک عالمی طبی کانفرنس (بعض مسائل حاضرہ پر بحث)	۱

باب التقریظ والانتقاد

صفحہ	مضمون	شمار
۶۴	دیوان مراجی خراسانی	۱

ادبیات

صفحہ	مضمون	شمار
۱۵۲	تضمین بر غزل اقبال	۱
۱۵۱	رسول عربی (صلی اللہ علیہ وسلم)	۲
۳۳، [illegible] ۱۵۴	غزل	۳
۱۵۱	معیار طلب	۴

مطبوعات جدیدہ

۶۰ ، ۱۵۵ ، ۲۳۶ ، ۳۱۶ ، ۳۹۹ ، ۴۷۶

فہرست مضمون نگاران معارف

(جلد ۱۱۲)

ماہ جولائی ۱۹۷۳ء تا ماہ دسمبر ۱۹۷۳ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شمار	مضمون نگار	صفحہ	شمار	مضمون نگار	صفحہ
۱	جناب سید اختر امام صاحب ایم اے علیگ، پی ایچ ڈی، (لندن)	۴۷۲	۷	جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے ایل ایل بی سابق رجسٹرار عربی و فارسی اتر پردیش	۲۴۵ ۳۲۵ ۴۰۵
۲	جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری، اڈیٹر البلاغ بمبئی	۵	۸	جناب شفیق احمد خاں صاحب ندوی ایم اے علیگ	۲۳۰
۳	جناب الطاف حسین خاں صاحب شروانی اسلامیہ کالج اٹاوہ	۳۰۶	۹	سید صباح الدین عبد الرحمن	۸۵، ۱۶۵، ۲۴۲، ۲۹۳، ۳۲۲، ۳۴۰
۴	جناب ڈاکٹر سید امیر حسن صاحب عابدی دہلی یونیورسٹی	۲۰۹	۱۰	ضیاء الدین اصلاحی رفیق دار المصنفین	۸۸، ۱۵۵، ۲۳۶، ۳۱۰، ۳۹۹، ۴۰۶
۵	جناب انور احمد صاحب سوپاری	۲۲۹	۱۱	جناب پروفیسر عبد المغنی صاحب پٹنہ	۱۳۵، ۱۸۹
۶	جناب اے اے اے فیضی صاحب	۳۶۷	۱۲	جناب غلام رسول صاحب سابق لائبریرین حیدرآباد دکن کالج حیدرآباد دکن	۲۶۶

فہرست مضامین معارف

(جلد ۱۱۲)

ماہ جولائی ۱۹۷۳ء تا ماہ دسمبر ۱۹۷۳ء

بہ ترتیب حروف تہجی

شمار	مضمون	صفحہ	شمار	مضمون	صفحہ
	شذرات	۱۶۲،۸۲۶۲، ۳۲۲،۲۴۴، ۴۰۳	۹	قرآن پاک اور مرزا غالب	۲۷، ۱۴۳
۱	اردو کا اصلاح شدہ رسم خط	۴۰۰	۱۰	مسعود بک (ہندوستان کے حسین بن منصور حلاج)	۲۰۶
۲	اقبال اور اسلامی فکر کی تشکیل جدید	۱۲۵، ۱۸۹		مکتوب اسکو	۴۷۳
۳	ایک ہندوستانی صحابی بابا رتن	۱۰۹	۱۲	محمود جونپوری	۲۱۶، ۵
۴	آیہ وادر شہابی اسرائیل پر ایک نظر	۲۵۵، ۲۹۲، ۴۴۸		محمود جونپوری کی سوانح حیات کے بعض نئے ماخذ	۲۴۵، ۳۲۵، ۴۰۵
۵	چند قدیم نایاب سکے	۲۳۹	۱۳	مولانا محمد علی کی یاد میں	۸۵، ۱۶۵، ۲۶۳، ۳۴۷
۶	خریطۂ جواہر	۴۵، ۳۱۲			
۷	دیوان ہادی	۲۷۹	۱۴	ہندوستان میں مشرق وسطیٰ سے متعلق مطالعتی ادارہ کا قیام (ایک تجویز اور خاکہ)	۳۶۷
۸	علم بلاغت کی ابتداء اور ارتقاء	۴۲۷			

شمار	مضمون نگار	صفحہ	شمار	مضمون نگار	صفحہ
۱۳	جناب مولوی محمد ایوب صاحب استاد مدرسۃ الاصلاح سرائے میر	۵۷	۱۶	جناب ڈاکٹر معتصم عباسی آزاد مسلم یونیورسٹی علی گڈھ	۶۰
۱۴	جناب مولانا محمد شفیع حجۃ اللہ فرنگی محلی	۲۹۵، ۳۹۲، ۴۴۸	۱۷	شاہ معین الدین احمد ندوی	۱۲، ۵۰، ۷۷، ۸۳، ۱۶۳، ۲۱۹، ۳۱۲، ۴۰۳
۱۵	جناب پروفیسر مسعود حسن صاحب صدر شعبۂ عربی مولانا آزاد کالج کلکتہ	۲۰، ۱۲۳	۱۸	جناب سید وحید اشرف صاحب لکچرر شعبۂ فارسی و اردو سیاجی راؤ یونیورسٹی (بڑودہ)	۱۰۹

شعراء

شمار	شاعر	صفحہ	شمار	شاعر	صفحہ
۱	جناب اسلم صاحب سندیلوی	۱۵۴	۵	جناب عروج زیدی	۲۳۳
۲	جناب توقیر جمال لکھنوی	۱۵۴	۶	جناب ولی الحق انصاری لکھنؤ	۲۳۴
۳	جناب محمد شرف الدین صاحب ساحل	۱۵۲			
۴	جناب عثمان احمد صاحب قاسمی جونپوری	۱۵۱	۷	جناب وارث القادری	۲۳۵

تلخیص و تبصرہ

شمار	مضمون	صفحہ	
۱	ایک عالمی طبی کانفرنس (بعض مسائل حاضرہ پر بحث)	۵۷	

باب التقریظ والانتقاد

شمار	مضمون	صفحہ	
۱	دیوان سراجی خراسانی	۶۷	

ادبیات

شمار	مضمون	صفحہ	
۱	تضمین بر غزل اقبال	۱۵۲	
۲	رسول عربی (صلی اللہ علیہ وسلم)	۱۵۱	
۳	غزل	۳۳، ۱۰۴، ۳۳۴، ۱۵۴	
۴	معیار طلب	۱۵۱	

مطبوعات جدیدہ

۷۷ ، ۱۵۵ ، ۲۳۶ ، ۳۱۶ ، ۳۹۹ ، ۴۷۶